تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن
جلد ۸
شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
خلیفہ مجاز
قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب
سابق امیر مرکزیہ نائب
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
(رجسٹرڈ)
نفیس قرآن کمپنی
بیسمنٹ مکہ سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبیان الفرقان
فی
تفسیر القرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا

سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء

شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ

سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)

۵۔لوئر مال ٥ بیسمنٹ مکہ سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

فون: 042-37361460, 0321-320-9464017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی زید مجدہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ۔۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ) ۵-لوئر مال ٥ بیسمنٹ مکہ سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

جامعہ اسلامیہ باب العلوم
کہروڑپکا۔ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی
جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد
فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم
جڑانوالہ روڈ۔فیصل آباد
فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار۔لاہور

اسلامی کتب خانہ
بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی
سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن۔کراچی
021-34130020
021-24125590

بیت الکتب
بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اُردو بازار۔کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ملتان

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
مضمون	صفحہ

***

پارہ
قد سمع اللہ

آیاتھا ۲۲ — ۵۸ سورۃ المجادلۃ مدنیۃ ۱۰۵ — رکوعاتھا ۳

سورۂ مجادلہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں، تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ

یقیناً سن لی اللہ تعالیٰ نے بات اس عورت کی جو آپ سے جھگڑا کرتی ہے اپنے خاوند کے بارے میں، اور وہ اللہ کی طرف شکایت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ

يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۱ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ

تم دونوں کی گفتگو کو سنتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے ۝ جو لوگ تم میں سے ظہار کرتے ہیں اپنی بیویوں سے،

مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـئِيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ

وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، نہیں ہیں ان کی مائیں مگر وہ جنہوں نے ان کو جنا ہے، اور بے شک وہ لوگ البتہ بولتے ہیں بری

الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ

بات اور جھوٹ، اور بے شک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے ۝ اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں

ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ

پھر وہ لوٹتے ہیں اس بات کی طرف جو انہوں نے کہی، اُن کے ذمے ہے غلام آزاد کرنا قبل اس کے کہ آپس میں ایک دوسرے سے مس کریں،

ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۳ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

اس بات کے ذریعے تم نصیحت کیے جاتے ہو، اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو ۝ جس کو (غلام) نہ ملے تو اس کے ذمے ہیں

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ

مسلسل دو مہینوں کے روزے قبل اس کے کہ آپس میں ایک دوسرے سے مس کریں، اور جو (روزہ رکھنے کی بھی) طاقت نہیں رکھتا تو اس کے ذمے ہے

سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ

ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا، یہ اس لیے ہے تاکہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، یہ اللہ کے بیان کردہ ضابطے ہیں، اور

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا
کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ۝ بے شک وہ لوگ جو مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی وہ ذلیل کیے گئے جیسے کہ
كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
ذلیل کیے گئے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، اور ہم نے واضح واضح احکام اُتار دیے، اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا
مُّهِيْنٌ ۝ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ
عذاب ہے ۝ جس دن اللہ ان سب کو اُٹھائے گا پھر خبر دے گا انہیں ان کاموں کی جو انہوں نے کیے، اللہ نے وہ سب کام محفوظ کر رکھے ہیں
وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝
اور یہ خود ان کو بھولے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے ۝

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ مجادلہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۲۲ آیتیں ہیں، ۳ رُکوع ہیں، اس سورت میں اِبتدا میں تو ''ظِہار'' کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس کے بعد زیادہ تر تنبیہ منافقین کے لئے ہے، اور اِصلاحِ معاشرہ کے لئے بعض ہدایات دی گئی ہیں۔

شانِ نزول

ایک عورت ہے خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا، اور اُس کے خاوند کا نام تھا اوس بن صامت رضی اللہ عنہ، کسی بات میں تیزی ہوگئی، خاوند کو غصہ آگیا، اس نے اپنی بیوی کو خطاب کر کے کہہ دیا: ''اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ!'' تُو میرے پہ ایسے ہے جیسے ماں کی پشت، اور چونکہ اس میں ''ظَہر'' کا لفظ آتا ہے اس لیے فقہی اِصطلاح میں اِس کو ''ظِہار'' ہی کہتے ہیں۔ جاہلیت میں اس لفظ کو طلاق سے بھی زیادہ مغلظ سمجھا جاتا تھا، کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اس سے تو رُجوع بھی ہوسکتا تھا، دوبارہ نکاح بھی ہوسکتا تھا، لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ''ماں'' کہہ دیتا تو پھر وہ سمجھتے تھے کہ یہ ماں کی طرح ہی ہوگئی، اب دوبارہ اس کے ساتھ زوجیت کا رشتہ قائم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس عورت کو اس کے خاوند نے جب یہ کہہ دیا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی، آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے واقعہ ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت تک اس مسئلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایات نازل نہیں ہوئی تھیں، اس لیے آپ نے یہ فرمایا کہ میرا خیال بھی یہی ہے کہ تُو اپنے شوہر پہ حرام ہوگئی، یا بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بارے میں میرے پہ کوئی حکم نازل نہیں ہوا، ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، واقعہ یہی تھا کہ اُس وقت تک حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری الفاظ کی طرف دیکھتے ہوئے حرمت کا ہی قول کیا، کہ بظاہر معلوم ایسے ہی ہوتا ہے کہ تُو حرام ہوگئی، ویسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح ہدایت اس مسئلے میں نہیں آئی۔ وہ بیچاری رو رہی تھی، کہتی تھی میں کیا

کروں؟ اب بڑھاپے میں کدھر جاؤں؟ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ کبھی کہتی: یارسول اللہ! اس نے کوئی طلاق کا ذکر تو نہیں کیا، اور پھر کبھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے دُکھ درد کا، اور اس معاملے میں اپنی پریشانی کا اظہار کرتی (نسفی)۔ تو یہی ہے حوالہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِبتدائی آیات میں دیا ہے، اور اس کے بعد اس مسئلے کی وضاحت فرمائی۔

''ظِہار'' کی تعریف، حکم اور کفارہ

حاصل اس مسئلے کا یہ ہے کہ اپنی بیوی کو اپنی محرمہ کے ساتھ، محرمہ میں بہن بھی ہے، بیٹی بھی ہے، ماں بھی ہے، خالہ بھی ہے، یعنی محرم اَبدا جو عورتیں ہوا کرتی ہیں جو دائمی طور پر حرام ہیں، اس مسئلے میں وہ سب ماں کے حکم میں ہیں، اُن میں سے کسی عورت کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دے دی جائے جس کی طرف دیکھنا انسان کے لئے جائز نہیں، ران ہے، پشت ہے، بطن ہے، فرج ہے، یوں کہہ دیا جائے اپنی بیوی کو کہ ''تُو میرے لیے میری بہن کے، میری ماں کے فلاں عضو کی طرح ہے!'' جس کی طرف دیکھنا جائز نہیں، تو فقہی طور پر اس کو ''ظِہار'' کہتے ہیں...... اس کا حکم یہ ہے کہ وہ عورت حرام ہوجاتی ہے، لیکن طلاق نہیں ہوتی، اب اگر اس عورت کے ساتھ وہ دوبارہ زوجیت کے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کو کفارہ دینا پڑتا ہے جس کو ''کفارۂ ظِہار'' کہتے ہیں، کفارے کے اَدا کرنے سے پہلے اس کے ساتھ تعلق قائم کرنا حرام ہے...... اور ''کفارۂ ظِہار'' میں تین چیزیں ذکر کی گئیں، یا تو غلام آزاد کیا جائے بیوی کو مس کرنے سے پہلے پہلے، اور اگر غلام پر قدرت نہیں جس طرح سے آج کل غلام نہیں ملتے تو دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے جائیں، ان کے ساتھ بھی یہ قید ہے کہ بیوی کو مس کرنے سے پہلے، اگر درمیان میں مس کرلے گا تو نئے سرے سے روزے شروع کرنے پڑیں گے، اور اگر دو مہینے روزے رکھنے کی بھی قدرت اور طاقت نہیں ہے تو پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے دو وقت، یا صدقۃ الفطر کی مقدار ہر مسکین کو اَدا کردی جائے، اس میں مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا کی قید نہیں ہے، تو شوافع چونکہ مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہیں، آپ نے فقہ کے اندر پڑھا، ان کے نزدیک اس میں بھی مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا کی قید ہے، ہمارے ہاں مطلق مطلق رہتا ہے، مقید مقید رہتا ہے تو غلام کا آزاد کرنا اور روزے رکھنا یہ تو مقید ہے مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا کے ساتھ، لیکن اِطعام مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا کے ساتھ مقید نہیں، اس لیے اگر کھانا کھلانا شروع کیا اور درمیان میں اس نے اپنی بیوی سے مس کرلیا تو کھلایا ہوا کھانا باطل نہیں ہوگا، اور نئے سرے سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا دینا ضروری نہیں ہوگا، جیسے کہ روزوں میں ذکر کیا گیا کہ اگر روزوں کے وسط میں ایسا واقعہ پیش آجائے تو رکھے ہوئے روزے ختم ہوجاتے ہیں اور نئے سرے سے دو مہینے کے روزے پھر رکھنے پڑتے ہیں۔ تو یہ ہے اس مسئلے کی وضاحت، باقی! فقہ میں آپ مفصل اَحکام پڑھتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد اہلِ ایمان کو تو تاکید ہے اللہ تعالیٰ کے اَحکام ماننے کی، اور مدینہ منورہ میں چونکہ منافقین کا ایک ٹولہ پیدا ہوگیا تھا، اور یہود کے ساتھ ان کے روابط تھے، یہود کے ساتھ مل کر وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے، اور کچھ یہودی بھی شرارتیں کرتے تھے، اگلی آیات کے اندر کچھ اُن کو سرزنش ہے۔

تفسیر

''مجادلہ'' کا مفہوم

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا: قد تاکید کے لئے ہوتا ہے، ''یقیناً سُن لی اللہ تعالیٰ نے بات اس عورت کی جو آپ سے جھگڑتی ہے اپنے خاوند کے بارے میں، جو آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑا کرتی ہے'' جھگڑا کرنے سے یہاں مراد ہے اِصرار کرنا، اِلحاح کرنا، بار بار، جیسے کسی بات کو منوانے کے لئے چھوٹا بڑے کے ساتھ اِصرار کرلیا کرتا ہے، یہ ''مجادلہ'' وہی ہے۔ مجادلہ کے اندر دونوں مفہوم ہوا کرتے ہیں، بسا اوقات انسان کسی کی بات کو غلط ثابت کرنے کے لئے جھگڑا کرتا ہے، اور بسا اوقات اپنی بات منوانے کے لئے کرتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں آیا تھا، لُوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں یُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ (سورۂ ہود: ۷۴) تو وہاں اِلحاح وزاری مراد ہے، تو یہاں بھی اِلحاح وزاری مراد ہے، ''سُن لی بات اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی جو آپ سے جھگڑا کرتی ہے اپنے خاوند کے بارے میں'' وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ: اور وہ اللہ کی طرف شکایت کرتی ہے اپنی پریشانی کی، وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا: اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو کو سنتا ہے، اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے، یعنی جو گفتگو تم دونوں میں ہوئی اللہ تعالیٰ نے پوری پوری سُن لی، اور اس کی طرف توجہ فرمائی، اور اس کے بارے میں یہ اَحکام آگے دیے جارہے ہیں۔

عقیدۂ جاہلیت کی تردید

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ: وہ لوگ جو تم میں سے اپنی بیویوں سے ''ظہار'' کرلیتے ہیں، یعنی اپنی بیوی کو اُس وقت کے محاورے کے مطابق ''اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ'' کہہ دیتے ہیں، اپنی بیوی کو تشبیہ دے دیتے ہیں اپنی ماں کے ساتھ، ''جو لوگ تم میں سے ''ظہار'' کرتے ہیں اپنی بیویوں سے'' مَا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ: یہ تو جاہلیت کے عقیدے کی رَدّ ہوگئی، وہ کہتے تھے کہ ماں کی طرح ہوجاتی ہے، اب یہ محرم اَبداً ہے، کوئی صورت نہیں اس بیوی کے حلال ہونے کی۔ ''وہ اُن کی مائیں نہیں ہیں'' اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـئِيْ وَلَدْنَهُمْ: نہیں ہیں اُن کی مائیں مگر وہی جنہوں نے انہیں جنا ہے، مائیں تو اُن کی وہی ہیں، کوئی دُوسری عورت ''ماں'' کہنے سے ''ماں'' نہیں بن جایا کرتی۔

''ظہار'' گناہ ہے!

وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا: اور بے شک یہ لوگ بولتے ہیں بُری بات اور جھوٹ، اپنی بیوی کو جو ''ماں'' کہہ دیتے ہیں یہ بہت منکر قول ہے، بہت غلط بات ہے، ایسا کہنا نہیں چاہیے، اس طرح سے کہنا ایک جرم ہے، اس منکر من القول اور زُور کا اپنی زبان سے نکالنا ایک جرم ہے، اور اس جرم کی آگے سزا ذکر کی جارہی ہے، باتوں میں سے ایک منکر بات اور ناپسندیدہ

بات اور جھوٹ اس نے بولا ہے جس نے بھی ایسا کہہ دیا،" بے شک وہ لوگ البتہ بولتے ہیں باتوں میں سے ناپسند بات اور جھوٹ، اور بے شک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے" اس لیئے اس جرم کی اگر تلافی کرنا چاہیں تو اللہ معاف بھی کر دیتا ہے، تلافی بھی ہوجائے گی۔

کفّارۂ ظہار

اور تلافی کی یہ صورت ہے کہ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ: اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے "ظہار" کرتے ہیں، یعنی اپنی بیویوں کو ماں کے ساتھ تشبیہ دے دیتے ہیں، "اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ" کہہ دیتے ہیں، ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا: يَعُوْدُوْنَ لِنَقْضِ مَا قَالُوْا، لِتَدَارُكِ مَا قَالُوْا (مظہری) جو بات انہوں نے کہہ دی، پھر وہ اس کو توڑنا چاہتے ہیں، اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں، اس کا تدارک کرنا چاہتے ہیں،" پھر وہ لوٹتے ہیں اس بات کی طرف جو انہوں نے کہی" یعنی اس کے ختم کرنے کے لئے، تدارک کے لئے متوجہ ہوتے ہیں، فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا: فَعَلَيْهِمْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ان کے ذمے ہے غلام کا آزاد کرنا قبل اس کے کہ آپس میں ایک دُوسرے سے ملیں، آپس میں ایک دُوسرے سے مس کرنے سے قبل اس کو غلام آزاد کرنا چاہیے، یہاں رقبہ مطلق ہے، اس کے ساتھ مؤمنہ کی قید نہیں، مؤمنہ کافرہ دونوں یہاں آزاد کیے جاسکتے ہیں۔ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ: ذٰلِكُمْ یہ حکم جو پیچھے دیا ہے اس کے ذریعے سے تم نصیحت کیے جاتے ہو، مطلب یہ ہے کہ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ وہ حرمت جو آگئی وہ بھی ختم ہوجائے، اور آئندہ کے لئے تمہیں نصیحت بھی ہو کہ ایسی بُری بات منہ سے نہ نکالو،" اس بات کے ذریعے تم نصیحت دیے جاتے ہو" وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ: جس کو غلام آزاد کرنے کے لئے نہ ملے، فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ: اس کے ذمے ہیں مسلسل دو مہینوں کے روزے، مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا: قبل اس کے کہ آپس میں ایک دُوسرے سے مس کریں، مسلسل دو مہینے کے روزے رکھیں، فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ: اور جو روزے رکھنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا، فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا: تو اس کے ذمے ہے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

صحیح اِیمان والے کون ہیں؟

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: یہ حکم جو دیا جا رہا ہے، یہ حکم واضح کیا جا رہا ہے،" تاکہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" یعنی تاکہ اس حکم کے ماننے کے ساتھ تمہارے ایمان کا اِظہار ہو، کہ تم رَسمِ جاہلیت کے پابند ہو یا اللہ اور اللہ کے رسول پہ تمہارا ایمان ہے، جو اللہ کا حکم آجانے کے بعد اپنی خاندانی رُسوم کو چھوڑتے ہیں وہی صحیح طور پر اللہ اور اللہ کے رسول پر اِیمان لانے والے ہوتے ہیں، اور جو اُسی رَسمِ جاہلیت پر پابند رہتے ہیں تو گویا کہ ان کا اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان نہیں ہے، تو یہ حکم جو واضح کیا جا رہا ہے اس لیے تاکہ تمہارے ایمان کا اِظہار ہوجائے، تاکہ تم اللہ اور اللہ کے رسول کی تصدیق کرو، وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: یہ اللہ کے بیان کردہ ضابطے ہیں، حدود: حد کی جمع، ضابطے کے معنی میں،" اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے" جو اللہ کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔

اِتمامِ حُجّت کے بعد اللہ اور رسول کی مخالفت کا انجام

''بے شک وہ لوگ جو مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی'' کُبِتُوْا: ماضی کا صیغہ ہے لیکن معنی مضارع کا ظاہر کرتا ہے، ''بے شک وہ ذلیل کیے گئے'' یعنی ذلیل کیے جاتے ہیں یا ذلیل کیے جائیں گے، ''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل کیے گئے جیسے کہ ذلیل کئے گئے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے'' اللہ اور اللہ کے رسول کے اَحکام کی مخالفت کرنے والے جیسے پہلے ذلیل ہوئے ویسے یہ ذلیل ہوں گے۔ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ: اور ہم نے واضح واضح اَحکام اُتار دیے، واضح اَحکام اُتر جانے کے بعد اِتمامِ حُجّت ہو جاتی ہے، پھر اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرنے والے معذور نہیں سمجھے جائیں گے، ان کے مقدر میں ذِلّت ہے، ''اور کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''

اللہ کے پاس ہر ایک کا ہر عمل محفوظ ہے

اور یہ عذاب کس وقت ہوگا؟ ''جس دِن اللہ ان سب کو اُٹھائے گا'' یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا: یہ بعث کا ذِکر آگیا، بعث بعد الموت، ''جس دِن اللہ ان سب کو اُٹھائے گا پھر خبر دے گا اِنہیں ان کاموں کی جو انہوں نے کیے'' اَحْصٰىهُ اللّٰهُ: اللہ نے وہ سب کام محفوظ کر رکھے ہیں، سب گِن رکھے ہیں، اللہ کے علم سے ان کا کوئی کام باہر نہیں، وَنَسُوْهُ: اور یہ خود اپنے کیے ہوئے کام کو بھولے ہوئے ہیں، اِنہیں یاد نہیں کہ ہم نے کیا کیا کیا ہے، اِن کی توجہ نہیں ہے، یہ اُدھر اِلتفات نہیں کرتے، ان کے نزدیک اہمیت نہیں، اس لیے یہ بھولے ہوئے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا کیا ہے، لیکن اللہ کے ہاں سب محفوظ ہے، اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ: ہٗ کی ضمیر مَا عَمِلُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے، ''جو کچھ انہوں نے کیا اللہ نے اس کو محفوظ کیا ہے اور یہ اُس کو بھولے ہوئے ہیں'' وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر گواہ ہے، اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں، ہر چیز کا اللہ تعالیٰ مشاہدہ کرنے والا ہے، ہر چیز اللہ کے سامنے ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ
کیا آپ جانتے نہیں کہ بے شک اللہ جانتا ہے ان سب چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، نہیں ہوتی تین کی سرگوشی
اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ
مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ کی مگر وہ اللہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ
اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی یہ ہوں، پھر خبر دے گا ان کو ان کے کیے ہوئے کاموں کی قیامت کے دِن، بے شک اللہ تعالیٰ ہر

شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۞ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نُہُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا

چیز کا علم رکھنے والا ہے۞ کیا آپ نے نہیں دیکھا انہیں ان لوگوں کی طرف جو روکے گئے تھے سرگوشی سے پھر وہ لوٹتے ہیں انہی باتوں کی طرف

نُہُوۡا عَنۡہُ وَ یَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ مَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ ۫ وَ اِذَا جَآءُوۡکَ

جن سے ان کو روکا گیا اور سرگوشی کرتے ہیں آپس میں گناہ کی اور ظلم کی اور رسول کی معصیت کی، اور جس وقت آپ کے پاس آتے ہیں

حَیَّوۡکَ بِمَا لَمۡ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ ۙ وَ یَقُوۡلُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ لَوۡ لَا یُعَذِّبُنَا

تو آپ کو سلام کرتے ہیں ایسے لفظ کے ساتھ کہ جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا، اور اپنے دِلوں میں کہتے ہیں کیوں نہیں عذاب دیتا

اللّٰہُ بِمَا نَقُوۡلُ ؕ حَسۡبُہُمۡ جَہَنَّمُ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ۞ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ

اللہ ہمیں اس بات کی وجہ سے جو ہم کہتے ہیں، ان کے لیے جہنّم کافی ہے، داخل ہوں گے اس میں، پس وہ بُرا ٹھکانا ہے۞ اے

اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَنَاجَیۡتُمۡ فَلَا تَتَنَاجَوۡا بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ مَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ وَ تَنَاجَوۡا

ایمان والو! جس وقت تم آپس میں سرگوشی کرو تو سرگوشی نہ کیا کرو گناہ، ظلم اور معصیتِ رسول کے ساتھ، مشورے کیا کرو آپس میں

بِالۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰی ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ۞ اِنَّمَا النَّجۡوٰی

نیکی اور تقویٰ کے ساتھ، اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم جمع کئے جاؤ گے۞ سوائے اس کے نہیں کہ سرگوشی

مِنَ الشَّیۡطٰنِ لِیَحۡزُنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَیۡسَ بِضَآرِّہِمۡ شَیۡئًا اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ

شیطان کی طرف سے ہے تاکہ غم میں ڈالے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، اور یہ شیطان ان کو نقصان پہنچانے والا نہیں کچھ بھی مگر اللہ کے اذن سے اور

عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۞ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قِیۡلَ لَکُمۡ تَفَسَّحُوۡا فِی

اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۞ اے ایمان والو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجلسوں میں وسعت

الۡمَجٰلِسِ فَافۡسَحُوۡا یَفۡسَحِ اللّٰہُ لَکُمۡ ۚ وَ اِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا یَرۡفَعِ

کردو تو وسعت کر دیا کرو، اللہ تمہارے لیے کشادگی کرے گا، اور جب تمہیں کہہ دیا جائے کہ اُٹھ کے چلے جاؤ تو اُٹھ کے چلے جایا کرو، اُونچا کرے گا

اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ ۙ وَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے تم میں سے اور ان لوگوں کو جو علم دیئے گئے (اُونچا کرے گا) درجوں میں، اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے

خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ
تمہارے عملوں کی﴿۱۱﴾ اے ایمان والو! جس وقت تم اللہ کے رسول سے سرگوشی کرو تو مقدم کیا کرو صدقہ
نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
اپنی سرگوشی سے پہلے، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اور زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے، پس اگر تم نہ پاؤ (صدقہ کرنے کے لئے کوئی چیز) تو اللہ تعالیٰ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ
بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے﴿۱۲﴾ کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تم مقدم کرو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ، پس جب تم نے
تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ
ایسا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کرلی پس تم نماز کو قائم رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو، اللہ اور
رَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع
اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے﴿۱۳﴾

آخری دو رکوع کے مضامین پر ایک نظر

اگلے رُکوع میں جس طرح سے میں نے عرض کیا، اصلاحِ معاشرہ کے لئے بعض ہدایات دی جارہی ہیں، اور منافقین اور یہود کو بعض باتوں میں تنبیہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین کا جو ٹولہ تھا در پردہ ان کی ہمدردیاں یہود کے ساتھ تھیں، اور یہود کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف وہ مشورے کرتے رہتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مشتمل ہوتے، اسلام کی مخالفت پر مشتمل ہوتے، اور ویسے بھی مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لئے علیحدہ مجلسیں لگائے رکھتے تا کہ مسلمان یہ سمجھیں کہ ہمارے خلاف یہ کوئی سکیم بنا رہے ہیں۔ مدینہ منورہ میں اوس اور خزرج یہ دو قبیلے جو سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے انصار کہلائے ان میں سے اکثر تو مخلص لوگ تھے، اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے ظاہری طور پر تو کلمہ پڑھ لیا تھا لیکن حقیقت میں وہ منافق تھے، اُن کی ہمدردیاں یہود کے ساتھ تھیں، اور یہود کے ساتھ مل کر وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے، مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لئے خفیہ طور پر مشورے کرتے، اور ایسا بھی ہوتا کہ کہیں کسی مسلمان کو جاتے ہوئے دیکھتے تو آپس میں ایک دُوسرے کے کانوں میں لگ جاتے باتیں کرنے، کچھ آنکھوں سے اور ہاتھوں سے اِشارے اُدھر کرتے جس سے خواہ مخواہ دُوسرے کو پریشان کرنا مقصود ہوتا، اور یہ واقعہ ہے کہ ایک انسان کو دیکھ کر اگر دُوسرے دو آدمی یوں آپس میں کانا پھوسی کرنے لگ جائیں اور آنکھ سے اور ہاتھ سے اشارہ بھی اُس آنے جانے والے کی طرف کریں تو یقیناً اُس کے دِل دِماغ پر یہ اثر پڑتا ہے کہ پتا نہیں میرے خلاف کوئی بات کر رہے

ہیں، یا میری کسی بات کا مذاق اُڑا رہے ہیں، یا کوئی اور کسی قسم کا مشورہ کر رہے ہیں، تو ذہن پر اثر پڑتا ہے، تو یہ منافق اور یہودی آپس میں مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔

ایک تو یہ ان کی بُری عادت تھی، اور پھر حدیث شریف میں یہود کے متعلق آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں آتے تو جیسے کہ طریقہ ہے، مجلس میں آتے وقت "السلام علیکم" کہا جاتا ہے، تو یہ لوگ شرارت کرتے، دبی زبان کے ساتھ لفظ "سلام" کو ادا کرتے تو "لام" کھا جاتے، "السلام علیکم" کی بجائے کہتے "السام علیکم"، "لام" کو کھا جاتے، تو یہ دُعا کی بجائے بددُعا بن جاتی، "سام" موت کو کہتے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہود اس طرح سے آتے تھے اور یوں آکر "السام علیکم" کہتے تھے، ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو پتا چل گیا، انہوں نے آگے سے کچھ سخت کلامی کی "بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ، لَعَنَكُمُ اللهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ" اس قسم کے سخت لفظ بولے، تو حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ یوں نہ کیا کرو، عائشہ ؓ کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے سنا نہیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کہا ہے تو میرا جواب نہیں سنا کہ میں نے کیا کہا ہے؟ میں نے کہہ دیا ہے: عَلَيْكُمْ! تو ان کی جو بددُعا ہے وہ ان پر ہی جائے گی، ان کی بددُعا مجھے نہیں لگتی۔[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو پتا تو تھا کہ یہ شرارت کرتے ہیں، لیکن آپ اپنی خوش اخلاقی کے طور پر ان کو تنبیہ نہیں کرتے تھے، بس جس وقت وہ "سلام" کہتے تو آپ ان کو صرف "علیکم" کا جواب دیا کرتے تھے، مطلب یہ ہے کہ تم پر ہی ہو، جو تم میرے متعلق کہتے ہو وہ تم پر ہی ہو۔ اور عام مسلمانوں کو بھی حضور ﷺ نے پھر ہدایات یہ دے دی تھیں کہ جب یہ یہودی سلام کریں تو تم ان کو "وَعَلَيْكُمْ" کے ساتھ جواب دے دیا کرو۔[2] کیونکہ یہ شرارت کرتے ہیں، بسا اوقات "السلام" نہیں کہتے، بلکہ "السام علیکم" کہتے ہیں، تو وہ حضور ﷺ کی مجلس میں آتے تو ایسے ہی وہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے، جس طرح سے آپ کے سامنے پہلے لفظ "رَاعِنَا" میں تفصیل آئی تھی سورۂ بقرہ میں، وہ بھی یہی بات تھی، کہ اس قسم کے لفظ بولتے جس میں وہ کوئی نہ کوئی شرارت کا پہلو نکال لیتے، حضور ﷺ کی طرف سے گرفت نہ ہوتی یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا نہ ہوتی تو پھر جا کر اپنی مجلسوں میں تذکرے کرتے کہ اگر یہ اللہ کا رسول ہوتا تو ہمیں اس بات کی وجہ سے عذاب نہ ہو جاتا؟ یوں اس ڈھیل کو گویا کہ اپنی اس بدکرداری کے جواز کی دلیل بناتے تھے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ پتا مجھے سب ہے جو کچھ تم کرتے ہو، خفیہ مشورہ کرتے ہو، سازشیں کرتے ہو، یا مجلس میں آتے ہو تو اُس طریقے کے ساتھ سلام نہیں کہتے جو طریقہ اللہ نے متعین کیا ہے، سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (سورۂ صافات کا آخر) صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (سورۂ اَحزاب: ۵۶) یہ جو طریقہ اختیار کیے ہوئے ہو اور پھر جا کر یوں باتیں بھی کرتے ہو کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ تمہاری یہ باتیں مخفی نہیں ہیں، عذاب کا وقت آجائے گا، پھر تمہیں کوئی طاقت اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی۔

تو یہ اُن کو تنبیہ کی، اور ساتھ ساتھ منافقین کو ان کی دوستی پر بھی متنبہ کیا، اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ اوّل تو کوئی خفیہ

---

(۱) بخاری ۲/۹۳۶ باب الدعاء علی المشرکین/ ۲/ ۱۰۲۳ باب اذا عرض الذمی وغیرہ/ ۲/ ۹۴۷ باب قول النبی یستجاب لنا... الخ/ مشکوۃ ۲/ ۳۹۸، باب السلام۔

(۲) بخاری ج ۲ ص ۹۲۵ باب کیف یرد علی اهل الذمة السلام۔ ابو داؤد ج ۲ ص ۳۵۱ کتاب الأدب باب فی السلام علی اهل الذمة۔

مشورے کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اگر کبھی کوئی خفیہ بات کرنی بھی ہو تو تمہاری بات کے اندر ''بِرّ'' اور ''تقویٰ'' ہونا چاہیے، اچھے کاموں کے لئے آپس میں مشورہ کرو، مسلمانوں کی آپس میں حالات کی اصلاح کے متعلق مشورہ کرو، تمہارے مشورے آپس میں تقویٰ پر مشتمل ہونے چاہئیں، منافقین کی طرح تمہارے مشوروں کے اندر کوئی معصیت کا پہلو نہیں آنا چاہیے۔ اور اگر یہ یہود ومنافقین تمہیں پریشان کرنے کے لئے سرگوشیاں کرتے ہیں تو پریشان نہ ہوا کرو، یہ شیطان کی طرف سے ہے جو کچھ بھی ہے، اور وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمہیں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا چاہیے۔

آگے پھر کچھ آدابِ مجلس ذکر فرمائے ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں گاہے ایسی نوبت آجاتی کہ آپ جہاں بیٹھے ہیں تو لوگ ملنے کے لئے آتے، تو جگہ تنگ ہوتی، تو رسول اللہ ﷺ بعض حضرات سے کہہ دیتے کہ یہ جگہ چھوڑ دو، جو مخلص ہوتے وہ تو چھوڑ دیتے، اُٹھ کے چلے جاتے، جس طرح آپ سے کہہ دیا جائے کہ آپ جائیں، دُوسروں کو آگے آکر بیٹھنے کا موقع دیں، سبق ختم ہوتا ہے تو پہلے سبق کے طلبہ کو اُٹھا دیا جاتا ہے، دُوسرے آجاتے ہیں، تو مجلس میں بھی ایسی نوبت آسکتی ہے کہ آپ لوگوں نے بات کرلی جو کرنی تھی، اب آپ چلے جائیں، دُوسرے لوگوں کو جگہ دیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کہہ دیا جاتا کہ جگہ تنگ ہے، ذرا جُڑ جُڑ کر بیٹھ جاؤ، مجلس میں وسعت کردو، اس پر بھی بعض منافقین محسوس کرتے کہ دیکھو! ہمیں اُٹھا دیا، ہمیں یوں کردیا۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجلس کا خیال رکھا کرو، حدیث شریف میں بھی جس طرح سے وضاحت کردی کہ جو کوئی آئے، مجلس میں گردنیں پھلانگ کر آگے گزرنے کی کوشش نہ کرے، جہاں جگہ دیکھے وہیں بیٹھ جایا کرے۔[1] ...... اور پھر آنے والے کے لئے جگہ کھول دیا کرو، جگہ کھولنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جُڑ جُڑ کر بیٹھ جایا کرو، جب آپس میں جُڑ جُڑ کر بیٹھیں گے تو ایسی صورت میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے، تو تم اپنی علمی مجلسوں کے اندر وسعت پیدا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے جنّت میں وسعت پیدا کرے گا۔ اور خاص طور پر اہلِ علم جو کہ بات کو اچھی طرح سے سمجھ کر خلوص کے ساتھ اِس حکم پہ عمل کریں گے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے گا۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کی بنا حضور ﷺ کسی سے کہہ دیں کہ اُٹھ کے چلے جاؤ تو چُپ کرکے چلے جایا کرو، اس کو بھی محسوس نہ کیا کرو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ تو صدرِ مجلس کو اس قسم کے اختیارات ہوا کرتے ہیں مجلس کے اندر، کسی کو آگے پیچھے کردے، کسی کو کہہ دے اُٹھ کے چلے جاؤ، تو مؤمنینِ مخلصین کا کام ہوتا ہے کہ موقع محل کو پہچانیں اور کوئی کسی قسم کی قلب کے اندر گرانی نہ لائیں...... حضور ﷺ کی مجلس کو سامنے رکھ کر ہدایات دی گئی ہیں، لیکن ہر مجلس کے آداب ایسے ہی ہوتے ہیں کہ صدرِ مجلس جس قسم کا حکم دے، جس قسم کی بات کرے دُوسرے لوگوں کو وہ ماننی چاہیے۔

اور پھر منافقین اکثر وبیشتر اپنی چوہدراہٹ جگانے کے لئے حضور ﷺ سے خلوت میں وقت لے لیتے، باتیں کرتے رہتے، کوئی کام کی بات تو ہوتی نہ، جس میں آپ کا وقت بھی ضائع ہوتا اور جو مخلص مسلمان تھے وہ بے چارے پریشان بھی ہوتے کہ زیادہ وقت اُنہوں نے لے لیا، دُوسروں کو ایسا کوئی وقت نہیں ملا، تو اللہ تعالیٰ نے اس بدنظمی کو دُور کرنے کے لئے یہ ہدایت دے دی

---

(۱) عن جابر بن سمرۃ قال: کنا اذا اتینا النبی ﷺ جلس احدنا حیث ینتھی. (ترمذی ۲/۱۰۱، باب اجلس...الخ. ابوداؤد ۲/۳۰۸۔ مشکوٰۃ ۲/۴۰۵، باب الجلوس)

کہ جو بھی حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہے وہ پہلے کچھ صدقہ خیرات کر کے آیا کرے، اس کے بعد وقت لے سکتا ہے، ایسے ہی آ کر حضور ﷺ کے کانوں نہ لگا کرو۔ جب یہ حکم آیا تو آپ جانتے ہیں کہ وہ منافقین یا یہودی مال کی محبت میں مبتلا تھے، تو ان کے ہاں اتنی اہمیت نہیں تھی حضور ﷺ کے ساتھ گفتگو کرنے کی، کہ پہلے وہ صدقہ خیرات کر کے آئیں، تو کچھ وقت کے لئے یہ حکم دیا گیا جس کے تحت وہ بدنظمی دُور ہوگئی، لیکن اس حکم میں بعض مؤمنین کے لئے بھی دقت پیش آئی کہ وہ بات کرنا چاہتے تھے، لیکن صدقہ خیرات کرنے کی ان میں اتنی ہمت نہیں تھی، اور نہ وہ نمایاں قسم کے نادار اور فقیر ہی تھے کہ ہم کہیں کہ ان کے لئے معافی ہے، جیسے قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا کہ جس کے پاس صدقہ خیرات کرنے کے لئے کچھ نہ ہو تو ضروری نہیں ہے، وہ ویسے ہی بات کر سکتا ہے، لیکن اگر وسعت موجود ہے تو پہلے صدقہ خیرات کر کے آیا کرو، پھر آ کے حضور ﷺ سے بات کیا کرو، تو بعض حضرات ایسے ہوا کرتے ہیں کہ نہ تو وہ بالکل ناداروں کی فہرست میں ہوتے ہیں اور نہ ان کے پاس اتنی وسعت ہوا کرتی ہے، تو اس قسم کے لوگوں کو پریشانی بھی پیش آئی، تو جس وقت یہ مفاسد دُور ہو گئے کہ منافقین اور یہود حضور ﷺ کی مجلس میں آتے لیکن خلوت میں زیادہ وقت لینے کی کوشش نہ کرتے اور آپ کا وقت ضائع نہ ہوتا، تو پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا، منسوخ تو کیا گیا کچھ وقت کے بعد، لیکن یہاں اِس رُکوع میں ناسخ اور منسوخ دونوں آیتوں کو اکٹھا ہی ذکر کر دیا گیا، اس کا یہ معنی نہیں کہ پہلی آیت اُترتے ہی دوسری آیت آ گئی جس نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔ وقت درمیان میں کافی گزرا ہوگا، جس سے ان مفاسد کا تدارک ہو گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔

آگے پھر منافقین کو تنبیہ ہے جو یہود کے ساتھ مل کر شرارتیں کرتے، لیکن جب ان کو بلایا جاتا حضور ﷺ کے سامنے پوچھا جاتا تو قسمیں کھا جاتے، تو قسموں کی اوٹ میں وہ اپنی جان کو اور اپنے مال کو بچائے ہوئے تھے، قسموں کو بطور ڈھال کے استعمال کیے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی ان کی بُری عادت آخرت میں بھی سامنے آئے گی، وہاں بھی یہ قسمیں کھا کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں گے لیکن وہاں بچ نہیں سکیں گے۔ یہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اور یہ کیسا ایمان ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے دشمنوں سے بھی دوستیاں رکھتے ہیں، مؤمن مخلص تو وہ ہیں کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول کے دشمنوں سے دوستی نہیں رکھتے چاہے وہ ان کے آباء، ابناء، اور بھائی کیوں نہ ہو، قبیلے کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں، ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول کا دشمن ہے اس سے محبت نہ رکھی جائے۔ منافقین کو حزبِ شیطان قرار دیا جو یہود کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے، اور یہ مؤمنین مخلصین جو اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ تعلق رکھیں اور باقی کسی سے محبت نہ رکھیں ان کو حزبُ اللہ قرار دیا، تو آخری رُکوع کے اندر ان دونوں گروہوں کا ذکر ہے۔

آیات کی تفسیر

کسی کی کوئی سرگوشی اللہ سے مخفی نہیں

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: کیا آپ نے دیکھا نہیں؟ آپ جانتے نہیں؟ آپ کو معلوم نہیں؟ (یہاں

رُؤیت قلبی مراد ہے) کہ بے شک اللہ جانتا ہے ان سب چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ: نجوٰی: سرگوشی، ''نہیں ہوتی تین کی سرگوشی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے، اور نہ پانچ کی مگر وہ اللہ ان کا چھٹا ہوتا ہے، اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے'' یعنی دو ہوں، چھ سات ہوں، جتنے بھی ہوں، جو خفیہ مشورے کرتے ہیں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں اَيْنَ مَا كَانُوْا، اللہ تعالیٰ سے ان کی کوئی سرگوشی کوئی خفیہ مشورہ مخفی نہیں، اس لیے اسلام کے خلاف یہ سازشیں کرتے ہیں یا اللہ کے رسول کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تو یہ نہ سمجھیں کہ ان کی یہ سازشیں مخفی رہ جائیں گی، ''نہ اس سے کم نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی یہ ہوں، پھر خبر دے گا اِن کو ان کے کیے ہوئے کاموں کی قیامت کے دن، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

سرگوشی سے ممانعت کے باوجود منافق باز نہیں آتے

''کیا آپ نے دیکھا نہیں ان لوگوں کی طرف جو روکے گئے سرگوشی سے'' نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى: جن کو سرگوشی کرنے سے روکا گیا، منع کیا گیا، حضور ﷺ سے تنبیہ کی گئی کہ یوں کسی مسلمان کو دیکھ کر آپس میں کانوں نہ لگ جایا کرو اس کو پریشان کرنے کے لئے۔ احادیث میں بھی آپ پڑھیں گے، حضور ﷺ نے یہ آداب ذکر فرمائے ہیں، حتیٰ کہ یہ کہا کہ اگر کسی جگہ تین ساتھی ہوں تو ایک کو چھوڑ کر دو آپس میں سرگوشی نہ کیا کریں جب تک کہ عام لوگوں میں نہ مل جائیں،[1] کیونکہ جب تین ہیں، دو آپس میں کانوں لگ جائیں گے اور تیسرے کو چھوڑ دیں گے تو تیسرا یقیناً پریشان ہوگا کہ یہ مجھے اپنا نہیں سمجھتے، میرے پہ اعتماد نہیں کرتے، شاید میرے خلاف بات کر رہے ہیں۔ اور جس وقت عام آدمیوں میں شامل ہو جائیں گے پھر ہر کوئی کہتا ہے کہ شاید دوسرے سے چھپانا مقصود ہوگا، پھر کوئی ایک آدھ آدمی نشانہ نہیں بنا کرتا۔ یہاں تک رسول اللہ ﷺ نے رعایت رکھی ہے کہ ایک دوسرے کے لئے کوئی پریشانی کی بات نہ ہو، اور جس وقت عام مجلس ہو تو پھر اگر کسی کے ساتھ سرگوشی کی بھی جائے تو کوئی خاص آدمی پریشانی محسوس نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ شاید مجھ سے مخفی رکھنا مقصود نہیں، کسی اور سے مخفی رکھا جا رہا ہے..... تو منافقین کو جو تنبیہ کی تھی تو اس تنبیہ پر وہ متنبہ نہیں ہوئے، اس کے باوجود وہ مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کیے ہوئے تھے، اِس آیت میں اُن کا ذکر ہے ''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو روکے گئے تھے سرگوشی سے، کانا پھوسی سے، پھر وہ لوٹتے ہیں انہی باتوں کی طرف ہی جس سے اُن کو روکا گیا، اور سرگوشی کرتے ہیں آپس میں گناہ کی، ظلم کی، رسول کی معصیت کی'' یعنی اُن کی سرگوشیاں اِن باتوں پہ مشتمل ہیں، شریعت کے خلاف باتیں کرتے ہیں یہ گناہ ہو گیا، مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں یہ عدوان ہو گیا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے حکم کی چونکہ خلاف ورزی لازم آتی ہے تو یہ معصیتِ رسول ہے۔

سلام کرتے وقت یہودیوں، منافقوں کی چالاکی

''اور جس وقت آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو سلام کرتے ہیں ایسے لفظ کے ساتھ کہ جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو

---

(۱) بخاری ۹۳۰/۲ باب لا یتناجی اثنان/ مسلم ۲۱۹/۲ باب تحریم مناجاة الاثنین/ مشکوٰۃ ۴۲۲/۲ باب الشفقة والرحمة فصل اول۔

سلام نہیں کیا" اللہ نے تو سلام کا لفظ بولا ہے سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (سورۂ صافات: ۱۸۱)، یا: صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (سورۂ احزاب: ۵۶)
"ایسے لفظ کے ساتھ کہ جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو دُعا نہیں دی وہ دُعا دیتے ہیں" وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: اور اپنے دِلوں میں کہتے ہیں، لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ: کیوں عذاب نہیں دیتا اللہ ہمیں اس بات کی وجہ سے جو ہم کہتے ہیں،" ان کے لیے جہنم کافی ہے، داخل ہوں گے اس میں، پس وہ بُرا ٹھکانا ہے۔"

سرگوشی کے بارے میں اہلِ ایمان کو ہدایات

"اے ایمان والو! جس وقت تم آپس میں سرگوشی کرو تو سرگوشی نہ کیا کرو گناہ، ظلم اور معصیتِ رسول کے ساتھ" یعنی منافقوں کی طرح تمہارے مشورے تمہاری مخفی مجلسیں گناہ پر مشتمل نہیں ہونی چاہئیں، کہ آپس میں بیٹھ کے بُری بُری باتیں کرو، یا کسی کے اُوپر ظلم کے مشورے کرو، یا ایسے کام کرو جن سے اللہ کے رسول نے روکا ہے، ایسی باتیں کرو جو ممنوع ہیں، تمہاری مجلسوں میں گناہ، عدوان اور معصیتِ رسول کے متعلق مشورے نہیں ہونے چاہئیں۔" مشورے کیا کرو آپس میں بِر اور تقویٰ کے ساتھ" بِرّ: دُوسرے کو فائدہ پہنچانا، نیکی کرنا۔ تقویٰ: اللہ سے ڈرنا۔ آپس میں جب بیٹھو تو تمہاری گفتگو بِرّ و تقویٰ کے متعلق ہونی چاہیے، جس میں مخلوق کا فائدہ ہے، دُوسرے بھائی کے ساتھ ہمدردی ہے، ایسے مشورے کرو جس سے دُوسرے کو فائدہ پہنچایا جائے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کے خوف پر تمہاری باتیں مشتمل ہونی چاہئیں۔" اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے"......
"سوائے اس کے نہیں کہ نجویٰ شیطان کی طرف سے ہے" یعنی یہ منافقین اور یہود جو خفیہ مشورے کرتے ہیں یہ شیطانی حرکت ہے، " یہ شیطان کی طرف سے ہے تا کہ غم میں ڈالے ان لوگوں کو جو کہ ایمان لے آئے، اور یہ شیطان ان کو نقصان پہنچانے والا نہیں کچھ بھی مگر اللہ کے اِذن سے" جو ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، شیطان میں اور شیطان کا کردار ادا کرنے والے لوگوں میں یہ طاقت نہیں کہ تمہارا کچھ بگاڑ سکیں "نہیں ہے وہ بگاڑنے والا اِن کا، نہیں ہے وہ نقصان پہنچانے والا اِن کو کچھ بھی مگر اللہ کے اِذن سے، اور اللہ پر ہی بھروسا کرنا چاہیے ایمان والوں کو"...... "اے ایمان والو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجلسوں میں وسعت کردو" فسحت اور وُسعت ایک ہی چیز ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جُڑ جُڑ کے بیٹھ جاؤ، آنے والوں کے لئے گنجائش نکال دو،" جب تمہیں کہا جائے کہ مجلس میں وسعت کردو تو وسعت کر دیا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی کرے گا۔ اور جب تمہیں کہہ دیا جائے کہ اُٹھ کے چلے جاؤ تو اُٹھ کے چلے جایا کرو، اُونچا کرے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے تم میں سے اور ان لوگوں کو جو علم دیے گئے، درجوں میں" اللہ درجے بڑھائے گا، جب رسول اللہ ﷺ کی ایسے اَحکام میں بھی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے درجے اُونچے کرے گا، اِس قسم کے حکم کو محسوس نہ کیا کرو کہ یہ ہماری شان کے خلاف ہو گیا، ہمیں کیوں اُٹھا دیا گیا، وقتی مصلحت ہوتی ہے صدرِ مجلس کے لئے، جس طرح سے وہ ہدایت دیں اس کی پابندی کرنی چاہیے۔" اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے تمہارے عملوں کی۔"

حضور ﷺ سے خلوت میں بات کرنے سے پہلے صدقے کا حکم

"اے ایمان والو! جس وقت تم اللہ کے رسول سے سرگوشی کرو" کوئی خلوت میں وقت لینا چاہتے ہو، کوئی رازداری کی

بات کرنا چاہتے ہو" تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ کیا کرو" قَدِّمُوْا صَدَقَةً، مقدّم کیا کرو صدقہ اپنی سرگوشی سے پہلے، "یہ بہتر ہے تمہارے لیے اور زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے" یعنی صدقہ کرو گے تو اگر کوئی کسی قسم کی تھوڑی بہت کوتاہی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ صدقے کے ذریعے سے اس کی تلافی بھی فرمادیں گے۔ انتظامی صورت میں یہ بہتر ہے۔ "پس اگر تم نہ پاؤ صدقہ کرنے کے لئے کوئی چیز تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے" پھر کوئی بات نہیں ہے۔

مذکورہ حکم کا نسخ

یہ گنجائش تو رکھ دی کہ جس کے پاس صدقہ دینے کے لئے کچھ نہیں وہ بغیر صدقہ دینے کے بھی حضور ﷺ سے بات کر سکتا ہے، لیکن اس میں بعض مشکلات آجاتی ہیں کہ کوئی شخص ایسا ہوا کرتا ہے کہ نہ تو وہ اپنے آپ کو بالکل نادار سمجھتا ہے نہ اس کے پاس اتنی وسعت ہے، اور پھر جس مصلحت کے لئے حکم دیا گیا تھا وہ مصلحت بھی حاصل ہو گئی، کہ یہود اور منافقین جو خواہ مخواہ ہی حضور ﷺ کی خلوت میں مخل ہوتے تھے، بلاوجہ آکر خلوت میں وقت لے کر باتیں کرتے، لوگوں کے سامنے وہ دکھانا چاہتے کہ ہمارے تعلقات ہیں کہ دیکھو! ہم خلوت میں کتنی کتنی دیر تک بیٹھے رہتے ہیں، تو حضور ﷺ کا وقت ضائع ہوتا تھا، دوسرے مسلمانوں کا نقصان ہوتا کہ ان کو وقت نہ ملتا، یہ بدانتظامی جو ان لوگوں نے کر رکھی تھی وہ بھی دُور ہو گئی، تو پھر اللہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔
ءَاَشْفَقْتُمْ: "کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تم مقدّم کرو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات کو، پس جب تم نے ایسا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی" جس میں اس بات کی طرف بھی تنبیہ ہے کہ سب کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا کہ اس طرح سے جا کر بیٹھنا اللہ کو پسند نہیں تھا، اللہ کے رسول کے لئے بھی باعث تکلیف تھا، اس لیے یہ پابندی کی گئی ہے، تو پھر وہ نادم بھی ہوئے، شرمسار بھی ہوئے، اپنی پچھلی حرکت کے اُوپر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ بھی کی، جو مؤمنین مخلصین کی طرف سے ایسی کوتاہیاں ہو جاتی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے وہ توبہ قبول کر لی، یعنی پہلے جس سے حضور ﷺ کی مجلس میں کوئی ایسی کوتاہی ہوئی تھی اللہ نے معاف کر دی۔
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: پس تم نماز کو قائم رکھو، وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ دیتے رہو، وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، "اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔" تو یہ آیت ناسخ ہے اس پچھلے حکم کے لئے جس میں حضور ﷺ سے خلوت میں وقت لینے سے پہلے صدقہ کرنے کو ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اب یہ آیتیں ایک دُوسرے کے ساتھ متصل ہی رکھ دی گئیں، ناسخ اور منسوخ اکٹھے آگئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آیت کے اُترتے ہی دوسری آیت آگئی تھی، بلکہ کچھ وقفے کے ساتھ آئی، جس وقت وہ انتظام بحال ہو گیا، وہ مفاسد دُور ہو گئے جو دُور کرنے مقصود تھے، تو پھر اللہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ جیسے سورۂ مزمل میں تہجد کی فرضیت کا ذکر بھی ہے، اور اس کے بعد اس کے نسخ کا ذکر بھی ہے، درمیان میں تقریباً سال کا فصل ہے، لیکن آیتیں ایک ہی سورت میں اکٹھی کر دی گئیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا
کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے دوستی لگائی اُن لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہے، نہ یہ تم میں سے ہیں، نہ

مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۴﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا

اُن میں سے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں جھوٹ پر حالانکہ یہ جانتے ہیں﴿۱۴﴾ تیار کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت

شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا

عذاب، بے شک جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ بُرا کام ہے﴿۱۵﴾ بنایا انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال، پھر روکتے ہیں

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ

اللہ کے راستے سے، ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے﴿۱۶﴾ ہرگز کام نہیں آئیں گے اِن کے اِن کے اموال اور نہ ان کی اولاد

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ

اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، یہ جہنم والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں﴿۱۷﴾ جس دن اللہ اِنہیں اُٹھائے گا

جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۖ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ

سب کو، پھر یہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے سامنے جیسے قسمیں کھاتے ہیں تمہارے سامنے، اور سمجھیں گے وہ کہ وہ کسی اچھی شے پر ہیں،

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿۱۸﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ

خبردار! بے شک وہ جھوٹے ہیں﴿۱۸﴾ غالب آگیا ان کے اُوپر شیطان پھر بھلادی ان کو اللہ کی یاد،

أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ

یہ شیطان کا ٹولہ ہیں، خبردار! شیطان کا ٹولہ ہی خسارہ پانے والا ہے﴿۱۹﴾ بے شک وہ لوگ جو

يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَ

اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ اذلین میں ہیں﴿۲۰﴾ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ البتہ ضرور غالب آؤں گا میں اور

رُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۲۱﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

میرے رسول، بے شک اللہ قوت والا ہے زبردست ہے﴿۲۱﴾ نہیں پائے گا تو ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یوم آخر پر

يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

کہ وہ محبت کریں ان لوگوں سے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے مخالف ہیں اگرچہ وہ ان کے باپ دادا ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں

اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ

یا اُن کا قبیلہ ہو، یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا اور قوت پہنچائی ان کو اپنی طرف سے رُوح کے ذریعے سے، اور

يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اِن کو باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں، اللہ ان سے راضی ہو گیا،

وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾

وہ اللہ سے خوش ہو گئے، یہ اللہ کا گروہ ہیں، خبردار! جو لوگ اللہ کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۲۲﴾

تفسیر

منافقین کے لئے سرزنش

آگے پھر منافقین کے لئے سرزنش ہے، ''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے دوستی لگائی ایسے لوگوں سے جن کے اُوپر اللہ کا غضب ہے'' قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کا مصداق یہود ہیں، ''جنہوں نے دوستی لگائی اُن لوگوں سے جن کے اُوپر اللہ کا غضب ہے، نہ یہ تم میں سے ہیں، نہ اُن میں سے ہیں'' جیسے منافقین کی عادت ہوتی ہے، ظاہری ظاہری تمہارے ساتھ، اندر اندر سے ان کے ساتھ، نہ پورے اُن کے ساتھ، نہ تمہارے ساتھ، ''قسمیں کھاتے ہیں جھوٹ پر حالانکہ یہ جانتے ہیں'' جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، پھر جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں۔ یہ ان کے اخلاق کا ایک نقشہ کھینچا ہے کہ گڑ بڑ کرتے لیکن جب ان سے پوچھا جاتا تو قسمیں کھا جاتے، ''تیار کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب، بے شک بُرا ہے کام جو کرتے ہیں'' اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ بُرا کام ہے۔ ''بنا یا انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال'' جس طرح سے ڈھال ہوتی ہے کہ اس کے اُوپر دوسرے کے وار کو روک لیا جاتا ہے، اپنے لیے تحفظ کا ذریعہ بنالیا جاتا ہے، تو انہوں نے قسموں کو ڈھال بنایا ہوا ہے، ''پھر روکتے ہیں اللہ کے راستے سے، اِن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔'' قسموں کو ڈھال بنایا یعنی جس وقت بھی ان پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو اپنی جان کو، مال کو، عزّت کو بچانے کے لئے قسمیں کھا لیتے ہیں، تو قسم کو بطور ڈھال کے استعمال کرتے ہیں۔

آخرت میں نہ مال اولاد کام آئیں گے نہ جھوٹی قسمیں!

اور منافقین جو تھے، نفاق میں مبتلا تھے صرف اپنے مال اور اولاد کی محبت کی وجہ سے، تو آگے ان کی اس بیماری کے اُوپر تنبیہ ہے، ''ہرگز کام نہیں آئیں گے اِن کے اموال نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی'' اللہ کے عذاب سے کچھ بھی دُور نہیں ہٹائیں گے، جیسے اغنیٰ عنہ کا ترجمہ کیا جاتا ہے کام آنا، فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا، ''ہرگز کام نہیں آئیں گے اِن کے اموال اور نہ اِن کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، یہ جہنم والے ہیں اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔'' يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا:

جس دن اللہ اُنہیں اُٹھائے گا سب کو،" پھر یہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے سامنے جیسے قسمیں کھاتے ہیں تمہارے سامنے" وہاں بھی وہ قسمیں کھا کر اپنا کام نکالنا چاہیں گے، وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ: اور سمجھیں گے وہ کہ وہ کسی اچھی شئ پر ہیں، کسی اچھے حال پر ہیں۔ "خبردار بے شک وہ جھوٹے ہیں" ان کا کذب نمایاں ہو جائے گا، وہاں قسموں سے کام نہیں چلے گا۔

منافقین کی سیاست خسارے کی سیاست ہے!

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ: غالب آ گیا ان کے اُوپر شیطان، شیطان نے ان کے اُوپر تسلط حاصل کر لیا ہے، قابو پا لیا ہے، "غالب آ گیا اِن کے اُوپر شیطان، پھر بھلا دی اِن کو اللہ کی یاد" شیطانی اثر کی وجہ سے ان کو اللہ یاد نہیں رہتا، "یہ شیطان کا ٹولہ ہیں، خبردار! شیطان کا ٹولہ ہی خسارہ پانے والا ہے" جو شیطان کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں، شیطانی حرکتیں کرتے ہیں، شیطان کے اثر کو قبول کرتے ہیں، خسارہ پانے والے بھی ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری سیاست کامیاب ہے، لیکن ان کو پتا نہیں کہ یہ سیاست خسارے کی سیاست ہے، جو دُنیا میں بھی ان کو ذِلّت کی طرف لیے جا رہی ہے اور آخرت میں بھی ذِلّت کی طرف لے جائے گی۔ "بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ اَذلین میں شامل ہیں" بدترین قسم کے ذلیل لوگ ہیں، ان کی ذِلّت دُنیا میں بھی نمایاں ہے اور آخرت میں بھی نمایاں ہوگی، جیسے کہ منافقین آخرکار ذلیل ہوئے، تو ان کی اِس سیاست نے ان کو ذِلّت کے دروازے تک پہنچایا، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے کامیاب ہیں، دونوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، "یہ لوگ اذلین میں ہیں۔"

دُنیا و آخرت میں غلبہ رسولوں کو ہی ملتا ہے

"اللہ نے لکھ دیا ہے کہ البتہ ضرور غالب آؤں گا میں اور میرے رسول، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے، زبردست ہے" اللہ اور اس کے رسول کے لئے غلبہ ہے دُنیا میں بھی آخرت میں بھی، حُجّت کا غلبہ تو نمایاں ہوتا ہی ہے، اور آخرت کا غلبہ تو واضح ہی ہے، اور دُنیا میں تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رسول بھیجے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ایک عدالت ہوتے ہیں، جس کے بعد آ کر انصاف ہو جاتا ہے، اگر وہ لوگ اس کو مانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اُوپر دُنیا اور آخرت میں رحم کرتا ہے، انکار کرتے ہیں تو آپ کے سامنے آ ہی گیا کہ کتنی قومیں ہیں جن سے پھر اللہ رسول کو اور رسول کے ماننے والوں کو نکال لیتا ہے، باقیوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے، اُمتِ محمدیہ کے اندر ماننے والوں کے ہاتھ میں تلوار دے دی گئی کہ ان کے خلاف جہاد کریں، اس جہاد کے ذریعے سے ان کی ذِلّت ظاہر کر دی گئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اِیمانی بُلندی

"نہیں پائے گا تو ان لوگوں کو جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یومِ آخر پر ایمان لاتے ہیں، نہیں پائے گا تو اُنہیں کہ وہ محبت کریں ان لوگوں سے جو اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں" مؤمنین مخلصین اللہ اور اللہ کے رسول کے دشمنوں سے محبت نہیں کر سکتے، جو ان سے محبت رکھتا ہے وہ سمجھو کہ اندر سے منافق ہے۔ "نہیں پائے گا تو ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر، کہ وہ محبت کریں ان لوگوں سے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے مخالف ہیں اگرچہ ان کے آباء ہوں یا ابناء ہوں" وَلَوْ كَانُوْٓا

اٰبَآءَھُمْ: اگرچہ وہ ان کے آباء ہوں، باپ دادا ہوں، ''یا اُن کے بیٹے ہوں یا اُن کے بھائی ہوں یا ان کا قبیلہ ہو'' کوئی ہو، اللہ اور اللہ کے رسول کے مخالف کے ساتھ وہ محبت نہیں رکھ سکتے۔ صحابہ کرام کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جہاد میں اگر بیٹا سامنے آ گیا تو انہوں نے بیٹے کی گردن اُڑا دی، باپ سامنے آ گیا تو باپ کی رعایت نہیں رکھی، کس طرح سے سارے کے سارے تعلقات اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے قربان کر دیے۔ اِن لفظوں میں صحابہ کرام ﷺ کی اس ساری زندگی کا خاکہ آ گیا، کہ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کی وجہ سے انہوں نے کسی سے محبت نہیں رکھی، چاہے اس کے ساتھ کتنا ہی قریبی رشتہ کیوں نہ ہو۔

کافروں کے ساتھ دِلی محبت اور معاملات کا حکم

''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثابت کر دیا'' کَتَبَ: لکھ دیا، ثابت کر دیا، یعنی ایمان کے ثابت اور پکے ہونے کی علامت یہی ہے کہ محبت کے جذبات سارے اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین کے لئے ہو جائیں، مخالفین کے ساتھ دِل میں کوئی جگہ نہ رہے۔ ظاہری معاملات، میل ملاپ، یا کسی کے ساتھ ظاہری طور پر خیر خواہی ہمدردی، وہ ایک علیحدہ بات ہے، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ممتحنہ میں آ رہی ہے، اور پہلے سورۂ آل عمران کے اندر بھی اس کی تفصیل آئی تھی کہ مدارات، مواساۃ، موالات، ان کے کیا درجے ہیں؟ دِل سے محبت کس کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے کس کے ساتھ نہیں؟ ظاہری خیر خواہی کس کے ساتھ کی جا سکتی ہے؟ اور اس کی کچھ تفصیل آگے سورۂ ممتحنہ میں آ رہی ہے، معاملات رکھے جا سکتے ہیں، ظاہری طور پر خیر خواہی اور ہمدردی بھی کی جا سکتی ہے، لیکن جہاں تک دِل کے تعلق کی بات ہے وہ صرف اللہ کے ساتھ، اللہ کے رسول کے ساتھ یا مؤمنینِ مخلصین کے ساتھ ہے، مؤمن کی محبت اگر ہو سکتی ہے تو انہی سے ہوگی، ظاہری معاملہ اگرچہ فساق فجار کفار سے کیا جا سکتا ہے، کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے، میل ملاپ بھی رکھا جا سکتا ہے، ظاہری طور پر خوشِ اخلاقی کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے، بوقتِ ضرورت ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی بھی ہو سکتی ہے، اس کی ممانعت نہیں ہے۔

صحابہ ﷺ کے اِیمان کی خدائی گواہی اور ان کے لئے اِنعامات

''یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں میں ایمان لکھ دیا، اور قوت پہنچائی ان کو اپنی طرف سے رُوح کے ذریعے سے'' اللہ کی طرف سے ان کو فیضان ملتا ہے، اللہ کی طرف سے ان کے قلب میں نُور آتا ہے جس سے مزید قوت حاصل ہوتی ہے، وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ: داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اِن کو باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ''ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں، اللہ ان سے راضی ہو گیا، وہ اللہ سے خوش ہو گئے'' یعنی اللہ کا معاملہ ان کے ساتھ ایسا ہوگا کہ یہ بالکل خوش ہو جائیں گے، اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰہِ: یہ اللہ کا گروہ ہیں، اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: خبردار! جو لوگ اللہ کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

آیاتہا ۲۴ ۵۹ سُوْرَۃُ الْحَشْرِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۱ رکوعاتہا ۳

سورۂ حشر مدینہ میں نازل ہوئی اس کی چوبیس آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ① هُوَ الَّذِیْٓ

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ① وہی اللہ ہے

اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ

جس نے نکال دیا اہلِ کتاب میں سے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلی مرتبہ جمع کرنے کے موقع پر، تمہارا خیال نہیں تھا کہ یہ

اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ

نکل جائیں گے، اور انہوں نے بھی خیال کیا تھا کہ بے شک ان کو بچانے والے ہیں ان کے قلعے اللہ (کی پکڑ) سے، پس ان کے پاس اللہ آ گیا ایسی جگہ سے

لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَ

کہ جہاں ان کا گمان بھی نہیں تھا، اللہ نے ان کے دِلوں کے اندر رُعب ڈال دیا، اُجاڑ رہے تھے وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور

اَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ② وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ

مؤمنین کے ہاتھوں، اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو ② اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اُوپر جلاوطنی

عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③ ذٰلِكَ

نہ لکھی ہوتی تو اللہ انہیں عذاب دیتا دُنیا میں، اور ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب ہے ③ یہ اس لیے کہ

بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ④

انہوں نے مخالفت کی اللہ اور اللہ کے رسول کی، اور جو کوئی مخالفت کرتا ہے اللہ کی پس بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں ④

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓی اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیُخْزِیَ

جو درخت تم نے کاٹ دیے یا اپنے تنے کے اُوپر کھڑے چھوڑ دیے، یہ سب اللہ کے اِذن کے تحت ہے، اور تا کہ اللہ تعالیٰ رُسوا کرے

الْفٰسِقِيْنَ ۝٥ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا

ان بدمعاشوں کو ۝ جو مال اللہ نے لوٹایا اپنے رسول پر ان یہود کی طرف سے پس نہیں دوڑائے تم نے اس کے اُوپر گھوڑے اور نہ

رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦

اُونٹ، لیکن اللہ تعالیٰ مسلط کر دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس کے اُوپر چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے ۝

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَ

ان بستیوں والوں کی طرف سے اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کے اُوپر لوٹایا پس وہ اللہ کے لئے ہے، اور اللہ کے رسول کے لئے ہے، اور رسول کے قرابت والوں

الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ

کے لئے ہے، اور یتیموں کے لئے ہے اور مسکینوں کے لئے ہے اور مسافروں کے لئے ہے، تاکہ یہ مال تمہارے اغنیاء کے درمیان میں لینے دینے کی چیز نہ بن جائے،

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اور جو کچھ تمہیں رسول دے دے تو وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تمہیں روک دے اس سے رُک جایا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٧ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ

سخت سزا والے ہیں ۝ (یہ اموال) ان فقراء کے لیے ہیں جو ہجرت کرنے والے ہیں، نکال دیے گئے وہ اپنے گھروں سے اور

اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ

اپنے مالوں سے، اللہ کے فضل اور اس کی رضا کو چاہتے ہیں، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ (اپنے دعویٰ ایمان میں)

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝٨ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ

سچے ہیں ۝ اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا اختیار کیا دار میں اور اپنے ایمان کو پختہ کیا ان (مہاجرین) سے پہلے، وہ محبت کرتے ہیں اُن لوگوں سے جو

هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي

ان کی طرف ہجرت کر کے آتے ہیں، اور نہیں محسوس کرتے اپنے دلوں کے اندر کوئی حاجت اس مال کی جو مہاجرین دیے گئے، اور ترجیح دیتے ہیں یہ

اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ړ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٩ وَالَّذِيْنَ

اپنی جانوں پر اگرچہ خود ان کو فاقہ ہی ہو، اور جو شخص خود غرضی سے بچا لیا گیا یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۝ جو لوگ ان کے

جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ

بعد آئے وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رَبّ! بخش دے ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے سبقت لے گئے ایمان میں، اور نہ کر ہمارے

فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ⑩

دلوں کے اندر کوئی کینہ اور بغض اُن لوگوں کے متعلق جو ایمان لے آئے، اے ہمارے پروردگار! بے شک تو نرمی کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے ⑩

سورت کا تعارف اور ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ حشر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۴ آیتیں ہیں، ۳ رُکوع ہیں۔ سورت کا نام دُوسری آیت سے ماخوذ ہے جس میں لفظ آیا ہے لِاَوَّلِ الْحَشْرِ، اور چونکہ اس سورت کے اندر بنونضیر کا واقعہ مذکور ہے، اس لیے بعض روایات میں اس سورت کا نام سورۂ بنی نضیر بھی ذِکر کیا گیا ہے..... پچھلی سورت میں یہ لفظ آئے تھے اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ، جو اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ لوگ اذلین میں شامل ہیں، ذلیل ترین طبقے میں شامل ہیں، اس سورت میں اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرنے والوں کو جو ذِلّت نصیب ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ دکھایا جارہا ہے، بنی نضیر یہود کا قبیلہ جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کی تو کس طرح سے وہ ذلیل ہوئے، ایک مثال نمایاں کی جارہی ہے۔

یہودِ مدینہ کے ساتھ معاہدہ اور بنوقینقاع کی جلاوطنی

واقعہ یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے اور وہاں ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی تو مدینہ منورہ کے اردگرد یہود کے تین معروف قبیلے تھے، بنوقینقاع، یہ عبداللہ بن سلام کا قبیلہ ہے، اور بنونضیر اور بنوقریظہ، ان کے ساتھ بھی حضور ﷺ نے مصالحت کرلی، امن کا معاہدہ ہوگیا، آپس میں تعاون کا معاہدہ کرلیا، کہ اگر ہم پر کوئی حملہ آور ہو تو آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں، آپ پر کوئی حملہ آور ہوگا تو ہم تعاون کریں گے، اس طرح سے حضور ﷺ نے اُس سارے علاقے کو ایک پُرامن علاقہ بنادیا۔ لیکن یہود کی فطرت میں شرارت تھی، مشرکینِ مکہ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ جو پہلی لڑائی لڑی گئی وہ غزوۂ بدر ہے، غزوۂ بدر میں مشرکین کو ذِلّت ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو فتح دی، اس فتح کے بعد یہ یہودی کچھ ذہنی طور پر دب دبا گئے تھے، لیکن پھر سب سے پہلے شرارت بنوقینقاع کی طرف سے ہوئی، انہوں نے اسلام کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں حصہ لیا، اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کی، تو سرورِ کائنات ﷺ نے ان کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا، تو یہ بنوقینقاع مدینہ منورہ چھوڑ کر شام کی طرف چلے گئے۔ پہلا قبیلہ تو یہ ہے۔

بنونضیر کی عہد شکنی

اور دُوسرا قبیلہ یہی بنونضیر ہے، غزوۂ بدر کے ایک سال بعد ہی غزوۂ اُحد پیش آیا، غزوۂ اُحد میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے

تحت مسلمانوں کو کچھ چوٹ پہنچائی گئی، نقصان ہوا، مسلمانوں نے مشرکین کے ہاتھوں بظاہر شکست کھائی اور بہت نقصان اُٹھایا، اِس واقعے کے بعد پھر یہ یہودی بھی کچھ ذہنی طور پر دلیر ہوگئے، تو بنونضیر نے سازشیں شروع کردیں قریش کے ساتھ، تاکہ مل جل کر مسلمانوں کا مدینہ منورہ سے خاتمہ کیا جائے (مظہری)، اور ایک واقعہ پیش آگیا کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں غلطی کے ساتھ دو آدمی قتل ہوگئے جو مشرک تھے، لیکن حضور ﷺ نے ان کے ساتھ بھی امن کا معاہدہ کیا ہوا تھا، بنوعامر میں سے تھے، اور حضور ﷺ کی طرف سے اُن کو امن حاصل تھا، لیکن ایک صحابی سے غلطی کے ساتھ وہ دو قتل ہوگئے، ایسے موقع پر پھر معاہد قوم کو دِیت دی جاتی ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ دِیت کے لئے کچھ مال اکٹھا کر رہے تھے، تو آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ چونکہ بنونضیر اور بنوقریظہ کے ساتھ بھی معاہدہ ہے تو چلو ان سے بھی کچھ چندہ کرلیا جائے، اور اس سلسلے میں کچھ تعاون حاصل کرلیا جائے، دِیت ادا کرنے کے لئے۔ تو آپ ﷺ چند صحابہ سمیت بنونضیر کے قبیلے میں چلے گئے، وہاں انہوں نے حضور ﷺ کو ایک جگہ بٹھایا، یہ کہہ کر کہ ہم آپس میں مشورہ کرتے ہیں، کچھ اس سلسلے میں اکٹھا کرتے ہیں، آپ کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، لیکن درپردہ انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی، اور یہ ارادہ کیا کہ جہاں آپ ﷺ بیٹھے ہوئے ہیں اُوپر سے کوئی پتھر گرادیا جائے جس کی زد میں ... ۔نعوذ باللہ۔ آپ کا خاتمہ ہوجائے، تو اس طرح سے یہ مسلمان مدینہ منورہ سے اکھیڑ دیے جائیں گے۔ سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہوگئی، تو آپ ﷺ وہاں سے جلدی ہی اُٹھ کر تشریف لے آئے جس سے ان کی وہ سازش جو تھی ناکام رہ گئی۔

بنونضیر کے اِخراج کا حکم

آپ ﷺ نے پھر ان کے متعلق بھی ارادہ کرلیا کہ یہ پڑوس میں بیٹھے ہیں، اور آئے دِن مشرکین کے ساتھ بھی ان کی باتیں چلتی رہتی ہیں، اور اب ان کی اتنی جرأت بڑھ گئی کہ قتل کرنے کی سازش بھی کی، تو ان کا پاس رہنا مفید نہیں، تو آپ نے اُن کو بھی پیغام بھجوادیا کہ تمہیں دس دِن کی مہلت ہے، دس دِن کے اندر اندر اس علاقے کو خالی کردو، جہاں تمہارا جی چاہتا ہے چلے جاؤ، جتنا سامان تم اُٹھا سکتے ہو، اُٹھالو (سامانِ جنگ کے علاوہ)، سامان کے ساتھ تعرض نہیں کیا جائے گا۔ مدینہ منورہ میں یہ دو قبیلے جو تھے اوس اور خزرج جو انصار کے قبائل کہلاتے ہیں ان کے یہود کے ساتھ پُرانے تعلقات تھے، اوس کا زیادہ تر تعلق بنوقریظہ کے ساتھ تھا اور خزرج کا تعلق بنونضیر کے ساتھ تھا، جاہلیت میں جنگوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ یہ لوگ تعاون کرتے تھے۔

بنونضیر رئیس المنافقین کے بہکاوے میں

اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ ابن سلول یہ بنوخزرج میں سے ہے، تو اپنے سابقہ تعلقات کی بنا پر اس نے بھی بنونضیر کے ساتھ خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا، اور انہیں بہکایا کہ بالکل نکلنے کی کوشش نہ کرنا، میرے جتنے رُفقاء ہیں سب تمہارے معاون ہیں، اگر لڑائی ہوگئی تو ہم تمہارے ساتھ تعاون کریں گے، اور اگر بالفرض نکلنا ہی پڑ گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور تمہارے معاملات میں ہم کسی کا دباؤ قبول نہیں کریں گے، اس لیے ڈٹ جاؤ، بالکل نہ جانا، یوں اس نے بنونضیر کو بہکایا، اور وہ بنونضیر بھی اس

کے بہکاوے میں آگئے، جس وقت بہکاوے میں آگئے تو انہوں نے حضور ﷺ کو جواب کہلا بھیجا کہ ہم نہیں جائیں گے، آپ سے جو ہوتا ہے کرلو۔

بنونضیر کا محاصرہ

جب یہ جواب موصول ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ساتھ لے کر ان کے قبیلے پر حملہ کر دیا، وہ اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے، اور یہ منافقین جنہوں نے ان کو بہکایا تھا شرارت کے لئے، وہ اپنے گھروں میں دبے رہ گئے، کوئی بھی ان کے تعاون کے لئے نہ نکلا۔ اور اس قسم کے شیطانوں کا طریقہ یہی ہوا کرتا ہے کہ شرارت پر اُکسا دیتے ہیں لیکن جس وقت دُوسرا آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو پھر اس مصیبت میں ہاتھ بٹانے کے لئے آگے نہیں جایا کرتے اور کوئی ذمہ داری قبول نہیں کیا کرتے، ہمیشہ سے شریر قسم کے لوگوں کا یہی اصول رہتا ہے، اور آج بھی اسی طرح سے کیا کرتے ہیں، اُنگلی لگائیں گے، لگا کر دو آدمیوں کو لڑا دیں گے، لیکن پھر جس وقت اس کے نتائج سامنے آئیں گے تو اپنے آپ کو لاتعلق ظاہر کر دیں گے، کہیں گے زیادہ سے زیادہ یہی تھا کہ میں نے تو مشورہ ہی دیا تھا، باقی جو کچھ کیا آپ نے خود کیا، اس طرح سے اپنے سر سے ذمہ داری ٹال دیتے ہیں۔ تو یہ منافقین جو تھے وہ اسی طرح سے گھروں میں دَب کے بیٹھے رہے، اور انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔

درخت کاٹنے میں صحابہ کا اِختلافِ رائے

حضور ﷺ نے کچھ دِن تک اُن کا محاصرہ رکھا، ان کو مرعوب کرنے کے لئے کچھ جنگی ضرورت کے تحت ان کے کچھ درخت کاٹے تاکہ انہیں تکلیف ہو، اور بعض جگہ آگ بھی لگائی، مقصد یہ ہوتا ہے تاکہ فریقِ مخالف ذہنی طور پر مرعوب ہو جائے اور وہ یہ سمجھے کہ یا تو مقابلہ کیا جائے ورنہ شکست مان لی جائے، اپنے قلعوں سے وہ باہر نکل آئیں۔ صحابہ ﷺ کے دو فریق تھے بعضوں نے ان درختوں کا کاٹنا مناسب جانا، اور بعض یہ کہتے تھے کہ یہود نے شکست تو کھانی ہے، تو یہ مال بعد میں ہمارے کام آئیں گے، نقصان نہ پہنچایا جائے، تو اس اختلافِ رائے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے ذِکر فرمایا، سورت میں آئے گا کہ جو کچھ ہوا سب اللہ کے اِذن کے تحت ہوا اور یوں ہی مناسب تھا، دونوں کی تصویب فرمادی، جس سے معلوم ہوا کہ اگر ان کو ذہنی تکلیف پہنچانے کے لئے درخت کاٹے گئے تو یہ بھی ٹھیک ہوا، اور اگر کسی نے نہیں کاٹے تو اس نے بھی کوئی ایسی بُری بات نہیں کی، دونوں معاملے ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں ٹھیک ہیں، اِسی میں مصلحت تھی۔

بنونضیر کی بے بسی اور جلاوطنی

آخر چند دِن محصور رہنے کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ ہماری معاونت کے لئے بھی کوئی نہیں آیا، تو پھر انہوں نے حضور ﷺ کی بات مانی، کوئی باقاعدہ لڑائی کی نوبت نہیں آئی، اور یہ کہا کہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں، پھر انہوں نے اپنا سامان اپنے جانوروں پہ لادا، اور اس خیال سے کہ ہمارے مکانات مسلمانوں کے کام نہ آئیں، اس کی کڑیاں بھی نکالنے کی

کوشش کی، دروازے اور کواڑ بھی اکھیڑ لیے، جیسے کہ طریقہ ہوتا ہے کہ اگر ساتھ نہیں لے جاسکتے تو خراب ہی کر دیں، تاکہ بعد میں دُوسروں کے کام نہ آئے، اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو اُجاڑا، اور جو سامان اُٹھا سکتے تھے اُٹھا کے کچھ خیبر اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔ یوں بنونضیر کا خاتمہ ہوا۔

بنوقریظہ کا خاتمہ

پھر ایک ہی قبیلہ رہ گیا بنوقریظہ، تو بنوقریظہ نے بھی منافقین کے ساتھ مل کر سازشیں کی تھیں، مشرکین کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ توڑا تھا غزوۂ اَحزاب میں جس کو غزوۂ خندق کہتے ہیں، تو غزوۂ خندق سے واپس آ کر حضور ﷺ نے پھر قریظہ کا محاصرہ کیا تھا، ان کے واقعے کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَحزاب میں گزر چکی ہے، سب سے بُرا انجام اِن بنوقریظہ کا ہوا، ان کو بھی بہکانے والے یہی منافق تھے، ان میں جو نوجوان تھے وہ سارے کے سارے قتل کر دیے گئے تھے، عورتیں اور بچے جتنے تھے وہ غلام بنالیے گئے تھے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے تحت، یہ واقعہ مفصل آپ کے سامنے سورۂ اَحزاب میں گزرا ہے۔

''مالِ فَیْ'' اور ''مالِ غنیمت'' میں فرق

اِن کے خاتمے کے بعد ان کے باغات اور ان کا وہ علاقہ جو بڑا سرسبز وشاداب علاقہ ہے، اب بھی مدینہ منورہ میں اُدھر باغات زیادہ ہیں۔ تو جب وہ حضور ﷺ کے قبضے میں آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس مال کی حیثیت ''مالِ غنیمت'' کی قرار نہیں دی جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ اَنفال میں آیا تھا، اور دسویں پارے کی اِبتدا میں ذکر کیا گیا تھا۔ غنیمت جو ہے اس میں سے خمس بیت المال کے لئے ہوتا ہے، باقی چار حصے غانمین میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں، یہاں چونکہ لڑائی کی نوبت نہیں آئی اس لیے اس مال کو ''مالِ غنیمت'' قرار دینے کی بجائے ''مالِ فَیْ'' قرار دیا گیا، یہ ایک نئی اِصطلاح ہے، ''فَیْ'' ویسے لوٹنے کو کہتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال اللہ تعالیٰ نے حق داروں کی طرف لوٹا دیا، باغیوں سے چھینا اور اصل حق داروں کی طرف لوٹا دیا، تو ''مالِ فَیْ'' اور ''مالِ غنیمت'' میں فرق یہ رکھا گیا کہ ''مالِ فَیْ'' میں براہِ راست حق دار غانمین نہیں ہوتے، لڑائی لڑنے والے مجاہدین جنہوں نے حملہ کیا تھا، محاصرہ کیا تھا، یہ حق دار نہیں ہوا کرتے، بلکہ براہِ راست یہ سارے کا سارا بیت المال کی ملکیت میں آ جاتا ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ اپنی صوابدید کے مطابق اس کو مستحقین میں خرچ کریں، ضروری نہیں کہ وہ مستحقین لڑائی میں شریک ہوں، بلکہ ساری اُمت کا اُس میں حق ہے، کوئی لڑائی میں شریک ہوا یا نہیں ہوا، وہاں مقابلہ کے لئے گیا تھا یا نہیں گیا، ضرورت کے مطابق حضور ﷺ اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کرتے رہیں، قومی ضرورتوں پر، مساکین پر، محتاجوں پر، مہاجرین کی امداد کریں، یہ اس کے مصرف واضح کر دیے گئے، تو اس کو غنیمت کے اُصول سے تقسیم نہیں کیا گیا۔

اَموالِ بنی نضیر کے بارے میں اَنصار کا بے مثال اِیثار

تو یہ موقع ہے جب سرورِ کائنات ﷺ نے اَنصار سے پوچھا تھا، انصار چونکہ مہاجرین کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی رکھنے

والے تھے، مہاجرین مدینہ منورہ میں گئے ہیں تو ان لوگوں نے اپنی جائیدادیں تک بانٹ کر ان کے سپرد کر دی تھیں، اپنے مکانات تک مہاجرین کو دے دیے تھے، واقعات آپ سنتے ہی رہتے ہیں، ان واقعات کے بیان کرنے سے خواہ مخواہ کی تطویل مقصود نہیں ہے نہ اِس کا موقع ہے، تو حضور ﷺ نے انصار سے پوچھا تھا کہ اگر تم اجازت دو تو یہ بنونضیر کے اموال میں مہاجرین میں تقسیم کر دوں، اور اس کے ساتھ تمہارا بوجھ ٹل جائے گا، تمہارے اپنے جو دیے ہوئے باغات ہیں یا جائیداد ہے وہ تمہیں واپس کر دی جائے گی، تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔ تو انصار نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ جواب دیا تھا کہ یارسول اللہ! ہماری طرف سے اجازت ہے کہ جو کچھ ہم ان کو حصہ دے بیٹھے ہیں وہ بھی مہاجرین کے پاس ہی رہے، اور یہ اَموال، باغات جو آپ کے قبضے میں آئے ہیں، یہ بھی آپ مہاجرین میں تقسیم کر دیں، ہمیں ان کی کوئی کسی قسم کی ضرورت نہیں ہے۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے پھر ان باغات میں سے اَنصار کو حصہ نہیں دیا تھا، مہاجرین پر یہ تقسیم ہوئے (مظہری، قرطبی)، اور جن جن مہاجروں کو اَنصار نے کوئی جائیداد دی ہوئی تھی وہ حضور ﷺ نے واپس انصار کو کروادی، اس طرح سے انصار سے وہ معاشی بوجھ ٹل گیا، اور کسی درجے میں مسلمانوں کو خوش حالی حاصل ہوگئی۔ اور پھر صلح حدیبیہ کے بعد، آپ سامنے سورۂ اَحزاب میں واقعہ آچکا، پھر خیبر بھی فتح ہو گیا تھا، خیبر فتح ہونے کے بعد تو پھر اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خوش حالی کر دی۔ تو ان واقعات کے ضمن میں مہاجرین کا تذکرہ بھی آ رہا ہے اور انصار نے جس قسم کی سیر چشمی دکھائی اور مہاجرین کے ساتھ جس قسم کے ایثار اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر بھی آ رہا ہے۔

دُوسرے اور تیسرے رُکوع کا مضمون

اور اگلے رُکوع میں ان منافقین کے کردار کا نقشہ کھینچا گیا، کہ یہ کس قسم کے شیطان لوگ ہیں، کس طرح سے دوسروں کو شرارت پر بہکاتے ہیں، لیکن جب مصیبت آتی ہے تو پھر ساتھ نہیں دیتے۔ آخری رُکوع میں آخرت کی یاددہانی کروائی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ذکر کیا گیا ہے جو ایمان کے لئے ایک منشا بنتے ہیں، تو جس میں مؤمنین کے لیے اور اسی طرح سے مؤمنین کے ضمن میں منافقین کے لئے یہ نصیحت ہے کہ آخرت کا فکر کرو، دُنیوی اَغراض کے تحت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تم نے جو اختیار کر رکھی ہے یہ آخر کار تمہارے لیے خسارے کا باعث بنے گی۔ اس مضمون پر اس سورت کا اختتام ہو جائے گا، انہی واقعات پر یہ سورت مشتمل ہے۔

تفسیر

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اللہ کے لئے تسبیح بیان کرتی ہے وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، ہر چیز اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے کہ اللہ میں کوئی عیب نہیں، نقص نہیں، جیسے تسبیح کا مفہوم ہے۔ سَبَّحَ: پاکی بیان کی، کہیں یُسَبِّحُ آتا ہے، کہیں سَبِّحْ اَمر کا صیغہ آتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى۔ بہرحال ماضی، مضارع، اَمر، ہر طرح سے ماضی میں، مستقبل میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کائنات کے ذرّے ذرّے سے واضح ہے، ''جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔'' وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

بنو نضیر کا حشرِ ثانی

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: وہی اللہ ہے جس نے نکال دیا اہلِ کتاب میں سے کافروں کو مِنْ دِيَارِهِمْ: ان کے گھروں سے، لِاَوَّلِ الْحَشْرِ: پہلی مرتبہ جمع کرنے کے موقع پر۔ لام وقت کے لئے ہے، حشر جمع کرنے کو کہتے ہیں، ''پہلی مرتبہ جمع کرکے، جمع کرنے کے موقع پر'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ یہود جو یہاں سے نکالے گئے تھے ان کا اس طرح سے گھروں سے نکلنا یہ پہلا واقعہ ہے، اکٹھا کیا، اکٹھا کرکے اِن کو نکال دیا گیا، اِس میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد کوئی دوسرا واقعہ بھی پیش آئے گا، چنانچہ وہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پیش آیا کہ یہی لوگ جو یہاں سے اُٹھ کے خیبر میں جا کر آباد ہوئے تھے، خیبر فتح تو ہوگیا تھا سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں، لیکن اُس وقت پھر ان یہودیوں کی حیثیت مزارعین کی کردی گئی تھی، کہ زمین انہی کے پاس ہی رہنے دی کہ وہ محنت کریں، ملکیت مسلمانوں کی ہوگئی، اس میں سے نصف یہود کو ملتا تھا اور نصف مسلمان وصول کرتے تھے، اور حضور ﷺ نے ان سے یہ کہہ کر معاہدہ کیا تھا کہ جب تک ہم چاہیں گے تمہیں ٹھہرائیں گے۔[1] انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں رہنے دیا جائے، ہم محنت کریں گے اور پیداوار کے اندر ہم حصہ دار ہوجائیں گے، تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''نُقِرُّكُمْ مَا اَقَرَّكُمُ اللهُ'' جب تک اللہ کو منظور ہوگا ہم تمہیں برقرار رکھیں گے۔ وفات کے وقت رسول اللہ ﷺ وصیت فرما گئے تھے کہ جتنی جلد ہوسکے جزیرۃ العرب کو کافروں مشرکوں سے پاک کردینا،[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تو کچھ ایسا اُلجھاؤ ہوا تھا معاملات میں مرتدین کے ساتھ، منکرینِ زکوٰۃ کے ساتھ، مدعیانِ نبوت کے ساتھ، اور دَور بالکل مختصر تھا، تو اُس زمانے میں اِن معاملات کی طرف توجہ کا موقع نہیں ملا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس وقت آئے ہیں تو انہوں نے پھر حضور ﷺ کی اس وصیت کو عملی جامہ پہنایا اور اس وصیت کے تحت ان سب یہود کو خیبر سے نکال دیا تھا، پھر یہ شام کی طرف چلے گئے تھے، گویا کہ وہ حشرِ ثانی ہے۔ اور حشر جو قیامت میں ہوگا وہ تو ہے ہی، کہ سب کو اللہ تعالیٰ اکٹھا کریں گے۔ تو یہاں اوّل الحشر سے مراد ہے پہلی مرتبہ جمع کرنے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان اہلِ کتاب میں سے کافروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔

یہود کا گھمنڈ خاک میں مل گیا

مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا: مَا ظَنَنْتُمْ یہ خطاب مؤمنین کو ہے، اور منافقین کو بھی سنانا مقصود ہے، ''تمہارا خیال نہیں تھا کہ یہ نکل جائیں گے'' یعنی ان کو جس طرح سے برتری حاصل تھی اپنے ماحول میں جو قوت حاصل تھی، تم نہیں سمجھتے تھے کہ یہ نکل جائیں گے، ''نہیں گمان تھا تمہارا کہ یہ نکل جائیں گے'' وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللهِ: اور انہوں نے بھی خیال کیا تھا کہ بے شک ان کو بچانے والے ہیں ان کے قلعے اللہ کے عذاب سے، اللہ کی پکڑ سے، ان کو بھی اپنے قلعوں پر، اپنی عمارتوں پر بہت فخر تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کسی طرح سے بھی مسلمانوں کے مقابلے میں شکست نہیں کھا سکتے، یہ جو ذہنی طور پر ان کو اپنے قلعوں پر ناز تھا اس کا نقشہ

(۱) بخاری ۱/ ۳۱۳ باب اذا قال ربّ الارض اقرّها۔ ۱/ ۳۷۷ باب اذا اشترط فی المزارعۃ الخ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۳۵۵ باب اخراج الیہود، فصل اوّل۔

(۲) بخاری ۱/ ۴۲۹ باب هل یستشفع. ولفظه: اَوْصٰى عِنْدَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثٍ اَخْرِجُوا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ۔ نیز مشکوٰۃ ۲/ ۵۴۸ باب مجرۃ اصحابہ۔

کھینچا گیا ہے کہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ اللہ کا عذاب ان قلعوں میں آ ہی نہیں سکتا۔" اور انہوں نے گمان کیا تھا کہ بے شک ان کو بچانے والے ہیں ان کے قلعے، اللہ کے عذاب سے، اللہ کی پکڑ سے۔" حصون: حِصن کی جمع ہے، حصن قلعے کو کہتے ہیں۔ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا: پس ان کے پاس اللہ آ گیا ایسی جگہ سے کہ جہاں ان کا گمان بھی نہیں تھا، اللہ آ گیا یعنی اللہ کی پکڑ آ گئی، اللہ کی پکڑ کدھر سے آئی؟ جیسے آگے ذکر کر دیا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ: اللہ نے ان کے دلوں کے اندر رُعب ڈال دیا، مسلمانوں کے سامنے مرعوب ہو گئے، اور آپ جانتے ہیں کہ کسی قوم کی قوت اصل کے اعتبار سے قلعوں میں، اسلحہ میں، بڑی اونچی عمارتوں میں اور خندقوں میں نہیں ہوتی، اصل قوت قلب کی قوت ہے، اگر دل مضبوط ہو تو اسلحہ کم بھی ہو تو فوج ڈٹ جاتی ہے، مقابلہ کرتی ہے، اور دل کی قوت کی بنا پر دُوسروں پر فتح بھی پا جاتی ہے، اور اگر دل کمزور ہو جائے تو کتنا ہی ایٹمی اسلحہ کیوں نہ ہو اور کتنے ہی قلعے کیوں نہ ہوں، دل بیٹھ جانے کے بعد پھر فوج کوئی کام نہیں کیا کرتی، تو وہ دیکھتے تھے ظاہری اُونچی دیواروں کو کہ ہمارے قلعوں کی دیواریں اُونچی ہیں، اس لیے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، لیکن یہ ان کو معلوم نہیں کہ جس کا قبضہ دِلوں پر ہے، جب اس نے دِلوں کو بٹھا دیا تو یہ اُونچی دیواریں کام نہیں آ سکتیں، چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ "اللہ تعالیٰ نے اُن کے دِلوں کے اندر رُعب ڈال دیا۔"

بنونضیر کا عبرتناک انجام

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ: خراب کرتے تھے وہ اپنے گھروں کو، ویران کرتے تھے اُجاڑتے تھے وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مؤمنین کے ہاتھوں، یعنی مؤمنین نے بھی اُنہیں اجاڑا اور خود اپنے ہاتھوں بھی انہوں نے اپنے گھر برباد کیے، وہی مکان جو بنائے ہوئے تھے کیسے کیسے ارمانوں کے ساتھ، کیسی حسرتوں کے ساتھ، کیسی کیسی تمنائیں تھیں، آخر ان کو اپنے ہاتھوں ڈھایا، اور مسلمانوں نے بھی اُن کے ساتھ اِس معاملے میں تعاون کیا، تو چونکہ اُس تعاون کا سبب یہی بنے تھے کہ مسلمان ان کو اُجاڑ رہے تھے، اور ان کے اُجاڑنے کی وجہ اُنہی کی شرارت تھی، تو اس لیے اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ کی تخریب جو ہے یہ بھی انہی کی طرف ہی منسوب ہے، "ویران کر رہے تھے، اُجاڑ رہے تھے اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مؤمنین کے ہاتھوں۔" فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ: اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو، آنکھیں کھول کے دیکھو، جو اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کیا کرتے ہیں کتنے ہی اسباب ظاہری طور پر ان کو حاصل کیوں نہ ہوں، لیکن جب اللہ کی گرفت میں آتے ہیں تو وہ پھر بچ نہیں سکتے یا کوئی دوسرا انہیں بچا نہیں سکتا، "اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو" عبرت کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ اس واقعے پر قیاس کر کے دوسرے واقعات کا نتیجہ سمجھو، کہ جو بھی ایسا کرتا ہے، خیانت کرتا ہے، سازشیں کرتا ہے، اللہ کے اَحکام کی مخالفت کرتا ہے، پھر اللہ کی گرفت آ جائے تو اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ وَلَوْلَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ: اگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اُوپر جلاوطنی نہ لکھی ہوتی، لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا تو اللہ انہیں عذاب دیتا دُنیا میں، وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ: اور ان کے لئے آخرت میں آگ کا عذاب ہے، یعنی اللہ کی حکمت کے تحت ان کا جلاوطن کرنا ہی لکھا جا چکا تھا، ورنہ ان کے اُوپر دُنیا میں بھی عذاب آتا، اور آخرت کا عذاب تو ہے ہی۔ "اگر اللہ نے اِن کے اُوپر

جلاوطنی نہ لکھی ہوتی، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ نے ان کے متعلق جلاوطنی کا فیصلہ کر کے لکھ دیا، تو عذاب دیتا انہیں دُنیا میں، اور ان کے لئے آخرت میں جہنم کا عذاب ہے۔"

یہود کی بربادی کا سبب کیا تھا؟

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: یہ واقعہ اس لیے پیش آیا، دنیا کے اندر ان کے لئے رُسوائی اس لیے ہوئی، جلاوطنی اس لیے ہوئی، کہ انہوں نے ضد کی اللہ اور اللہ رسول کے ساتھ، "اور جو کوئی ضد کرتا ہے مخالفت کرتا ہے اللہ کی پس بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں" ان کی مخالفت اللہ کے رسول کے ساتھ تھی، اللہ کے رسول کے ساتھ مخالفت اصل میں اللہ کے ساتھ ہی مخالفت ہے، کیونکہ رسول اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے جزا کو ذکر کرتے ہوئے مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ صرف اللہ کا ذکر کیا۔ "جو شخص بھی اللہ کے ساتھ ضد کرے، مخالفت کرے، بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں۔"

درختوں کا کاٹنا اور نہ کاٹنا، دونوں کام دُرست تھے

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ: لینہ کھجور کے درخت کو کہتے ہیں، "جو کھجور کا درخت تم نے کاٹا، اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا: یا وہ چھوڑ دیا تم نے اپنے تنے کے اُوپر کھڑا، یا وہ درخت اپنے تنوں کے اوپر کھڑے چھوڑ دیے، اصول: اصل کی جمع، اصل تنے کے معنی میں ہے، "جو درخت تم نے کاٹ دیے یا اپنے تنوں کے اُوپر کھڑے چھوڑ دیے" فَبِاِذْنِ اللّٰهِ: سب اللہ کے اِذن کے تحت ہے اور حکمت کے موافق ہوا جو بھی ہوا، وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ: اور تاکہ اللہ تعالیٰ رُسوا کرے اِن فاسقوں کو، بدمعاشوں کو، ان باغیوں کو، ان سرکشوں کو، جنہوں نے فسق و فجور اختیار کیا اللہ کے رسول کے مقابلے میں، اس کارروائی کے ساتھ جو اللہ نے تمہیں توفیق دی کہ بعض درخت کاٹے بعض چھوڑ دیے، دونوں کے اندر تمہارا غلبہ نمایاں ہوا، اور اِن فاسقین کی رُسوائی نمایاں ہوئی۔

اِجتہادی مسائل میں کسی مجتہد کو باطل نہیں کہا جا سکتا

اس میں مفسرین نے اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو مسئلہ مجتہد فیہ ہوتا ہے، خلوص کے ساتھ فریقین اس میں غور کر کے جو راستہ اختیار کر لیتے ہیں تو دونوں ہی اللہ کے نزدیک مقبول ہوا کرتے ہیں، کسی کے اُوپر کوئی ملامت نہیں ہوتی، جیسے یہاں جنہوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ درخت کاٹ دیے جائیں انہوں نے کاٹ دیے، جنہوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ باغ نہ اُجاڑے جائیں کہ بعد میں مسلمانوں کے کام آئیں گے، دونوں کی تصویب اللہ نے فرمادی کہ جو ہوا ٹھیک ہوا، دونوں میں حکمت تھی، تو مجتہدین اِجتہاد کر کے کسی مسئلے کے اندر اگر دو رائیں اختیار کر لیتے ہیں تو ان میں سے کسی کو بھی باطل نہیں کہا جایا کرتا، اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں ہی اَجر پاتے ہیں، اور اِجتہاد ہوا بھی اُس بارے میں کرتا ہے کہ جس میں اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے کوئی واضح ہدایت نہ آئی ہوئی ہو، واضح ہدایت آجانے کے بعد پھر کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہیں رہا کرتی۔

بنو نضیر کا مال ''مالِ فَیٔ'' تھا

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ: جو مال اللہ نے لوٹایا اپنے رسول پر ان یہود کی طرف سے فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ: پس نہیں دوڑائے تم نے اس کے اُوپر گھوڑے اور نہ اُونٹ، رِکاب یہ راحلہ کی جمع ہے من غیر لفظہ، یعنی تمہیں نہ زیادہ سفر کی نوبت آئی، کیونکہ جہاں مسلمان آباد تھے، مدینہ منورہ کی جو اصل آبادی تھی، اس سے ان کے قبیلے کی آبادی تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے، اس لیے کوئی زیادہ سفر کی بھی نوبت نہیں آئی اور مقابلہ بھی نہیں ہوا، ''نہیں دوڑائے تم نے اس کے اُوپر کوئی گھوڑے اور نہ اُونٹ'' وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ: لیکن اللہ تعالیٰ مسلط کر دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس کے اُوپر چاہتا ہے، ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی قدرت کے ساتھ اِن کافروں کو مرعوب کیا، تمہیں اس میں کوئی زیادہ مشقت نہیں اٹھانی پڑی۔

''مالِ فَیٔ'' کا حکم

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی: ان بستیوں والوں کی طرف سے اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کے اُوپر لوٹایا، فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ: پس وہ اللہ کے لئے ہے یعنی براہِ راست وہ ملکیت اللہ کی ہے، ''اور اللہ کے رسول کے لئے ہے'' کہ اللہ کے رسول کو اس میں تصرف کا حق دے دیا گیا، اور اللہ کے رسول اپنی صواب دید کے مطابق آگے مصارف پہ اس کو خرچ کریں گے، وَلِذِی الْقُرْبٰی: ذی القربیٰ سے قربی الرسول مراد ہیں، رسول اللہ ﷺ کی قرابت والے، اُن کے لئے ہے، حضور ﷺ اپنا خرچ نکال سکتے ہیں، اپنے اہلِ قرابت کا خرچ نکال سکتے ہیں، چنانچہ اموالِ بنی نضیر میں حضور ﷺ نے اِن سب کے حصے رکھے تھے، اپنے اہل وعیال کا خرچ بھی اسی میں سے نکالتے تھے، وَالْیَتٰمٰی: یتیموں کے لئے ہیں وَالْمَسٰکِیْنِ: مسکینوں کے لئے ہیں وَابْنِ السَّبِیْلِ: مسافروں کے لئے ہیں، کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ دالَ یدولُ گھومنے کے معنی میں ہے، مداولہ: اسی سے ہے، تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (سورۂ آل عمران: ۱۴۰) یہ ایام ہم لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہا کرتے ہیں، کبھی کوئی خوش حال ہو گیا، دُوسرا بدحال ہو گیا، کبھی کوئی فتح پا گیا، دُوسرا شکست کھا گیا، یہ ادل بدل ہوتے رہتے ہیں، تو یہاں دُولہ کا مصداق یہ ہوا ''تاکہ یہ مال تمہارے اغنیاء کے درمیان میں لینے دینے کی چیز نہ بن جائے، اغنیاء کے درمیان ہی گھومتی نہ رہے'' اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایات دے دیں کہ اللہ کا رسول اپنی صواب دید کے مطابق ان جگہوں میں خرچ کرے گا، یتیموں کو دے گا، مسکینوں کو دے گا، مسافروں پہ خرچ کرے گا، اپنے اہلِ قرابت میں خرچ کرے گا، قومی ضرورتیں اسی ''مالِ فَیٔ'' میں سے پوری کی جاتی ہیں، تو ''مالِ فَیٔ'' میں سے یہ ساری کی ساری ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں یعنی سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے قبل جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ اس قسم کے اموال جو بھی دشمن کی طرف سے حاصل ہوتے وہ ان کے سردار لوگ سنبھال لیا کرتے تھے، عام لوگوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہوتا تھا، تو کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ میں اُس جاہلیت کی رسم کو ختم کر دیا گیا کہ یہ

اغنیاء اور سرداروں کے ہاتھوں میں آنے جانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ براہِ راست یہ بیت المال میں جائے گی، اور اللہ کا رسول اپنی صواب دید کے مطابق اس کو قومی مصارف پر خرچ کرے گا۔ اور اللہ کے رسول کے بعد فقہاء کا اتفاق ہے کہ خلیفہ جو ہوتا ہے اس کو بھی اس قسم کے تصرف حاصل ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، و دیگر خلفاء اِن اموال کے اندر اسی طرح سے تصرف کرتے تھے جس طرح سے حضور ﷺ نے کیا تھا۔ تو اغنیاء کے ہاتھوں میں یہ لینے دینے کی چیز نہ بن جائے اس لیے ہم یہ ہدایات دے رہے ہیں۔

حجیتِ حدیث پر دلیل

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا: جو کچھ تمہیں رسول دے دے تو وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تمہیں روک دے اس سے رُک جایا کرو۔ اب اس آیت کا موقع محل اگرچہ یہاں اموال کی تقسیم میں ہے، کہ جب اِس کا تصرف براہِ راست اللہ کے رسول کو دے دیا گیا تو تم اِس میں اپنی رائے زنی نہ کرو، کہ فلاں کو کیوں مل گیا؟ فلاں کو کیوں نہیں ملا؟ فلاں کو اتنا کیوں دے دیا؟ فلاں کو اتنا کیوں نہیں دیا؟ بلکہ جو اللہ کا رسول دے دے وہ لے لیا کرو، جس سے روک دے رُک جایا کرو۔ تو اس کا موقع محل اموال کی تقسیم کے متعلق ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیت کو ہمیشہ عموم پر محمول کر کے تمام اَحکام میں حضور ﷺ کو مطاع قرار دینے کے لئے اِستدلال ہمیشہ اسی آیت سے کیا ہے، جب بھی کوئی بات بیان کرتے اور وہ بیان کی ہوئی ہوتی اللہ کے رسول کی، حدیث شریف میں ہوتی، اور وہ کہتے کہ اللہ کا حکم یہ ہے، پھر جب کوئی پوچھتا کہ اللہ کا حکم کہاں مذکور ہے؟ کتاب اللہ میں تو ہے نہیں! وہ کہتے: دیکھو! کتاب اللہ میں یہ آ گیا کہ جو اللہ کا رسول دے دے لے لو، جس سے روک دے رُک جاؤ۔ معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کا حکم جو بھی ہو گا وہ اللہ کا ہی حکم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے چند عورتوں کے اُوپر لعنت کا ذکر کیا، کہ یہ جو بدن گدواتی ہیں، بال نوچتی ہیں، اور بھی کئیوں کا ذکر کیا، ان کے اُوپر اللہ کی لعنت ہے، یہ عورتیں ملعون ہیں، تو کوئی عورت آئی اور آکر کہنے لگی کہ عبداللہ! میں نے سنا ہے کہ تُو ان عورتوں کے اُوپر لعنت کرتا ہے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! میں لعنت کرتا ہوں، اور میں کیوں نہ کروں جس کے اُوپر اللہ کے رسول نے بھی لعنت کی، اور جس کا ذکر اللہ کی کتاب میں بھی ہے، تو وہ عورت کہنے لگی کہ "قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ" میں نے تو جتنی کتاب ہے ساری کی ساری پڑھی ہے، اِن عورتوں کے اُوپر لعنت کا ذکر قرآن میں تو ہے نہیں! عبداللہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ اگر تُو غور سے پڑھتی تو تجھے مل جاتا، کیا تُو نے یہ آیت نہیں پڑھی؟ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا، اللہ کا رسول جو تمہیں دے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔ وہ کہنے لگی: ہاں! یہ آیت تو ہے۔ فرمایا: بس! پھر جب حضور ﷺ نے روک دیا تو اللہ نے روک دیا۔[1] جب رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کے اُوپر لعنت کر دی تو اللہ نے لعنت کر دی۔ تو اس آیت میں گویا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت یہ متعین کر دی کہ آپ کا حکم اللہ کا حکم ہے اور آپ کا منع کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ نے منع کر دیا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فہم یہی ہے، اور بھی بہت سے واقعات اس قسم کے آتے ہیں کہ جہاں

---

(۱) بخاری ۲/۷۲۵، کتاب التفسیر، سورۃ الحشر / مشکوٰۃ ۲/۳۸۱ باب الترجل فصل اوّل۔

رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ حکم کو صحابہ ؓ نے کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا، جو علامت ہے اس بات کی کہ انہوں نے اس کو عموم پر محمول کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے لئے اور آپ کے اَحکام کو اَحکامِ الٰہیہ ثابت کرنے کے لئے اس آیت سے ہمیشہ اِستدلال کیا جاتا ہے، حجیت حدیث کے لئے اس آیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ یہ بات اللہ کی کتاب میں نہیں آئی اس لیے ہم اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، رسول اللہ ﷺ سے اگر کوئی بات صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی کتاب میں آگئی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں، "اللہ سے ڈرتے رہو" یعنی اللہ کے رسول کے کسی حکم کی مخالفت نہ ہونے پائے، جو کچھ وہ کہیں اس کے مطابق کرو، جس سے روکیں اس سے رُک جاؤ، اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا والا ہے، اگر اللہ کے رسول کے اَحکام کی مخالفت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کی سزا سر پر کھڑی ہے۔

"مالِ فَیْ" کا پہلا مصرف: مہاجرین

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ: یہ خصوصیت کے ساتھ ان اموال کے مصرف بیان کیے جا رہے ہیں، کہ یہ مال ان لوگوں کو ملنے چاہئیں، چونکہ جیسے میں نے عرض کیا کہ اس میں غانمین کا حصّہ تو متعین نہیں ہوتا، ساری قوم ہی شریک ہے، درجہ بدرجہ اس سے فائدہ اُٹھائے، مہاجرین بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، انصار بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، مہاجرین و انصار کے بعد آنے والے لوگ بھی اِن سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، یہ مال ایک قسم کا قومی ملکیت میں ہوتا ہے، اور قومی مفاد کے اندر اس کو خرچ کیا جاتا ہے، خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے "یہ اموال ان فقراء کے لئے ہیں جو ہجرت کرنے والے ہیں۔"

لفظِ "فقراء" سے ایک فقہی مسئلے کا اِستنباط

فقراء: فقیر کی جمع، "اصول الشاشی" میں اور "نورالانوار" میں آپ نے یہ مسئلہ پڑھا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین کو "فقراء" کے عنوان سے ذکر کیا، حالانکہ اِن مہاجرین میں ایسے لوگ بھی تھے جو مکہ معظمہ میں بہت صاحبِ حیثیت تھے، جائیداد والے تھے، مکان والے تھے، کاروبار والے تھے، تو جب ان کو "فقراء" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا تو اس سے یہ مسئلہ نکالا گیا کہ معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں پر اگر کافر تسلط حاصل کرلیں اور مسلمان اپنے اموال کو چھوڑ کر نکل جائیں تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی ملکیت ختم ہوجایا کرتی ہے، اور وہ اموال کافروں کی ملک میں چلے جاتے ہیں، اس لیے وہ کافر جس قسم کا تصرف کریں ان کا تصرف قابلِ اعتبار ہوتا ہے، تو "فقراء" کے لفظ سے فقہاء نے اِستدلال کیا ہے جس کا ذکر آپ کے سامنے اُصول کی کتابوں میں ہوتا ہے، "فقراء ہجرت کرکے آنے والے" اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ: جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، یعنی کافروں نے انہیں تنگ کیا، جس کی بنا پر وہ نکلنے پہ مجبور ہوگئے۔ "نکال دیے گئے وہ اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے۔"

مہاجرین صحابہ کے فضائل

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا: کتنی بڑی سند ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن فقراء مہاجرین کو عطا کی جارہی ہے، مالوں سے نکالے گئے، گھروں سے نکالے گئے، اور یہ جو چھوڑ چھاڑ کر آئے تو ان کا مقصد دُنیا نہیں، کوئی دُنیا کے جاہ وجلال کے لئے، عزت واحترام حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنے گھروں کو نہیں چھوڑا، بلکہ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا: تو اِن کے خلوص کی گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شہادت دی جارہی ہے کہ یہ اللہ کے فضل کو چاہتے ہیں اور اللہ کی رضا کو چاہتے ہیں، اللہ کے فضل اور اللہ کی رضا کو چاہنے کے لئے اِنہوں نے سب مصیبتیں برداشت کیں، وَيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں، اللہ کے دِین کی مدد کرتے ہیں، اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں، اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ: یہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں، کیونکہ ایمان لاتے وقت انسان ایک قسم کا عہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ، کہ میں تیرے اَحکام مانوں گا، تیرے دِین کا اور تیرے رسول کا مددگار رہوں گا، اور اس کے مقابلے میں اپنی جان مال کی پروا نہیں کروں گا، تو یہ لوگ سچے ثابت ہوئے، جو کچھ زبان سے کہا وہی اِنہوں نے کر کے دکھایا، پوری جانبازی دکھائی۔ یہ تو مہاجرین کا تذکرہ ہو گیا۔

''مالِ فَی'' کا دُوسرا مصرف اور اَنصار صحابہ کے فضائل

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ: تَبَوَّأَ: ٹھکانا اختیار کرنا، دار سے یہاں مدینہ منورہ مراد ہے، وَالْاِيْمَانَ: اس کا عطف دار کے اُوپر ہے، بظاہر الْاِيْمَانَ یہ تَبَوَّؤُ کا مفعول نہیں بن سکتا، چونکہ لفظی ترجمہ یوں ہوگا ''وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا بنایا دار میں اور ایمان میں''، تو ایمان کوئی مقام یا کوئی جگہ تو ہے نہیں کہ جس کے اندر ٹھکانا اختیار کرنا ہے، اس لیے یہاں ایک فعل کو محذوف مانا جائے گا، جیسے مثال آپ کے سامنے مختلف جگہوں میں آیا کرتی ہے: ''عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَاءً بَارِدًا'' علف چارا ڈالنے کو کہتے ہیں، تو علف کا مفعول تبنًا تو ٹھیک ہے، میں نے اُونٹنی کو بھوسا بطور چارے کے ڈالا، اور ٹھنڈا پانی، اب یہ ''مَاءً بَارِدًا'' جو ہے یہ لغۃً عَلَفَ کا مفعول نہیں ہو سکتا ''میں نے چارا ڈالا ٹھنڈے پانی کا''، کیونکہ چارا ڈالنا یہ پانی پر صادق نہیں آیا کرتا، تو یہ مثال آپ کے سامنے دیا کرتے ہیں کہ ایسے موقع پر دُوسرا فعل قرینے کے ساتھ محذوف مان لیا جاتا ہے ''عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَسَقَيْتُهَا مَاءً بَارِدًا'' میں نے اس کو چارا ڈالا یعنی بھوسا، اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ تو اسی طرح سے یہاں بھی ''تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَاَخْلَصُوا الْاِيْمَانَ''، ''وَاَحْكَمُوا الايمانَ'' یوں لفظ نکال لیں گے، ''جنہوں نے دار کے اندر ٹھکانا بنایا (دار سے مراد مدینہ منورہ) اور ایمان کو محکم کیا، اِیمان کو پکا کیا، اور خالص طور پر ایمان لائے، ''وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا اختیار کیا دار میں، اِس گھر میں'' الدار پر الف لام عہد کا ہے، مراد اس سے دارِ ہجرت ہے، مدینہ منورہ، ''ٹھکانا اختیار کیا دار میں اور انہوں نے اپنے اِیمان کو پختہ کیا'' مِنْ قَبْلِهِمْ: اِن مہاجرین سے قبل، مہاجرین مکہ معظمہ سے آئے تو اس سے پہلے انصار ایمان قبول کیے بیٹھے تھے، يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ: یہ انصار کی صفت آ گئی، محبت کرتے ہیں یہ اُن لوگوں سے جو اِن کی طرف ہجرت کر کے آتے ہیں، وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا: اور نہیں محسوس کرتے اپنے دلوں کے اندر

کوئی حاجت اُس مال کی جو مہاجرین دیے گئے، وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ: اور ترجیح دیتے ہیں یہ اپنی جانوں پر، وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ: اگر چہ اِن کو خود فاقہ ہی ہو، خصاصہ حاجت اور فاقہ کو کہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ نے انصار کی تعریف بیان فرمائی، مدینہ منورہ میں انہوں نے اپنا ٹھکانا بنایا ہوا تھا، ایمان ان کا خالص تھا، خلوص فی الایمان کی شہادت بھی ہو گئی، مہاجرین سے پہلے انہوں نے اپنے ایمان کو خالص کیا، یعنی جو ابتدائی لوگ تھے اوّلین سابقین جو حضور ﷺ کے ہاتھ پر مکہ معظمہ جا کے بیعت کر کے آئے تھے، اور پھر ہجرت کی دعوت دی تھی کہ آپ ہمارے ہاں آجایئے، ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ بہت بڑی صفت ان کی یہ ذکر کی گئی کہ جو لوگ اِن کی طرف ہجرت کر کے آرہے ہیں یہ اُن سے محبت کرتے ہیں، آنے والوں سے نفرت نہیں کرتے، لٹے پٹے لوگ اردگرد سے آتے، یہ اُن کا استقبال کرتے، اپنے گھروں کے اندر اُن کو ٹھہراتے، اُن کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے، اُن لوگوں کو یہ احساس ہی نہ ہونے دیتے کہ وہ کسی اجنبی جگہ آگئے ہیں، ورنہ عام طور پر طریقہ یہ ہوا کرتا ہے کہ جو اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے ہیں آنے والوں کا بلا وجہ بوجھ اُٹھانے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتے، نفرت کرتے ہیں، آپ حضرات کے لئے تو یہ چیز کوئی اجنبی نہیں ہے، پاکستان میں تو آپ نے دیکھ ہی لیا، یعنی ۳۴ سال گزر جانے کے باوجود،(۱) دو نسلیں پیدا ہو گئیں پاکستان میں، پاکستان بننے کے بعد تقریباً دو نسلیں پیدا ہو گئیں، جو بچے پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئے تھے، وہ آج کہولت کی عمر کو پہنچے ہوئے ہیں، ۳۴، ۳۴ سال کے ہو گئے، اور ان کے بھی آگے اولاد ہو گئی، تو پاکستان بننے کے بعد دو نسلیں پیدا ہو چکی ہیں، لیکن "لوکل" اور "مہاجر" کا مسئلہ آج بھی دردِ سر بنا ہوا ہے، دونوں کے درمیان میں خلیج اِس وقت بھی موجود ہے، ایک دوسرے سے نفرت اور بُعد اِس وقت بھی موجود ہے، اور بعض علاقوں میں تو اِس عنوان سے فساد خون ریزی کے درجے تک بھی ہوا اور ہوتا رہتا ہے، سندھ کے علاقے میں خصوصیت سے، دیکھ لو جا کے کہ سندھ میں جا کے جو مہاجر آباد ہوئے ہیں تو وہاں کے جو مقامی لوگ ہیں وہ کس طرح سے اُن کے ساتھ نفرت کا معاملہ کرتے ہیں، مہاجر اور لوکل آپس میں بالکل جڑ کے نہیں بیٹھ سکے، دونوں کے درمیان میں لکیر کھنچی ہوئی ہے، ایک دوسرے کے مفاد جب ٹکراتے ہیں تو دشمنیاں ہو جاتی ہیں، لڑائیاں ہوتی ہیں، فساد ہوتا ہے، اور "لوکل" کہتے ہیں کہ یہ باہر سے کہاں سے آگئے، آ کے ہمارے اُوپر مسلط ہو گئے، اِن کو وہ لوگ مکوڑے کہتے ہیں، کہتے ہیں یہ باہر سے مکوڑے آگئے ہیں، اور یہ ہمارے صوبے سے فائدے اُٹھا رہے ہیں، یہ لوٹ کر کھا گئے، تو یہ نفرت اِنتہا کو پہنچی ہوئی ہے، کئی دفعہ تو آپس میں خونریز لڑائی ہو چکی، اور اِس وقت بھی حالات اِس قسم کے ہیں کہ معلوم نہیں کس وقت تصادم ہو جائے۔ اور اپنے علاقوں کے اندر بھی دیکھتے رہتے ہو، کہ دونوں جو ہیں بالکل ممتاز، اور ایک دوسرے کے مفاد علیحدہ علیحدہ، لیکن یہ خصوصیت اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو دی حضور ﷺ کی محبت کے صدقے، کہ ہر آنے والے کا استقبال کیا اور اُس کے سامنے اپنا سب کچھ پیش کر دیا، احادیث کے اندر جس طرح سے واقعات آتے ہیں، بھرے پڑے ہیں واقعات، اِس طرح سے ان لوگوں نے ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کیا کہ آسمان نے کبھی کوئی ایسا نقشہ دیکھا ہی نہیں ہوگا، اتنی محبت دی آنے والوں کو، اور اتنا استقبال کیا۔

---

(۱) یہ درس غالباً سن ۱۹۸۱ یا ۱۹۸۲ء بمطابق ۱۴۰۲ھ کا ہے۔

انصار کے ایثار کا بے مثال واقعہ!

حدیث شریف میں آتا ہے خصوصیت کے ساتھ اسی آیت کے تحت یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ، کہ ایک دفعہ سرور کائنات ﷺ کے ایک مہمان آگیا، آپ نے اپنے گھروں میں پتا کروایا بیویوں کے ہاں، کہ کوئی چیز کھانے کی ہو، کچھ موجود نہیں تھا، انتہائی معاشی تنگی تھی، آپ کو معلوم ہے کہ سارے مسلمانوں کا بوجھ اس بستی پہ آپڑا تھا، اردگرد دشمن ہی دشمن تھے، گزراوقات جو بھی تھا اُس کے وسائل وہیں تھے، کوئی تجارت اور کوئی دوسری چیز تو تھی نہیں، تو پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کوئی ہے جو اس کا بوجھ برداشت کرلے اور اس کی مہمان داری کرے، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد، اُمِّ سلیم کے شوہر، وہ لے گئے، اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہا کہ یہ حضور ﷺ کا مہمان ہے، اس سے کوئی چیز بچا کر نہیں رکھنی، کوئی چیز ہے جو شام کو اس کو کھلادیں؟ وہ کہنے لگی کہ اتنا سا ہمارے پاس موجود ہے جو بچے کھا کر سو سکتے ہیں، تو ہمارا بھی فاقہ ہے، وہ کہنے لگے کہ بچوں کو بھی کسی طرح سے بہلا لینا، یہ حضور ﷺ کا مہمان ہے اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرنا، باقی! یہ مہمان تقاضا کرے گا کہ ہم بھی اِس کے ساتھ بیٹھ کر کھائیں، یہ اکیلا کھائے گا نہیں، اس لیے رات کی تاریکی میں ہم کھانا شروع کریں گے، تو دیے کو دُرست کرنے کے بہانے سے بجھا دینا، ہم بیٹھ کر کچھ اس طرح سے حرکت کرتے رہیں گے جس سے ہمارا مہمان یہ سمجھے کہ یہ بھی کھا رہے ہیں، اور یہ جتنی غذا موجود ہے یہ مہمان کو کھلادیں گے، چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ بچوں کو بھی بہلا کر سلا دیا گیا، اور یہ حضرات جو تھے (خاوند بیوی) یہ بھی اسی طرح سے مہمان کو انہوں نے مطمئن رکھا گویا کہ یہ بھی کھا رہے ہیں، اور جو موجود تھا مہمان کو کھلا دیا، خود بھی بھوکے رہے، بچوں کو بھی رات کو بھوکا رکھا، صبح حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تاریخی جملے پہلے ہی نازل ہو چکے تھے،[1] کہ کیسے بھلے لوگ ہیں کہ آنے والوں کو اپنے پہ ترجیح دیتے ہیں، خود محتاج ہوں تو اپنی احتیاج کا خیال نہیں کرتے، یہ قرآنِ کریم میں شہادت دی گئی یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ: اپنے نفسوں پہ ترجیح دیتے ہیں، وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ: اگرچہ خود محتاج ہی ہوں، اگرچہ خود اِن کو فاقہ ہی ہو، دُوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ تو یہ ایک واقعہ ہے جس کے اُوپر یہ آیت چسپاں ہوگئی، اور اس قسم کے بیسیوں واقعات احادیث کے اندر موجود ہیں، کہ کس طرح سے اِن لوگوں نے مالی قربانیاں دیں، کس طرح سے آنے والوں کا استقبال کیا اور ان کے لئے ٹھکانا مہیا کیا، لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً: مہاجرین کو جو کچھ دیا جارہا ہے، خصوصیت سے بنی نضیر کے جو اموال تھے، باغات، یہ مہاجرین پہ تقسیم کیے گئے، جیسے میں نے عرض کیا، تو انہوں نے کوئی ضرورت نہیں محسوس کی کہ ہمیں ملنے چاہئیں۔

لفظ ”شُح“ کی وضاحت

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہ ہے اصل کے اعتبار سے اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شہادت، شح: کہتے ہیں بخل کو، حرص کو، آز کو۔ حرص اور بخل آپ جانتے ہیں کہ یہ تقریباً تقریباً قریب قریب ہیں، دونوں کا منشا مال کی محبت ہوتا

(۱) بخاری ۱/۵۳۶، کتاب المناقب، باب قول اللہ ویؤثرون علی انفسھم/ مسلم ۲/۱۸۴، باب اکرام الضیف/ مشکوۃ ۲/۵۸۱، باب جامع المناقب کا آخر۔

ہے، جس وقت دِل کے اندر مال کی محبت ہو تو انسان چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آئے، یہ حرص ہے، اور جو آیا ہوا ہے وہ جائے نہیں، یہ بخل ہے، حاصل دونوں کا مال کی محبت ہے، اور اس کے لئے اگر آپ زیادہ سہل لفظ بولنا چاہیں جو اس کی صحیح ترجمانی کرے تو اس کے لئے لفظ ''خودغرضی'' کا ہے، ''جو شخص اپنے نفس کے حرص وبخل سے بچالیا گیا پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، جو خودغرضی سے بچالیا گیا یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''، خودغرض لوگ کبھی کسی سے ایثار نہیں کرسکتے، کبھی کسی کے ساتھ ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کرسکتے، مالی قربانی نہیں دے سکتے، اپنے گھروں کے اندر دُوسروں کو بٹھا نہیں سکتے، جن کے سامنے اپنی اغراض ہوتی ہیں، جو حرص یا بخل کے مرض کے اندر مبتلا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی شہادت یہ ہے کہ یہ انصارِ مدینہ نہ حریص ہیں، نہ بخیل ہیں، نہ یہ خودغرض ہیں، اس لیے دُنیا اور آخرت کی فلاح انہی کے لئے ہے، یہ خودغرضی سے بچالیے گئے، اور جو شخص بھی خودغرضی سے بچالیا جاتا ہے، حرص وبخل سے بچالیا جاتا ہے یہی لوگ فلاح پانے والے ہوتے ہیں۔ اور جو منافقین کا ٹولہ تھا وہ یہی خودغرض ٹولہ تھا، ان کے سامنے ہمیشہ اپنی اغراض رہتی تھیں، اس لیے جہاں بھی اپنی غرض پوری ہوتی وہاں تو وہ مائل ہوتے تھے، جہاں اپنی غرض کو ذرا سی ٹھیس پہنچتی بھاگ جاتے تھے۔ تو انصار کے ایثار اور قربانی کا مدار اس بات پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرص بخل اور خودغرضی سے بچایا، جس کے نتیجے میں انہوں نے مہاجرین کے ساتھ بہت ہی محبت کا معاملہ کیا اور ایثار کا معاملہ کیا، ہمدردی کا معاملہ کیا۔

''مالِ فَیْ'' کا تیسرا مصرف

آگے تیسرے گروہ کا ذِکر آگیا۔ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ، وہ بھی اس ''مالِ فَیْ'' میں حق دار ہیں ''جو لوگ اِن کے بعد آئے'' یعنی سابقینِ اَوّلین کے بعد، یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا: ''کہتے ہیں کہ اے ہمارے رَبّ! ہمیں بخش دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے سبقت لے گئے ایمان میں'' جو پہلے مؤمن ہیں اُن کو بھی بخش دے یعنی سابقین کے ساتھ وہ محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں، گزرے ہوئے صحابہ کے ساتھ وہ محبت کا مظاہرہ کرکے اُن کے لئے دُعائیں کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: نہ کر ہمارے دِلوں کے اندر کوئی کینہ اور بغض ان لوگوں کے متعلق جو اِیمان لے آئے، ''اے ہمارے پروردگار! بے شک تو شفقت کرنے والا، نرمی کرنے والا، مہربانی کرنے والا ہے'' ہم پر یہ مہربانی کر کہ ہمیں اپنے سے پہلے جانے والے مؤمنین کے ساتھ محبت عطا فرما، ہمارے دِل کے اندر اُن کے متعلق کوئی کینہ بغض نہ آئے، ہمیں بھی بخش دے اور اُنہیں بھی بخش دے، اس قسم کے جذبات کے جو حامل لوگ ہیں وہ بھی اس ''مالِ فَیْ'' سے فائدہ اُٹھائیں گے اور یہ ''مالِ فَیْ'' ان کے لئے بھی ہے۔ یہ تیسرا فریق ہوگیا۔

کون ''مالِ فَیْ'' کا حق دار نہیں؟

تو گویا کہ مؤمنین کے تین ہی فریق ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں، مہاجرین، انصار، اور مہاجرین وانصار سے محبت رکھنے والے، اور جو شخص اس تیسرے فریق میں بھی شامل نہیں، مہاجرین وانصار میں سے کسی فریق کے ساتھ بھی وہ بغض رکھنے والا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملعون ہے، اس لیے یہ تین ہی فریق ہیں جن کا ذِکر اللہ تعالیٰ

نے یہاں مدح کے عنوان سے کیا، ہجرت کرنے والے، اور انصار اُن کی مدد کرنے والے، اور تیسرے بعد میں آنے والے جو ان دونوں فریقوں کے ساتھ محبت رکھنے والے ہیں۔ بلکہ اسی آیت کے ضمن میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ صحابہ کے ساتھ، انصار اور مہاجرین کے ساتھ جو شخص بغض رکھتا ہے وہ ''مالِ فیٔ'' میں حق دار نہیں ہے، ان کو اموالِ فیٔ سے فائدہ نہیں پہنچایا جاسکتا (مظہری)، گویا کہ وہ ان مؤمنین کی فہرست میں شامل نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
آپ نے دیکھا نہیں؟ ان لوگوں کی طرف جنہوں نے نفاق اختیار کیا، کہتے ہیں اپنے ان بھائیوں کو جنہوں نے کفر کیا اہل
الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ
کتاب میں سے، اگر تم نکالے گئے تو البتہ ضرور نکلیں گے ہم تمہارے ساتھ، اور نہیں اطاعت کریں گے ہم تمہارے بارے میں
اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝١١ لَئِنْ
کسی کی کبھی بھی، اور اگر تم لڑائی لڑے گئے تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے، اللہ گواہی دیتا ہے اس بات کی کہ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں ۝ اگر
اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ
وہ یہودی نکال دیے گئے تو یہ ان کے ساتھ نکلیں گے نہیں، اور اگر وہ لڑائی لڑے گئے تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے، اور اگر بالفرض
نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۙ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝١٢ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ
ان کی مدد کریں بھی تو پھر یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر یہ مدد نہیں دیے جائیں گے ۝ البتہ تم زیادہ سخت ہو از روئے خوف کے
صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝١٣ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا
ان کے دلوں میں بمقابلہ اللہ کے، یہ اس سبب سے ہے کہ وہ سمجھ دار لوگ نہیں ۝ نہیں لڑیں گے یہ تم سے سارے کے سارے اکٹھے ہو کر
فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا
محفوظ بستیوں میں، یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کی آپس میں لڑائی سخت ہوتی ہے، اے مخاطب! تو ان سب کو اکٹھا سمجھتا ہے
وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝١٤ ۚ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ
حالانکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے ۝ ان کا حال اُن لوگوں کے حال کی طرح ہے جو

مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٥﴾

ان سے پہلے گزرے قریب زمانے میں ہی، مزہ چکھا انہوں نے اپنے اَمر کے وبال کا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ⑮

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ ۖ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ

(ان منافقین کا حال) شیطان جیسا ہے جب وہ انسان کو کہتا ہے کہ تُو کُفر کر، جب وہ کُفر کرلیتا ہے تو یہ کہتا ہے

إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي

کہ میرا تیرے سے کوئی تعلق نہیں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو رَبّ العالمین ہے ⑯ پھر ان دونوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی

النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿١٧﴾

جہنم میں ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے وہ اس میں، ظالمین کا بدلہ یہی ہے ⑰

تفسیر

یہودیوں سے منافقین کے جھوٹے وعدے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا: اب آگے آ گیا وہ منافقین کا کردار، جس کی تفصیل آپ کی خدمت میں پہلے عرض کر دی گئی، ''آپ نے دیکھا نہیں؟ ان لوگوں کی طرف جنہوں نے نفاق اختیار کیا'' جو دوغلے ہیں، اندر سے بے ایمان، يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: کہتے ہیں اپنے ان بھائیوں کو جنہوں نے کُفر کیا اہلِ کتاب میں سے، ان کو بھائیوں کے عنوان سے ذکر کیا گویا کہ دلی ہمدردی اِن کی اُنہی کے ساتھ ہی ہے، ''کہا انہوں نے اپنے ان بھائیوں کو جو کافر ہیں اہلِ کتاب میں سے'' لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ: اگر تم نکالے گئے لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ: البتہ ضرور نکلیں گے ہم تمہارے ساتھ، وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا: اور نہیں اطاعت کریں گے ہم تمہارے بارے میں کسی کی کبھی بھی، جیسے میں نے واقعہ ذکر کیا کہ انہوں نے کہا ہم کسی دباؤ میں نہیں آئیں گے، کہ کوئی ہم پر اثر ڈالنا چاہے کہ تم اِن سے تعلقات چھوڑ دو، ان کی مدد نہ کرو، تو ہم کسی کی نہیں مانیں گے، اس لیے تم ڈٹ جاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں، ''نہیں اطاعت کریں گے ہم تمہارے بارے میں کسی کی کبھی بھی'' وَاِنْ قُوْتِلْتُمْ: اور اگر تم لڑائی لڑے گئے لَنَنْصُرَنَّكُمْ: تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے، یہ دیکھو! کس طرح سے تاکیدی صیغے استعمال کیے ہیں، لام تاکید بانونِ ثقیلہ، ''ضرور نکلیں گے ہم، اور ضرور مدد کریں گے تمہاری۔'' تو اُتنی قوت کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے شہادت دی کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اللہ گواہی دیتا ہے اس بات کی کہ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔

منافقین کی بزدلی اوران کا اندرونی اِنتشار

لَئِنْ اُخْرِجُوْا: اگر وہ یہودی نکال دیے گئے لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ: تو یہ ان کے ساتھ نکلیں گے نہیں، وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا: اور اگر وہ لڑائی لڑے گئے، لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ: تو یہ اُن کی مدد نہیں کریں گے، وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ: اور اگر بالفرض! اُن کی مدد کریں بھی، لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ: تو پھر یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ: پھر یہ مدد نہیں دیے جائیں گے، اوّل تو آئیں گے نہیں، اور اگر آئیں گے بھی تو اُن سے بڑھ کر یہ بزدل ہیں، کچھ نہیں کر سکتے، لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ: تم زیادہ سخت ہوازروئے خوف کے اِن کے دلوں میں بمقابلہ اللہ کے، اِن کو اللہ سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا تم سے لگتا ہے، کیونکہ اللہ تو ان کی نظروں کے سامنے نہیں، آخرت کا عذاب اِن کے سامنے نہیں، دُنیوی نقصان پہنچے گا تمہارے ہاتھوں، اس لیے تم سے زیادہ ڈرتے ہیں، اگر اللہ سے ڈرتے تو خلوت میں بھی اللہ کے اَحکام کی رعایت رکھتے، تمہارا ڈنڈا ان کے سر کے زیادہ قریب ہے بمقابلہ اللہ کے، اس لیے تمہارے مقابلے میں نہیں آسکتے؛ ''البتہ تم زیادہ سخت ہوازروئے خوف اِن کے دِلوں میں بمقابلہ اللہ کے''؛ ''اور یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ سمجھ دار نہیں'' اگر ان کو دِین کی سمجھ ہوتی تو یہ اللہ سے ڈرتے اور اللہ کے اَحکام کی مخالفت نہ کرتے، اللہ کو راضی کرلیا جائے تو اللہ کے بندے کیا کر سکتے ہیں، کچھ بھی نہیں، اللہ کو تو کریں ناراض، اور بندوں کے ساتھ جوڑ لگا کے کہیں کہ ہم اس سے کوئی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، یہ تو بے سمجھی کی بات ہے؛ ''یہ اس سبب سے ہے کہ وہ سمجھ دار لوگ نہیں۔'' لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا: یہ سارے کے سارے اکٹھے ہو کر بھی تم سے نہیں لڑیں گے، نہیں لڑیں گے یہ تم سے سارے کے سارے اکٹھے ہو کر، اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ: مگر محفوظ بستیوں میں، یعنی اگر کبھی گڑبڑ ہو بھی جائے تو یہ اپنا دفاع کریں گے، بستیوں میں، قلعوں کے اندر گھس جائیں، دیوار کے پیچھے سے کچھ دفاع کرلیں، اس سے بڑھ کر ان کی جرأت نہیں ہے کہ کھل کر مقابلے میں آجائیں۔ قُرًى قریہ کی جمع ہے، مُحَصَّنَة: قلعہ بند، محفوظ بستیاں۔ ''مگر محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کے پیچھے سے'' جُدُر: جدار کی جمع، اور دیواروں کے پیچھے سے لڑنا، قلعوں کے اندر محصور ہو کر لڑنا یہ دفاع کہلاتا ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ ہوگا کہ یہ تھوڑا بہت اپنا دفاع کرلیں گے، باقی! مقابلے میں کھل کر میدان میں نہیں آسکتے، بَاْسُهُمْ بَیْنَهُمْ شَدِیْدٌ: ان کی آپس میں لڑائی سخت ہوتی ہے، جب آپس میں لڑیں تو ان کی لڑائی سخت ہوتی ہے، لیکن تمہارے مقابلے میں سب بزدل ہیں۔ اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ کا معنی ہوجائے گا ''نہیں لڑیں گے تم سے سارے کے سارے اکٹھے ہو کر'' اِلَّا كَائِنِیْنَ فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ'' مگر اس حال میں کہ وہ محفوظ بستیوں میں ہوں، یا دیواروں کے پیچھے سے، اِن کی لڑائی آپس میں سخت ہے۔ ''اے مخاطب! تو ان سب کو اکٹھا سمجھتا ہے'' کہ ان کا آپس میں جوڑ ہے، وَقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى: حالانکہ ان کے دِل جدا جدا ہیں، یعنی بظاہر ان کا جو اِسلام دشمنی کے اُوپر آپس میں اتحاد ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کے قلوب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہیں، اور خود غرض طبقے میں ہمیشہ یہی بات ہوا کرتی ہے، کہ اگر کسی مشترکہ مقصد کے لئے اکٹھے ہو بھی جائیں تو ہر ایک تاک میں ہوتا ہے کہ میں فائدہ کس طریقے سے اُٹھاؤں، قلوب میں اختلاف ہوتا ہے، یہی چیز ان کے لئے اِنتشار کا باعث ہوجاتی ہے، جیسے ''قومی اتحاد''(۱) کا نقشہ پچھلے دِنوں

(۱) ''پاکستان قومی اتحاد'' ۱۹۷۷ء میں بھٹو کے خلاف تشکیل دیا گیا تھا جس میں نو جماعتیں شامل تھیں۔

میں آپ نے دیکھا، کہ اَغراض مختلف ہونے کی بنا پر شیرازہ کس طرح سے جلدی سے بکھر گیا، ہر کوئی موقع تاڑتا ہے کہ میں فائدہ کس طرح سے زیادہ سے زیادہ اُٹھالوں، جس کے نتیجے میں پھر اِنتشار ہوجاتا ہے۔ تو اِن کے قلوب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہیں، تو ان کو بظاہر دیکھتا ہے کہ یہ اکٹھے ہیں۔ ''اور یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے'' عقل مند کا کام ہوتا ہے کہ اَغراض کو پس پشت ڈالتے ہیں، دینی، قومی ضرورت کو مقدم رکھا کرتے ہیں، یہ بے عقلی ہے کہ اپنی اپنی اَغراض کے پیچھے لوگ لگ جاتے ہیں، تو پھر قومی نقصان بھی کر بیٹھتے ہیں، دینی نقصان بھی کر بیٹھتے ہیں۔ ''یہ اس سبب سے ہے کہ یہ عقل نہیں رکھتے۔''

یہود اور منافقین کی ایک ایک مثال

اب آگے ان کا حال مثال سے واضح کیا جارہا ہے، ایک مثال یہود کی ہے اور ایک مثال منافقین کی ہے، ''اِن کا حال اُن لوگوں کے حال کی طرح ہے جو اِن سے پہلے گزرے قریب زمانے میں ہی'' یہ بنوقینقاع کی طرف اشارہ ہے، ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ: انہوں نے اپنے اَمر کا وَبال چکھا، مزہ چکھا اُنہوں نے اپنے اَمر کے وَبال کا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ''اور ان منافقین کی مثال شیطان جیسی ہے، جب کہتا ہے وہ انسان کو کہ تُو کفر کر!'' مشورہ دیتا ہے، دِل میں وسوسہ ڈالتا ہے، فَلَمَّا كَفَرَ: جب انسان کُفر میں مبتلا ہوجاتا ہے، قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ: پھر وہ شیطان کہتا ہے کہ میرا تیرے سے کوئی تعلق نہیں، اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ: مجھے تو رَبّ العالمین سے ڈرلگتا ہے! پھر وہ یوں کہہ کر قطع تعلق کر دیتا ہے، کُفر پر اُکساتا ہے، کُفر میں مبتلا کرنے کے بعد کہتا ہے کہ میرا تیرا کیا تعلق؟ جیسے بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اسی قسم کا کردار ظاہر کیا کہ جب مشرکین چڑھ کے آرہے تھے تو شیطان آیا، آکر اس نے مشرکین کو بہکایا کہ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ: آج تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں، اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ: میں بھی تمہارا معاون ہوں، مددگار ہوں، اس طرح سے بہکایا، لیکن جس وقت میدان کا نقشہ دیکھا کہ مسلمان قوت پکڑ گئے ہیں اور مشرکین پٹ رہے ہیں، تو پھر وہ وہاں سے بھاگا یہ کہتا ہوا کہ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ: میں ایسی چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آرہیں۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ (سورۂ انفال: ۴۹) مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، تو اس لیے میں تو جاتا ہوں۔ تو یہ شیطانوں کا کام ہوتا ہے ہمیشہ، شیطان فطرت انسان بھی یوں ہی کیا کرتے ہیں، پہلے آپ کو بہکائیں گے، بہکاتے وقت بڑے سبز باغ دِکھائیں گے، لیکن جب آپ اُن کے مشورے پر چل کر کوئی کام بگاڑ بیٹھیں گے، پھر شکل نہیں دِکھاتے، پھر آپ کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائیں گے، تو اُکسانے والوں اور بہکانے والوں کا ہمیشہ کردار ایسے ہی ہوا کرتا ہے، ''اِن منافقین کا حال اُس شیطان جیسا ہے جو انسان کو کہتا ہے کہ تُو کفر کر!'' وسوسہ ڈالتا ہے، برانگیختہ کرتا ہے، ''جب وہ کُفر کر لیتا ہے تو یہ کہتا ہے: میرا تیرے سے کوئی تعلق نہیں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو رَبّ العالمین ہے!'' فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ: پھر ان دونوں کا انجام یہی ہوتا ہے کہ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ خَالِدَیْنِ فِیْهَا: پھر اس طرح سے لاتعلق ہونے کے بعد بھی بچ نہیں سکتے پھر دونوں ہی جہنم میں جاتے ہیں، ''اُن کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی جہنم میں ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے وہ اُس میں'' وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ: ظالمین کا بدلہ یہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، خیال کرے ہر نفس جو اس نے کل کے لیے آگے بھیجا، اور اللہ سے ڈرو

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ

بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿١٨﴾ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا لیا،

فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١٩﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے نفسوں سے غافل کردیا، یہی لوگ نافرمان ہیں ﴿١٩﴾ جہنم والے اور جنت والے برابر نہیں

الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿٢٠﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ

جنت والے کامیاب ہیں ﴿٢٠﴾ اگر اُتارتے ہم اِس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو دیکھتا تُو اس کو

خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ

دبنے والا، پھٹنے والا اللہ کے خوف سے، اور یہ مثالیں ہیں، بیان کرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کے لئے

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ

تاکہ وہ غور کریں ﴿٢١﴾ اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی، غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے،

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ

وہ رحمٰن ورحیم ہے ﴿٢٢﴾ وہی اللہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، بادشاہ ہے، پاک ہے، سلامتی ہی سلامتی ہے،

الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾

امن دینے والا ہے، حفاظت کرنے والا ہے، زبردست ہے، سنبھالنے والا ہے، بڑائی والا ہے، پاک ہے وہ ان باتوں سے جو مشرکین بیان کرتے ہیں ﴿٢٣﴾

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ

وہ اللہ پیدا کرنے والا ہے، نکال کھڑا کرنے والا ہے، صورت بنانے والا ہے، اسی کے لئے اچھے اچھے نام ہیں، پاکی بیان کرتی ہیں

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٤﴾

اس کے لئے وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست، حکمت والا ہے ﴿٢٤﴾

تفسیر

مؤمنین کو یہود و منافقین کی روش سے بچنے کی تاکید

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، ''خیال رکھے ہر نفس جو اس نے کل کے لئے آگے بھیجا، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے'' منافقین کی طرح اور یہود کی طرح خود غرضی میں مبتلا ہو کر اللہ کے اَحکام کی مخالفت نہ کرو، اللہ کے اَحکام کی پابندی کرو، اور ہمیشہ اس چیز کو مستحضر رکھا کرو کہ قیامت آنی ہے، اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، ہر وقت دیکھتے رہا کرو کہ تم آگے کل کے لئے کیا بھیج رہے ہو، کل سے مراد قیامت ہے، اور اس کو ''غد'' کے ساتھ تعبیر کیا، یوں سمجھو کہ اگلا دِن قیامت کا ہی ہے، اس کے قریب ہونے کی طرف اور اس کے یقینی ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے، بھائی! قیامت دُور نہیں ہے، ''مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ'' جس کی موت آ گئی اُس کی قیامت تو آ گئی، اور موت ہر وقت سر پہ کھڑی ہے، خاص طور پر آج کل تو بے فکر ہونے کی بات ہے ہی نہیں، اتنی جلدی انسان چلتا ہے اور اتنی کثرت کے ساتھ موت واقع ہونے لگ گئی، جسے ''موتِ فُجاءۃ'' کہتے ہیں، اچانک موت، جس کو کہتے ہیں کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا، دِل فیل ہو گیا، یہ مشین کھڑی ہو گئی، ایک ہی لمحے کے اندر......! اچھا بھلا آدمی دُکان سے اُٹھ کر جاتا ہے، گھر جاتا ہے، چار پائی پہ لیٹا اور گیا، تو اس لیے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کل ہی یہ واقعہ پیش آنے والا ہے، بلکہ کل سے بھی پہلے، ہر وقت انسان یہی سمجھے، جو مر گیا اس کی قیامت تو آ گئی، اس لیے ہمیشہ سوچتے رہا کرو کہ تم کل کے لئے آگے کیا بھیج رہے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سے تمہارا کوئی عمل مخفی نہیں ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ: اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا لیا، یہ یہود اور منافقین جس طرح سے اللہ کو بھولے ہوئے ہیں، اللہ کے اَحکام کو یاد نہیں رکھتے، فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے نفسوں سے غافل کر دیا، یہ ایک بہت بڑی نکتے کی بات ہے، اللہ کو بھولنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے، اپنے خیر و شر میں امتیاز نہیں کر سکتا کہ میرے لیے بھلی چیز کون سی ہے اور میرے لیے بُری چیز کون سی ہے، اپنے آپ کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو یاد رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے نفع کا راستہ اختیار کرو، فائدے کی چیز اِختیار کرو، اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرو، لیکن اللہ کو بھلانے کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھتا ہے، خیر اور شر کا اِمتیاز ہی اُٹھ جاتا ہے، پھر انسان کو یہ یاد ہی نہیں ہوتا کہ میں اپنے آپ کو اچھائی کی طرف لے جا رہا ہوں یا بُرائی کی طرف لے جا رہا ہوں، کامیابی کی طرف لے جا رہا ہوں یا خسارے کی طرف لے جا رہا ہوں، اس طرح سے انسان اپنے سے غافل ہو جاتا ہے، اس کے سامنے صرف اس کی شہوات رہ جاتی ہیں، اس کی اپنی غرضیں رہ جاتی ہیں، یوں سمجھو وہ زہر کھاتا ہے لیکن اس کو وقتی طور پر میٹھی محسوس کرتا ہوا لذّت لیتا ہے، جو آدمی حلوے کی شکل میں زہر کھائے تو ہم یوں ہی کہیں گے کہ اپنا دُشمن خود ہے، کہ وقتی لذّت کو اس نے دیکھا ہے لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اندر جانے کے بعد یہ کس طرح سے آنتڑیوں کو کاٹے گی اور کس طرح سے انسان کی جان ختم کر کے رکھ دے گی، تو اللہ سے غافل ہونے کے نتیجے میں انسان اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے، اگر تم اپنے آپ کو بھلائی کی طرف لے جانا چاہتے ہو، اپنا فائدہ کرنا چاہتے ہو تو اس کا اصل طریقہ یہی ہے کہ اللہ کو یاد کرو، اللہ کے اَحکام کو یاد

رکھو۔''ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی جانیں بھلا دیں'' اپنے آپ سے اُن کو غافل کر دیا، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: یہی لوگ نافرمان ہیں، فسق وفجور آخر اُن لوگوں کی قسمت ہے جو اللہ کو یاد نہیں رکھتے، اور آپ جانتے ہیں کہ فسق وفجور دُنیا اور آخرت میں کبھی بھی کوئی اچھائی سامنے نہیں لاتا، اس کے نتیجے میں بربادی ہی بربادی ہوتی ہے، دُنیا بھی برباد آخرت بھی برباد۔ لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: جہنم والے اور جنت والے برابر نہیں، اِن میں اتنا فرق نہیں ہے جس کو تم آسانی سے نظر انداز کر جاؤ، یہ سمجھو کہ معمولی فرق ہے، کوئی بات نہیں، جنت میں چلے گئے تو کیا ہوا، جہنم میں چلے گئے تو کیا ہوا، یہ ایسی نظرانداز کرنے کی بات نہیں ہے، دونوں برابر نہیں ہیں جہنم والے اور جنت والے، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ: جنت والے کامیاب ہیں، فوز اور کامیابی اُنہی کو ملے گی، فلاح انہی کو ملے گی، اور دُوسرے ہر طرح سے ناکام ہوں گے، اور تفصیل آپ کے سامنے آ ہی چکی کہ جنتیوں کے لئے فوز وفلاح کس قسم کا ہے، اور جہنمیوں کے لئے عذاب کس قسم کا ہے، دونوں برابر نہیں، آنکھیں کھول کر دیکھو اور پھر سوچو کہ تمہیں کس گروہ کے اندر شامل ہونا چاہیے، اِن کا نتیجہ ایک جیسا نہیں ہے۔

اِنسان کا دِل متأثر کیوں نہیں ہوتا؟

آگے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے اور منافقین کے لئے تنبیہ ہے کہ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی، یہ قرآن اُتارا، اور یہ اتنا پُرتاثیر ہے کہ اگر یہ پہاڑ پر بھی اُتار دیا جاتا تو وہ بھی اس کے سامنے دَب جاتا، انسان کا دِل جب پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوجاتا ہے تو پھر اس قسم کی نصیحتوں سے بھی متأثر نہیں ہوتا۔ جیسے کہ یہ مثال آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں آئی تھی، کہ انسان کے قلب پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوجاتے ہیں، یہ صرف اَغراض پرستی اور شہوت پرستی کے نتیجے میں انسان کے قلب سے تأثر ختم ہوتا ہے، اور اگر یہ نصائح، یہ امانت، یہ قرآنِ کریم پہاڑ پر اُتارا جاتا، اس میں پھر عقل وفہم ہوتی، اور یہ شہوات اور اس قسم کے جذبات اور خودغرضیاں نہ ہوں، تو پہاڑ بھی اس سے متأثر ہوتے، لیکن اِنسان کے اَغراض، خودغرضی، شہوت پرستی کے نتیجے میں قلب ایسا سیاہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلام کا وہ کوئی عکس قبول نہیں کرتا۔''اگر اُتارتے ہم اِس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو دیکھتا تُو اُس کو دَبنے والا، پھٹنے والا اللہ کے خوف سے، اور یہ مثالیں ہیں، بیان کرتے ہیں ہم اِن کو لوگوں کے لئے تاکہ وہ فکر کریں، تاکہ وہ سوچیں، غور کریں۔''

اَسمائے اِلٰہیہ کا ذِکر

آگے اسمائے اِلٰہیہ کا ذکر ہے، جو ایمان کے لئے منشا بنتے ہیں، ''اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی، غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے'' غیب سے مراد ہیں وہ چیزیں جو عام انسان سے مخفی ہیں، اللہ کے سامنے کوئی چیز غیب نہیں، غیب وشہادت کی تقسیم ہمارے اعتبار سے ہے، ''جاننے والا ہے غیب وشہادت کا، وہ رحمٰن ورحیم ہے، وہی اللہ ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، بادشاہ ہے'' اَلْقُدُّوْسُ: پاک، صاف ستھرا، اَلسَّلٰمُ: سلامتی ہی سلامتی، یعنی اگر کسی کو سلامتی مل سکتی ہے تو اللہ کے ہاں سے مل سکتی ہے، وہ سلام ہے، جسے آپ مجسم سلامتی کہہ سکتے ہیں، اَلْمُؤْمِنُ: امن دینے والا ہے، خطروں سے بچانے والا ہے، اَلْمُهَیْمِنُ: حفاظت کرنے والا ہے، اَلْعَزِیْزُ: زبردست ہے، اَلْجَبَّارُ: سنبھالنے والا ہے، کنٹرول کرنے والا ہے، سب کے اُوپر وہ حاوی ہے، اَلْمُتَكَبِّرُ: بڑائی والا ہے،

کبریائی اُسے ہی حاصل ہے، کبریائی اصل کے اعتبار سے اسے حاصل ہوتی ہے جس میں کسی قسم کا کوئی احتیاج نہ ہو، تو انسان کے لئے تکبّر اسی لیے بُرا ہے کہ یہ سراسر جھوٹ ہے جب انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے جو سراپا محتاج ہے اپنے وجود میں اور اپنی ہر چیز میں، اللہ کے بھی محتاج، اور مخلوق بھی ایک دُوسرے کی محتاج، تو اِن کے لئے بڑائی بھلا کہاں زیب دیتی ہے! بڑائی اسے ہی زیب دیتی ہے کہ جس کے اندر کوئی کسی قسم کا احتیاج موجود نہیں، ''پاک ہے وہ اُن باتوں سے جو مشرکین بیان کرتے ہیں، یا، جن کو مشرکین شریک ٹھہراتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ بلند و بالاتر ہے، پاک ہے'' اُن کی نسبت اللہ کی طرف کرنا یہ عیب ہے، ''پاک ہے اللہ تعالیٰ ان باتوں سے جو مشرکین بیان کرتے ہیں۔'' ''وہ اللہ پیدا کرنے والا ہے'' خالق، باریٔ، مصوّر، یہ تین لفظ آرہے ہیں، خالق کا معنی بھی پیدا کرنے والا، اور باریٔ بھی پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں، مصوّر: تصویر بنانے والا۔ اصل میں یہ خلق کے درجات ہیں، اصل چیز کو پیدا کرنا، پھر اس کو دُوسری ہیئت پر لانا، پھر اس کی صورت بنانا، جس طرح سے ایک لوہا ہے، لوہے سے پرزے تیار ہوتے ہیں، پھر پرزوں کو جوڑ کر انجن تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح سے ہر چیز کا خالق یعنی اصل ابتدائی حالت کے اعتبار سے بھی اللہ، اور پھر اس کے جو اعضا بنائے جاتے ہیں ان کو بنانے والا بھی اللہ، اور پھر ان کی نوک پلک سنوارنا اور اس کی صورت بنانا یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے، ''وہی پیدا کرنے والا ہے، وہی نکال کھڑا کرنے والا ہے، وہی صورت بنانے والا ہے، اسی کے لئے اچھے اچھے نام ہیں'' اچھی اچھی صفات اسی کے لئے ہیں۔ ''پاکی بیان کرتی ہیں اس کے لئے وہ سب چیزیں جو آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست، حکمت والا ہے۔''

آخری تین آیات کی فضیلت

یہ سورۂ حشر کی جو آخری تین آیتیں ہیں ھُوَاللهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ سے لے کر اِختتام تک، ان کی بھی فضیلت حدیث شریف میں ذکر کی گئی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی شخص تین دفعہ یہ پڑھے ''اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ '' (وہاں یہی کلمات ہیں، اور ذِکر اَذکار میں جو کلمات آئے ہوئے ہوں اُنہی کی پابندی کرنی چاہیے) ''اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ '' اس کو تین دفعہ پڑھو، تین دفعہ پڑھنے کے بعد پھر یہ تین آیتیں، جو شخص اس کو صبح پڑھے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دُعا کرتے ہیں، اور اگر وہ اسی دن مرجائے تو مغفور مرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتے ہیں، اور شام کو اگر کوئی پڑھے تو صبح تک یہی فضیلت ہے۔[1] اس لیے صبح شام کے وظائف میں ان آیات کو شامل کر لینا چاہیے، اور پڑھنے کا طریقہ یہی ہے کہ پہلے تین دفعہ پڑھا جائے ''اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ '' ھُوَاللهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ، اس طرح سے آیات کے اختتام تک۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(١) ترمذی ٢/ ١٢٠ / مشکوٰۃ ١/ ١٨٨، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی کا تقریباً آخر۔ ولفظ الحدیث: وَاِنْ مَاتَ فِیْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مَاتَ شَهِيْدًا.

آیاتھا ۱۳ ۶۰ سُوْرَۃُ الْمُمْتَحِنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۱ رکوعاتھا ۲

سورۂ ممتحنہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیرہ آیتیں ہیں اور دو رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ

اے ایمان والو! میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف ڈالتے ہو

بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِیَّاكُمْ اَنْ

محبت حالانکہ انہوں نے کُفر کیا اس حق کا جو تمہارے پاس آگیا، نکالتے ہیں رسول کو اور تمہیں اس سبب سے کہ

تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ ۖۗ

تم اللہ پر ایمان لے آئے جو تمہارا ربّ ہے، اگر نکلے ہو تم میرے راستے میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا چاہنے کے لیے

تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖۗ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَیْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ مَنْ

تم خفیہ خفیہ ان تک محبت کے پیغام پہنچاتے ہو، میں خوب جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو

یَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ① اِنْ یَّثْقَفُوْكُمْ یَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ

تم میں سے ایسا کام کرے گا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ۞ اگر وہ تم پر قابو پالیں تو وہ تمہارے دشمن ہوں گے اور

یَبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ② ؕ لَنْ

پھیلائیں گے تمہاری طرف اپنے ہاتھوں کو اور اپنی زبانوں کو بُرائی کے ساتھ، اور وہ چاہیں گے کہ تم کافر ہو جاؤ ۞ ہرگز نہیں

تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۚۛ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚۛ یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ

نفع دیں گی تمہیں تمہاری رشتہ داریاں اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا، اللہ تعالیٰ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ③ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ

تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ۞ تحقیق تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم علیہ السلام اور ان لوگوں میں جو ابراہیم کے ساتھ تھے

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ٛ
جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم سے بے شک ہم لاتعلق ہیں تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم اللہ کے علاوہ پُوجا کرتے ہو،
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ
ہم نے اِنکار کیا تمہارا، اور ظاہر ہوگئی ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لئے، جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ،
اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ
ہاں ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات اپنے باپ کے لئے کہ میں استغفار کروں گا تیرے لیے اور میں نہیں اختیار رکھتا تیرے لیے اللہ کی طرف سے
شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ رَبَّنَا
کسی شئے کا، اے ہمارے رَبّ! ہم نے تیرے پر بھروسا کیا اور تیری طرف ہی رُجوع کیا، اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے ۝ اے ہمارے رَبّ!
لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝
ہمیں کافروں کے لئے تختۂ مشق نہ بنا، اور ہمیں بخش دے اے ہمارے پروردگار! بے شک تو زبردست، حکمت والا ہے ۝
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ
البتہ تحقیق تمہارے لیے اِن میں بہترین نمونہ ہے یعنی اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کی اُمید رکھتا ہو، اور جو کوئی شخص
يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝
(اللہ کے حکم سے) منہ پھیرے گا پس بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور تعریف کیا ہوا ہے ۝

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ ممتحنہ، یہاں لکھا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی لیکن یہ ''مدنی'' ہے ''مکی'' نہیں، یقینی طور پر یہ ''مدنی'' ہے، اس کی تیرہ آیتیں ہیں، اور اس میں دو رکوع ہیں۔

شانِ نزول

اِس سورت کی اِبتدائی آیات کا تعلق ایک واقعے سے ہے۔ ''بخاری شریف'' میں متعدّد مقام پر وہ روایت ذکر کی گئی ہے، سورۂ فتح میں آپ سُن چکے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکینِ مکہ کے ساتھ ایک معاہدۂ صلح ہوگیا تھا، جس کو ''صلح حدیبیہ'' کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، اُس میں جو دفعات رکھی گئی تھیں ان میں سے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ دس سال تک فریقین آپس میں جنگ نہیں کریں گے،

لیکن دو سال نہیں گزرنے پائے کہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی، تو سرورِ کائنات ﷺ نے ارادہ فرمالیا کہ مکہ کے اُوپر حملہ کیا جائے، اور ایسے طور پر کیا جائے کہ یہ کارروائی مشرکوں سے مخفی رہے، اچانک ہم وہاں پہنچ جائیں، مقصد یہ تھا کہ خون ریزی نہ ہو، زیادہ مقابلہ نہ ہو، اور شہر فتح ہو جائے، اگر اُن کو پہلے ہی اطلاع ہوگئی کہ ہم آرہے ہیں تو وہ بھی اپنے دفاع کی پوری تیاری کرلیں گے، اور لڑائی زیادہ ہوگی، حرم کے اندر خون ریزی ہوگی۔ معاہدے کی پابندی رہی نہیں تھی، کیونکہ اس کی خلاف ورزی مشرکینِ مکہ کی طرف سے ہوگئی تھی، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ فتح میں ذکر کی جاچکی۔ آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری شروع کردی، ایک صحابی ہیں حاطب بن ابی بلتعہ، مہاجرین میں سے ہیں، السابقین الاوّلین میں سے ہیں، مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آئے، اصل کے اعتبار سے یہ یمنی ہیں، لیکن یمن کو چھوڑ کر یہ مکہ معظمہ میں قریش کے حلیف ہوگئے تھے، اہل وعیال ان کے وہیں تھے، اور یہ خود مدینہ منورہ میں آگئے تھے، بدری ہیں، بدر میں بھی انہوں نے شرکت کی۔ اِن کے دِل میں ایک خیال آیا کہ مکہ معظمہ سے جتنے لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں ان کے اہل وعیال وہاں موجود ہیں، تو دُوسرے رشتہ دار، تعلق والے، قبیلے والے لوگ بھی ہیں، تو وہ لوگ اپنی رشتہ داری کی بنا پر ان کے اہل وعیال کا کچھ نہ کچھ خیال رکھتے ہوں گے، اِن کے بال بچے پیچھے زیادہ پریشان نہیں ہوں گے، چونکہ باقی قبیلہ رشتے داروں کا ہے، تو اُن کا خیال رکھتے ہوں گے، میرے بیوی بچے وہاں بے سہارا ہیں، کیونکہ میری کوئی رشتہ داری تو وہاں تھی نہیں، میں ان کو چھوڑ کر آگیا، تو وہ لوگ میرے بچوں کا خیال نہیں کرتے ہوں گے، تو اگر میں قریش پر کوئی اِحسان کردوں تو اس احسان کے نتیجے میں وہ میرے بیوی بچوں کا خیال کریں گے، دِل میں خیال آگیا، آخر اِنسان ہے، ہر قسم کے خیالات دِل میں آتے ہیں، تو اس کا طریقہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوچا کہ میں قریش کو اطلاع دے دُوں کہ عنقریب تم پر حملہ ہونے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے چونکہ فتح کا وعدہ کیا ہوا ہے، فتح تو یقیناً ہوگی، اس لیے ان کو اطلاع ہوجائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ایک بات دِل میں آگئی وسوسے کے طور پر۔ اتفاق سے ایک عورت مکہ معظمہ جارہی تھی، تو حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے رُقعہ لکھا، جس کے اندر یہی حضور ﷺ کے جہاد کی تیاری کی اطلاع دی، اور اس عورت کو دے دیا کہ یہ چھپالے اور وہاں جاکر قریش کو پہنچادینا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک جنگی راز تھا جس کا اِفشا ہو رہا ہے، اور اگر یہ اطلاع اہلِ مکہ کو ہوجاتی تو جتنی مصلحت سرورِ کائنات ﷺ نے سوچی تھی کہ حرم میں خون ریزی نہ ہو، مقابلہ نہ ہو اور جانی نقصان نہ ہو، اور یہ مرکز قبضے میں آجائے، وہ ساری کی ساری مصلحت خراب ہوجاتی، اور جنگی راز کا کسی دُوسری جگہ پہنچادینا دنیا میں ہمیشہ اِس کو ایک ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے، کہ کوئی شخص اس قسم کی جاسوسی کردے جس کا تعلق ایک مُلک کی دُوسرے کے خلاف جنگی تیاریوں کے ساتھ ہے۔

وہ عورت رُقعہ لے کر روانہ ہوئی، سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہوگئی کہ یوں ایک رُقعہ مکہ معظمہ جارہا ہے، اور اس میں کوئی ایسی اطلاع ہے جو آئندہ جاکے نقصان پہنچائے گی۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بُلایا، اور ایک دو ان کے ساتھ اور ملائے، اور انہیں کہا کہ جلدی جلدی جاؤ گھوڑوں پہ سوار ہو کر، فلاں مقام میں ایک عورت ملے گی جس کے پاس رُقعہ ہے، وہ اس سے وصول کرنا ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور دو تین آدمیوں [1] کو متعین کیا، تو یہ حضرات اپنے گھوڑوں پر سوار

(۱) کل تین آدمی تھے: ۱۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، ۲۔ سیدنا زبیر، ۳۔ سیدنا مقداد۔ اور بعض روایات میں ابومرثد غنوی کا نام بھی ہے۔

ہو کر روانہ ہوئے، تو جس مقام کا تذکرہ حضور ﷺ نے کیا تھا کہ وہاں عورت تمہیں ملے گی، عین اسی مقام پر وہ عورت مل گئی، انہوں نے اس سے پوچھا کہ تیرے پاس کوئی خط ہے وہ نکال دے! اس نے انکار کر دیا کہ میرے پاس تو کوئی خط نہیں ہے! انہوں نے اس کے سامان کی تلاشی لی تو سامان میں سے بھی کوئی خط نہ نکلا، تو یہ حیران ہوئے، آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ حضور ﷺ ایک بات کہیں اور وہ نہ ہو، آپ ﷺ تو جو بات کہتے ہیں وہ ٹھیک ہوتی ہے، خط اس کے پاس یقیناً ہے، لیکن یہ بتاتی نہیں ہے۔ پھر اس عورت کو دھمکایا کہ یا تو خط نکال دے ورنہ ہم تیرے کپڑے اُتار کر تیری تلاشی لیں گے! جب اس عورت نے یہ محسوس کیا کہ یہ تو واقعی تلے ہوئے ہیں تو پھر اس نے وہ خط نکال کر دیا جو اس نے چادر کے بند میں جہاں چادر باندھی جاتی ہے تو یہاں اس نے چھپایا ہوا تھا، تو خط نکال کر دے دیا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے بالوں میں چھپایا ہوا تھا...... واقعات کے بیان کرنے میں اس قسم کا تھوڑا بہت فرق ہو جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ بالوں میں چھپایا ہوا ہو لیکن جب اس قسم کی گرفت اس کے اُوپر شروع ہوئی تو وہاں سے نکال کر اس نے چادر میں چھپانے کی کوشش کی ہو، یا پہلے چادر میں چھپایا ہوا ہو تو وہاں سے نکال کر بالوں میں چھپانے کی کوشش کی ہو، تو نسبت دونوں طرف ہی ہو سکتی ہے...... وہ خط اس نے نکالا اور نکال کر ان کے سپرد کر دیا، یہ خط لے کر مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے، جس وقت وہ خط کھول کر پڑھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے ہے، اور مشرکین مکہ کو یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ تم پہ حملہ ہونے والا ہے، تو سارے حیران ہوئے، جیسے میں نے عرض کیا کہ جنگی راز کا کسی دُوسری قوم تک پہنچانا اپنی محارب قوت تک، یہ تو بہت ناقابلِ معافی جرم ہوتا ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ سے پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو حاطب بن ابی بلتعہ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! آپ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کیجئے، اصل بات یہ ہے کہ میں جس طرح سے پہلے مسلمان تھا ویسے ہی مسلمان ہوں، میرے دِل میں کوئی نفاق نہیں، اور نہ مجھے کافروں کے ساتھ کوئی ہمدردی ہے، میرے دِل میں یوں خیال آیا کہ میرے اہل وعیال وہاں ہیں، میری رشتہ داری کوئی ہے نہیں، اُن کا کوئی خیال نہیں کرتا ہوگا، اور یہ جتنے مہاجرین آپ کے ساتھ آئے ہیں ان سب کے رشتہ دار وہاں موجود ہیں، اِن کے بیوی بچوں کا وہ خیال کرتے ہوں گے، تو میرے دِل میں یہ آیا کہ میں مشرکین پر ایک احسان کر دوں، فرق اس سے پڑے گا نہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح کا وعدہ ہو چکا ہے، اس لیے میں نے یہ غلطی کی ہے، یہ خط لکھا ہے، باقی! میرے دِل میں کوئی کُفر نہیں، کوئی کسی قسم کا نفاق نہیں۔ یہ حاطب بن ابی بلتعہؓ نے اپنی صفائی دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، آپ جانتے ہیں کہ ان کے اُوپر تو بغض فی اللہ کا غلبہ تھا، جب ان کے سامنے یہ بات ہوئی اُسی مجلس میں تو انہوں نے حضور ﷺ سے اجازت طلب کی کہ یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے، میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں! ''منافق'' کا لفظ استعمال کیا، یہاں ''منافق'' جو کہا جا رہا ہے وہ اسی عملی نفاق کے طور پر، کہ یہ کیا ہے کہ اُوپر اُوپر سے تو مسلمان ہیں، ہمارے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اندر اندر سے ہمدردی مشرکین کے ساتھ ہے، اپنے مزاج کے مطابق انہوں نے تشدّد کیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حاطب بن ابی بلتعہ بدری ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کی طرف توجہ فرمائی تھی اور کہہ دیا تھا کہ ''اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ. فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ!'' تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں معاف کر دیا! یہ مغفور ہے، اور جو کچھ یہ کہتا ہے کہ میں نے اس وسوسے کے تحت یہ خط لکھا ہے، یہ سچ کہتا ہے، اس میں کوئی کسی قسم کا نفاق

نہیں۔ حضور ﷺ نے صفائی دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا کہ اللہ ورسولہ اعلم! حقیقت حال کو اللہ اور اللہ کا رسول ہی جانتے ہیں، اس لیے ٹھیک ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا مطالبہ چھوڑ دیا۔[1] اور وہ شدت جو نمایاں کی تھی تو اسی لئے نمایاں کی تھی کہ یہ ایک بہت بڑا جرم ہے کہ اپنے اندر شامل ہوتے ہوئے ہمدردیاں غیر قوم کے ساتھ ہوں، اور اپنی محارب قوت کے ساتھ ہوں، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سخت لفظ بولا تھا کہ "مجھے اجازت دو، میں اس کی گردن اُڑا دوں!" حضور ﷺ نے صفائی دے دی اور حاطب رضی اللہ عنہ کا عذر قبول کر لیا۔

سورت کے مضامین ایک نظر میں

ایسے موقع پر یہ آیات آئیں، جس میں یہ نصیحت کی گئی کہ کافروں کے ساتھ، مشرکوں کے ساتھ تعلق نہ رکھو، ان کے ساتھ ہمدردی کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، اُلٹا نقصان ہوگا، وہ لوگ نہ تمہارے ہمدرد ہیں دینی اعتبار سے، نہ تمہارے ہمدرد ہیں دُنیوی اعتبار سے، اپنے بیوی بچوں کی محبت میں آ کر اگر ایسی کوئی حرکت کرو گے تو یاد رکھو! بیوی بچے بھی کوئی آخرت میں کام آنے کی چیز نہیں ہیں۔ پھر نمونہ یاد دلایا کہ تمہارے لیے بہترین نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں ہے کہ جب انہوں نے اللہ کا نام لیا اور ایمان قبول کر لیا تو اپنی ساری قوم سے لاتعلق ہو گئے، ہاں! اتنی سی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے ساتھ تعلق کی کی تھی کہ میں تیرے لیے اِستغفار کروں گا، اگرچہ میں اللہ کی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتا کہ میں تیرے دِل میں ایمان ڈال دُوں یا اللہ کی گرفت سے تجھے بچا لوں، اللہ عذاب دینا چاہے میں بچا لوں، یہ میرے اختیار میں کچھ نہیں، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کی تھی، لیکن اُس کا بھی جب پتا چلا، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ (سورۂ توبہ: ۱۱۴) جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین آ گیا کہ اِس کی قسمت میں ایمان نہیں ہے، یہ کفر پر ہی مر رہا ہے، تو لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے جس طرح سے اپنی قوم سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا تمہیں بھی ایسے ہی کرنا چاہیے، باقی! یہ لوگ جن کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے حالات پیدا کر دے گا کہ تمہاری آپس میں محبت ہو جائے گی، حالات سازگار ہو جائیں گے، چنانچہ مکہ فتح ہوتے ہی سب لوگوں کے ساتھ تعلقات ٹھیک ہو گئے۔

اِبتدائی آیات کا تعلق تو اس واقعے سے ہے، اور اس سے پیچھے جو آیات آ رہی ہیں ان کا تعلق ہے مسلمان عورتوں کے متعلق کچھ اَحکام سے۔ حدیبیہ میں جو صلح ہوئی تھی اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی جس کا ذکر آپ کے سامنے پہلے ہوا کہ مشرکین نے یہ شرط رکھوائی تھی کہ جو کوئی مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ چلا جائے، چاہے وہ آپ کے دِین پر ہو، وہ واپس کرنا پڑے گا، اور اگر اہلِ مدینہ میں سے کوئی مکہ آ جائے چاہے وہ آپ کے دِین پر ہو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے، یہ دفعہ بھی اُس میں تھی، لیکن اس میں عورت اور مرد کی صراحت نہیں تھی، واقعہ یہ ہوا کہ صلح ہو جانے کے بعد کچھ عورتیں مکہ معظمہ سے بھاگ کر مدینہ منورہ آ گئیں اسلام قبول کر کے،

---

(۱) بخاری ۱/۴۲۲، باب الجاسوس۔ ۲/۵۶۷، باب فضل من شهد بدرا۔ ۲/۶۱۲، باب غزوۃ الفتح وما بعث حاطب۔ ۲/۷۲۶، کتاب التفسیر، سورۃ الممتحنۃ۔ وغیرہ۔

اب یہ مسئلہ پیش ہو گیا کہ اِن عورتوں کو بھی واپس کرنا چاہیے یا نہیں؟ دفعات کے اندر کوئی صراحت نہیں تھی کہ یہ دفعہ مردوں کو بھی شامل ہے اور عورتوں کو بھی شامل ہے، جب یہ تردّد پیدا ہوا اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع آ گئی کہ اب یہ مؤمن عورتیں مشرکوں کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں، اس لیے اِن کو واپس نہ لوٹاؤ، تو یہ صراحت کر دی گئی کہ وہ دفعہ مردوں کو شامل ہے عورتوں کو شامل نہیں ہے، ہاں! البتہ صلح کے طور پر یہ ساتھ کہا گیا کہ یہ عورتیں جو وہاں سے مسلمان ہو کر آئیں پہلے یہ پڑتال کر لیا کرو کہ واقعی ایمان کے جذبے کے تحت آئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ گھر میں اپنے خاوند سے تنگ ہوں، اپنے گھر میں ان کو کوئی تکلیف ہو تو محض جان بچانے کے لئے بھاگ آئیں، یا مزید کسی تعلقات کی خرابی کی بنا پر وہاں سے چھوڑ کر اِدھر کو آ گئیں، ذرا ان کا اِمتحان لے لیا کرو...... وہاں فَامْتَحِنُوْهُنَّ کا لفظ چونکہ آیا ہے تو وہیں سے سورت کا نام ''ممتحنہ'' اِختیار کیا گیا ہے...... اگر تمہاری آزمائش کے اندر وہ مؤمن ثابت ہوں تو پھر ان کو واپس نہ لوٹایا کرو، حقیقتِ حال اللہ جانتا ہے کہ ان کے دِل میں ایمان ہے یا نہیں، تم ظاہری طور پر ان کو ذرا پرکھ لیا کرو۔ تو پرکھنے کے لئے آگے وہ الفاظ آ گئے کہ ان الفاظ پر بیعت لیا کرو، جو عورت ان لفظوں پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو سمجھو کہ وہ مؤمن ہے۔ البتہ مصالحت کی رعایت رکھتے ہوئے یہ کہا گیا کہ جو عورت مکہ معظمہ سے اِدھر آ جائے ہجرت کر کے، اگر اس کا شوہر پیچھے موجود ہے اس شوہر نے جو اس کو مہر دیا ہے یا کوئی اور اس کو خرچ دیا ہوا ہے وہ تمہارے ذمے ہے کہ واپس کر دو، اِس عورت سے کوئی نکاح کرنا چاہے تو وہ شخص اس کا مہر واپس لوٹا دے اور نئے سرے سے اس کو اور مہر دو، اور اگر کوئی نکاح کرنے والا نہ ہو یا اس کے پاس پیسے لوٹانے کے لئے نہ ہوں تو بیت المال میں سے اس کو دیا جائے۔ اور اسی طرح سے تمہاری عورتیں جو اُدھر رہ گئیں آج سے ان سے بھی تعلقات ختم کر دو، پہلے صورت یہ تھی کہ مرد مؤمن ہے ہجرت کر کے آ گیا، اس کی بیوی مکہ معظمہ ہے، تو وہ سمجھتا تھا کہ میری بیوی ہے اور تعلقات قائم تھے، اب نصیحت کر دی گئی کہ کافر اور مشرک کا ازدواجی تعلق قائم نہیں ہو سکتا، لہٰذا تم اپنی اُن بیویوں سے بھی تعلقات کاٹ دو۔ یہاں بھی وہی بات کہی کہ تم مشرکوں سے مطالبہ کر لو کہ جو تم نے مہر وغیرہ دیا ہوا ہے مشرک وہ واپس کر دیں، اور اگر وہ واپس نہیں کرتے تو تم آپس میں اول بدل کر لیا کرو، جس کی بیوی اُدھر رہ گئی اس کو پیسے دے دے وہ شخص جو اُدھر سے آنے والی عورت کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے، یوں آپس میں حساب کر لو۔ یہ ہدایات دے دی گئیں، اور آخری آیت کے اندر جا کر پھر تاکید کر دی گئی کہ جو مغضوب لوگ ہیں، جن کے اُوپر اللہ کا غضب ہے، ان سے کوئی تعلق دوستی نہ رکھا کرو، یہ آخرت کے معاملات سے مایوس ہو چکے ہیں، یہ تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہیں۔ تو آخر میں جا کر پھر وہی نصیحت کر دی گئی جس کے ساتھ اس سورت کی اِبتدا ہوئی تھی، یہی مضمون اِس سورت میں ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ: عدو کا لفظ مفرد، جمع سب کے لئے بولا جاتا ہے، اس کی جمع اَعداء بھی آتی ہے، ویسے عدو بول کر بھی جمع مراد لی جا سکتی ہے بطورِ جنس کے، یہاں ترجمہ جمع کے ساتھ ہی کریں گے،

''میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ''، عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ یہ عنوان نفرت دلانے کے لئے اختیار کرلیا گیا، تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ تُلْقُوْنَ: اَلْقٰى يُلْقِيْ اِلْقَاء: ڈالنا، ''تم ان کی طرف ڈالتے ہو محبت'' اگر باء کو زائدہ کرلیا جائے، یا معنی ہے ''محبت کے سبب سے تم ان کی طرف پیغام پہنچاتے ہو، حالانکہ انہوں نے کفر کیا اس حق کا جو تمہارے پاس آگیا'' وہ تو اس حق کے منکر ہیں، یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ: نکالتے ہیں رسول کو، وَاِیَّاکُمْ: اور تمہیں، اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ: اس سبب سے کہ تم اللہ پر ایمان لے آئے جو تمہارا رَبّ ہے، اس سے زیادہ تمہارا کوئی قصور نہیں، صرف اس قصور کی بنا پر تمہیں نکالا، تو یہ ایسے بُرے لوگ ہیں کہ اللہ کا نام سننا گوارا نہیں کرتے، اور جو حق تمہارے پاس آیا اس کے منکر ہیں، تو ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی جنہوں نے اللہ کے رسول کو نکالا اور تمہیں گھروں سے نکالا، یہ بات آپس میں جچتی نہیں ہے، ''نکالتے ہیں وہ رسول کو اور تمہیں اس سبب سے کہ ایمان لائے تم اللہ پر جو تمہارا رَبّ ہے۔ اگر تم نکلے ہو میرے راستے میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضا کے چاہنے کے لئے'' تو پھر میری یہ نصیحت سُن لو کہ اس قسم کے اعداء کے ساتھ، دشمنوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ دینی مخالفت رکھتے ہیں، ان سے دوستی لگانا ٹھیک نہیں ہے، ''اگر نکلے ہو تم میرے راستے میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضا چاہنے کے لئے۔'' تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ: تم خفیہ خفیہ ان تک محبت کے پیغام پہنچاتے ہو، وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ: میں خوب جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو، وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ: جو تم میں سے ایسا کام کرے گا، فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ: وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا، وہ سیدھے راستے پر نہیں رہا جس نے اس قسم کی کارروائی کی۔ اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ: اگر وہ تم پر غالب آجائیں، تم پر قابو پالیں یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً: تو وہ تمہارے دشمن ہوں گے، وَيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ: اور پھیلائیں گے تمہاری طرف اپنے ہاتھوں کو اور اپنی زبانوں کو بُرائی کے ساتھ، ہاتھوں سے بھی بُرائی پہنچائیں گے، زبان سے بھی تمہاری مذمت کریں گے اگر ان کا تم پر قابو چل جائے، وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ: اور وہ چاہیں گے کہ تم کافر ہو جاؤ، یعنی تمہارا ایمان انہیں کسی صورت میں بھی برداشت نہیں ہے، زبان سے بھی ایذا پہنچائیں گے، ہاتھ سے بھی تکلیف پہنچائیں گے، اور پوری کوشش کریں گے کہ تمہیں دوبارہ کُفر کی طرف لوٹا لیں، اُن کے جذبات تو ایسے ہیں۔ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ: ہرگز نفع نہیں دیں گی تمہاری رشتہ داریاں، وَلَآ اَوْلَادُكُمْ: اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن، يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: دیکھو! اس کے آگے پیچھے تین نقطے لگے ہوئے ہیں، میں نے بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس موقع پر ترکیب دونوں طرح سے ہو جاتی ہے، ماقبل کے ساتھ لگالو، یا، مابعد کے ساتھ لگالو، ''ہرگز نفع نہیں دیں گی تمہیں تمہاری رشتہ داریاں نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن''، اور اگر اس کو مابعد کے ساتھ لگائیں گے تو يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ: تحقیق تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم علیہ السلام اور ان لوگوں میں جو ابراہیم کے ساتھ تھے، ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے، اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ: جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم سے اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ: بے شک ہم لاتعلق ہیں تم سے (بُرَءٰٓؤُا بَرِیْءٌ کی جمع ہے)

ہم تم سے لاتعلق ہیں اوران چیزوں سے جن کی تم اللہ کے علاوہ پوجا کرتے ہو، کَفَرْنَا بِکُمْ: ہم نے تمہارا انکار کیا، ہمارا تمہارے ساتھ کوئی دوستی کا تعلق نہیں ہے، ''ہم نے انکار کیا تمہارا، اور ظاہر ہوگئی ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لئے جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ'' صفائی کے ساتھ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ جب تک تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ ہماری آپس میں بغض وعداوت ظاہر ہوگئی، کوئی اس میں خفاء نہیں ہے، ہم تمہارے منکر ہیں، تمہارے تعلقات کے منکر ہیں، تمہارے معبودوں کے منکر ہیں، تمہارے دِین کے منکر ہیں، ہر چیز کے منکر ہیں، ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے ساتھیوں نے یہ صاف صاف اعلان کردیا، تو تمہارے سامنے یہ نمونہ کافی ہے کہ تم بھی ایمان لے آنے کے بعد ان کافروں کے ساتھ اسی طرح سے لاتعلقی کا اعلان کرو۔ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ: یہ جو اِستثناء ہے، ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مستثنیٰ منقطع بنایا، ''ہاں! ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات اپنے باپ کے لئے کہ میں اِستغفار کروں گا تیرے لیے اور میں نہیں اختیار رکھتا تیرے لیے اللہ کی طرف سے کسی شئے کا'' یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی جس سے کچھ تعلق نمایاں ہے، لیکن اس کی وضاحت آپ کے سامنے ہوگئی کہ یہ اِستغفار بھی اُس وقت تک کیا جب تک ان کو توقع تھی کہ یہ مؤمن ہوجائے گا، ایمان لاکر اس کو بخشش مل جائے گی، لیکن جب پتا چلا کہ اس کا خاتمہ کُفر پر ہوا ہے تو اس سے بھی لاتعلقی کا اعلان کردیا، تو اس کا ترجمہ ''ہاں! اتنی سی بات ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اپنے باپ کے متعلق'' جس سے کچھ تعلق نمایاں ہے، لیکن حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد اس سے بھی تبری کرلی۔ اور اگر اس کو مستثنیٰ متصل بنایا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لیے نمونہ ہے سوائے اس بات کے، کہ یہ تمہارے لیے نمونہ نہیں کہ تم بھی مشرکوں کے لئے اِستغفار شروع کردو، یہ نمونہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی وضاحت آپ کے سامنے آچکی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر اس سے بھی لاتعلقی کا اظہار کردیا تھا۔ اور آگے یہ جو لفظ بولے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہ میں کوئی اختیار نہیں رکھتا اللہ کی طرف سے تمہارے لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں صرف دُعا کرسکتا ہوں، اِستغفار کرسکتا ہوں، اللہ کے ہاں سفارش کرسکتا ہوں، باقی! ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے، یہ اپنا مقام واضح کردیا اور توحید کو نمایاں کردیا۔ آگے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی دُعا نقل کی ہے کہ لاتعلق ہوجانے کے بعد اب اللہ پر اعتماد اور اللہ پر توکل کا اظہار، کہ ساری قوم سے علیحدہ ہوگئے، ساری قوم سے دشمنی مول لے لی، تو یوں دُعا کی، یہ بھی نمونے میں داخل ہے کہ تم بھی اسی طرح سے اللہ سے تعلق رکھو، اللہ کے سامنے دُعا کرو، وہی ہر قسم کے شر سے تمہیں بچانے والا ہے، کافروں کے ساتھ تعلق رکھنے کی اجازت نہیں، ''اے ہمارے ربّ! ہم نے تیرے پر بھروسہ کیا اور تیری طرف ہی رُجوع کیا اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے'' رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اے ہمارے ربّ! ہمیں فتنہ نہ بنا کافروں کے لئے، اس کا مفہوم یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہم ان کافروں کے سامنے مغلوب رہے، کافر ہمیں سزا دیتے رہے، تو ہم کافروں کے لئے ایک آزمائش بن جائیں گے، کافر اپنے آپ کو سمجھیں گے کہ ہم حق پہ ہیں اور ہمیں سمجھیں گے کہ یہ باطل پہ ہیں، کیونکہ اگر یہ حق پر ہوتے تو ہمیں ان

کے اُوپر اتنا تسلط کیوں حاصل ہوتا، مطلب یہ ہے کہ ہمارے اُوپر کافروں کو تسلط دے کر کافروں کو آزمائش میں نہ ڈال، ہمیں ان کے لئے آزمائش کا ذریعہ نہ بنا۔ یا فتنہ سے موضع فتنہ مراد ہے، شرارت کی جگہ، کہ کافر ہمارے ساتھ شرارتیں کریں، ہمیں سزائیں دیں، ہمیں تختہ مشق بنالیں، ہمیں کافروں کے لئے تختہ مشق نہ بنا، "اور ہمیں بخش دے اے ہمارے پروردگار!" اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: بے شک تو زبردست، حکمت والا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ: البتہ تحقیق تمہارے لیے اِن میں بہترین نمونہ ہے لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ: یہ لَكُمْ سے بدل ہے، "یعنی اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کی اُمید رکھتا ہے" وَمَنْ يَّتَوَلَّ: اور جو کوئی شخص اللہ کے حکم سے منہ پھیرے گا، فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ: پس بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور تعریف کیا ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس تولّی کا نقصان اسے ہی پہنچے گا، اللہ کو اس تولّی کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو بے نیاز ہے، اور ہر قسم کی کمال کی صفات کے ساتھ موصوف ہے۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۗ وَاللّٰهُ

قریب ہے کہ کر دے گا اللہ تعالیٰ محبت تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے، اللہ تعالیٰ

قَدِيْرٌ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي

قدرت رکھنے والا ہے، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۝ نہیں روکتا اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے جو تم سے دِین کے معاملے

الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ

میں لڑے نہیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا (نہیں روکتا اس بات سے) کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اور ان کے ساتھ انصاف کرو، بے شک

يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ

اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۝ اس کے سوا کچھ نہیں کہ روکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اُنہی سے جو تم سے دِین کے معاملے میں لڑے ہیں اور

اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ

تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اور تمہارے نکالنے پر ایک دُوسرے کی مدد کی ہے، (روکتا ہے اللہ) کہ تم ان کے ساتھ دوستی لگاؤ،

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ

اور جو ان سے دوستی لگائے گا پس یہی لوگ ظالم ہیں ۝ اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں

الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ

آجائیں ہجرت کرنے والی، تو ان کا امتحان لے لیا کرو، اللہ بہتر جانتا ہے ان کے ایمان کو، پھر اگر جانو تم انہیں

مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَ

مومنات تو نہ لوٹایا کرو انہیں کافروں کی طرف، نہ وہ عورتیں حلال ہیں ان کافروں کے لئے، اور نہ وہ کافر حلال ہیں ان عورتوں کے لئے، اور

اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

جو کچھ وہ خرچ کر چکے ہیں وہ انہیں دے دیا کرو، اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں سے نکاح کر لو جب تم ان کو ان کے

اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ

مہر دے دو، کافر عورتوں کے تعلقات کو روک کے نہ رکھو، اور ان کافروں سے تم بھی مانگ لو وہ چیز جو تم نے خرچ کی ہے، اور وہ بھی طلب کر لیں

اَنْفَقُوْا ۭ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ وَاِنْ فَاتَكُمْ

جو چیز انہوں نے خرچ کی ہے، یہ اللہ کا حکم ہے، تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اللہ علم والا حکمت والا ہے ۝۱۰ اگر تمہاری بیویوں کی

شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ

طرف سے کوئی شئ فوت ہو جائے کافروں کی طرف، پھر تمہاری باری آجائے، تو دے دیا کرو ان کو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں مثل

مَآ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاۗءَكَ

اس چیز کے جو انہوں نے خرچ کی، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کے ساتھ تم ایمان لاتے ہو ۝۱۱ اے نبی! جس وقت آپ کے پاس

الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓي اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ

مومن عورتیں آجائیں، بیعت کریں آپ سے اس شرط پر کہ وہ نہیں شریک ٹھہرائیں گی اللہ کے ساتھ کسی کو، اور نہ چوری کریں گی، اور نہ زنا کریں گی

وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَ

اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جس کو گھڑ لیتی ہیں اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے سامنے، اور

لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ

کسی معروف کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی، تو آپ ان کو بیعت کر لیا کیجئے، اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کیجئے،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ

اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۞ اے ایمان والو! دوستی نہ لگایا کرو ان لوگوں سے جن کے اُوپر اللہ کا غضب ہوا،

قَدْ یَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾

وہ لوگ آخرت سے مایوس ہوچکے ہیں جس طرح سے کہ مایوس ہیں کافر اصحاب قبور سے ۞

تفسیر

عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّجْعَلَ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً: تو یہ لاتعلقی کے لیے جو کہا جارہا ہے یہ بھی دائمی نہیں، اُمید رکھو کہ یہ حالات بدل جائیں گے، ”قریب ہے کہ کردے گا اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے“ مَوَدَّةً: دوستی، دوستی کردے گا، حالات بدل جائیں گے، قریب ہے وہ وقت، کردے گا اللہ تعالیٰ مودّت، محبت تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے، جن سے تم نے عداوت ڈالی، ”اللہ تعالیٰ قدرت رکھنے والا ہے“ اللہ کی قدرت کے تحت یہ تصرف ہوجائے گا، وَاللّٰهُ قَدِیْرٌ: اللہ قدرت رکھنے والا ہے، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

کافر غیر حربی کے ساتھ تعلق کا حکم

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ: نہیں روکتا اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے جو تم سے دین کے معاملے میں لڑے نہیں، جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا نہیں، ”نہیں روکتا اس بات سے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور ان کے ساتھ انصاف کرو“ یعنی کافر جو محارب نہیں ہیں، معاہد ہیں، ذمّی ہیں، مسالم ہیں، مستامن ہیں، جن کے ساتھ تمہاری لڑائی نہیں، ان کے ساتھ تم کوئی اچھا برتاؤ کرلو، ان پر احسان کرلو، ان کی طرف کوئی انصاف کا معاملہ کرلو، اس سے اللہ نہیں روکتا۔ ”بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

کافر حربی کے ساتھ تعلق کا حکم

”اس کے سوا کچھ نہیں کہ روکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں انہی سے جو تم سے دین کے معاملے میں لڑے ہیں، اور جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اور تمہارے نکالنے کے اُوپر ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ایسے لوگ، ان کے ساتھ منع کرتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ان کے ساتھ دوستی لگاؤ، اور جو ان سے دوستی لگائے گا پس یہی لوگ ظالم ہیں“ ان کے ساتھ دوستی لگانے کی اجازت نہیں، تَوَلِّیْ اتخاذ وَلی کے معنی میں ہے، ان کو تم دوست بناؤ، دل کے ساتھ ان سے محبت رکھو، اس سے اللہ تعالیٰ تمہیں روکتا ہے، اگر ان کے ساتھ کوئی دوستی لگائے گا تو وہ ظالم ہے۔

مؤمنات مہاجرات کے متعلق چند احکام

آگے عورتوں کے متعلق بات آگئی، جس کی تفصیل آپ کے خدمت میں عرض کردی گئی، "اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں آجائیں ہجرت کرنے والی" فَامْتَحِنُوْهُنَّ: توان کا امتحان لے لیا کرو، انہیں ذرا پرکھ لیا کرو، "اللہ بہتر جانتا ہے ان کے ایمان کو" یعنی حقیقتِ حال ان کے دل میں کیا ہے وہ تو اللہ ہی جانتا ہے، تم نے تو ظاہری حال کو دیکھنا ہے، "پھر اگر جانو تم انہیں مؤمنات تو نہ لوٹایا کرو انہیں کافروں کی طرف، نہ وہ عورتیں حلال ہیں ان کافروں کے لئے اور نہ وہ کافر حلال ہیں ان عورتوں کے لئے" دونوں طرف سے رشتہ ختم ہوگیا۔ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا: جو کچھ وہ خرچ کرچکے ہیں وہ انہیں دے دیا کرو، ان کا مہر وغیرہ واپس کردیا کرو۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ: اورتم پر کوئی گناہ نہیں، اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ: کہ تم ان عورتوں سے نکاح کرلو جب تم ان کو ان کے مہر دے دو، یعنی کافروں کو مہر علیحدہ واپس کرنا ہے، اور نکاح کرتے ہوئے اِن عورتوں کو علیحدہ دینا ہے، ایسا کرکے تم اِن عورتوں سے نکاح کرسکتے ہو۔ مسئلہ تو آپ نے سُن لیا، اختلافِ دِین اور اختلافِ دار یہ نکاح ٹوٹنے کا سبب بن جاتا ہے، پھر ضروری نہیں کہ تم اُس مشرک شوہر سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کرو، جس وقت عورتیں اسلام قبول کرکے ہجرت کرکے دارُالاسلام میں آگئیں پچھلا نکاح ختم ہوگیا، یہاں وہ اپنی عدت گزاریں گی، عدّت گزارنے کے بعد پھر اُن کے ساتھ نئے سرے سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ ہاں! البتہ چونکہ آپس میں مصالحت ہے تو جو کچھ وہ عورتوں کو مہر دے چکے ہیں وہ اُن کو لوٹاؤ، اور جو شخص اِن سے نکاح کرنا چاہے وہ اِن کو مستقل مہر دے۔ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ: کوافر کافرہ کی جمع "کافر عورتوں کے تعلقات کو روک کے نہ رکھو" تم بھی تعلقات چھوڑ دو، تمہاری بیویاں جو مکہ معظمہ میں ہیں ان کو اطلاع دے دو کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے، عِصَم یہ عصمت کی جمع ہے، عصمت سے وہ رشتہ اور وہ تعلق مراد ہے جس کی بنا پر انسان عورت کے ناموس کی حفاظت کرتا ہے، "عورتوں کی عصمتوں کو روک کے نہ رکھو" ان کی عصمتوں کے تم وارث بن کے نہ رہو، یہ رشتۂ نکاح جو ہے یہ منقطع کردو، اس لیے حاصل ترجمہ اس کا یہی ہے کہ کافر عورتوں کے تعلقات کو روک کے نہ رکھو۔ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ: اور اُن کافروں سے تم بھی مانگ لو وہ چیز جو تم نے خرچ کی ہے وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا: اور وہ بھی طلب کرلیں جو چیز انہوں نے خرچ کی ہے، "یہ اللہ کا حکم ہے، تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اللہ علم والا حکمت والا ہے۔" وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ: اگر تمہاری بیویوں کی طرف سے کوئی شئے فوت ہوجائے کافروں کی طرف، بیوی تمہاری رہ گئی، تم نے تعلق چھوڑ دیا، لیکن وہ کافر مہر واپس نہیں کرتے، تمہارا خرچ کیا ہوا مال واپس نہیں دیتے، فَعَاقَبْتُمْ: پھر تمہاری باری آجائے، عاقبتم یہ عُقبۃ سے لیا گیا ہے، عُقبہ باری کو کہتے ہیں، باری آنے کا مطلب یہ ہے کہ پھر کوئی عورت وہاں سے آگئی جس کا مہر تم نے واپس کرنا ہے، تو تم کافروں کی طرف واپس کرنے کے بجائے اس شخص کو دے دو جس کی بیوی اُدھر رہ گئی اور کافروں نے اس کا خرچ واپس نہیں کیا۔ "پھر تمہاری باری آجائے تو دے دیا کرو ان کو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں، مثل اس چیز کے جو انہوں نے خرچ کی۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کے ساتھ تم ایمان لاتے ہو۔"

''بیعت'' کے الفاظ اور شرائط

''اے نبی! جس وقت تیرے پاس مؤمن عورتیں آجائیں'' یُبَایِعْنَكَ: بیعت کرتی ہوں آپ سے اس شرط پر، یعنی یہ شرطیں مان لیں اور بیعت کرنا چاہیں تو آپ انہیں بیعت کرلیا کیجئے، ان کا ایمان قبول ہوگیا۔ حضور ﷺ عورتوں سے انہی الفاظ پر بیعت لیتے تھے اور زبانی زبانی، بیعت لیتے وقت حضور ﷺ نے کسی عورت کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں لگایا، حدیث شریف میں صراحت ہے، وہ سامنے بیٹھ جاتیں، بیٹھنے کے بعد اُن سے یہ الفاظ کہلوا لیے جاتے، جب وہ ان باتوں کو مان جاتیں تو آپ ﷺ فرماتے کہ سب کی بیعت ہوگئی۔[1] اور سب کا ایمان قبول ہوگیا۔ تو عورت کے ساتھ بیعت کرتے وقت مصافحہ جائز نہیں ہے، جیسے کہ مردوں کی بیعت کرتے وقت مصافحہ مروّج ہے، حضور ﷺ بھی مردوں سے بیعت کرتے وقت ان سے مصافحہ فرمایا کرتے تھے۔ ''اے نبی! جس وقت آپ کے پاس مؤمن عورتیں آئیں'' یعنی ایسی عورتیں آجائیں جو اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کرتی ہیں، ''بیعت کریں آپ سے اس شرط پر کہ وہ نہیں شریک ٹھہرائیں گی اللہ کے ساتھ کسی کو، اور نہ چوری کریں گی، اور نہ زِنا کریں گی، اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جس کو گھڑ لیتی ہیں اپنے ہاتھوں کے سامنے اور پاؤں کے سامنے۔'' بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ کا مطلب یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے بات بنالی اپنے ہاتھ پاؤں کے سامنے، واقعہ کچھ نہیں ہوتا، جیسے عورتوں کی عادت ہے ایک دوسرے پہ تہمتیں لگاتی ہیں، بہتان لگانا یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، اس بہتان لگانے کی ایک مروّج صورت یہ بھی تھی کہ کوئی عورت جس کے اولاد نہ ہوتی، تو اپنے خاوند کو مطمئن کرنے کے لئے کسی اور کا بچہ لے لیتی اور اس کو اپنی طرف منسوب کر کے کہتی کہ یہ میرے خاوند کا ہے، یا بدکاری کے نتیجے میں حاملہ کسی اور جگہ سے ہوجاتی اور ظاہر کرتی کہ یہ خاوند کا ہے، یہ ایک بہت بدترین قسم کا بہتان ہے جس میں نسب خلط ملط ہوتا ہے، تو اس پر بھی پابندی لگادی گئی کہ اس قسم کا جھوٹ نہیں بولنا، کسی کے اُوپر کوئی بہتان نہیں لگانا، بات جو ہے وہ ساری صاف رہے، زِنا نہیں کرنا، کوئی کسی قسم کا اِفترا اور بہتان تراشی کسی پر نہیں کرنی، یہ پابندیاں ان کے اُوپر لگائیں کیونکہ جاہلیت کے اندر یہ چیزیں فساد پیدا کیے ہوئے تھیں، ''نہیں لائیں گی وہ بہتان جس کو کہ گھڑ لیتی ہیں وہ اپنے ہاتھ پاؤں کے سامنے'' وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ: اور کسی معروف کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی، جو بھی شرعی طور پر اچھا کام ہوگا، آپ کا جو حکم آئے گا اس کو مانیں گی، ساری کی ساری اس کی اطاعت کریں گی، فَبَايِعْهُنَّ: اگر وہ ان شرطوں پر بیعت کرتی ہیں تو آپ ان کو بیعت کرلیا کیجئے، وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ پھر اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کیجئے، ''اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔''

کافروں سے دوستی نہ کرنے کا دوبارہ تاکیدی حکم

''اے ایمان والو! دوستی نہ لگایا کرو ان لوگوں سے جن کے اُوپر اللہ کا غضب ہے'' اس کا مصداق خصوصیت کے ساتھ یہودی ہیں، پچھلی سورت میں بھی یہود کے ساتھ منافقین کے جو تعلقات تھے تو ان کو سرزنش کی تھی، جس سے معلوم ہوگیا کہ یہود کے ساتھ تعلقات رکھنے ٹھیک نہیں تھے، تو اس سورت میں مشرکین کے ساتھ تعلق رکھنے کی علی العموم ممانعت آگئی، اور آخری آیت کے

(۱) بخاری ۱/۳۷۵ باب ما یجوز من الشروط فی الاسلام/ مشکوۃ ۲/۳۵۴ باب الصلح فصل اول۔

اندر پھر اس قسم کا اشارہ آ گیا، جس کا مصداق اولاً یہودی ہیں، اور اس کے بعد سارے ہی کافر مصداق ہو سکتے ہیں۔ ''اے ایمان والو! دوستی نہ لگایا کرو ان لوگوں سے جن کے اُوپر اللہ کا غضب ہوا'' قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ: وہ لوگ آخرت سے مایوس ہو چکے ہیں، یہ یہودی آخرت سے مایوس ہو چکے ہیں، چونکہ ان کو اپنا کُفر معلوم تھا، چاہے زبان سے اقرار نہ کریں، آخرت کی نجات سے مایوس ہیں، ''جس طرح سے کہ مایوس ہیں کافر'' مِنْ أَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ: اصحاب قبور سے۔ مِنْ أَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ کا مفہوم دو طرح سے واضح کیا گیا ہے، وہ کافر جو قبروں میں جا چکے جس طرح سے آخرت میں اللہ کی رحمت سے وہ مایوس ہیں اسی طرح سے یہ یہودی زندگی میں بھی مایوس ہیں، تو مِنْ أَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ یہ اَلْكُفَّارُ کا بیان ہے۔ یا یوں بھی مطلب ذکر کیا گیا ہے کہ جیسے کافر اس بات سے مایوس ہیں کہ اُصحابِ قبور لوٹ کر اُن کی طرف آ جائیں، اسی طرح سے یہ یہود بھی آخرت میں اللہ کی رحمت حاصل ہونے سے مایوس ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس اس لیے ہیں کیونکہ ان کو اپنا کُفر معلوم ہے، اگرچہ یہ لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ تو ایسے لوگ جو اللہ کی رحمت سے آخرت میں مایوس رہیں گے، ان کے اُوپر اللہ کا غضب پڑ رہا ہے، تو ایسے لوگوں سے دوستی نہ لگاؤ، کیونکہ جب کوئی شخص کسی سے دوستی لگایا کرتا ہے تو دوست دوست آپس میں پھر ایک ہی مقام پر ہو جایا کرتے ہیں، تو جب اللہ کے مغضوب لوگوں کے ساتھ تم دوستی لگاؤ گے تو تم بھی غضب کا نشانہ بن جاؤ گے۔ تو یہ اُنہی تعلقات کی ممانعت آ گئی۔

رکوعاتها ۲	۶۱ سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۹	اٰياتها ۱۴

سورۂ صف مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کی چودہ آیتیں ہیں اور اس میں دو رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ يٰۤاَيُّهَا

اللہ کی پاکی بیان کی ان چیزوں نے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۝ اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا

ایمان والو! کیوں بولتے ہو وہ بات جو تم کرتے نہیں ہو ۝ بڑی ہے از روئے بیزاری کے اللہ کے نزدیک یہ بات کہ بولو تم

مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ

وہ جو تم کرتے نہیں ہو ۝ بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اللہ کے راستے میں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ عمارت ہیں

مَّرْصُوْصٌ ۞ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ

سیسہ پلائی ہوئی۞ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے، اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ

رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی

میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں تمہاری طرف، جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اور کج کر دیا، اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۞ وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

فاسق لوگوں کو ۞ اور یاد کیجئے جب کہا مریم کے بیٹے عیسیٰ نے: اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں

اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ

تمہاری طرف، میں تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو آئے گا

مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۞

میرے بعد اس کا نام احمد ہے، جس وقت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس آئے واضح دلائل لے کر، تو کہا ان لوگوں نے کہ یہ تو صریح جادو ہے ۞

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ یُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا

اور کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو گھڑے اللہ پر جھوٹ، حالانکہ وہ بلایا جارہا ہے اسلام کی طرف، اللہ تعالیٰ نہیں

یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۞ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ

ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو۞ ارادہ کرتے ہیں یہ لوگ کہ بجھا دیں اللہ کے نُور کو اپنے مونہوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ

مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۞ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ

اپنے نُور کو پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناخوش ہوں۞ اللہ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور

دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۞ ع

دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اِس (دینِ حق) کو سب دینوں پر اگرچہ مشرکوں کو ناپسند ہو ۞

ماقبل سے ربط اور ابتدائی آیات کا مضمون اور شانِ نزول

سورۂ صف مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چودہ آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں۔ اس سورت میں خصوصیت

کے ساتھ جہاد کی ترغیب دی گئی ہے، جب تعلقات منقطع ہو گئے، یہود سے بھی منقطع ہیں، مشرکین سے بھی منقطع ہیں، تو ان کے ساتھ کوئی ہمدردی کا جذبہ رکھنے کی بجائے تمہیں جہاد کرنا چاہیے۔ ابتدا کے اندر ایسی بات ذکر کی جارہی ہے جس میں مسلمانوں کو برانگیختہ کیا جارہا ہے کہ جو منہ سے نکالو تو اس کے مطابق عمل بھی کر کے دکھایا کرو، جس طرح ان لوگوں کے دل میں ولولے اُٹھتے تھے، مجلس میں بیٹھ کر باتیں کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جہاد کی اجازت دے دے تو ہم اس طرح سے کوشش کریں گے، یا بعض نے گفتگو کی کہ اگر ہمیں پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب شغل کون سا ہے تو ہم اس میں پوری تن دہی کے ساتھ عمل کریں گے، تو اللہ تعالیٰ برانگیختہ کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ ایسی باتیں نہ کیا کرو جن کے اُوپر تم عمل نہ کرو، مطلب یہ ہے کہ ڈینگ مارنا، لاف مارنا، لاف زنی، کہ ہم یوں کر دیں گے، ووں کر دیں گے، اور جب موقع آئے تو کچھ کر کے نہ دکھاؤ، تو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ پھر خصوصیت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ عمل محبوب ہے، اور اگر تم اللہ کے محبوب عمل کو اختیار کرنا چاہتے ہو تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے کے اندر جہاد کرو، اس طرح سے صف بندی کر کے کہ جیسے ایک دیوار ہوتی ہے جس میں سیسہ ڈال دیا گیا ہو، جو کسی طرح سے ٹوٹتی نہیں، اس میں شگاف نہیں پڑتا، اس طرح سے اکٹھے ہو کر تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب عمل ہے۔

تفسیر

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: اللہ کی پاکی بیان کی ان چیزوں نے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ یہ مضمون بار ہا گزر گیا۔ ''وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

کیا بے عمل کے لئے وعظ کہنا جائز نہیں؟

''اے ایمان والو! کیوں بولتے ہو وہ بات جو تم کرتے نہیں ہو'' لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ جو تم کرتے نہیں ہو اس کو کہتے کیوں ہو، یہ کہنا اُسی طرح سے ہے لاف زنی کے طور پر کہ ہم یوں کر دیں گے، ہم ووں کر دیں گے، زبان سے تو بول دیتے ہو، جب موقع آتا ہے تو کرتے نہیں ہو، تو یہاں اِستفہام میں جو ملامت کرنی مقصود ہے وہ اس بات پر ہے کہ منہ سے بولی ہوئی بات کے مطابق عمل کیوں نہیں کر کے دکھاتے؟ جو منہ سے کہتے ہو وہ کر کے بھی دکھاؤ، تو عمل کی ترغیب دینا مقصود ہے، یہ کہنا مقصود نہیں کہ اگر تمہارا اپنا عمل ٹھیک نہیں تو تم یہ بات کسی اور کو بھی نہ کہا کرو...... ذرا بات کو سمجھ لیجئے!...... ایک ہے بے عمل کا وعظ کہنا، کہ ایک آدمی مثال کے طور پر خود نماز نہیں پڑھتا، اور دُوسروں کا کہتا ہے کہ نماز پڑھا کرو، یہ اس آیت کا مصداق نہیں ہے، کیونکہ اس کا مصداق یہ نہیں کہ بے عمل کو وعظ نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ دُوسرے کو نیکی کی تلقین کرنا ایک مستقل نیکی ہے اور اس کے اُوپر عمل کرنا ایک مستقل نیکی ہے، اگر ایک نیک بات آپ کو معلوم ہے لیکن آپ کا خود اس پر عمل نہیں تو آپ دُوسروں کو بتائیے، یہ نہیں کہ اپنی بدعملی کا سہارا لے کر آپ آگے دُوسروں کو بھی کہنا چھوڑ دیں، بدعمل واعظ کے لئے وعظ کہنا جائز ہے، یہ آیت اس کی ممانعت کے لئے نہیں۔ جس طرح

سے قرآنِ کریم میں ایک دُوسری جگہ آیا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (سورۂ بقرہ: ۴۴) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ تو وہاں بھی یہ مقصد ہے کہ اپنے آپ بھولو نہیں، جب تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو تو خود بھی نیکی کرو، تو نیکی کی ترغیب دینا مقصود ہے، اپنے آپ کو بھلانے کی ممانعت مقصود ہے، یہ مطلب نہیں کہ جب تم اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہو تو لوگوں کو بھی نیکی کی بات نہ کہو۔ ایک گناہ کو دُوسرے گناہ کا ذریعہ نہیں بنانا، بدعملی مستقل گناہ ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دینا مستقل گناہ ہے، ایک گناہ میں مبتلا ہو کر دُوسرے گناہ کے لئے اس کو ذریعہ بناؤ یہ مقصد نہیں ہے، کہ جب تم خود نہیں کرتے تو کسی سے بھی کہا نہ کرو، جب تم اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو تو دُوسرے کو بھی نیکی حکم نہ دیا کرو، یہ مفہوم غلط ہے، یہ تو ایک گناہ کو دُوسرے گناہ کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب تم دُوسروں کو نیکی کے لئے کہتے ہو تو اپنے آپ کو کیوں بھولے بیٹھے ہو، اپنے آپ کو بھی نیکی کے راستے پر لگاؤ، تو یہ عمل کی ترغیب ہے کہ جو منہ سے بولتے ہو اس کے مطابق عمل بھی کرو، لوگوں کو کہتے ہو جھوٹ نہ بولو تو خود بھی جھوٹ نہ بولو، یہ کیا بات ہے کہ لوگوں کو تو نصیحتیں کرو اور اپنے کو بھلا کے بیٹھ جاؤ۔ اسی طرح سے یہاں ہے، لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کا یہ معنی نہیں کہ جس کے مطابق تمہارا عمل نہیں وہ بات دُوسروں سے بھی نہ کہو، یہ مطلب نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو منہ سے بولتے ہو اس کے مطابق عمل کر کے دِکھاؤ، تو یہ عمل کرنے کی ترغیب دینی مقصود ہے۔ ''ہمیں پتا چل جائے کہ یہ نیکی کا کام ہے تو ہم پوری جان توڑ کوشش کریں گے'' اب بیٹھ کے یہ بات تو کہہ دی، لیکن جب پتا چلا کہ یہ نیکی کا کام ہے تو سست ہو گئے، وہاں کہا جائے گا کہ کیوں بولتے ہو منہ سے ایسی بات جو تم کرتے نہیں، مطلب یہ ہے کہ جب منہ سے کہتے ہو تو پھر اس کے مطابق عمل بھی کر کے دِکھاؤ۔ تو یہ عمل کی ترغیب کے لئے ہے، اور خالی لاف زنی سے ممانعت ہے، کہ مجلس میں بیٹھ کے ڈینگیں نہ مارا کرو، لاف زنی نہ کیا کرو کہ ہم یوں کر دیں گے، دوں کر دیں گے، اور جب موقع آئے تو بالکل ہی بیٹھ جاؤ، ایسے نہ کیا کرو، جب منہ سے ایک بات نکالتے ہو پھر جب موقع آجائے تو اس کے مطابق عمل کر کے دِکھاؤ'' کیوں بولتے ہو ایسی بات جو تم کرتے نہیں ہو'' كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ: بڑی ہے ازروئے بیزاری کے (مقت بیزاری کو کہتے ہیں) بڑی ہے ازروائے بیزاری کے اللہ کے نزدیک یہ بات کہ بولو تم اپنے منہ سے وہ جو تم کرتے نہیں ہو، یعنی منہ سے تو تم دعوے کرتے رہو، اِن الفاظ میں دعویٰ اور لاف زنی کی ممانعت ہے، کہ منہ سے تو ایک بات کہتے رہو لیکن جب عمل کا موقع آئے تو اس کے اُوپر عمل نہ کر کے دکھاؤ، ایسی لاف زنی اور ایسا دعویٰ اللہ کے نزدیک بہت بیزاری اور نفرت کی بات ہے، منہ سے وہی بات نکالو جو موقع آنے پر پھر ویسے کر کے بھی دِکھا دو۔

جم کر جہاد کرنا اللہ کے ہاں محبوب عمل ہے

''بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اللہ کے راستے میں قطاریں باندھ کر، صفیں باندھ کر (صَفًّا مُصْطَفِّيْنَ کے معنی میں) جو لڑتے ہیں اللہ کے راستے میں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ عمارت ہیں سیسہ پلائی ہوئی'' مَّرْصُوْصٌ: رَصاص سیسے کو کہتے ہیں، سکہ جس کے ساتھ آپ ٹانکا لگایا کرتے ہیں، یہ پگھلا کے کسی چیز کے اندر ڈال دیا جائے تو جوڑ مضبوط ہو جاتا ہے، اور بنیان سے یہاں دیوار مراد ہے، دیوار میں آپ نے دیکھا ہو گا اینٹیں کس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ پھنسی ہوئی ہوتی

ہیں، اگر ایک اینٹ بھی ان میں سے نکل جاتی ہے تو دیوار کمزور ہو جاتی ہے، تو تم بھی اسی طرح سے صف بندی کر کے لڑا کرو، جس طرح سے ایک دیوار ہے جس کو سیسے کے ساتھ گویا کہ ویلڈ کر دیا گیا ہے جو ہلنے والی نہیں، کہ مریں گے تو سارے مریں گے، بڑھیں گے تو سارے بڑھیں گے، یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک بھاگ جائے، پھر دوسرا بھاگ جائے، جس طرح سے دیوار کی اینٹیں گرنے لگ جاتی ہیں، یہ لوگ اچھے نہیں ہوتے، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جو صف بندی کر کے اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں یہ اللہ کو بڑے اچھے لگتے ہیں، تو اگر تمہیں یہ مطلوب ہے کہ ہمیں اللہ کے نزدیک محبوب عمل کا پتا چل جائے تو ہم اس پر کوشش کریں گے، تو یہ ہم تمہیں بتا دیتے ہیں، تم مجلس میں بیٹھ کر جو ڈینگیں مارتے ہو موقع آئے تو پھر ایسا کر کے بھی دکھاؤ، کہ جب بھی جہاد کا موقع آ جائے تو اس میں اس طرح سے ڈٹ جاؤ جس طرح سے ایک دیوار ہوتی ہے جس کے اندر سیسہ ڈال دیا گیا ہو۔ ”گویا کہ وہ عمارت ہیں سیسہ پلائی ہوئی“ بُنیان عمارت کو کہتے ہیں، یہاں دیوار مراد ہے۔

بطور نمونہ کے یہود کے حالات کا تذکرہ

آگے حوالہ دیا کہ دیکھو! یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی بات نہیں سنی یا نہیں مانی، ان کی ہدایات پر عمل نہیں کیا، تو آخر وہ دُنیا اور آخرت میں خوار ہو گئے، تو اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلو گے تو تم بھی نقصان اُٹھاؤ گے، خصوصیت کے ساتھ یہود۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ: قابل ذکر ہے وہ وقت جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ: اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف، اللہ کا بھیجا ہوا ہوں تمہاری طرف، رسول اللہ جانتے ہوئے میرا کلمہ پڑھتے ہوئے پھر مجھے تم تکلیف کیوں پہنچاتے ہو؟ یہ پہلے آپ کے سامنے سورۂ اَحزاب کے آخر میں بھی آ چکا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ، اور وہ کس طرح سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، تکلیف نبی کے لئے سب سے بڑی یہی ہوتی ہے کہ نبی اللہ کا حکم پہنچائے اور آگے سے قوم مانے نہ، اور یہود کے ایسے واقعات قرآنِ کریم میں ذکر کیے گئے ہیں، جیسے فلسطین پر جہاد کا حکم آیا تھا تو کہنے لگے اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ: تُو جا اور تیرا ربّ جائے، جا کر لڑو، اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورۂ مائدہ: ۲۴)، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، تو ایسے موقع پر جی چُرانا اور نبی کے ساتھ مل کر جہاد نہ کرنا بہت باعث تکلیف ہوتا ہے، اور اگر تم بھی ایسے موقع پرستی کرو گے تو تمہارا طریق بھی یہود والا طریق ہو جائے گا۔ ”کیوں تکلیف پہنچاتے ہو مجھے حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف“ فَلَمَّا زَاغُوْٓا: جس وقت وہ لوگ کج ہو گئے، ٹیڑھے ہو گئے، سیدھے راستے پر نہ چلے اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ: تو اللہ نے ان کے دلوں کو اور ٹیڑھا کر دیا، یہ تو قاعدہ ہے کہ ایک آدمی بُرائی اختیار کرتا ہے تو ابتدا میں تھوڑی بُرائی اختیار کرتا ہے، آہستہ آہستہ عادت پڑتی چلی جاتی ہے، بُرائی میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے، سیدھا راستہ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں مزید سیدھے رہنے کی توفیق دے گا، اور اگر تم ٹیڑھے ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ آئندہ کے لئے تمہیں اور بھی ٹیڑھا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو اختیار دے کر انسان کو چھوڑا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ جو عادت ڈالنا چاہو اسی قسم کی عادت پڑتی چلی جاتی ہے، اگر کوئی شخص نبی کی اطاعت کے اندر کوشش کرتا ہے تو اس کی اطاعت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اور اگر کوئی گردن کشی کی کوشش کرتا ہے تو اُس طرف کا راستہ اس

کے لئے آسان ہوجاتا ہے، جو عادت چاہو ڈال لو۔ ''جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں کو اور کج کردیا، اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا فاسق لوگوں کو'' یعنی جو قوم فسق وفجور چھوڑنے پر آمادہ نہیں ان کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔

عیسائیوں کے حالات، اور عیسیٰ علیہ السلام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش گوئی

''اور یاد کیجئے جب کہا عیسیٰ بن مریم نے، مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام نے، اے بنی اسرائیل!'' اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ: میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ: میں مصداق بننے والا ہوں اس توراۃ کا جو مجھ سے پہلے ہے۔ مُصَدِّق کا معنی کئی دفعہ آپ کے سامنے ذکر کیا، مُصَدِّق: تصدیق کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی پیش گوئیوں کا مصداق۔ مجھ سے پہلے توراۃ اُتری، توراۃ کے اندر جس قسم کے نبی کی پیش گوئی کی گئی میں اس کا مصداق بننے والا ہوں، ''تصدیق کرنے والا ہوں میں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے ہے، اور بشارت دینے والا ہوں میں ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد، اس کا نام احمد ہے'' اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں۔ اس میں عیسائیوں کو بتلانا مقصود ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ، کیونکہ یہ تو ایسے ہیں جن کی بشارت صراحتاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام ذکر کر کے گئے ہیں، نامزد بشارت، اور باوجود تحریف کے اِس وقت تک علماء نے موجودہ انجیل اور توراۃ میں سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارتیں نکالی ہیں اور وہ کتابیں بھری پڑی ہیں، اور ہمیشہ اس معاملے میں عیسائی یہودی مقابلے میں شکست کھاتے ہیں، تحریفات کے باوجود اُن بشارتوں کو اِن کتابوں سے ختم نہیں کیا جاسکا۔ سب سے زیادہ تفصیل اس مسئلے کی اِس آیت کے تحت ''تفسیر حقانی'' میں ہے، انہوں نے وہ سب عبارات اکٹھی کی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارات معلوم ہوتی ہیں، اور اِنہوں (یہود ونصاریٰ) نے بہت کوشش کی تحریف کرنے کی، کوئی آگے فقرہ بڑھایا، کوئی پیچھے فقرہ بڑھایا، کہیں ترجمے کے اندر گڑبڑ کی، لیکن اس کے باوجود وہاں سے جو بات نکلتی ہے وہ یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئی کا مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ''بیان القرآن'' میں بھی کچھ تفصیل ہے لیکن انہوں نے بھی وہ تفصیل ''حقانی'' سے ہی نقل کی ہے، ''بشارت دینے والا ہوں رسول کی جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے۔'' فَلَمَّا جَآءَهُمْ: جس وقت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس آئے واضح دلائل لے کر، تو کہا اُن لوگوں نے کہ یہ تو صریح جادو ہے، ان کے معجزات کو دیکھ کر یہودیوں نے ان پر بھی یہی بہتان لگایا۔

سب سے بڑا ظالم کون؟

''اور کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو گھڑے اللہ پر جھوٹ'' اللہ پر جھوٹ گھڑنے کی دونوں ہی صورتیں ہیں، جو اللہ کی طرف سے چیز ثابت ہے اس کی نفی کرے، جو ثابت نہیں اس کا اِثبات کرے، ''کون بڑا ظالم ہے اس سے جو گھڑے اللہ پر جھوٹ، حالانکہ وہ بلایا جارہا ہے اسلام کی طرف، اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو'' جو لوگ اپنا کردار ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کرتے ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، پہلے اپنے ظلم وفسق سے توبہ کرو، اللہ تعالیٰ صحیح راستے پر چلنے کی تب توفیق دیتے ہیں۔

اب دِینِ اِسلام غالب آ کر رہے گا

''ارادہ کرتے ہیں یہ لوگ کہ بجھا دیں اللہ کے نُور کو اپنے مونہوں کے ساتھ'' منہ کے ساتھ اللہ کے نُور کو بجھانے کا مطلب یہ ہے کہ اعتراضات کر کر کے اس دین کو ٹھکرانا چاہتے ہیں، ان کی مثال ایسے ہی ہے کہ جس طرح سے کوئی پھونکیں مار کے سورج کو، یا چاند کو جو اللہ تعالیٰ کا نُور ہے، اس کو بجھانے کی کوشش کرے، جیسے یہ کوشش ان کی بیکار ہے اسی طرح سے زبان سے اعتراض کر کر کے اس دین کو اب یہ باطل نہیں کر سکتے، شکست نہیں دے سکتے، ''ارادہ کرتے ہیں یہ لوگ کہ بجھا دیں اللہ کے نُور کو اپنے مونہوں سے'' وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ: اللہ تعالیٰ اپنے نُور کو پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناخوش ہوں، وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ: اگرچہ کافروں کو یہ پسند نہ ہو۔ ''اللہ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر تا کہ غالب کردے اِس دینِ حق کو سب دینوں پر'' وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ: اگرچہ مشرکوں کو ناپسند ہو، جس میں یہ اشارہ کر دیا گیا کہ اب کسی کی ناپسندیدگی کا کوئی اعتبار نہیں، کافر بھی زور لگالیں، مشرک بھی زور لگالیں، اب یہ دین باقی دینوں پر غالب آ کر رہے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑩
اے ایمان والو! کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے سودے پر جو تمہیں نجات دے درد ناک عذاب سے ⑩
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ
ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑪ۙ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ
یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانو ⑪ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخشے گا اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اور عمدہ محلات میں جو ہمیشگی کے باغات میں ہیں، یہ بہت بڑی
الْعَظِيْمُ ⑫ۙ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑬
کامیابی ہے ⑫ اور ایک اور چیز بھی جس کو تم پسند کرتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد اور قریب حاصل ہونے والی فتح، اور مؤمنوں کو بشارت دے دیجئے ⑬
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ
اے ایمان والو! ہو جاؤ تم اللہ کے مدد گار جیسے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے حواریین سے کہا تھا

مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىٕفَةٌ مِّنْۢ

کہ کون مددگار ہے میرا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے، تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، پس ایمان لے آیا بنی اسرائیل

بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ۠

میں سے ایک گروہ، اور ایک گروہ نے انکار کیا، پھر ہم نے قوت پہنچائی ان لوگوں کو جو کہ ایمان لے آئے ان کے دشمنوں کے خلاف، پس وہ مؤمن غلبہ پانے والے ہو گئے

تفسیر

عذاب سے نجات دینے والی تجارت اور اس کا نتیجہ

''اے ایمان والو!'' هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ: کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایک ایسے سودے پر جو تمہیں نجات دے دردناک عذاب سے؟ تجارۃ: سودا، ایک چیز دی جاتی ہے دوسری لی جاتی ہے۔ تمہیں بھی ایک ایسا کاروبار بتادیں؟ جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے گا۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: یہ صورۃً خبر ہے معنًی اِنشاء ہے، ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو'' اپنی جان اور مال کو اللہ کے راستے میں قربان کرو اور مقابلے میں اللہ تعالیٰ تمہیں یہ دے گا کہ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ یُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخشے گا اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اور عمدہ محلات میں جو ہیشگی کے باغات میں ہیں، یعنی ہیشگی کے باغات ہیں اور اُن میں اچھے اچھے مکانات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ تمہیں داخل کرے گا، ''اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

مال اور جان فی سبیل اللہ خرچ کرنا کامیابی کیسے ہے؟

مال اور جان کو خرچ کرو اللہ کے راستے میں، ایمان لاؤ اور مال اور جان کو خرچ کرو، مقابلے کے اندر جو چیز ملنے والی ہے چونکہ دائمی راحت ہے، اور یہ جان اور مال ایک عارضی سی چیز ہے، اگر اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرو گے تو خرچ پھر بھی ہو جانی ہے، آج کل آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ پھٹوں کے اُوپر برف رکھے بیٹھے ہیں، تو برف اگر وہ نہ بیچیں، اُڑ کے بیٹھ جائیں کہ ہم نہیں بیچتے، تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ تو وقت کے ساتھ ساتھ پگھل جائے گی، اور اس کے بعد حاصل تو کچھ آنے کا نہیں، تو اِن برف والوں کے لئے تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کو نکالنے کی کوشش کریں، جو بیچ لیں گے پیسے آجائیں گے، ورنہ یہ پگھل جائے گی، پانی بن جائے گی، حاصل کچھ بھی نہیں، گیس بن کر اُڑ جائے گی۔ تو یہی حساب ہے انسان کے مال اور جان کا بھی، یہ خرچ تو بہر حال ہونے ہیں، یہ رہنے کی تو چیز ہے نہیں، مرنا آپ نے یقیناً ہے، سانس جو چل رہے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے قطرہ قطرہ پگھلتا

جارہا ہے، اور پیسے بھی کوئی نکلنے والی چیز نہیں، تو یہ چیزیں جو آپ کے ہاتھ سے نکلنے والی ہیں تو ان کو کسی اچھی تجارت میں لگالو، اور وہ تجارت یہی ہے کہ اللہ کے اَحکام کے مطابق ان کو خرچ کرو تاکہ مقابلے کے اندر اللہ کی رضا حاصل ہوجائے، دائمی راحت اور دائمی سکونت کے باغات مل جائیں، اس لیے اس کو فوزِ عظیم قرار دیا، کہ اگر تم اس طرح سے نہیں کرو گے تو جو چیز سنبھالے بیٹھے ہو تو یہ تم سے سنبھالی تو جائے گی نہیں، یہ جانی تو بہرصورت ہے، تو تم اس کو خرچ کر کے کوئی اچھی چیز حاصل کرلو۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا: اور ایک اور چیز بھی جس کو تم پسند کرتے ہو وہ بھی اللہ تمہیں دے گا، وہ کیا ہے نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ: اللہ کی مدد اور قریب حاصل ہونے والی فتح، اس سے فتحِ مکہ کی طرف اشارہ کردیا، ''اور مؤمنوں کو بشارت دے دیجئے'' کہ عنقریب اِن کو اللہ کی طرف سے نصرت اور فتح حاصل ہونے والی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے ''حواریین'' کی قربانی اور اس کا صلہ

''اے ایمان والو! ہوجاؤ اللہ کے مددگار'' كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ اَنصار: ناصر کی جمع ہے، اللہ کے مددگار ہوجاؤ یعنی اللہ کے دین کے مددگار ہوجاؤ اور اللہ کے رسول کے مددگار ہوجاؤ، ''ہوجاؤ تم اللہ کے مددگار جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے حواریین کو'' ''حواریین'' کا تذکرہ پہلے آپ کے سامنے ہوچکا، حواریین: حواری کی جمع ہے، اور حواری مخلص دوست یار مددگار کو کہتے ہیں، ''جس وقت کہ اِبنِ مریم نے حواریین سے کہا تھا کہ کون مددگار ہے میرا اللہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے''، مُتَوَجِّهًا اِلَى اللّٰهِ، ''اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے میرا مددگار کون ہے؟ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں''، فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: پس ایمان لے آیا بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ، وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ: اور ایک گروہ نے انکار کیا، فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: پھر ہم نے قوت پہنچائی ان لوگوں کو جو کہ ایمان لے آئے عَلٰى عَدُوِّهِمْ: ان کے دشمنوں کے خلاف، فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ: پس وہ مؤمن غلبہ پانے والے ہوگئے۔ اسی طرح سے آج جو اِس رسول پر ایمان لائیں گے، اللہ کے دین کی نصرت کریں گے، اللہ تعالیٰ ان کو بھی دشمنوں کے مقابلے میں غلبہ دے گا، دُنیوی کامیابی اور اُخروی کامیابی دونوں کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاد کے لئے تیار ہوجاؤ، اپنی جان اور مال اللہ کے راستے میں لڑاؤ، اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دُشمن کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں دُنیوی کامیابی بھی دے گا اور اُخروی کامیابی بھی دے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ اس کا ترجمہ مفسرین نے دو طرح سے کیا ہے کہ یا تو یہ کہا جارہا ہے کہ اُن یہودیوں کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس وقت واضح دلائل لے کر آئے تو اُن یہودیوں نے اُن کو سحرِ مبین کہہ دیا، پیچھے سے ذکر چونکہ اُن کا چلا آرہا ہے تو وہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، یا، یہ ہے کہ باوجود اس بات کے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت بھی دی اور نامزد بشارت دی، لیکن پھر بھی جب احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس آیا واضح دلائل لے کر، تو ان کے مخالفوں نے پھر بھی اُن کو جادوگر ہی قرار دیا، تو اس پر بھی ملامت کی جاسکتی ہے، ضمیر دونوں طرف لوٹائی ہے، تبادُر یہی ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے (آلوسی)۔

أياتها ۱۱ ۶۲ سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۰ رکوعاتها ۲

سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی اس کی گیارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①

تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کے لئے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، بادشاہ ہے، پاک ہے، غالب ہے، حکمت والا ہے ○

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں میں انہی میں سے رسول، پڑھتا ہے ان کے اُوپر اللہ کی آیات، اور انہیں پاک صاف کرتا ہے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ②

اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب وحکمت کی، اور بے شک یہ لوگ اُس رسول کے آنے سے قبل صریح گمراہی میں تھے ○

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③

اور (بھیجا) کچھ اور لوگوں میں جو انہی میں سے ہیں جو ابھی تک اِن کے ساتھ ملے نہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے ○

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ④ مَثَلُ الَّذِيْنَ

یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم والا ہے ○ ان لوگوں کی مثال

حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۗ بِئْسَ مَثَلُ

جو توراۃ اُٹھوائے گئے پھر انہوں نے اُس توراۃ کو نہ اُٹھایا، گدھے کی طرح ہے جو کہ کتابیں اُٹھائے ہوئے ہو، بُری مثال ہے

الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑤ قُلْ

ان لوگوں کی جو کہ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کی راہنمائی نہیں کیا کرتا ○ آپ کہہ دیجئے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا

کہ اے یہودیو! اگر تمہارا خیال ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو دُوسرے لوگوں کے علاوہ تو تم موت کی

الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ

آرزو کرو اگر تم سچے ہو ۝ اور یہ لوگ موت کی تمنا کبھی نہیں کریں گے بسبب ان اعمال کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے،

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ

اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے ۝ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تو تم سے ملنے والی ہے

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

پھر لوٹائے جاؤ گے تم اس اللہ کی طرف جو کہ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے پھر خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے ۝

ماقبل سے ربط اور آنے والی تین سورتوں کے مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں، دو رُکوع ہیں۔ پچھلی سورت (سورۂ ممتحنہ) میں مشرکین کے ساتھ تعلقات رکھنے کی ممانعت تھی، اور آخر میں جا کے اشارہ تھا کہ یہود کے ساتھ بھی تعلقات نہیں ہونے چاہئیں، ان کے ساتھ بھی محبت نہ رکھو، غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ، یہ سورۂ ممتحنہ کے اندر جس طرح سے مضمون گزرا۔ اور اس سے اگلی سورت سورۂ صف میں جہاد کی ترغیب تھی، اور خصوصیت کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، اپنی جان اور مال کو اللہ کے رستے میں قربان کرو، اس کے مقابلے میں تمہیں فوزِ عظیم حاصل ہوگی، اور دُنیا کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دینے کی ممانعت تھی، کہ اگر مال اور جان کی رعایت رکھو گے اور اللہ کے اَحکام کی پابندی نہیں کرو گے تو فوزِ عظیم سے محروم ہو جاؤ گے۔ آگے جو دو تین سورتیں آرہی ہیں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون اور سورۂ تغابن تینوں کے اندر تقریباً مضمون مشترک ہے، جس میں اللہ کے راستے میں دُنیا کو قربان کرنے کی ترغیب ہے، اور یہود نے جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی اِس نعمت کی قدر نہیں کی تھی، کہ اللہ کے رسول اُن کی طرف آئے اور کتاب بھی آئی، اور اِس قدر نہ کرنے کی بنا پر وہ ذِلّت میں پڑے، تو مسلمانوں کو ان کا واقعہ ذِکر کر کے ممانعت کرنی مقصود ہے کہ تم اِس نعمت کی قدر کرو، اور یہود کی طرح دُنیا کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح نہ دو۔ تقریباً ان تینوں سورتوں کے اندر یہ مضمون مشترک ہے، منافقین کا تذکرہ آئے گا، اور منافقین کی بنیادی بیماری یہی ذِکر کی گئی ہے کہ یہ مال اولاد کی محبت میں مبتلا ہیں، اللہ کے اَحکام سے بچنے کے لئے مختلف بہانے حیلے بناتے ہیں، اور انہیں یہ کہا گیا ہے کہ جان اور مال کی محبت یا اولاد کی محبت یہ کوئی اچھی بات نہیں، اللہ کے اَحکام کے مقابلے میں اس کو ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

تفسیر

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: یہ آیت بارہا آپ کے سامنے گزر گئی، اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت ہے،

جس طرح سے آگے سرورِکائنات ﷺ کی رسالت کا تذکرہ ہے، "تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کے لئے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے" اَلْمَلِكُ: بادشاہ ہے، حکومت اسی کی ہے، اَلْقُدُّوْسُ: پاک ہے، اَلْعَزِیْزُ: غالب ہے، اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ یہ سب الفاظ سورۂ حشر کے آخر میں بھی گزر چکے ہیں۔

اہلِ کتاب حضور ﷺ اور آپ کی اُمت کو تحقیراً "اُمّی" کہتے تھے، لیکن درحقیقت یہ عظیم شرف ہے

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ: اُمِّیّین یہ اُمّی کی جمع ہے، اور اُمّی میں نسبت ہے اُمّ کی طرف، اُمّ ماں کو کہتے ہیں، اور اُمّی اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو پڑھا لکھا نہ ہو، کسی تربیت گاہ میں داخل ہو کر اس نے کوئی تربیت حاصل نہیں کی، بس ویسے ہی ہے جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ یہ لفظ اہلِ عرب کے لئے استعمال کیا کرتے تھے ان کی تحقیر کے طور پر، کہ یہ اَن پڑھ قسم کے لوگ ہیں، جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ویسے ہی ہیں، اور ہم حاملِ کتاب ہیں، علم ہمارے پاس ہے، انبیاء ﷺ ہمارے ہاں آئے، تو اپنے اس اہلِ علم ہونے کو، اہلِ کتاب ہونے کو وہ باعثِ فخر قرار دیتے تھے، اور اہلِ عرب میں چونکہ قریب قریب زمانے میں کوئی پیغمبر آیا نہیں تھا، اللہ کی طرف سے کوئی کتاب اُتری نہیں تھی، اور اُن میں پڑھنے لکھنے کا رِواج نہیں تھا، تو اُن کو تحقیراً وہ "اُمّیّین" کے لفظ سے ذِکر کیا کرتے تھے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کے آنے کے بعد بھی آپ ﷺ کو کہا کرتے تھے کہ یہ "نبی الاُمّیّین" ہیں، اَن پڑھوں کے نبی ہیں، ہم تو اہلِ علم ہیں، ہم اِن کی طرف محتاج نہیں ہیں، جیسے دجال کی وہ لمبی روایت جو حضور ﷺ نے بیان فرمائی جس میں دجال کا قصہ ہے، تو اس نے بھی "نبی الاُمّیّین" کے ساتھ ہی حضور ﷺ کا تذکرہ کیا،[1] اور ابنِ صیاد کی روایت میں بھی ایسے ہی ہے۔[2] انہوں نے تو اس لفظ کو تحقیراً استعمال کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بھی اہلِ عرب کو "اُمّیّین" کے لفظ کے ساتھ ہی ذِکر کیا، اور پھر خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کا ذِکر بھی قرآنِ کریم میں اَلنَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کے ساتھ آ گیا (سورۂ اَعراف: ۱۵۷، ۱۵۸)، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لقب اہلِ کتاب نے اہلِ عرب کو بطور "تحقیر" کے دیا تھا، وہی لقب ان کے لئے بطور "شرف" کے آ گیا، چونکہ اب حقیقت یہ ہوگئی کہ یہ لوگ تھے تو واقعی اَن پڑھ، لیکن اِن اَن پڑھوں کو اللہ تعالیٰ نے اب علمی قیادت دے دی، سیادت دے دی، اور اِنہی اَن پڑھوں میں سے ایک نبیِ اُمّی اٹھایا، جو کسی مدرسے میں نہیں پڑھا، اور کسی عالم کی صحبت میں نہیں رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کے اُوپر علم اِلقاء کیا، اور علم و حکمت کے ساتھ ان کی وساطت سے ساری اُمت کو نوازا، اور اتنا نوازا کہ یہی اُمّی جن کو یہ اُمّیّین اور اَن پڑھ کہا کرتے تھے، علمی دُنیا کے اندر سب کے قائد بن گئے، تو یہ لقب ان کے لئے "شرف" بن گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمیوں کو نوازا، براہِ راست علم دیا، اور نبیِ اُمّی کے اُوپر اللہ تعالیٰ نے ایسی کتاب اُتاری کہ جس کا مقابلہ کرنے کے لئے دُنیا عاجز آ گئی، اور تھوڑے دِنوں میں یہ انقلاب آ گیا کہ یہی اَن پڑھ علمی دُنیا کے اندر سب کے اِمام بن گئے۔

---

(۱) مسلم ۴۰۵/۲، کتاب الفتن، باب قصة الجساسة/مشکوٰۃ ۴۷۶/۲، باب العلامات بین یدی الساعة، فصل اوّل کا تقریباً آخر۔

(۲) بخاری ۱۸۰/۱، باب اذا اسلم الصبی الخ/مشکوٰۃ ۴۷۸/۲، باب قصة ابن صیاد کی پہلی حدیث۔

اور اس لفظ کے ذکر کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت کی یاددہانی بھی ہے کہ تم لوگ اُمی تھے، اَن پڑھ تھے، گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا رسول آیا جس نے آکے تمہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سنائیں، اور تمہیں تعلیم وتربیت کے ذریعے سے پاک صاف کیا، علم وحکمت کی تلقین کی، یہ جو دولت اللہ کی طرف سے تمہیں ملی اس کی قدر کرنی چاہیے، اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس کے تقاضوں کو پورا کرو، تو اس عنوان کے اختیار کرنے میں گویا کہ اِس نعمت کی یاددہانی بھی ہے۔

منصبِ رِسالت

اور یہ الفاظ جو سرورِ کائنات ﷺ کی شان میں یہاں بولے گئے، تلاوتِ کتاب، تزکیہ، تعلیم کتاب وحکمت، یہ آیت تقریباً تین دفعہ پہلے گزر چکی ہے اور اس کی تفصیل ہو چکی، ''وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں میں اُنہی میں سے رسول، پڑھتا ہے ان کے اُوپر اللہ کی آیات، اور انہیں پاک صاف کرتا ہے'' اس ''تزکیہ'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے اخلاق سنوارتا ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھ کے سناتا ہے پھر ان کو عملی تربیت دیتا ہے، جس کے ساتھ ان کے نظریات ٹھیک ہوئے، کفر وشرک کی نجاست ان کے باطن سے ختم ہوئی، اور ظاہری طور پر بھی طہارت کے اَحکام حضور ﷺ نے سکھائے، تو ظاہر وباطن دونوں کا تزکیہ حضور ﷺ نے کیا، ''ان کو پاک صاف کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے کتاب وحکمت کی۔'' ''کتاب'' سے مراد تو یہی کتابُ اللہ ہوگئی، ''حکمت'' سے دانش مندی کی باتیں، سرورِ کائنات ﷺ کے اقوال جو کہ اِس کتاب کی تشریح میں بیان ہوئے جن کو ہم ''حدیث'' کے لفظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں، وہ سب حکمت کا مصداق ہیں۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: بے شک یہ لوگ تھے حضور ﷺ کے آنے سے قبل صریح گمراہی میں، تو ان کو گمراہی کا دور یاد دِلا کر اس نعمت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ اللہ کا کتنا احسان ہے کہ تمہیں اس گمراہی سے نکال دیا۔ ''بے شک یہ لوگ اِس رسول کے آنے سے قبل صریح گمراہی میں تھے۔''

اوّلین وآخرین کے نبی

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ: آخرین کا عطف ہے اُمّیین پر، ''اللہ تعالیٰ نے بھیجا رسول اُمّیین میں اور کچھ اور لوگوں میں جو اِنہی میں سے ہیں'' لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ: جو ابھی تک اِن کے ساتھ ملے نہیں، تو پہلے اُمّیین سے مراد وہ ہوجائیں گے جو اس سورت کے نازل ہونے کے وقت مسلمان ہو چکے تھے، اور اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ سے مراد وہ لوگ ہو جائیں گے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ لَمَّا يَلْحَقُوْا میں چونکہ لَمَّا آ گیا، لَمَّا اور لَمْ کے اندر آپ فرق سمجھتے ہیں کہ دونوں کے اندر نفی کا معنی ہے، لیکن لَمَّا کے اندر آنے والے وقت میں توقع ہوتی ہے، اور لَمْ کے اندر یہ اشارہ نہیں ہوا کرتا، جیسے ہم کہیں لَمَّا يَضْرِبْ ابھی تک نہیں مارا، اس میں اشارہ ہوتا ہے کہ عنقریب مارے گا، اُمید ہے کہ مارے گا، اور لَمْ يَضْرِبْ میں صرف ماضی کی نفی ہوتی ہے کہ مارا نہیں، اور مستقبل کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا۔ تو لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کے اندر آ گیا کہ وہ ابھی تک ان کے ساتھ لاحق نہیں ہوئے ایمان لا کر، تو اشارہ ہے کہ ہونے والے ہیں، تو جس طرح سے موجودہ اُمّیین جو ایمان لے آئے اِن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہے تو پچھلے لوگوں میں بھی ہے، جو ہیں

انہی اُمّیین میں سے، اور عنقریب ایمان لا کر ان کے ساتھ شامل ہونے والے ہیں، دونوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کو بھیجا۔
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: اور وہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اللہ کا فضل ''بنی اسرائیل'' پر ختم ہو گیا، اور ''بنی اسماعیل'' میں آ گیا

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہے دیتا ہے، ذٰلِكَ کا اشارہ رسول کا بھیج دینا، اور اس رسول کے ذریعے سے ہدایت کا نصیب ہو جانا، یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، ایک وقت میں یہ فضل بہت وافر مقدار میں بنی اسرائیل پر رہا، اللہ تعالیٰ نے بہت کثرت کے ساتھ انبیاء بھیجے، اب ''بنی اسرائیل'' سے یہ سلسلہ ختم ہو کر ''بنی اسماعیل'' میں آ گیا، تو اللہ کا فضل جس کو اللہ چاہے ملتا ہے، تو اب اس فضل کا مصداق ''بنی اسماعیل'' بنے ہوئے ہیں، ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم والا ہے۔''

یہودی علماء کی مثال گدھے کی سی ہے!

اب آگے وہ یہود جو اپنے علم کے اُوپر فخر کیا کرتے تھے اور ان عرب کو اپنے مقابلے میں اُمّیین قرار دے کر ان کی تحقیر کیا کرتے تھے، انہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ علم بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے، اگر ایک شخص ایک کتاب کا حامل بن جاتا ہے، اس کا علم حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا، تو اس کی مثال تو اس گدھے کی ہے جس کے اُوپر کتابیں لاد دی جائیں، تو ان کا جو علمی غرور تھا اُس کو اِس مثال کے ساتھ توڑا جا رہا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ: مثال ان لوگوں کی جن کے اُوپر توراۃ لادی گئی، حُمِّلُوا کے لفظ کے اندر بھی اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے توراۃ آئی تھی تو انہوں نے خوشی کے ساتھ اس کو قبول نہیں کیا، وہ بھی ان کے اُوپر لادی گئی تھی، زبردستی اِن کو اُس کا مکلّف کیا گیا، وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (سورۂ بقرہ: ۶۳) کے تحت جس طرح سے واقعہ ذکر کیا گیا تھا، طور اُوپر اُٹھا کے انہیں کہا گیا تھا کہ ''کتاب لو اور اس کے مطابق عمل کرو، نہیں تو ابھی یہ پہاڑ گرا کر تمہیں ہلاک کر دیا جائے گا!'' ''جو لادے گئے توراۃ'' یعنی جو توراۃ کے مکلّف کیے گئے، ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا: پھر انہوں نے اُس توراۃ کو اُٹھایا نہیں، اُٹھایا نہیں کا مطلب یہ ہے کہ جیسے اُٹھانا چاہیے تھا اس کا حق ادا نہیں کیا، صحیح طور پر اس کو پڑھتے سمجھتے، اس کے مطابق عمل کرتے، یہ تھا کتاب دیے جانے کا مقصد۔ ''ان لوگوں کی مثال جو توراۃ اُٹھوائے گئے پھر انہوں نے اُس توراۃ کو نہ اُٹھایا گدھے کی طرح ہے'' يَحْمِلُ اَسْفَارًا: جو کہ کتابیں اُٹھائے ہوئے ہو، اَسفار یہ سِفر کی جمع ہے، سِفر کتاب کو کہتے ہیں، تو جیسے گدھے کے اُوپر کتابیں لاد دی جائیں تو اس سے گدھے کو کوئی شرف حاصل نہیں ہو جاتا، اسی طرح سے ان کو توراۃ دی گئی، جب انہوں نے اس کے مطابق عمل نہیں کیا تو یہ بھی گدھے ہیں جنہوں نے توراۃ سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ تو عالمِ بےعمل کے لئے گویا کہ حِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا کی مثال اس آیت کے اندر ذکر کی گئی، حضرت شیخ (سعدیؒ) نے بھی اپنی کتاب ''گلستان'' کے اندر اسی مثال کو نمایاں کیا ہے، حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

علم چنداں کہ بیشتر خوانی چوں عمل در تو نیست نادانی
نہ محقق بود نہ دانش مند چار پائے برو کتابے چند[1]

کہ علم جتنا چاہو پڑھ لو، لیکن اگر اس کے مطابق عمل نہیں تو نادان کے نادان ہی ہو، کسی چار پائے کے اُوپر اگر چند کتابیں لاد دی جائیں تو کتابیں اُٹھانے کے ساتھ وہ کوئی محقق یا دانش مند نہیں بن جایا کرتا، محقق اور دانش مند تبھی بنے گا کہ جس وقت علم کو پڑھے، پڑھنے کے بعد اس کے مطابق اس کا عمل بھی ہو اور اس کے مطابق اپنے نظریات کو صحیح کیا جائے اور اپنی عملی زندگی کو دُرست کیا جائے۔ تو یہود کے اُوپر زبردستی کتاب تو ڈال دی گئی، مجبوری کے تحت انہوں نے وہ قبول کر لی، لیکن اس کے بعد اس کو پڑھا نہیں، اس کے مطابق عمل نہیں کیا، بلکہ اس کو دُنیا کمانے اور دُنیا جمع کرنے کا ذریعہ بنالیا، اپنے اَغراض کا اُس کو ذریعہ بنالیا، تو اب ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس علم پر وہ غرور کریں فخر کریں، ان کی مثال تو گدھے جیسی ہے۔ ''گدھے کی طرح جو کہ اُٹھاتا ہے کتابیں۔'' بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ بُری مثال ہے ان لوگوں کی جو کہ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں،'' اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کی راہنمائی نہیں کیا کرتا'' جس وقت تک وہ ظلم سے باز نہ آئیں، ظالم رہتے ہوئے کوئی قوم سیدھا راستہ نہیں پاسکتی، اور یہ ظالم ہیں جو علم کا حق ادا نہیں کرتے، کتاب کا حق ادا نہیں کرتے، ایسی صورت میں اِن کو ہدایت کہاں نصیب ہوسکتی ہے۔

یہودیوں کے جھوٹے نعرے

پھر وہ علم کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوبیت کا دعویٰ بھی کرتے تھے، جیسے وہ کہتے تھے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ:۱۸) ہم اللہ کے لیے بیٹوں کی طرح ہیں، اور اس کے محبوبوں کی طرح ہیں۔ آخرت میں صرف وہی لوگ نجات پائیں گے جو کہ یہودی ہوں گے لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا (سورۂ بقرہ:۱۱۱)، لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (سورۂ بقرہ:۸۰) اس قسم کے ان کے نظریات تھے جن کی بنا پر وہ فخر وغرور میں مبتلا تھے، تو سورۂ بقرہ کے اندر ان کے نظریات کی تردید آچکی، اُس میں یہ مضمون بھی آیا تھا کہ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ (سورۂ بقرہ:۹۴) اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ آخرت صرف تمہارے لیے ہے، دُوسروں کے لئے نہیں ہے، تو ذرا موت کی آرزو تو کرو، یعنی تمہاری زندگی ایسی ہونی چاہیے کہ تم آخرت کو دُنیا کے مقابلے میں ترجیح دو، اور موت کا تمہیں شوق ہونا چاہیے، زندگی کی محبت نہیں ہونی چاہیے، اگر تمہاری یہ بات صحیح ہے جو تم زبان سے کہتے ہو اور دِل سے بھی یوں ہی سمجھتے ہو تو پھر چاہیے کہ تمہیں آخرت کی محبت اس بات پر براَنگیختہ کرے کہ تم مرنے کا زیادہ شوق رکھو بمقابلہ جینے کے، لیکن تم تو کبھی اپنی زبان سے یوں نہیں کہہ سکتے کہ ہم مرنا چاہتے ہیں، تمہارے دِل کے اندر تو دُنیا کی محبت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے، جینے کی تمنا تمہارے اندر زیادہ ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ زبان سے دعوے کرتے ہو، ورنہ دِل تمہارا بھی جانتا ہے کہ اگر آخرت میں ہم چلے گئے تو جُوتے کھائیں گے، وہاں جا کے نجات نہیں

(۱) ''گلستان''، باب ۸، حکمت ۳۔

ہے، لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے زبان سے اس قسم کی باتیں کرتے ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ہی اللہ کے مقبول ہو، اور آخرت صرف تمہارے لیے ہے، جنت میں وہی جائے گا جو یہودی ہوگا، کسی یہودی کو آگ نہیں لگے گی، یہ صرف تمہاری زبانی باتیں ہیں۔ یہاں بھی وہی بات کہی جارہی ہے، آپ کہہ دیجئے کہ اے یہودیو! اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ: اگر تمہارا خیال ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو، دوسرے لوگوں کے علاوہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ: تو تم موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو، یعنی تمہارے اس عقیدے کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ تم ہر وقت خواہش رکھو کہ ہم اس دُنیا سے آخرت کی طرف جائیں، دُنیا کی تکلیفوں سے نجات پائیں، اور آخرت کی راحت حاصل کریں، وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا: اور یہ لوگ موت کی تمنا کبھی بھی نہیں کریں گے بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ: بسبب ان اعمال کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے، ان کی بدکرداریاں ان کے سامنے نمایاں ہیں، یہ کسی صورت میں بھی موت کی تمنا نہیں کرسکتے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو'' یعنی جس موت کا تم شکار ہونا نہیں چاہتے، تم مرنا نہیں چاہتے، دُنیا کی محبت تمہارے دِل میں ہے، ''وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو'' فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ: وہ تو تم سے ملنے والی ہے، تم اس سے چھوٹ نہیں سکتے، تو جو اعمال تم نے آگے بھیجے ہیں وہ تمہارے سامنے آنے والے ہیں، ''وہ موت تم سے ملنے والی ہے، پھر لوٹائے جاؤ گے تم اس اللہ کی طرف جو کہ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے، پھر خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ
اے ایمان والو! جس وقت اذان کہہ دی جائے نماز کے لیے جمعہ کے دِن تو اللہ کے ذکر کی طرف کوشش کرکے چلا کرو
وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ
اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو ۝ جس وقت نماز ادا کر لی جائے
فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ
تو منتشر ہو جایا کرو زمین میں اور تلاش کیا کرو اللہ کا فضل اور یاد کرو اللہ کو کثرت سے تاکہ تم
تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ۭ قُلْ
فلاح پاجاؤ ۝ اور جب دیکھی انہوں نے تجارت اور لہو تو منتشر ہو گئے اس کی طرف اور آپ کو کھڑا چھوڑ گئے، آپ کہہ دیجئے
مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝
کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے ایسے کھیل سے اور تجارت سے، اللہ تعالیٰ بہتر رزق دینے والا ہے ۝

شانِ نزول اور آیات کے مضمون پر ایک نظر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ: اس میں مسلمانوں کو ایک کوتاہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس میں انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دُنیا کو ترجیح دی اور دُنیا کی طرف وہ متوجہ ہوئے۔ سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کے وعظ ونصیحت کی کچھ بےقدری ہوئی، ایسی لغزش ہوئی تھی جس پر متنبہ کیا جارہا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جمعہ کا دِن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے ایک فضیلت والا دِن بنایا ہے، اور نمازِ جمعہ کی باقی نمازوں کے مقابلے میں تاکید زیادہ ہے کہ اس میں کاروبار سے انسان اپنے آپ کو فارغ کر کے اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ ہوجائے، اور نماز پڑھنے کے بعد پھر کاروبار کی اجازت ہے۔ تو ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضور ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد میں بیٹھے تھے، اتنے میں باہر سے کوئی تجارتی قافلہ آ گیا، اور اپنے اعلان کے لئے وہ ساتھ کوئی دف وغیرہ بھی بجارہے تھے، جیسے اس وقت کا طریقہ تھا، اور یہ تجارتی قافلے اُس وقت کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، کہ جب باہر سے سامان آتا تھا تو شہر والے اپنی ضروریات جلدی جلدی ان سے خریدتے اور اپنا مال ان کے ہاتھوں میں فروخت کرتے، اس سلسلے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ تو جس وقت وہ قافلہ مدینہ میں آیا اور دف بجتی ہوئی سنی، تو بعض لوگ اُٹھ کر مسجد سے چلے گئے، اس خیال سے کہ اُس قافلے کو دیکھیں یا ان سے کوئی بات چیت کریں، اُن کا خیال یہ ہوگا کہ خطبے میں بیٹھنا کوئی ضروری نہیں، نماز ضروری ہے، خطبے میں بیٹھنا ضروری نہیں ہے، اگر خطبہ نماز سے پہلے تھا تو ان کا مقصد ہوگا کہ نماز کے وقت میں واپس آجاتے ہیں جلدی جلدی، اور اگر خطبہ نماز کے بعد تھا جیسے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضور ﷺ خطبہ نماز کے بعد ہی دیا کرتے تھے، تو انہوں نے خیال کیا کہ نماز سے اب فارغ ہوگئے، خطبے میں بیٹھنا کوئی ضروری نہیں ہے، اس خیال سے اُٹھ کر چلے گئے۔[1] چونکہ اَحکام حضور ﷺ نے بالترتیب آہستہ آہستہ موقع بہ موقع دیے ہیں، تو یہ تاکید ان کے سامنے نہیں تھی کہ خطبے کی حالت میں اُٹھنا ٹھیک نہیں ہے، یا مسجد سے نکلنا دُرست نہیں، یہ واقعہ پیش آ گیا، اس میں صورت ایسی بن گئی کہ حضور ﷺ تو ان کی طرف متوجہ ہیں اور انہیں دِین کی باتیں بتارہے ہیں، اور وہ حضور ﷺ کی مجلس کو چھوڑ کر ایک کاروبار کی طرف متوجہ ہوگئے، جس میں ظاہراً دُنیا کے حالات کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دے دی، اس پر اللہ تعالیٰ تنبیہ کررہے ہیں کہ ایسا نہ کیا کرو، رزق کی فکر کے اندر اگر تم یوں کرو کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ دو، یا اس کی وعظ کو چھوڑ دو، دِین کی باتوں کو چھوڑ دو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی تدبیر کو کامیاب سمجھتے ہو کہ اس تدبیر کے ساتھ تمہیں رزق حاصل ہوجائے گا، رزق وغیرہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے دیتا ہے، جس کو چاہے نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی طرف توجہ اصل ہے، اور نمازِ جمعہ سے فارغ ہوکر پھر تم کاروبار میں لگو، کمانے میں لگو، تو اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر ایسے طور پر تم تجارت کی طرف متوجہ ہوتے ہو

(۱) آلوسی ابن کثیر وغیرہ۔ نیز دیکھیں: بخاری ۱/ ۱۲۸ باب اذا نفر الناس. مختصراً. مسلم ۱/ ۲۸۴، کتاب الجمعة. مختصراً.

کہ اللہ کے اَحکام کے اندر نقص واقع ہوتا ہے یہ تمہاری غلطی ہے۔ تو یہ تفہیم کردی گئی اس رُکوع کے اندر جمعہ کی تاکید بھی کردی گئی، اورآئندہ کے لئے اس غلطی سے منع بھی کردیا گیا کہ پھر ایسا نہ ہونے پائے کہ کسی دُنیوی غرض کے لئے دُنیوی کاروبار کے لئے سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس کو چھوڑ کر تم چلے جاؤ، یہ طریقہ ٹھیک نہیں، یہ اس نعمت کی بے قدری ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رسول کی صورت میں اور کتاب کی صورت میں دی ہے، اصل تمہارے دِل میں قدر اِسی کی ہونی چاہیے، اس کے حقوق ادا کرنے کے بعد کھانا کمانا یہ سب بعد کا قصہ ہے، اور رزق کا کم ہونا بیش ہونا جو کچھ ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو یوں نہ سمجھو کہ اگر ہم جلدی سے تجارت کی طرف متوجہ نہ ہوئے تو ہمارے رزق میں کوئی کمی آجائے گی۔

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ: اے ایمان والو! جس وقت اَذان کہہ دی جائے نماز کے لئے جمعہ کے دِن، فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ: تو اللہ کے ذِکر کی طرف کوشش کر کے چلا کرو، سعی بھاگنے کو کہتے ہیں، بھاگو اللہ کے ذِکر کی طرف، بھاگنے سے حقیقتاً بھاگنا مراد نہیں ہوتا، بلکہ جلدی جلدی باقی کاموں سے فارغ ہو کر جمعہ کی طرف جانا مراد ہے، اہتمام کے ساتھ حاضری، اس کو بھی سعی کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں، ''کوشش کرو اللہ کے ذِکر کی طرف پہنچنے کی'' یعنی جلدی جلدی موانع ختم کرو، تیاری کر کے اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ ہو جایا کرو۔ وَذَرُوا الْبَیْعَ: اور خرید وفروخت چھوڑ دیا کرو، بیع بیچنے کو کہتے ہیں، لیکن یہاں خرید وفروخت مراد ہے، کاروبار چھوڑ دیا کرو، ''یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو۔''

جمعہ کی اَذانِ ثانی کا ثبوت

نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ: نماز کے لئے اَذان کہی جائے، اس اَذان سے مراد وہ اَذان ہے جو خطبے سے پہلے اِمام کے سامنے ہوتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں صرف یہی ایک اَذان تھی، جب آپ خطبے کے لئے تشریف لے آتے اور منبر پر بیٹھتے تو اس وقت اَذان کہی جاتی تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہ ایک ہی اَذان رہی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہ ایک ہی اَذان رہی، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس دُوسری اَذان کا اضافہ کیا، یعنی مشروعیت کے لحاظ سے دُوسری، حقیقت کے اعتبار سے پہلی، جو اَب کہی جاتی ہے، اب جو پہلی اَذان کہی جاتی ہے یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اضافہ کردہ ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس زیادتی کو قبول کیا، کسی نے اس کے اُوپر انکار نہیں کیا، تو اِجماعِ صحابہ کے ساتھ جمعہ کے لئے دو اَذانیں ہوگئیں، ایک اَذان وہی جو کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھی جو مشروعیت کے لحاظ سے اوّل ہے، اور ایک یہ اَذانِ ثانی (اس کو ''ثانی'' کہا جارہا ہے مشروعیت کے اعتبار سے، ورنہ عمل کے اعتبار سے اب وہ اَذانِ اوّل ہے)۔

''اَذانِ اَوّل'' کے بعد کاروبار وغیرہ کا حکم

تو جب صحابہ کے اِجماع کے ساتھ اِس اَذان کا اضافہ ہوگیا، اور یہ اَذان ہے بھی صلوٰۃِ جمعہ کے لئے، اور ہے بھی جمعہ کے دِن، تو قرآنِ کریم کے الفاظ اس پر بھی صادق آ گئے، اس لیے اب اس آیت کا مصداق اَذانِ اوّل ہی ہے جو جمعہ کے لئے اب کہی جاتی ہے، اس اَذان کے ہوجانے کے بعد کاروبار کرنا ناجائز ہے۔ کاروبار بطورِ مثال کے ذِکر کردیا گیا، ورنہ کوئی ایسی مشغولیت جو نماز کی کوشش میں مانع ہے اس کو ممنوع کردیا گیا، اِس اَذان کے بعد نہ سونا ٹھیک، نہ کھانا ٹھیک، اور نہ کوئی دُوسرا کام، بس انسان اپنی نماز کی تیاری کی طرف متوجہ ہوجائے، غسل کرے، وضو کرے، اور فارغ ہو کے جلدی سے جلدی مسجد کی طرف چلا جائے۔ لیکن دونوں اَذانوں میں فرق یوں رکھا جائے گا کہ عبارۃ النص کے تحت تو اِس اَذان سے مراد وہی اَذان ہوگی جو کہ منبر کے سامنے ہوتی ہے، اور دلالت النص کے طور پر یہ دُوسری اَذان مراد لے لی جائے گی جس کا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا، اس لیے اب اس کا مصداق یہی اَذان ہے جو جمعہ کے لئے کہی جاتی ہے اور جمعہ کے دِن کہی جاتی ہے، اور اس کے ہوجانے کے بعد پھر خرید و فروخت کرنی ٹھیک نہیں۔ اور یہاں جو لفظ ''بیع'' کا بولا گیا کہ بیچنا چھوڑ دو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت بیچنے والے اپنی دُکانیں بند کردیں گے، تو خریداری خود بند ہوجاتی ہے، اگر بیچنے والے اپنی دُکان کھلی رکھیں تو خریدار بھی آتے رہتے ہیں، تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ اَذان ہوتے ہی تمام دُکانیں بند ہوجانی چاہئیں، جس وقت بیچنا بند کردیں گے تو خریداری ہوگی نہیں، تو لوگ فارغ ہوکر جمعہ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے۔

جمعہ کے لئے ''آبادی'' بالاتفاق شرط ہے

اور یہ ''بیع'' کا ذِکر جو کیا گیا ہے تو اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نمازِ جمعہ ایسے مقام پر ہی پڑھی جاتی ہے کہ جہاں خرید و فروخت عمومی طور پر ہوتی ہو، کہ عمومی حکم دیا گیا ہے کہ خرید و فروخت چھوڑ دو، یہیں سے فقہائے اَحناف نے یہ اشارہ نکالا ہے کہ جمعہ شہر میں پڑھا جاتا ہے، بستیوں میں، دیہاتوں میں نہیں پڑھا جاتا۔ بہر حال یہ ایک فقہی مسئلہ ہے جس میں اَئمہ کا کچھ اختلاف ہے، لیکن ہر جگہ، ہر مقام پر جمعہ یہ اَئمۂ اَربعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے، مستقل آبادی ہر کسی کے نزدیک ضروری ہے، اگرچہ اس کے تھوڑے زیادہ ہونے کے اعتبار سے فرق ہے، کہ مستقل آبادی کتنی ہونی چاہیے؟ کتنے آدمی موجود ہوں تو جمعہ پڑھا جاسکتا ہے؟ بہر حال مستقل آبادی اَئمۂ اَربعہ کے نزدیک شرط ہے، جنگل میں چند لوگ اکٹھے ہوجائیں، سمندر کے اندر سفر کرتے جارہے ہوں، یا کوئی فوج ہی جارہی ہے اور عارضی طور پر کہیں پڑاؤ ڈال لیا، آبادیوں سے دُور، جیسے جنگلوں میں ٹھہر جاتے ہیں، تو بالاتفاق وہاں جمعہ پڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔ تو جمعہ فرض ہے، لیکن باقی نمازوں کے مقابلے میں اس کے لئے کچھ شرائط زائدہ ہیں، جن کی تفصیل فقہ میں موجود ہے۔ تو سارے کام چھوڑ کر اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ ہوجایا کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

نمازِ جمعہ کے بعد کاروبار کی اجازت اور اہلِ اِسلام کے لئے سہولت

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ: جس وقت نماز اَدا کردی جائے، نماز پوری ہوگئی، تو فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ: پھر زمین میں منتشر ہوجایا کرو وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ: اور اللہ کا رزق تلاش کیا کرو۔ تو کاروبار کی ممانعت صرف اَذان سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک ہے، اس لیے اگر کوئی شخص صبح صبح کوئی کام کرلیتا ہے یا جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد کسی کاروبار میں لگ جاتا ہے تو اس کی ممانعت نہیں ہے، اور یہ یہود کے مقابلے میں ہمیں سہولت دی گئی، یہود کے لئے تو یہ حکم تھا کہ جس وقت ہفتہ کی رات شروع ہو (یعنی جمعہ کی شام کو سورج غروب ہوتا ہے تو ہفتے کی رات شروع ہوگئی) تو ہفتے کی شام تک یہ چوبیس گھنٹے ان کو کوئی کسی قسم کا کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی، انہوں نے شکار کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی سزا ملی، آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں گزر چکا، حیلہ کرکے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کی تو سب بندر بنادیے گئے، تو حضور ﷺ کی اُمت کے اوپر یہ تخفیف کردی گئی کہ چوبیس گھنٹے فارغ رکھنے ضروری نہیں، بلکہ اَذانِ جمعہ سے لے کر نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک یہ وقت ضروری ہے کہ اس کو صرف عبادت کے لئے فارغ کیا جائے، کوئی دُوسرا کام نہ کیا جائے، تو اگر لوگ اس میں بھی کوتاہی کرتے ہیں تو آپ اندازہ کرلیجئے کہ یہ کتنی بڑی غلطی ہے! آگے پیچھے کاروبار ٹھیک ہے۔ ''جب نماز پوری ہوجائے، نماز ادا کرلی جائے تو منتشر ہوجایا کرو زمین میں، اور تلاش کیا کرو اللہ کا فضل، اور یاد کرو اللہ کو کثرت سے'' اللہ کو ہر طرح سے یاد رکھو، کاروبار میں لگ کر بھی اللہ کو نہ بھولو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پاجاؤ، معلوم ہوا گیا کہ فلاح کا مدار اللہ کو یاد رکھنے پر ہی ہے، جتنا اللہ کو یاد رکھیں گے اتنی کامیابی ہے دنیا اور آخرت کی ...... وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً: اور جب اِن لوگوں نے تجارت دیکھی اور لہو دیکھا، لہو سے کھیل وغیرہ کا سامان، جو ڈھول وغیرہ بجتا تھا وہ مراد ہے، اس میں تعریض ہے اسی واقعے کی طرف جو آپ کے سامنے ذِکر کیا گیا، ''جب ان لوگوں نے دیکھا تجارت اور لہو'' کوئی کھیل تماشا، ڈھول ڈھمکا جس طرح سے ہوتا ہے، ''جب دیکھی انہوں نے تجارت اور لہو تو منتشر ہوگئے اُس کی طرف اور آپ کو کھڑا چھوڑ گئے'' جس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضور ﷺ کھڑے ہوکر خطبہ دے رہے تھے، اور مسنون طریقہ یہی ہے کہ خطیب کھڑا ہوکر خطبہ دے۔ قُلْ مَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ: آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے ایسے کھیل سے اور تجارت سے، وَاللهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: اللہ تعالیٰ بہتر رزق دینے والا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے منہ موڑ کر لہو و تجارت کی طرف متوجہ ہوجانا یہ اچھی بات نہیں، یہ کوئی رزق میں اضافے کا باعث نہیں، رزق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اس لیے عبادت کے تقاضے پورے کرنے کے بعد پھر انسان تجارت کی طرف متوجہ ہو، عبادت کو چھوڑ کر تجارت کی طرف متوجہ ہونا یہ ٹھیک نہیں ہے۔

آیاتہا ۱۱ ۶۳ سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۴ رکوعاتہا ۲

سورۂ منافقون مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ

جس وقت یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے، اللہ جانتا ہے کہ بے شک تو

لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ ① اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً

اللہ کا رسول ہے لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بولتے ہیں ۞ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے

فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا

پھر یہ روکتے ہیں اللہ کے راستے سے، بے شک بُرا ہے وہ کام جو یہ کرتے ہیں ۞ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لے آئے

ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ③ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ

پھر یہ کافر ہوئے، پھر ان کے دلوں کے اُوپر مُہر کر دی گئی، اب یہ سمجھتے نہیں ہیں ۞ اور جس وقت آپ ان کو دیکھتے ہیں تو ان کے جسم آپ کو

اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ

تعجب میں ڈالتے ہیں، اور اگر یہ باتیں کریں تو آپ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں گویا کہ یہ لکڑیاں ہیں جو سہارا دے کر کھڑی کی ہوئی ہیں،

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى

سمجھتے ہیں ہر شور کو اپنے ہی خلاف، یہ حقیقت میں دشمن ہیں، ان سے بچ کے رہا کیجئے، اللہ انہیں برباد کرے یہ کدھر کو

يُؤْفَكُوْنَ ④ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ

پھیرے جاتے ہیں ۞ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم آ جاؤ، اللہ کا رسول تمہارے لیے استغفار کرے، تو یہ اپنے سروں کو موڑتے ہیں

وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ⑤ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ

اور آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ یہ رُکتے ہیں اس حال میں کہ یہ تکبر کرنے والے ہیں ۞ برابر ہے ان پر

اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى
کہ آپ ان کے لیے استغفار کیجئے یا نہ کیجئے، ہرگز نہیں بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو سیدھے راستے پر
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۶﴾ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ
نہیں چلایا کرتا ﴿﴾ یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خرچ نہ کرو ان لوگوں پر جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں
حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، اللہ ہی کے لئے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافق
لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۷﴾ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا
سمجھتے نہیں ﴿﴾ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹیں گے مدینہ کی طرف تو ضرور نکال دے گا باعزت اُس مدینے سے
الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ ع
اَذل کو، اللہ ہی کے لیے عزّت ہے اور اللہ کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے لیکن منافق جانتے نہیں ﴿﴾

سورت کا مضمون

سورۂ منافقون مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں۔ اس میں بھی اصل مقصد تو یہی سمجھانا ہے کہ مال واولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ کے ذِکر سے غافل نہ ہوا کرو، اور منافقین کی اصل بیماری یہی تھی کہ وہ مال واولاد کی محبت میں مبتلا تھے، جس کی بنا پر وہ اللہ کے اَحکام سے جی چُراتے رہتے تھے، کُفر میں مبتلا ہوئے، اللہ کے رسول کی انہوں نے قدر نہیں کی، وجہ اُس کی یہی تھی کہ مال واولاد کی محبت میں اور دُنیا کی محبت میں مبتلا تھے، ممانعت تو اسی کی کرنی مقصود ہے۔

شانِ نزول

اِبتدا کے اندر ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے، جو سرورِ کائنات ﷺ کے ایک سفر میں پیش آیا تھا، غزوۂ بنی مصطلق یا غزوۂ مُریسیع یہ ایک ہی لڑائی کے دو نام ہیں، قبیلہ بنی مصطلق ہے، اور مریسیع کے نام سے ایک چشمہ تھا، وہاں یہ لوگ آباد تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے اُوپر چڑھائی کی، اور اللہ نے فتح دی، حضرت جویریہ اُمّ المؤمنین اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں، اسی جگہ وہ مالِ غنیمت میں آئی تھیں، حضور ﷺ نے آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا، اور ان کی برکت سے پھر سارا قبیلہ ہی آزاد ہو گیا تھا۔[1]

---

(۱) ابو داؤد ۲/ ۱۹۲ باب فی بیع المکاتب اذا فسخت الکتابۃ۔ نوٹ:- یہ ثابت بن قیس کے حصے میں آئی تھیں، آپ ﷺ نے بدل کتابت دے کر ان سے نکاح کر لیا۔

انصار اور مہاجرین کی کشاکشی اور حضور ﷺ کا سمجھانا

جب صحابہ کرام ؓ وہاں ٹھہرے ہوئے تھے تو وہاں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا، پانی لینے میں جس طرح سے رُفقاء بسا اوقات اکٹھے ہوجاتے ہیں، تو آخر انسان ہیں، کبھی کشاکشی بھی ہوجاتی ہے، تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کا پانی لینے کے مسئلے پہ تھوڑا سا جھگڑا ہوگیا، تو مہاجر نے اس کے لات ماردی، اور انصاری کو غصہ آیا تو اس نے اپنی مدد کے لئے انصار کو پکارنا شروع کردیا، جب کچھ انصاری متوجہ ہوئے تو مہاجر نے مہاجرین کو آواز دے دی، تو یوں آپس میں دو فریق پیدا ہو کر کچھ تصادم کا خطرہ پیدا ہوگیا کہ مہاجر اور انصار کہیں ایک دوسرے کی حمایت میں آپس میں اُلجھ نہ جائیں، جب حضور ﷺ نے یہ شور سا سُنا، پتا کروایا، آپ وہاں موقع پر تشریف لے گئے، جا کے تنبیہ کی، اور یہ جو ''یَا لَلْأَنْصَارِ، یَا لَلْمُهَاجِرِیْنَ'' اس قسم کے لفظ انہوں نے بولے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو وہی جاہلیت والی بات ہے،[1] یہ کیسی جاہلیت والی پکار تم نے شروع کردی، کہ جاہلیت میں لوگ اپنی اپنی پارٹی کو بلایا کرتے تھے، مسلمان ہوجانے کے بعد تو سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، یہاں کوئی پارٹی نہیں ہے، یہاں تو اگر کسی کی حمایت کرنی چاہیے تو یہ دیکھ کرنی چاہیے کہ زیادتی کس پر ہوئی ہے؟ مظلوم کی حمایت کرو، چاہے وہ تمہاری اپنی برادری کا ہے چاہے کوئی دُوسرا ہے، اور ظالم کا ہاتھ پکڑو، اور ظالم کا ہاتھ پکڑنا یہ بھی ایک قسم کی ظالم کی حمایت ہے، جیسے ایک حدیث میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا'' اپنے بھائی کی مدد کیا کرو چاہے وہ بھائی ظالم ہے، چاہے مظلوم ہے۔ صحابہ کہنے لگے: یارسول اللہ! مظلوم کی مدد تو ہم کریں، ظالم کی مدد کس طرح سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ظالم کا ہاتھ پکڑ لو، اسے ظلم کرنے سے روکو، یہ ظالم کی اِمداد ہے،[2] کیونکہ جس وقت وہ دُوسرے پر ظلم کرتا ہے تو نقصان اپنا کرتا ہے، برباد وہ اپنے آپ کو کرتا ہے، تو جب تم اس کا ہاتھ پکڑ لوگے، ظلم نہیں کرنے دوگے، تو یہ تم اس کی مدد کررہے ہو، ظلم سے روک کے اس کو نقصان سے بچا رہے ہو۔

شریعت نے صرف ایک ہی تقسیم رکھی ہے، باقی سب تقسیمات باطل ہیں

تو اسلام نے جو تعاون اور تناصر کا اُصول دیا ہے، وہ ہے مظلوم کی حمایت اور ظالم کو ظلم سے روکنا، نہ اس میں کوئی علاقائی تقسیم ہے کہ پنجابی سندھی لڑ پڑیں تو پنجابی بہرحال پنجابی کی حمایت کرے چاہے سندھی مظلوم ہی ہو، سندھی سندھی کی حمایت کرے چاہے سندھی ظالم ہی ہو۔ علاقائی تقسیم، لسان کے لحاظ سے تقسیم، گورے کالے کی تقسیم دُنیا نے جس قسم کی کر رکھی ہے، ملکوں کے لحاظ سے تقسیم، کوئی عربی ہے، کوئی عجمی ہے، کوئی ہندی ہے، کوئی پاکستانی ہے، اس قسم کی تقسیمیں، شریعت ان کا اعتبار نہیں کرتی، یہ انسانی برادری کو جو اس طرح سے بانٹ دیا گیا یہ تو غیر اختیاری تقسیم ہے، اب اگر کوئی گورا ہوجائے تو کالے ہونے کا اس کو اختیار نہیں ہے،

---

(۱) بخاری ۱/۴۹۹، باب ما ینھی عنه من دعوی الجاھلیة۔ مسلم ۲/۳۲۰، باب نصر الاخ ظالمًا او مظلومًا۔ ترمذی ۲/۱۶۸، کتاب التفسیر، سورۃ المنافقون۔

(۲) بخاری ۱/۳۳۱ باب اعن اخاك ظالمًا او مظلومًا۔ مشکوٰۃ ۲/۴۲۲ باب الشفقة والرحمة فصل اوّل۔

کالا ہو جائے تو اپنی کوشش کے ساتھ وہ گورا نہیں بن سکتا، زبانوں کا اختلاف بھی قدرتی ہے، علاقوں کا اختلاف بھی قدرتی ہے، اگر ان اختلافات کا اعتبار کرنا شروع کر دیں تو انسانی برادری تو بے شمار گروہوں کے اندر بٹ جائے گی، ان کی آپس میں اتفاق کی کوئی صورت ہی نہیں ہوگی، اس لیے اس تفریق کو شریعت نے مٹایا ہے، شریعت نے ایک ہی تفریق رکھی ہے جو عقیدے کی تفریق ہے کہ مؤمن ایک برادری ہے اور کافر ایک برادری ہے، جس طرح سے اگلی سورت کے اندر یہ بات زیادہ صراحت سے آرہی ہے۔ تو عقیدے اور نظریے کے اعتبار سے آپس میں تعاون اور تناصر ہے، اور باقی تقسیمیں جتنی ہیں وہ سب باطل ہیں۔

آج کی تفریق کا مسلمانوں کو نقصان

آج مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچ رہا ہے وہ انہی تقسیموں کے اعتبار سے پہنچ رہا ہے، ان کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا، مصری مصری کی رعایت کرے گا، شامی شامی کی رعایت کرے گا، عربی عربی کی بات کرتا ہے، عجمی عجمی کی بات کرتا ہے، پاکستانی اور ہندی ان کے آپس میں مفادات مختلف ہو گئے جس کی بنا پر اُمت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آپس میں اُلجھ گئی، اور شریعت کا مقصد یہ ہے کہ ان تفریقوں کو مٹایا جائے، صرف ایک ہی تفریق ہے انسانوں کے درمیان میں، وہ کُفر اور ایمان کے اعتبار سے ہے، مؤمن سارے بھائی بھائی ہیں، اور ان کو آپس میں مسائل اس طرح سے سوچنے چاہئیں کہ اگر دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو دیکھو! زیادتی کس کی ہے اور کس پہ ہوئی ہے؟ جس پہ زیادتی ہوئی ہے اس کی تلافی کراؤ، اس کی مدد کرو، اور ظالم کو ظلم سے روکو، یہ ہے آپس میں تعاون اور تناصر کا اُصول۔ پارٹی بازی کے طور پر آواز دینی شروع کر دینا یہ دعویٰ جاہلیت ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا دعویٰ جاہلیت شروع ہو گئی "دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ" (حوالہ مذکورہ) ان باتوں کو چھوڑو، یہ تو بدبو پھیلاتی ہیں، اسی کے ساتھ تو معاشرہ خراب ہوتا ہے۔ تو مہاجر اور انصار دونوں کو حضور ﷺ نے تنبیہ فرمائی، اور شیطان کے اِلقاء کے ساتھ جس طرح سے ایک شرارت سی کھڑی ہو گئی تھی اس کی فوراً تلافی ہو گئی۔

رئیس المنافقین نے قومی سطح پر فساد اُبھارنے کی کوشش کی

واقعہ تو صرف اتنا ہوا، لیکن اس غزوے میں حضور ﷺ کے ساتھ عبداللہ بن اُبَیّ اِبن سلول رئیس المنافقین یہ بھی گیا ہوا تھا، اور یہ لوگ موقع کی تاڑ میں رہتے تھے کہ کسی طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے، اِن کی عزت کو اور جاہ کو برداشت نہیں کرتے تھے، تو وہ چونکہ انصاری تھا، خزرج قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، تو اس نے اپنے حواریوں میں بیٹھ کر کچھ اس طرح کی بڑیں ماریں کہ تم نے ان لوگوں کو بلا کے جو گھروں میں ٹھکانا دیا، اور گھر سے روٹیاں کھلائیں، آج دیکھ لیا نتیجہ؟ کہ وہی ہمارے لاتیں مارتے ہیں، یعنی اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اس انداز سے برانگیختہ کیا، اور کہا یہ تمہاری روٹیوں پہ پلنے والے، اسی قسم کے الفاظ

آتے ہیں،[1] تمہاری روٹیوں پر پلنے والے آج تمہی پر ہی آنکھیں اُٹھاتے ہیں، اگر تم ان لوگوں پر خرچ کرنا بند کردو، ان کا تعاون چھوڑ دو، تو یہ سارے مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں گے، بلکہ ایک روایت میں تو ایک لفظ بھی نقل کیا گیا ہے جو بہت سخت قسم کا ہے کہ وہ کہنے لگا کہ یہ مثال تو وہی ہوئی، (عبداللہ بن اُبیّ نے وہاں بکواس کرتے ہوئے یہ کہا) کہ یہ مثال تو وہی ہوئی جو کہا کرتے ہیں کہ ''سمن کلبك یاکلك'' اپنے کتے کو کھلا کھلا کر موٹا کرو، تو کتا تمہیں کھا جائے گا (عام تفاسیر)، مطلب یہ تھا کہ ان کو تم نے کھلا کھلا کر اس حیثیت میں کر دیا کہ اب یہ تمہیں ہی دانت دکھاتے ہیں اور تمہاری طرف ہی آنکھیں اُٹھاتے ہیں، جا کر ان کو خرچ دینا بند کردو یہ خود مدینہ منورہ چھوڑ کر چلے جائیں گے، تو اس کو بغض کے اظہار کا موقع مل گیا، اور پھر ساتھ اُس نے یہ بھی کہا کہ ہم تو صاحبِ جائیداد ہیں، ہم تو اپنے شہر والے ہیں، ہمیں تو عزّت حاصل ہے، تو یہ ذلیل کہاں سے آ گئے؟ دھکے کھاتے ہوئے ذلیل ہو کر آئے، ہم نے ان کو سنبھالا، اب ہم ان ذلیلوں کو نکال کر رہیں گے، ہم اپنے شہر کے اندر ان کو رہنے نہیں دیتے۔ مجلس کے اندر بیٹھ کر اس نے اس قسم کی باتیں کیں، اپنے آپ کو ''اَعزّ'' قرار دیا، اور جو مسلمان مہاجر آئے ہوئے تھے ان کو ''اَذلّ'' قرار دیا، اور کہا کہ ان کو ہم مدینہ منورہ سے نکال دیں گے، رہنے نہیں دیں گے، یعنی یہ دو شخصوں کے درمیان میں جو فساد ہوا تھا اُس نے اِس کو قومی سطح پر اُبھارنے کی کوشش کی، تاکہ مسلمانوں کے خلاف جذبات مشتعل ہو جائیں، اور اس طرح سے مدینہ منورہ والوں کی باہر سے آنے والوں کے ساتھ لڑائی کروادی جائے اور شہر صاف ہو جائے، اور یہی وہ چاہتے تھے تاکہ عزّت اور جاہ ہمیں حاصل ہو، باہر سے آنے والے لوگ عزّت کے مالک نہ بنیں۔

زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ کی اللہ کی طرف سے تصدیق

وہاں ایک صحابی موجود تھے زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ، عمر کے یہ چھوٹے تھے، تھے یہ انصاری، انہوں نے یہ باتیں سنیں تو جا کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیں کہ یا رسول اللہ! آج عبداللہ نے ایسی باتیں کی ہیں، تو آپ یہ باتیں سن کر بہت حیران ہوئے، عبداللہ کو بلایا تو وہ صاف قسمیں کھا کر کہتا ہے: بالکل غلط ہے! آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ تو زید بن اَرقم بیچارے بہت پریشان ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سمجھیں گے کہ شاید میں نے جھوٹ بولا ہے، تو اس پریشانی میں منہ چھپاتے پھرتے تھے، لیکن اللہ کی طرف سے یہ سورت جو اُتری تو اس میں ایک ایک بات کی تصدیق ہو گئی کہ زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے، اور یہ منافق ہی جھوٹے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن اَرقم کو بلا کر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے کان کی تصدیق کر دی، جو باتیں تُو نے سنی تھیں وہ ٹھیک سنی تھیں۔ [2]

---

(۱) هذا ما فعلتم بأنفسكم احللتموهم بلادكم وقاسمتوهم اموالكم والله لو امسكتم من جعال ودونه فضل الطعام لم يركبوا رقابكم (بغوی مظهری وغیرہ)

(۲) بخاری ۲/ ۷۲۷، ۷۲۸، کتاب التفسیر، سورۃ المنافقون.

رئیس المنافقین کی ضد اور اس کی ذِلّت کا منظر

جب یہ واقعہ ظاہر ہوا تو بعض لوگوں نے عبداللہ بن اُبیّ سے کہا کہ اب یہ بات تو ظاہر ہوگئی، تم جاؤ، جا کر اپنے قصور کا اِعتراف کر کے معافی مانگ لو، اور حضور ﷺ سے کہو کہ تیرے لیے اِستغفار کریں، لیکن اس کا تکبّر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ جا کر غلطی کا اقرار کرے، اِس کا ذکر بھی اس میں ہوا، اور جو اُس نے جملے بولے تھے وہ بھی اِس میں دوہرا دیے گئے، تو اس طرح سے زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ کی ساری باتیں صحیح ہوگئیں، اور اُس منافق کے نفاق کا بھانڈا پھوڑ دیا گیا، اور اس کی ذِلّت ہوئی۔ بعد میں اُسی کا بیٹا، عبداللہ بن اُبیّ کا بیٹا، اُس کا نام بھی "عبداللہ" ہے، وہ مخلص مسلمان تھا...... ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرورِکائنات ﷺ سے اجازت مانگی تھی کہ یارسول اللہ! مجھے اجازت دو، میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں، جب یہ تصدیق ہوگئی کہ زید بن اَرقم نے بات صحیح کی ہے، معلوم ہوگیا کہ یہ فتنہ پرداز ہے، آپس میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے، ہمیں لڑانا چاہتا ہے، تو ایسے آدمی کا خاتمہ کردیا جائے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہ! ایسا نہ کرو، لوگ آپس میں باتیں کریں گے کہ "إِنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ" (حوالہ مذکورہ) کہ محمد تو اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کردیتا ہے، تو وہاں جا کے ہم کیا عزّت حاصل کریں گے، اس طرح سے اسلام کی اشاعت میں رُکاوٹ پیدا ہوگی، لوگوں میں پروپیگنڈا غلط ہوجائے گا، کہ وہاں تو جو اس پر ایمان لانے والے اس کے ساتھی ہیں ان کی بھی جان محفوظ نہیں ہے، ذرا سی بات ہوتی ہے تو ان کی بھی گردن اُڑا دیتے ہیں۔ تو روک دیا۔ لیکن جب اس کے بیٹے عبداللہ کو پتا چلا تو وہ حضور ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا کہ یارسول اللہ! میں اس کا بیٹا ہوں، اور مجھے اپنے باپ کی یہ باتیں جو معلوم ہوئی ہیں تو میں آپ سے اجازت طلب کرتا ہوں کہ اگر اس کو قتل کروانا مقصود ہے تو اُس کا سَر میں اُتار کے لاتا ہوں، آپ نے اس کو بھی منع کردیا کہ ایسے نہیں، تو وہ عبداللہ اپنے باپ عبداللہ بن اُبیّ کے پاس گیا اور اس کی اُونٹنی کو روک کر تلوار کھینچی اور کہا کہ جس وقت تک تُو یہ اِقرار نہ کرے کہ حضور ﷺ عزّت والے ہیں اور میں ذلیل ہوں، اس وقت تک میں تجھے مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیتا، چنانچہ اس نے اپنے باپ سے یہ الفاظ کہلوائے تب اس کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت دی (ابن کثیر وغیرہ)۔ تو رُسوائی اُنہی کے حصے میں آئی جنہوں نے حضور ﷺ کے یا آپ ﷺ کے صحابہ کے متعلق اِس قسم کے جذبات رکھے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ سارے کا سارا راز فاش کردیا۔ تو منافق ذلیل ہوگئے اور عزّت مؤمنین کے لئے ہوئی۔

دُوسرے رُکوع کا مضمون اور اِنفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت

اور یہ ساری کی ساری گڑبڑ کیوں ہوتی تھی؟ وہ اس لیے ہوتی تھی کہ یہ لوگ جاہ کے بھوکے تھے، مال و دولت کے ساتھ اِن کو محبت تھی، اور یہ دیکھتے تھے کہ حضور ﷺ کے آنے کے ساتھ ہماری عزّت کو زوال ہوگیا، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی جو تلقین کی جارہی تھی اس کو وہ اپنے لیے مالی نقصان سمجھتے تھے، تو اگلے رُکوع میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو تاکید کردی کہ تمہارے جذبات ایسے نہیں ہونے چاہئیں، اولاد اور مال کی محبت تمہیں اللہ کے ذِکر سے غافل نہ کردے، اور اللہ کے راستے میں وہ وقت

آنے سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ جب موت کا وقت آجائے گا، پھر انسان تمنائیں کرے گا کہ مجھے کوئی مہلت مل جائے تو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرکے نیک ہوجاؤں، پھر یہ مہلت نہیں ملے گی۔ مؤمنین کو بار بار یہ ترغیب دی جارہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور طاعت جس انداز میں بھی کیا جائے وہ بہت عمدہ ہے، لیکن ایمان کی مضبوطی کے لئے اللہ کے راستے میں انفاق یہ ایک بہت بڑی بات ہے، جو شخص اللہ کے راستے میں مال خرچ نہیں کرتا اس کا ایمان ہر وقت خطرے میں ہوتا ہے، مال کی محبت انسان کو کبھی بھی فتنے میں ڈال سکتی ہے، اور اس مال کی محبت کو ختم کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں انفاق کیا جائے، جتنا اللہ کے راستے میں خرچ کروگے اتنا مال کی محبت ختم ہوگی اور ایمان مضبوط ہوگا، اس لیے بار بار اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی تلقین کی جارہی ہے، جتنے لوگ نفاق کے اس فتنے میں مبتلا ہوئے وہ سارے کے سارے حب مال کی ہی وجہ سے ہوئے۔

آیات کی تفسیر

منافق جھوٹے کیسے ہیں؟

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ: جس وقت یہ منافقون، دوغلے، آپ کے پاس آتے ہیں قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ: کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے، بڑے زور کے ساتھ اپنی صداقت ثابت کرنے کے لئے رسالت کی شہادت دیتے ہیں، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ: ظاہری الفاظ کے اعتبار سے تو بات صحیح ہے، ''اللہ جانتا ہے کہ بے شک تُو اس کا رسول ہے، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بولتے ہیں'' یعنی منافق جو کہتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے، تو چونکہ وہ اللہ کا رسول دل سے نہیں سمجھتے اس لیے اُن کی بات اُن کے اعتبار سے جھوٹی ہے، واقع کے اعتبار سے آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ کہنا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے، وہ جھوٹ بول رہے ہیں، چونکہ وہ سمجھتے نہیں، اور بات صحیح تو وہ ہوا کرتی ہے کہ انسان جو دل میں ہے وہی کہے، اس اعتبار سے ان کو جھوٹے کہا جارہا ہے کہ اُن کے دل میں کچھ ہے زبان سے کچھ کہتے ہیں۔

منافق اپنی قسموں کو ڈھال بناتے ہیں

اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً: انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے، قسموں کے پیچھے چھپتے ہیں، جس طرح سے انسان جنگ میں ڈھال کے پیچھے چھپتا ہے، تلوار کے وار سے، تیر سے، تو انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے، ''پھر یہ روکتے ہیں اللہ کے راستے سے'' یعنی خود بھی رُکے ہوئے ہیں اور دُوسروں کو بھی روکتے ہیں، ''بے شک بُرا ہے وہ کام جو یہ کرتے ہیں۔'' اور یہ جو ان کی بدتمیزی ہے کہ جھوٹ بولتے ہیں اور قسموں کے سہارے سے اپنی کارروائی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، ''یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے'' ظاہری طور پر انہوں نے کلمہ پڑھا، ثُمَّ كَفَرُوْا: پھر دل سے یہ کافر ہوئے فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: اللہ نے ان کے دلوں

کے اُوپر مہر کردی فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ: اب یہ سمجھتے نہیں ہیں، ان کی مت ماری گئی ہے، ان کی سمجھ خراب ہوگئی اسی دوغلے پن کی بنا پر کہ ظاہری طور پر ایمان لائے پھر دلوں میں کفر کیا۔

منافقین کی ظاہری ٹیپ ٹاپ

اور جس وقت آپ ان کو دیکھتے ہیں تو تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ: ان کے جسم آپ کو تعجب میں ڈالتے ہیں، یعنی ظاہری دیکھنے میں بڑے خوبصورت، جس طرح سے کہ سرمایہ دار لوگوں کی حالت ہوتی ہے، لباس اچھا، شکل اچھی، جسم پلے ہوئے، چہرے پالش کیے ہوئے، جب دیکھو تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بڑے خوبصورت اور بڑے اچھے ہیں، لیکن اندر سے چونکہ بے ایمان ہوتے ہیں تو ان کی حالت ایسی ہے جیسے لکڑی کی کوئی چیز سجا کے کھڑی کردی جائے ان کی پوزیشن یہ ہے، باتیں کرتے ہیں تو بڑی چکنی چپڑی، باتیں کر کے تو یہ اپنے خلوص کی دھاک بٹھاتے ہیں، اور یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے اِن جیسا بہادر اور اسلام کا فدائی کوئی بھی نہیں، ان کی باتیں سنو تو باتیں کیسی، شکلیں دیکھو تو شکلیں کیسی، لیکن باطن میں یہ کھوکھلے ہیں، ان کے اندر کچھ نہیں ہے، ’’جس وقت آپ ان کو دیکھتے ہیں تو ان کے جسم آپ کو تعجب میں ڈالتے ہیں، اور جس وقت یہ باتیں کرتے ہیں تو آپ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں گویا کہ یہ لکڑیاں ہیں جو سہارا دے کر کھڑی کی ہوئی ہیں‘‘ یعنی اندر ان کے کچھ نہیں۔

منافقین کی بزدلی کی تصویر

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ: گمان کرتے ہیں ہر شور شرابے کو اپنے ہی خلاف، یہ بزدل اور مجرم آدمی کی بات ہوتی ہے، اگر ایک آدمی بزدل نہیں اور اس کے سامنے اپنا کوئی جرم نہیں تو کسی طرف اگر کوئی شور ہے یا کوئی لوگ نظر آتے ہیں تو وہ ڈرتا نہیں ہے، مجرم آدمی جہاں بیٹھا ہو تو پولیس کا آدمی آتا ہوا دیکھے گا تو یہ دھڑکنا شروع ہو جائے گا کہ یہ مجھے پکڑنے کے لئے آیا ہے، یعنی آپ لوگ مجرم نہیں تو اگر کسی پولیس پارٹی کو آتے ہوئے دیکھیں تو آپ کے دِل میں کوئی دھڑکا نہیں ہوگا، لیکن جو آدمی مجرم ہے تو وہ سمجھے گا کہ یہ مجھے ہی پکڑنے کے لئے آرہے ہیں۔ تو منافقین چونکہ در پردہ مجرم تھے تو کسی طرف کوئی شور ہو کوئی ایسی بات ہو یہ دھڑک جاتے ہیں کہ کہیں ہمارے خلاف تو کوئی بات تو نہیں اُٹھ کھڑی ہوئی، یہ ان کی بزدلی کی تصویر ہے، ہر وقت یہ اندر سے دھڑکتے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے ان کے اپنے جرم ہیں، جب کوئی شور ہوتا ہے یا کوئی آواز بلند ہوتی ہے تو یہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ ہمارے خلاف تو کوئی بات نہیں ہو رہی۔ ’’سمجھتے ہیں ہر شور کو اپنے ہی خلاف۔‘‘

منافقین کی ضد اور اس کا نتیجہ

هُمُ الْعَدُوُّ: یہ حقیقت میں دشمن ہیں، فَاحْذَرْهُمْ: ان سے بچ کے رہا کیجئے، قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ: اللہ انہیں برباد کرے اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: یہ کدھر کو پھیرے جاتے ہیں، سیدھا راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے، یہ کدھر کو اُلٹے کیے جاتے ہیں، وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم آجاؤ، يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ: اللہ کا رسول تمہارے لیے استغفار کرے، لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ: تو یہ اپنے سروں کو

موڑتے ہیں، وَرَاَیْتَہُمْ یَصُدُّوْنَ: اور آپ اِن کو دیکھتے ہیں کہ یہ رُکتے ہیں آپ کی مجلس میں آنے سے، وَھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ: اس حال میں کہ یہ تکبّر کرنے والے ہیں، کسی کے کہنے سے بھی آپ کی مجلس میں آ کے اپنے گناہ اور قصور کا اعتراف کر کے معافی نہیں مانگتے، اور آپ سے یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے اللہ سے اِستغفار کیجئے، کوئی متوجہ بھی کرتا ہے تو بھی یہ سر پھیر جاتے ہیں، سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَہُمْ: جب ان کی یہ کیفیت ہے تو برابر ہے اِن پر کہ آپ ان کے لئے اِستغفار کیجئے یا نہ کیجئے، یعنی آپ کے اِستغفار کا اندریں حالات اِن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، لَنْ یَّغْفِرَ اللہُ لَہُمْ: ہرگز نہیں بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں، اِنَّ اللہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ نافرمان فاسق لوگوں کو سیدھے راستے پہ نہیں چلایا کرتا، جب تک وہ اپنے فسق و فجور کو نہ چھوڑیں۔

مال خرچ کرتے ہوئے منافقانہ اور مخلصانہ سوچ

ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ: یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللہِ: نہ خرچ کرو ان لوگوں پر جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں حَتّٰی یَنْفَضُّوْا: یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، وَلِلہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے خزانے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافق سمجھتے نہیں، یعنی ان کا یہ کہنا کہ اگر ہم خرچ دینا بند کر دیں گے تو یہ منتشر ہو جائیں گے یہ ان کی غلط فہمی ہے، ان کو تو یہ اللہ نے سعادت دی کہ ان کو یہ موقع دیا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کر کے، مہاجرین کی، رسول اللہ کی اور ان کے ساتھیوں کی خدمت کر کے آخرت کی سعادت حاصل کریں، ورنہ یہ کوئی ان پر موقوف نہیں ہے، اگر یہ خرچ نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ دُوسرا دروازہ کھول دیں گے...... یہ بات ذرا سمجھئے!...... اگر کوئی شخص کسی دینی سلسلے کے اندر کوئی تعاون کرتا ہے، مال خرچ کرتا ہے، جس وقت تک تو یہ سمجھتا رہے کہ یہ اللہ کا میرے پہ احسان ہے کہ مجھے اس نے خرچ کرنے کا موقع دیا، میں نیک لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں، طالب علموں کی خدمت کر رہا ہوں، علماء کی خدمت کر رہا ہوں، یہ اللہ کا احسان ہے، میرا کوئی احسان نہیں ہے، اُس وقت تک تو یہ سمجھئے کہ یہ لوگ سمجھدار ہیں، اِن کو دین کا فہم حاصل ہے، اور ان کی نیکی اللہ کے ہاں قبول ہے...... اور جب دماغ میں یہ آنا شروع ہو جائے کہ اِن کو ہم کھانے کے لئے دیتے ہیں، تو یہ ہماری مخالفت کیسے کرتے ہیں؟ ہماری بات یہ کیوں نہیں مانتے؟ جیسے کہ الیکشنوں کے موقع پر اور آگے پیچھے دُنیادار قسم کے لوگ مدارس کی یا علماء کی مدد کرتے ہیں تو ان کی زبانوں سے اس قسم کے فقرے نکلنے لگ جاتے ہیں، کہ "یہ لوگ ہماری روٹیوں پہ پلتے ہیں اور ہماری مخالفت کرتے ہیں، ہمارے ساتھ موافقت کیوں نہیں کرتے؟ ان کا چندہ بند کر دو، جب چندہ بند کر دو گے تو یہ خود منتشر ہو جائیں گے!" یہ سب علامت ہوتی ہے کہ دل کے اندر نفاق ہے، اور یہ جو خرچ کرتے تھے یہ اللہ کی رضا کے لئے نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی برتری جتانے کے لئے اس قسم کے کام کرتے تھے، یہ منافقانہ جذبہ ہے۔ تو صدقات اور خیرات دینے والوں کا یہ جذبہ ہو کہ اللہ نے ہمیں یہ توفیق دی اور ہمیں یہ سعادت دی، یہ خرچ کرنا ہماری نیک بختی ہے، اُس وقت تک یوں سمجھئے کہ یہ نیکی کا جذبہ ہے اور اللہ کی رضا کے لئے ہے، اور جب ذرا سی مرضی کے خلاف بات ہو جانے کے بعد وہ آنکھیں دکھانا شروع کر دیں، اور کہیں کہ "چندے تو ہم دیتے ہیں اور پھر تم ہماری مخالفت کرتے ہو؟ چندے تو ہم دیتے ہیں پھر تم ہمارے اُوپر ہی تنقید کرتے ہو؟ اور ہمارا کھاتے ہو اور ہماری مرضی کے مطابق تم چلتے نہیں ہو؟" جب اس قسم کا

رُعب ڈالنا شروع کردیں تو یہ وہی منافقانہ کردار ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ کی رضا کے لئے خرچ نہیں کرتے، بلکہ اِن کے دِل کے اندر یہی چور ہے کہ خرچ اگر ظاہری طور پر کرتے بھی ہیں تو اپنے کسی مفاد کے تحت کرتے ہیں، اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی مقصود نہیں ہے، اور یہ جذبہ منافقانہ ہے...... اور اسی طرح سے اپنی مال داری کے اُوپر اِعتماد کرتے ہوئے کہ ہم مال دار ہیں، ہم دینے والے ہیں، دُوسرا لینے والا ہے، ہم خرچ کرنے والے ہیں، دُوسرا لے کر ہم سے کھانے والا ہے، اِس کیفیت پر نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھنا کہ ہم باعزّت ہیں اور دُوسروں کو سمجھنا کہ یہ ذلیل ہیں، یہ بھی منافقانہ جذبہ ہے، جیسے کہ اگلی آیت کے اندر ذِکر کردیا گیا، یعنی اگر کوئی دولت مند شخص کوئی سرمایہ دار، اُس کے دِل میں یہ خیال آتا ہے کہ ہم چونکہ مال دار ہیں اور ہم اِن کو کھانے کے لئے دیتے ہیں، اس لیے ہم اِن کے مقابلے میں باعزّت ہیں، اور یہ لوگ ہمارے مقابلے میں ذلیل ہیں، یہ ہم سے لے کر کھاتے ہیں، اس قسم کا خیال اگر کسی کے دِل کے اندر آتا ہے تو قرآنِ کریم کی اِن آیات کی روشنی میں قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ شخص منافق ہے، اور رئیس المنافقین کے یہی ملفوظات ہیں جو کہ قرآنِ کریم نے یہاں نقل کیے ہیں...... اور نیک بخت وہ ہوا کرتے ہیں کہ جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کے لئے لٹا دیا، کسی کے اُوپر اِحسان نہیں دھرا، اگر حضور ﷺ نے قبول کرلیا یا کسی صحابی کو کچھ دینے اور کھلانے کا موقع آگیا تو اللہ کا شکر ادا کیا، اور اُنہیں کہا کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (پ ۲۹، سورۂ دہر) ہم تو اگر تمہیں دیتے ہیں تو اللہ کی رضا کے لئے دیتے ہیں، نہ ہم تم سے کوئی جزا چاہتے ہیں نہ شکر گزاری چاہتے ہیں، یہ ہے اصل کے اعتبار سے مخلصین کا جذبہ، اور منافقین کے جذبات اِس قسم کے ہوا کرتے ہیں (جو آپ کے سامنے آگئے)...... تو قرآنِ کریم اگرچہ کسی ایک واقعے کو سامنے رکھ کر تبصرہ کرتا ہے لیکن اس میں سے اُصول یہی مستنبط ہوتے ہیں، تو اُمّت کے سامنے بھی یہ آئینہ رکھ دیا گیا، ان لوگوں کے سامنے خصوصیت کے ساتھ کہ جن کو دِینی سلسلے میں کچھ مال خرچ کرنے کا موقع ملتا ہے، جو طالب علموں پر یا علماء پر کسی دِینی سلسلے میں تعاون کرتے ہوئے خرچ کرتے ہیں، اُن کے جذبات یہ ہونے چاہئیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ موقع دے دیا، ورنہ اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں، اگر ہم خرچ نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ کسی دُوسری جگہ سے انتظام کردے گا، اور ہوتا ایسے ہی ہے، ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی چندہ دینے والا ایسے کسی معاملے میں ناراض ہوکر چندہ بند کردے کہ مدرسے والوں نے میری مرضی کے خلاف کام کیوں کیا ہے؟ تو پھر مدرسہ بند ہوجائے، ہمارے سامنے ایسی کوئی مثال نہیں ہے! ایک ناراض ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ دس دروازے اور کھول دیتے ہیں، اور محروم وہی ہوجاتا ہے جس کے دِل میں اس قسم کے جذبات ہوتے ہیں، زندگی بھر کی نیکیاں برباد کرلیں، آئندہ کے لئے نیکی سے محروم ہوگیا، تو اس قسم کے خیالات نفاق کے ساتھ پیدا ہوا کرتے ہیں۔

عزّت والا کون ہے؟

"کہتے ہیں کہ خرچ نہ کرو ان لوگوں پر جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں حتیٰ کہ وہ منتشر ہوجائیں، اللہ ہی کے لئے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے، لیکن منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹیں گے مدینہ کی طرف، ضرور نکال دے گا باعزّت اُس مدینے سے اَذل کو" جن کو عزّت حاصل ہے، جن کو غلبہ حاصل ہے، وہ اَذل کو نکال دے گا، اَذل ان کو قرار دیا جو باہر

سے آئے ہوئے مہاجر تھے، اور اُعزّا اپنے آپ کو قرار دیا کہ ہم صاحب جائیداد ہیں، جتھے والے ہیں، ہماری جماعت ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهٖ: اللہ ہی کے لئے عزت ہے اور اللہ کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافق جانتے نہیں ہیں۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عزت ہمیں حاصل ہے، عزت اصل کے اعتبار سے اللہ کے لئے، اور اللہ کے دینے کے ساتھ رسول اور مؤمنین کے لئے ہے۔ یہ لوگ ذلیل ہیں جس طرح سے پیچھے آیا تھا: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ (سورۂ مجادلہ: ۲۰) اور واقعہ بھی ایسا ہوا، نتیجہ بھی یہی نکلا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذِکر سے غفلت میں نہ ڈال دیں، جو کوئی ایسا

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ

کرے گا یہی لوگ خسارے والے ہیں ۝۹ اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے قبل کہ آجائے

اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ

تم میں سے کسی کو موت، پھر وہ کہے گا کہ اے میرے رَبّ! کیوں نہ مجھے ڈھیل دے دی تُو نے ایک قریب وقت تک، پھر میں صدقہ کر لیتا اور ہو جاتا

مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱

نیک لوگوں میں سے ۝۱۰ ہرگز نہیں ڈھیل دے گا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو جس وقت اس کا وقتِ معین آجائے گا، اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جن کو تم کرتے ہو ۝۱۱

تفسیر

کامیابی اور ناکامی کا قرآنی معیار

اے ایمان والو! لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ: تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذِکر سے غفلت میں نہ ڈال دیں، جس طرح سے یہ منافق مال واولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ کو بھلائے بیٹھے ہیں، ''تمہیں غفلت میں نہ ڈال دیں تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذِکر سے، جو کوئی ایسا کرے گا یہی لوگ خسارے والے ہیں'' قرآنِ کریم عام لوگوں کے فہم کے خلاف ایک بات سامنے رکھتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ کامیابی یہ ہے کہ دُنیا میں مال زیادہ سے زیادہ جمع کر لو اور اچھی سے اچھی

اولاد حاصل کرلو، یہ کامیابی ہے، جس نے جتنا مال جمع کرلیا، جتنا اچھا خاندان بنالیا تو کہتے ہیں یہ کامیاب ہے، اور اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہی سب سے بڑا خسارہ ہے کہ مال اور اولاد کے پیچھے لگے رہو، اور اللہ کو یاد کرکے، اللہ کے دین کے لئے کچھ نہ کرو۔ ”جو ایسا کرے گا“ کہ مال واولاد کی محبت میں پڑ کر اللہ کے ذکر سے غافل ہو گیا ”وہ لوگ خسارے والے ہیں“ تو کامیاب کون ہوں گے؟ جو دین کے لئے نہ اپنی اولاد کی پرواکرتے ہیں، نہ مال کی پرواکرتے ہیں، مال بھی اللہ کے راستے میں لگاتے ہیں، اولاد بھی اللہ کے راستے میں لگاتے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے کامیاب ہونے والے وہ ہیں، تو لوگ ظاہری طور پر کس طرح سے سوچتے ہیں اور قرآنِ کریم اُن کو کیا راستہ دکھاتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ: منافقوں کا قصہ پیچھے سُن لیا کہ مال کی محبت میں اور اولاد کی محبت میں کس طرح سے وہ اللہ کے ذکر سے غافل تھے، ”اے ایمان والو! تمہیں غفلت میں نہ ڈال دیں تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے“ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ: جو ایسا کرے گا فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ: یہی لوگ خسارے میں پڑنے والے ہیں، مال واولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر جو اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتے ہیں اصل خسارہ یہی ہے، لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مال واولاد کی ترقی یہی کامیابی ہے، اور اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ مال واولاد کو دین میں خرچ کرنا اور اللہ کے لئے قربان کرنا اصل کامیابی یہ ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کی تاکید اور اہمیت

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ: ”اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے، اس سے قبل کہ آ جائے تم میں سے کسی کو موت، پھر وہ کہے گا کہ اے میرے ربّ! کیوں نہ مجھے ڈھیل دے دی تُو نے تھوڑی سی ایک قریب وقت تک، پھر میں صدقہ کرلیتا اور ہو جاتا نیک لوگوں میں سے“ اُس وقت پھر یہ تمنائیں کرے گا کہ مجھے مہلت کیوں نہ دی یعنی مہلت دے دے۔ اور آگے یہ مجزوم ہے، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تُو مجھے مہلت دے دے تو میں صدقہ کرلوں اور صالحین میں سے ہو جاؤں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ موت کے وقت اس قسم کی تمنا پوری نہیں ہوا کرتی، وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا: ہرگز نہیں ڈھیل دے گا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو جس وقت اس کا وقتِ معین آ جاتا ہے، وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والے ہیں ان کاموں کی جن کو تم کرتے ہو۔ تو یہ اِنفاق کی خصوصیت کے ساتھ جو ترغیب دی جارہی ہے، میں نے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ طاعات ساری ضروری ہیں، جتنی بھی نیکیاں آپ کریں گے سب نیک بختی ہے، لیکن نیکی کو قلب کے اندر جمانے کے لئے اور مزید نیکی کی توفیق حاصل کرنے کے لئے اِنفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، وجہ یہ ہے کہ انسان جتنی بُرائیوں میں مبتلا ہوتا ہے ان میں سے اکثریت ایسی ہے جو حُبِ مال کی بنا پر ہی آتی ہے، مال کی محبت کی بنا پر ہی انسان اللہ تعالیٰ کی معصیت اختیار کرتا ہے، اور اِنفاق کے ساتھ مال کی محبت کی جڑ کٹتی ہے، جب اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی عادت پڑے گی تو مال کی محبت رہے گی نہیں، جب مال کی محبت نہیں رہے گی تو انسان بیسیوں خرابیوں سے بچ جاتا ہے، تو ایمان کو مضبوط کرنے کے لئے اور قلب کے اندر نیکی کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اِنفاق کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

آیاتہا ۱۸ ۶۴ سورۃ التغابن مدنیۃ ۱۰۸ رکوعاتہا ۲

سورۂ تغابن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۸ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۫

پاکی بیان کرتی ہیں اللہ کے لئے وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اسی کے لئے سلطنت ہے، اسی کے لئے سب تعریفیں ہیں

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَ

وہ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے ۝ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے بعض کافر ہیں اور تم میں سے بعض مؤمن ہیں،

اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ

اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ۝ پیدا کیا اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، اور اس نے تمہیں صورتیں دیں

فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور تمہاری صورتوں کو اچھا کیا، اسی کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے ۝ جانتا ہے اُن سب باتوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں

وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

اور جانتا ہے ان باتوں کو جن کو تم چھپاتے ہو اور جن کو تم ظاہر کرتے ہو، اور اللہ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کو ۝

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

تمہارے پاس خبر نہیں آئی؟ ان لوگوں کی جنہوں نے پہلے کُفر کیا تھا، اُنہوں نے اپنے اَمر کے وَبال کا مزہ چکھ لیا، اور ان کے لئے دردناک

اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ

عذاب ہے ۝ یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، تو انہوں نے کہا: کیا بشر ہمیں ہدایت دیتے ہیں؟

فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ

انہوں نے انکار کر دیا اور پیٹھ پھیری، اللہ بھی مستغنی ہو گیا، اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے ۝ گمان کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا

أَنْ يُبْعَثُوا ۚ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا
کہ وہ اُٹھائے نہیں جائیں گے، آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں، میرے رَبّ کی قسم! البتہ ضرور اُٹھائے جاؤ گے تم، پھر خبر دیئے جاؤ گے ان کاموں کی
عَمِلْتُمْ ۚ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۞ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا ۚ
جو تم نے کیے، اور یہ اللہ پر آسان ہے۞ پس ایمان لے آؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نُور پر جو ہم نے اُتارا،
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۞ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۗ
اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۞ جس دِن کہ اکٹھا کرے گا اللہ تمہیں اکٹھا کرنے کے دِن، یہ دِن ہار جیت کا ہوگا،
وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ
اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک عمل کرے اللہ اس سے اس کے سیئات دُور ہٹادے گا، اور داخل کرے گا اس کو جنّات میں
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۞ وَالَّذِينَ
جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، یہ فوزِ عظیم ہے۞ اور وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۞
کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ جہنم والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۞

سورت کا مضمون

سورۂ تغابن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں، دو رُکوع ہیں۔ یہی مضمون جو پچھلی سورت میں ذِکر کیا گیا، آخرت کی یاددہانی کے ساتھ مال واولاد کی قربانی کے اُوپر برانگیختہ کرنا، اور نہ کرنے کی صورت میں آخرت کا خسارہ، اس سورت کے اندر بھی یہی مضمون واضح کیا گیا ہے۔

تفسیر

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: پاکی بیان کرتی ہیں اللہ کے لئے وہ چیزیں جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، بارہا یہ آیت گزر گئی، ''اسی کے لئے سلطنت ہے، اسی کے لئے سب تعریفیں ہیں، وہ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے۔''

تمام اِنسان دو حصوں میں تقسیم ہیں

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ: وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ: پھر تم دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، تم میں سے

بعض کافر ہیں اور تم میں سے بعض مؤمن ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ یہی آگئی تقسیم جو حقیقت کے اعتبار سے تقسیم ہے، یہ ثنائی ہے، انسان دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں یا مؤمن یا کافر، یہ دو ہی برادریاں ہیں، اس کے علاوہ جو بھی تفریق لوگوں نے پیدا کی ہوئی ہے سب غیر شرعی ہے، اور مؤمن مؤمن جتنے ہیں وہ سب بھائی ہیں، پارٹی اگر ہے تو ایک ہی ہے، اہلِ ایمان ایک پارٹی، اہلِ کفر ایک پارٹی۔

اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کا ذکر

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ: پیدا کیا اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ، وَصَوَّرَكُمْ: اور اس نے تمہیں شکلیں دیں، صورتیں دیں، فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ: اور تمہاری اِن صورتوں کو خوبصورت کیا، تمہاری صورتوں کو اچھا کیا، وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ: اسی کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے، يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جانتا ہے اُن سب باتوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ: اور جانتا ہے اُن باتوں کو جن کو تم چھپاتے ہو، وَمَا تُعْلِنُوْنَ: اور جن کو تم ظاہر کرتے ہو،'' اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے دِلوں کی باتوں کو'' بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، صدور صدر کی جمع ہے،'' بِاَسْرَارِ ذَاتِ الصُّدُوْرِ '' سینے میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی جانتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا علم جو ذکر کیا جارہا ہے خاص طور پر اِنسان کے اعمال واقوال کے متعلق اس کا تعلق جزاء کے ساتھ ہے، کہ جب تمہارا کوئی عمل مخفی نہیں، اللہ تمہیں پیدا کرنے والا ہے، صورتیں دینے والا ہے، پھر اللہ نے تمہیں مکلف کیا، اور کوئی حرکت تمہاری مخفی نہیں، تو اس میں ترغیب اور ترہیب کا پہلو ہے، کہ اچھائی کروگے تو اللہ تعالیٰ اس کی جزا دے گا، بُرائی کروگے تو مار کھاؤ گے۔

پچھلی تاریخ کا حوالہ

آگے حوالہ آگیا پچھلی تاریخ کا، اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ: تمہارے پاس خبر نہیں آئی؟ ان لوگوں کی جنہوں نے پہلے کفر کیا تھا، فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ: انہوں نے اپنے اَمر کا وَبال چکھ لیا، اپنے اَمر کے وَبال کا مزہ چکھ لیا، یعنی جو طور طریق انہوں نے اختیار کیا اس کے وبال کا مزہ انہوں نے چکھ لیا؛'' اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''،'' اور یہ اس وجہ سے ہوا'' یعنی اُن کا کفر کی طرف جانا، برباد ہونا، اور اپنے طرز وطریق کے وَبال میں مبتلا ہونا اس وجہ سے ہوا'' کہ ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، تو انہوں نے کہا کیا بشر ہمیں ہدایت دیتے ہیں؟'' یعنی انہوں نے اس بات سے انکار کردیا کہ کسی بشر کو اپنا ہادی بنائیں، ان کے ذہن مین یہ تھا کہ ہادی بشر نہیں ہوسکتا۔

رسالت اور بشریت میں منافات کا عقیدہ مشرکانہ ہے

اگلی بات کی طرف ذرا توجہ دیجئے......! بہت جگہ قرآن کریم میں یہ گزرا ہے کہ مشرکین یہی کہتے تھے کہ تم تو ہم جیسے بشر ہو، تم اللہ کے رسول کیسے ہوگئے؟ ہم تمہاری بات کس طرح سے مان لیں؟ تو گویا کہ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا، اگر

رسول ہوتو کوئی فرشتہ ہو، اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو بھیج دے، تو گویا کہ بشر اور رسالت کے درمیان منافات یہ مشرکین کا ذہن تھا، وہ کہتے تھے کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا، اور انبیاء ﷺ کا چونکہ وہ آنکھوں سے مشاہدہ کرتے تھے، کہ ہماری طرح پیدا ہوئے، ہماری طرح زندگی گزراتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، ان کے تعلقات ہیں، تو بشر ہونے کا تو اُن کو یقین تھا، اس لیے رسول ماننے کے لئے تیار نہیں تھے اسی منافات کے عقیدے کے تحت، اس لیے بشر اور رسالت میں منافات کا عقیدہ اصل کے اعتبار سے مشرکانہ ذہن ہے، چاہے کہے کہ یہ بشر ہیں ہم انہیں رسول نہیں مانتے، چاہے کہے کہ یہ رسول ہیں ہم انہیں بشر نہیں مانتے، منافات دونوں صورتوں میں نمایاں ہے، اور قرآنِ کریم نے واضح یہ کیا ہے کہ اللہ نے جو بھی رسول بھیجے ہیں بشر ہی بھیجے ہیں، رسول بشر ہی ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو فضیلتیں اور کمالات اتنے دیتا ہے کہ عام انسان ان کی گردِ راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے، تو رسالت اور بشریت ان دونوں کا اجتماع ہے اسلامی عقیدے کے تحت، کہ رسول جو بھی ہے وہ بشر ہے، بشر رسول ہوسکتا ہے، ان کے درمیان میں منافات نہیں ہے۔ وہ چونکہ رسولوں کو تو آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ یہ انسان ہیں، بشر ہیں، انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، رہنا سہنا انسانوں کی طرح، کھانا پینا ہماری طرح، سونا اُٹھنا ہماری طرح، تو بشر ہونے کا ان کو یقین تھا تو رسالت کا عقیدہ وہ نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح سے اگر کوئی شخص کسی کو رسول تو سمجھتا ہے اور اس کو بشر ماننے کے لئے تیار نہیں تو حقیقت کے اعتبار سے ذہن وہی مشرکانہ ہے، ایک کو مانا دوسرے کو نہیں مانا، منافات دونوں کے اندر پھر بھی ہوگئی، قضیہ منفصلہ تو بھی بن گیا، اور اصل اسلامی عقیدہ کیا ہے؟ کہ انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول انسان ہی بھیجے ہیں، اور یہ جتنے رسول آئے ہیں سب بشر ہی تھے، اور بشر اور رسالت کے درمیان کوئی منافات نہیں، ہاں! البتہ جس بشر کو اللہ تعالیٰ رسول بنا دیتے ہیں اس کا درجہ کمالات کے اعتبار سے اتنا اُونچا ہوجاتا ہے کہ باقی انسان سارے کے سارے اکٹھے ہوکر اس کے کسی ایک کمال کا مقابلہ نہیں کر سکتے، یہ ہے اصل کے اعتبار سے اسلامی عقیدہ۔ تو پہلے لوگوں کی گمراہی کی بنیاد یہ بتائی گئی کہ وہ کہتے تھے بشر ہمیں ہدایت دیتے ہیں؟ ہم اِن بشروں کو ہادی سمجھ لیں؟ فَكَفَرُوْا: پس اس نظریے کے ساتھ وہ کافر ہوگئے، انہوں نے انکار کیا، مانا نہیں، کہ بشر ہادی نہیں ہوسکتا، ہم بشر کو ہادی نہیں مانتے۔

بشریتِ انبیاء ﷺ کے منکرین کی قرآن میں تحریف

اب یہاں بعض لوگ تحریف کرتے ہوئے یوں بھی کہہ دیا کرتے ہیں، کہ دیکھو! قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ اُن مشرکوں نے کہا کہ کیا بشر ہمیں ہدایت دیتے ہیں؟ بس یہ کہہ کے وہ کافر ہوگئے، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! رسولوں کو انہوں نے بشر کہا تو بشر کہنے کے نتیجے میں کافر ہوگئے، یعنی انہوں نے رسولوں کے متعلق کہا کہ یہ بشر ہمیں ہدایت دیتے ہیں؟ فَكَفَرُوْا: پس وہ کافر ہوگئے، یعنی رسولوں کے اُوپر انہوں نے "بشر" کا لفظ بولا تو کافر ہوگئے، یہ لوگ اس طرح سے کہتے ہیں اور لکھتے ہیں، کہ رسولوں کو بشر کہنے کے نتیجے میں وہ کافر ہوئے، یہ بالکل تحریف ہے، یعنی وہ کہتے تھے بشر تو ہیں، یہ تو ان کا مشاہدہ تھا، لیکن ان کو ہادی ماننے کے لئے وہ تیار نہ ہوئے۔ اسی کے متعلق حضرت شیخ الاسلام ﷫ لکھتے ہیں، کہتے ہیں: "یعنی کیا ہم ہی جیسے آدمی ہادی بنا کر بھیجے گئے؟ بھیجنا تھا تو آسمان سے کسی فرشتے کو بھیجتے، گویا ان کے نزدیک بشریت اور رسالت میں منافات تھی، اس لیے انہوں کُفر اختیار کیا، اور رسولوں کی

بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس آیت سے یہ ثابت کرنا کہ رسول کو "بشر" کہنے والا کافر ہے، اِنتہائی جہل اور الحاد ہے، اس کے برعکس اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ آیت ان لوگوں کے کُفر پر دلالت کر رہی ہے جو رُسل بنی آدم کے بشر ہونے کا انکار کریں تو یہ دعویٰ پہلے دعوے سے زیادہ قوی ہوگا۔" (تفسیر عثمانی) جیسے صحیح مطلب آپ کی خدمت میں ذکر کیا کہ بشر اُن کو مان کر ہادی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، جس میں ذہن یہ نکلا کہ دونوں میں منافات کے قائل تھے، منافات کا قول کرنا یہ مشرکانہ ذہن ہے، یہ بات الفاظ آیت کی طرف زیادہ قریب ہے کہ جو شخص بھی بشر اور رسالت کے درمیان منافات کا قائل ہے، حقیقت کے اعتبار سے وہ کافر ہے۔

فَكَفَرُوْا: انہوں نے انکار کر دیا، وَتَوَلَّوْا: اور پیٹھ پھیری، وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ: اللہ بھی مستغنی ہوگیا، اللہ نے بھی ان کی کوئی پروا نہیں کی، وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ: اللہ تعالیٰ غنی ہے، حمید ہے۔ غنی: بے نیاز، کسی کا محتاج نہیں۔ حمید ہے، اس کے لئے سب کمالات ثابت ہیں، وہ استکمال بالغیر نہیں کرتا کہ دُوسرا کوئی اس کے ساتھ تعاون کرے گا تو اس کو کوئی کمال حاصل ہو، ایسی بات نہیں ہے۔

کُفار کا اِنکارِ معاد اور ان پر رَدّ

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: گمان کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا، اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا: کہ وہ اُٹھائے نہیں جائیں گے، ان کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد وہ اُٹھائے نہیں جائیں گے، منکرِ آخرت ہیں، "آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں، میرے رَبّ کی قسم! البتہ ضرور اُٹھائے جاؤ گے تم، اور پھر خبر دیے جاؤ گے ان کاموں کی جو تم نے کیے" وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ: اور یہ اللہ پر آسان ہے، مارنے کے بعد اُٹھانا بھی آسان، اور تمہارے کیے ہوئے کاموں کو تمہارے سامنے ذکر کر دینا یہ بھی آسان۔

قیامت کا دِن ہار جیت کا دِن ہوگا

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: پس ایمان لے آؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نُور پر جو ہم نے اُتارا، اس نُور سے کتاب اللہ مراد ہے۔ تین چیزیں آ گئیں "اللہ پر ایمان لے آؤ، اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور اس نُور پر ایمان لے آؤ جو ہم نے اُتارا، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔" يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ: جس دِن کہ اکٹھا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں اکٹھا کرنے کے دِن، ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ: یہ دِن ہار جیت کا ہوگا، غبن اصل میں کہتے ہیں خسارے کو، اور تغابن کا معنی ہوتا ہے ایک دُوسرے کو خسارے میں ڈالنا، یعنی اس دِن جا کر پتا چلے گا کہ تم میں سے کس نے کس کو خسارے میں ڈالا؟ کافر جو دُنیا کے اندر مؤمنوں کو شکست دینے کی کوشش کرتے تھے یہ مؤمنوں کو خسارے میں ڈال رہے تھے یا خود خسارے میں پڑ رہے تھے؟ مؤمنین نے ان کو خسارے میں ڈال دیا یا انہوں نے مؤمنوں کو خسارے میں ڈال دیا؟ یہ بات اس دِن جا کر ظاہر ہوگی۔ جس طرح سے قیامت کو یوم الحسرت کے ساتھ تعبیر کیا، کہ ہر کسی کو حسرت ہوگی کہ ہم نے نیکی کیوں نہ کی، ہم نے ایمان کیوں نہ قبول کر لیا، مؤمنوں کو بھی اس دِن حسرت ہوگی کہ ہم نے زیادہ نیکیاں کیوں نہ کر لیں، اسی طرح سے یہ یوم التغابن بھی ہے کہ اس دِن جا کر خسارہ نمایاں ہوگا کہ ہم نے کون سے دُنیا میں کام کیے تھے جس کی بنا پر خسارے میں پڑ گئے، یہ ہے ہار جیت کا دِن، جس میں ہار جیت نمایاں ہوگی، پتا چلے گا کہ کون خسارے میں گیا اور کون نفع میں گیا۔ "اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک عمل کرے اللہ اس سے اس کے

سیئات دُور ہٹادے گا، بُرے اعمال دُور کردے گا، اور داخل کرے گا اس کو جنّات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، یہ فوزِ عظیم ہے"، معلوم ہوگیا کہ ایمان باللہ، عمل صالح یہ نفع کی صورت ہے، جو لوگ یہ تجارت کریں گے، ایمان لائیں گے، نیک عمل کریں گے، آخرت میں کامیاب یہی ہوں گے، باقی خسارے میں پڑ جائیں گے۔" اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ جہنم والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔"

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ

نہیں پہنچتی تمہیں کوئی مصیبت مگر اللہ کے اِذن سے، اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے دِل کو سیدھا راستہ دِکھاتا ہے، اللہ تعالیٰ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى

ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے⑪ اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا کہنا مانو، اگر تم نے پیٹھ پھیری تو

رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

ہمارے رسول کے ذِمّے تو کھول کھول کے پہنچادینا ہی ہے⑫ اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، اور اللہ پر ہی مؤمنین کو

الْمُؤْمِنُوْنَ ⑬ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ

اعتماد کرنا چاہیے⑬ اے ایمان والو! بےشک تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولاد تمہاری دُشمن ہے،

فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑭ اِنَّمَآ

ان سے بچ کے رہا کرو، اور اگر تم انہیں معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بےشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے⑭ اس کے سوا کچھ نہیں

اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑮ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا

کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش کا ذریعہ ہیں، اللہ کے پاس اَجرِ عظیم ہے⑮ ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے جہاں تک

اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ

تم میں طاقت ہے، اور اللہ کی باتیں سنو اور کہنا مانو، اور خرچ کرو اللہ کے راستے میں، بہتر ہے تمہارے لیے، اور جو کوئی شخص اپنے نفس

نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑯ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ

کے بخل سے بچالیا گیا پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں⑯ اگر تم اللہ کو قرض دو گے اچھا قرض تو اللہ تعالیٰ بڑھائے گا اس کو تمہارے لیے

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

اور بخش دے گا تمہیں، اللہ تعالیٰ قدر دان ہے بُرد بار ہے ﴿۱۷﴾ جاننے والا ہے غیب وشہادت کو، زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾

تفسیر

مال جمع کر کے رکھنا مصیبت سے نہیں بچا سکتا

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: اب اصل میں بات وہی کہنی مقصود ہے کہ مال اور اولاد کے بارے میں اللہ کے احکام کی رعایت کیا کرو، جب دِل کے اندر مال کی محبت ہوتی ہے تو ہر مصیبت سے انسان ڈرتا بھی ہے اور مصیبت آ جانے کے بعد بہت پریشان ہو جاتا ہے، اور اگر اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو یوں سمجھے گا کہ جو مصیبت مقدر تھی وہی آئی ہے، ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے، اس لیے یہ خطرہ بھی محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ اگر اللہ کے راستے میں ہم نے خرچ کیا اور بعد میں کسی مصیبت کا شکار ہو گئے تو پھر ہم کیا کریں گے، اس لیے جوڑ کے رکھنا چاہیے جمع رکھنا چاہیے تاکہ کسی مصیبت کے وقت میں ہمارے کام آئے، جو لوگ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور سرمایہ جمع کرتے ہیں تو اصل میں ذہن یہ ہوا کرتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ کام آئے گا، اس ذہن کے تحت انسان پیسے جمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ذہن بھی غلط ہے، مصیبت جو بھی آتی ہے اللہ کے اِذن کے ساتھ آتی ہے، اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں آتی، اور اگر آئے گی تو کسی سرمایہ دار پر بھی آئے گی تو اس کا سرمایہ اس مصیبت کو روک نہیں سکتا، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی مصیبت سے بچائے تو ایک فقیر اور غریب کو بھی بچا لیتا ہے، تو یہ ذہن کہ ہم سرمائے کو جمع رکھنے کے ساتھ مصیبت سے بچ جائیں گے، اور اگر ہمارے پاس سرمایہ نہ ہوا تو ہم مصیبتوں کا شکار ہو جائیں گے، یہ ذہن بھی غلط ہے۔ ''نہیں پہنچتی تمہیں کوئی مصیبت مگر اللہ کے اِذن سے۔''

ایمان کی ترغیب اور کُفّار کے لئے وعید

''اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے دِل کو سیدھا راستہ دِکھاتا ہے'' ایمان کی برکت سے آگے مزید نیکی کی توفیق ہوتی ہے، اور دِل حقیقت کو سمجھ جاتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی جانب سے ہوتا ہے، ہماری تدبیر اس میں کوئی کام نہیں آ سکتی، یہی ہے ہدایت جو قلب کو نصیب ہوتی ہے ایمان کی برکت سے۔ اور جس کے دِل میں یہ بات آ گئی کہ مصیبت من جانب اللہ ہے، ہماری تدبیر اس کے مقابلے میں کچھ نہیں، یوں سمجھو کہ اس کا قلب ہدایت یافتہ ہے، اور جو اپنی تدبیروں کے اُوپر اعتماد کیے ہوئے ہے تو یوں سمجھو کہ اس کا دِل ابھی تک بھٹکا ہوا ہے، ''جو ایمان لائے گا اللہ تعالیٰ اس کے دِل کو سیدھا راستہ دِکھائے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے''۔ ''اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا کہنا مانو، اگر تم نے پیٹھ پھیری تو یاد رکھو! ہمارے رسول کے ذمے تو کھول کھول کے پہنچا دینا ہی ہے'' اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب اگر تم سننے کے بعد مانتے نہیں، اس کے مطابق

عمل نہیں کرتے، تو رسول بری الذمہ ہے، اب ذمہ داری تم پہ ہے۔ ''اللہ کوئی معبود نہیں مگر وہی، اور اللہ پر ہی مؤمنین کو اعتماد کرنا چاہیے'' ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ پر ہی بھروسا کریں۔

بیویوں اور اولاد کے بارے میں ہدایات

''اے ایمان والو! بے شک تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولاد تمہاری دشمن ہے'' ان بیویوں اور اولاد سے وہی بیویاں اور اولاد مراد ہے جو نیکی سے مانع بنتی ہے، نیک کام کرنے نہیں دیتی، رُکاوٹ ڈالتی ہے، اسی طرح سے وہ اولاد جس کی محبت میں مبتلا ہو کر انسان دینی کاموں سے محروم رہ جائے۔ ''بے شک تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولاد تمہاری دشمن ہے، ان سے بچ کے رہا کرو، اور اگر تم انہیں معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'' کیا مطلب؟ کہ جب تمہیں یہ بتا دیا گیا کہ بعض بیویاں اور اولاد تمہاری دشمن ہیں، تو اگر ان کی طرف سے اس قسم کا کوئی مظاہرہ ہو جس میں تم سمجھتے ہو کہ یہ تو ہمارے ساتھ دشمنی ہے، تمہیں دین کے کسی کام سے روکنے کی کوشش کریں، تمہارے کہنے کے باوجود وہ کسی بُرائی کو نہ چھوڑیں، تو ہر وقت انتقامی ذہن بھی نہیں ہونا چاہیے، کہ ان کے ساتھ تعلقات ہی کاٹ دو، ان کے اُوپر مار دھاڑ شروع کر دو، اکثر و بیشتر عفو اور صلح سے کام لیا کرو، سمجھاتے رہو، ہر ہر بات کے اُوپر اس طرح سے گرفت کرنا کہ بالکل ہی تعلقات کاٹ کے رکھ دو، یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ ''معاف کر دو'' سزا نہ دو، ''درگزر کر لو'' زیادہ ملامت نہ کرو، ''اور بخش دو'' دل سے بھلا دو، اگر کوئی اس قسم کی بات وہ کبھی کرتی ہیں اور بعد میں اپنی غلطی کی تلافی کریں اور معافی مانگیں تو معاف کر دو، اس کو اِنتقام کا ذریعہ نہ بناؤ، ''بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''...... ''اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد یہ آزمائش کا ذریعہ ہیں'' اللہ تعالیٰ دُنیا میں مال و اولاد دیتا ہے، اس میں آزمائش ہے کہ تم کہاں تک اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی رعایت رکھتے ہو، کہاں تک اِن کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہو، ''اللہ کے پاس اَجرِ عظیم ہے''...... ''ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے جہاں تک تم میں طاقت ہے، اور اللہ کی باتیں سنو اور کہنا مانو۔''

اِنفاقِ مال کا فائدہ اور حُبِّ مال کا نقصان

وَاَنْفِقُوْا: اور خرچ کرو اللہ کے راستے میں، بہتر ہے تمہارے لیے، میں نے جیسے عرض کیا کہ اِنفاقِ مال یہی ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ بنتا ہے، اور اِنفاقِ مال کے ساتھ ہی انسان مال کی محبت سے محفوظ ہوتا ہے، جس کے بعد پھر اس کے لئے ہر نیکی آسان ہو جاتی ہے اور ہر بُرائی کا چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے، ورنہ حُبِّ مال بیسیوں بیماریوں کا ذریعہ بنتی ہے۔ اَنْفِقُوْا: خرچ کرو، بہتر ہے تمہارے نفسوں کے لئے، وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ: جو کوئی شخص اپنے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ یہاں بھی وہی بات آ گئی، جو بخل میں مبتلا ہو گیا وہ فلاح پانے والا نہیں، بخل میں مبتلا ہوگا تو خرچ نہیں کرے گا، مال جمع کر کر کے رکھے گا، اور یہ پھر آگے بہت ساری خرابیوں کا ذریعہ بنتا ہے، ''جو بچا لیا گیا اپنے نفس کے حرص یا بخل سے'' شُح کا

ترجمہ سورۂ حشر میں آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا، کہ "شح" حرص کو بھی کہتے ہیں اور بخل کو بھی کہتے ہیں، اور ان دونوں کا مبنیٰ حب مال ہے، جب مال کی محبت میں انسان مبتلا ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آئے، یہ حرص ہے، اور آیا ہوا جائے نہ، یہ بخل ہے، "جو اپنے نفس کے شح سے بچالیا گیا پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

اِنفاق فی سبیل اللہ کو قرض سے تعبیر کیوں کیا گیا؟

"اگر تم اللہ کو قرضہ دو گے اچھا قرض تو اللہ تعالیٰ بڑھائے گا اس کو تمہارے لیے اور بخش دے گا تمہیں" قرضِ حسن یعنی حلال مال میں سے دو، خوش دلی کے ساتھ دو، کسی پر احسان نہ جتلاؤ، موقع محل کے مطابق اس کو خرچ کرو، تو اللہ تعالیٰ اس صدقے کو اور خیرات کو قرض کے ساتھ تعبیر کرتا ہے یہ بات ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کا ثواب یقیناً تمہاری طرف لوٹ کے آئے گا، جس طرح سے تم کسی کو قرض دو تو تمہیں یقین ہوتا ہے کہ دُوسرے وقت میں یہ لوٹ کر ہماری طرف آجائے گا، اللہ کے راستے میں دیا ہوا ایسے ہی ہے جیسے کہ تم اللہ کو قرض دے رہے رہو، "اگر تم اللہ کو اچھا قرض دو تو بڑھائے گا اللہ تعالیٰ اُس کو تمہارے لیے اور تمہیں بخش دے گا، اللہ تعالیٰ قدردان ہے، بُردبار ہے، جاننے والا ہے غیب وشہادت کو، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔"

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

آیاتہا ۱۲ ۶۵ سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ ۹۹ رکوعاتہا ۲

سورۂ طلاق مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ

اے نبی! (اپنے اُمتیوں کو یہ تعلیم دے دیجئے کہ) جس وقت تم عورتوں کو طلاق دو تو طلاق دیا کرو ان کو ان کی عدت کے لئے، اور عدت کو شمار کیا کرو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ

اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا ربّ ہے، نہ نکالا کرو ان کو اُن کے گھروں سے، نہ وہ خود نکلیں، مگر یہ کہ ارتکاب کریں وہ

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ

صریح بے حیائی کا، یہ اللہ کے بتائے ہوئے ضابطے ہیں، جو کوئی اللہ کے حدود سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے آپ پہ

نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ۝۱ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ

زیادتی کی، اے مخاطب! تجھے معلوم نہیں، شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور اَمر پیدا کردے ۝ پھر جس وقت وہ اپنی عدت کو پہنچنے لگیں

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّاَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ

تو روک لیا کرو اُن کو اچھے طریقے سے یا جدا کردیا کرو ان کو اچھے طریقے سے، اور اپنے میں سے دو عادل آدمیوں کو گواہ بنالیا کرو،

وَاَقِیۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمۡ یُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ

قائم کیا کرو شہادت کو اللہ کے لئے، یہ بات اِس کے ذریعے سے نصیحت کیا جاتا ہے وہ شخص جو اِیمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخر پر،

وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝۲ وَّیَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ؕ

جو کوئی اللہ سے ڈرے کردے گا اللہ اس کے لئے نکلنے کا ذریعہ ۝ اور اللہ اس کو رزق دے گا ایسی جگہ سے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا

وَمَنۡ یَّتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ

اور جو اللہ پہ بھروسا کرے اللہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اَمر کو پہنچنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز

شَیۡءٍ قَدۡرًا ۝۳ وَالّٰٓـئِیۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ

کے لئے ایک اندازہ متعین کیا ہے ۝ جو عورتیں تمہاری عورتوں میں سے مایوس ہوجائیں حیض سے (ان کی عدت کے بارے میں) اگر تمہیں شبہ ہو

فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنۡ

تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور وہ عورتیں بھی کہ جن کو حیض نہیں آیا، اور حمل والی عورتیں اُن کی عدت یہ ہے کہ

یَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ یُسۡرًا ۝۴ ذٰلِكَ اَمۡرُ

وہ اپنے حمل کو وضع کردیں، جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے معاملے میں آسانی پیدا کردیتا ہے ۝ یہ اللہ کا

اللّٰهِ اَنۡزَلَهٗۤ اِلَیۡكُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرۡ عَنۡهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُعۡظِمۡ لَهٗۤ اَجۡرًا ۝۵

حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف اُتارا، اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس سے اس کی بُرائیاں دُور کرے گا اور اس کے لئے اَجر کو بڑا کرے گا ۝

اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَیۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَیِّقُوۡا

ٹھہرایا کرو اِن عورتوں کو جہاں تم ٹھہرتے ہو اپنی گنجائش کے موافق، اور انہیں نقصان نہ پہنچایا کرو تا کہ تم ان کے اُوپر

عَلَيْهِنَّ ۚ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ

تنگی ڈالو، اور اگر وہ عورتیں حمل والی ہیں تو ان کے اُوپر خرچ کیا کرو یہاں تک کہ وہ اپنے حمل کو وضع کردیں،

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ

اگر وہ عورتیں تمہارے لیے دُودھ پلائیں (ان بچوں کو) تو دیا کرو ان کو ان کے اُجر، اور آپس میں اچھے طریقے سے مشورہ کرلیا کرو، اور اگر

تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۞ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۚ

تم ایک دُوسرے کے اُوپر تنگی کرو گے تو عنقریب اس بچے کو کوئی اور دُودھ پلائے گی ⑥ چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت سے خرچ کرے

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ

اور جس کے اُوپر اس کا رزق تنگ کردیا گیا ہے اسے چاہیے کہ خرچ کرے اسی مال میں سے جو اللہ نے اس کو دیا ہے، نہیں تکلیف دیتا اللہ

نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۞

کسی نفس کو مگر اسی چیز کی جو اللہ نے اس کو دے رکھی ہے، عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد کشادگی کردے گا ⑦

ماقبل سے ربط اور سورۂ طلاق اور سورۂ تحریم کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ طلاق مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، اور اس کی بارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں۔ پچھلی سورت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا تھا کہ تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولاد دشمن ہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ، اور بیویوں اور اولاد کی دشمنی اس پہلو سے ہے کہ بسا اوقات انسان ان کے ساتھ محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اَحکام سے غافل ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے حالات پیدا ہوجانے کے بعد کشاکشی کی نوبت بھی آجاتی ہے، اور اُس کشاکشی میں جدائی کی نوبت بھی آجاتی ہے، آگے جو دو سورتیں آپ کے سامنے آرہی ہیں سورۂ طلاق اور سورۂ تحریم، ان میں خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے معاملات ہی زیرِ بحث لائے گئے ہیں، اور حاصل ان دونوں سورتوں کا یہ ہے کہ گھر کے معاملات میں انسان کو بہت محتاط ہونا چاہیے، اگر آپس میں ناگواری پیش آجائے تو بھی اللہ تعالیٰ کے حدود کی رعایت رکھو، یہ نہ ہو کہ اگر نفرت ہوگئی اور آپس میں کوئی بدمزگی ہوگئی تو غصے میں آکر اللہ کی حدود کو بھی پھلانگ جاؤ، جس طرح سے جاہلیت میں عادت تھی، کہ یک دم بیوی کو کئی کئی طلاقیں دے دیتے، گھر سے نکال دیتے، نان نفقے کا خیال نہ کرتے، یہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ اور محبت اگر ہو تو محبت میں بھی اعتدال ہونا چاہیے، اپنی ازواج کی دلداری کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ پہلی سورت میں ناگواری کے حالات زیرِ بحث ہیں، اور دُوسری سورت میں سرورِ کائنات ﷺ کے واقعے کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ

بیویوں کے ساتھ محبت اور تعلق کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے، محبت ہو یا عداوت، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ حدود کی پابندی کرو، دونوں سورتوں میں حاصل مضمون یہ ہے، پہلی سورت کے اندر طلاق اور عدت کے اَحکام ذکر کیے گئے ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک علیحدگی کا مسئلہ ہے، کہ اگر خاوند بیوی کی آپس میں بن نہ سکے تو خوش گوار طریقے سے، احسن طریقے سے علیحدگی اختیار کر لی جائے، تو ان اَحکام کی کچھ تفصیل سورۂ بقرہ میں بھی گزری ہے، سورۂ نساء میں بھی گزری ہے، اور اِس سورت کے اندر بھی کچھ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

تفسیر

طلاق دینے کا وقت اور عدّت کیا ہے؟

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ: خطاب ہے حضور ﷺ کو، اور آگے مسئلہ ذِکر کیا جا رہا ہے عام لوگوں کی طرف نسبت کر کے، جس سے معلوم ہو گیا کہ حضور ﷺ کو یہ خطاب ذاتی حیثیت سے نہیں، بلکہ اُمت کے ایک نمائندہ کے اعتبار سے ہے، کہ نبی ﷺ کو یہ کہا جا رہا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو یہ تعلیم دے دیجئے ''اے نبی! آپ اپنے اُمتیوں کو یہ تعلیم دے دیجئے'' اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ: کہ جس وقت تم عورتوں کو طلاق دو، یعنی طلاق دینے کا ارادہ کرو، فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ: طلاق دیا کرو ان کو ان کی عدّت کے لئے، لِعِدَّتِهِنَّ کی توجیہ ہے مُسْتَقْبِلَاتٍ لِعِدَّتِهِنَّ (نسفی)، اُن کو ایسے حال میں طلاق دیا کرو کہ وہ اپنی عدت کا استقبال کرنے والی ہوں، یعنی ان کی عدّت شروع ہونے والی ہو، اَحناف کے نزدیک ''عدّت'' سے مراد ''حیض'' ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ حیض شروع ہونے سے پہلے اُن کو طلاق دے دیا کرو ''طہر'' میں، اور اَحادیث[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ ''طہر'' بھی ایسا ہونا چاہئے کہ جس ''طہر'' میں بیوی کے ساتھ مجامعت کی نوبت نہیں آئی، سُنّت طریقے کے مطابق طلاق کا وقت یہی ہے۔ اور اگر لام کو وقت کے معنی میں لیا جائے ''اُن عورتوں کو عدت کے وقت طلاق دیا کرو''، تو پھر سید شیخنا الانور رحمہ اللہ کی توجیہ کے مطابق عدت دو قسم کی ہے، ایک ہے عدّتِ طلاق، اور ایک ہے عدّتِ تطلیق، تطلیق کا مطلب یہ ہے کہ مرد کے طلاق دینے کے لئے شریعت نے جو وقت متعین کیا ہے اس کو بھی ''عدت'' کہتے ہیں، اور طلاق پانے کے بعد عورت جو اپنے دِن شمار کرتی ہے علیحدگی کے لئے، اس کو بھی ''عدت'' کہتے ہیں، تو عدتِ تطلیق ''طہر'' ہے، طلاق دینے کا وقت احادیث کی روشنی میں ''طہر'' ہے، تو پھر یہاں ''عدّت'' سے مراد ہو جائے گا اُن کی عدّت، یعنی جو وقت طلاق دینے کے لئے اللہ نے متعین کیا ہے ایسے وقت میں طلاق دیا کرو،[2] پھر بھی حاصل وہی نکلا کہ ''طہر'' میں طلاق دیا کرو، ''جب تم طلاق دینے کا ارادہ کر لو عورتوں کو تو طلاق دیا کرو اُن کو اُن کی عدت سے پہلے، یا، اس حال میں کہ وہ اپنی عدت کا استقبال کرنے والی ہوں'' وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ: اور عدت کو شمار کیا کرو، عدت کے دِن شمار کیا کرو تا کہ عدت میں اختلاط واقع ہو جانے کی صورت میں آگے حرام حلال پر اثر نہ پڑے، صحیح طور پر عدت گزرنی چاہئے۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۷۲۹، کتاب التفسیر۔ سورۃ الطلاق/ مشکوٰۃ ۲/ ۲۸۳ باب الخلع والطلاق کی دوسری حدیث۔

(۲) فیض الباری ۵/ ۴۲۷، کتاب التفسیر۔ سورۃ الطلاق۔

خانگی معاملات کے ضمن میں تقویٰ کی تاکید کیوں؟

وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ: اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا ربّ ہے۔ یہ خانگی معاملات میں بار بار تقوے کی تاکید آ رہی ہے، جس سے ان اَحکام کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یہ عورتوں کے مسئلے اور گھر کے معاملات، ان کو کتنی اہمیت کے ساتھ انسان ادا کرے، کہ ایک ایک حکم میں کوتاہی بہت بڑے بڑے فسادات کا ذریعہ بن جاتی ہے، ''اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا ربّ ہے۔''

دورانِ عدّت مطلقہ کو گھر سے نکالنے یا اس کے نکلنے کے متعلق اَحکام

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ: نہ نکالا کرو ان کو ان کے گھروں سے، یعنی جن گھروں میں وہ نکاح کی صورت میں رہتی تھیں، بُیُوتِهِنَّ سے وہی بیوت مراد ہیں، یعنی نکاح ہونے کی صورت میں جن گھروں کے اندر تم نے انہیں ٹھہرایا ہوا تھا طلاق دیتے ہی ان کو گھروں سے نکال نہ دیا کرو۔ فقہ کے اندر ان اَحکام کی تفصیل آپ نے پڑھی کہ عدت میں بھی عورت کا سکونت والا حق باقی رہا کرتا ہے، نفقہ بھی خاوند کے ذمے ہوتا ہے اور سکنیٰ بھی خاوند کے ذمے ہوتا ہے، جب تک عدت باقی ہے تو اس کی رہائش کا حق ہے، تو اُس کو طلاق دیتے ہی جاہلیت کے طور پر گھر سے نکال دینا مناسب نہیں، ''نہ نکالا کرو اُن کو اُن کے گھروں سے'' وَلَا يَخْرُجْنَ: نہ وہ خود نکلیں، اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: مگر یہ کہ ارتکاب کریں وہ صریح بے حیائی کا، یعنی اگر وہ صریح بے حیائی کا اِرتکاب کرتی ہیں تو ایسی صورت میں تم ان کو گھروں سے نکال سکتے ہو، یعنی عدت کے زمانے میں وہ تمہاری ہدایات کی پروا نہیں کرتیں، یا جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان درازی کرتی ہیں، ہر وقت لڑتی ہیں، یا کوئی اور بے حیائی کی حرکتیں کرتی ہیں، تو ایسے وقت میں سزا کے طور پر ان کو نکال دیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور ایک توجیہ اس کی یہ بھی کی گئی ہے (یہ جو پہلے میں نے ترجمہ کیا ہے اس کے مطابق اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ کا تعلق لَا تُخْرِجُوْهُنَّ کے ساتھ ہے، ''تم ان کو نکالا نہ کرو ان کے گھروں سے مگر یہ کہ ارتکاب کریں وہ صریح بے حیائی کا'' ایسی صورت میں تم ان کو گھروں سے نکال سکتے ہو) اور اس کا تعلق لَا يَخْرُجْنَ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، کہ وہ عورتیں گھروں سے نہ نکلیں مگر اس حال میں کہ وہ ارتکاب کریں صریح بے حیائی کا، کیا مطلب؟ کہ اُن کا گھروں سے نکلنا ایسے حال کے ساتھ ہی متلبس ہے کہ یہ نکلنا خود صریح بے حیائی ہے، اگر نکلیں گی تو صریح بے حیائی کا ارتکاب کرتی ہوئی نکلیں گی، ورنہ وہ عورتیں گھروں سے نکل نہیں سکتیں، تو گویا ان کا گھروں سے نکل کے جانا بھی ارتکاب ہے بے حیائی کا، ''نہ نکلیں وہ اپنے گھروں سے مگر وقت ارتکاب کرنے ان کے صریح بے حیائی کا''، پھر یہ مفہوم ہو جائے گا، تو گویا کہ عورتوں کا گھروں سے نکل جانا بھی اُن کی غلط حرکت ہے (مظہری وغیرہ)۔

اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے ضابطوں میں مصلحت ہے

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: یہ اللہ کے بتائے ہوئے ضابطے اور قاعدے ہیں، وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ: جو کوئی اللہ کے حدود سے تجاوز کرے اس نے اپنے آپ پہ زیادتی کی، جتنے بھی قاعدے ضابطے آ گئے، احادیث میں ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے جو

سرورِ کائنات ﷺ نے سمجھایا کہ ''حیض'' میں طلاق نہ دی جائے، ایسے ''طہر'' میں طلاق نہ دی جائے جس میں مجامعت کی گئی ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ طلاقیں نہ دی جائیں، طلاق دی جائے تو صریح لفظ کے ساتھ دی جائے تاکہ اس کے بعد پھر رُجوع وغیرہ کرنا آسان ہو، یہ سب اللہ کے بتائے ہوئے ضابطے ہیں جن کی رعایت رکھنی چاہیے اور اِنہی ضابطوں میں مصلحت ہے۔

عورت کو شرعی طریقے سے علیحدہ کرنے میں ہی فائدہ ہے

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا: اے مخاطب! تجھے نہیں معلوم، شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور اَمر پیدا کردے۔ یعنی وقتی طور پر ناگواری ہوگئی، ناگواری کے بعد غصے میں آ کے تمام دروازے اپنے لیے بند نہیں کر لینے چاہئیں، اللہ کے ان ضابطوں کی رعایت رکھو، ہوسکتا ہے بعد میں کوئی اور اَمر پیدا ہوجائے، پھر خوش گواری پیدا ہوجائے، دوبارہ پھر تم اکٹھا رہنے پر آمادہ ہوجاؤ، تو طریقہ ایسا اختیار کرو کہ اکٹھا رہنے کی گنجائش ہو، اور اگر غصے میں آ کر ایسا طریقہ اختیار کرلیا کہ اکٹھا رہنے کی گنجائش ہی نہ ہو تو آنے والے وقت میں مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔ آئے دِن یہ واقعات سامنے آتے رہتے ہیں کہ غصے میں آ کر خاوند طلاق دے دیتا ہے، اور تھوڑی دیر کے بعد ندامت ہوتی ہے، بچوں کی وجہ سے، گھر کے دیگر معاملات کی وجہ سے، رشتہ داریوں کے لحاظ کی وجہ سے، پھر مسئلہ پوچھنے کے لئے آتے ہیں، لیکن طلاق ایسی دے بیٹھتے ہیں کہ جس کے بعد رُجوع کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی، پھر سوائے اس کے کہ خاندان اُجڑیں اور گھر برباد ہوں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، تو غصے میں آ کر اگر عورت کو علیحدہ بھی کرنا ہے تو اپنی عقل کو ٹھکانے رکھو، ایسے طور پر علیحدہ کرو کہ جس کے بعد دوبارہ پھر جُڑنے کی گنجائش باقی رہ جائے، اُس کی صورت یہی ہے کہ ایک طلاق دو، صریح طلاق دو جس کے بعد رُجوع کیا جاسکے، اور سختی کرکے گھر سے بھگا نہ دو، گھر میں اکٹھے رہو، ہوسکتا ہے کہ پاس پاس رہنے کی وجہ سے پھر ایک دُوسرے کی طرف رغبت ہوجائے اور حالات ٹھیک ہوجائیں، تو لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا میں انہی باتوں کی طرف اشارہ ہے، کہ تجھے کیا معلوم، اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور بات پیدا کردے، اس لیے حکمت اور مصلحت اللہ ہی جانتا ہے، تو علیحدگی بڑے اچھے طریقے کے ساتھ ہونی چاہیے۔

''طلاقِ رجعی'' کا حکم

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ: پھر جس وقت وہ اپنی عدت کو پہنچنے لگیں، اُن کی عدت گزرنے کے قریب ہوجائے، یہاں بلوغِ اجل سے قُربِ بلوغ مراد ہے، کیونکہ آگے فَاَمْسِكُوْهُنَّ ذکر کیا ہوا ہے کہ تم ان کو روک لیا کرو، روکنا عدت کے اندر ہوتا ہے، عدت کے بعد نہیں، اس لیے اس کا ترجمہ یوں کریں گے ''جس وقت ان کی عدت گزرنے لگے، تو روک لیا کرو ان کو اچھے طریقے سے یا جُدا کردیا کرو ان کو اچھے طریقے سے'' یعنی پھر تمہیں دونوں اختیار ہیں، اگر رُجوع کرنا چاہو تو رُجوع بھی کرسکتے ہو، اور رُجوع نہیں کرنا چاہتے تو رُجوع نہ کرو اور اچھے طریقے کے ساتھ ان کو جُدا کردو۔

بوقتِ رُجوع گواہ بنانے کا حکم اور اس میں حکمت

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ: اور اپنے سے دو عادل آدمیوں کو گواہ بنالیا کرو، یعنی طلاق دینے پر بھی اور رُجوع کرنے پر بھی، تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا وغیرہ ہوجائے تو مسئلہ حل کرنا آسان ہوجائے، لیکن یہ اِشہاد مستحب ہے، واجب نہیں، اگر کوئی موجود نہ ہو اور خلوت میں طلاق دے دی جائے تو بھی واقع ہوجاتی ہے، اور اسی طرح سے خلوت میں بغیر کسی کی موجودگی کے رُجوع کرلیا جائے تو بھی رُجوع ہوجاتا ہے، لیکن اگر گواہ موجود نہ ہوں تو جھگڑے کی صورت میں فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، تو بہتر ہے کہ ان معاملات میں گواہ بنالیے جائیں، طلاق دو تو بھی دو آدمیوں کی موجودگی میں دو، رُجوع کرو تو بھی دو آدمیوں کی موجودگی میں کرو، تاکہ جھگڑے کی صورت میں معاملے کا حل آسان ہوجائے۔

گواہ کی شرائط اور گواہوں کو نصیحت

''اپنے میں سے دو آدمیوں کو گوہ بنالیا کرو جو عدل والے ہوں'' اس سے معلوم ہوگیا کہ شاہد عادل ہونا چاہیے، اور مِّنْكُمْ سے اشارہ ہوگیا کہ مسلمان ہونا چاہیے، اور اسی طرح سے خطاب چونکہ آرہا ہے مکلّف مَردوں کو تو جس سے معلوم ہوگیا کہ بالغ ہونے چاہئیں، یہی شرطیں گواہوں میں ہوتی ہیں، مسلمان ہو، عاقل ہو، بالغ ہو، عادل ہو، ایسے گواہ کی گواہی قابلِ قبول ہوتی ہے۔ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ: یہ شاہدوں کو نصیحت کردی، ''اللہ کے لئے گواہی قائم کیا کرو'' یعنی گواہ بننے کے بعد پھر اگر گواہی ادا کرنے کی نوبت آجائے تو اس میں کسی کی رُورعایت نہ کیا کرو، جو تمہارے علم میں آئی ہوئی بات ہے وہی کہا کرو، ''قائم کیا کرو شہادت کو اللہ کے لئے'' ذٰلِكُمْ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: یہ بات، اس کے ذریعے سے نصیحت کیا جاتا ہے وہ شخص جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور یومِ آخر پر۔

تقویٰ اور توکّل کی تاکید اور برکات

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا: یہ پھر تقویٰ کی تاکید ہے، ''جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے مخرج بنادیتا ہے'' مخرج: نکلنا، خروج کے معنی میں، یعنی اللہ تعالیٰ اس کے لئے مشکلات سے چھوٹنے کا ذریعہ پیدا فرمادیتے ہیں، اللہ کے تقوے کے نتیجے میں دُنیا اور آخرت کی مشکلات سے نجات کے ذرائع انسان کو مہیا ہوجاتے ہیں، مشکلات حل ہوجاتی ہیں، ''کردے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کا ذریعہ مشکلات سے'' وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ: اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کو رزق دے گا ایسی جگہ سے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا، تو اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ خیال نہ کرو کہ ایسی صورت میں اگر ہم بیویوں کو رکھیں گے تو ان کو خرچ دینا پڑے گا، خرچ میں تنگی آجائے گی، ایسا نہیں، اللہ کے اَحکام کی اگر رعایت رکھو گے تو اللہ تمہیں ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے تمہارا گمان بھی نہیں ہے۔ اور واقعہ بھی ایسے ہی ہے کہ رزق کا ذریعہ وہی متعین نہیں جو آپ کے علم میں ہے کہ فلاں ذریعے سے ہمیں روزی مل رہی ہے، بیسیوں سینکڑوں دروازے رزق کے ہیں، اور اُن کا اِحساس انسان کو اسی وقت ہوتا ہے جب کسی موقع پر

آ کر انسان کے لئے وہ رزق کا دروازہ کھلتا ہے، اس لیے ہر وقت اللہ کے اَحکام کی رعایت رکھو، اس سے ڈرتے رہو، یہ خیال نہ کرو کہ اگر ہم نے یوں کرلیا، شریعت کے اس مسئلے پر عمل کیا تو ہمیں نقصان پہنچے گا، ہمارے رزق میں کمی آجائے گی، ایسی بات نہیں، ''جوکوئی اللہ سے ڈرے، تقویٰ اختیار کرے، رزق دے گا اس کو اللہ تعالیٰ ایسی جگہ سے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں'' وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ: اور جو اللہ پہ بھروسا کرے اللہ اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تو تقویٰ اور توکل کی تاکید کی جارہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ: بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اَمر کو پہنچنے والا ہے، ''پہنچنے والے'' کا یہاں مطلب یہ ہے کہ جو چاہے کرتا ہے، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ متعین کیا ہے، جب چاہے جتنا چاہے اللہ تعالیٰ واقع کرتے ہیں۔

عدّتِ طلاق اور عدّتِ وفات کی تفصیل

آگے عدّت کا مسئلہ آ گیا، سورۂ بقرہ میں بھی اس کی تفصیل گزری۔ ۱۔ منکوحہ جب آزاد ہو اور ذوات الحیض میں سے ہو، (یعنی جن عورتوں کو حیض آتا ہے) اور حاملہ نہ ہو تو اس کی عدّت آپ کے سامنے آئی تھی تین قروء، يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (سورۂ بقرہ: ۲۲۸)، اور قروء کا ترجمہ اَحناف کے نزدیک ''حیض'' ہے، تو تین حیض اس کی عدّت ہے، تین حیض تک وہ اپنے آپ کو روک کے رکھے۔ ۲۔ اور اگر وہ عورت حاملہ ہے تو حاملہ ہونے کی صورت میں عدّت وضعِ حمل ہے۔ ۳۔ اور باندی اگر ہو تو اس کی عدّت دو حیض ہے، وہ چونکہ اب موجود نہیں اس لیے اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، عدّتِ طلاق یہی آپ کے سامنے ذکر کی گئی تھی۔ ۴۔ اور اگر وہ عورت ذوات الحیض میں سے نہ ہو، اس کو حیض آتا نہیں، یا حیض کی عمر سے وہ گزر گئی، جس کو ''آئسہ'' کہتے ہیں، زیادہ بوڑھی ہوگئی، اس کی عدّت سورۂ بقرہ میں ذکر نہیں کی گئی، تو جب وہ عدّت کا مسئلہ ذکر کیا گیا کہ تین حیض تک اپنے آپ کو روک کے رکھے، تو لوگوں کے دِلوں میں کھٹکا پیدا ہوا کہ جو حیض والی نہیں ہیں پھر وہ عدّت کیسے گزاریں؟ اُس کھٹکے کو اللہ تعالیٰ نے یہاں دُور کر دیا، کہ جن کو حیض نہیں آتا، جو حیض سے مایوس ہوگئی ہیں یا بچپن کی وجہ سے حیض نہیں آتا، ان کو اگر طلاق دے دی جائے تو ایسی صورت میں ان کی عدّت تین مہینے ہیں، تین مہینے یہ تین حیضوں کے قائم مقام ہیں۔ لیکن یہ عدّت کا مسئلہ جو ذکر کیا جارہا ہے اس صورت میں ہے کہ جب وہ عورت مدخولہ ہو، جس کے ساتھ خلوتِ صحیحہ ہو چکی ہو، اور اگر نکاح ہوا ہے اور خلوتِ صحیحہ کی نوبت نہیں آئی تو پھر یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں آیا تھا کہ ان عورتوں کے ذمے کوئی عدّت نہیں ہے تمہارے لیے، طلاق ہوتے ہی وہ فارغ ہوجایا کرتی ہیں۔ نکاح ہوا، خلوت کی نوبت نہیں آئی، رُخصتی نہیں ہوئی، خاوند کے ساتھ ان کی ملاقات نہیں ہوئی، تو ایسی صورت میں عدّت نہیں ہوا کرتی۔ تو عدّت کی جو تفصیل ذکر کی جارہی ہے یہ ساری کی ساری مدخولہ کے متعلق ہے، جس کو خاوند کے ساتھ خلوت کرنے کا موقع مل گیا۔ اور عدّتِ وفات، وہ بھی آپ کے سامنے ایک شق اس کی سورۂ بقرہ میں گزر چکی، کہ جن کے خاوند فوت ہوجاتے ہیں وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دِن روک کے رکھیں، تو وہاں بھی ایسی عورتیں مراد ہیں جو حاملہ نہیں ہیں اور آزاد ہیں، چار مہینے دس دِن ان کو عدّت گزارنی پڑتی ہے، اور اس میں وہ سوگ کرتی ہیں، زیب و زینت نہیں کرسکتیں۔ اور اگر وہ بھی حاملہ ہوں تو یہ مسئلہ یہاں صاف ہوگیا کہ اُن کی عدّت بھی وضعِ حمل ہے، چاہے وہ مہینے میں ہوجائے، چاہے نو مہینے میں ہوجائے، جس وقت بچہ

جنیں گی اس وقت وہ فارغ ہوں گی اور عدت گزرے گی، پھر چار مہینے دس دن کی رعایت نہیں ہے، بلکہ وضع حمل کی رعایت ہے..... حاصل یہ ہوا کہ حاملہ عورت کی عدت، چاہے عدتِ طلاق ہو، چاہے عدتِ وفات ہو، وہ تو وضعِ حمل ہے، اور مطلقہ کی عدت حاملہ ہونے کی صورت میں وضعِ حمل، اور اگر حاملہ نہ ہو اور ذوات الحیض میں سے ہو تو تین حیض، اور اگر ذوات الحیض میں سے نہ ہو تو تین مہینے، یہی مسئلہ آگے ذکر کیا جارہا ہے۔

دورانِ عدت سکنیٰ اور نفقہ کا حکم

اور عدت میں بھی عورت کو سکنیٰ دینا پڑتا ہے اور نفقہ دینا پڑتا ہے، چاہے وہ حاملہ ہو، چاہے حاملہ نہ ہو، یہاں مسئلہ ذکر کیا جارہا ہے کہ حمل کی صورت میں اللہ نے صراحت کی ہے کہ ان کو خرچ دیا کرو، اس کی وجہ یہ ہے کہ حمل بسا اوقات لمبا ہوجاتا ہے، تو کہیں خرچ دینے سے انسان اُکتا نہ جائے، اس لیے اِس کی تاکید کردی، ورنہ روایات اور آیات سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورت چونکہ عدت میں بھی اُسی مرد کے حق میں محبوس ہے، وہ کسی طرف جانہیں سکتی، اس حبس کی جزاء کے طور پر جیسے نفقہ نکاح کی صورت میں دیا جاتا ہے اسی طرح سے عدت کی صورت میں بھی نفقہ دیا جائے گا، عورت خاوند کے حق میں ہی رُکی ہوئی ہے، جیسے نکاح میں محبوس ہوتی ہے اسی طرح سے عدت میں بھی محبوس ہے، تو نفقہ یہ جزاءِ حبس ہے، جب یہ عورت کسی اور طرف نہیں جاسکتی تو جس وقت تک اس خاوند کے حق کے طور پر وہ اس گھر کے اندر رکی رہے گی تو خرچہ خاوند کے ذِمّے ہوگا۔

خلاصۂ آیات

وَالّٰٓئِىۡ يَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِيۡضِ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ: مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ یہ الّٰٓئِىۡ کا بیان ہے، جو عورتیں تمہاری عورتوں میں سے مایوس ہوجائیں حیض سے، ان کی عدت کے بارے میں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے، وَّالّٰٓئِىۡ لَمۡ يَحِضۡنَ: اور وہ عورتیں بھی کہ جن کو حیض نہیں آیا، اس سے چھوٹی بچی مراد ہوجائے گی، ان کو بھی اگر طلاق ہوجائے، اور وہ مدخولہ ہوں، خاوند کے پاس وہ جاچکی ہوں، ان کی عدت بھی تین مہینے ہے، اور جن کی عمر گزر گئی، آئسہ ہوگئیں، بڑھاپے کی طرف چلی گئیں، ان کی عدت بھی تین مہینے۔ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ کا معنی ہے کہ اگر ان کے بارے میں تمہیں تردّد ہے، شبہ ہے، چونکہ پہلے ذوات الحیض کی عدت بیان کردی گئی، تو اس کے بعد خواہ مخواہ کھٹکا قلب میں پیدا ہوا کہ جن کو حیض نہیں آتا پھر آخر ان کی کیا عدت ہے؟ تو اس کی وضاحت اِس آیت کے اندر کردی گئی۔ وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ: اور حمل والی عورتیں اَجَلُهُنَّ اَنۡ يَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ: ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل کو وضع کردیں۔ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ يُسۡرًا: یہ پھر تقویٰ کی تاکید ہے، جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے معاملے میں آسانی پیدا کردیتا ہے، تقوے کی صورت میں اللہ کی نصرت ہوتی ہے، مشکلات حل ہوتی ہیں، ''اور یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف اُتارا، اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس سے اس کی بُرائیاں دُور کرے گا اور اس کے لئے اجر کو بڑا کرے گا''، اس لیے خانگی معاملات میں بھی جو اَحکام دیے جارہے ہیں ان کی رعایت رکھو یہ بھی تقویٰ ہے، تقوے کا تقاضا ہے کہ ان اَحکام کی رعایت رکھی جائے، اور اس تقوے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دینی ودُنیوی برکات سے مالا مال کرے گا۔ اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ: ٹھہرایا کرو ان عورتوں کو یعنی جن کو تم نے طلاق دی

ہے، ٹھہرایا کرو ان عورتوں کو جہاں تم ٹھہرتے ہو مِنْ وُّجْدِكُمْ: اپنی گنجائش کے موافق، وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ: اور انہیں نقصان نہ پہنچایا کرو تا کہ تم ان کے اُوپر تنگی ڈالو، یعنی اگر بغض کی بنا پر، نفرت کی بنا پر طلاق بھی دے دی تو بھی ان کو تنگ کرنے کی کوشش نہ کرو، ''نہ نقصان پہنچایا کرو انہیں تا کہ تم ان کے اُوپر تنگی ڈالو'' وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ: اور اگر وہ عورتیں حمل والی ہیں فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ: تو ان کے اُوپر خرچ کیا کرو، حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ: یہاں تک کہ وہ اپنے حمل کو وضع کردیں، تو حاملہ کے لئے خرچ کی یہاں صراحت کردی چونکہ حمل کی مدت لمبی بھی ہوسکتی ہے، تو خرچ دیتے ہوئے کہیں اُکتا نہ جانا، اس کو اپنے گھر میں رکھو، خرچ بھی دیتے رہو جس وقت تک حمل وضع نہ کردے۔

دُودھ پلانے کی اُجرت کے متعلق اَحکام

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ: حمل وضع ہوجانے کے بعد اب وہ تمہاری بیوی نہیں رہی، عدّت ختم ہوگئی، اب اس کے بعد بچّے کی پرورِش کا مسئلہ ہے، اگر وہ عورت بچّے کو پالے اور دُودھ پلائے تو دُودھ پلائی کی اُجرت اس کو دِیا کرو، یعنی منکوحہ ہونے کی صورت میں تو اگر عورت بچّے کو دُودھ پلاتی ہے تو پھر وہ نئی اُجرت کی حق دار نہیں، وہی نفقہ اس کو ملے گا جو منکوحہ کو ملا کرتا ہے، لیکن اگر وہ مطلقہ ہوچکی اور اس کی عدّت گزر گئی ایسی صورت میں اگر وہ تمہاری اولاد کو پالتی ہے تو پھر وہ اُجرت لینے کی حق دار ہے، یہ مرضعات کا مسئلہ بھی آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے، ''اگر وہ عورتیں تمہارے لیے دُودھ پلائیں ان بچوں کو'' فَاٰتُوْهُنَّ: تو دیا کرو ان عورتوں کو ان کے اجر، وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ: اور آپس میں اچھے طریقے سے مشورہ کرلیا کرو، اُجرت متعین کرنے کے لئے کہ بچّے کو اس کے پاس چھوڑنا بہتر ہے یا نہیں، کتنی اُجرت دینی ہے، آپس میں مشورے کے ساتھ طے کرلیا کرو، وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ: اور اگر تم ایک دُوسرے کے اُوپر تنگی کروگے، تنگی کرنا دونوں طرح سے ہی ہے، ماں تنگی کرتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ پیسے مانگتی ہے، یا باپ تنگی کرتا ہے کہ مناسب اُجرت بھی نہیں دیتا، تو فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى: تو عنقریب اس بچّے کو کوئی اور دُودھ پلائے گی، کوئی اور عورت دُودھ پلادے گی، اس میں تنبیہ دونوں کے لئے ہے، باپ کو تو بایں معنی کہ تُو اگر اس کی والدہ کو خرچ نہیں دیتا تو آخر کسی کو تو دے گا؟ دُودھ پلانے کے لئے کوئی عورت تو لے گا؟ تو جو پرائی عورت کو دینا ہے وہ اسی کو ہی دے دے۔ اور ماں کو تنبیہ بایں معنی ہے کہ اگر تُو تنگی کرے گی اور خواہ مخواہ بوجھ ڈالے گی تو دُودھ پلانے کے لئے کوئی اور عورت مل جائے گی، آخر بچّے کو تو پالنا ہی ہے کسی نہ کسی صورت میں، تو بہتر یہ ہے کہ آپس میں اچھی طرح سے مشورہ کر کے اتفاق کے ساتھ، جس میں بچّے کی مصلحت ہو، وہ بات طے کرلیا کرو، نہ ماں کی طرف سے کوئی تنگی ہونی چاہیے، نہ باپ کی طرف سے کوئی تنگی ہونی چاہئے۔

بچّے کے خرچ کا حکم

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ: یہ بچّے پر خرچ کا مسئلہ ہے، کہ چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت سے خرچ کرے وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ: اور جس کے اُوپر اس کا رزق تنگ کردیا گیا ہے اسے چاہیے کہ خرچ کرے اسی مال میں سے جو اللہ نے اس کو دیا ہے،

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰہَا: نہیں تکلیف دیتا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مگر اسی چیز کی جو اللہ نے اس کو دے رکھا ہے، باپ اگر خوش حال ہے تو اس کو خوش حال والا خرچ دینا چاہیے، اور اگر وہ تنگ دست ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے، اللہ کی طرف سے انسان مکلف اتنا ہی ہے جتنی اس کے پاس وسعت ہے، وسعت سے زیادہ اللہ اسے مکلف نہیں کرتا۔

تنگی میں صبر کی تاکید

سَیَجْعَلُ اللّٰہُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا: عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد کشادگی کردے گا، وقتی طور پر اگر خرچ میں تنگی آجائے تو بھی گھبرانا نہیں چاہیے، جاہلیت میں جس طرح سے خرچ کی تنگی کی بنا پر اولاد کو قتل کردیا جاتا تھا، اُس کے بوجھ کو انسان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا، ایسی کوئی بات نہیں، چند دن کے لئے اگر تنگی آبھی جائے تو صبر سے گزارو، اللہ تعالیٰ اس تنگی کے بعد کشادگی کردے گا۔

وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا ۙ وَّ
کتنی ہی بستیاں سرکش ہوگئیں اپنے رَبّ کے حکم سے اور اس کے رسولوں کے حکم سے، پھر ہم نے ان کا محاسبہ کیا بہت سخت محاسبہ، اور

عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝۹
عذاب دیا ہم نے اُن کو سخت عذاب ۝ پھر ان بستیوں نے اپنے اُمر کا وَبال چکھ لیا، اور ان کے اُمر کا انجام خسارہ ہی ہوا ۝

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ
اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کیا، اے عقل والو جو ایمان لے آئے ہو! اللہ سے ڈرتے رہو،

اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ
اللہ نے اُتار دی تمہاری طرف نصیحت ۝ اور بھیج دیا رسول جو پڑھتا ہے تم پر اللہ کی واضح واضح آیات، تاکہ نکالے وہ

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ
ان کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں تاریکیوں سے نُور کی طرف، اور جو کوئی شخص اللہ پہ ایمان لے آئے اور

یَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ
نیک عمل کرے داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو باغات میں، جاری ہیں ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں،

اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ⑪ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ

اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے روزی اچھی کی⑪ اللہ وہی ہے جس نے پیدا کیا سات آسمانوں کو اور زمینوں سے بھی

مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ

ان جیسی زمینوں کو، اُترتا ہے اَمر ان کے درمیان (اللہ تعالیٰ یہ حالات تمہیں اس لیے بتاتا ہے) تاکہ تمہیں پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ⑫

ہر چیز پر قادر ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم کے اعتبار سے اِحاطہ کر رکھا ہے⑫

بطورِ عبرت گزشتہ قوموں کے اَنجامِ بد کا ذِکر

آگے اِنہی اَحکام پر عمل کرنے کی تاکید کے طور پر پچھلی اُمتوں کے واقعات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے، کہ جو اللہ کے نافرمان ہوتے ہیں وہ کس طرح پھر دُنیا اور آخرت میں خسارہ اُٹھاتے ہیں، وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ: کتنی ہی بستیاں سرکش ہوگئیں اپنے رَبّ کے حکم سے اور اس کے رسولوں کے حکم سے، اپنے رَبّ کا حکم نہ مانا اور اللہ کے رسولوں کا حکم نہ مانا، فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا: پھر ہم نے ان کا محاسبہ کیا بڑا سخت محاسبہ، ان سے حساب لیا کہ ہم نے تمہیں کیا دیا تھا، تم نے ہمارا کیا کھایا، کیا شکر ادا کیا، اللہ کے رسول کی کیا قدر کی، اَحکام مانے یا نہیں مانے، ''ہم نے بہت سخت محاسبہ کیا'' وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا: اور ہم نے ان کو عذاب دیا عجیب سا عذاب، اجنبی عذاب جو جلدی سے انسان کی سمجھ میں بھی نہ آئے، اس طرح سے ہم نے ان کے اُوپر عذاب اُتار دیا، نکر سے یہاں سخت عذاب مراد ہے، عَذَابًا نُّكْرًا: پھر ہم نے ان کے اُوپر منکر عذاب، یعنی جو جلدی سے فہم میں آنے والا بھی نہیں، جس کو اِنسان سوچ بھی نہیں سکتا تھا، ہم نے اس طریقے سے ان کے اُوپر عذاب بھیجا، ''عذاب دیا ہم نے ان کو سخت عذاب'' فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا: ذاقت کی ضمیر اسی قریہ کی طرف لوٹ گئی، مراد اہلِ قریہ ہیں، ''پھر ان بستیوں نے اپنے اَمر کا وَبال چکھ لیا''، وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا: اور ان کے اَمر کا اَنجام خسارہ ہی ہوا، جو معاملہ انہوں نے اختیار کیا اس کا انجام خسارہ ہی آیا اور انہوں نے اپنے اَمر کا وَبال چکھ لیا، مطلب یہ ہوگیا کہ اللہ کے اَحکام کے مقابلے میں جو سرکشی اختیار کیا کرتے ہیں نتیجہ خسارہ ہے، اور ان کے اُوپر ہماری طرف سے محاسبہ بہت سخت ہوا کرتا ہے، اور اگر ایک آدمی اُصولاً فرماں بردار ہوجائے پھر اگر اس سے کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو پھر ہمارا حساب یسیر ہوتا ہے، جس میں درگزر ہی درگزر ہے، اور نافرمانوں کے ساتھ معاملہ اور سرکشی اختیار کرنے والے اور باغیوں کے ساتھ معاملہ حسابِ شدید کا ہوتا ہے، وہاں پھر ہم گرفت بہت سخت کرتے ہیں۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا: اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کیا، یعنی آخرت میں، پہلے دُنیوی عذاب کی طرف اشارہ تھا اب یہ آخرت کا عذاب آگیا، فَاتَّقُوا اللّٰهَ

یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ: اے عقل والو! اللہ سے ڈرتے رہو، الباب لُب کی جمع ہے، لُبّ عقل کو کہتے ہیں، ''اے عقل والو! اللہ سے ڈرتے رہو'' الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: یہ اولی الباب کا بیان ہے، ''اے عقل والو! جو ایمان لے آئے ہو اللہ سے ڈرتے رہو'' اللہ نے تمہیں عقل دی ہے جس کی بنا پر تم ایمان لے آئے، تو اس کے بعد اَب تقویٰ اِختیار کرو، دُنیا اور آخرت کی کامیابی اسی میں ہے۔

قرآنِ کریم اور رسول روشنی کا ذریعہ ہیں

قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکُمۡ ذِکۡرًا: اللہ نے تمہاری طرف نصیحت اُتاردی رَّسُوۡلًا یَّتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ: اس میں رَّسُوۡلًا یہ مفعول ہے فعل محذوف کا، اللہ نے تمہاری طرف نصیحت اُتاری اور رسول بھیجا جو تم پر اللہ کی آیات واضح واضح پڑھتا ہے، اَرۡسَلَ رَسُوۡلًا یہ مفہوم نکل آئے گا سیاقِ کلام کے تقاضے سے، ''اللہ نے اُتاردی تمہاری طرف نصیحت اور بھیج دیا رسول جو پڑھتا ہے تم پر اللہ کی واضح واضح آیات۔'' اور اگر رَسُوۡلًا کو ذِکۡرًا سے بدل ہی بنالیا جائے تو بھی ٹھیک ہے، کہ رسول مجسمۂ نصیحت ہوتا ہے، ''اللہ نے تمہاری طرف نصیحت اُتاردی یعنی رسول'' یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ ''رسول'' کو جو ''ذِکر'' کہا جارہا ہے تو اس لیے کہ رسول مجسمۂ نصیحت ہے، مصدر ہونے کے اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ گویا کہ رسول سر سے پاؤں تک نصیحت ہی نصیحت ہے۔ ویسے صاف ترجمہ وہی ہے جو پہلے کیا گیا کہ اَنۡزَلَ کا تعلق ذِکۡرًا کے ساتھ ہے، اور رَسُوۡلًا کے لئے فعل محذوف نکال لیا جائے اَرۡسَلَ رَسُوۡلًا۔ اور ذِکر کا مصداق قرآنِ کریم ہو جائے گا، ''اللہ نے تمہاری طرف نصیحت اُتاردی اس کتاب کی شکل میں، اور رسول بھیج دیا جو تم پر واضح واضح آیتیں پڑھتا ہے'' لِیُخۡرِجَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ: اور نصیحت اُتارنے اور رسول بھیجنے سے مقصد یہی ہے تاکہ نکالے وہ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں تاریکیوں سے نُور کی طرف، جہالت کی تاریکیوں سے اور کُفر وشرک کی تاریکیوں سے نُور کی طرف نکالنا مقصود ہے، تو جو لوگ اس رسول کو نہیں مانتے یا اس کی نصیحت کے اُوپر کان نہیں دھرتے گویا کہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں رہنا چاہتے ہیں، اور اگر وہ روشنی حاصل کرنا چاہتے ہوں تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس نصیحت کو سنو اور اس رسول کی بات کو مانو، یہ تمہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گا۔

اہلِ ایمان پر اِنعامِ خاص

وَ مَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ: اور جو کوئی شخص اللہ پہ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کو باغات میں، جاری ہیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں، قَدۡ اَحۡسَنَ اللّٰہُ لَہٗ رِزۡقًا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے روزی اچھی کی، آخرت میں بھی اس کو رزقِ حسن ملے گا، دُنیا کے اندر بھی اللہ تعالیٰ اُس کو رزقِ حسن دیتا ہے۔

زمینوں کا تعدّد اور اس کی کیفیت

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ: اللہ وہی ہے جس نے پیدا کیا سات آسمانوں کو اور زمینوں سے بھی ان جیسی زمینوں کو، وَّمِنَ

الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ: پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو اور زمین سے بھی ان جیسیوں کو، "هُنَّ" کی ضمیر "سماوات" کی طرف لوٹ رہی ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمینیں بھی متعدد ہیں جس طرح سے کہ آسمان متعدد ہیں، باقی وہ متعدد زمینیں کہاں ہیں؟ اُوپر نیچے ہیں یا دُوسرے سیارے ہیں؟ اس کی تفصیل قرآنِ کریم نے نہیں بیان کی گئی، بہر حال روایات سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ سماوات کی طرح زمینوں میں بھی تعدد ہے،[1] اگرچہ ان کی صحیح کیفیت نمایاں نہیں، کہ وہ اُوپر نیچے ہیں آسمانوں کی طرح، یا اسی طرح سے مختلف سیاروں کی شکل میں، بہر حال زمینوں میں بھی تعدد ہے۔

"اَمرِ تشریعی" اور "اَمرِ تکوینی" کا محل

یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ: اُترتا ہے اَمر ان کے درمیان، یعنی آسمانوں میں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کا اَمر اُترتا ہے، اللہ تعالیٰ کا اَمر دو قسم کا ہوتا ہے، ایک وہ ہے جس کو آپ "اَمرِ تشریعی" کہتے ہیں، جو مکلّفین کے لیے اُترتا ہے، کہ یہ کام کرو، یہ نہ کرو، "اَحکامِ تکلیفیہ" اور "اَحکامِ تشریعیہ" جنہیں کہا جاتا ہے، یہ تو وہیں اُترتا ہے کہ جہاں مکلّف موجود ہوں۔ اور ایک اَمر "تکوینی" ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے تصرفات کہا جاتا ہے، یہ ساری کائنات میں جاری ہے۔ تو جہاں جہاں آبادی ایسے لوگوں کی ہوگی جو اللہ کے اَحکام کے مکلّف ہیں وہاں تو "اَمرِ تشریعی" بھی اُترتا ہے، فرشتوں پر بھی "اَمرِ تشریعی" آتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اَحکام آتے ہیں، اِنسانوں پر بھی آتے ہیں، جنّات پر بھی آتے ہیں، اور "اَمرِ تکوینی" کائنات کے ذرّے ذرّے میں ہے۔ "اللہ تعالیٰ کا اَمر ان سب میں اُترتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کو ذِکر کرنے کا مقصد

لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: یہ بات جو تمہیں بتائی گئی لِتَعْلَمُوْۤا کا تعلق اس کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ یہ حالات تمہیں اس لیے بتاتا ہے تاکہ تمہیں پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم کے اعتبار سے اِحاطہ کر رکھا ہے۔ اللہ کے علم اور قدرت کو تم جان لو، جس وقت اللہ کے علم اور قدرت کو جان لوگے تو اس کے ہر حکم کو ماننے کے لئے تمہاری طبیعت آمادہ ہوجائے گی، اللہ کا علم اور اللہ کی قدرت یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اُمہات الصفات کہلاتے ہیں، باقی سب صفتیں جو ہیں ان کا سلسلہ آگے چلتا ہے، اصل علم اور قدرت ہے، تو اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کا تذکرہ ہوگیا کہ اللہ نے یوں آسمان پیدا کیا، زمین پیدا کی، ان کے درمیان میں اس کے اَحکام اُترتے ہیں، تو ایسا علیم قدیر جو حکم دے اس کا حکم ماننا چاہیے، تو اللہ کی عظمت پیدا کرنے کے لئے یہ بات آپ کے سامنے ذِکر کی گئی۔

---

(۱) مَنْ ظَلَمَ قِیْدَ شِبْرٍ مِنَ الْاَرْضِ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ اَرْضِیْنَ. (بخاری ۱/ ۳۳۲ باب اثم من ظلم ... الخ. مسلم ۲/ ۳۲-مشکوٰۃ ۱/ ۲۵۴ باب الغصب)

آیاتھا ۱۲ ۶۶ سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۷ رکوعاتھا ۲

سورۂ تحریم مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ

اے نبی! کیوں حرام ٹھہراتے ہیں آپ اس چیز کو جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کی، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتے ہوئے، اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۝ اللہ تعالیٰ نے متعین کر دیا تمہارے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا، اللہ تمہارا آقا ہے اور وہ

الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۲ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ

جاننے والا ہے حکمت والا ہے ۝ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب چپکے سے ایک بات کہی نبی نے اپنی بیویوں میں سے کسی بیوی کو،

فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ

جب اس بیوی نے وہ بات بتلا دی اور اللہ تعالیٰ نے نبی کو اس کے اُوپر مطلع کر دیا، تو جتلائی بعض، اور بعض سے اعراض کیا،

فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ

جس وقت اُس نبی نے اس بیوی کو اس بات کی خبر دے دی تو اس بیوی نے کہا کہ آپ کو یہ بات کس نے بتلائی؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خبر دی

الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۳ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا

ہے علیم خبیر نے ۝ اگر تم توبہ کرو اللہ کی طرف تو تحقیق تمہارے دِلوں میں میلان آ گیا، اور اگر تم ایک دُوسرے سے تعاون کرو گی

عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ

نبی کے خلاف تو اللہ اس کا مولیٰ ہے اور جبریل اور نیک مؤمن، اور اس کے بعد فرشتے بھی

ظَهِيْرٌ ۝۴ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ

مددگار ہیں ۝ قریب ہے اس کا ربّ اگر اس نے تمہیں طلاق دے دی کہ بدل کے دے دے گا اس کو بیویاں تم سے بہتر،

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ
جو اِسلام والی ہوں گی، اِیمان والی ہوں گی، فرماں بردار ہوں گی، توبہ کرنے والی ہوں گی، عبادت کرنے والی ہوں گی،
سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا
روزے رکھنے والی ہوں گی، بیوہ ہوں گی اور کنواری ہوں گی ۞ اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے
وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ
جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، اس آگ کے اُوپر بہت سخت دِل سخت مزاج فرشتے متعین ہیں، نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی
مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
اس بات میں جو اللہ ان کو حکم دے دے، اور کرتے ہیں وہی کام جو ان کو حکم دیا جاتا ہے ۞ (اس وقت کہا جائے گا) اے کافرو!
لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞
آج عذر نہ کرو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ بدلہ دیے جاتے ہو تم انہی کاموں کا جو تم کرتے تھے ۞

آیات کے مضامین پر ایک نظر

ماقبل سے ربط

سورۂ تحریم مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں ہیں اور اس میں دو رُکوع ہیں۔ سورۂ طلاق کی اِبتدا میں جس طرح سے میں نے عرض کردیا کہ یہ سورت بھی اِصلاحِ اَحوال پر مشتمل ہے، خاص طور پر وہ اَحوال جو عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سورۂ طلاق میں زور اس بات پر دیا گیا کہ ناگواری کی صورت میں بھی اللہ کے اَحکام کی رعایت ہونی چاہیے، اور اس سورت میں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ محبت کے وقت میں بھی اللہ کے اَحکام کی رعایت ہونی چاہیے۔

خاوند بیوی کی محبت شریعت میں مطلوب ہے، لیکن...!

آیات میں کچھ اشارہ ایسا نکلتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی بیویوں کی رضاجوئی کے لئے کوئی ایسی بات کرلی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں تھی، کسی حلال چیز کو اپنے پہ حلال ٹھہرالیا بیویوں کی رضاجوئی کے لئے، اور آپ جانتے ہیں کہ بیوی کو خوش کرنا اور اس کو راضی رکھنا یہ خانگی ضرورت کے تحت بہت اہم ہے، شریعت نے بھی ترغیب دی ہے، خاوند بیوی کی آپس میں محبت شریعت میں بہت مطلوب ہے، اور خاوند بیوی کا آپس میں اختلاف شریعت میں بہت مذموم ہے، حتیٰ کہ آپ کے سامنے وہ روایت بھی آتی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اگر خاوند بیوی آپس میں حالات کو دُرست کرنے کے لئے کسی وقت کوئی

غلط بیانی سے بھی کام لیتے ہیں تو اس کو بھی شریعت نے گوارہ کیا ہے، یعنی صورۃً ایک جھوٹ ہے، لیکن اگر وہ اصلاحِ احوال کے لئے اختیار کیا گیا ہے تو شریعت نے اس کو گوارہ کیا، روایات میں اس کی تفصیل آتی ہے۔[1] تو بیوی کو خوش کرنا کوئی بُری بات نہیں، لیکن خوش کرنے کے لئے کوئی ایسا کام ہو جائے یا ایسی بات ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ مصلحت کے خلاف ہو یہ مناسب نہیں ہے، تو محبت میں آ کر بھی ایسی کوئی حرکت نہ کرو جس میں اللہ تعالیٰ کے ضابطے کی رعایت نہ رہے۔ نبی نمونہ ہوتا ہے اُمت کے ہر فرد کے لئے، آپ ﷺ کی معمولی سے معمولی بات اُمت کے اندر ایک بہت بڑے طرزِ عمل کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

شہد کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرانے کا واقعہ

مثلاً روایات میں یہاں یہی ذکر کیا گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ عصر کے بعد سب بیویوں کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے جایا کرتے تھے، اور آپ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پیا، اور یہ روز کا معمول بن گیا، جس کی بنا پر آپ کا وہاں ٹھہرنا کچھ زیادہ ہو جاتا تھا، بعض دُوسری بیویوں کو یہ چیز محسوس ہوئی کہ حضور ﷺ وہاں وقت زیادہ گزارتے ہیں، اور بیویوں کے درمیان اس قسم کا رشک اور اس طرح سے آپس میں مسابقت ہوتی ہی ہے، خاص طور پر ان بیویوں میں جن کو اپنے خاوند کے ساتھ بہت محبت ہو، خاوند کے ساتھ جب محبت ہوتی ہے تو ہر بیوی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ میری طرف توجہ زیادہ ہو اور دُوسری کی طرف اتنی توجہ نہ ہو، تو وہ شہد پینا ان عورتوں کو ناگوار گزرا، تو انہوں نے اس ناگواری کا اظہار کیا، تو آپ ﷺ نے ان کو خوش کرنے کے لیے شہد ہی اپنے اُوپر حرام کر لیا کہ میں آئندہ پیوں گا ہی نہیں۔[2] اب آپ جانتے ہیں کہ شہد اللہ تعالیٰ کی ایک حلال کی ہوئی چیز ہے، اب اگر نبی کسی مصلحت کی طور پر اس کو اپنے اُوپر ممنوع کر لیتا ہے، اگر یہ ممانعت اسی طرح سے باقی رہتی تو آپ جانتے ہیں کہ اُمت کے اندر ایک حلال چیز کے متعلق یہ تأثر ہو جاتا کہ کوئی شخص جو اِتباعِ نبی کا دعویٰ رکھتا ہو وہ شہد کو کبھی ہاتھ نہ لگاتا، تو حلال اور حرام کی حدود آپس میں خلط ہو جاتیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں تنبیہ کر دی کہ بیویوں کو خوش کرنا ایک اچھی بات ہے، لیکن بیویوں کو خوش کرنے کے لئے کوئی ایسی بات کر لینا کہ جس کا اثر آگے حدودِ اِلٰہیہ کے اُوپر پڑے یہ مناسب نہیں ہے۔ تو اس میں یہ پہلو آ گیا کہ بیویوں کے ساتھ عداوت ہو تو بھی حدود کی رعایت رکھو، محبت ہو تو بھی حدود کی رعایت رکھو۔

رسول اللہ ﷺ کو خطاب کا مقصد

اور حضور ﷺ کو سامنے رکھ کے یہ جو ہدایات دی گئیں تو اس میں اہمیت نمایاں ہو گئی کہ جب سرورِ کائنات ﷺ کے لئے بھی یہ گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ ضابطے میں کوئی کسی قسم کی کمی بیشی کر لیں، یا اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ ضابطے کے خلاف بیویوں کی رضا جوئی کے لئے کوئی اِقدام کر لیں، تو باقیوں کے لئے کس طرح سے اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟

---

(۱) مسلم ۲/۳۲۵ باب تحریم الکذب الخ۔ ترمذی ۲/۱۵ باب ما جاء فی اصلاح ذات البین۔ مشکوٰۃ ۲/۴۲۸ باب ما یُنهی عنه، فصل اوّل و فصل ثانی۔

(۲) دیکھیں: بخاری ۲/۷۲۹، کتاب التفسیر، سورۃ التحریم/ مشکوٰۃ ۲/۲۸۳ باب الخلع فصل اول۔ بعض روایات میں سیّدہ حفصہ کے پاس شہد پینے کا ذکر ہے، بخاری ۲/۷۹۳ باب لِمَ تحرّم... الخ۔

رازآگے بتانے پرحضور ﷺ کی طرف سے زوجہ کوتنبیہ

اور پھرآگے بیویوں کوبھی بعض حالات میں تنبیہ کی گئی، اس میں واقعے کی تفصیل نہیں ذکر کی گئی، معلوم یوں ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے کسی بیوی کے سامنے کوئی راز داری سے بات کی تھی، اور خاوند بیوی میں ایسے حالات چلتے رہتے ہیں، اورآپ کا منشا یہ تھا کہ کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ نہ ہو، اوراس بیوی نے کسی دوسری بیوی کے سامنے بھی تذکرہ کردیا، اس طرح سے وہ راز اِفشاء ہوگیا۔ وہ کیاراز کی بات تھی؟ قرآنِ کریم نے ذکرنہیں کی، اور نہ کسی حدیث شریف کے اندر اِس عنوان کے تحت اِس کی وضاحت آئی ہے کہ یہ راز کی بات تھی، کیونکہ جب راز کی بات تھی تواس کی وضاحت کی کیا ضرورت ہے؟ اوراس کے ایک بیوی سے دُوسری بیوی تک پہنچنے پرہی توگرفت کی جارہی ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو پھرہم اس کی کھود کرید کس طرح سے کرسکتے ہیں؟ اوراس راز کی بات کی وضاحت کیسے کردی جائے؟ بہرحال یہ بیوی سے کوئی لغزش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی تنبیہ کی کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا، اور اگر ایسی کوئی بات ہوگئی جس کے نتیجے میں تمہارا حضور ﷺ کے ساتھ کوئی کسی قسم کا کشاکشی کا معاملہ ہوگیا کہ حضور ﷺ تم پر ناراض ہوئے اورتم مقابلے میں رُوٹھ گئیں، توتمہیں اس بات سے توبہ کرنی چاہئے۔ اوراس بات کوواضح کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ عورتوں کوبھی چاہئے کہ ان معاملات کے اندر پوری پوری رعایت رکھیں اور نبی کے منشا کے خلاف کوئی بات نہ ہونے پائے، جب حضور ﷺ کی بیویوں کوسامنے رکھ کر دھمکا دیا جائے گا توکسی دُوسرے کی بیوی کے لئے کیا گنجائش رہے گی کہ وہ اس قسم کی کارروائی کرے جو اللہ اور اللہ کے رسول کی منشا کے خلاف ہے۔ توکوئی اسی قسم کی خانگی ناگواری تھی جس کا تذکرہ ان آیات کے اندر کیا گیا ہے۔

قرآن میں دوجگہ ازواجِ مطہرات کے معاملات کا صراحتاً ذکر ہے

قرآنِ کریم میں دومقام ایسے ہیں کہ جن میں سرورِکائنات ﷺ کی بیویوں کے معاملات کواللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ایک سورۂ اَحزاب میں آپ کے سامنے گزرا، جب انہوں نے نفقے میں زیادتی کا مطالبہ کیا تھا، دُنیا کی زیب وزینت کا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مداخلت کی گئی تھی کہ ان سے کہہ دو کہ اگر یہ دُنیا چاہتی ہیں تو آپ ان کوچھوڑدیں، ان کو رُخصت کردیں، یہ چلی جائیں، جاکر جہاں چاہیں عیش کریں، اوراگر یہ نبی اور اللہ کو پسند کرتی ہیں تواسی طرح سے مشقت کے اندر وقت گزاریں، اللہ تعالیٰ ان کواَجرِعظیم دے گا، یہ سورۂ اَحزاب کے اندرایک مکمل رُکوع ان حالات کے متعلق گزرچکا ہے، وہاں بھی کچھ ناگواری ہوئی تھی جس کے نتیجے میں حضور ﷺ نے ایک مہینے کے لئے ایلاء کرلیا تھا، بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی تھی، اورایک مہینے کے بعد پھریہ آیات اُتری تھیں، توان آیات کولے کر بیویوں کے پاس گئے، جاکر صاف صاف بات کرلی کہ اگر میرے ہاں رہنا ہے توانہی حالات میں رہنا پڑے گا، اوراگر دُنیا کی زیب وزینت چاہتی ہوتوتم دُنیا کوپسند کرو، میں تمہیں رُخصت کردیتا ہوں، لیکن کوئی بیوی ایسی نہیں تھی جو حضور ﷺ کوچھوڑنے پرآمادہ ہوتی اوردُنیا کی زیب وزینت کو اِختیار کرتی، سب نے بیک زبان حضور ﷺ کو، اللہ کواورآخرت کو اِختیار کیا، دُنیا کولات ماردی۔ ایک تووہ مقام ہے کہ جس میں حضور ﷺ کی ازواج کا

معاملہ زیر بحث آیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خانگی معاملات میں کچھ کشیدگی ہوئی تھی، لیکن اُس کا نتیجہ یوں نکل آیا۔ اور ایک یہ معاملہ ہے جس کا یہاں تذکرہ کیا گیا، تو حضور ﷺ کے ساتھ چونکہ بیویوں کو محبت بہت تھی، اور جب خاوند کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو ہر بیوی چاہتی ہے کہ میرے ساتھ تعلق زیادہ ہو بمقابلہ دُوسری کے، تو اس قسم کی اگر کشاکشی کی نوبت پیدا ہو جائے تو بشریت کی طرف دیکھتے ہوئے یہ کوئی ناممکن بھی نہیں ہے، اور اَزواج معصوم بھی نہیں، اس لیے ان سے اگر ذرا سی کوئی لغزش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً مداخلت کر کے اس معاملے کو سلجھا دیا، اور کتاب اللہ کے اندر ذکر کر کے باقی اُمت کو متنبہ کر دیا کہ دیکھو! لغزش بہر حال لغزش ہے چاہے نبی کی بیوی کیوں نہ کرے، اور وہ بھی اگر توبہ نہیں کرے گی اور اپنی اس غلطی کا ازالہ نہیں کرے گی تو اللہ کے ہاں اس کی بھی کوئی رُو رعایت نہیں ہے، اور باقی عورتوں کا تو پھر کیا درجہ ہے کہ ان کے لیے کسی قسم کی رُو رعایت رکھی جائے۔

اِبتدائی آیات کا پس منظر شیخ الاسلامؒ کے قلم سے

تو حضرت شیخ الاسلام ؒ اسی آیت کی تمہید میں کچھ ایسے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "سورۂ اَحزاب کے فوائد میں گزر چکا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات عنایت فرمائیں اور لوگ آسودہ ہو گئے تو اَزواجِ مطہرات کو بھی خیال آیا کہ ہم کیوں آسودہ نہ ہوں، اس سلسلے میں انہوں نے مل کر حضور ﷺ سے زیادہ نفقہ کا مطالبہ شروع کیا، "صحیح مسلم" کی ایک حدیث میں ہے: "وَهُنَّ حَوْلِي يَطْلُبْنَنِي النَّفَقَةَ" اور "بخاری" کے "ابواب المناقب" میں ہے "وَعِنْدَهُ نِسْوَةٌ يُكَلِّمْنَهُ وَيَسْتَكْثِرْنَهُ" اس پر ابوبکر ؓ نے عائشہ ؓ کو، اور عمر ؓ نے حفصہ ؓ کو ڈانٹ بتلائی، آخر ازواج نے وعدہ کیا کہ آئندہ ہم آپ سے اس چیز کا مطالبہ نہیں کریں گی جو آپ کے پاس نہیں ہے، پھر بھی رفتارِ واقعات کی ایسی رہی جس سے آپ کو ایک ماہ کے لئے ازواج سے ایلاء کرنا پڑا، تا آنکہ آیت تخییر نے جو اَحزاب میں ہے، نازل ہو کر اس قصے کا خاتمہ کر دیا، اس درمیان میں کچھ واقعات اور بھی پیش آئے جس سے حضور ﷺ کی طبع مبارک پر گرانی ہوئی، اصل یہ ہے کہ اَزواجِ مطہرات کو جو محبت اور تعلق حضور ﷺ کے ساتھ تھا اس نے قدرتی طور پر آپس میں ایک طرح کی کشمکش پیدا کر دی تھی، ہر ایک زوجہ کی تمنا اور کوشش تھی کہ وہ زائد از زائد حضور ﷺ کی توجہات کا مرکز بن کر دارین کی برکات و فیوض سے متمتع ہو، مَرد کے لئے یہ موقع تحمل، تدبر اور خوش اخلاقی کے اِمتحان کا نازک ترین موقع ہوتا ہے، مگر اس نازک موقع پر بھی حضور ﷺ کی ثابت قدمی ویسی ہی غیر متزلزل ثابت ہوئی جس کی توقع سیّد الانبیاء ﷺ کی پاک سیرت سے ہو سکتی تھی۔ آپ کی عادت تھی کہ عصر کے بعد سب ازواج کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے جاتے (یہ وہی واقعہ ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا) ایک روز حضرت زینب ؓ کے ہاں کچھ دیر لگی، معلوم ہوا کہ انہوں نے شہد پیش کیا تھا، اس کے نوش فرمانے میں وقفہ ہوا، پھر کئی روز یہ معمول رہا، حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ ؓ نے مل کر تدبیر کی کہ آپ وہاں شہد پینا چھوڑ دیں، آپ نے چھوڑ دیا، اور حفصہ سے فرمایا کہ میں نے زینب کے ہاں شہد پیا تھا، مگر اب میں قسم کھاتا ہوں کہ پھر نہیں پیوں گا۔ نیز یہ خیال فرما کر کہ زینب کو اس کی اطلاع ہو گئی تو خواہ مخواہ دل گیر ہوں گی حفصہ کو منع کر دیا کہ اس کی اطلاع کسی کو نہ کرنا۔ اسی طرح کا ایک قصہ ماریہ قبطیہ کے متعلق جو کہ آپ کے حرم میں تھیں، جن کے بطن

سے صاحبزادے ابراہیم تولد ہوئے، پیش آیا، اس میں آپ نے ازواج کی خاطر قسم کھائی کہ ماریہ کے پاس نہ جاؤں گا، یہ بات آپ نے حضرت حفصہ کے سامنے کہی تھی، اور تاکید کردی تھی کہ دُوسروں کے سامنے اظہار نہ ہو، حضرت حفصہ نے اِن واقعات کی اطلاع چپکے سے حضرت عائشہ کو کردی، اور یہ بھی کہہ دیا کہ کسی اور کو نہ کہنا۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمادیا، آپ نے حفصہ کو جتلایا کہ تم نے فلاں بات کی اطلاع عائشہ کو کردی، حالانکہ منع کردیا تھا، وہ متعجب ہوکر کہنے لگیں کہ آپ سے کس نے کہا؟ شاید عائشہ کی طرف خیال گیا ہوگا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ یعنی خدا تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی۔ انہی واقعات کے سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں (تفسیر عثمانی)۔

آیات کی تفسیر

جب حلال کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرانا گناہ نہیں تھا، تو تنبیہ کیوں کی گئی؟

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ: اے نبی! لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ: کیوں حرام ٹھہراتے ہیں آپ اس چیز کو جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کی، تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ: اپنی بیویوں کی مرضی چاہتے ہوئے، یہ جملہ حال کی جگہ ہے، اس حال میں کہ آپ اپنی بیویوں کی رضا کے طالب ہیں، بیویوں کو خوش کرنے کے لئے آپ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کیوں حرام ٹھہراتے ہیں؟ ''اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'' کیا مطلب؟ کہ حقیقتاً گناہ ہوجائے تو اللہ وہ بھی بخش دیتا ہے، یہاں تو گناہ کی کوئی بات ہی نہیں، یہ تو اچھے جذبے کے تحت آپ نے ایک بات کی ہے، لیکن چونکہ آپ نبی ہیں اور لوگوں کے لئے آپ کا ہر قول وفعل نمونہ ہے، تو آپ کا اس قسم کا اِقدام آگے اُمت کے لئے مشکلات کا باعث ہوسکتا ہے، اس لیے تنبیہ کی جارہی ہے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی جرم نہیں جو آپ نے کیا، کیونکہ کسی مصلحت کی وجہ سے کسی حلال چیز کو اپنے اُوپر ممنوع قرار دے لینا کہ میں استعمال نہیں کروں گا، جبکہ عقیدۃً انسان اس کو حلال سمجھتا ہے، تو ایسی بھی گنجائش ہے، ایک آدمی کو دُودھ نقصان دیتا ہے وہ اپنے اُوپر ممانعت کرلیتا ہے کہ میں دُودھ نہیں پیوں گا، میں لسی نہیں پیوں گا، میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا، بشرطیکہ دِل میں اس کو حلال جانے، تو طبی مصلحت کے تحت اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے، اور معاملات کے تحت بھی برداشت کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ دِل میں انسان اس کو حلال جانے، کیونکہ حلال چیز کو حرام جاننا یہ تحریف ہے، جو چیز قطعی حلال ہے اگر اس کو اپنے قلب سے حرام جانے گا تو یہ کفر ہے، لیکن حضور ﷺ نے جو اپنے اُوپر ممانعت کی تھی وہ تو عملاً ترک کرنے کی تھی اور اس کو کسی مصلحت کی بنا پر برداشت کیا جاسکتا ہے، لیکن یہاں مصلحت بیویوں کی رضا جوئی تھی اور حضور ﷺ کا یہ عمل آئندہ اُمت کے لئے مشکلات کا باعث بن سکتا تھا، اور اس میں اللہ کی حدود خلط ہوسکتی تھیں، جس کی بنا پر یہاں فوراً گرفت کرلی گئی۔

خلاصۂ آیات

قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ: اللہ تعالیٰ نے متعین کردیا تمہارے لیے تمہاری قسموں کا کھولنا، متعین کردیا کفارے کے

ذریعے سے، جس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے، اس قسم کو توڑ دو اور کفارہ دے دو۔ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ: اللہ تمہارا آقا ہے، اس لیے حلال حرام کے متعلق قواعد مقرر کرنا اور ہدایات دینا یہ سب اسی کا کام ہے، اسی مولیٰ کے اَحکام کی تمہیں پابندی کرنی چاہیے۔ ''اللہ تمہارا مولا ہے اور وہ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے''...... ''قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب چپکے سے ایک بات کہی نبی نے اپنی بیویوں میں سے کسی بیوی کو'' حَدِيْثًا یہ اَسَرَّ کا مفعول ہے۔ نبی نے اپنی بعض بیویوں کی طرف ایک بات چپکے سے کہی، یعنی چھپا کے ایک بات پہنچائی، وہ کون سی بات تھی؟ اس کی تفصیل یہاں نہیں، ہوسکتا ہے ویسی ہی کوئی بات ہو جس طرح سے حاشیے میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے بیان کی، اور میں نے آپ کے سامنے پڑھ دی، فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ: جب اُس بیوی نے وہ بات بتلادی وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ: اور اللہ تعالیٰ نے نبی کو اس کے اُوپر مطلع کردیا، عَرَّفَ بَعْضَهٗ: تو اُس نبی نے اُس کے بعض کو پہچنوایا یعنی ذکر کرتے ہوئے یوں کہا کہ تُو نے فلاں راز کی بات کسی کو کہہ دی، پوری تنبیہ نہیں کی بلکہ بعض الفاظ......! عَرَّفَ بَعْضَهٗ: جتلائی بعض وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ: اور بعض سے اِعراض کیا، یہ بھی آپ کی خوش اخلاقی تھی کہ جتنی کوتاہی کا پتا چلا اتنی بھی صراحتاً ذکر نہیں کی، بلکہ کچھ ذکر کی، کچھ سے اِعراض کرگئے، فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ: جس وقت اس نبی نے اس بیوی کو اس بات کی خبر دی، قَالَتْ: اُس بیوی نے کہا، مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا: آپ کو یہ بات کس نے بتلائی؟ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ: تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خبر دی ہے علیم خبیر نے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہر چیز کو جاننے والا ہے اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔

کیا اَزواجِ مطہرات بھی حضور ﷺ کو عالم الغیب سمجھتی تھیں؟

ان آیات کے ترجمے میں ایک بات آپ کے سامنے واضح طور آجانی چاہیے، مدینہ منورہ کی زندگی کا یہ واقعہ ہے اور تقریباً تقریباً آخری ایام کا، جبکہ ساری بیویاں حضور ﷺ کے نکاح میں آچکی تھیں، اُس وقت ایک معاملہ حضور ﷺ خفیہ طور پر، سِر اور راز کے طور پر ایک بیوی سے کرتے ہیں، اور بیوی وہ بات آگے نقل کردیتی ہے، جو اس کے لئے مناسب نہیں تھی، اور جب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کا یہ راز آؤٹ ہوگیا اور یہ بات آگے نکل گئی تو حضور ﷺ اُس بیوی کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تُو نے ایسا کیوں کیا؟ کچھ بات جتلائی، کچھ سے اِعراض کرگئے، بیوی آگے سے گھبرا کر کہتی ہے کہ آپ کو کس نے بتلادیا؟ تو اس سے کیا بات نکلتی ہے کہ عائشہ، حفصہ، اَزواجِ مطہرات حضور ﷺ کو عالم الغیب سمجھتی تھیں؟ اس سے کیا بات نکلتی ہے؟ اگر اَزواجِ مطہرات حضور ﷺ کو عالم الغیب سمجھتی تھیں تو کیا اس سوال کی گنجائش ہے کہ آپ کو کس نے بتادیا؟ آپ کو خبر کس نے دے دی؟ پھر اگر اس نے یہ سوال کر ہی لیا تھا تو حضور ﷺ فرماتے کہ تم مجھے عالم الغیب نہیں سمجھتی؟ تمہارا عقیدہ خراب ہے، تم وہابی ہو، تمہیں پتا نہیں؟ کہ میں تو ہر چیز جانتا ہوں، پھر جواب یہ ہونا چاہیے تھا تاکہ اَزواجِ مطہرات کے عقیدے کی اصلاح ہوجاتی کہ تمہیں آج تک پتا نہیں چلا؟ کہ مجھے تو ذرّے ذرّے کا پتا ہے، میرے سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے، ابھی تک تمہارا عقیدہ خراب ہے؟ حضور ﷺ نے آگے سے یوں تنبیہ نہیں کی، کیا کہا؟ کہ مجھے علیم خبیر نے بتادیا، معلوم ہوگیا کہ علیم خبیر جو بتادے اس کا پتا چلتا ہے، اور جو نہ بتائے تو نہیں پتا چلتا۔ اور اَزواجِ مطہرات بھی سمجھتی تھیں کہ حضور ﷺ سے رازداری کے طور پر کسی دُوسرے سے بات کی جاسکتی ہے،

ضروری نہیں کہ حضور ﷺ کو پتا چل جائے، اگر ان کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ایک ایک بات کا حضور ﷺ کو پتا چلتا ہے تو وہ اس طرح سے لغزش نہ کرتیں۔ جس طرح سے برادرانِ یوسف کے قصے میں میں نے ذِکر کیا تھا کہ اگر یہ نبی زادوں کا عقیدہ ہوتا کہ نبی غیب جانتا ہے تو یوسف علیہ السلام کے متعلق وہ ایسی کارروائیاں نہ کرتے اور خفیہ مشورے نہ کرتے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی زادے بھی نبی کو عالم الغیب نہیں سمجھتے تھے، یہاں آ گیا کہ نبی کی بیویاں بھی نبی کو عالم الغیب نہیں سمجھتی تھیں، اور اگر یہ (علم غیب کا) عقیدہ صحیح ہوتا تو جب انہوں نے یہ سوال اُٹھایا تھا تو حضور ﷺ آگے اس عقیدے کی وضاحت فرما دیتے۔ کتنا صاف مسئلہ ہے جو ان آیات کے اندر واضح ہو رہا ہے۔

اَزواجِ مطہرات کو تنبیہ اور اس کا مقصد

اِنْ تَتُوْبَآ: اب یہ اُن عورتوں کو تنبیہ ہے، کہ اگر تم توبہ کرو اللہ کی طرف فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا: تحقیق تمہارے دِلوں میں میلان آ گیا، یعنی تم راہِ اعتدال سے ہٹ گئی ہو، اگر تم توبہ کرو تو یہ توبہ کرنے کا وقت ہے، توبہ کرنے کا مقتضی موجود ہے، توبہ کی ضرورت ہے، وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ: اور اگر تم ایک دُوسرے سے تعاون کرو گی نبی کے خلاف، تو یاد رکھو کہ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ: اللہ اس کا مولیٰ ہے اور جبریل اور نیک مؤمن، مولیٰ سے مراد یہاں ساتھی رفیق ناصر، اللہ اس کا مددگار ہے اور جبریل مددگار ہے، اور نیک مؤمن مددگار ہیں، ''اور اس کے بعد فرشتے بھی مددگار ہیں'' ظهير: مددگار، ''اس کے بعد فرشتے بھی ظہیر ہیں مددگار ہیں'' تو نبی کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔

اور یہاں جو تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا اِنْ تَتُوْبَآ، اور آگے قُلُوْبُكُمَا ''بخاری شریف'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے صراحت ہے، اِبنِ عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ یا امیر المؤمنین! ان دونوں سے کون سی عورتیں مراد ہیں جن کا ذِکر اس سورت میں آیا ہوا ہے؟ تو لمبی روایت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پورا قصہ بیان کیا اور کہا کہ تمہیں پتا ہی نہیں؟ کہ اس سے مراد حفصہ اور عائشہ ہیں۔[1] ان دونوں نے مل کر حضور ﷺ کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کیا تھا جو آپ کے لیے ناگواری کا باعث بنا، تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی، اور یہ کہا کہ اگر تم نے اس طرح سے ایک دُوسرے سے تعاون نہ چھوڑا، اور اللہ کے سامنے توبہ نہ کی، آئندہ کے لئے حضور ﷺ کو اِیذاء پہنچانے کی کوشش کی، تو یاد رکھنا تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گی، اس کے تو سارے ہی ناصر اور مددگار ہیں، اور جس کے ساتھ اللہ ہو، جس کے ساتھ سارے نیک مؤمنین ہوں، خصوصیت سے جبریل ہو، باقی فرشتے ہوں، اس کو تم کیا نقصان پہنچا سکتی ہو؟ تمہارے جُدا ہو جانے کے ساتھ کوئی ان کی بزم سونی نہیں ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ تم جیسی عورتیں اور دے دے گا، یہ تنبیہ کی۔ اور اِن عورتوں کو سامنے رکھ کے اس معمولی سی لغزش پر تنبیہ جو کی جا رہی ہے تو اس میں کان کھولے جا رہے ہیں باقی عورتوں کے، کہ جب نبی کی بیوی کی لغزش برداشت نہیں جا سکتی تو ''تا بدیگراں چہ رسد''، باقی عورتوں کی لغزشیں کیسے برداشت کی جا سکتی ہیں، کیونکہ سب سے بڑا جو دماغ میں فتنہ اُٹھا کرتا ہے وہ یہی ہے کہ مقبولین کے متعلقین بھی خواہ مخواہ اپنے آپ کو مقبول سمجھنے لگ جایا کرتے ہیں، اور یوں سمجھا کرتے ہیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں، کیونکہ ہم فلاں سے تعلق رکھنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے یہ بُت توڑا ہے جو

---

(۱) بخاری ۱/۳۳۴ باب الغرفة والعلية/ مسلم ۱/۴۸۰ باب المطلقة البائن لا نفقة لها۔ سے پہلے۔

جاہلیت کا بُت تھا، کہ تعلق کوئی کام آنے والی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کام آنے والی چیز ہے۔ اسی کے تحت آگے مثالیں دی جا رہی ہیں کہ دیکھو! نُوح علیہ السلام کی بیوی اور لُوط علیہ السلام کی بیوی (کافروں کو تنبیہ کی جا رہی ہے) کہ چاہے ان کے خاوند نبی تھے، لیکن جب انہوں نے اچھا طریقہ اختیار نہیں کیا تو خاوند کی نبوّت ان کے کام نہیں آئی، اور اگر کوئی اچھا ہے تو چاہے فرعون کی بیوی کیوں نہ ہو، وہ اللہ کے ہاں مقبول ہے، یعنی ذاتی عمل اور ذاتی ایمان اور عقیدہ، یہ ہے آخرت میں کام آنے والی چیز! کتنے ہی گندے ماحول میں ہو، حتیٰ کہ فرعون کی بیوی ہے لیکن اچھی ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو گئی، اور اگر وہ عورتیں خود اچھی نہیں ہیں تو چاہے نبی کی بیوی ہوں وہ اچھی نہیں ہیں، کافروں کے لئے مثال دی نُوح علیہ السلام کی بیوی کی اور لُوط علیہ السلام کی بیوی کی، اور مؤمنوں کے لئے مثال بیان کی فرعون کی بیوی کی اور حضرت مریم کی، تو جس سے معلوم ہو گیا کہ انسان کے ذاتی کردار اور ذاتی ایمان کی قدر ہوا کرتی ہے، نسبتوں کا کوئی اعتبار نہیں، اگر کوئی شخص ایمان کا حامل نہ ہو تو کتنی ہی اُونچی نسبت کا حامل ہو، اللہ کے ہاں وہ نجات نہیں پا سکتا۔

اَزواجِ مطہرات کی اللہ کی طرف سے اِصلاح

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ: یہ بھی وہی دھمکایا جا رہا ہے، ''قریب ہے اس کا رَبّ، اگر اس نے تمہیں طلاق دے دی، قریب ہے اس کا رَبّ کہ بدل کے دے دے گا اس کو بیویاں تم سے بہتر'' کیونکہ تم میں جو خیریت اور بہتری ہے وہ نبی کی بیوی ہونے کے اعتبار سے ہی ہے، اور جب تمہیں وہ چھوڑ دے گا تو تم بیوی رہو گی نہیں، دوسری عورت بیوی بن جائے گی، وہی خیریت اس کے لئے ثابت ہو جائے گی، یعنی اگر چہ فی الحال کوئی عورت ان بیویوں سے بہتر نہ ہو لیکن اس نسبت کے ٹوٹ جانے کے بعد اور دُوسری عورت کو یہ نسبت حاصل ہو جانے کے بعد وہی عورت اِن سے بہتر ہو جائیگی، ''بدل کے دے دے گا ان کو بیویاں بہتر تم سے، جو مسلمان ہوں گی، مؤمنات ہوں گی، ایمان والی ہوں گی، اسلام والی ہوں گی'' قٰنِتٰتٍ: فرماں بردار ہوں گی تٰٓئِبٰتٍ: توبہ کرنے والی ہوں گی، عٰبِدٰتٍ: عبادت کرنے والی ہوں گی، سٰٓئِحٰتٍ: روزے رکھنے والی ہوں گی، ثَيِّبٰتٍ: بیوہ ہوں گی اور کنواری ہوں گی، یعنی بعض بیوہ اور بعض کنواری، جیسی پسندیدہ ہوں اللہ تعالیٰ ایسی بیویاں اور بدل کے دے دے گا، جیسے اس وقت بھی بعض بیوہ تھیں اور بعض کنواری تھیں، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں عورتوں کی کمی نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر عورتیں دے سکتا ہے، اس لیے تمہیں چاہیے کہ تم اللہ کے رسول کو بھی تکلیف نہ پہنچاؤ اور اللہ کے اَحکام کی رعایت رکھو۔ یہاں تک تو یہ معاملہ تھا جو خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کی بیویوں کی اِصلاح کے طور پر کیا گیا تھا۔

عام مؤمنین کو تاکید..... عذاب اور عذاب کے فرشتوں کا تذکرہ

آگے عام مؤمنین کو تاکید ہے کہ گھر کے حالات سنوارنے کی کوشش کیا کرو، انسان پر ذمہ داری صرف اپنی ذات تک نہیں، بلکہ اپنے اہل وعیال کی بھی آتی ہے۔ ''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں'' عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ: اس آگ کے اُوپر بہت سخت فرشتے متعین ہیں، غِلاظ غلیظ کی جمع، سخت دِل،

شِدَادٌ: سخت طبیعت، اس آگ پر جو منتظم متعین ہیں بڑے سخت دل ہیں، بڑے سخت مزاج ہیں، مطلب یہ ہے کہ کسی پر رحم نہیں کھائیں گے، کسی کو چھوڑیں گے نہیں، لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ: نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی اس بات میں جو اللہ ان کو حکم دے دے، وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ: اور کرتے ہیں وہی کام جو وہ کہے جاتے ہیں، جو ان کو حکم دیا جاتا ہے، نافرمانی نہیں کرتے، جو کچھ انہیں کہا جائے وہی کرتے ہیں، ایسے سخت منتظم اس آگ کے اُوپر ہیں، تو آگ میں پڑ کر چیخو گے، چلاؤ گے، فریادیں کرو گے، کوئی کسی قسم کا چھٹکارا تمہیں نہیں ملے گا، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبر میں اعمیٰ اور ابکم فرشتہ متعین کرے گا مارنے کے لئے، سزا دینے کے لئے۔[1] اعمیٰ اندھے کو کہتے ہیں، ابکم گونگے کو کہتے ہیں۔ اور گونگا عموماً بہرہ بھی ہوتا ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ فرشتے حقیقت میں اندھے اور بہرے ہوں تاکہ وہ نہ اس معذّب کا حال دیکھیں نہ اس کی چیخ و پکار سنیں، ترس آیا کرتا ہے تو دونوں طرح سے آتا ہے، مضروب جس کو پیٹا جارہا ہے تو اس کی حالتِ زار جو آنکھوں سے اِنسان دیکھتا ہے تو اس سے بھی بسا اوقات دل نرم ہوجاتا ہے، یا اس کی چیخ و پکار اپنے کانوں سے سنتا ہے تو بسا اوقات تب انسان کے دِل میں نرمی آجاتی ہے، اور اگر آنکھوں سے دیکھے نہ اور کانوں سے سنے نہ تو نرمی کہاں سے آئے؟ تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے وہ فرشتے جو متعین کیے ہیں سزا دینے کے لئے، وہ اندھے بھی ہوں گے، بہرے بھی ہوں گے۔ یا وہ اندھے، بہرے حقیقتاً تو نہیں ہیں، لیکن چونکہ آنکھوں سے حال دیکھ کر اور کانوں سے سُن کر وہ متأثر نہیں ہوں گے تو یوں سمجھو جیسے انہوں نے سنا ہی کچھ نہیں اور دیکھا ہی کچھ نہیں، آنکھیں ہی بند کرلیں ہر معاملے میں، تو یہ مراد بھی ہوسکتی ہے، کہ وہ ایسے ہوں گے جیسے اندھے ہوتے ہیں کہ دیکھ کے متأثر نہیں ہوں گے، ایسے ہوں گے جیسے بہرے ہوتے ہیں کہ کان سے سُن کے متأثر نہیں ہوں گے، اور جو اَحکام اللہ کی طرف سے آئیں گے ان کے مطابق عمل کریں گے۔'' اور اس وقت کہا جائے گا کہ اے کافرو!'' لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ: آج عذر نہ کرو، إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ بدلہ دیے جاتے ہو تم انہی کاموں کا جو تم کرتے تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ

اے ایمان والو! اللہ کی طرف توبہ کرو توبہ خالص، قریب ہے کہ تمہارا رَبّ دُور ہٹا دے گا

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ

تم سے تمہاری بُرائیاں، اور داخل کرے گا تمہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جس دِن کہ نہیں رُسوا کرے گا اللہ

النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ

نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، ان کا نُور بھاگتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب،

---

(۱) ابوداؤد، ۲۹۸/۲، باب فی المسئلة فی القبر۔ مشکوۃ ۲۶/۱، باب اثبات عذاب القبر، فصل ثانی، عن البراء۔

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا

اور وہ کہتے ہوں گے: اے ہمارے رَبّ! پورا کر ہمارے لیے ہمارے نُور کو اور ہمیں بخش دے، بے شک تُو ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے ۝ اے

النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ

نبی! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور ان کے اُوپر سختی کیجئے، اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا

الْمَصِيْرُ ۝ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ

ٹھکانا ہے ۝ بیان کی اللہ تعالیٰ نے مثال ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا، نُوح علیہ السلام کی بیوی کی اور لُوط علیہ السلام کی بیوی کی،

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا

یہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، ان دونوں نے ان دونوں کے ساتھ خیانت کی، تو نہ کام آئے وہ دونوں

مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، اور کہہ دیا گیا کہ داخل ہو جاؤ تم دونوں جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ ۝ اور بیان کی مثال اللہ تعالیٰ نے

لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ

ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئے فرعون کی بیوی کی، جبکہ کہا اس نے کہ اے میرے رَبّ! بنا میرے لیے اپنے پاس گھر جنّت میں

وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ

اور نجات دے مجھے فرعون سے اور اس کے عمل سے، اور نجات دے مجھے ظالم لوگوں سے ۝ اور (مثال بیان کی اللہ تعالیٰ نے)

مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ

عمران کی بیٹی مریم کی، جس نے حفاظت کی اپنے گریبان کی، تو ہم نے اس گریبان میں پھونک دی اپنی رُوح، اور اس نے تصدیق

بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝

کی اپنے رَبّ کی باتوں کی اور اللہ کی کتابوں کی، اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی ۝

''توبۂ نصوح'' کی تاکید اور اس کی حقیقت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا: نصوح: خالص کو کہتے ہیں، ''اے ایمان والو! اللہ کی طرف توبہ کرو توبہ

خالص" خلوص کے ساتھ توبہ کا مطلب یہ ہے کہ دِل میں ندامت محسوس کرو اور آئندہ کے لئے عزم کرو کہ ہم یہ غلطی نہیں کریں گے، توبہ کی حقیقت یہی ہوتی ہے، اور اگر زبان پر تو توبہ توبہ ہے، اِستغفار ہے، لیکن دِل میں اسی طرح سے گناہ کا شوق بھرا ہوا ہے، اور اس گناہ کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں، تو یہ "توبۂ نصوح" نہیں ہے، خالص توبہ یہی ہے کہ دِل کے خلوص کے ساتھ تہیہ کرو کہ آئندہ ہم یہ کام نہیں کریں گے، اور جو کام ہو چکا اس کے اُوپر ندامت کا اظہار کرو۔

سچی توبہ پر اِنعامات

"رُجوع کرو اللہ کی طرف رُجوع کرنا خالص، قریب ہے کہ تمہارا رَبّ دُور ہٹادے گا تم سے تمہاری بُرائیاں" وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: اور داخل کرے گا تمہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، "جس دِن کہ نہیں رُسوا کرے گا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، ان کا نُور بھاگتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب، اور وہ کہتے ہوں گے کہ اے ہمارے رَبّ! پورا کر ہمارے لیے ہمارے نُور کو اور ہمیں بخش دے، بے شک تو ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے" اس نُور کا قصہ، کہ مؤمنین کو یہ نُور حاصل ہوگا سورۂ حدید میں بھی گزر چکا ہے، اور منافقین کو پہلے تھوڑی سی چمک ملے گی، چونکہ وہ ایمان لائے تھے، پھر وہ چمک مٹا دی جائی گے، تو جب نُور ملنے کے بعد ان کا نُور مٹ جائے گا تو اس وقت مؤمنین اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یوں دُعائیں کریں گے کہ اے اللہ! ہمارے نُور کو پورا رکھ، ہمارے نُور کو پورا کر، ہمارا نُور ضائع نہ ہو جائے، اس طرح سے وہ میدانِ قیامت میں اپنے ایمان اور عمل کی روشنی میں جنّت کی طرف سفر کریں گے، ظلمات سے اللہ تعالیٰ انہیں نجات دے گا۔

کُفّار و منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم

"اے نبی! جہاد کر کافروں کے ساتھ اور منافقوں کے ساتھ" کافروں کے ساتھ بالسنان، یہ بھی اِصلاح ہے، چونکہ نبی کے ذِمّے اصلاح سب کی ہے، تو کافروں اور منافقوں سب کے ساتھ اصلاح کا معاملہ کیجئے، جو سمجھائے نہیں سمجھتے اُن کے ساتھ جہاد کیجئے، کافروں کے ساتھ جہاد تو تلوار اور نیزے کے ساتھ تھا، اور منافقین کے ساتھ زبانی، یعنی سختی کے ساتھ اِن کا محاسبہ کیجئے، ان کی غلطیوں کا حساب لیجئے، "جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ" وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: اور ان کے اُوپر سختی کیجئے، وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

کافروں کے لئے نُوح علیہ السلام اور لُوط علیہ السلام کی بیویوں کی مثال اور مثال کا مقصد

آگے مثالوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کی کہ اللہ کے ہاں قدر اپنے ذاتی ایمان اور کردار کی ہے، نسبتیں کام نہیں آتیں، جس میں کلیت کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اَزواج کے لئے بھی تنبیہ ہو جائے گی، ورنہ یہ مثال انہی پر چسپاں کرنا مقصود نہیں، گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں، تو بیویوں کی مثال ایسے ہوگئی جیسے نُوح علیہ السلام کی بیوی کی اور لُوط علیہ السلام کی بیوی کی جو کافرہ تھیں، اور یہاں سے پھر یہ نکالا جائے کہ اَزواجِ مطہرات اندر سے مؤمنہ نہیں تھیں، کافرہ تھیں، یہ بالکل غلط اور تحریف ہے، کیونکہ آگے مثال

فرعون کی بیوی کی بھی آرہی ہے، پھر اس کو حضور ﷺ پہ کیسے منطبق کرو گے؟ یہاں ایک اُصول کے طور پر، کلیت کے طور پر بات واضح کی جارہی ہے کہ اپنے ذاتی کردار کی فکر کرو اور ذاتی ایمان کی فکر کرو، نسبتیں کام آنے والی چیز نہیں ہیں، اور اگر انسان کے پاس ذاتی کردار نہیں، ذاتی ایمان نہیں، تو نبی کے ساتھ بھی نسبت کام نہیں آئے گی، اور اگر ذاتی ایمان اور ذاتی کردار ہے تو فرعون کی بیوی ہو تو بھی اللہ کے ہاں مقبول ہو جائے گی، یہ کلیت کے درجے میں بیان کرنا مقصود ہے، کسی بیوی کے اُوپر یہ مثال چسپاں کرنی مقصود نہیں، ورنہ فرعون والی مثال پھر کس پہ چسپاں کرو گے۔ ''بیان کی اللہ تعالیٰ نے مثال ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا نوح علیہ السلام کی بیوی کی اور لُوط علیہ السلام کی بیوی کی'' كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ: اور یہ دونوں کی دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے تحت تھیں، یعنی ان کے نکاح میں تھیں، فَخَانَتٰهُمَا: اِن دونوں نے اُن دونوں کے ساتھ خیانت کی، ان کے احکام بجا نہیں لائیں، خیانت یہی ہے کہ خاوند کا حق ادا نہ کیا جائے اور جب خاوند نبی ہو تو سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کے اُوپر ایمان لایا جائے، جو بیوی اپنے خاوند نبی پر ایمان نہیں لاتی وہ اس کے حق میں خائن ہے، ''اُن دونوں نے اُن کے ساتھ خیانت کی'' فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا: تو نہ کام آئے وہ دونوں اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، اَغْنٰى عَنْهُ کا ترجمہ کئی دفعہ آپ کے سامنے کیا گیا، فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا، کام آنا، ''یہ دونوں نبی اُن دونوں عورتوں کے کچھ کام نہ آئے اللہ کے مقابلے میں'' وَّقِيْلَ: اور کہہ دیا گیا، ادْخُلَا: داخل ہو جاؤ تم دونوں، النَّارَ: جہنم میں، مَعَ الدّٰخِلِيْنَ: داخل ہونے والوں کے ساتھ، یعنی نبی کی بیویاں ہونے کے باوجود اُنہیں کہہ دیا گیا کہ جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ شامل ہو کر تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

مؤمنین کے لئے فرعون کی بیوی اور سیّدہ مریم کی مثال اور مثال کا مقصد

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا: اور بیان کی مثال اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لے آئے، ایمان والوں کے لئے مثال بیان کی اس خیال کے اعتبار سے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر تمہارا کوئی رشتہ دار کافر ہے تو اس کے کافر ہونے کی بنا پر تمہارا کوئی نقصان ہوگا، چاہے کوئی تمہارا بڑا ہے چاہے کوئی تمہارا چھوٹا ہے، بیٹا یہ سمجھے کہ میں مؤمن ہو گیا ہوں لیکن میرا باپ کافر ہے، کہیں اللہ کے ہاں میں پکڑا نہ جاؤں کہ تیرا باپ کافر کیوں تھا، یا بڑا مؤمن ہو گیا اور اس کا کوئی چھوٹا کافر ہے تو وہ یہ سمجھے کہ میں پکڑا جاؤں گا کہ میرا یہ چھوٹا، میرا یہ بیٹا، میرا یہ فلاں کافر کیوں ہے، یہ بات نہیں، اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب تم ایمان لے آئے، اپنے طور پر تم نے اپنا فرض ادا کر دیا تو تمہارا کوئی رشتہ دار وہ بُرے سے بُرا انسان بھی ہو تو اس کا تمہیں کوئی نقصان نہیں ہے، جبکہ تم اپنا فرض ادا کیے بیٹھے ہو۔ دیکھو! فرعون کی بیوی تھی، فرعون کے گھر تھی، جب وہ ایمان لے آئی تو اگرچہ اس کا خاوند فرعون تھا، لیکن اِس میں اُس کا کیا نقصان؟ وہ اللہ کی مقبول ہو گئی۔ ''مثال بیان کی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لائے ہیں فرعون کی بیوی کی جبکہ کہا اس نے کہ اے میرے رَبّ! بنا میرے لیے اپنے پاس گھر جنت میں، اور نجات دے مجھ کو فرعون سے اور اس کے عمل سے اور نجات دے مجھ کو ظالم لوگوں سے'' یعنی وہ فرعون کے ماحول سے بیزار تھی، شاہی ٹھاٹھ باٹھ اس کو نہیں بھاتی تھی، وہ اپنے ایمان کی

حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے یوں دُعائیں کرتی تھی کہ اے اللہ! مجھے اس ظالم ماحول سے نجات دے دے، ''بنا میرے لیے گھر اپنے پاس جنّت میں، اور نجات دے مجھے فرعون سے اور اس کے عمل سے'' وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ: اور ظالم لوگوں سے مجھے نجات دے...... مریم بنتِ عمران، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ، اُن کی مثال بھی آ گئی کہ باوجود اس بات کے کہ ان کا کوئی شوہر نہیں تھا، اور ایسے ماحول کے اندر انہوں نے تربیت پائی تھی جہاں ارد گرد اسرائیلی تھے، اور اسرائیلیوں کے اندر اخلاق کی گراوٹ جیسی تھی وہ سب کو معلوم ہے، تو ایک تنہا عورت تھی جس کے اُوپر اس کا خاوند بھی نہیں، اس کو سنبھالنے والا، نصیحت کرنے والا۔ لیکن جب اس ماحول میں رہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو ٹھیک رکھا تو اللہ کے ہاں وہ بھی مقبول ہوگئی۔ ''اور مثال بیان کی اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیٹی مریم کی'' الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا: جس نے اپنے گریبان کی حفاظت کی، فرج سے یہاں گریبان مراد ہے، یہ کنایہ ہے پاک دامنی سے، جیسے ہم بھی بولتے ہیں ''پاک دامن''، ''دامن'' تو اصل میں قمیص کا ہے، تو پاک دامن سے مراد ہوتا ہے کہ اخلاق اچھا ہے، ''اس کا دامن آلودہ ہوگیا'' اس سے اخلاق کے گرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، ''وہ پاک دامن نہیں ہے'' یعنی اس کا اخلاق ٹھیک نہیں ہے۔ ''جس نے حفاظت کی اپنے گریبان کی'' حفاظت انہوں نے دونوں طرح سے کی، نہ حلال نہ حرام کسی اعتبار سے بھی کسی کا ہاتھ اپنے گریبان تک نہیں پہنچنے دیا، فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا: تو ہم نے اس گریبان میں پھونک دی اپنی رُوح، وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا: اور اُس مریم بنت عمران نے تصدیق کی اپنے ربّ کی باتوں کی، جو بھی باتیں اس تک پہنچیں نبیوں کے وساطت سے، فرشتوں کے وساطت سے، ''اور تصدیق کی اللہ کی کتابوں کی'' یعنی توراۃ، زبور وغیرہ جو اُتری ہوئی تھیں، وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ: اور وہ فرماں برداروں میں سے تھیں۔

افضل ترین پانچ عورتیں

تو مریم بنتِ عمران اور آسیہ امراۃِ فرعون ان دونوں کی مثال اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے سامنے بیان کی، اور حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَرد تو بہت کامل ہوئے ہیں لیکن عورتوں میں سے کامل چند عورتیں ہوئیں، تو پچھلی اُمتوں میں سے اِن دو کی فضیلت ذِکر فرمائی، ایک مریم کی اور ایک آسیہ امراۃِ فرعون کی، اور اپنی اُمت میں سے تین عورتوں کی برتری کا ذِکر کیا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا[1] تو علماء کے نزدیک یہ پانچ عورتیں دُنیا کی عورتوں میں سے افضل ہیں، باقی! اِن پانچوں میں کلّی فضیلت کس کے لئے ہے؟ اس کے بارے میں کچھ اختلافی اقوال اور قرائن مختلف ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا اٰسِيَةُ امْرَاَةُ فِرْعَوْنَ وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَاِنَّ فَضْلَ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ (بخاری ۱/ ۴۸۳، باب قول اللہ وضرب اللہ مثلاً الخ/ مشکوۃ ۲/ ۵۰۹، باب بدء الخلق، فصل اوّل کا آخر)۔ حَسْبُكَ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ مَرْيَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَخَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَاٰسِيَةُ امْرَاَةُ فِرْعَوْنَ. (ترمذی ۲/ ۲۲۷، باب فضل خدیجۃ/ مشکوۃ ۲/ ۵۷۳، باب مناقب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فصل ثانی)

پارہ
تَبٰرَكَ الَّذِیْ
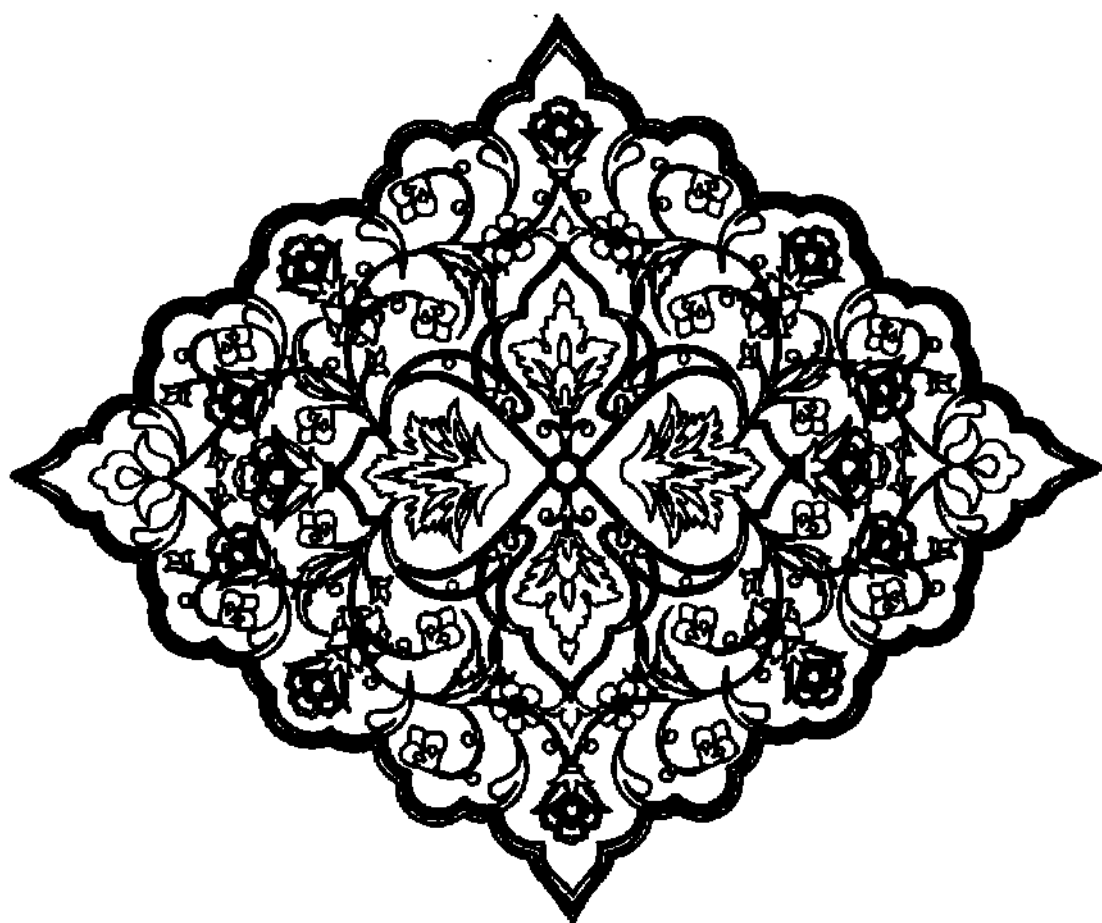
آیاتہا ۳۰ ۶۷ سورۃ الملک مکیۃ ۷۷ رکوعاتہا ۲

سورۂ ملک مکہ معظمہ میں نازل ہوئی، اس کی ۳۰ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ٘ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ

برکت والا ہے وہ جس کے قبضے میں ہے سلطنت، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۞ جس نے پیدا کیا موت کو

وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ ۞ الَّذِیْ خَلَقَ

اور حیات کو تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون زیادہ اچھا ہے از روئے عمل کے، اور وہ زبردست ہے بخشنے والا ہے ۞ جس نے پیدا کیے

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ

سات آسمان اُوپر نیچے، اے مخاطب! تو رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تفاوت نہیں دیکھتا، پھر تو لوٹا نظر کو،

هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۞ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ

کیا تو کوئی پھٹن دیکھتا ہے؟ ۞ پھر لوٹا تو نظر بار بار، لوٹے گی تیری طرف نظر ذلیل ہو کر اس حال میں کہ

هُوَ حَسِیْرٌ ۞ وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا

وہ تھکی ہوئی ہو گی ۞ اور البتہ تحقیق مزین کیا ہم نے قریب والے آسمان کو ستاروں کے ساتھ، اور ہم نے ان کو سنگ باری کا ذریعہ بنایا

لِّلشَّیٰطِیْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ۞ وَلِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ

شیاطین کے لئے، اور ہم نے ان شیاطین کے لئے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے ۞ اور اُن لوگوں کے لیے جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں جہنم کا

جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۞ اِذَآ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّهِیَ تَفُوْرُ ۙ ۞

عذاب ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ۞ جب یہ کافر اس جہنم میں ڈالے جائیں گے تو سنیں گے اس کے لئے دھاڑنا اور وہ جوش مارتی ہوگی ۞

تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ

قریب ہے کہ پھٹ جائے وہ غصے سے، جب ڈالی جائے گی اس کے اندر کوئی جماعت تو ان سے پوچھیں گے اُس جہنم کے داروغے

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ﴿۸﴾ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَكَذَّبْنَا

کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ ﴿۸﴾ وہ کہیں گے کیوں نہیں، ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا، ہم نے اس کی تکذیب کی

وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ﴿۹﴾ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ

اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اُتاری، نہیں ہو تم مگر بڑی گمراہی میں ﴿۹﴾ اور کہیں گے وہ کہ اگر ہم سنتے

اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۰﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۱﴾

یا ہم سوچتے تو ہم جہنم والوں میں سے نہ ہوتے ﴿۱۰﴾ پس اعتراف کیا انہوں نے اپنے گناہ کا، پس دُوری ہے اصحابِ سعیر کے لیے ﴿۱۱﴾

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۱۲﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ

بے شک وہ لوگ جو اپنے رَبّ سے بِن دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور بڑا اجر ہے ﴿۱۲﴾ چھپاؤ تم اپنی بات یا

اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾

اس کو ظاہر کرو بے شک وہ تو دِلوں کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے ﴿۱۳﴾ کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟ وہ باریک بین ہے خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۴﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ مُلک مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۰ آیتیں ہیں، دو رُکوع ہیں۔

سورۂ مُلک کی فضیلت

احادیث میں بعض سورتوں کے خصوصی فضائل منقول ہیں، اُن میں سے ایک یہ سورت بھی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے اس کو ''مُنْجِیہ'' اور ''مَانِعَہ'' قرار دیا،[1] مانعہ: بچانے والی، کہ یہ عذابِ قبر سے بچانے والی سورۃ ہے، اگر کوئی شخص اس کو پڑھتا رہے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے عذابِ قبر سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اِسی قسم کی فضیلت آپ کے سامنے الٓمّ تنزیل السجدۃ کی بھی گزری تھی، تو سرورِ کائنات ﷺ کا معمول تھا کہ سوتے وقت یہ دونوں سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔[2] اور حدیث شریف میں ایک واقعہ بھی ذِکر کیا ہوا ہے کہ ایک صحابی نے نادانستہ کسی قبر کے اُوپر خیمہ لگالیا، یعنی اسے پتا نہیں تھا کہ قبر ہے، کوئی خاص نشان نمایاں نہیں تھا، اس کے اُوپر خیمہ لگالیا، تھوڑی دیر میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ زمین کے نیچے سے سورۂ مُلک کی تلاوت کی آواز آرہی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی مدفون تھا اور وہ قبر میں سورۂ مُلک تلاوت کر رہا ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے اِس بات کو ذِکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورۃ مُنْجِیَہ ہے، یہ عذابِ قبر سے نجات دلانے والی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ اس قسم کے واقعات نمایاں ہوجاتے ہیں جو عالمِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) ترمذی ۲/ ۱۱۷، ابواب الفضائل، باب فضل سورۃ الملک۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۸، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی کا تقریباً آخر۔

(۲) مسند احمد، رقم الحدیث: ۱۴۶۵۹/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۸، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی۔ عن جابر۔

''عالمِ برزخ'' کو ''عالمِ دُنیا'' پر قیاس نہ کیا جائے

اور جو چیز اَحادیث کے اندر آ گئی اس کو ماننا چاہیے، ہمارے بعض دوست ہیں جن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنی موٹی مٹی کی تہہ کے اندر آواز کس طرح سے جاسکتی ہے؟ یا اندر کی آواز کس طرح سے باہر آسکتی ہے؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کا تعلق عالم غیب سے ہے، اُس عالمِ غیب کو اِس عالم شہادت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ تو ایسے واقعات کثرت کے ساتھ ثابت ہیں کہ اللہ تعالیٰ زیرِ زمین مدفون اموات کے حالات دِکھا بھی دیتے ہیں اور ان کی باتیں سنا بھی دیتے ہیں، اور باہر والوں کی بات اُن کو بھی سنا دیتے ہیں، تو اس لیے اہلِ حق کا نظریہ یہی ہے کہ اس میں نہ کوئی عقلاً اِمتناع ہے اور نہ کوئی اس کے اندر شرعاً اِمتناع ہے، عقلاً بھی ایسا ہوسکتا ہے اور شرعی طور پر بھی ایسے واقعات کا ثبوت ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں۔ بہرحال اِس سورۃ کی یہ فضیلت روایات میں آئی ہوئی ہے۔

سورۂ مُلک کا مضمون

یہ سورۃ ''مکی'' ہے اور ''مکی'' سورتوں میں آپ جانتے ہیں کہ اُصول کا تذکرہ ہی ہوتا ہے، اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کو ذِکر کر کے توحید کی تلقین کی گئی ہے، اور منکرین کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے، تو اِثباتِ توحید اور اِثباتِ معاد پر یہ سورۃ مشتمل ہے، ترغیب وترہیب کا مضمون بھی اِس میں ''مکی'' سورتوں کی طرح موجود ہے۔

تفسیر

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ: برکت والا ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہے سلطنت، یَد کا لفظ متشابہات میں سے ہے، یعنی اللہ کے قبضے میں ہے سلطنت، اور ہاتھ اللہ کا ہے جس طرح سے اُس کی شان کے لائق ہے۔ اور برکت والا ہے، یعنی بہت منافع والا ہے، کثیر البرکت ہے، کثیر المنافع ہے، مخلوق کو اس کی ذات سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، ''برکت والا ہے جس کے قبضے میں ہے سلطنت، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

موت وحیات دونوں مخلوق ہیں اور وجودی ہیں

''جس نے پیدا کیا موت کو اور حیات کو'' لِیَبْلُوَكُمْ: تا کہ تمہاری آزمائش کرے اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا: کہ تم میں سے کون زیادہ اچھا ہے از روئے عمل کے، ''اور وہ زبردست ہے بخشنے والا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ کے تصرفات میں سے ایک تصرف یہ بھی ہوا کہ وہ موت وحیات کا خالق ہے، معلوم ہوگیا کہ موت بھی مخلوق ہے اور حیات بھی مخلوق ہے، حدیث شریف میں آتا ہے قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں موجود کریں گے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت بھی ایک وجودی چیز ہے، اہلِ جنت کو دکھائیں گے، اہلِ جہنم کو دِکھائیں گے، دونوں کو دِکھانے کے بعد پھر اس کو فنا کر دیا جائے گا، ذبح کر دیا جائے گا، اور اعلان کر دیا جائے گا کہ آج کے بعد نہ اہلِ جنت میں سے کسی کو موت آئے گی اور نہ اہلِ جہنم میں سے کسی کو موت آئے گی، تو اہلِ جنت کی خوشی کی

انتہا نہیں رہے گی اور اہلِ جہنم کے غم کی انتہا نہیں رہے گی۔[1] تو موت وحیات اللہ تعالیٰ نے پیدا اس لیے کیں تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے اچھا عمل کون کرتا ہے؟

عملی زندگی میں موت وحیات دونوں کا دخل ہے

حیات کا تعلق عمل کے ساتھ تو واضح ہے، کہ اگر اللہ زندگی نہ دیتا تو عمل کس طرح سے ہوتا؟ یہ زندگی دی، صلاحیتیں دیں، اسی لیے تو عمل کرنے کی قوت، طاقت حاصل ہوئی، عمل کرنے کا موقع ملا۔ اور موت کا تصور نہ ہوتا تو اِنسان انجام سے بے فکر ہوتا، تو انجام کی فکر یہ بھی عمل کے لئے ایک محرک ہے، تو جب یہ بتادیا گیا کہ موت بھی آنے والی ہے تو اس نظریے کا دخل ہے انسان کی عملی زندگی میں، تو اگر کوئی شخص یہ سوچ کہ میں نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد پھر اپنے خالق کے سامنے پیش ہونا ہے تو پھر اس کے لئے نیک عمل کرنا اور برائی سے بچنا آسان ہوجاتا ہے، اس لیے عمل میں موت کا بھی دخل ہے اور حیات کا بھی دخل ہے۔ ''تاکہ آزمائے وہ تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست ہے بخشنے والا ہے۔''

آسمان میں اللہ تعالیٰ کا محکم نظام

''جس نے پیدا کیے سات آسمان اُوپر نیچے'' طِبَاقًا یہ طَبَق کی جمع بھی ہوسکتی ہے، تو طَبَقًا بَعْدَ طَبَقٍ کے معنی میں ہے، اُوپر نیچے، تہہ بہ تہہ، اور طِبَاقًا مُطَابَقَةً کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، ایک دوسرے کے مطابق، تو بھی مفہوم وہی ہے، ''جس نے پیدا کیے سات آسمان تہہ بہ تہہ، اُوپر نیچے، ایک دوسرے کے مطابق'' مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ: اے مخاطب! تُو رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تفاوت نہیں دیکھتا، اِس مخلوق سے وہی بالائی مخلوق مراد ہے کہ آسمان کی طرف دیکھو، تمہیں اس نظام کے اندر کوئی کسی قسم کا تفاوت، کوئی خلل، کوئی خرابی نظر نہیں آئے گی، بہت محکم نظام ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت ہی مضبوط ترین بنایا ہے، فَارْجِعِ الْبَصَرَ: پھر تُو لوٹا نظر کو! هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ: کیا تو کوئی پھٹن دیکھتا ہے؟ اُوپر والے عالم میں آسمانوں کی طرف تجھے کوئی پھٹن نظر آتی ہے؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ: پھر تُو لوٹا نظر کو بار بار، كَرَّتَيْنِ یہ تثنیہ ہے، كَرَّةً بَعْدَ كَرَّةٍ، یہ تکرار کے لئے ہے، ''پھر لوٹا تو نظر بار بار'' يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ لوٹے گی تیری طرف نظر خَاسِئًا: ذلیل ہوکر، وَّهُوَ حَسِيْرٌ: اس حال میں کہ وہ تھکی ہوئی ہوگی، یعنی تھک کر ہار کر تیری نظر واپس لوٹ آئے گی لیکن اللہ کی مخلوق کے اندر تو کوئی کسی قسم کی دراڑ، کوئی کسی قسم کا تفاوت اور خرابی نہیں دیکھ سکتا، اتنا محکم نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے عالمِ بالا کی جانب بنایا ہے۔

ستاروں کی تخلیق کے دو مقاصد

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ: اور البتہ تحقیق مزین کیا ہم نے قریب والے آسمان کو، یہ زمین والوں کے سر پر جو سب سے قریب ہے، ''مزین کیا ہم نے قریب والے آسمان کو ستاروں کے ساتھ'' مصابیح جمع ہے مصباح کی، مصباح کہتے ہیں چراغ

---

(۱) بخاری ۶۹۱/۲، کتاب التفسیر، سورۃ مریم۔ ۹۶۹/۲، باب صفۃ الجنۃ والنار/ ترمذی ۸۳/۲، باب فی خلود اهل الجنۃ۔ نیز ۱۴۸/۲ / مشکوۃ ۴۹۳/۲ باب الحوض، فصل اوّل۔

کو، یہاں روشن ستارے مراد ہیں، ''روشن چراغوں کے ساتھ ہم نے آسمان کو مزین کیا'' یعنی چاہے یہ ستارے فضا میں ہوں، لیکن نیچے سے دیکھنے والوں کو یونہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ آسمان کی چھت میں لٹکے ہوئے ہیں تو یہ آسمان کے لئے زینت بنے ہوئے ہیں ہمارے دیکھنے کے اعتبار سے، چاہے خود ان کا وجود فضا میں ہو اور یہ آسمان میں جڑے ہوئے نہ ہوں، ''اور ہم نے ان مصابیح کو، ان ستاروں کو شیاطین کے لیے رُجوم بنایا'' یعنی شیاطین کے لئے ان کو سنگ باری کا ذریعہ بنایا، مَا یُرْجَمُ بِہٖ کے معنی میں، رجوم جمع بنالیجئے رجم کی، اور مَا یُرْجَمُ بِہٖ کے ساتھ اس کا ترجمہ ہو جائے گا، ''ہم نے ان کو شیاطین کے لئے رجم کا ذریعہ بنایا، سنگ باری کا ذریعہ بنایا'' یعنی انہی ستاروں میں سے جن میں سے یہ روشنی پھیل رہی ہے آگ کے شعلے نکلتے ہیں جو ان شیاطین پر برستے ہیں جو اُوپر کی طرف باتیں سننے کے لئے جاتے ہیں، وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ: اور ہم نے اِن شیاطین کے لئے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے۔ وَلِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ: اور اُن لوگوں کے لئے جو اپنے رَبّ کا انکار کرتے ہیں جہنم کا عذاب ہے، اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

جہنّم کا جوش

اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا: شهیق: چیخ کو کہتے ہیں، گدھا جس طرح سے ہینگتا ہے اور زور لگا کے آواز نکالتا ہے، شہیق اور زفیر یہ دو لفظ پہلے بھی سورۂ ہود میں آپ کے سامنے گزرے تھے، ''جب یہ کافر اُس جہنم میں ڈالے جائیں گے تو سنیں گے اس جہنم کے لئے دھاڑنا'' وہ دھاڑے گی، چیخیں مارے گی، شور مچائے گی، وَّهِیَ تَفُوْرُ: اور وہ جوش مار رہی ہوگی، جس طرح سے تنور میں آگ بھڑک رہی ہو تو آواز بھی پیدا ہوتی ہے اور اس میں جوش بھی ہوتا ہے، ''سنیں گے وہ اس جہنم کے لئے چیخنا اور دھاڑنا، اور وہ جوش مارتی ہوگی، قریب ہے کہ پھٹ جائے وہ غصے سے'' یعنی اتنا اس میں جوش ہوگا ایسے لگے گا جیسے پھٹنا چاہتی ہے، ''قریب ہے کہ پھٹ جائے غصے سے۔''

جہنّم کے داروغوں کا جہنمیوں سے سوال

كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ: جب ڈالی جائے گی اس کے اندر کوئی جماعت سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ: تو اس فوج سے (افراد کے اعتبار سے هُمْ کی ضمیر فوج کی طرف لوٹ گئی) ان سے پوچھیں گے اس جہنم کے دارو غے۔ خزنۃ: خازن کی جمع ہے، اس کا انتظام کرنے والے، ''اس کا انتظام کرنے والے پوچھیں گے اُن لوگوں سے'' اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ: کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ یہ ایک تنبیہ ہے اُن کے لئے، کہ تم جو اس عذاب میں مبتلا ہو رہے ہو، جہنم کی طرف آ رہے ہو، کیا تمہیں کوئی سمجھانے والا ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟

جہنمیوں کا جواب میں اِعتراف جرم اور حسرت

قَالُوْا بَلٰی: وہ کہیں گے کیوں نہیں، آیا تھا، قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ: ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا فَكَذَّبْنَا: ہم نے اس کی تکذیب کی، ہم نے اسے جھوٹا کہا، وَقُلْنَا: اور ہم نے کہا، مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ: اللہ نے کوئی چیز نہیں اُتاری، اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ:

نہیں ہو تم مگر بڑی گمراہی میں، یعنی جو ڈرانے کے لیے آئے تھے، جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اُوپر کتاب اُتاری ہے، اللہ نے ہمارے اُوپر وحی اُتاری ہے، یہ باتیں جو ہم تمہیں پہنچاتے ہیں یہ اللہ کی اُتاری ہوئی ہیں، تو ہم پوری ڈھٹائی کے ساتھ انہیں کہہ دیتے تھے کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اُتاری، تم جھوٹ بولتے ہو، ہمارے اُوپر دھونس جمانے کے لئے اور ہمارے اُوپر برتری حاصل کرنے کے لئے تم یہ نام لیتے ہو کہ اللہ نے کچھ اُتارا ہے، اللہ نے کچھ نہیں اُتارا، تم بہت بڑی گمراہی میں ہو جو اپنے آباؤاجداد کا طریقہ چھوڑ کے ایک نیا طریقہ نکال رہے ہو، اور خواہ مخواہ اللہ کے رسول اور نبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، تو ہم ان کو یوں کہہ دیا کرتے تھے، وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ: اور کہیں گے وہ جہنم میں جانے والے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم سنتے یا ہم سوچتے، مَا كُنَّا فِي أَصْحٰبِ السَّعِيرِ: تو ہم جہنم والوں میں سے نہ ہوتے۔ نَسْمَعُ: کسی سمجھانے والے کی بات سُن ہی لیتے، اور نَعْقِلُ: کچھ عقل سے ہی کام لے لیتے، تو آج ہم جہنم والوں میں سے نہ ہوتے۔ یہ جہنمیوں کی بات نقل کی جارہی ہے چونکہ اسی قسم کی باتیں ان مشرکوں کے سامنے بھی آنے والی تھیں جن کو سنائی جارہی ہیں، اور یہ بھی آج یہی کہتے تھے کہ اللہ نے کچھ نہیں اُتارا، تم گمراہی میں ہو، تم غلطی میں ہو۔ تو اللہ تعالیٰ سناتا ہے کہ جہنم میں جاکے پھر تمہیں اپنی اس غلطی کا اعتراف کرنا پڑے گا، اس لیے آج سمجھ جاؤ، پھر وہاں پچھتاؤ گے۔

آیتِ بالا عقیدۂ سماعِ موتٰی کے خلاف نہیں

سننے سے مراد ہے کہ کسی دُوسرے کی بات سُن کر مان لی جائے، یہاں سننے سے ماننا مراد ہے، جیسے کہ سماعِ موتٰی کے مسئلے میں آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ سننا کنایہ ہوتا ہے ماننے سے، ''میری بات فلاں سنتا ہی نہیں'' اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ اس کے کانوں تک آواز ہی نہیں پہنچتی، اسی طرح سے لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ کا یہ معنی ہے کہ اگر کسی کی بات سُن کے ہم مان لیتے، ورنہ سنتے تو وہ تھے، انبیاء علیہم السلام نے باتیں تو ان تک پہنچائی تھیں، جیسے وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ڈرانے والے ہمارے پاس آئے تھے، ڈرانے والوں نے ڈرایا تھا، وہ باتیں ان کے کانوں تک پہنچی تھیں، اور انہوں نے وہ باتیں سنی تھیں، لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ اگر ہم سُن کے مان لیتے یا خود اپنی عقل سے ہی کام لے لیتے تو آج ہمارا انجام یہ نہ ہوتا، فَاعْتَرَفُوا بِذَنْۢبِهِمْ: پس اعتراف کیا انہوں نے اپنے قصور کا، اپنے گناہ کا، فَسُحْقًا لِّأَصْحٰبِ السَّعِيرِ پس اَصحابِ سعیر کے لئے سحق ہے، سحقًا مصدر ہے، جس کا معنی ہے دُوری، ''پس دُوری ہے اَصحابِ سعیر کے لئے'' یعنی ان کو یوں کہہ دیا جائے گا سُحْقًا سُحْقًا دفع ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، دُور ہو جاؤ، ''دفع دُوری ہے اُن کے لئے'' یعنی ان کو کوئی عزت کے ساتھ بلائے گا نہیں، عزت کے ساتھ کوئی جگہ نہیں دے گا، اللہ کی رحمت سے ان کو دھتکار دیا جائے گا۔ ''پس دُوری اور پھٹکار ہے اَصحابِ سعیر کے لئے۔''

متقین کا انجام

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ: یہ مقابلۃً دوسرے فریق کا انجام مذکور ہے، ''بیشک وہ لوگ جو اپنے رَبّ سے بن دیکھے

ڈرتے ہیں، غیب میں ڈرتے ہیں یعنی تنہائی میں ڈرتے ہیں جبکہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں، ''بے شک وہ لوگ جو ڈرتے ہیں اپنے رَبّ سے بے دیکھے'' یعنی اللہ کو انہوں نے دیکھا نہیں، اللہ ان کے نزدیک ایک چھپی ہوئی حقیقت ہے، غیب ہے، جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی، دلائل سے پہچانی جاتی ہے، یا غیب کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں جس وقت اپنے اللہ سے ڈرتے ہیں، ''بیشک جو ڈرتے ہیں اپنے رَبّ سے بِن دیکھے'' لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ: ان کے لئے بخشش ہے اور بڑا اَجر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اِحاطۂ علمی کا بیان

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ: یہ اللہ کا علمی اِحاطہ آ گیا تم چھپاؤ اپنی بات کو یا اُس کو جہر کرو، یعنی ظاہر کر کے بلند آواز سے بولو، ''چھپاؤ تم اپنی بات یا اُس کو ظاہر کرو'' اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: اللہ سے کوئی بات مخفی نہیں، بے شک وہ تو دلوں کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے، علیمٌ بِاَقوالِ ذاتِ الصُّدورِ، صدور: صدر کی جمع، صدر سینے کو بھی کہتے ہیں، اور صدر بول کر دل بھی مراد لیا جاتا ہے، کیونکہ راز اور بھید کی نسبت دونوں کی طرف ہوتی ہے، ''دِلوں کے بھید''، ''سینوں کا راز'' دونوں قسم کے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو بات تمہاری زبان پہ آ جائے گی چاہے وہ سرًا آئے یا جہرًا آئے اس کو اللہ تعالیٰ کیوں نہیں جانے گا جبکہ وہ تو دِلوں کے خیالات کو بھی جانتا ہے۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ: کیا وہ نہ جانے جو پیدا کرنے والا ہے، کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟ وہ باریک بین ہے خبر رکھنے والا ہے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے علمی اِحاطے کے لئے ایک عقلی دلیل دے دی کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ خلق تو علم سے ہی ہو سکتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز پیدا کر دی جائے اور پیدا کرنے والے کو پتا بھی نہ ہو، تو جب ہر ہر چیز کا خالق وہ ہے تو لازماً ہر ہر چیز کو جاننے والا بھی وہ ہے، ''کیا جو پیدا کرے وہ نہ جانے؟'' یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیدا کرنے والے کو علم نہ ہو، پیدا کرنے والا ہر چیز پہچانتا جانتا ہے، اس کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں، ''وہ باریک بین ہے خبر رکھنے والا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ
وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو پست بنایا، پس چلو پھرو تم اس کے کناروں میں، اور اللہ کے رِزق کو کھاؤ،
اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ
اسی کی طرف ہی اُٹھ کر جانا ہے ۞ کیا بے خوف ہو گئے تم؟ اس سے جو آسمان میں ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے، پس اچانک وہ زمین
تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ
لرزنے لگ جائے گی ۞ یا بے خوف ہو گئے تم؟ اُس سے جو آسمان میں ہے کہ بھیج دے تم پر کنکریاں برسانے والی تند ہوا،

فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ

پھر تمہیں عنقریب پتا چل جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسے ہے ﴿۱۷﴾ البتہ تحقیق جھٹلایا اُن لوگوں نے جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، پس میرا انکار کرنا

نَكِیْرِ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ ؔ مَا یُمْسِكُهُنَّ

کیسے تھا؟ ﴿۱۸﴾ کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا اپنے اُوپر، جو اپنے پروں کو پھیلانے والے ہیں اور پروں کو سمیٹتے ہیں، نہیں روکتا ان کو

اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ ﴿۱۹﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ

مگر رحمٰن، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ﴿۱۹﴾ کون ہے یہ جو تمہارا لشکر ہے مدد کرے گا تمہاری

مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ

رحمٰن کے علاوہ، نہیں ہیں کافر مگر دھوکے میں ﴿۲۰﴾ یا کون ہے جو رزق دے گا تمہیں

اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ

اگر اللہ اپنا رزق روک لے، بلکہ انہوں نے اِصرار کیا سرکشی میں اور نفرت میں ﴿۲۱﴾ کیا پھر وہ شخص جو چلتا ہے منہ کے بل گرتا ہوا

اَهْدٰٓى اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۲﴾ قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ

یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا جو چلتا ہے سیدھا صراطِ مستقیم پر؟ ﴿۲۲﴾ آپ کہہ دیجئے وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ

اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دِل بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو ﴿۲۳﴾ آپ کہہ دیجئے وہی ہے

الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ

جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا، اور اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے ﴿۲۴﴾ کہتے ہیں کہ کب ہوگا یہ وعدہ

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۶﴾

اگر تم سچے ہو ﴿۲۵﴾ آپ کہہ دیجئے کہ (تعیین کے ساتھ) علم تو اللہ کے پاس ہے، اور میں تو واضح طور پر ڈرانے والا ہوں ﴿۲۶﴾

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ

جس وقت دیکھیں گے اس عذاب کو قریب تو بُرے ہو جائیں گے چہرے ان لوگوں کے جنہوں نے کُفر کیا، اور کہا جائے گا یہ ہے وہ جس کو

تَدَّعُوْنَ﴿۲۷﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا

تم طلب کیا کرتے تھے ﴿۲۷﴾ آپ کہیے کہ تم بتلاؤ اگر اللہ ہلاک کردے مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو یا ہم پر رحم کرے

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴿۲۸﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ

تو پھر کون پناہ دے گا کافروں کو عذابِ الیم سے؟ ﴿۲۸﴾ آپ کہہ دیں کہ وہ رحمٰن ہے، ہم تو اس پر ایمان لے آئے، اور اسی پر

تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۲۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ

ہم نے بھروسا کیا، پس عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا کہ صریح گمراہی میں کون ہے ﴿۲۹﴾ آپ کہہ دیں کہ تم بتلاؤ اگر تمہارا پانی

غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ﴿۳۰﴾

نیچے چلا جائے تو کون لے آئے گا تمہارے پاس جاری صاف ستھرا پانی ﴿۳۰﴾

تفسیر

زمین میں اللہ کے اِنعامات اور قدرت کے نمونے

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا: اب یہ آگے نعمتوں کا ذکر بھی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے، ''وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ذَلول بنایا'' ذَلول کہتے ہیں پست کو، مطیع کو، فرماں بردار کو، یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں ذبحِ بقرہ کے اندر بھی آیا تھا لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ (آیت:۷۱) وہ کام میں لگائی ہوئی نہ ہو، مسخر کی ہوئی نہ ہو، جو کھیت کو باہتی ہو یا سیراب کرتی ہو کھیتی کو، تو وہاں بھی ذَلول، مسخر کی ہوئی، کام میں لگائی ہوئی۔ اور سورۂ نحل کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (سورۂ نحل:۶۹) وہ بھی ذَلول کی جمع ہے، ایسے راستے جو تیرے تابع ہیں، مطیع ہیں۔ تو یہاں ذلول کا یہی معنی ہے نرم، پست، دبی ہوئی، فرماں بردار، جو تمہارے سامنے کوئی کسی قسم کی مشکل پیدا نہیں کرتی، ''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو پست بنایا، نرم بنایا'' جو تمہارے سامنے دبی ہوئی ہے، فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا: مناکب مَنکِب کی جمع ہے، منکب کندھے کو کہتے ہیں، یہاں سے اِس کی وادیاں اور اِس کے راستے مراد ہیں، ''پس چلو پھرو تم اس کے کناروں میں، اس کے کندھوں میں چلو پھرو'' یعنی اس کے کناروں میں، اس کی وادیوں میں چلو پھرو، وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ: اور اللہ کے رزق کو کھاؤ جو اِسی زمین سے تمہارے لیے نکلتا ہے۔ لیکن ساتھ یہ بات یاد رکھو، وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ: اسی کی طرف ہی اُٹھ کر جانا ہے، اسی زمین سے اُس نے تمہیں پیدا کیا، زمین کو تمہارے لیے ذَلول اور پست بنایا، جس سے تمہاری ضروریات پوری ہوتی ہیں، اسی سے تمہیں رزق کے خزانے دیے، خوب کھاؤ پیو، زمین کے اندر، چلو پھرو، لیکن اس بات کو یاد رکھو وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ: اسی کی طرف ہی اُٹھ کر جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ زمین میں دھنسانے اور سخت آندھی بھیجنے پر بھی قادر ہے۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ: کیا تم بے خوف ہو گئے اُس سے جو آسمان میں ہے، جس کی بادشاہت اور حکومت آسمان میں ہے، اللہ تعالیٰ کی نسبت عموماً عالمِ بالا کی طرف ہی کی جاتی ہے، عرش کی طرف، عالمِ بالا کی طرف، ''کیا بے خوف ہو گئے تم اُس سے جو آسمان میں ہے'' اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ: کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے، اِس بات سے تم بے خوف ہو گئے ہو؟ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ: پس اچانک وہ زمین لرزنے لگ جائے گی، مَارَ يَمُوْرُ: حرکت کرنا، یعنی زلزلے کی صورت پیدا ہو جائے اور تم اس زمین کے اندر دھنس جاؤ، اللہ تعالیٰ کو اس بات کی قدرت ہے، تم اس سے بے خوف کیسے ہو گئے ہو؟ ''کیا تم نڈر ہو گئے، بے خوف ہو گئے اُس سے جو آسمان میں ہے اِس بات سے کہ دھنسا دے وہ تمہیں زمین میں، پس اچانک وہ زمین لرزنے لگ جائے گی'' اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ: یا بے خوف ہو گئے تم اُس سے جو آسمان میں ہے اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا: کہ بھیج دے تم پر کنکریاں برسانے والی تند ہوا، ایسی آندھی آ جائے جو تم پر پتھر برسائے، کنکریاں برسائے، فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ: پھر تمہیں عنقریب پتا چل جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسے ہے، یہ نذیر مصدر کے معنی میں ہے، ''عنقریب پتا چل جائے گا میرا ڈرانا کیسے ہے'' کہ یہ خالی دھمکیاں ہیں یا اس میں کوئی واقعہ بھی ہے، آنے والے حالات تمہیں بتا دیں گے، جیسے کہ نمونہ دکھایا جا رہا ہے تاریخ کے حوالے سے وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: البتہ تحقیق جھٹلایا ان لوگوں نے جو اِن سے پہلے گزرے ہیں فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ: نکیر کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دلالت کرنے والا ہے، فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِيْ میرا انکار کرنا ان کے احوال پر، اعمال پر کیسا تھا؟ یعنی جب میں نے پھر ان پہ انکار کیا، عملی انکار، عذاب کی صورت میں، تو وہ کیسا تھا، ''پس میرا انکار کرنا کیسے تھا؟''

پرندوں میں قدرتِ الٰہی کے نمونے

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ: کیا انہوں نے دیکھا نہیں پرندوں کی طرف اپنے اُوپر، آسمان کے نشانات اور زمین کے نشانات کی طرف متوجہ کرنے کے بعد یہ فضا کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے، ''کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا اپنے اُوپر؟'' صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ: جو اپنے پروں کو پھیلانے والے ہیں اور پروں کو سمیٹتے ہیں، کبھی پھیلاتے ہیں کبھی سمیٹتے ہیں، مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ: نہیں روکتا ان کو مگر رحمٰن، یعنی اللہ تعالیٰ نے فضا ایسی بنا دی اور پرندوں کی ساخت ایسی کر دی کہ وزنی ہونے کے باوجود وہ فضا کے درمیان اُڑتے پھرتے ہیں، کبھی پَر پھیلاتے ہیں کبھی سمیٹتے ہیں، یہ سب اللہ کی قدرت ہے، اور اس قدرت کو نمایاں کر کے ہی بتایا جا رہا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا تمہیں کیوں سمجھ میں نہیں آتا؟ جس اللہ تعالیٰ کی قدرت چاروں طرف اُوپر نیچے تمہارے سامنے اس طرح سے بکھری ہوئی ہے، آثارِ قدرت نمایاں ہیں، تو تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ مارنے کے بعد تمہیں زندہ نہیں کیا جا سکتا؟ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ: بیشک وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

رحمٰن کے علاوہ نہ کوئی مدد کر سکتا ہے نہ رزق دے سکتا ہے

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ: اَمۡ مَنۡ هٰذَا الَّذِیۡ، اَمۡ علیحدہ ہو گیا، مَنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ، کون ہے یہ جو تمہارا لشکر ہے مدد کرے گا تمہاری رحمٰن کے علاوہ، یعنی رحمٰن اگر تمہیں پکڑنا چاہے، گرفت کرنا چاہے، تو وہ کون ہے تمہارا لشکر جو تمہاری مدد کرے گا؟ اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ: نہیں ہیں کافر مگر دھوکے میں، اگر انہوں نے فرضی طور پر کوئی ہستیاں اور شخصیتیں ایسی بنائی ہوئی ہیں جن کو یہ سمجھتے ہیں کہ موقع پر یہ ہماری مدد کرتے ہیں، یہ ان کو دھوکا ہے، جب اللہ کی گرفت آئے گی کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔ اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُكُمۡ اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ: یا کون ہے یہ جو رزق دے گا تمہیں اگر اللہ اپنا رزق روک لے، آسمان سے بارش نہ برسنے دے، زمین سے نباتات نہ اُگنے دے، تو کون ہے جو تمہیں روزی دے سکتا ہے؟ ان سب باتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی قدرت اور اللہ کے علم کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھ جائیں، لیکن یہ سمجھتے نہیں ہیں، بلکہ سرکشی اور نفرت میں اَڑے ہوئے ہیں، بَلۡ لَّجُّوۡا: بلکہ انہوں نے اِصرار کیا سرکشی میں اور نفرت میں، سرکشی اور نفرت میں یہ لوگ اَڑے ہوئے ہیں، ان کی اَڑی نہیں جاتی۔

مشرک اور موحد کی مثال

اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُكِبًّا عَلٰی وَجۡهِهٖۤ اَهۡدٰۤی: کیا پھر وہ شخص جو چلتا ہے منہ کے بَل گرتا ہوا، زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا جو چلتا ہے سیدھا صراطِ مستقیم پر؟ وہ اچھی طرح سے منزل پر پہنچنے والا ہے، یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے ہیں، اور ان دونوں باتوں کو دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہے کہ جو سیدھے راستے پہ چل رہا ہے اور سیدھا سیدھا چل رہا ہے، اس کو کہیں ٹھوکر نہیں لگتی، وہ کہیں گرتا نہیں، وہ اپنی منزل پر جلدی پہنچے گا بمقابلہ اس شخص کے جو کبھی چلتا ہے، کبھی گر جاتا ہے منہ کے بَل۔ یہ مثال مشرک کی ہے کہ جس کے سامنے کوئی راستہ واضح نہیں، کبھی کسی دروازے پہ ٹھوکر کھاتا ہے، کبھی کسی دروازے پہ ٹھوکر کھاتا ہے، یہ شخص کبھی اپنی مطلوب منزل کو نہیں پا سکتا۔ "کیا پھر جو شخص جو چلتا ہے" مُكِبًّا عَلٰی وَجۡهِهٖ: اَكَبَّ: اُلٹا ہو جانا، كَبَبۡتُهٗ فَاَكَبَّ: میں نے اس کو اُلٹا کیا پس وہ اُلٹا ہو گیا، اور مُكِبًّا عَلٰی وَجۡهِهٖ یہ یَمۡشِیۡ کی ضمیر سے حال ہے، چل بھی رہا ہے، چہرے کے بَل اُلٹا ہوتا ہوا، یعنی کبھی منہ کے بَل گرتا ہے، کبھی اُٹھتا ہے، گرتا پڑتا چلتا ہے، "تو یہ زیادہ ہدایت پانے والا ہے؟ یا وہ شخص جو سیدھا چلتا ہے اور صراطِ مستقیم پر چلتا ہے" سَوِیًّا کا معنی کہ جو چلنے کا سیدھا طریقہ ہے، جس طرح سے انسان چلا کرتے ہیں، "جو چلتا ہے سیدھا کھڑے ہونے کی حالت میں صراطِ مستقیم پر" یعنی منہ کے بَل گرتا نہیں، سَر کے بَل گرتا نہیں، بلکہ سیدھے طریقے سے وہ چلتا ہے۔

قیامت کے متعلق کُفّار کے شبہات کے جوابات، اور کُفّار کا انجامِ بد

قُلۡ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ: آپ کہہ دیجئے، وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو، اس قسم کی آیات بار ہا ذکر ہو چکیں، "آپ کہہ دیجئے، وہی ہے جس نے

تمہیں زمین میں پھیلایا" وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ: اور اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے، جو پھیلاتا ہے وہ جمع بھی کرلے گا۔ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ: یہ وہی پرانی مشرکانہ بات ہے، جب بھی ان کے سامنے عالمِ آخرت کا ذکر آتا، مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنے کا، تو فوراً وہ بھی کہتے: "کہتے ہیں کہ کب ہوگا یہ وعدہ؟" اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اگر تم سچے ہو تو اس وعدے کا وقت بتاؤ، اور جب ان کو صحیح طور پر تعیین کرکے وقت نہ بتایا جاتا تو اس کو وہ دلیل بناتے کہ یہ بات غلط ہے، حالانکہ دُنیا کے اندر کتنے واقعات ہیں جن کے واقع ہونے کی ہمیں کوئی معین تاریخ معلوم نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ہوتے ہیں، تو ضروری نہیں کہ جس کا ہمیں علم نہ ہو وہ واقعہ پیش ہی نہ آئے، قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ: آپ کہہ دیجئے کہ تعیین کے ساتھ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، ہم یہ نہیں بتاسکتے کہ یہ واقعہ کس وقت پیش آئے گا؟ لیکن آئے گا ضرور، "آپ کہہ دیجئے کہ علم اللہ ہی کے پاس ہے" وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ: میں تو کھول کر بیان کرنے والا ہوں ڈرانے والا ہوں، واضح طور پر ڈرانے والا ہوں، نذیر: ڈرانے والا ہوں، مبین کا معنی واضح طور پر، میرا منصب تو صرف آخرت کے عذاب سے ڈرانا ہے، وقت بتانا یا اُس کو تمہاری مرضی کے مطابق لے آنا یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً: زلفی قریب ہونے کو کہتے ہیں، یہ مصدر کے طور پر لفظ پہلے بھی استعمال ہوا تھا مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (سورۂ زمر: ۳)۔ "جس وقت دیکھیں گے اس عذاب کو قریب" آنکھوں کے سامنے آجائے گا، اس کے آثار نمایاں ہوجائیں گے سِیْٓــٴَـتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: بُرے ہوجائیں گے چہرے ان لوگوں کے جنہوں نے کفر کیا، ان کی شکلیں بگڑ جائیں گی اس عذاب کو دیکھ کر، وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ: اور کہا جائے گا یہ ہے وہ جس کو تم طلب کیا کرتے تھے۔

کافرو! ہماری فکر کی بجائے تم اپنی فکر کرو

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ: آپ کہیے کہ تم بتلاؤ! اگر اللہ مجھے ہلاک کردے، جس طرح سے تم کہتے ہو کہ یہ عنقریب مرجائے گا، نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (سورۂ طور: ۳۰)، "اگر اللہ مجھے ہلاک کردے اور ان کو بھی جو میرے ساتھ ہیں یا ہم پر رحم کرے" ان دونوں صورتوں میں تم نے اپنے متعلق کیا سوچا؟ یعنی اگر ہم ہلاک بھی ہوجائیں، ہمیں موت آجائے، مجھے بھی آجائے، میرے ساتھیوں کو بھی آجائے، تو تمہارے لیے اس میں اطمینان کی صورت کون سی ہے؟ تمہیں تو اپنی جان کی فکر کرنی چاہیے، "اگر ہلاک کردے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھیوں کو یا ہم پر رحم کرے تو پھر کون پناہ دے گا کافروں کو عذابِ الیم سے؟" یعنی ہماری ہلاکت سے تمہیں کوئی عذابِ الیم سے پناہ نہیں مل جائے گی، تمہیں اپنی جان کی بہرحال فکر کرنی چاہیے، اَجَارَ یُجِیْرُ: پناہ دینا، "کون پناہ دے گا کافروں کو عذابِ الیم سے۔" قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ: آپ کہہ دیں کہ وہ رحمٰن ہے، ہم تو اُس پر ایمان لے آئے اور اسی پر ہم نے بھروسا کیا، اس لئے ہم تو بہرحال اس سے اچھی اُمید رکھتے ہیں، اچھے انجام کی، کہ دُنیا میں اور آخرت میں وہ ہمیں اچھے انجام کی طرف پہنچائے گا، کیونکہ ہمارا اس پہ ایمان ہے اور اسی پہ بھروسا ہے، فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: پس عنقریب تمہیں پتا

چل جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے؟ ان مؤمنین کو اور اللہ کے رسول کو تم جو کہتے ہو کہ یہ بڑی گمراہی میں ہیں تمہیں پتا چل جائے گا کہ صریح گمراہی میں کون ہے؟

اللہ تعالیٰ اگر پانی نیچے لے جائے تو کوئی واپس نہیں لا سکتا

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا: غَارَ يَغُوْرُ: نیچے کی طرف چلے جانا، یہ جو آپ کسی بات میں غور کیا کرتے ہیں تو اس کا یہی معنی ہوتا ہے کہ اس کی تہہ کو پہنچنے کی آپ کوشش کرتے ہیں، ''میں نے اِس بات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے'' یعنی ایسی نظر کے ساتھ جو کہ بالکل تہہ کو پہنچنے والی ہو، تو غور نیچے کو جانے کو کہتے ہیں۔ '' آپ ان سے پوچھیں کہ تم بتاؤ اگر تمہارا پانی نیچے کو جانے والا ہو جائے'' یعنی اور اللہ کی نعمتیں تو چھوڑیے، صرف ایک پانی والی نعمت کو دیکھ لیجئے، آسمان سے اللہ برساتا ہے، پھر بعد میں اس کو زمین میں محفوظ کرتا ہے، پھر تم گڑھے کھود کر اور کنویں کھود کر اور نلکے پائپ لگا کر اس پانی کو نکال لیتے ہو۔ ''اگر اللہ تعالیٰ اس پانی کو نیچے لے جائے'' فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ: تو کون لے آئے گا تمہارے پاس جاری صاف ستھرا پانی، تمہارے پاس صاف ستھرا پانی، جاری پانی کون لے آئے گا، یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنی یہی نعمت تم سے سلب کر لے تو تمہیں پانی میسّر نہ آئے، تم عاجز آ جاؤ گے اس پانی کے نکالنے کے لئے۔ یہ زمین میں جو پانی ہے آپ جانتے ہیں کہ آسمان کی طرف سے بارش ہوتی ہے، پہاڑوں پر برف باری ہوتی ہے، وہی پانی ہے جو زمین کی سوتوں میں اندر سے ہر جگہ پہنچتا ہے اور لوگ اس کو اپنی ضرورت کے بمطابق نکالتے رہتے ہیں۔ آسمان سے بارش نہ ہو، پہاڑوں پر برف باری نہ ہو، اسی طرح سے زمین کے نیچے جو پانی ہے وہ بہت نیچے چلا جائے کہ انسان کی دسترس سے باہر ہو جائے، تو کس میں قوت اور طاقت ہے کہ صاف ستھرا شفاف پانی اِنسان کو لا کر پلائے۔

ایک بے دِین کا واقعہ

''جلالین'' میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے آخر میں علامہ محلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک بے دِین نے اس آیت کو سننے کے بعد کہا تھا کہ ہم کسیوں اور مزدوروں کے ذریعے سے پانی نیچے سے نکال لیں گے، کتنا گہرا چلا جائے گا؟ تو رات کے وقت اس کی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا اور آواز آئی کہ لو! ہم نے تیری آنکھوں کا پانی گہرا کر دیا، نیچے کر دیا، اب ذرا اس کو نکلوا کے دِکھاؤ، صبح اُٹھا تو اندھا تھا، یعنی زمین کے پانی کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو واپس کیا لانا ہے، ذرا اپنی آنکھوں کے پانی کے خشک ہو جانے کے بعد ذرا اِسی کو واپس لا کر دِکھا دو۔ تو اللہ تعالیٰ کی جس وقت گرفت ہوتی ہے، پھر اِنسان کے ہوش ٹھکانے آتے ہیں، قبل از وقت انسان نہیں سوچتا۔[1]

(۱) دیکھئے: ''جلالین'' و''کشاف'' مختصراً۔ نیز تفسیر مدارک للنسفی، ۴م /۱۰۷۔ اور تفسیر فتح الرحمٰن للمقدسی ۷م /۹۲۔

آیاتها ۵۲ ۶۸ سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ ۲ رکوعاتها ۲

سورۂ قلم مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ۵۲ آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا

نٓ، قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جس کو وہ لکھتے ہیں ۝ آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں ۝ اور بے شک آپ کے لئے البتہ اجر ہے

غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝۳ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝۵ بِاَيِّكُمُ

جو ختم نہیں ہوگا ۝ اور بے شک آپ خُلقِ عظیم پر ہیں ۝ پس آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے ۝ کہ تم میں سے کس کو

الْمَفْتُوْنُ ۝۶ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۪ وَهُوَ اَعْلَمُ

جنون ہے ۝ بے شک آپ کا رب خوب جاننے والا ہے اس کو جو بھٹک گیا اس کے راستے سے، اور وہ خوب جاننے والا ہے

بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۷ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹ وَ

ہدایت یافتہ لوگوں کو ۝ آپ جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانیے ۝ وہ چاہتے ہیں اگر آپ نرم ہو جائیں تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے ۝ اور

لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱

کہنا نہ مانیے ہر ایسے شخص کا جو کہ بہت قسمیں کھانے والا ہے، ذلیل ہے، ۝ طعنہ زن ہے، چغلی کے ساتھ پھرنے والا ہے ۝

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳ اَنْ كَانَ

بھلائی سے روکنے والا ہے، ظالم ہے، گنہگار ہے ۝ سخت مزاج ہے، اور ان سب کے بعد بدنام ہے ۝ اس وجہ سے کہ وہ

ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۱۴ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۵

مال اور بیٹوں والا ہے ۝ جب اس پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ۝

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝۱۶ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ

عنقریب ہم اس کے ناک پر نشان لگائیں گے ۝ بے شک ہم نے ان کو آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح سے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا جبکہ

اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝۱۷ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝۱۸ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ

قسم کھائی انہوں نے کہ البتہ ضرور کاٹیں گے وہ اس باغ کو صبح کے وقت ۝ اور انہوں نے اِن شاء اللہ بھی نہ کہا ۝ گھوم گیا اس باغ پر کوئی گھومنے والا

مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝۱۹ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝۲۰ فَتَنَادَوْا

تیرے رَبّ کی جانب سے اس حال میں کہ وہ سوئے ہوئے تھے ۝ پس ہوگیا وہ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ۝ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو آوازیں دیں

مُصْبِحِيْنَ ۝۲۱ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝۲۲ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝۲۳

صبح کے وقت ۝ کہ چلو تم اپنے کھیت پر اگر تم کاٹنے والے ہو ۝ پس وہ چلے اس حال میں کہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے ۝

اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ۝۲۴ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝۲۵ فَلَمَّا

کہ نہ داخل ہو اُس باغ میں تم پر آج کوئی مسکین ۝ وہ صبح صبح چلے اس حال میں کہ وہ قدرت پانے والے تھے روکنے پر ۝ جب

رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝۲۶ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝۲۷ قَالَ اَوْسَطُهُمْ

انہوں نے اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم راستہ بھولنے والے ہیں ۝ بلکہ ہم تو محروم ہوگئے ۝ ان میں سے جو اچھا آدمی تھا اس نے کہا

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝۲۸ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۲۹

میں نے تمہیں کہا نہیں تھا؟ کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں بیان کرتے ۝ وہ کہنے لگے ہمارا رَبّ پاک ہے، بے شک ہم ہی غلط کار تھے ۝

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝۳۰ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا

پھر متوجہ ہوا اُن کا بعض بعض پر اس حال میں ایک دُوسرے کو ملامت کر رہے تھے ۝ کہا انہوں نے کہ اے ہماری خرابی! بے شک ہم ہی

طٰغِيْنَ ۝۳۱ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝۳۲

سرکش تھے ۝ اُمید ہے کہ ہمارا پروردگار بدل کے دے دے گا ہمیں اس سے بہتر، ہم اپنے رَبّ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں ۝

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۳ ع

عذاب ایسے ہی آیا کرتا ہے، اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ جان لیں ۝

سورۂ قلم مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵۲ آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں۔

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

جس طرح سے پچھلی سورت ''مکی'' ہے اور اس میں اُصول کا ذکر ہے، اسی طرح سے سورۂ قلم کے اندر بھی اُصولی باتوں کا ذکر ہے، لیکن خصوصیت سے رِسالت کا مسئلہ زیرِ بحث ہے، اور اِثباتِ معاد اور آخرت کے عذاب کے ساتھ ترہیب بھی ہے اور اچھے انجام کے ساتھ ترغیب بھی ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ: نٓ: یہ حروفِ مقطعات میں سے ہے جس طرح سے ''قٓ'' آیا تھا اسی طرح سے یہ ''نٓ'' ہے، اللہ اعلم بمرادہ بذلك، اور بعض مفسرین اس کو سورت کا نام قرار دیتے ہیں، وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ: قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جس کو وہ لکھتے ہیں! مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ: آپ اپنے ربّ کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں، وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ: اور بیشک تیرے لئے البتہ اُجر ہے جو ختم نہیں ہوگا، غَيْرَ مَمْنُوْنٍ: مَنّ قطع کے معنیٰ میں، ''جو ختم نہیں ہوگا'' وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ: اور بے شک آپ خُلُقِ عظیم پر ہیں، فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ: پس تُو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے، بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ: باء کو زائدہ قرار دیا جائے، تو اَيُّكُمُ المفتونُ تم میں سے کون مفتون ہے، تُو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون مفتون ہے۔ مفتون: فتنے میں ڈالا ہوا۔ شیطان نے، نفس نے کس شخص کو فتنے میں ڈال رکھا ہے۔ یا مفتون سے مجنون مراد ہے ''تم میں سے کون مجنون ہے؟ تُو بھی دیکھ لے گا اور یہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔'' اور اگر باء کو زائدہ نہ بنایا جائے تو مفتون: جنون کے معنیٰ میں بھی لیا گیا ہے کہ تم میں سے کس کو جنون ہے؟ اور یہ معنیٰ بھی کیا گیا ہے کہ اَيُّكم میں کم کا خطاب تمام کو ہو گیا مسلمانوں کو بھی اور کافروں کو بھی، یعنی تم جو دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہو، مسلمان اور کافر، تو دونوں گروہوں میں سے کس گروہ کے اندر مفتون اور مجنون موجود ہے تم عنقریب دیکھ لو گے، مجنون مشرکین میں ہیں یا مجنون مسلمانوں میں ہیں؟ تمہیں عنقریب پتا چل جائے گا، اس طرح سے بھی اس کے مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ بہر حال مطلب یہ ہوا کہ عنقریب واضح ہو جائے گا کہ جنون تمہیں ہے یا ہمیں، مجنون تم ہو یا ہم ہیں، عنقریب اس بات کا پتا چل جائے گا، ''تُو بھی دیکھ لے گا اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کس کو جنون ہے؟ بے شک تیرا ربّ خوب جاننے والا ہے اس کو جو بھٹک گیا اس کے راستے سے، اور وہ خوب جاننے والا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو۔''

تفسیر

''قلم'' کا مصداق اور جوابِ قسم کے ساتھ مناسبت

وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ: ''قلم'' تو آپ جانتے ہی ہیں، یہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، جس کے ذریعے سے لکھا جاتا ہے، لیکن اس ''قلم'' سے کون سی ''قلم'' مراد ہے، اس میں مفسرین کے دو قول ہیں، یا تو وہ ''قلم'' مراد ہے جو اللہ نے سب سے پہلے پیدا کی تھی، جیسے روایات میں آتا ہے، اور پھر اس کے بعد اس کو کہا تھا کہ لکھ! قلم نے کہا کہ میں کیا لکھوں؟ تو اللہ نے فرمایا کہ لوگوں

کی مقادیر لکھ، جو کچھ ہونے والا ہے، جو کچھ ہوگا وہ سب لکھ! تو قلم نے وہ سب کچھ اللہ کی قدرت کے تحت لکھ دیا جو ''لوحِ محفوظ'' کی شکل میں محفوظ ہے۔ تو اس ''قلم'' سے وہ ''قلم'' مراد ہے، اور اس ''قلم'' کی قسم کھائی جارہی ہے، اور مَا يَسْطُرُوْنَ سے مراد ہو جائے گا جو کچھ لکھتے ہیں یعنی فرشتے، اللہ تعالیٰ کی تحریر جو ''لوحِ محفوظ'' میں ہے یا نامۂ اعمال میں ہے مَا يَسْطُرُوْنَ سے وہ مراد ہو جائے گی۔ اور وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ یہ قسم ہے، قلم کی قسم اور اس چیز کی قسم جس کو لکھتے ہیں۔ اور یہ آپ کے سامنے کئی دفعہ واضح کیا گیا کہ قرآنِ کریم میں جو قسمیں کھائی جاتی ہیں وہ آنے والے مضمون کے لئے ایک شاہد ہوتی ہیں، بطور گواہ کے پیش کی جاتی ہیں، تو یہاں پھر معنیٰ یہ ہو جائے گا کہ قلم اور قلم کے ذریعے سے لکھی ہوئی تحریریں جو عالمِ غیب میں ہیں، اللہ کے ہاں محفوظ ہیں، وہ سب کی سب اس بات پہ شاہد ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے فضل سے دیوانے نہیں، جو تقدیر اللہ کی طرف سے لکھی جاچکی ہے اُس میں یہ حقیقت نمایاں ہے کہ آپ ﷺ دیوانے نہیں ہیں، اور وَمَا يَسْطُرُوْنَ کے اندر فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کی کتابیں بھی مراد ہو سکتی ہیں، تو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابیں لکھی گئیں لکھوائی گئیں فرشتوں کی وساطت سے، وہ سب اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ ﷺ دیوانے نہیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ پہلے سے چلا آتا ہے اور وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عقل مند ہوتے ہیں، اُسی سلسلے میں سے آپ ﷺ بھی ایک سنہری کڑی ہیں، آپ دیوانے کس طرح سے ہو سکتے ہیں؟ دیوانوں کے اعمال اور کردار کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہیں ہوتا، آپ ﷺ کے سامنے تو ایک بہت اچھا انجام آنے والا ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں، اور دیوانوں کا اخلاق اور کردار کوئی وزن نہیں رکھا کرتا، لیکن آپ ﷺ کا کردار تو بہت ہی عالی ہے، آپ تو خُلُقِ عظیم پہ ہیں۔ تو اللہ کی لکھی ہوئی تحریریں، فرشتوں کی لکھی ہوئی تحریریں، قلم کے ذریعے سے جو کچھ لکھا گیا آسمانی کتابوں میں اور لوحِ محفوظ میں، سب اس بات پہ گواہ ہیں کہ آپ ﷺ دیوانے نہیں ہیں، اور آپ کا انجام بڑا اچھا ہے اور آپ کا کردار بڑا عالی ہے، تو یہ جاہل یہ مشرک آپ کو کس طرح کہتے ہیں کہ آپ دیوانے ہیں، مر جائیں گے ختم ہو جائیں گے اور کوئی آپ کے سامنے اچھا انجام آنے والا نہیں؟ تو پھر اِس قسم کی مناسبت اگلے مضمون کے ساتھ یوں ہو جائے گی...... اور اگر ''قلم'' سے یہ عام قلم مراد لی جائے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اور مَا يَسْطُرُوْنَ سے انسانوں کا لکھنا مراد لیا جائے، تو پھر بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ قلم کے ذریعے سے جو تحریریں لکھی جارہی ہیں یہ گواہ ہیں اس بات کی کہ آپ ﷺ دیوانے نہیں، آپ تو خُلُقِ عظیم والے ہیں، بہت عالی کردار انسان ہیں، اور آپ کا انجام بڑا اچھا ہونا والا ہے، کیا مطلب؟ کہ جس طرح سے پچھلے انبیاء علیہم السلام کے تاریخی واقعات جو کتابوں کے اندر لکھے ہوئے ہیں وہ دلیل ہیں اس بات کی کہ انبیاء علیہم السلام عظیم رجال تھے، بہت عظمت والے تھے، اور ان کا انجام بڑا اچھا ہوا، وہ دیوانے نہیں تھے جس طرح سے قوم نے اُن کو دیوانہ کہا۔ پہلی لکھی ہوئی تحریریں، تحریری واقعات، کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ اس بات پہ شہادت دیتے ہیں۔ اسی طرح سے آنے والے مؤرخ جو کچھ لکھیں گے اور آنے والے لوگ جو کچھ تحریر کریں گے وہ سب تحریریں اس بات کے اوپر شاہد ہوں گی کہ آپ ﷺ دیوانے نہیں ہیں، اور آپ کا بڑا اچھا انجام ہوا، اور آپ بہت عالی کردار اور بہت ہی عالی اخلاق کے مالک انسان تھے، یہ لکھی جانے والی باتیں سب کی سب اس بات کے اوپر شہادت دیں گی...... دونوں اعتبار سے بات صحیح ہے، انبیاء علیہم السلام کے لکھے ہوئے تاریخی واقعات، انہوں نے ثابت کیا کہ انبیاء علیہم السلام اپنے وقت میں بہت عظیم تھے،

بہت اچھے کردار کے مالک تھے، اور وہ دیوانے نہیں تھے، جیسے قوم اُن کے اوپر تہمت لگاتی تھی، اسی طرح سے جو کچھ آپ کے متعلق لکھا جائے گا اُس سے بھی یہ بات ثابت ہوگی، آنے والی تاریخ واضح کردے گی کہ مشرکین کا یہ اعتراض غلط ہے، آپ ﷺ دیوانے نہیں ہیں، آپ کے لئے غیر منقطع اجر ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں، اور آپ بہت ہی عالی اخلاق کے مالک ہیں، پھر اس طرح سے بھی یہ شہادت ہو سکتی ہے۔

''خُلُقِ عظیم'' کا مصداق

باقی رہا کہ ''خُلُقِ عظیم'' کیا چیز ہے؟ سرورِ کائنات ﷺ کے اخلاق کے متعلق اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سعد بن ہشام نے پوچھا تھا: اَنْبِئِینِی عَنْ خُلُقِ رَسُولِ اللهِ ﷺ۔ رسول اللہ ﷺ کے خُلُق کے متعلق مجھے خبر دیجئے۔ تو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ''[1] رسول اللہ کا خُلُق قرآن تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ کے اخلاق کو سمجھنا ہو تو قرآنِ کریم کو پڑھ لیجئے، قرآنِ کریم جو مطالبہ کرتا ہے کہ انسان ان صفات پر ہونا چاہیے، کسی انسان میں یہ صفتیں ہونی چاہئیں اور یہ صفتیں نہیں ہونی چاہئیں، قرآنِ کریم سے جو ایک مقبول ترین انسان کا سراپا سمجھ میں آتا ہے، ایک معیار سمجھ میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ ویسے ہی ہیں، اگر حضور ﷺ کے ظاہر اور باطن کو سمجھنا ہو تو قرآنِ کریم پڑھ لیجئے، قرآنِ کریم سے حضور ﷺ کے اخلاق سمجھ میں آئیں گے، اور اگر قرآنِ کریم جو کہ ایک علمی کتاب ہے اس کی عملی تصویر دیکھنی ہو کہ قرآنِ کریم کس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے، اللہ قرآنِ کریم میں ہدایات دے کر اپنے بندوں کو کیسا دیکھنا چاہتا ہے تو حضور ﷺ کو دیکھ لو، تو گویا کہ آپ ﷺ قرآنِ کریم کی عملی تفسیر ہیں...... ویسے علماء کہا کرتے ہیں کہ ''خُلُقِ عظیم'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور بندوں کے حقوق بھی ادا کرے، کسی کے حق میں کوئی کمی نہ ہو، بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو عابد، زاہد بنا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور دُوسرے اہلِ حقوق کے حقوق کی پروا نہیں کرتا، بیوی کے حقوق کی پروا نہیں کرتا، والدین کے حقوق کی پروا نہیں کرتا، اپنی عبادت ریاضت میں لگا ہوا ہے، اولاد کی تربیت یا اولاد کے حقوق کی پروا نہیں ہے، اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان اپنے اہلِ تعلق کی وجہ سے اللہ کے اَحکام کی کی نافرمانی کر جاتا ہے، یہ دونوں باتیں ہی انسان کے اندر نقص کی ہیں، اور کامل انسان وہ ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوئی کسی قسم کی کمی واقع ہونے دے، اور نہ بندوں کے حق میں کسی قسم کی کمی واقع ہونے دے، اللہ تعالیٰ کا بھی وہ عبادت گزار بندہ ہو، ظاہر اور باطن سے اللہ سے ڈرنے والا ہو، اور مخلوقِ خدا پر بھی پوری شفقت رکھنے والا ہو، اور اہلِ قرابت اور اہلِ تعلق سب کے حقوق کامل طریقے سے ادا کرنے والا ہو، مخلوق پر اس کی رحمت اور شفقت کامل ہو، ایسے شخص کو کہیں گے کہ اس کا خُلُق عظیم ہے۔ تو آپ جانتے ہیں کہ اخلاق کا یہ معیار کسی دیوانے میں نہیں پایا جا سکتا، دیوانے کی تو کسی حرکت کا کوئی معنی ہی نہیں ہوتا، ساری حرکات بے معنی سی ہوتی ہیں، اس لیے جو بات

---

(۱) مسند احمد ۶/۹۱، رقم: ۲۴۶۰۱، ولفظه: اخبرینی عن...، الخ نیز دیکھیں: مسلم ۱/۲۵۶، باب صلاۃ اللیل/ مشکوۃ ۱/۱۱۱، باب الوتر. ولفظهما: اَنْبِئِینِی عَنْ خُلُقِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. قَالَتْ: اَلَسْتَ تَقْرَأُ الْقُرْآنَ؟ قُلْتُ: بَلٰی! قَالَتْ: فَاِنَّ خُلُقَ نَبِیِّ اللهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنَ۔

پہلے ذکر کی گئی کہ اپنے رب کے فضل سے تو دیوانہ نہیں ہے، تو یہ آپ کا خلق عظیم پر ہونا ایک مشاہداتی دلیل ہے، ہر کوئی شخص مشاہدہ کرسکتا ہے کہ دیوانے میں کیسی باتیں ہوا کرتی ہیں، اور آپ کس قسم کے کردار پر ہیں۔

حضور ﷺ کو "مجنون" کہنے والوں کے لئے تنبیہ

تو جو آپ ﷺ کے اِس کردار کی طرف دیکھتے ہوئے، آپ کے حالات کی طرف دیکھتے ہوئے آپ کو دیوانہ کہتے ہیں، اصل کے اعتبار سے اُنہی کی عقل ٹھکانے نہیں ہے، اس لیے آگے یہ تنبیہی الفاظ آ گئے فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ: یعنی یہ کشاکشی چلتی رہے گی، "عنقریب تُو بھی دیکھ لے گا اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے" باء زائدہ، أَيُّكُمُ الْمَفْتُونُ، مفتون بمعنی مجنون، یا تم میں سے کون فتنے میں ڈالا ہوا ہے، یہ لوگ آپ کو کہتے ہیں کہ آپ کسی جن، شیطان کے تصرف سے کسی فتنے میں واقع ہو گئے، اور اب پتا چل جائے گا کہ فتنے میں پڑے ہوئے یہ لوگ ہیں یا فتنے میں پڑے ہوئے آپ ہیں، أَيُّكُمُ کا خطاب سب کو ہو جائے گا، "تم میں سے کون دیوانہ ہے؟ تمہیں بھی پتا چل جائے گا اور انہیں بھی پتا چل جائے گا۔" اور اگر باء کو زائدہ قرار نہ دیا جائے تو مفتون سے جنون بھی مراد لیا جاسکتا ہے، مصدری معنیٰ، "تم میں سے کس کو جنون ہے۔" یا "تم دونوں فریقوں میں سے مجنون کس میں موجود ہے؟" حزبین مراد لے کر، "دونوں گروہوں میں سے مجنون کس میں موجود ہے تمہیں یہ بھی پتا چل جائے گا" اہلِ اسلام کی قیادت کسی مجنون کے ہاتھ میں ہے یا مشرکین کی قیادت کسی مجنون کے ہاتھ میں ہے، یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی، آنے والے حالات بہت جلد واضح کر دیں گے۔

دونوں فریق اللہ کے علم میں ہیں اور دونوں کا انجام جلد سامنے آئے گا

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ: بے شک تیرا رب خوب جاننے والا ہے اس شخص کو جو بھٹک گیا اس کے راستے سے، "اور وہ خوب جاننے والا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو" اللہ کا علم دونوں سے متعلق ہے، اس لیے انجام بھی جلدی واضح ہو جائے گا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک آدمی ہو تو بھٹکا ہوا، اور وہ ہمیشہ اسی طرح سے دندناتا پھرتا رہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اُوپر کوئی گرفت نہ ہو، اور نہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ایک شخص ہے مہتدی، ہدایت پہ چلنے والا، وہ ہمیشہ ماحول کے اندر مغلوب ہی رہے اور اس کی نصرت نہ ہو، ایسا نہیں، عنقریب حالات واضح ہو جائیں گے، جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا ہوا ہے وہ ذلیل اور خوار ہوگا، اور جو اللہ تعالیٰ کے راستے پہ چلنے والا ہے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت کے اندر اُس کو سرفرازی نصیب فرمائیں گے، اس کے ساتھ وہ نتیجہ واضح ہو جائے گا جس کو فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے، یہ حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے، کیونکہ جس وقت یہ سورت اُتر رہی تھی اس وقت بظاہر غلبہ مشرکین کا تھا جو کہ اللہ کے راستے سے بھٹکے ہوئے تھے، اور جو کلمہ گو تھے سرورِ کائنات ﷺ کا ساتھ دینے والے وہ بظاہر پست تھے، لیکن اللہ سب کو جانتا ہے، ایسا نہیں ہوگا کہ جو ذلت کا مستحق ہے اس کو ہمیشہ عزت دیے رہیں، اور وہ ہمیشہ دُنیا کے اندر غلبہ پائے رکھے اور دندناتا رہے، اور جو حقیقت کے اعتبار سے اللہ کے فرماں بردار اور عزت کے مستحق ہیں وہ اسی طرح سے ماحول کے اندر دبے رہیں، ایسا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کا علم دونوں سے متعلق ہے، اور دونوں کا انجام بہت جلدی سامنے آ جائے گا۔

"مکذبین" کی باتوں میں آ کر آپ ﷺ مداہنت اختیار نہ کریں

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِیْنَ: تو اطاعت نہ کر مکذبین کی، جھٹلانے والوں کی، یہ خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو بھی ہوسکتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ مکذبین کا گروہ جو اللہ کی باتیں نہیں مان رہا، مشرکینِ مکہ، خصوصیت سے ان کے رُؤساء، اُن کے قائدین، یہ آئے دِن آپ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان بتوں کی مذمت چھوڑ دیجئے، توحید کا تذکرہ چھوڑ دیجئے، آپ اُن کی بات بالکل نہ مانیے، آپ اپنا کام کرتے رہیں، فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِیْنَ: مکذبین کی آپ اطاعت نہ کیجئے، ان کا کہنا نہ مانیے، یہ تو آپ سے "کچھ لو کچھ دو" پر معاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ بھی کچھ نرم ہوجائیں کہ اِن کے آلہہ باطلہ کی مذمت چھوڑ دیں، ان کے گزرے ہوئے آباء، باپ دادا جو گمراہ تھے ان کی مذمت ترک کردیں، تو یہ بھی آپ کی مخالفت ترک کردیں گے، یہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ نرم ہوجائیں، اور آپ نرم ہوجائیں تو وہ بھی نرم ہوجائیں گے، ان کی بات بالکل نہ مانیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیز آپ کی طرف اُتاری جارہی ہے آپ علی الاعلان اس کو کہتے رہیے، ان کی پرواہ نہ کیجئے، آگے جس طرح لفظ آ گئے کہ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ: وہ چاہتے ہیں، لَوْ تُدْهِنُ: اگر آپ نرم ہوجائیں تو وہ بھی نرم ہوجائیں گے، اَدْهَنَ یہ اِدهان سے ہے، اور ادھان کا لفظ دُھن سے لیا گیا ہے، دُھن تیل کو کہتے ہیں، کسی چیز کو تیل لگایا جائے تو وہ نرم ہوجاتی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے مسلک کو ذرا نرم کردیجئے، ان کے حالات، ان کے عقائد اور خیالات سے کچھ درگزر کیجئے، ان کے آلہہ باطلہ کی تردید نہ کیجئے، ان کے آباء مشرکین جو مر گئے ان کا برا انجام ذکر نہ کیجئے، تو یہ بھی نرم ہوجائیں گے، وہ تو چاہتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں آپس میں معاہدہ کرلینا، کہ کچھ لو کچھ دو، کچھ آپ ڈھیلے ہوجائیں کچھ ہم ڈھیلے ہوجائیں گے، وہ تو یوں چاہتے ہیں، تو بظاہر تو یہ خطاب حضور ﷺ کو ہے لیکن اس میں عناناً ہر کسی کو مراد ہے، جو بھی اہلِ توحید ہیں ان کو چاہیے کہ مکذبین کی بات نہ مانیں اور مکذبین کا لحاظ کرتے ہوئے مسئلے کے اندر مداہنت نہ کریں۔

"مداہنت" اور "مصلحت" میں فرق

مداہنت کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ مسئلے کا اِخفاء کرلیا، پوری طرح سے حق واضح نہ کیا، صرف اس خیال سے کہ کوئی ناراض نہ ہوجائے اور ان کے ناراض ہونے کے ساتھ ہمارے کسی مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے، اس کو "مداہنت" کہتے ہیں جو شریعت میں حرام ہے۔ اور ایک ہے حکمت یا مدارات، کہ سمجھانے میں انسان کوئی ترتیب قائم کرلے کہ اگر میں نے ابھی اس کو اس انداز سے بات کہی تو یہ مانے گا نہیں، میں اس کو ذرا نرمی کے ساتھ پہلے مانوس کرلوں پھر بات اس کو سمجھاؤں گا، اس قسم کی حکمت کا تقاضا اگر ہو تو اس میں ترتیب قائم کی جاسکتی ہے، لیکن کسی کا لحاظ کرتے ہوئے مسئلے کی غلط بیانی کرنا، کسی کی غلط بات کو صحیح کہہ دینا اور اس کی غلط باتوں سے چشم پوشی کرجانا اس خیال سے کہ کہیں یہ ناراض نہ ہوجائے اور اس کے ناراض ہونے کے ساتھ ہمیں کوئی دُنیا میں تکلیف نہ پہنچ جائے یا ہمارے کسی مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے، یہ "مداہنت" ہے اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔ "مکذبین کی اطاعت نہ کیجئے، وہ تو چاہتے ہیں کہ اگر تو نرم ہوجائے تو وہ بھی نرم ہوجائیں گے۔"

مشرکین کے قائدین کا تعارف اور ان کی صفات

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ: اب یہ خصوصیت کے ساتھ مشرکین کے قائدین کا تعارف ہے، یہ دو گروہ جو بن گئے تھے حضور ﷺ کی تبلیغ کے بعد، ایک اہلِ اسلام کا اور ایک اہلِ شرک کا، تو اہلِ اسلام کی قیادت تو اس شخصیت کے ہاتھ میں تھی جس کی تعریف پہلے آگئی کہ وہ مجنون نہیں، کامل ترین انسان ہیں، اعلیٰ کردار کے انسان ہیں، اور دوسری طرف کی قیادت کا یہ حال ہے جس کا ذکر کیا جارہا ہے، اُن کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، تو ہر شخص کو مقابلہ کر لینا چاہیے کہ کون سا قائد اس قابل ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور کون سا قائد اس قابل ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ مشرکین کی قیادت کرنے والے اِن صفات کے مالک تھے لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ: حلّاف کہتے ہیں بہت قسمیں کھانے والا، اور یہ بہت قسمیں کھانے والا اکثر جھوٹا ہوتا ہے، اور احساس کہتری میں مبتلا ہوتا ہے، اس کا دل یہ کہتا ہے کہ جس وقت تک میں قسم کھا کر اپنی کلام کو مؤکد نہیں کروں گا میری بات کوئی مانے گا نہیں، اس باطنی کمزوری کی بنا پر وہ بات بات پہ قسم کھاتا ہے، جس آدمی میں کردار کی مضبوطی ہوتی ہے وہ اپنی بات میں خود وزن محسوس کرتا ہے، وہ جب بات کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے قسم کھانے کی، دوسرا مانتا ہے مانے، نہیں مانتا نہ سہی، اور جو جھوٹے آدمی ہوا کرتے ہیں، جنہوں نے اپنا کوئی عیب چھپانا ہوتا ہے، وہ اپنی ایک ایک بات پہ بار بار قسم کھائیں گے، تو حلّاف سے ایسے ہی کمزور کردار کا آدمی مراد ہے جس کی بات میں کوئی وزن نہیں، اس کی بات واقعات کے مطابق نہیں، لوگوں کو یقین دلانے کے لئے قسمیں بہت کھاتا ہے، جیسے مشرکینِ مکہ لوگوں کو قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے یہ دیوانہ ہے، یہ کاہن ہے، یہ شاعر ہے، لیکن اِس کو ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس دلیل کوئی نہیں تھی...... مَّهِيْنٍ: حلّاف کے ساتھ مھین یہ واقع کا بیان ہے، مھین کہتے ہیں بے قدرا، جس کی قدر کوئی نہیں، ذلیل آدمی، عزت کوئی نہیں، اگر کوئی باعزت ہو باوقار ہو تو اس کو اپنی باتوں پر قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی...... اور هَمَّازٍ: یہ هَمز سے لیا گیا ہے، اشارہ کرنا، طعنہ دینا، پھبتی کسنا اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ھمّاز کا معنیٰ ہو گا طعنہ دینے والا، یعنی جو ایسا بد اخلاق ہے کہ دوسروں کو طعنے دیتا ہے، دوسروں پہ پھبتیاں کستا ہے، اور اشارے اشارے کے ساتھ مذاق اُڑاتا ہے، یہ بھی اس وقت مشرکین کے قائدین کا حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے، پھبتیاں کستے، مذاق اُڑاتے، یعنی دلیل کے ساتھ جب کسی کے دعوے کو رَدّ نہ کیا جا سکے تو عموماً باطل پرستوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تم ان کا مذاق اُڑاؤ اور ماحول کے اندر ان کو گرانے کی کوشش کرو، لوگوں کی نظروں میں ذلیل کرنے کی کوشش کرو، یہ بھی بے دلیل لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے جو اپنے دعوے کے اُوپر دلیل قائم نہ کر سکیں وہ پھبتیاں اُڑا کر اور مذاق اُڑا کر دُوسرے کو گرانا چاہتے ہیں، تو ھمّاز سے مراد یہی ہے طعنہ زن، پھبتیاں کسنے والا، اشارہ باز...... مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ: مشّاء یہ مبالغے کا صیغہ ہے، نمیم کہتے ہیں چغلی کو، "جو بہت چلنے پھرنے والا ہے چغلی کے ساتھ" یعنی آپس میں پھوٹ ڈالنے کے لئے لگائی بجھائی بہت کرتا ہے، اِدھر کی بات اُدھر پہنچا، اُدھر کی بات اِدھر پہنچا، اور یہ بھی انہی مشرکین کا کردار تھا، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے اور لوگوں کو مسلمانوں سے متنفر کرنے کے لئے لگائی بجھائی کرتے ہی رہتے تھے، "چغلی کے ساتھ بہت پھرنے والا ہے"...... مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ: بھلائی سے بہت روکنے والا ہے، مُعْتَدٍ: اِعتدا،

سے ہے، حد سے گزرنے والا ہے یعنی لوگوں کے حقوق تلف کرتا ہے، لوگوں پر ظلم کرتا ہے، اَثِیْم: اپنی ذات میں گنہگار ہے، یعنی اپنے ذاتی افعال کے اندر بھی وہ گنہگار ہے اور لوگوں کے حقوق بھی تلف کرتا ہے۔ عُتُلٍّ: سخت مزاج، سخت دل، سخت طبیعت، عُتل کا معنی یہی ہوتا ہے، سخت مزاج، سخت دل، جیسے فظ غلیظ کا لفظ آیا کرتا ہے، جس کی طبیعت میں کوئی کسی قسم کا رحم وکرم نہیں، بہت سنگ دل ہے...... بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ: اس مذکور کے بعد وہ زنیم بھی ہے، زنیم کا لفظ زَنَمَةُ الشَّاة سے لیا گیا ہے، زَنَمَة کا لفظ بولا جاتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا بعض بعض بکریوں کے گلے میں کچھ یہاں غدودیں لٹک پڑتی ہیں اس طرح سے، یہ آپ نے دیکھا ہوگا کبھی کبھی بکری کے گلے میں یوں غدود لٹکی ہوئی ہوتی ہے، اس کو کہتے ہیں اصل میں زَنَمَةُ الشَّاة۔ اور وہ ایک بے کار چیز ہے، عیب ہے، کوئی خوبی نہیں ہے، اور ایک زائد عضو ہے جو کسی کام کا نہیں، اور یہ نقص کی بات ہے، تو اسی طرح سے زنیم کہتے ہیں ایسے شخص کو جو کسی قوم میں زبردستی شامل ہو گیا ہو اور اُس قوم میں سے نہ ہو، جس کو آپ ملحق کہہ سکتے ہیں، تو اسی طرح سے قریش میں سے بعض قریش ایسے تھے جو اس بارے میں متہم تھے کہ یہ حقیقت کے اعتبار سے قریشی نہیں، زبردستی قریشی بنے ہوئے ہیں، اور اپنی قوم اور نسل کو تبدیل کرنا یا زبردستی کسی قوم کے اندر گھسنا آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی تو ذلت کی بات ہے، جو شخص احساسِ کہتری میں مبتلا ہوا کرتا ہے وہ اپنی مصنوعی عزت کے لئے اپنے آپ کو دُوسری قوم میں ظاہر کیا کرتا ہے، اور اگر کسی شخص میں کوئی کمال ہے، اللہ نے اس کو ذاتی کمال دیا ہے، وہ علم یا عمل کے زیور سے آراستہ ہے، وہ باوقار ہے، تو کسی قوم کا ہو اس کو کیا؟ اس نے ماحول کے اندر وزن اپنے کردار سے پیدا کرنا ہے نہ کہ قوم کی نسبت سے، اور جو اپنی نظر میں اپنے آپ کو ذلیل سمجھتے ہیں کہ ہم نے اگر اپنی اصل قومیت نمایاں کردی تو لوگ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھیں گے، اپنے اندر تو کوئی وزن ہے نہیں، کوئی علم وعمل کی خوبی تو ہے نہیں جس کے ساتھ عزت کروالیں، اس لئے وہ اپنے آپ پر اچھی قوم کا لیبل لگاتے ہیں اور دُوسری قوم میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسوں کو کہا جاتا ہے زنیم، یعنی کسی قوم کے اندر اِن کی پوزیشن وہی ہے جیسے بکری کے گلے میں اُس بڑھی ہوئی غدود کی جو ایک بے کار اور عیب کی بات ہے، کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔ تو بعض مشرکین کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایسے ہی تھے، باپ کے نہیں تھے، ان کی ماؤں کے ساتھ کسی نے بدکاری کی جس کے نتیجے میں پیدا ہوئے، اور آپ جانتے ہیں کہ بیٹے کی نسبت تو باپ کی طرف ہوتی ہے، تو تھے وہ غیر قوم کے، اور مصنوعی طور پر اُس قوم میں شامل ہو گئے، اس قسم کے لوگ عموماً بداخلاق ہوتے ہیں، اس لیے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ حرام زادہ کے ساتھ کیا ہے، زنیم کہتے ہیں حرام زادہ کو، ولد الحرام کو، اور ولد الحرام جو ہوتا ہے اس کے اخلاق ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

فیصلہ خود کرلو کہ مجنوں کون ہے؟

تو یہ نقشہ کھینچا ہے مشرکین کی قیادت کا، کہ جو لوگوں کو اپنی اتباع کی طرف بُلاتے ہیں ان کی پوزیشن یہ ہے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار اور ان کا اخلاق اور ان کا معیار یہ ہے، اب آنکھیں کھول کے دیکھ لو کہ دونوں گروہوں میں سے کون سے گروہ کے اندر دیوانے موجود ہیں، کیونکہ عقل کا تقاضا یہ ہوا کرتا ہے کہ نفع نقصان کو پہچانے، نفع کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اور

نقصان سے بچے، اور جو شخص اپنا انجام نہیں سوچتا، بربادی اور تباہی کے راستے پر چل رہا ہے، اپنے آپ کو کتنا ہی عقل مند کیوں نہ کہہ لے، حقیقت کے اعتبار سے وہ دیوانہ ہے، اور جو شخص انجام کو سوچتا ہے اور انجام کو سوچ کر اچھا کردار اختیار کرتا ہے برے کردار سے بچتا ہے تو حقیقت کے اعتبار سے وہ عقل مند ہے۔

"کہنا نہ مانیے ہر ایسے شخص کا جو کہ بہت قسمیں کھانے والا ہے، ذلیل ہے، طعنہ زن ہے، طعنے مارنے والا ہے، پھبتیاں کسنے والا ہے، چغلی کے ساتھ پھرنے والا ہے" نمیمہ کہتے ہیں چغلی کو، جیسے میں نے عرض کر دیا، یہ لڑانے کے لئے جو بات ایک طرف سے دُوسری طرف نقل کی جاتی ہے اسے نمیمہ کہتے ہیں، لگائی بجھائی جس طرح سے ہماری زبان میں بولا جاتا ہے، "بہت لگائی بجھائی کرنے والا ہے، نمیمہ کے ساتھ پھرنے والا ہے، بھلائی سے روکنے والا ہے" مُعْتَدٍ: ظالم ہے، لوگوں کے حقوق پر تعدی کرنے والا ہے، اَثِیْمٍ: گنہگار ہے، عُتُلٍّ: سخت مزاج، جس کے دل میں کوئی رحم و کرم نہیں، سخت مزاج سخت طبیعت، "اور ان سب کے بعد زنیمہ" قوم میں بلاوجہ داخل ہونے والا، قوم کے اندر ایک زائد عضو کی طرح داخل ہونے والا، بداخلاق کے ساتھ اس کا ترجمہ کیجئے تو بھی اس کا مفہوم صحیح ہے، "اس کے بعد بداخلاق"، یا ولد الحرام کے ساتھ ترجمہ کر دیجئے تو بھی مفہوم صحیح ہے، کہ "ولد الحرام" بول کر بسا اوقات "بداخلاق" ہی مراد لیا جاتا ہے، یہ گالی دیتے ہوئے جس وقت کسی کو کہا جاتا ہے حرام زادہ، تو اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ کہنے والا اس کو کہتا ہے کہ واقعی تو باپ کا نہیں، بلکہ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جیسے حرام زادوں کے اخلاق ہوتے ہیں تیرے اخلاق ویسے ہی ہیں، تو بدنام، بداخلاق، ولد الحرام، یہ مفہوم ہے زنیمہ کا، اور اس کی لفظی تحقیق یہی ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی، کہ یہ لفظ زَنَمہ سے لیا گیا ہے، اور زَنَمہ اُس غدود کو کہتے ہیں جو بکری کے گلے کے نیچے لٹکا کرتی ہے، اور یہ عیب ہے، کوئی خوبی نہیں، اور وہ ایک عضوِ زائد ہوا کرتا ہے، جس کے ساتھ کوئی فائدہ متعلق نہیں ہے۔

کیا بدکردار کے مال اور خاندان کی وجہ سے اس کا کہنا مان لیا جائے؟

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ: اس وجہ سے کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے، اس کا تعلق دو طرف لگ سکتا ہے، اگر تو اس کو ماقبل کے ساتھ لگائیں، تو پھر اس کا مطلب ہوگا لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ...... اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ، ایسے شخص کی اِقتدا نہ کیجئے جس کے اندر یہ خرابیاں ہیں، جس کا کردار اور اخلاق یہ ہے، جس کا سراپا یہ ہے جو اِن الفاظ میں بیان کر دیا گیا، "اطاعت نہ کیجئے اس وجہ سے کہ وہ مال دار ہے اور بیٹوں والا ہے" یعنی کوئی اخلاق کی خوبی تو اس میں ہے نہیں، کردار کی خوبی تو نہیں ہے، پرلے درجے کا بداخلاق بدکردار، اس کا ظاہر اور باطن تباہ ہے، معتدل مزاج نہیں بلکہ معتدی ہے ظالم ہے، نیک نہیں بلکہ اثیمہ ہے، گنہگار ہے، رحم و شفقت اس کے قلب میں نہیں بلکہ عتل ہے، اور کوئی خاندانی شرف نہیں رکھتا، بلکہ زنیمہ ہے، تو اس کا کہنا صرف اس وجہ سے مانا جائے کہ یہ مال دار ہے اور یہ بیٹوں والا ہے، یہ کون سی عقل مندی ہے؟ آج کل ہمارے معاشرے میں یہ بات بھی ہے کہ جس کو دیکھتے ہیں کہ یہ زمین دار ہے، سرمایہ دار ہے، اس کو کہتے ہیں یہ بڑا آدمی ہے، ذاتی کردار میں وہ کتنا ہی زانی، بدکردار، شرابی اور رسہ گیر ہی کیوں نہ ہو، لیکن

اس کے مال اور اس کے خاندان سے مرعوب ہو کر لوگ اس کا کہنا مانتے ہیں، اور یہ ماحول کے اندر مستقل فساد کا باعث ہے، کہ جب اس قسم کے بدکردار لوگوں کا لوگ کہنا مانیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے اور ان کو سرداری حاصل ہوگی تو آپ جانتے ہیں کہ پھر دُنیا میں فساد ہی پھیلے گا، اِس وجہ سے کسی کا کہنا ماننا کہ یہ مال دار ہے یا یہ اچھے خاندان والا ہے یہ کوئی عقل مندی نہیں، اس وجہ سے کہنا نہ مانو جب خود ذاتی حیثیت اُن کی یہ ہے کہ ایسے بدکردار ہیں تو اُن کے مال اور ان کے خاندان سے متاثر ہو کر ان کی بات کا ماننا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ تو اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ کا تعلق ماقبل کے ساتھ تو یوں نمایاں ہو جائے گا، کہ کسی کے مال اور بیٹوں سے متاثر ہو کر، ان کے خاندان سے متاثر ہو کر ان کی قیادت قبول نہ کیجیے، اطاعت نہ کیجیے، اور یہ مشرکین کے قائد ایسے ہی تھے، مال کے زور سے اور اپنے خاندان کے زور سے لوگوں پر مسلط رہنا چاہتے تھے اور اسی لحاظ سے لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، ورنہ ذاتی کردار تو اُن کا یہ ہے جس کا نقشہ اُوپر کھینچا گیا۔

''اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ'' کا دُوسرا مفہوم

اور اگر اس کو مابعد کے ساتھ لگائیں گے تو بھی بات صاف ہے، مابعد کی آیت ہے اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ، جب اس کے اُوپر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو پہلوں کی قصے کہانیاں ہیں جو چلے آرہے ہیں، ان میں کوئی کام کی بات تو ہے نہیں، جس طرح سے لوگ قصے سنایا کرتے ہیں یہ تو قصے ہیں، اساطیر یہ اُسطورۃ کی جمع ہے، اُسطورہ کہتے ہیں اس حکایت کو جو نقل ہوتی چلی آرہی ہو، ''یہ پہلے لوگوں کی حکایات ہیں جو نقل ہوتی چلی آرہی ہیں'' یعنی اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہ ہم کہیں یہ اللہ نے اُتاری ہے یا اس کے اندر کوئی معنویت موجود ہے، یہ ایسے ہی قصے کہانیاں ہیں، جس طرح سے لوگ ''رستم'' اور ''اسفندیار'' اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کے واقعات نقل کرتے ہیں تو اسی طرح سے یہ عاد و ثمود کے قصے سنا رہے ہیں۔ یوں کہہ دیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کے متعلق، جب ہماری آیات اس کے اُوپر پڑھی جاتی ہیں تو یوں کہہ کر ان کو ٹھکراتا ہے اور ان کی تحقیر کرتا ہے۔ اور یہ اس کا کہنا کسی دلیل کی بنا پر نہیں ہے، کوئی غور و تدبر کا نتیجہ نہیں، بلکہ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ مال دار ہے اور بیٹوں والا ہے، یعنی اپنے خاندان کے اُوپر غرور کرتا ہوا اور اپنے مال کی وجہ سے اور سرمایہ داری کے اُوپر ناز کرتا ہوا ہماری باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا، بلکہ یوں بک دیتا ہے کہ یہ تو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ہیں، اور اس کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کو مال اور بیٹے دے رکھے ہیں، یعنی یہ سرمایہ داری کا غرور ہے جس کی بنا پر ہماری باتوں کی طرف یہ متوجہ نہیں ہوتا اور یوں کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا واقعہ جو آپ کے سامنے گزرا، تو وہاں بھی تو یہی بات تھی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (سورۂ بقرہ: ۲۵۸) جس نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اس کے ربّ کے بارے میں جھگڑا کیا، جھگڑا کرنے کی وجہ کیا تھی؟ کہ ہم نے اس کو سلطنت دے رکھی تھی، صاحبِ سلطنت تھا اس لیے وہ اس طرح سے جھگڑنے لگ گیا۔ تو ہماری آیات کو یہ جو جھٹلاتا ہے تو اس جھٹلانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اللہ نے مال اور اولاد دے رکھی ہے، جیسے نمرود کو سلطنت دے

رکھی تھی تو اس سلطنت کے غرور میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ٹکرایا اور ابراہیم کے رب کے بارے میں اُس نے جھگڑا کیا، اسی طرح سے یہ بھی اِس وجہ سے کہتے ہیں کہ اَنْ کَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیْنَ، یعنی کسی دلیل کی بنا پر نہیں، کسی تدبر کی بنا پر وہ یہ بات نہیں کہتے، بس ایک مال اور اولاد کا غرور ہے جس کی بنا پر وہ ہماری باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ہماری باتوں کو یوں کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔

مشرکین کے قائدین کے لئے وعید

سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ: نَسِمُ وَسَمَ یَسِمُ سے ہے، وَسم کہتے ہیں داغ دینے کو، حدیث شریف میں یہ لفظ آتا ہے جانوروں کے داغ دینے کے معنی میں۔[1] سَنَسِمُهٗ: عنقریب ہم اس کو داغ لگائیں گے عَلَی الْخُرْطُوْمِ: خرطوم اصل میں کہتے ہیں ہاتھی کی ناک کو، یہ ہاتھی کی جو سونڈ ہے، اور یا یہ لفظ بولا جاتا ہے خنزیر کی ناک کے لئے، دونوں کے لئے یہ لفظ بولتے ہیں، انسان کی ناک کے لئے عموماً خرطوم کا لفظ نہیں بولا جاتا، انسان کی ناک کو اَنف کہتے ہیں، اس کے لئے خرطوم کا لفظ نہیں بولا جاتا، خرطوم بولتے ہیں ہاتھی کی سونڈ کو، یا دُوسرا معنی اس کا لکھا ہے کہ خنزیر کی ناک کو کہتے ہیں، اب یہ تحقیر ہے ان لوگوں کی جن کی صفات اُوپر ذکر کی گئیں، کہ بات اصل میں کوئی نہیں، ان لوگوں نے اسے اپنی ناک کا مسئلہ بنالیا ہے، اور یہ ناک کا محاورہ بہت پُرانا ہے، اُونچی ناک والا ہے، یہ متکبر ہے، یہ کسی کی بات مان لینے کو سمجھتا ہے کہ میری ناک نیچی ہوجائے گی، اس کی ناک بہت اُونچی ہے، بڑا متکبر ہے، کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، تو اُونچی ناک، یہ محاورہ پہلے سے چلا آرہا ہے، اور مشرکین نے بھی اس کو اپنی ناک کا ہی مسئلہ بنالیا تھا، وہ کہتے تھے کہ اگر ہم اس کی بات مانیں گے تو ہماری عزت نہیں رہتی، ہماری قیادت اور سیادت جاتی ہے، بات کتنی ہی واضح کردی گئی، دلائل کے ساتھ مدلل کردی گئی، اور ان کے پاس کوئی کسی قسم کا جواب نہیں، لیکن ان کی اُونچی ناک اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان کی ناک پر ذِلّت کا نشان لگائیں گے، جیسا کہ کسی کو ذلیل ظاہر کرنے کے لئے ہمارے ہاں بھی یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ فلاں کی ناک کاٹ دی گئی، فلاں کی ناک کٹ گئی، ناک کا کٹنا ذِلّت کی طرف اشارہ ہوا کرتا ہے، ناک کاٹ دینا ذلیل کرنے سے کنایہ ہوتا ہے، تو اسی طرح یہاں ہے کہ اِن لوگوں نے اپنی جو ناکیں اتنی اُونچی کرلی ہیں کہ وہ انسان کی ناک نہیں رہی بلکہ ہاتھیوں کی سونڈ بن گئی، اتنی لمبی ناک کرلی انہوں نے اپنی، یعنی وہمی طور پر، تو ان کی سونڈ کے اُوپر ہم ذِلّت کا نشان لگائیں گے، یہ ویسے ہی ہے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، یہ اُونچی ناک ہم کاٹ دیں گے، اس طرح سے ان کی ناک اُونچی رہے گی نہیں جس طرح سے یہ ناک کو اُونچا کیے بیٹھے ہیں، اور یہ ناک اُنہوں نے اتنی اُونچی کرلی تھی گویا کہ بڑھا بڑھا کر سونڈ بنالیا، یہ اُن کے اسی تکبر کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ جنہوں نے اپنی ناکیں اتنی اُونچی کرلیں کہ وہ سونڈ بن گئی، ناک نہیں رہی، ہم اس کے اُوپر ذِلّت کا نشان لگائیں گے، یہ ناک رہے گی نہیں، کٹ جائے گی، سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ کا یہ مفہوم ہوگیا ''عنقریب ہم ان کے ناک پر نشان لگائیں گے''، اور اُن کے ناک کو خرطوم کے لفظ کے ساتھ جو تعبیر کیا ہے یہ ان کی تحقیر ہے۔

(۱) بخاری ۱؍۲۰۴ باب فی وسم الامام ابل الصدقة۔ مشکوٰۃ ۲؍۳۵۸، کتاب الصید، فصل اوّل۔ وغیرہ۔

ایک باغ والوں کا عبرت ناک واقعہ اور اس کے ذکر کرنے سے مقصد

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ: بیشک ہم نے اِن کو آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح سے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا، یہ ایک مثال کے ذریعے سے مشرکینِ مکہ کو متوجہ کیا جارہا ہے کہ تمہیں اگر مال و دولت سے اللہ نے نوازا ہے، تمہیں اگر اولاد سے اللہ نے نوازا ہے، تو یہ ایک امتحان ہے، اور اس کو امتحان ہی سمجھو اور اس میں کامیاب ہونے کی کوشش کرو کہ اللہ کی شکر گزاری کرو، اور اگر تم اس میں کامیاب نہیں ہوگے اور امتحان میں آزمائش میں فیل ہوجاؤ گے تو تمہارا حال وہی ہوگا جو ایک باغ والوں کا ہوا تھا، آگے ان باغ والوں کی تمثیل ہے۔ یہ باغ کہاں تھا؟ اور یہ کون لوگ تھے؟ ممکن ہے کہ اُس وقت مکہ کے اندر کوئی اس قسم کی شہرت ہو کسی واقعے کی جس کی طرف اُن کو متوجہ کیا گیا ہے، یا یہ محض ایک تمثیل ہے، مفسرین نے مختلف قول نقل کیے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ ایسا واقعہ یمن میں پیش آیا تھا، کوئی کہتا ہے کہ حبشہ میں پیش آیا تھا، بہرحال ہمیں اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، جو مقصد ہے وہ بہرحال اس مثال سے حاصل ہے، حاصل اس کا یہی ہے کہ کوئی باغ والے تھے، اللہ نے ان کو بڑا سرسبز و شاداب باغ دے رکھا تھا، جس میں کھیتی بھی تھی، لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اختیار کی، مساکین کا خیال نہ کیا، اللہ کا حق اُس میں سے ادا نہیں کیا، تو اللہ نے باغ تباہ کردیا، تباہ ہونے کے بعد پھر ان کو ہوش آئی، لیکن بعد میں ہوش آنے سے کیا ہوتا ہے؟ جس کو کہتے ہیں کہ ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' تو بہتر یہ ہوتا ہے کہ انسان وقت پر سمجھنے کی کوشش کرے۔ یاد ہوگا، سورۂ کہف میں بھی اسی طرح سے دو آدمیوں کی مثال جو آئی تھی تو ان میں بھی ایک باغ والا تھا، اس میں بھی اسی طرح سے ایک مضمون سمجھایا گیا تھا۔ ''ہم نے آزمایا اِن کو جس طرح سے کہ آزمایا ہم نے باغ والوں کو'' اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ: جب انہوں نے قسمیں کھائیں کہ البتہ ضرور کاٹیں گے وہ اس باغ کو صبح کے وقت، یعنی پھل کامل ہوگیا تھا، اور وہ کہتے تھے کہ صبح جائیں گے، کاٹ کر لے آئیں گے، اور کسی مسکین کو اِس میں سے ایک دانہ نہیں دیں گے، اس طرح سے انہوں نے قسمیں کھالیں، ''جبکہ قسم کھائی انہوں نے کہ ضرور کاٹیں گے اُس باغ کو صبح کے وقت۔''

''وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ'' کے دو مفہوم

وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ: اس کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے کیا ہے کہ انہوں نے ''ان شاء اللہ'' بھی نہ کہا، استثناء فی الیمین عموماً ''ان شاء اللہ'' کے لئے بولا جاتا ہے، اپنی قسموں میں کوئی اِستثناء نہیں کیا، یعنی اللہ کی مشیت کے ساتھ اس کو متعلق نہیں کیا کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم ان پھلوں کو توڑلیں گے، بلکہ بِلا اِستثناء انہوں نے کہا کہ ہم ضرور توڑیں گے۔ اور لفظی معنی کے طور پر اس مفہوم کی بھی گنجائش ہے جس طرح سے بعض مترجمین نے اِدھر اشارہ کیا کہ لَا يَسْتَثْنُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ اُس باغ میں سے اُس وقت کے عرف کے مطابق کوئی حصہ وہ مساکین کے لئے مستثنیٰ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے ہم سارا ہی توڑلیں گے، کسی حصے کو مستثنیٰ نہیں کرتے تھے، عموماً شرفاء کے اندر یہ ایک عُرف رہا ہے، ہمارے ہاں بھی کسی کسی جگہ دیکھنے میں یہ بات آئی ہے کہ لوگ جس وقت کھیت کاٹتے ہیں تو اس کا کچھ حصہ تھوڑا سا چھوڑ دیا کرتے ہیں کہ مساکین توڑ کر لے جائیں گے، کاٹ کر لے جائیں گے، اپنے کام میں لے

آئیں گے، اسی طرح سے باغوں میں رواج تھا کہ جب پھل توڑتے تو پھل توڑنے کے بعد کچھ تھوڑا سا پھل چھوڑ دیتے کہ مساکین آجائیں گے، ان کے بچے آئیں گے، آکر توڑ کے کھائیں گے، یہ ان کا حصہ ہے، تو گویا یہ بھی صدقہ وخیرات کی ایک صورت ہوتی ہے، کھیتی کاٹتے وقت بھی لوگ تھوڑے بہت اسی طرح سے حصے چھوڑ دیتے ہیں مساکین کے لئے، تو وہ اس طرح سے استثناء نہیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے ہم تو سارا ہی کاٹ لیں گے، استثناء نہیں کرتے تھے۔ دونوں ہی مفہوم اس کے ہوسکتے ہیں۔

باغ راتوں رات تباہ ہوگیا

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ: گھوم گیا اس باغ پر کوئی گھومنے والا تیرے رَبّ کی جانب سے وَهُمْ نَآئِمُوْنَ: اور وہ سوئے ہوئے تھے، سوئے ہوئے تھے رات کو کوئی گھومنے والا گھوم گیا، اس سے مراد ہے اللہ کا عذاب، لُو کی شکل میں آگیا، آگ کی شکل میں آگیا، جس نے راتوں رات سارے باغ کو اُجاڑ کے رکھ دیا، اور یہ آپ کے سامنے ہے، آج کل تو یہ واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں کہ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، تھوڑے سے وقت میں فٹافٹ ژالہ باری ہوتی ہے اور سب ریزہ ریزہ ہو کے رہ جاتی ہیں، جو لوگ اس غرور میں تھے کہ فصل اچھی ہے، کاٹیں گے اور منوں کے حساب سے ہمارے ہاں غلہ آئے گا، سیروں کو ترس گئے، فصلیں اس طرح سے تباہ ہوگئیں، جانوروں کے لئے بھوسا تک نہیں بچا، تو لہلہاتی کھیتیوں کو اُجاڑ دینا، یا لدے پھندے باغوں کو اُجاڑ دینا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کیا چیز ہے؟ ایک ہی تو جھونکا آتا ہے سب کچھ تباہ کر کے رکھ جاتا ہے! یہی حال اُن کا ہوا، ''گھوم گیا اُس باغ کے اُوپر گھومنے والا تیرے رَبّ کی طرف سے، اس حال میں کہ وہ سوئے ہوئے تھے'' فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ: پس ہوگیا وہ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح، جیسے کسی چیز کو کاٹ کے پھینک دیا جائے، صریم مصرُوم کے معنی میں، ''وہ کٹے ہوئے کھیت کی طرح ہوگیا''

بخل کے جذبے سے باغ والوں کی صبح صبح خفیہ روانگی

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ: انہوں نے آپس میں ایک دُوسرے کو آوازیں دی صبح کے وقت، جیسے کام کو چلتے وقت آوازیں دیا کرتے ہیں، اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ: تنادوا کے اندر جو ندا ہے یہ ''اَن'' اس کی تفسیر ہے، ''انہوں نے آپس میں آوازیں دیں صبح کے وقت، کہا کہ چلو اپنے کھیتوں پر اگر تم کاٹنے والے ہو'' تو اس کو حرث کے ساتھ تعبیر کیا ہے، باغ کے اندر کھیت جس طرح سے عام طور پر ہوتے ہیں، تو اس کو کھیت سے بھی تعبیر کر دیتے ہیں، باغ سے بھی تعبیر کر دیتے ہیں، ''چلو تم اپنے کھیت پر اگر تم کاٹنے والے ہو'' فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ: پس وہ چلے اس حال میں کہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے، اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ: کہ نہ داخل ہو اُس باغ میں تم پر آج کوئی مسکین، یعنی جلدی جلدی جا کے کاٹ کر اُٹھا کر فصل گھر میں لے آؤ، کاٹنے کے وقت کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے، تا کہ ہم دیکھا دیکھی اس کو دینے پر کچھ مجبور نہ ہوں، کہ مروّت ہوتی ہے، انسان دینے پہ مجبور ہو جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ مسکینوں کے آنے سے پہلے پہلے کاٹ کے سارا کا سارا لے آؤ، کوئی مسکین وہاں آنے نہ پائے، وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ: غَدَوْا قٰدِرِيْنَ، قٰدِرِيْنَ یہ غَدَوْا کی ضمیر سے حال بھی واقع ہوسکتا ہے، صبح صبح چلے وہ اس حال میں کہ قدرت پانے والے تھے، عَلٰى حَرْدٍ، حرد منع کے معنی میں بھی ہے، اس حال میں کہ وہ روکنے پہ قدرت پانے والے تھے، یوں بھی اس کا مفہوم ادا

کیا گیا ہے۔ یا حرد سے مراد ہے نشاط، تیزی، چستی، ''چلے وہ صبح چستی پر اس حال میں کہ وہ اپنے آپ کو قادر سمجھنے والے تھے، قدرت پانے والے تھے'' کہ جلدی جلدی چلو، جا کے توڑ کے لے آؤ، تو حرد تیزی، نشاط، جوش، اس معنیٰ میں بھی آتا ہے اور منع کے معنی میں بھی آتا ہے، منع کے معنی میں کریں گے تو ''چلے وہ اس حال میں کہ روکنے پہ اپنے آپ کو قادر کرنے والے تھے'' اپنے آپ کو قادر سمجھ رہے تھے کہ ہم روک لیں گے اور کسی مسکین کو کچھ نہیں دیں گے، یا ''چلے وہ جوش وخروش سے اس حال میں کہ وہ قادر تھے'' یعنی اپنے آپ کو قادر سمجھنے والے تھے اس لیے جلدی سے، چستی سے، جوش وخروش کے ساتھ وہ باغ توڑنے کی طرف گئے۔

باغ والے باغ دیکھ کر حیران

فَلَمَّا رَاَوْهَا: جب انہوں نے اس باغ کو دیکھا، قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ: کہنے لگے کہ ہم تو راستہ بھول گئے، یعنی وہ سڑک پر چلتے ہوئے جب اپنے باغ کی جگہ پہنچے تو باغ اُجڑا ہوا تھا، ٹوٹا پھوٹا، نیست ونابود ہو گیا، جب دیکھتے ہیں کہ یہاں وہ باغ ہمارے باغ کی طرح نظر نہیں آ رہا تو کہتے ہیں کہ کہیں رات کی تاریکی میں راستہ تو نہیں بھول گئے کہ کسی اور طرف نکل آئے ہوں، یہ تو ہمارا کھیت اور ہمارا باغ نہیں ہے، ''کہنے لگے کہ ہم راستہ بھولنے والے ہیں'' لیکن پھر جس وقت غور کیا تو پتا چلا کہ باغ تو وہی ہے، پھر کہنے لگے بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ: راستہ نہیں بھولے بلکہ ہم تو محروم القسمت ہی ہو گئے، ہم تو محروم ہو گئے، ہمارا تو کھیت ہی اُجڑ گیا۔

سمجھدار آدمی کی تنبیہ

قَالَ اَوْسَطُهُمْ: اُن میں سے جو بھلا آدمی تھا، اوسط کہتے ہیں بھلے آدمی کو، ان میں سے جو کوئی اچھا آدمی تھا، اُن میں سے اچھے نے کہا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ: میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں بیان کرتے؟ تم یہ منصوبے کیوں بنا رہے ہو کہ ہم اس طرح سے فصل کاٹ کے لے آئیں گے کہ کسی مسکین کو ایک دانہ بھی نہیں دیں گے؟ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں بیان کرتے؟ اللہ کو کیوں یاد نہیں کرتے؟ اور اللہ کو یاد کرنے کا مطلب یہی کہ تم اللہ کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں نعمت دی ہے، اس میں سے شکریے کے طور پر کوئی صدقہ خیرات کے منصوبے بناؤ، تم سارے روکنے کے اور مسکین کو نہ دینے کے منصوبے نہ بناؤ، میں نے تمہیں یہ کہا نہیں تھا؟ قَالُوْا: وہ کہنے لگے سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ: ہمارا رَبّ پاک ہے، بے شک ہم ہی غلط کار تھے، ہم نے جو سوچا اور جو منصوبے بنائے غلط بنائے، ہمارا رَبّ پاک ہے۔

باغ والوں کی ایک دُوسرے کو ملامت

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ: پھر متوجہ ہوا اُن کا بعض بعض پر اس حال میں کہ ایک دُوسرے کو ملامت کرتے تھے، یہ قاعدہ ہے کہ جب کام بگڑ جایا کرتا ہے تو کوئی کہتا ہے: ''تُو نے مشورہ دیا تھا!'' دُوسرا کہتا ہے: ''میں نے کب کہا تھا؟ تُو یوں کہتا تھا!'' تیسرا کہتا ہے: ''میں نے تو یوں کہا تھا، تم نے مانا نہیں!'' دُوسرے کہتے ہیں: ''تُو نے کب کہا تھا، تُو تو یوں کہہ رہا تھا!'' تو کام بگڑنے کے وقت ایک دُوسرے کو اِلزام دینا یہ انسانوں میں ہوتا ہے۔ جب کام ہو جائے اور نتیجہ اچھا نکل آئے تو ہر کوئی کوشش کیا

کرتا ہے کہ اس کو اپنی طرف منسوب کرے، کہ یہ میں نے کہا تھا یوں ہو گیا، یہ میری کارروائی ہے، یہ میرا مشورہ تھا، پھر انسان ذمہ داری اپنے پہ لایا کرتا ہے اور اُس شرف کو اپنی طرف منسوب کیا کرتا ہے، لیکن اگر اجتماعی کام کے اندر نقص واقع ہو جائے تو پھر الزام ایک دوسرے کو دیتے ہیں، یَتَلَاوَمُوْنَ کا یہی معنی ہے کہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے، "متوجہ ہوا بعض بعض پر اس حال میں کہ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے تھے۔"

باغ والوں کا اعترافِ جرم اور توبہ

قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ: کہا انہوں نے کہ اے ہماری خرابی! ہماری بربادی! بے شک ہم ہی سرکش تھے عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ: اُمید ہے کہ ہمارا پروردگار بدل کے دے دے گا ہمیں اس سے بہتر اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ: ہم اپنے رَبّ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں، یہ ایک تھپڑ لگا تو ہوش ٹھکانے آئی، پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے کہ ہم اللہ کی رحمت سے اُمید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِس باغ سے بہتر باغ ہمیں دے دے گا، ہم توبہ کرتے ہیں، اور اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔

واقعہ ذِکر کرنے سے مقصود

یہ واقعہ سُنایا جا رہا ہے کہ جس طرح سے ان باغ والوں کو اللہ نے باغ دے کر آزمایا تھا، لیکن وہ اللہ کی نافرمانی کر کے اس امتحان میں ناکام ہوئے، تو مشرکینِ مکہ کو ہم نے جو مال واولاد دے رکھا ہے، یہ بھی اِن کے لئے ایک آزمائش ہے، اس لیے واقعہ بیان کر کے کہا جا رہا ہے كَذٰلِكَ الْعَذَابُ: عذاب ایسے ہی آیا کرتا ہے جس طرح سے ان باغ والوں پر آیا، اس عذاب سے عذابِ دُنیوی کی طرف اشارہ ہے جیسے کہ مقابلۃً آگے آ گیا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ: عذاب ایسے ہی ہے اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ جان جائیں، ان لوگوں کو علم حاصل ہو جائے تو یہ دُنیا کے عذاب سے بھی بچنے کی کوشش کریں اور آخرت کے عذاب سے بھی بچنے کی کوشش کریں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ﴿۳۵﴾

بے شک متقین کے لئے ان کے رَبّ کے پاس خوش حالی کے باغات ہیں ﴿۳۴﴾ کیا پھر ہم کر دیں گے مسلمانوں کو مجرموں کی طرح؟ ﴿۳۵﴾

مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ

تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو ﴿۳۶﴾ یا تمہارے لئے کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو؟ ﴿۳۷﴾ بے شک تمہارے لئے اس کتاب میں

لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ

وہ چیز لکھی ہوئی ہے جو تم پسند کرتے ہو ﴿۳۸﴾ یا تمہارے لئے قسمیں ہیں ہمارے ذمے، پہنچنے والی ہیں قیامت کے دن تک؟ بے شک تمہارے لئے

لِمَا تَحْكُمُوْنَ ۞ سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ ۞ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ

وہ چیز ہے جس کا تم فیصلہ کرتے ہو ۞ آپ ان سے پوچھئے کہ ان میں سے کون اس بات کا ذمہ دار ہے؟ ۞ کیا ان کے لئے شرکاء ہیں؟

فَلْیَاْتُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۞ یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ

پس چاہیے کہ اپنے شرکاء کو لے آئیں اگر یہ سچے ہیں ۞ جس دِن کہ پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ لوگ سجدے کی طرف بلائے

اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ۞ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا

جائیں گے پھر وہ طاقت نہیں رکھیں گے ۞ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، ان کو ذِلت ڈھانپ لے گی، اور تحقیق وہ

یُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۞ فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ

بُلائے جاتے تھے سجدے کی طرف اس حال میں کہ صحیح سالم تھے ۞ چھوڑیے مجھے اور ان لوگوں کو جو کہ اس حدیث کو جھٹلاتے ہیں

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۞ وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۞

ہم ان کو درجہ بدرجہ لیے جا رہے ہیں ایسی جگہ سے جس کا ان کو پتا نہیں ۞ اور میں انہیں ڈھیل دیے ہوئے ہوں، بے شک میری تدبیر مضبوط ہے ۞

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۞ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ

کیا آپ اِن سے کوئی اُجرت مانگتے ہیں کہ وہ تاوان کی وجہ سے بوجھ میں دبے جا رہے ہوں؟ ۞ یا ان کے پاس غیب ہے جس کو وہ

یَكْتُبُوْنَ ۞ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى

لکھ کر رکھتے ہیں؟ ۞ پس آپ صبر کرتے رہیں اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے، اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں جب اس نے پکارا (اپنے رَبّ کو)

وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۞ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ

اس حال میں کہ وہ غم کے ساتھ گھٹا ہوا تھا ۞ اگر نہ پالیتا اس کو اس کے رَبّ کا احسان تو پھینک دیا جاتا وہ میدان میں اس حال میں کہ

مَذْمُوْمٌ ۞ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۞ وَاِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ

اس کی بُرائی کی ہوئی ہوتی ۞ پس چُن لیا اس کو اس کے رَبّ نے اور کر دیا اس کو اعلیٰ درجے کے لوگوں میں سے ۞ بے شک وہ لوگ جو

كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۞

کُفر کرتے ہیں قریب ہے کہ آپ کو پھسلا دیں اپنی آنکھوں کے ساتھ جب وہ نصیحت سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے ۞

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۵۲

اور نہیں ہے یہ مگر سب جہانوں کے لئے نصیحت ۝

خلاصۂ آیات

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ: بیشک متقین کے لئے ان کے ربّ کے پاس خوش حالی کے باغات ہیں، اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ: کیا پھر ہم کر دیں گے مسلمانوں کو مجرموں کی طرح؟ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ: تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ: یا تمہارے لیے کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو؟ اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ: بے شک تمہارے لیے اس کتاب میں وہ چیز لکھی ہوئی ہے جو تم پسند کرتے ہو، اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ: یا تمہارے لیے قسمیں ہیں ہمارے ذمے، پہنچنے والی ہیں قیامت کے دن تک؟ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ: بے شک تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم فیصلہ کرتے ہو، سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ: آپ ان سے پوچھئے کہ اِن میں سے کون اس بات کا ذمہ دار ہے؟ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ: کیا ان کے لیے شرکاء ہیں؟ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ: پس چاہیے کہ اپنے شرکاء کو لے آئیں اگر یہ سچے ہیں۔

تفسیر

آخرت کی حکمت

اس میں آخرت کی حکمت کا اشارہ کیا ہے جو بارہا آپ کے سامنے ذکر کی جا چکی، مشرکین جو کہتے تھے کہ آخرت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پھر اس کا مطلب یہ ہوا اگر آخرت نہیں ہے تو دُنیا میں جو فرماں بردار ہیں اور دُنیا میں جو مجرم ہیں مرنے کے بعد سب برابر ہو جائیں گے، یا تم جو کہتے ہو کہ بالفرض آخرت ہوئی تو ہم آخرت میں اسی طرح سے خوش حال ہوں گے، اگر تمہاری یہ بات صحیح ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم مجرم سب برابر؟ اور یہ بات کیسے ہوسکتی ہے، یہ بات تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے منافی ہے، کہ ایک شخص دُنیا کے اندر فرماں برداری سے وقت گزارتا ہے، اپنی لذات اور شہوات کو لات مارتا ہے، اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے اندر تکلیفیں اُٹھاتا ہے، اور دُوسرا شخص اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دُنیا کے اندر عیاشی کرتا ہے، بدمعاشی کرتا ہے، ہر قسم کی لذت اور خواہش پوری کرتا ہے، اور اگر سامنے کوئی انجام آنے والا نہیں تو پھر تو ظاہری طور پر دیکھتے ہوئے مجرمین خوش حال ہیں اور کامیاب ہیں، اور مسلمین فرماں بردار لوگ جو ہیں وہ تو ناکام ہیں، یہ دُنیا میں گرمی کی تکلیف اُٹھاتے رہے، روزے رکھتے رہے، سردی کی تکلیف اُٹھاتے رہے، رات کو اُٹھ اُٹھ کر نمازیں پڑھتے رہے، ان کے پلّے کیا پڑا؟ اور وہ دُوسرے لوگ جو تھے، وہ ہر قسم کی عیش وعشرت کرتے رہے، تو کامیاب زندگی تو مجرمین کی ہوگئی، پھر مسلمین کی کیسے ہوئی، اور ان دونوں کے درمیان فرق لازماً ہونا چاہیے، اس لیے آخرت یقیناً آئے گی۔

مشرکین کے نظریات بے دلیل ہیں

اور تم یہ جو کہتے ہو کہ اگر آخرت ہوئی تو ہم وہاں خوش حال ہوں گے، تو تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ کیا تم پر کوئی کتاب اُتری ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے؟ یا اللہ تعالیٰ نے قسمیں کھا کر تم سے کوئی عہد کر لیا ہے؟ اور وہ قسمیں قیامت تک قائم ہیں اور ان کے اندر کوئی کسی قسم کی ترمیم نہیں ہوگی؟ کتاب میں لکھا ہوا ہو کہ جو تم پسند کرو گے وہی تمہیں ملے گا؟ اللہ نے قسمیں کھائی ہوں، تمہارے ساتھ کوئی پختہ عہد کر لیا ہو کہ جو تم چاہو گے وہی ہوگا، کوئی اس قسم کا کوئی ثبوت ہے تو لے آؤ۔ یا کسی نے تمہیں کوئی سہارا دے دیا ہے کہ میں یوں کروا دوں گا، تم نے کوئی شفعاء شرکاء تجویز رکھے ہیں، تو اگر کوئی ایسی بات ہے تو ان کو بھی ہمارے سامنے ثابت کر دو کہ فلاں لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں سہارا دے دیا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم یوں کروا دیں گے۔ نہ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب اُتری، نہ اللہ کا تمہارے ساتھ کوئی معاہدہ، نہ کوئی شرکاء، تو پھر تم کیوں بھول میں پڑے ہوئے ہو اور آخرت کی فکر نہیں کرتے۔

قیامت کے دِن سجدہ کون کرسکیں گے؟

یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ: جس دِن کہ پنڈلی کھولی جائے گی، لفظی ترجمہ یہی ہے، جس دِن کہ پنڈلی کھولی جائے گی، وَّیُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ: اور وہ لوگ سجدے کی طرف بُلائے جائیں گے فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ: پھر وہ طاقت نہیں رکھیں گے خَاشِعَۃً اَبۡصَارُھُمۡ: ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی تَرۡھَقُھُمۡ ذِلَّۃٌ: اور اُن کو ذِلّت ڈھانپ لے گی، وَقَدۡ کَانُوۡا یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ: اور تحقیق بُلائے جاتے تھے وہ سجدے کی طرف، وَھُمۡ سٰلِمُوۡنَ: اس حال میں کہ صحیح سالم تھے۔ یہ بھی ایک آنے والے وقت کی طرف اشارہ ہے، کشفِ ساق محاورۃً یہ سختی سے کنایہ ہوتا ہے، جس دن پنڈلی کھل جائے گی، چونکہ عادت یہی ہے کہ جب کوئی معاملہ سخت ہوتا ہے جیسے کوئی سخت لڑائی ہوگئی، سخت خطرہ پیش ہوگیا، تو عورتیں ہوں یا مرد ہوں یہ اپنی چادروں شلواروں کو یوں سمیٹتے ہیں بھاگتے دوڑتے ہوئے کہ پنڈلی ننگی ہوجایا کرتی ہے، عموماً آپ نے دیکھا ہوگا، محنت کے کام میں، گھبراہٹ کی حالت میں، جس وقت کوئی جلد بازی ہوتی ہے، انسان بھاگ دوڑ کرتا ہے تو کپڑے یوں سمیٹ لیتا ہے، عورتیں بھی سمیٹ لیتی ہیں مرد بھی سمیٹ لیتے ہیں، پنڈلیاں ننگی ہوجاتی ہیں، تو یہ علامت ہوتی ہے کہ کسی سخت مشقت میں یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں، محنت کر رہے ہیں، بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، یا ہیبت اور گھبراہٹ کی حالت میں ہیں، اس لیے ''کشفِ ساق'' یہ محاورۃً حالات کے سخت ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، ''جس دِن معاملہ سخت ہوجائے گا'' مراد ہے قیامت کا دِن، ''اُس دِن پھر ان لوگوں کو سجدے کی طرف بُلایا جائے گا پھر یہ سجدہ کر نہیں سکیں گے'' کیونکہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز وہی لوگ ہوں گے جو دُنیا کے اندر خلوص کے ساتھ سجدہ کرتے رہے، اور اگر اس دِن یہ لوگ سجدہ کر کے اطاعت کا اظہار کرنا چاہیں گے تو ان کی کمریں تختے کی طرح سخت ہوجائیں گی، یہ پیچھے کو تو گریں گے سجدے کی حالت میں نہیں آسکیں گے، اللہ تعالیٰ اُس وقت بھی ان کو تنبیہ کے طور پر فرمائیں گے کہ تمہیں دُنیا میں سجدہ کرنے کے لئے کہا جاتا تھا جب تم صحیح سالم تھے، سجدہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے، اُس وقت تم نے سجدہ نہیں کیا، تو آج تمہیں سجدہ کرنے کی توفیق نہیں ہوسکتی، اس طرح سے عملاً فرماں بردار اور مجرمین ممتاز ہوجائیں گے، جو سجدہ کرسکیں گے سجدے میں گر جائیں گے وہ

مسلم اور فرماں بردار ہوں گے، اور فساق، فجار، منافق، مجرم جو ہوں گے وہ سجدہ نہیں کرسکیں گے، اس طرح سے دونوں جماعتوں کے درمیان امتیاز قائم ہوجائے گا۔

''کشفِ ساق'' کا دُوسرا مفہوم

اور ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کشفِ ساق یہ کوئی تجلی ہے اللہ تعالیٰ کی کما یلیق بشانہ، ساق سے مراد اللہ کی ساق ہی ہے، جس طرح سے ہاتھ کا لفظ آیا، چہرے کا لفظ آیا، صفاتِ الٰہیہ جتنی بھی آتی ہیں ان کے اندر ہمارا اہلِ سُنت والجماعت کا مسلک یہی ہے کما یلیق بشانہ، تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پنڈلی کھولیں گے، اور اللہ کی پنڈلی کھلنے کے ساتھ مؤمن مخلص جتنے ہیں وہ سب سجدے میں گرجائیں گے، اور منافق، فساق، فجار، کافر، سجدہ نہیں کرسکیں گے، اس دن عملی امتیاز ہوجائے گا، تو کشفِ ساق کا یہ مفہوم بھی روایات میں موجود ہے، پھر اس کو ہم یونہی ذکر کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کوئی تجلی ہے، اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت ہے، کما یلیق بشانہ، ہم اس کو کسی نقشے یا مثال کے تحت سمجھ سمجھا نہیں سکتے، جیسا کہ صفاتِ الٰہیہ کے اندر ہمیشہ آپ کے سامنے یہی مسلک نمایاں کیا جاتا ہے۔

''جس دن کہ پنڈلی کھولی جائے گی، اور یہ لوگ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے، پھر طاقت نہیں رکھیں گے، اِن کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی'' شرم کے مارے، جس طرح سے کوئی آدمی ذلیل وخوار ہوتا ہے، آنکھ اُوپر نہیں اُٹھاتا، '' آنکھیں اِن کی جھکی ہوئی ہوں گی، ذِلت اِن کو ڈھانپ لے گی، اور یہ بلائے جاتے تھے سجدے کی طرف اِس حال میں کہ صحیح سالم تھے۔''

حضور ﷺ کے لئے تسلی

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ: یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی ہے، ''چھوڑیے مجھے اور ان لوگوں کو جو کہ اس حدیث کو جھٹلاتے ہیں''، حدیث سے مراد قرآنِ کریم، جو اس قرآنِ کریم کی تکذیب کرتے ہیں مجھے اور ان کو چھوڑ دیجئے، کیا مطلب؟ کہ آپ ان کے معاملے میں دخل نہ دیجئے، آپ نے اپنا فرض ادا کردیا، اب میں جانوں اور یہ جانیں۔

کافروں کی ظاہری ترقّی درحقیقت اِستدراج ہے

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ: اِستدراج: درجہ بہ درجہ کسی شخص کو لے جانا، ''ہم ان کو درجہ بدرجہ لیے جارہے ہیں ایسی جگہ سے جس کا ان کو پتا نہیں''، لَا يَعْلَمُوْنَ: ایسے طور پر لیے جارہے ہیں کہ ان کو پتا نہیں، ہم ایسی جگہ سے اِن کو درجہ بدرجہ لیے جارہے ہیں کہ اِن کو کوئی علم نہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دُنیا کے اندر ترقّی کرتے چلے جارہے ہیں، ہمیں غلبہ نصیب ہوتا چلا جارہا ہے، ہم خوش حال ہوتے چلے جارہے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے یہ جہنم کی طرف درجے طے کرتے چلے جارہے ہیں، پتا اسی وقت ہی چلے گا جب سر کے بل اس گڑھے میں جا گریں گے، تب ان کو پتا چلے گا کہ ہم کہاں پہنچ گئے، ابھی اِن کو معلوم نہیں۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ فسق وفجور اور گناہوں کی زندگی کے باوجود اس کو رزق کی وسعت حاصل ہے،

اوراس کی عزت کے اندر ترقی ہوتی چلی جارہی ہے، تو سمجھ جایا کرو کہ یہ اِستدراج ہے، اللہ نے اس کی ڈور ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے، اور یہ آئے دن نعمتیں حاصل کرکے دن بہ دن زیادہ غروراور زیادہ تکبراور زیادہ سرکشی کے اندر مبتلا ہوتا چلا جارہا ہے، آخر یہ ایسے ٹھکانے پہنچ جائے گا کہ جہاں سے پھر لوٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اور پھر یہ اس طرح سے تباہ ہوگا کہ پھر اس تباہی سے بچنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔[1] اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہو اور پہلے گناہ پر ہی وہ پکڑا جائے اور اس کو سزا ہو جائے یہ اس کی سعادت اور نیک بختی ہے کہ آئندہ وہ جرم کرنے سے بچ جائے گا، اور جس شخص کو جرم اور گناہ ہضم ہونا شروع ہو جائے وہ آئندہ آئے دن اس میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ پھر ترقی کرتا کرتا وہ ایسے درجے پہ پہنچ جاتا ہے کہ پھر کوئی عذر معذرت کی گنجائش نہیں رہتی، تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِستدراج ہے۔ ایک سپاہی آدمی رشوت لے، سپاہی کے لئے رشوت کے مواقع کم ہیں بمقابلہ تھانیدار کے، اب وہ اپنی اس رشوت لینے کی زندگی میں ترقی کرتا ہوا تھانیدار بن گیا، تو وہ تو لوگوں کو دعوتیں دیتا ہے اور خوشیاں مناتا ہے کہ مجھے ترقی ہوگئی، لیکن اس کو یہ نہیں معلوم کہ فسق وفجور کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے ترقی دے کے نافرمانی کے مواقع زیادہ کردیے، اب وہ جتنی رشوت اور حرام زدگی کرتا تھا سپاہی ہونے کے زمانے میں، تو تھانیدار ہونے کے زمانے میں یقیناً اس سے زیادہ کرے گا، اور جب تھانیدار ہونے کے زمانے میں خوب ظلم وستم کرے گا، رشوت لے گا، اُوپر والے افسروں کو پہنچائے گا، ترقی کرکے اگلا عہدہ مل جائے گا، اس کو اور زیادہ مواقع حاصل ہو جائیں گے۔ اب یہ شخص تو سمجھتا ہے کہ میں ترقی کرتا چلا جارہا ہوں، لیکن اِس مجرمانہ زندگی پر اللہ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں آئی تو یہ ڈور ڈھیلی چھوڑی جارہی ہے، جس کے ساتھ اس کو بربادی کی طرف لے جایا جارہا ہے، آخر ایک درجے پہ پہنچے گا تو اس کے بعد کوئی عذر معذرت کی بات نہیں ہوگی، اللہ کی گرفت میں یک دَم آجائے گا اس کو ''اِستدراج'' کہتے ہیں، کہ نافرمانی کے باوجود، گناہوں کی زندگی کے باوجود اگر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کو خوش حال کیے ہوئے ہے اور اس کے رزق اور دُوسری چیزوں کے اندر ترقی ہے، تو سمجھ جایا کرو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ڈور ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے، جس کو کوئی اُردو شاعر کہتا ہے کہ:

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے — صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

مچھلی، جس وقت لوگ اس کو کانٹا لگایا کرتے ہیں، تو اس کے اُوپر مچھلی کی کوئی نہ کوئی مرغوب فیہ چیز لگادیتے ہیں، اور وہ خوش ہوکر اس کو نگلتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ مجھے لقمہ مل گیا، اور اُدھر صیاد خوش ہوتا ہے کہ یہ کانٹا نگل گئی، اور مچھلی کے شکاریوں کا یہ طریقہ ہے کہ جس وقت مچھلی کانٹے کو منہ ڈالتی ہے تو یہ ڈور ڈھیلی کردیتے ہیں، تو بہت شوق کے ساتھ مچھلی اس کو آگے نگل جاتی ہے، جس وقت آگے نگلتی ہے پھر یک دَم جھٹکا جو دیتے ہیں تو کانٹا ایسی جگہ پھنستا ہے کہ پھر وہ تڑپے پھڑکے، پھر چھوٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تو یہی اللہ تعالیٰ کی طرف اِستدراج ہوتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ میں نافرمان ہونے کے باوجود دیکھو کس طرح ترقی کرتا چلا جارہا

---

(۱) لَا تَغْبِطَنَّ فَاجِرًا بِنِعْمَتِهٖ فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا هُوَ لَاقٍ بَعْدَ مَوْتِهٖ إِنَّ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ قَاتِلًا لَا يَمُوتُ يَعْنِي النَّارَ. (مشکوٰۃ ۲/۴۴۷، باب فضل الفقراء، فصل ثانی)

ہوں، معلوم ہوتا ہے یہی طریقہ ٹھیک ہے، لیکن یہ اللہ کی طرف سے ڈور ڈھیلی ہے، اور جس دن یہ پکڑا جائے گا پھر ایسے ہی ہوگا جیسے گلے میں یہ پھنس گئی پھر نکلے گی نہیں۔ تو یہ حرام حلال کا امتیاز جو نہیں کرتے آخر جس وقت پھنسیں گے تو ایسے ہی حال اِن کا ہوگا۔ یہی ہے مطلب اِس کا، کہ ہم ان کو درجہ بدرجہ لیے جارہے ہیں ایسی جگہ جس کا ان کو پتا نہیں ہے۔ وَاُمْلِيْ لَهُمْ: اور میں انہیں ڈھیل دیے ہوئے ہوں اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ: بے شک میری تدبیر مضبوط ہے، جس کا توڑ انسان کے پاس نہیں ہے۔

کُفّار کے اِنکار پر تعجب

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا: کیا آپ اِن سے کوئی اُجرت مانگتے ہیں فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ: کہ وہ تاوان میں دبے جارہے ہوں؟ مثقل: جس کے اوپر بوجھ ڈال دیا جائے، یہ ان کے انکار پر تعجب ہے، تعجب بر انکارِ نبوّت، کہ آپ کو جو مانتے نہیں، آپ پر ایمان نہیں لاتے، تو کیا بات ہے؟ آپ اِن سے کوئی اُجر مانگتے ہیں؟ کہ یہ تاوان برداشت نہیں کرسکتے فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ: تاوان کی وجہ سے بوجھ میں دبے جارہے ہوں، اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ: یا ان کے پاس غیب ہے؟ جس کو وہ لکھ کے رکھتے ہیں، کیا مطلب؟ کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی ان کو ضرورت نہیں، یہ خود غیب دان ہیں، اور جو باتیں اِن کو غیب کی معلوم ہوتی ہیں تو محفوظ کرنے کے لئے اس کو لکھ کے رکھ لیتے ہیں، یعنی ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں، نہ تو غیب کی خبریں اِن کو براہِ راست حاصل ہوتی ہیں، اس میں بھی وہ نبی کے محتاج ہیں، اور نہ آپ ان سے کوئی اُجرت مانگتے ہیں کہ جس کے ادا کرنے کہ اِن میں ہمت نہ ہو، اور اس لیے آپ کو نہ مانتے ہوں، اِن دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی تسلی کے لئے حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ: پس آپ اپنے رَبّ کے حکم کے لئے منتظر رہیے، صبر کیجئے، آپ صبر کرتے رہیں اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے یا اپنے رَبّ کے فیصلے کے انتظار میں، مستقل مزاج رہیں، ان حالات کو برداشت کرتے رہیں، وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ: اور صاحبِ حوت کی طرح نہ ہوجائیں، ''صاحبِ حوت'' کا لفظی معنیٰ: مچھلی والا، مچھلی والے کی طرح نہ ہوجائیں، ''مچھلی والے'' سے کون مراد؟ حضرت یونس علیہ السلام! اُن کی طرح نہ ہوجائیں کہ وہ قوم پر ناراض ہوگئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر ناراض ہوکے اپنی قوم سے نکل گئے تھے، آپ اس طرح سے غصّے سے بھر کے اپنی قوم کو چھوڑ کے نہ جائیں، جس وقت تک اللہ کا حکم ہے آپ جمے رہیں، جس طرح سے انہوں نے کچھ اس معاملے میں جلدی کرلی تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا انتظار کیے بغیر قوم سے نکل گئے تھے غصّے سے بھرے ہوئے، اس طرح سے آپ نہ کریں، آپ برداشت کریں، ''صبر کیجئے آپ اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے، یا، آپ اپنے رَبّ کے فیصلے کے انتظار کی وجہ سے صبر کیجئے، اور صاحبِ حوت کی طرح نہ ہوجایئے'' اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ: یہ آگے صاحبِ حوت کے واقعے کی طرف کچھ مختصر سا اشارہ ہے، اور اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ انبیاء میں اور اسی طرح سے سورۂ صافات گزر چکی ہے اور سورۂ یونس میں، ''قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب اس نے پکارا اپنے رَبّ کو اس حال میں کہ وہ غم کے ساتھ گھٹا ہوا تھا'' یہ پکارنا وہی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (سورۂ انبیاء: ۸۷)، نَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ،

تاریکیوں کے اندر اس نے اپنے رَبّ کو پکارا جبکہ وہ غم کے اندر گھٹا ہوا تھا۔ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ: اگر نہ پالیتا اُس کو اس کے رَبّ کا احسان تو پھینک دیا جاتا وہ میدان میں، وَهُوَ مَذْمُوْمٌ: اس حال میں کہ اس کی بُرائی کی ہوئی ہوتی، بُرے حال میں اس کو میدان میں پھینک دیا جاتا...... یہاں دو باتیں ہیں ایک جگہ تو آیا فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (سورۂ صافات: ۱۴۳)، اگر وہ تسبیح پڑھنے والے نہ ہوتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہ جاتے، قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو مچھلی کی غذا بنادیا جاتا، قیامت تک اس کو نکلنے کی توفیق نہ ہوتی، جس وقت اللہ تعالیٰ حشر فرماتے اسی وقت ہی وہ نکلتے، یہ نہیں کہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یونس علیہ السلام اس میں محبوس رہتے، یہ مطلب نہیں، مطلب یہ ہے کہ غذا بن جاتے، نکلنا نصیب ہی نہ ہوتا قیامت تک، اگر وہ تسبیح پڑھنے والے نہ ہوتے، یعنی یہ نہ پڑھتے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ یوں اللہ کا ذکر اگر وہ نہ کرتے تو مچھلی کے پیٹ میں ہی رہ جاتے۔ پھر اللہ کا ذکر کرنے کے بعد، توبہ کرنے کے بعد اِس ذکر اور توبہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو مچھلی سے باہر تو نکال دیتا، اور اگر یہ توبہ قبول نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کا احسان اِن کو نہ پالیتا تو پھر ان کو بُرے حال میں پھینکا جاتا، اللہ کی نصرت پھر ان کے ساتھ نہ ہوتی، ان کی بُرائی بیان کی ہوئی ہوتی، لیکن جب اللہ نے اِن کی توبہ قبول کرلی، اللہ کا احسان ان کے اُوپر ہوگیا، تو اللہ کے ذکر کی برکت سے مچھلی کے پیٹ سے نکال بھی دیے گئے، اور نکالے بھی مذموم ہونے کی حالت میں نہیں گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اللہ تعالیٰ کے منصور ہونے کی حالت میں۔ اللہ کا احسان ان کو شامل حال ہوگیا، ان کو اسی طرح سے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب کے اوپر فائز کیا گیا جس طرح سے یہ پہلے تھے، یہ کوئی مذموم نہیں ہیں اور کوئی ان کی بُرائی بیان نہیں کی گئی، بس بندے ہیں، اللہ کے حق میں کچھ تھوڑی سی لغزش ہوئی، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو فوراً سنبھال لیتے ہیں، یہ بھی سنبھالنے کے لئے ایک تنبیہ تھی جو حضرت یونس علیہ السلام کو کردی گئی۔

معمولی سی لغزش پر گرفت محبوب ہونے کی علامت ہے

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسے ہی ہے کہ اگر ان سے کوئی کسی قسم کی کوتاہی ان کی شان کے مطابق ہوتی ہے، (وہ کوتاہی ہماری کوتاہی کی طرح نہیں، بلکہ ان کی شان کے مطابق، اس لیے ایسے موقع پر الفاظ بڑے ادب کے ساتھ بولنے چاہئیں) ان کی شان کے لائق اگر کوئی کسی قسم کی کوتاہی ہوجاتی ہے تو چونکہ وہ بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت اتنی ہی سخت ہوجاتی ہے، تو اللہ کی طرف سے اُن کے اُوپر معمولی معمولی کوتاہیوں پہ اتنی سخت گرفت ہونا یہ ان کے اُونچے مرتبے کی علامت ہے، ان کے گھٹیا ہونے کی علامت نہیں، کافر اور مشرک جو کرتے رہیں پوچھتا کوئی نہیں، اور اِن حضرات سے اگر ذرا سی خلافِ اَولیٰ بات بھی ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت بہت سخت آتی ہے۔ ''اگر نہ پالیتا ان کو ان کے رَبّ کا احسان تو پھینک دیے جاتے وہ میدان میں اس حال میں کہ وہ بُرائی بیان کیے ہوئے ہوتے، مذموم ہوتے، بُرے حال میں ہوتے'' لیکن اللہ کا احسان ان کے شامل حال ہوگیا، ان کی توبہ قبول ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ سے ان کو میدان کی طرف نکالا تو مذموم ہونے کی حالت میں نہیں۔ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ: پس چُن لیا اس کو اس کے رَبّ نے، فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اور کردیا اس کو اعلیٰ درجے کے

لوگوں میں سے، اللہ تعالیٰ کا اجتباء جیسے پہلے تھا ویسے ہی ان کے شامل حال رہا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو صالحین میں سے کر دیا، بہت اعلیٰ درجے کے لوگوں میں سے کر دیا۔

کفار آپ ﷺ کو گھور کر اور دیوانہ کہہ کر پھسلانا چاہتے ہیں

اگلی آیت میں پھر اسی بات کی تردید ہے جس کو ابتدائے سورت میں ذکر کیا گیا تھا، وَاِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ: اِنْ یہ مخففہ من المثقلہ ہے،'' بیشک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں قریب ہے کہ آپ کو پھسلا دیں اپنی آنکھوں کے ساتھ جب وہ نصیحت سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے'' آنکھوں کے ساتھ پھسلانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی طرف یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہیں گویا کہ آپ کو مرعوب کر کے آپ کو آپ کے کام سے روکنا چاہتے ہیں۔ غصے کی کیفیت جس وقت انسان کے قلب میں ہوتی ہے تو دوسرے کی طرف غصے کی کیفیت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے، تو ہمارے ہاں محاورہ ہے کہ یہ میری طرف یوں جھانک رہا ہے جیسے مجھے کھا ہی جائے گا، تو یہاں ''اِزلاق'' اُسی مفہوم میں ہے کہ آپ ﷺ کی طرف یہ یوں جھانکتے ہیں، جس وقت آپ اِن کو نصیحت کرتے ہیں اور یہ نصیحت کی بات سنتے ہیں تو یہ یوں جھانکتے ہیں آپ کی طرف گویا کہ اپنی نگاہوں کے ساتھ مرعوب کر کے آپ کو اپنی جگہ سے پھسلا دیں گے، ہٹا دیں گے، اور یہ کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔

نصیحت کرنے والا دِیوانہ نہیں ہوتا

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ: اور نہیں ہے یہ بات جو ان کو پڑھ کے سنائی جارہی ہے مگر عالمین کے لئے نصیحت، وہ بات نصیحت ہے جس سے ان کو فائدہ اُٹھانا چاہیے، اور نصیحت کرنے والا دِیوانہ نہیں ہوا کرتا، آپ ﷺ دیوانے نہیں اور جو بات آپ بیان کر رہے ہیں یہ کوئی مجنون کی بڑ نہیں، جو شخص مجنون ہوا کرتا ہے اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات ایک بڑ ہوتی ہے جس کا مفہوم کچھ نہیں ہوتا، اس میں کوئی معنویت نہیں ہوتی، آپ جو کچھ کہتے ہیں یہ کوئی مجنون کی بڑ نہیں ہے، آپ دیوانے نہیں اور جو کچھ آپ بیان کرتے ہیں یہ تو سب جہانوں کے لئے نصیحت ہے جس سے اِن لوگوں کو فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

بدنظری کا علاج

اِس میں چونکہ اِزلاق بالابصار کا ذکر آ گیا کہ وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ پھسلانے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، تو قرآنِ کریم کی آیات کے خواص جو لوگوں نے بیان کیے ہیں تو اس آیت کی خاصیت بھی لکھی ہے کہ یہ بدنظری کا علاج ہے، کہ اگر کسی بچے کو، یا جانور کو، کوئی بُری نظر لگ جائے تو ایسے وقت میں اِس کو پڑھ کر اُس پہ پھونکا جائے، یا یہ لکھ کر گلے میں ڈال دی جائے، تو بدنظری کے علاج کے طور پر تعویذ گنڈے والے لوگ اس آیت کو استعمال کیا کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

آیاتھا ۵۲ ۶۹ سُوْرَةُ الْحَاۗقَّةِ مَكِّيَّةٌ ۷۸ رکوعاتھا ۲

سورۂ حاقہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آیات ۵۲ ہیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَاۗقَّةُ ۝ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ

ثابت ہونے والی ۝ اور کیا ہے وہ ثابت ہونے والی ۝ آپ کو کون سی چیز اطلاع دیتی ہے کہ ثابت ہونے والی کیا چیز ہے؟ ۝ جھٹلایا ثمود نے اور عاد

بِالْقَارِعَةِ ۝ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ

نے قارعہ کو ۝ تو پھر ثمود کو ہلاک کر دیا گیا ایک حد سے بڑھنے والی آفت کے ساتھ ۝ اور لیکن عاد، وہ ہلاک کر دیے گئے ایسی ہوا کے ذریعے سے

صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى

جو سناٹے والی تھی حد سے بڑھنے والی تھی ۝ مسخر کیا اللہ تعالیٰ نے اُس ہوا کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل، اے مخاطب! تو دیکھتا ہے

الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ

لوگوں کو اُس ہوا کے اندر پچھاڑ کے ڈالے ہوئے، گویا کہ وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہیں ۝ کیا تو دیکھتا ہے ان کے لئے کوئی

بَاقِيَةٍ ۝ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝ فَعَصَوْا

بقاء؟ ۝ فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے گزرے ہیں اور پلٹا کھانے والی بستیاں سب نے خطا کا ارتکاب کیا ۝ انہوں نے نافرمانی کی

رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي

اپنے رَبّ کے رسول کی، پس پکڑ لیا اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑنا سخت ۝ بے شک ہم نے جب پانی میں طغیانی آ گئی تمہیں اُٹھایا

الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝ فَاِذَا

کشتی میں ۝ تاکہ ہم بنا دیں اِس واقعے کو تمہارے لئے یاد دہانی، اور یاد رکھے اِس واقعے کو یاد رکھنے والا کان ۝ جس وقت

نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً

صور میں پھونک ماری جائے گی ایک ہی مرتبہ پھونک مارنا ۝ اور زمین اور پہاڑ اُٹھا لیے جائیں گے پھر ان کو یکبارگی کوٹ دیا

وَّاحِدَةً ﴿١٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١٥﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ

جائے گا ﴿۱۴﴾ پس جس دن ایسا ہوگا اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی ﴿۱۵﴾ اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن

وَّاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ

بہت ہی کمزور اور بودا ہوگا ﴿۱۶﴾ اور فرشتے اس آسمان کے کناروں پہ ہوں گے، اور اُٹھائیں گے تیرے رب کے عرش کو اپنے اُوپر اس دن

ثَمٰنِيَةٌ ﴿١٧﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ

آٹھ فرشتے ﴿۱۷﴾ جب یہ واقعات پیش آئیں گے تم پیش کیے جاؤ گے، کوئی چھپنے والی چیز تم سے چھپی نہیں رہے گی ﴿۱۸﴾ پھر جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اعمال

بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿١٩﴾ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾

اپنے دائیں ہاتھ میں، پس وہ کہے گا: لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو ﴿۱۹﴾ بے شک میں نے گمان کیا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں ﴿۲۰﴾

فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا

پس وہ شخص پسندیدہ زندگی میں ہوگا ﴿۲۱﴾ عالی قدر باغ میں ﴿۲۲﴾ جس کے پھل قریب ہوں گے ﴿۲۳﴾ (کہا جائے گا) کہ کھاؤ اور پیو

هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ

مزے لے لے کر ان اعمال کی وجہ سے جو تم نے بھیجے گزشتہ ایام میں ﴿۲۴﴾ لیکن جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اعمال اپنے بائیں ہاتھ میں،

فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿٢٥﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ

وہ کہے گا ہائے کاش! میں نامہ اعمال نہ دیا جاتا ﴿۲۵﴾ اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے ﴿۲۶﴾ ہائے! وہ موت ہی

الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾ مَآ اَغْنٰى عَنِّىْ مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّىْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿٢٩﴾ خُذُوْهُ

خاتمہ کرنے والی ہوتی ﴿۲۷﴾ میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا ﴿۲۸﴾ مجھ سے میرا سلطان بھی ہلاک ہو گیا ﴿۲۹﴾ (اللہ کی طرف سے حکم ہوگا) پکڑو اسے

فَغُلُّوْهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿٣١﴾ ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا

پھر اسے طوق پہناؤ ﴿۳۰﴾ پھر اس کو جہنم میں جھونک دو ﴿۳۱﴾ پھر اس کو ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ذراع ہے

فَاسْلُكُوْهُ ﴿٣٢﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ

اس کو داخل کر دو ﴿۳۲﴾ بے شک یہ شخص عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں لاتا تھا ﴿۳۳﴾ اور مسکین کے کھانے پر کسی کو برانگیختہ نہیں

الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾
کرتا تھا ﴿۳۴﴾ پس اس کے لئے آج یہاں کوئی گرم جوش دوست نہیں ہوگا ﴿۳۵﴾ اور نہ اس کے لئے کوئی کھانے کی چیز ہوگی مگر جہنمیوں کے زخموں کا دھوون ﴿۳۶﴾
لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿۳۷﴾
نہیں کھائیں گے اس غسلین کو مگر خطاکار لوگ ﴿۳۷﴾

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ- سورۂ حاقہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۵۲ آیتیں ہیں، ۲ رُکوع ہیں۔ پچھلی سورت میں خصوصیت کے ساتھ مشرکین کے اس قول کو رَدّ کیا گیا تھا جو آپ ﷺ کو مجنوں اور دِیوانہ قرار دیتے تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ دُنیوی اور اُخروی عذاب کے ساتھ ترہیب تھی، اور اِس سورت میں خصوصیت کے ساتھ مشرکین کے اس قول کو رَدّ کیا گیا ہے جو آپ ﷺ کو شاعر، یا کاہن کہتے تھے، تو دونوں سورتوں کا حاصل یہ ہوجائے گا کہ نہ آپ مجنون ہیں اور نہ آپ کاہن ہیں اور نہ آپ شاعر ہیں، جو کچھ آپ بیان کرتے ہیں یہ ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے، اور جو کچھ آپ کی زبان کے اُوپر جاری ہے یہ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے، اور اُخروی ودُنیوی عذاب کے تذکرے کے ساتھ ترغیب وترہیب دونوں سورتوں میں مشترک ہے۔

تفسیر

اَلْحَآقَّةُ ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ: مَا الْحَآقَّةُ یہ مبتدا خبر ہیں، جملہ مل کر یہ پہلے اَلْحَآقَّةُ کی خبر ہے، اَلْحَآقَّةُ یہ حَقَّ یَحِقُّ سے لیا گیا ہے، ثابت ہونا، حاقہ کا معنی ہوگا ثابت ہونے والی چیز، اور یہ قیامت کے ناموں میں سے ہے، چونکہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور اس میں ہر حقیقت نمایاں ہوجائے گی، شراپنی جگہ ثابت ہوجائے گا، خیراپنی جگہ ثابت ہوجائے گی، دُنیا کے اندر اِلتباس، اشتباہ جو کچھ ہے وہ سب اُٹھ جائے گا، اس لیے قیامت کو حاقہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''ثابت ہونے والی، کیا ہے وہ ثابت ہونے والی؟'' یہ اِستفہام بطورِ تہویل کے ہے، اس طرح اِستفہام کے ساتھ زیادہ ڈر پیدا ہوجاتا ہے، یعنی وہ ایسی چیز ہے کہ جس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ: آپ کو کون سی چیز اطلاع دیتی ہے حاقہ کیا چیز ہے؟ اس کا بھی وہی معنی ہے۔

قیامت کو جھٹلانے کی وجہ سے عاد وثمود کا انجام

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ: اب قیامت کو جھٹلانے والوں کی ہلاکت کا ذِکر ہے، اور قیامت کو جھٹلانا ہلاکت کا باعث اِس طرح سے بن جاتا ہے کہ جب وہ قیامت کے قائل ہی نہیں تو اپنے اعمال کا وہ جائزہ ہی نہیں لیں گے کہ ہم کون سا کام صحیح کررہے ہیں اور کون سا کام بُرا کررہے ہیں؟ اعمال کے اندر اگر توازن پیدا ہوتا ہے تو جزا سزا کے عقیدے کے ساتھ، اور اگر جزا سزا کا عقیدہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں انسان اپنے اعمال میں کوئی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا، دُنیا میں جس چیز کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے،

اختیار کر لیتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی بُری چیز کیوں نہ ہو، اور دُنیوی مفاد کے خلاف سمجھتا ہے تو چھوڑ دیتا ہے، چاہے وہ کتنی اچھی چیز کیوں نہ ہو، اور یہ طرزِ فکر تباہی لاتا ہے۔

''ثمود اور عاد نے قارعہ کو جھٹلایا'' قارعہ: قَرَعَ یَقْرَعُ: کھٹکھٹانا، یہ دروازے کو جو دستک دی جاتی ہے اس کو بھی قَرْعُ الْبَاب کہتے ہیں، دروازے پہ دستک دینا، تو قارعہ یہ بھی قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ تیسویں پارے میں آئے گا، تو یہاں کھٹکھٹانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس میں دِل دھڑکنے لگ جائیں گے، ہر چیز کو کھڑکا کے رکھ دے گی، ''جھٹلایا ثمود نے اور عاد نے قارعہ کو'' یعنی قیامت کو، فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ: طاغیہ یہ لفظ طغیان سے لیا گیا ہے، طغیان کا معنی ہوتا ہے حد سے تجاوز کرنا، سرکشی اختیار کرنا، سورۂ شمس میں آئے گا كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ: اپنی سرکشی کے سبب سے ثمود نے جھٹلایا، تو یہاں آ گیا کہ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ: ان کو طاغیہ کے ذریعے سے ہلاک کر دیا گیا، طاغیہ سے مراد یہاں ایسی آفت ہے جو حد سے تجاوز کرنے والی تھی، اُن کے اُوپر کوئی ایسی کڑک ایسی چیخ آئی جو حد سے نکلنے والی تھی، جس کا برداشت کرنا انسان کے بس میں نہیں تھا، ''ہلاک کر دیے گئے وہ حد سے بڑھنے والی چیز کے ساتھ، ایسی آفت کے ساتھ جو کہ حد سے تجاوز کرنے والی تھی، یا، ایسی صیحہ اور چیخ کے ذریعے سے جو کہ حد سے بڑھنے والی تھی۔'' اَمَّا کے ساتھ تفصیل آ گئی، ثمود وعاد کا ذکر پیچھے اِجمالاً آیا، اور اِن دونوں کے واقعات تفصیل کے ساتھ قرآنِ کریم میں آ چکے ہیں، ''ثمود اور عاد نے قارعہ کو یعنی قیامت کو جھٹلایا، تو پھر ثمود کو ہلاک کر دیا گیا ایک حد سے بڑھنے والی آفت کے ساتھ۔''

وَاَمَّا عَادٌ: اور لیکن عاد، فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ: وہ ہلاک کیے گئے ایک بادِ صرصر کے ذریعے سے، ریح: ہوا کو کہتے ہیں، صرصر کا معنی تیز تند جس کے چلنے کے ساتھ شور برپا ہوتا ہے، جیسے آندھی آیا کرتی ہے جھکڑ قسم کی تو اس میں شور ہوتا ہے، بادِ صرصر کے ساتھ ہی اس کو تعبیر کیا جاتا ہے، عَاتِيَةٍ: عاتیہ کا معنی حد سے بڑھنے والی، یعنی جو سنبھالے نہیں سنبھالی جاتی تھی، ''ہلاک کر دیئے گئے ایسی ہوا کے ذریعے سے جو سناٹے والی تھی اور حد سے بڑھنے والی تھی'' منتظمین کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی، عَتَتْ عَلَى الْخُزَّانِ جس طرح سے تفاسیر میں لفظ استعمال کیا گیا ہے، گویا کہ وہ منتظمین سے بھی سنبھالی نہیں جاتی تھی، بظاہر اس کا مفہوم یہ ہے، ''بہت تیز تند سرکش ہوا کے ذریعے سے ان کو ہلاک کر دیا گیا'' سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ: مسخر کیا اللہ تعالیٰ نے اس ہوا کو ان پر سات راتیں آٹھ دِن، سات راتیں اور آٹھ دِن وہ ہوا اُن کے اُوپر مسلط رہی، حُسُوْمًا: اس کا معنی مسلسل لگاتار بھی کیا گیا ہے (اس صورت میں یہ حاسم کی جمع ہوگا، اور سبع اور ثمانیۃ کی صفت بنے گا۔ ناقل) اور حُسُوْمًا یہ مفعول مطلق کے طور پر بھی ہے تَحْسِمُ حُسُوْمًا (نسفی وغیرہ) حَسَمَ: کاٹنا، قطع کرنا، جڑ سے اکھیڑ دینا، ''وہ ہوا اُن کو قطع کرتی تھی قطع کرنا، اُن کو جڑ سے اکھیڑتی تھی''، یا یہ ہے کہ وہ سات راتیں اور آٹھ دِن مسلسل چلتی رہی، متتابعات کے مفہوم کے طور پر۔ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى: اے مخاطب! تُو دیکھتا ہے لوگوں کو اس ہوا کے اندر پچھاڑ کر ڈالے ہوئے، صرعیٰ یہ صریع کی جمع ہے، صَرَعَ یَصْرَعُ: پچھاڑ دینا۔ صرعیٰ: پچھاڑے ہوئے، گرائے ہوئے، جس طرح بیخ کے پھینک دیے گئے ہوں، ''دیکھتا ہے تو لوگوں کو'' یہ تصویر کھینچی جا رہی ہے ماضی کی حال کے ساتھ، ''دیکھتا ہے تو لوگوں کو اُس ہوا کے اندر پچھاڑے ہوئے'' كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ اَعْجَاز عَجُز کی جمع ہے، اور خاویۃ کے معنی خالی،

اَعْجَازُ نَخْلٍ: کھجوروں کے تنے، ''گویا کہ وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہیں'' خَاوِيَةٍ یہ نَخْلٍ کے ساتھ لگ گیا، اَعْجَازُ کی اُدھر اضافت ہوگئی، کھوکھلے تنوں کی طرح یعنی جن میں جان نہیں ہوتی، اندر سے خالی ہوتے ہیں، اس طرح سے ان کو پچھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور یہ وہی قوم ہے جو کہتی تھی مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ فصلت:۱۵) ہم سے زیادہ طاقتور بھی کوئی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہوا کا مقابلہ نہ کرسکے، اور اس ہوا میں ایسے پچھاڑ دیے گئے جس طرح سے کھوکھلے تنے پھینکے ہوئے ہوتے ہیں۔ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ کیا تُو دیکھتا ہے ان کے لئے کوئی نفسِ باقیہ؟ ان سرکشوں میں سے تجھے کوئی نظر آتا ہے؟ نام ونشان مٹا دیا گیا۔ اور باقیہ کو اگر مصدر کے معنی میں لے لیا جائے تو بقاء کے مفہوم میں آجائے گا ''کیا تو ان کے لیے کوئی بقاء دیکھتا ہے؟'' ''کیا دیکھتا ہے تو ان کے لئے کوئی نفسِ باقیہ؟ یا، تو اُن کے لئے کوئی بقاء دیکھتا ہے؟''

فرعون، قومِ لُوط اور قومِ نُوح کا انجام

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ: مؤتفکات: اُلٹنے والی بستیاں، جو اُلٹی گئی تھیں، پلٹا کھانے والی بستیاں، اس سے قومِ لُوط کی بستیاں مراد ہیں، اور بِالْخَاطِئَةِ، خاطئۃ خطأ کے معنی میں ہے، باء تعدیہ کے لئے آگئی، ''فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے گزرے ہیں اور پلٹا کھانے والی بستیاں سب نے خطا کا اِرتکاب کیا، سب خطا لائے'' جَآءَ کا فاعل ہو گیا فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ، جَآءَ بِالْخَاطِئَةِ کا معنی سب نے خطا کا اِرتکاب کیا، سب نے گناہ کے کام کیے، خطائیں کیں، فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ: اپنے رَبّ کے رسول کی انہوں نے نافرمانی کی، یہ جَآءَ بِالْخَاطِئَةِ کی ایک تفصیل ہے، خطا کا اِرتکاب کس طرح سے کیا؟ کہ اللہ کی طرف سے جو رسول ان کے پاس آیا تھا اس کی انہوں نے نافرمانی کی، فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً پس پکڑ لیا اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑنا سخت، رَّابِيَةً: رَبَا، یَرْبُو: بڑھنے کے معنی میں ہے، تو اَخْذَةً رَّابِيَةً کا معنی ہو گیا کہ ایسا پکڑنا جو کہ شدت کی طرف بڑھنے والا تھا، ''سخت پکڑ ان کو پکڑ لیا، پکڑ لیا اُن کو پکڑنا سخت'' ...... اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ: طَغَا: طغیان سے ہے، ''بے شک ہم نے جب پانی کو طغیانی آگئی تمہیں اُٹھا لیا کشتی میں'' یہ حضرت نُوح علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ ہے، ''جب پانی حد سے بڑھ گیا، پانی میں طغیانی آگئی''، یہ آپ جو لفظ بولا کرتے ہیں کہ دریا میں آج کل طغیانی ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ پانی اتنے زور سے آیا ہوا ہے کہ اپنی حد سے بڑھتا جارہا ہے، ''جب پانی میں طغیانی آگئی ہم نے اُٹھایا تمہیں کشتی میں'' لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ: تاکہ ہم بنادیں اس واقعے کو تمہارے لیے یاددہانی اور یاد رکھیں اس واقعے کو یاد رکھنے والے کان۔ اُذن: کان، واعیہ: یاد رکھنے والا۔ ''یاد رکھنے والا کان اس واقعہ کو یاد رکھے'' کہ ہم نے تمہیں کشتی میں نجات دی، ''کشتی میں ہم نے تمہیں اُٹھا لیا تاکہ ہم اس واقعے کو تمہارے لیے یادگار بنادیں، یاددہانی بنادیں، اور تاکہ اس کو یاد رکھے یاد رکھنے والا کان۔''

قیامت کے دِن کے واقعات

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ: یہ تو دُنیوی واقعات تھے جن کی طرف نشاندہی کی گئی، اب اُخروی واقعات کا ذکر ہے، ''جس وقت صور میں پھونک ماری جائے گی ایک ہی مرتبہ پھونک مارنا'' یہ نفخ اوّل ہے، بار بار یہ مضمون گزر چکے، ''اور زمین اور پہاڑ اُٹھالیے

جائیں گے" فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً: پھران کو یکبارگی کوٹ دیا جائے گا، ریزہ ریزہ ہوجائیں گے سارے، فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ: پس جس دن ایسا ہوگا اس دن واقع ہونے والی واقع ہوجائے گی، وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ: اور آسمان پھٹ جائے گا، فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ: پس وہ آسمان اس دن بہت ہی کمزور اور بودا ہوگا، وَّاهِيَةٌ کے معنی بودا، کمزور، جس طرح سے کپڑا آخر پرانا ہوکر گھس جاتا ہے اور جلدی جلدی پھٹ جاتا ہے۔ یعنی آج آسمان آپ کو کتنا مضبوط نظر آتا ہے، لاکھوں کروڑوں سال گزر جانے کے باوجود اس میں کوئی شگاف نہیں پڑا، لیکن جس وقت نفخ صور ہوگا، قیامت آجائے گی، اس وقت یہ یوں پھٹے گا جس طرح سے بوسیدہ کپڑا پھٹتا ہے، وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآئِهَا: اَرجاء رَجا کی جمع ہے، کنارے کو کہتے ہیں، "اور فرشتے اِن آسمان کے کناروں پہ ہوں گے" وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ: اور اُٹھائیں گے تیرے رَبّ کے عرش کو اپنے اُوپر اُس دن آٹھ فرشتے، آٹھ فرشتے اُس دن تیرے رَبّ کے عرش کو اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ يَوْمَئِذٍ: یوم اِذ کان کذا، جب یہ واقعات پیش آئیں گے تُعْرَضُوْنَ: تم پیش کیے جاؤ گے، لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ: کوئی چھپنے والی چیز تم سے چھپی نہیں رہے گی، کوئی قول کوئی عمل کوئی حال جس کو تم نے کتنا ہی چھپایا کیوں نہ ہو لیکن چھپی نہ رہے گی، "کوئی چھپنے والی چیز تمہاری طرف سے چھپی نہیں رہے گی۔"

دائیں ہاتھ میں نامۂ اَعمال ملنے پر خوشی کا منظر

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ: پھر جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اَعمال اپنے دائیں ہاتھ میں، فَيَقُوْلُ: پس وہ کہے گا، هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ: لو! میرا نامۂ اَعمال پڑھو، كِتٰبِيَهْ کے آخر میں جو ہاء ہے وہ سکتہ کی ہے، اصل میں ہے: کتابی، میرا نامۂ اَعمال، یعنی خوشی کے ساتھ لوگوں کو بھی دِکھاتا پھرے گا کہ دیکھو! میرا نامۂ اَعمال پڑھو، اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ: بے شک میں نے گمان کیا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں، چونکہ میرے دِل میں یہ اندیشہ رہتا تھا کہ میں نے اپنا حساب کتاب دیکھنا ہے اور اپنے حساب وکتاب سے ملاقات کرنی ہے، اس لیے میں ہر کام سوچ سمجھ کے کرتا تھا، جس کا نتیجہ آج سامنے آرہا ہے، "بے شک میں نے خیال رکھا تھا اس بات کا کہ میں ملنے والا ہوں اپنے حساب کو" فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ: پس وہ شخص پسندیدہ زندگی میں ہوگا، پسندیدہ زندگی: ایسی زندگی جس کے اُوپر وہ خوش ہوگا اور راضی ہوگا، فِيْ عِيْشَةٍ ذَاتِ رِضًا کے معنی میں ہے، "پسندیدہ زندگی میں ہوگا"، فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ: عالی قدر باغ میں، قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ: جس کے پھل قریب قریب ہوں گے، جَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ رحمٰن میں آیا تھا، دونوں باغوں کے پھل قریب ہوں گے، یہاں بھی دَانِيَةٌ: دَنَا يَدْنُوْ. دُنُوّ سے ہے قریب ہونا، وہاں بھی جَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ، دانی قریب ہونے کے معنی میں ہی تھا، "اس کے پھل قریب ہوں گے" یعنی توڑنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئے گی، كُلُوْا وَاشْرَبُوْا: کہا جائے گا کہ کھاؤ اور پیو، هَنِيْٓـئًا: مزے لے لے کر، هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا جس طرح سے یہ لفظ سورۂ نساء میں آیا تھا (آیت: ۴) هَنِيْءٌ: خوش گوار، لذیذ، لذیذ اور خوشگوار، "کھاؤ پیو اچھے طریقے سے، خوب مزے لے لے کر" بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ: "اَیامِ خالیہ" سے مراد "اَیامِ ماضیہ"، "اُن اعمال کی وجہ سے جو تم نے بھیجے گزشتہ ایام میں" گزشتہ ایام میں جو اَعمال آپ نے بھیجے اُن اعمال کی وجہ سے اب مزے لے لے کر کھاؤ پیو۔

بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملنے پر حسرت وندامت کا منظر

وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ: لیکن جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اعمال اپنے بائیں ہاتھ میں فَیَقُوۡلُ: پھر وہ کہے گا یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُوۡتَ كِتٰبِیَهۡ: ہائے کاش! میں نامۂ اعمال نہ دیا جاتا، میرے سامنے یہ بات نہ آتی، وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِیَهۡ: اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ یہ حساب وکتاب سامنے نہ آتا، یعنی لوگوں سے بھی شرمسار ہوگا اور اس طرح سے اپنی حسرت اور ندامت کو ظاہر کرے گا، یٰلَیۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِیَةَ: یٰلَیۡتَهَا میں ''ھا'' ضمیر موتۃ کی طرف لوٹ رہی ہے، قرینہ مقام سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے، ''ہائے! وہ موت ہی خاتمہ کرنے والی ہوتی'' یعنی وہ موت اس طرح سے فیصلہ کر دیتی کہ دوبارہ جی اُٹھنا نہ ہوتا تا کہ یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا، ''کاش کہ وہی موت ہی فیصلہ کرنے والی ہوتی، ختم کرنے والی ہوتی'' یعنی دوبارہ جی اُٹھنا نہ ہوتا، مَاۤ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَهۡ: میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، مَالِیَهۡ کے آخر میں ہاءِ سکتہ کی ہے، اور یاء مضاف الیہ ہے، مَالِیۡ مَالِیَ دونوں طرح سے پڑھا جاتا ہے، جیسے کِتَابِیۡ کِتَابِیَ، ''میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا'' هَلَكَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَهۡ: مجھ سے میرا سلطان بھی ہلاک ہوگیا، سلطان سے مراد دبدبہ جو دُنیا میں حاصل تھا، جاہ، عزت، جو سلطنت دُنیا میں حاصل تھی، جو جاہ اور عزت حاصل تھی وہ بھی ہلاک ہوگئی، یعنی وہ بھی کسی کام نہ آئی۔

بائیں ہاتھ والوں کا انجام اور اس کی وجوہات

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا، خُذُوۡهُ: پکڑو اسے، فَغُلُّوۡهُ: پھر اسے طوق پہناؤ، ثُمَّ الۡجَحِیۡمَ صَلُّوۡهُ: پھر اس کو جہنم میں جھونک دو، ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَةٍ ذَرۡعُهَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُكُوۡهُ: پھر اس کو ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ذراع ہے اس کو داخل کر دو، زنجیروں کے اندر جکڑ دو، زنجیر میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زنجیر میں جکڑ دو۔ اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِیۡمِ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡكِیۡنِ: یہ اُن کے جہنم میں جانے کی وجہ ذکر کی گئی ہے، بے شک یہ شخص عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں لاتا تھا اور مسکین کے کھانے پر کسی کو برانگیختہ نہیں کرتا تھا، یعنی نہ خود کھلاتا تھا نہ کسی دُوسرے سے کہتا تھا، لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِیۡمِ میں حقوق اللہ کا ذکر آ گیا، اور وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡكِیۡنِ میں حقوق العباد کا ذکر آ گیا، نہ یہ اللہ کی عظمت محسوس کرتا تھا نہ یہ مخلوق کے اُوپر شفقت کرتا تھا، خود تو کسی کو کھانا کیا دینا ہے، کسی کو ترغیب بھی نہیں دیتا تھا کہ تم ہی کھانا کھلا دو، نہ بندوں کے ساتھ اس کا تعلق صحیح تھا نہ اللہ کے ساتھ اس کا تعلق صحیح تھا، یہ وجہ ہوگئی اس کے جہنم میں جانے کی، جس میں اشارہ اس بات کی طرف کر دیا گیا کہ آخرت کی کامیابی اگر حاصل کرنا چاہتے ہو تو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا خیال کرو، اللہ کی عظمت کو محسوس کرو، اس پر ایمان لاؤ، اور اسی طرح سے بندوں کے حق کو بھی پہچانو، اگلی سورت کے اندر آئے گا کہ مؤمنین مخلصین مصلین نماز پڑھنے والے وہ ہمیشہ اپنے مال کے اندر سائل اور محروم کے حق کو بھی محسوس کرتے ہیں، اپنے مال کو ان لوگوں پر بھی خرچ کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کے لئے شفقت علی الخلق بھی ضروری ہے۔

جہنمیوں کی غذا

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ: پس اس کے لئے آج یہاں کوئی غم خوار نہیں ہوگا، حمیم کہتے ہیں گرم جوش دوست کو، جو محبت کی گرمی سے گرم ہو یا ہوا ہو، "اس کے لئے آج کوئی گرم جوش دوست نہیں ہوگا" وَلَا طَعَامٌ: اور نہ اس کے لئے کوئی کھانے کی چیز ہوگی، اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ: مگر دھوون، غسلین کہتے ہیں کسی چیز کو دھونے کے بعد جو میل کچیل نکلا کرتی ہے، اور یہاں غسلین سے جہنمیوں کے زخموں کا دھوون مراد ہے، جس طرح سے زخم کو دھویا جائے تو اس میں پیپ، لہو اور اس قسم کی چیزیں شامل ہوتی ہیں، تو یہاں غسلین کا مصداق وہی ہے۔ حصر جو کیا جارہا ہے تو یہ حصر اضافی ہے یعنی کوئی لذیذ اور خوشگوار چیز اُن کو کھانے کے لئے نہیں دی جائے گی سوائے غسلین کے، تو غسلین جیسی اور چیزیں جیسے زقوم ہوگا (سورۂ واقعہ: ۵۲)، اور کچھ اور ہوگا، کہیں صدید کا ذکر آیا ہے (سورۂ ابراہیم: ۱۶)، کہیں غساق کا ذکر آیا ہے (سورۂ نبا: ۲۵)، تو اِن چیزوں کی نفی کرنی مقصود نہیں، خوش گوار لذیذ چیز کی نفی کرنی مقصود ہے، اِسے حصر اِضافی کہتے ہیں، بعض چیزوں کے مقابلے میں یہ حصر ہے، لَا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ: نہیں کھائیں گے اِس غسلین کو مگر خطا کار لوگ، یعنی گنہگاروں کو یہ کھانے کے لئے دیا جائے گا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿٤٠﴾ وَّ

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو ⊙ اور ان کی جن کو تم نہیں دیکھتے ⊙ بے شک یہ تو ایک باعزت رسول کی بات ہے ⊙

مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا

یہ کسی شاعر کی بات نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو ⊙ اور نہ یہ کسی کاہن کی بات ہے، تم بہت کم

تَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا

نصیحت حاصل کرتے ہو ⊙ یہ تو ربّ العالمین کی طرف سے اُتاری ہوئی چیز ہے ⊙ اور اگر یہ (ہمارا رسول) ہم پر باتوں میں سے

بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿٤٤﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿٤٦﴾

کوئی بات گھڑ لیتا ⊙ تو ہم اس رسول کو دائیں ہاتھ کے ساتھ پکڑ لیتے ⊙ پھر ہم اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے ⊙

فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾ وَاِنَّا

پھر تم میں سے کوئی بھی اس سے روکنے والا نہ ہوتا ⊙ بے شک یہ کتاب البتہ نصیحت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ⊙ اور بے شک ہم

لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ

البتہ جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض جھٹلانے والے ہیں ﴿۴۹﴾ اور بے شک یہ کتاب البتہ حسرت ہے کافروں پر ﴿۵۰﴾ اور بے شک یہ کتاب

لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

البتہ یقین لانے کے قابل ہے ﴿۵۱﴾ پس تسبیح بیان کیجئے اپنے عظمت والے رَبّ کے نام کی ﴿۵۲﴾

تفسیر

اِثباتِ رِسالت اور صداقتِ قرآن

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ: دُنیا اور آخرت دونوں کے واقعات ذِکر کرنے کے بعد اَب اصل مسئلہ آ گیا، بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ کوئی شاعر نہیں، کاہن نہیں، جو کچھ یہ بیان کرتے ہیں نہ یہ کوئی کاہنوں کی غلط بیانی ہے، نہ یہ کوئی شاعروں کی خیال بندی ہے، اور نہ یہ کوئی مجنون کی بڑ ہے، جس طرح سے پچھلی سورت میں ذِکر کیا گیا تھا، یہ تو رَبّ العالمین کی طرف سے اُتاری ہوئی چیز ہے، رَبّ العالمین کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت ہے، اس لیے اس چیز کی عظمت محسوس کرتے ہوئے تم اس کے اُوپر ایمان لاؤ، اور جو ایمان نہیں لاتے اور پھر خاص طور پر آخرت کا عقیدہ اختیار نہیں کرتے، دُنیا اور آخرت میں ان کے اُوپر جس قسم کی تباہی آتی ہے وہ اس پچھلے رُکوع کے اندر اُس کی تفصیل ذِکر کر دی گئی۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ: ''لا'' یہ تو تردید ہوا کرتی ہے ان حالات کی جس کے جواب کے طور پر یہ قسم کھائی جا رہی ہے، کہ تم لوگ کہتے ہو کہ یہ شاعر ہے اور یہ خیال بندی کرتا ہے، شاعروں کی طرح بیٹھا ایسے خیال جماتا رہتا ہے، یا یہ کاہن ہے، شیاطین سے کچھ باتیں معلوم کر کے جوڑ کے ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے، یہ بات بالکل نہیں، ''لا'' کے ساتھ اس کی نفی کرنی مقصود ہے، نہیں نہیں، بالکل نہیں، اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ: میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ: اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے، تو مخلوق دو طرح کی ہی ہوتی ہے، بعض نظر آتی ہے اور بعض نظر نہیں آتی، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے دلائل بیان کرتا ہے تو وہ بعض ایسی چیزیں ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، تاریخ کے واقعات بیان کیے جا رہے ہیں جن کو ہم کانوں سے سنتے ہیں، باقی! اللہ تعالیٰ آخرت کے احوال بیان کرتا ہے، اپنی صفات کا ذِکر کرتا ہے، تو وہ ایسی چیزیں ہیں جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتیں، دونوں قسم کے دلائل ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر واضح کیے ہیں، اور دونوں قسم کی چیزیں بطور استدلال کے اس کتاب کے اندر مذکور ہوئی ہیں، بعض ہمیں آنکھوں سے نظر آتی ہیں، بعض نظر نہیں آتیں، مراد اس سے ساری کائنات ہے، ''قسم کھاتا ہوں میں اُس کی جس کو تم دیکھتے ہو اور جس کو تم نہیں دیکھتے'' اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ: بے شک یہ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یہ تو ایک باعزت رسول کی بات ہے، رسولِ کریم کا قول

ہے،وَمَاهُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ: یہ کسی شاعر کی بات نہیں، قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ: تم بہت کم ایمان لاتے ہو،وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ: اور نہ یہ کسی کاہن کی بات ہے، کاہن وہ لوگ ہوتے تھے جو جنّات کے ساتھ اپنا رابطہ پیدا کر کے ان سے کچھ باتیں معلوم کر کے لوگوں کے سامنے نقل کرتے رہتے تھے، سورۂ شعراء کے اندر بھی اس کی تفصیل آئی تھی، قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ: تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو،تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ یہ تو ربّ العالمین کی طرف سے اُتاری ہوئی چیز ہے،تنزیل: مُنَزَّل کے معنی میں ہو جائے گا۔

نبی اگر بالفرض اللہ پر جھوٹ باندھے تو فوراً ہلاک ہو جائے

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ: تَقَوَّلَ: بات بنالینا،قول گھڑ لینا، ''اگر یہ (جو رسولِ کریم ہے جس کو پیچھے ذکر کیا جا رہا ہے) اگر یہ ہمارا رسول ہم پر کوئی بات گھڑ لے'' یعنی ہم نے کہی نہ ہو اور ہماری طرف منسوب کر دے، تقوّل: بات بنالینے کو کہتے ہیں،اقاویل: اَقْوِلَۃ کی جمع ہے، یا اقوال کی جمع ہے، ''اگر باتوں میں سے کوئی بات یہ ہم پر گھڑ لے'' ہم نے کہی نہ ہو اور ہماری طرف منسوب کر دے، لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ: یمین: دائیں ہاتھ کو کہتے ہیں اور یمین: قوت کے معنی میں بھی آتا ہے، تو لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ کا معنی یہ ہوگا کہ ہم اس رسول کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے، ہم اُس رسول کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، یا، ہم اُس رسول کو دائیں ہاتھ کے ساتھ پکڑ لیتے، یعنی پوری قوت کے ساتھ اس کو پکڑ لیتے، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ: پھر ہم اس سے وتین کاٹ دیتے، وتین یہ رگِ جان کو کہتے ہیں، وہ رگ جس کے کاٹنے کے ساتھ انسان مرجاتا ہے، جس کو سورۂ قٓ کے اندر ''حبلِ ورید'' کے ساتھ بھی تعبیر کیا تھا، ''پھر ہم اس کی رگِ گردن یا رگِ جان کاٹ دیتے'' فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ: پھر تم میں سے کوئی بھی اس سے روکنے والا نہ ہوتا، کوئی بھی اس کو بچا نہ سکتا۔ تلوار کے ساتھ جلاد جس وقت کسی کو قتل کرتا ہے تو دائیں ہاتھ کے ساتھ ہی اس نے تلوار چلانی ہوتی ہے تو اپنے بائیں ہاتھ کے ساتھ مجرم کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتا ہے، کیونکہ جب وہ مجرم میری طرف منہ کر کے کھڑا ہو مثال کے طور پر، تو اُس کا دایاں ہاتھ میرے بائیں ہاتھ کے مقابلے میں آئے گا، تو بائیں ہاتھ اُس کا دایاں ہاتھ یوں پکڑ لیا جائے اور اس کے بعد پھر اُس کی گردن اُڑا دی جائے، یہ ہے اُس کو قتل کرنے کا طریقہ، تو مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ رسول ہماری طرف کوئی بات اپنی طرف سے منسوب نہیں کر سکتا، اگر ایسا کرے ہم اِس کو فوراً ہلاک کر دیں۔

غیرِ نبی اگر اللہ پر جھوٹ باندھے تو فوراً ہلاک ہونا ضروری نہیں

یہ بات جو کہی جا رہی ہے یہ رسولِ کریم کے متعلق کہی جا رہی ہے، جس کو ہم اپنا رسول بنا کر بھیجیں اس کو یہ جرأت نہیں کہ ہماری طرف ایسی بات منسوب کر دے جو ہم نے نہ کہی ہو، اگر ایسا کرے تو اس کو فوراً ہلاک کر دیا جائے، رسول غلط بیانی نہیں کر سکتا، ہمارے اُوپر بہتان نہیں باندھ سکتا، یہ بات رسول کے متعلق کہی جا رہی ہے، اور اگر غیر رسول جس کو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر نہیں بھیجا وہ جو مرضی بکتا پھرے، لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے اُوپر اِفترا کرتا پھرے، جھوٹی باتیں بیان کر کے اللہ کی طرف منسوب کرتا

رہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ڈھیل دیتے ہیں، وقت پہ نہیں پکڑتے، آخرت میں سزا دیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اگر غلط بیانی کرے تو رسول کی تو ہر بات اللہ کی بات سمجھی جاتی ہے تو دین مسخ ہو جائے گا، اور اگر ایک عام آدمی جس کو یہ منصب حاصل نہیں ہے اگر یہ بکتا پھرتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری کسی پر نہیں ہوتی۔ دُنیوی حکومتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ حکومت کے منصب دار نہیں ہیں، عہدے دار نہیں ہیں، بھنگی ہیں، جھاڑو دیتے پھرتے ہیں، دُکان دار اپنی دُکانوں پر بیٹھے ہیں، یہ اگر صبح شام بھی حکومت کی طرف منسوب کر کے غلط بیانی کرتے رہیں تو حکومت چنداں ان کا نوٹس نہیں لیتی، لیکن اگر ایک شخص کو حکومت نے وزیر بنایا ہوا ہے، یا سفیر بنایا ہوا ہے، حکومت کا نمائندہ بن کے کسی دُوسرے ملک میں وہ دورے پہ گیا ہوا ہے، اور وہاں جا کے وہ حکومت کی پالیسی کے خلاف کوئی بات کرتا ہے، یا صدرِ مملکت نے وہ بات نہ کہی ہو اور صدرِ مملکت کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہہ دیتا ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ اس کے ایک ایک لفظ پہ گرفت ہو جاتی ہے، اسی طرح سے جس کو اللہ نے رسول بنا دیا، اور اس کی نبوّت اور رسالت کے دلائل قائم کر دیے، اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، یہ شخص اگر کوئی غلط بیانی کرے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اللہ کی طرف کوئی بات منسوب کرے تو کسی صورت میں زندہ نہیں رہ سکتا، اس کو فوراً تباہ کر دیا جائے گا، بمقابلہ ایسے شخص کے کہ جس کی رسالت اور نبوّت پر دلیل ہی کوئی نہیں، اگر وہ کوئی غلط بیانی کرتا پھرتا ہے تو اس کی باتوں کو کون پوچھتا ہے؟ کون اس کی باتوں کا ذمہ دار ہے؟ جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ پوچھ لیں گے۔

مرزائیوں کا آیتِ بالا سے اِستدلال غلط ہے!

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض اوقات یہ جھوٹے مدّعیٔ نبوّت، جس طرح سے یہ مرزائی ہیں، یہ مرزے کے متعلق جو بالکل جھوٹا ہے، اس کے متعلق بھی وہ بات کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ کہتا ہے کہ اگر ہم پر کوئی غلط بات گھڑے ہم اس کو ہلاک کر دیں گے، اس کا ہاتھ پکڑ کے اُس کو یوں کر دیں گے، تو مرزے کی زندگی میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ اگر اس کی باتیں غلط ہیں تو اس کے اُوپر کوئی تباہی کیوں نہیں آتی؟ اُس وقت ہمارے علماء کی طرف سے یہی توجیہ کی گئی تھی کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جو بھی اللہ کے متعلق جھوٹ بولے وہ فوراً ہلاک کر دیا جائے، یہ تو صبح سے لے کر شام تک لوگ اللہ کے متعلق جھوٹ بولتے ہیں، اِفترا علی اللہ کرتے ہیں، مشرکین بھی اِفترا علی اللہ کرتے تھے اور کس طرح سے دندناتے پھرتے تھے، قرآنِ کریم میں ان کے کتنے اِفترا نقل کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بات نہیں کہی اور یہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، قرآنِ کریم میں کتنی آیتیں اس قسم کی آئی ہیں، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ عامی آدمی کے متعلق یہ ضمانت نہیں، یہ تو ہے کہ جس کی نبوّت اور رسالت ثابت ہو جائے، ثابت ہونے کے بعد پھر اگر وہ بات غلط بیان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتا ہے، تو پھر اللہ اس کو فوراً پکڑ لیں گے، رسول کی غلط بیانی برداشت نہیں ہوسکتی۔ اور یہاں صداقت بیان کی جارہی ہے قرآنِ کریم کی، کہ یہ ہمارا رسول ہے، اِس کے رسول ہونے کے اُوپر دلائل قائم ہوگئے، اب یہ جو کچھ بھی بولے سب ہماری بات ہے، ہماری طرف نسبت کر کے یہ کوئی کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کر سکتا، لہٰذا اللہ کی کلام قرار دے کر یہ جو کچھ

تمہارے سامنے پیش کرتا ہے وہ واقعی سب تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے، اس کی طرف سے کوئی اس میں غلط بیانی نہیں ہے، یہ ضمانت دی جارہی ہے اس شخص کے لئے جس کو اللہ نے رسول بنادیا، جس کی رسالت اور نبوت ثابت ہے، جس کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ تو شاعر اور کاہن ہے، کہا جارہا ہے کہ بالکل نہیں، سب کچھ اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے، اور یہ کوئی غلط بیانی نہیں کرسکتا اور ہماری طرف کوئی غلط بات منسوب نہیں کرسکتا، اگر ایسا کرے گا تو ہم اس کو کبھی رہنے نہ دیں۔ اور اگر کسی کی نبوت رسالت ثابت ہی نہیں، ایک عامی آدمی ہے، خواہ مخواہ بڑیں مارتا پھرتا ہے تو مشرکین اللہ کے متعلق کتنے جھوٹ بولتے تھے اور کتنے افترا کرتے تھے، لیکن فوری طور پر اُن کو کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ نبی کے متعلق نہیں برداشت کیا جاسکتا کہ اللہ کی مرضی کے خلاف وہ کوئی بات کہہ دے، یہاں اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ ''ہم اس کو قوت سے پکڑ لیتے، زور سے پکڑ لیتے، پکڑ کر ہم اس کی رَگ گردن کاٹ دیتے'' مطلب ہے کہ ہلاک کردیتے، ''پھر تم میں سے کوئی بھی اس کو اس سزا سے بچانے والا نہ ہوتا۔'' دایاں ہاتھ مراد ہو تو اُس رسول کا مراد ہے، کہ ہم اُس رسول کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اس سے اس کی رَگ جان کاٹ دیتے، یہ قتل کی ایک تصویر ہے جس طرح سے عام طور پر کسی کو قتل کیا جاتا ہے، تو مراد یہاں مطلقاً ہلاک کرنا ہے کسی عذاب کے ذریعے سے۔ ''پھر تم میں سے کوئی بھی اُس سے روکنے والا نہ ہوتا'' جو اس سزا کو دُور ہٹا دیتا۔

قرآنِ کریم کی عظمت وحقانیت

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ: بے شک یہ کتاب (''ہٗ'' ضمیر لوٹ رہی ہے اس قرآنِ کریم کی طرف جو تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح سے لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ سے معلوم ہوتا ہے) بے شک یہ کتاب، یہ قرآن البتہ نصیحت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے، اور بے شک ہم البتہ جانتے ہیں کہ تم سے بعض مکذبین ہیں، جھٹلانے والے ہیں، تو مکذبین کو بھی ہم جانتے ہیں غیر مکذبین کو بھی ہم جانتے ہیں، ''اور بے شک یہ کتاب البتہ حسرت ہے کافروں پر'' یعنی ایک دن یہ حسرت کا ذریعہ بنے گی، حسرت کریں گے کہ ہم نے اس کو قبول کیوں نہ کرلیا، ہم نے اس کے اُوپر عمل کیوں نہ کیا، ''اور بے شک یہ کتاب البتہ حق الیقین ہے'' یقین لانے کے قابل ہے، یہ حقیقی بات ہے یقینی بات ہے، یہی الفاظ آپ کے سامنے سورۂ واقعہ کے آخر میں بھی آئے تھے اور وہاں وضاحت ہوئی تھی، ''پس تسبیح بیان کیجئے اپنے عظمت والے ربّ کے نام کی۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

چونکہ یہ سَبِّحْ اَمر کا صیغہ آ گیا، میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ جہاں بھی اس قسم کا اَمر کا صیغہ آئے تو اس کے مطابق فوراً عمل ہو جانا چاہیے، ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' اس قسم کے لفظ زبان سے ادا کردیے جائیں تاکہ اس اَمر کے اُوپر موقع محل کے مطابق عمل بھی ہو جائے، ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ۔''

آیاتھا ۴۴ ۷۰ سُوْرَةُ الْمَعَارِج مَكِّيَّةٌ ۷۹ رکوعاتھا ۲

سورۂ معارج مکہ میں نازل ہوئی اس کی چوالیس آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝۱ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝۲ مِّنَ اللّٰهِ ذِي

مانگنے والے نے عذاب مانگا جو واقع ہونے والا ہے ۝ کافروں کے لئے، جس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں ۝ (واقع ہونے والا ہے) اللہ کی جانب سے

الْمَعَارِجِ ۝۳ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ

جو کہ آسمانوں والا ہے ۝ چڑھیں گے فرشتے اور رُوح اُس اللہ کی طرف ایسے دن میں جس کی اندازہ پچاس

اَلْفَ سَنَةٍ ۝۴ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝۵ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ

ہزار سال ہے ۝ پس آپ اچھی طرح سے صبر کیجئے ۝ بے شک یہ لوگ تو اس دِن کو بعید سمجھتے ہیں ۝ ہم اس کو قریب ہی

قَرِيْبًا ۝۷ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝۸ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹ وَلَا يَسْئَلُ

سمجھ رہے ہیں ۝ جس دِن کہ ہو جائے گا آسمان تلچھٹ کی طرح ۝ اور ہو جائیں گے پہاڑ رنگی ہوئی اُون کی طرح ۝ اور نہیں پوچھے کوئی

حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ

دوست کسی دوست کو ۝ حالانکہ وہ ایک دُوسرے کو دکھائے جائیں گے، چاہے گا مجرم کہ فدیہ دے دے وہ اس دِن کے عذاب سے

بِبَنِيْهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَ

اور اپنے بیٹوں کے ساتھ ۝ اپنی بیوی کے ساتھ اور اپنے بھائی کے ساتھ ۝ اور اپنے کنبے کے ساتھ جو (دُنیا میں) اس کو ٹھکانا دیتا ہے ۝ اور

مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵

ان سب لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں پھر اس کا فدیہ دینا اس کو عذاب سے چھڑالے ۝ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، بے شک وہ آگ شعلہ زن ہے ۝

نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝۱۷ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝۱۸

کھینچ لینے والی ہے چمڑے ۝ بُلائے گی وہ اس شخص کو جس نے پیٹھ پھیری اور چلا گیا ۝ اور جمع کیا اور برتنوں میں ڈال کے رکھا ۝

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ

بے شک انسان پیدا کیا گیا ہے جی کا کچا ⑲ جب اس کو کوئی شر پہنچتا ہے تو یہ بے صبرا ہو جاتا ہے ⑳ جب اس کو کوئی بھلائی پہنچ جاتی ہے

مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ

تو بہت روکنے والا بن جاتا ہے ㉑ مگر جو نماز پڑھنے والے ہیں ㉒ جو اپنی نماز کے اُوپر دوام اختیار کرتے ہیں ㉓ اور جن کے مالوں میں

حَقٌّ مَعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَ

معلوم حق ہے ㉔ سائل کے لئے بھی اور محروم کے لئے بھی ㉕ اور جو جزاء کے دن کی تصدیق کرتے ہیں ㉖ اور

الَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ

جو اپنے رَبّ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں ㉗ بے شک ان کے رَبّ کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ㉘ اور جو

هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ

اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں ㉙ مگر اپنی بیویوں پر یا باندیوں پر جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، پس بے شک وہ

مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ

ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں ㉚ اور جو اس کے علاوہ کوئی جگہ تلاش کرتا ہے پس یہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ㉛ اور (یہ

لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ

نمازی وہ ہیں) جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت رکھنے والے ہیں ㉜ اور جو اپنی گواہیوں کے ساتھ قائم ہونے والے ہیں ㉝ اور جو

هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾

اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ㉞ یہ لوگ جنت میں عزت کیے جائیں گے ㉟

تفسیر

تمہارا مانگا ہوا عذاب آنے والا ہے

سورۃ المعارج مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۴۴ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رکوع ہیں۔ سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ: سوال کیا سوال کرنے والے نے عذاب کا جو کہ واقع ہونے والا ہے کافروں کے لیے، یہاں سَاَلَ کا صلہ چونکہ باء آیا ہے تو یہاں سَاَلَ

مانگنے کے معنی میں ہے، جب صلہ عن آئے تو سَاَلَ تحقیق کے متعلق ہوتا ہے، کہ کسی چیز کے متعلق سوال کیا جائے کہ وہ چیز کیا ہے وہاں عموماً سَاَلَ عَنْهُ آیا کرتا ہے، صلہ عن آتا ہے، اور جب صلہ باء آئے تو اس میں مانگنے والا مفہوم ہوتا ہے، تو مانگنے والے نے عذاب مانگا جو واقع ہونے والا ہے کافروں کے لئے، لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ: جس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں۔ یہ مانگنے والا کون تھا؟ اس کی تعیین کرنے کی ضرورت نہیں، مشرکین کہتے رہتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورۂ انفال: ۳۲) کہتے تھے یا اللہ! اگر یہ قرآن سچا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا لے آ ہمارے پاس دردناک عذاب۔ تو یہ وہی! عذاب مانگنے والی بات ہے، مشرکینِ مکہ اس طرح سے ضد میں آ کر ایسے سوال کرتے تھے۔ "مانگنے والے نے عذاب مانگا جو واقع ہونے والا ہے کافروں کے لئے، جس کو کوئی ہٹانے والا نہیں" مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ: یہ دَافِعٌ کے متعلق ہے، واقع ہونے والا ہے وہ اللہ کی طرف سے، ایسا اللہ جو کہ سیڑھیوں والا ہے، درجاتِ عالیہ والا ہے، آسمانوں والا ہے، معارج مِعْرَجٌ کی جمع ہے، مِعرَج: عروج کا آلہ، جس کو سیڑھی کہتے ہیں، مراد درجاتِ عالیہ اور سماوات ہیں، جو آسمانوں والا اللہ ہے، چونکہ آسمان اُوپر نیچے ہیں، تو ایسے ہی ہیں جیسے سیڑھی ہوتی ہے، اور اللہ کی طرف جانے والا انہی آسمانوں کو، انہی درجات کو عبور کر کے جاتا ہے، اس لیے اللہ کو ذِي الْمَعَارِجِ کہہ دیا، اور مِّنَ اللّٰهِ یہ دَافِعٌ کے متعلق ہے، "واقع ہونے والا ہے اللہ کی جانب سے جو کہ آسمانوں والا ہے۔"

قیامت کے دِن کی مقدار، اور ایک اِشکال کا جواب

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ: چڑھتے ہیں فرشتے اور رُوح (رُوح سے روح القدس مراد ہے یعنی جبریل) چڑھتے ہیں فرشتے اور رُوح القدس اُس اللہ کی طرف، عروج کر کے جاتے ہیں، اُوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَمر لے کر، کسی تدبیر کے لئے وہ آتے ہیں، پھر اسی کی طرف چڑھ کر جاتے ہیں، فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ: فِيْ يَوْمٍ کو متعلق کیا ہے یَقَعُ کے (جلالین)، وہ عذاب واقع ہوگا ایسے دِن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے، اور اِس دِن سے قیامت کا دِن مراد ہے، تو تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ یہ علیحدہ ہوگیا، یَقَعُ فِيْ يَوْمٍ علیحدہ ہوگیا، وہ عذاب ایسے دِن میں واقع ہوگا جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے، پچاس ہزار سال اُس کو کہا جا رہا ہے اس کی شدّت کی بنا پر، کہ شدّت کی بنا پر وہ کافروں کو یوں لمبا معلوم ہوگا کہ جیسے ختم ہونے میں ہی نہیں آتا، سورۂ الٓمٓ تنزیل السجدۃ کے اندر اس کی لمبائی اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ذکر کی گئی تھی، کہ تمہارے شمار کرنے کے اعتبار سے وہ ہزار سال کی طرح ہے، اور یہاں پچاس ہزار ذکر کیا جا رہا ہے، تو پچاس ہزار یا ہزار ہو اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، مراد یہ ہے کہ بہت لمبا ہوگا کہ کسی صورت میں یہ ختم ہوتا نظر ہی نہیں آئے گا، اور کافروں کے لئے اس کی اتنی لمبائی ہے، اور مؤمنین جو کہ اچھے حال میں ہوں گے حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اُن کے اُوپر تو یہ دِن اس طرح سے گزر جائے گا جس طرح سے ایک نماز سے لے کر دُوسری نماز کا وقت ہوتا ہے،[1] جس سے معلوم ہوگیا کہ یہ شدّت اضافی ہے، جو اچھے حال میں ہوگا اس کا وقت آسانی سے گزر جائے گا، دُنیا میں بھی ایسی ہی بات ہے، ایک دِن میں آپ سب

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۷ باب الحساب، فصل ثالث۔ انه ليخفف على المؤمن حتى يكون اهون عليه من الصلاة المكتوبة يصليها فى الدنيا۔

حضرات موجود ہوتے ہیں، لیکن ایک کے اُوپر اچھے حالات ہوتے ہیں تو اس کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کیسے گزر گیا، جیسے آپ کہا کرتے ہیں کہ:

''مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں''

اور دُوسرا کسی پریشانی میں مبتلا ہے تو اس کو ایسے معلوم ہوگا کہ جیسے ایک ایک منٹ جو ہے وہ گھنٹوں کے برابر ہو رہا ہے۔

''مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں''

(اقبالؒ)

یہ واقعی اپنا اپنا تأثر ہوتا ہے، ایک ہی جگہ پر بیٹھے ہوئے دو آدمی ہیں، اپنے اپنے حال کے اعتبار سے وقت کا تأثر ان کا علیحدہ علیحدہ ہے، کسی کا دن یوں گزر گیا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ چڑھا کب تھا اور غروب کب ہو گیا؟ اور کوئی ایک ایک منٹ کو اس طرح سے محسوس کرتا ہے کہ مہینوں لمبا ہو گیا، یہ وقت گزرتا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ تو جب حضور ﷺ نے قیامت کے دن کے متعلق بیان فرمایا کہ مؤمنین کے لئے وہ ایسا ہوگا جیسے ایک نماز کے بعد دُوسری نماز کا وقت آجاتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ اس کو ہزار سال کے برابر قرار دیا، اور ایک جگہ اس کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا، تو یہ مختلف گروہوں کے لئے اُس کے متعلق تأثر علیحدہ علیحدہ ہوگا، کسی کے نزدیک وہ وقت جلدی گزر جائے گا، کسی کے نزدیک وہ بہت لمبا ہوگا، کسی کے نزدیک اُس سے بھی زیادہ لمبا ہوگا۔ اور ہزار سال اور پچاس ہزار سال یہ محاورۃً طول بیان کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں، اُردو میں بھی آپ سنتے رہتے ہیں:

تم سلامت رہو ہزار برس　　　　ہر برس کے ہوں دِن پچاس ہزار

یہ غالبؔ کا شعر ہے، کسی کو دُعا دیتا ہوا یہ کہتا ہے، ہزار برس تم زندہ رہو اور ہر برس کے دِن پچاس ہزار ہوں، تو یہ صرف طویل عمر کی دُعا دینا مراد ہے، یہ الفاظ حقیقت پر محمول نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اللہ کی کلام میں اگر اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو ہم یوں ہی کہیں گے کہ حقیقتِ حال اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ بظاہر اس کی توجیہ یہی ہے کہ یہ اضافی چیز ہے، کسی کو وہ دن کتنا لمبا لگے گا، کسی کو وہ دِن کتنا لمبا لگے گا، تین باتیں سامنے آجانے کے بعد یہ توجیہ بالکل الفاظ پر منطبق ہوتی ہے، کہ حدیث شریف میں آگیا کہ مؤمن کو یہ اتنا سا معلوم ہوگا جیسے نماز کا وقت گزر جاتا ہے، اور قرآنِ کریم میں اس کے متعلق دو اندازے آگئے، ایک ہزار سال کا، دُوسرا پچاس ہزار سال کا، تو اس سے معلوم ہو گیا کہ اس کا طول یا اس کا چھوٹا ہونا یہ اضافی چیز ہے، خوش حال لوگوں کے لئے وہ ایسے ہوگا جیسے چند لمحوں میں گزر گیا، اور بدحال لوگوں کے لئے ایسے ہو گیا جیسے ہزار سال ہو گیا، کسی کے لئے ایسا ہوگا جیسے پچاس ہزار سال، باقی! حقیقتِ حال اللہ جانتے ہیں...... اور اگر فِیْ یَوْمٍ کو تَعْرُجُ کے متعلق ہی کر لیا جائے تو پھر بھی وہی! قیامت کی طرف اشارہ ہے (آلوسی)، کیونکہ قیامت کے دِن فرشتے بھی اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے، جبریل بھی پیش ہوں گے، ''چڑھیں گے اس کی طرف فرشتے اور رُوح ایسے دن میں کہ جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے۔''

قیامت بہت قریب ہے

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا: پس آپ اچھی طرح سے صبر کیجئے، صبر کیجئے صبرِ جمیل، اور صبرِ جمیل وہ ہوتا ہے کہ جس کے اندر بالکل شکایت کا نام ونشان نہ ہو، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ یہ لفظ سورۂ یوسف کے اندر بھی آیا تھا۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا: بے شک یہ لوگ تو اس دن کو بعید سمجھتے ہیں، بعید سے مراد ہے بعید اَز اِمکان، ان کے نزدیک تو ممکن ہی نہیں کہ ایسا دن آجائے، وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا: ہم اس کو قریب ہی سمجھ رہے ہیں کہ بالکل قریب الوقوع ہے، یہ اس کو اِمکان سے بعید سمجھتے ہیں، بعید الوقوع سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں ایسا دن کیسے ہوسکتا ہے، یہ تو بہت دُور کی بات ہے، جس طرح سے سورۂ مؤمنون میں آیا تھا هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (آیت:۳۶)، یہ اس کو بعید اَز اِمکان سمجھتے ہیں اور ہم اس کو بالکل ہی قریب الوقوع دیکھ رہے ہیں۔

قیامت کی ہولناکی اور مختلف مناظر

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ: جس دن کہ ہوجائے گا آسمان تلچھٹ کی طرح، مُہل کہتے ہیں تیل کے نیچے جو میل کچیل بیٹھ جایا کرتی ہے، وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ: اور ہوجائیں گے پہاڑ عہن کی طرح، عہن کہتے ہیں رنگین اُون کو، رنگی ہوئی اُون، جیسے كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ سورۂ قارعہ کے اندر لفظ آئے گا، رنگین اُون جو کہ جو دھنکی ہوئی ہو، جس کو دھنک لیا گیا ہو، تو پہاڑ بھی جس وقت رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑیں گے تو آپ جانتے ہیں کہ پہاڑوں کے اندر بھی مختلف قسم کے پتھر ہیں، سیاہ بھی ہیں، سرخ بھی ہیں، سفید بھی ہیں، بھورے بھی ہیں، تو جس وقت سارے کے سارے دھنکی ہوئی رُوئی کی طرح اُڑیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے یہ رنگین اُون ہے، ''ہوجائیں گے پہاڑ رنگی ہوئی اُون کی طرح'' وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا: اور کوئی دوست کسی دوست کو پوچھے گا بھی نہیں، یہاں پوچھنا ہمدردی کے معنی میں ہے، کوئی دوست کسی دوست کے ساتھ ہمدردی نہیں کرے گا، اور یہ جو آیا تھا کہ قیامت کے دن آپس میں ایک دُوسرے سے سوال کریں گے وہ سوال کرنا آپس میں ڈانٹ ڈپٹ اور ایک دُوسرے کو نادم اور شرمسار کرنے کے لئے ہے، اور یہاں ہے سوال کرنا حال پوچھنا ہمدردی کے طور پر'' کوئی دوست کسی دوست کا حال نہیں پوچھے گا'' يُبَصَّرُوْنَهُمْ: اور وہ آپس میں ایک دُوسرے کو دکھائے جائیں گے، یعنی یہ کہ دوستوں کے ساتھ ملاقات نہیں ہوگی، آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہوں گے، لیکن ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہوگی، کوئی کسی کا حال نہیں پوچھے گا، حال پوچھنا بطور ہمدردی کے، ''نہیں پوچھے گا کوئی دوست کسی دوست کو'' يُبَصَّرُوْنَهُمْ: حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دِکھائے جائیں گے، يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ: چاہے گا مجرم کہ فدیہ دے دے وہ اس دن کے عذاب سے اپنے بیٹوں کے ساتھ، اپنی بیوی کے ساتھ، اپنے بھائی کے ساتھ، اپنے کنبے قبیلے کے ساتھ، فصیلہ خاندان کو کہتے ہیں، ''ایسا خاندان کہ جو دُنیا میں اس کو ٹھکانا دیتا ہے'' وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: اور ان سب لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں، ثُمَّ يُنْجِيْهِ: پھر اس کا فدیہ دینا اس کو عذاب سے چھڑالے، ہر مجرم کے دل میں تمنا ہوگی کہ آج اگر میں اپنی بیوی کو پیش کرکے، بیٹوں کو پیش کرکے، بھائیوں کو پیش کرکے، خاندان قبیلے کو پیش کرکے حتیٰ کہ جتنے بھی لوگ زمین میں ہیں سب کو پیش کرکے

بھی اگر چھوٹ جاؤں تو مجھے یہ منظور ہے، وہ فدیہ دے کر چھوٹنا چاہے گا، لیکن کون وہاں فدیہ دے اور کون لے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ آج بیٹوں کی محبت میں، بیوی کی محبت میں، بھائیوں کے تعلقات سے اور اپنے خاندان کی مجبوریوں سے تم لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور اس راستے کو اختیار نہیں کرتے، اللہ کی نافرمانی دُنیا میں انسان اختیار کرتا ہے تو یہی چیزیں اس کے لئے مانع بنتی ہیں اللہ کی فرماں برداری اختیار کرنے سے، کبھی اولاد کی محبت، کبھی بیوی کا تعلق، کبھی بھائی چارہ، برادری کی مجبوری، کبھی خاندان کے تعلقات آڑے آجاتے ہیں، اور اس طرح سے دُنیا میں دُوسرے حالات معاملات دوست احباب کے ساتھ جیسے تعلقات ہوا کرتے ہیں وہ سب مانع آجاتے ہیں، آج ان کا لحاظ کرتے ہوئے تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی فرماں برداری اختیار نہیں کرتے، کل تم چاہو گے کہ ان سب کو جہنم میں جھونک کر خود چھوٹ جاؤ۔

جہنم کا منظر

كَلَّا: ایسا ہرگز نہیں ہوگا، یہ فدیہ دے کر کوئی مجرم جان نہیں چھڑا سکے گا، إِنَّهَا لَظَىٰ: ھا سے نار مراد ہے جس کے اُوپر عذاب دلالت کررہا ہے، بے شک وہ آگ شعلہ زن ہے، لظی کہتے ہیں خالص شعلے کو جس کے اندر کسی دُوسری چیز کی ملاوٹ نہ ہو، "بے شک وہ آگ ہے شعلے مارتی ہوئی" نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ: شوی یہ شَوَاۃ کی جمع ہے، شواۃ سر کے چمڑے کو کہتے ہیں، اعضا کے چمڑے کو کہتے ہیں، یہاں کھال مراد ہوجائے گی، تو نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ کا معنی یہ ہوگا کہ وہ آگ شعلہ زن ہے، کھینچ لینے والی چمڑے، وہ تو کھال اُتار لے گی، نَزَّاعَةً: کھینچنے والی ہے، لِّلشَّوَىٰ: چمڑوں کو، کھالوں کو اُتارنے والی ہے، تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ: بلائے گی وہ اس شخص کو جس نے پیٹھ پھیری، وَتَوَلَّىٰ: اور چلا گیا، جو تصدیق کرنے سے پیٹھ پھیرتا ہے اور اطاعت سے اعراض کرتا ہے ان سب کو وہ بلائے گی، وَجَمَعَ: جس نے کہ جمع کیا، فَأَوْعَىٰ: اور برتنوں میں ڈال ڈال کے رکھا، بوریاں بھر بھر کے، اَوعیٰ وِعاء سے ہے، وِعاء کا لفظ آپ کے سامنے سورۂ یوسف میں آیا تھا، وِعاء برتن کو، بوری کو اور گونی کو کہتے ہیں، "جمع کیا اور بوریوں میں بھر بھر کے رکھا، برتنوں میں ڈال ڈال کے رکھا" مطلب یہ ہے کہ بخیل تھے، جمع کرتے تھے اور خرچ نہیں کرتے تھے، مخلوق کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرتے تھے، اللہ کی اطاعت نہیں کی، رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری نہیں کی، مال اکٹھا کیا، جمع کر کر کے رکھا، ان سب لوگوں کو بلالے گی، دعوت دے گی، اور یہ اس کے بلانے پر آئیں گے، چھوٹ کر کہیں جا نہیں سکتے۔

اِنسان بے ہمت ہے

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا: ھلوع کہتے ہیں تھڑ دلا، بے ہمت، "بے شک انسان پیدا کیا گیا ہے جی کا کچا" جیسے حضرت شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ کیا: جی کا کچا، بے ہمت، تھڑدلا، یہ بہت جلدی حالات سے متأثر ہوجاتا ہے، اسی کی تفصیل ہے اگلے جملوں میں إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ: جب اس کو کوئی شر پہنچتا ہے جَزُوعًا: تو یہ بے صبرا ہوجاتا ہے، چیخ و پکار کرنے لگ جاتا ہے، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ: جب اس کو کوئی بھلائی پہنچ جاتی ہے مَنُوعًا: تو بہت روکنے والا ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحاناً اگر اس کے اُوپر کوئی رزق کی تنگی

آ جائے تو پھر یہ واویلا مچا دیتا ہے، اور اگر اللہ کی طرف سے اس کو خیر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے حقوق ادا نہیں کرتا بلکہ بخیل بن کے بیٹھ جاتا ہے۔

کون سی صفات والے بے ہمت نہیں ہوتے

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ: یہ اِنَّ الْاِنْسَانَ سے گویا کہ مستثنیٰ کر لیا گیا، "سوائے نمازیوں کے" مصلین سے یہاں مؤمنین مراد ہیں، جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں، ان کا عمل دُرست ہوتا ہے، نماز پڑھنے والے ہوتے ہیں، ان کے حالات ایسے نہیں ہیں اگر ان کو کوئی شر پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتے ہیں، خیر پہنچتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، اور مخلوق کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں، وہ ایسے تھڑدلے نہیں ہوتے، ایسے کم ہمت نہیں ہوتے، تو گویا کہ انسان کو ہمت اگر نصیب ہوتی ہے، دل میں مضبوطی اگر آتی ہے تو وہ بھی ایمان اور صلاۃ سے مصلین کے عنوان سے یہاں جو مؤمنین کو ذکر کیا جا رہا ہے تو اس میں نماز کی اہمیت بھی نمایاں ہے کہ ایمان کی اوّل نشانی صلاۃ ہی ہے، "مگر جو نماز پڑھنے والے ہیں۔"

پہلی صفت: نماز پر دَوام

الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ: جو اپنی نماز کے اُوپر دَوام اِختیار کرتے ہیں، دَوام اختیار کرنے کا مطلب ہے کہ ہمیشہ پڑھتے ہیں یعنی جو وقت اُس کے لئے متعین کیا گیا ہے اس میں ناغہ نہیں کرتے، ہمیشہ پڑھنے کا یہی معنی ہوتا ہے، جس طرح سے کوئی شخص یہ کہے کہ میں ہمیشہ چائے پیتا ہوں، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چوبیس گھنٹے وہ چائے پیتا رہتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ معمول کے مطابق، تو معمول کے مطابق جو آدمی نماز پڑھتا رہے جو اللہ نے وقت متعین کیا ہوا ہے تو گویا کہ اس نے نماز کے اُوپر دَوام اِختیار کر رکھا ہے۔ یا دَوام کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے وہ اپنی نظر اور اپنے خیالات کو نماز پر ہی بند رکھتے ہیں، دَوام کا یہ معنی بھی ذِکر کیا گیا ہے، نماز پر متوجہ رہتے ہیں، کسی دُوسری چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، یعنی جب تک نماز پڑھتے ہیں تو ان کی توجہ کا دَوام نماز پر ہی ہوتا ہے (آلوسی)، پھر اس کا مفہوم وہ نقل کیا گیا ہے جو هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ کا مفہوم ہے، چونکہ یہ آیات اُنہی آیات کے ساتھ ہی ملتی جلتی ہیں جو اٹھارویں پارے کی اِبتدا میں آپ کے سامنے آئیں، اور آگے لفظ آئے گا يُحَافِظُوْنَ کا، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، تو محافظت سے مراد ہوگا کہ اس کے آداب کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو اچھے طریقے سے ادا کرتے ہیں، اس کی نگہبانی کرتے ہیں، نماز کا خیال رکھتے ہیں، اچھی طرح سے پڑھتے ہیں، محافظت کا یہ معنی آ جائے گا۔

دُوسری صفت: صدقے کا اِہتمام

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ: یہ نمازیوں کی دُوسری صفت آ گئی، "ان کے مالوں میں معلوم حق ہے" یعنی حق ہے معلوم، متعین، "سائلوں کے لئے بھی اور محروم کے لئے بھی" سائل ہو گئے سوال کرنے والے، محروم سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو ہیں محتاج لیکن سوال نہیں کرتے، اس لیے اکثر و بیشتر وہ محروم رہ جاتے ہیں، تو یہ محروم کا لفظ بول کے متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ایسے لوگ جو

اپنی خودداری کی بنا پر اور عزتِ نفس کی بنا پر کسی کے سامنے حاجت ظاہر نہیں کرتے، اس لیے وہ عام طور پر لوگوں کی اِعانت سے اور اِمداد سے محروم رہ جاتے ہیں، اُن کے لئے بھی اِن کے مالوں میں حق ہے، اور ایسے لوگوں کو تلاش کر کے اعانت کرتے ہیں۔ اور یہ جو دیتے ہیں تو کوئی احسان نہیں کرتے، بلکہ اس میں وہ اِن مساکین کا حق سمجھتے ہیں، مصلین کی یہ صفت ہے۔

تیسری صفت: آخرت پر یقین

وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ: یہ مصلین وہ لوگ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں، اس کو سچا قرار دیتے ہیں، کہ واقعی جزا کا دِن آنے والا ہے، اور یہی ہے حقیقت کے اعتبار سے خیالات میں مرکزی نقطہ جس کے ذریعے سے عمل میں صحت پیدا ہوتی ہے، کہ انسان کے سامنے ہر وقت یہ بات رہے کہ جزا کا دِن بھی آنے والا ہے، مصلین کے اندر یہ صفت بھی موجود ہے، چونکہ مؤمنین ہی مراد ہیں، اس لیے وہ ساری صفتیں ذِکر کی جارہی ہیں، اور مؤمنین کو مصلین کے عنوان سے ذِکر کیا نماز کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لئے۔

چوتھی صفت: عذاب کا خوف

وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ: اور یہ مصلین وہ لوگ ہیں جو کہ اپنے رَبّ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں، نماز پڑھ کے بےخوف نہیں ہوجاتے، بلکہ ہر وقت اپنے رَبّ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ: یہ درمیان کے اندر جملہ معترضہ ہے، ''بےشک اُن کے رَبّ کا عذاب بےخوف ہونے کی چیز نہیں'' عذاب غیرِ مامون ہے، امن کی چیز نہیں ہے، بےخوف ہونے کی چیز نہیں۔

پانچویں صفت: شرم گاہوں کی حفاظت

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ: اور یہ مصلین وہ ہیں جو اپنے فروج کی حفاظت کرنے والے ہیں، شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ: مگر اپنی بیویوں پر، اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ: یا باندیوں پر، جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، ''پس بےشک وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں'' یعنی اگر قضائے شہوت یہاں کرتے ہیں دو مقام میں، یعنی ایک باندیاں اور ایک بیوی، تو یہاں کوئی ملامت نہیں، کوئی اِلزام نہیں، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ: اور جو اس کے علاوہ کوئی جگہ تلاش کرتا ہے قضائے شہوت کے لئے، اب جتنی بھی قضائے شہوت کی چیزیں ہیں وہ سب اِس میں آگئیں، لواطت آگئی، زِنا آگئی، اِستمناء بالید آگیا، اور جو بھی صورت اختیار کی جائے، وطی بالبہیمہ آگیا، سب صورتیں اِس میں آجائیں گی ''جو کوئی طلب کرتا اس کے علاوہ کسی اور جگہ کو'' فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ: پس یہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

چھٹی اور ساتویں صفت: امانت اور عہد کا خیال، اور گواہی کی صحیح ادائیگی

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ: اور یہ نمازی وہ لوگ ہیں جو کہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت رکھنے والے

ہیں، کسی کے ساتھ عہد کرلیں تو اس کی رعایت بھی رکھتے ہیں، اور کسی کا کوئی حق ان کے ذمے لگا ہوا ہو، ہر حق عموم کے طور پر امانت کا مصداق ہوتا ہے، کوئی آپ کے پاس امانت رکھ دیتا ہے وہ بھی امانت ہے، اور کسی کا کوئی حق آپ کے ذمے لگا ہوا ہے تو وہ بھی اس کی امانت ہے جو آپ کے ذمے ادا کرنی ضروری ہے، ''وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت رکھنے والے ہیں۔'' وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ: اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی گواہیوں کے ساتھ قائم ہونے والے ہیں، یعنی گواہی دینی پڑ جائے تو بالکل صحیح دیتے ہیں، قائم بالشہادۃ ہیں۔

آٹھویں صفت: نمازوں کی پابندی

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ: اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں، اُن کی حفاظت کرتے ہیں، نگرانی کرتے ہیں، وقت پہ ادا کرتے ہیں اور اس کی شرائط اور آداب کی رعایت رکھتے ہوئے ادا کرتے ہیں، تو دائمون کا معنی ہو جائے گا ہمیشہ پڑھتے ہیں اور یُحَافِظُوْنَ کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ صحیح طریقہ سے پڑھتے ہیں، پوری طرح سے خیال رکھ کے ادا کرتے ہیں۔ اور اگر دائمون کا وہ مفہوم لے لیا جائے جو دُوسرا آپ کے سامنے ذِکر کیا کہ نماز پڑھتے ہوئے اپنی توجہ کو نماز میں دائم رکھتے ہیں، تو پھر یہ نماز کے حال سے متعلق ہو جائے گا اور یُحَافِظُوْنَ میں یہ بات آ جائے گی کہ وقت کا خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ پڑھتے ہیں، آداب وغیرہ کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ: یہ لوگ جنت میں عزت کیے جائیں گے، ان کا اِکرام کیا جائے گا، یہ مکرم لوگ ہیں۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ

پس کیا ہو گیا ان لوگوں کو جنہوں نے انکار کیا، آپ کی طرف بھاگے ہوئے آتے ہیں ﴿۳۶﴾ دائیں جانب سے اور بائیں جانب سے

عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا

مختلف ٹولیوں کی صورت میں ﴿۳۷﴾ کیا اُمید رکھتا ہے ان میں سے ہر شخص کہ وہ داخل کر دیا جائے گا خوش حالی کے باغ میں؟ ﴿۳۸﴾ ہرگز نہیں، بے شک

خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا

ہم نے ان کو پیدا کیا اس چیز سے جس کو یہ جانتے ہیں ﴿۳۹﴾ پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رَبّ کی، بے شک ہم

لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ

البتہ قدرت رکھنے والے ہیں ﴿۴۰﴾ اس بات پر کہ بدل کے لے آئیں ان سے بہتر لوگ، اور ہم عاجز نہیں ﴿۴۱﴾ چھوڑیے انہیں،

يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝٤٢ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ

لگے رہیں، کھیلتے رہیں، حتّٰی کہ ملاقات کریں یہ اس دن سے جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں ۝۴۲ جس دن کہ نکلیں گے یہ

الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝٤٣ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ

قبروں سے جلدی کرتے ہوئے گویا کہ یہ گاڑے ہوئے پتھروں کی طرف بھاگتے ہیں ۝۴۳ جھکنے والی ہوں گی ان کی آنکھیں،

تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝٤٤

ڈھانپ لے گی ان کو ذلت، یہ وہ دن ہے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے تھے ۝۴۴

تفسیر

کافروں کی بدکرداری

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ: پس کیا ہو گیا ان لوگوں کو جنہوں نے انکار کیا، جو کافر لوگ ہیں، آپ کی طرف بھاگے ہوئے آتے ہیں مُهْطِعِيْنَ قِبَلَكَ۔ قِبَلَكَ یہ مفعول فیہ مُهْطِعِيْنَ کا ہے، ''بھاگے ہوئے آتے ہیں آپ کی جانب دائیں جانب سے اور بائیں جانب سے'' عِزِيْنَ: مختلف ٹولیوں کی صورت میں، یہاں عِزِيْنَ سے مختلف ٹکڑے اور جماعتیں مراد ہیں، ''جماعت در جماعت دائیں بائیں طرف سے آپ کی طرف بھاگے ہوئے آتے ہیں یہ کافر لوگ'' جس طرح سے وہ تکلیف پہنچانے کے لئے آتے تھے، تکذیب کرنے کے لئے آتے تھے، شور مچانے کے لئے آتے تھے، باتیں سُن کر مذاق اُڑاتے۔

کافروں کی جھوٹی اُمیدوں کی تردید

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ: کیا امید رکھتا ہے ان میں سے ہر شخص کہ داخل کر دیا جائے گا خوش حالی کے باغ میں، جیسے وہ کہا کرتے تھے کہ اوّل تو آخرت ہو گی نہیں، اگر ہو گی تو ہم وہاں بھی خوش حال ہی ہوں گے، تو یہ لوگ اس قسم کی اُمید رکھتے ہیں؟ كَلَّا: ہرگز نہیں، اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ: بے شک ہم نے ان کو پیدا کیا اس چیز سے جس کو یہ جانتے ہیں، ان کو اپنی پیدائش تو معلوم ہے، مٹی سے پیدا کیے گئے، نطفے سے پیدا کیے گئے، خون سے پیدا کیے گئے، ذاتی کمال تو ان میں کوئی بھی نہیں، جنت اگر حاصل ہو گی تو اس خلقی طور پر حاصل نہیں ہو گی کہ یہ انسان ہیں، فلاں چیز سے بنے ہیں، اس میں تو آپ جانتے ہیں کہ کسی میں کوئی فرق ہی نہیں، دیکھنا تو یہ ہے کہ اِس پیدا ہونے کے بعد پھر انہوں نے کیا کردار اختیار کیا؟ کیا اعمال اختیار کیے؟ اُن اعمال اور کردار کی بنا پر جنت ملے گی، کسی انسان کے لئے پیدائشی طور پر جنت کا حق نہیں ہے کہ وہ جو چاہے کرتا رہے، اور کہے کہ میں جنت

میں چلا جاؤں گا، ''ہم نے انہیں پیدا کیا اُس چیز سے جس کو یہ جانتے ہیں'' یعنی پیدائشی طور پر تو ان کے اندر کوئی ایسا کمال نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ان کو جنت میں بھیج دیا جائے، پیدائشی طور پر تو سارے انسان مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں، بلکہ اس سلسلے میں تو حیوان بھی انسان کے ساتھ شریک ہے، وہ بھی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، دیکھنا تو یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد کس کا کردار کیسا ہے، جنت کردار کی بنا پر ملے گی، اعمال اور عقائد کی بنا پر ملے گی، صرف ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کوئی شخص جنت کا حق دار نہیں ہوتا۔ اور یا اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّمَّا یَعْلَمُوْنَ میں اِمکانِ آخرت کو بیان کیا جا رہا ہے، کہ یہ جو آخرت کا انکار کرتے ہیں تو ان کو پتا ہونا چاہیے کہ ہم نے مٹی سے ان کو پیدا کیا ہے، اور جب ہم مٹی سے پیدا کر سکتے ہیں تو دوبارہ ان کو لا بھی سکتے ہیں، دوبارہ اُٹھا بھی سکتے ہیں۔ ''بے شک ہم نے ان کو پیدا کیا اُس چیز سے جس کو یہ جانتے ہیں۔''

پوری کائنات پر اللہ کے تصرفات اِمکانِ آخرت کی دلیل ہیں

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ: پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رَبّ کی، ''لا'' اُسی طرح سے اس بات کی تردید ہے جس کے رَدّ کے اندر یہ قسم کھائی جا رہی ہے، یہ جو کہتے ہیں آخرت نہیں ہوگی یا ہم جنت کے حق دار ہیں، نہیں نہیں! بالکل نہیں!، میں رَبُّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ کی قسم کھاتا ہوں، ''بے شک ہم البتہ قدرت رکھنے والے ہیں اس بات پر کہ بدل کے لے آئیں اِن سے بہتر لوگ، اور ہم مسبوق نہیں'' یعنی عاجز نہیں، یہ ہم سے چھوٹ کے کہیں بھاگ نہیں سکتے، ہم یہاں بھی اِن سے بہتر لوگ لا سکتے ہیں، تو ان کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا یہ ہمارے اِمکان سے باہر کس طرح سے ہے، یہ جو کہتے ہیں آخرت نہیں ہوگی، بالکل یہ بات نہیں ہے، مشرقوں اور مغربوں کا رَبّ اِس بات پہ گواہ ہے کہ ہمیں قدرت حاصل ہے، مشرقوں اور مغربوں کی طرف نسبت کر کے ساری کائنات کے تصرف کی طرف آپ کو متوجہ کر دیا گیا، کہ مشرقوں کی طرف دیکھو، مغربوں کی طرف دیکھو، اللہ تعالیٰ کے کیسے کیسے تصرفات نمایاں ہیں، تو یہ تصرفات دلیل ہیں اس بات کی کہ ہمیں ہر طرح سے قدرت حاصل ہے۔

قیامت کے دِن منکرین کی حالت

فَذَرْھُمْ یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا: چھوڑ یے انہیں، لگے رہیں، کھیلتے رہیں، حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَھُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ: حتیٰ کہ ملیں یہ اُس دِن سے، ملاقات کریں یہ اُس دِن سے جس کا کہ وعدہ دیے جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آپ کے سمجھائے ہوئے نہیں سمجھتے تو ان کو اپنے مشغلوں میں لگے رہنے دیجئے۔ یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا: جس دِن کہ نکلیں گے یہ قبروں سے بھاگتے ہوئے، اَجداث جَدَث کی جمع ہے، سورۂ یٰس کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا، ''جس دِن کہ نکلیں گے یہ قبروں سے جلدی کرتے ہوئے'' کَاَنَّھُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ: یُوْفِضُوْنَ: بھاگتے ہیں، اَوْفَضَ اِیْفَاض، اور نُصُب: گاڑے ہوئے پتھروں کو کہتے ہیں، اور یہاں گاڑے ہوئے پتھروں سے مراد ہیں جو لوگ دوڑ لگانے کے لئے کوئی نشان متعین کر لیتے ہیں، ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر آئی ہے (طبری) کہ جس طرح سے دوڑ لگاتے ہوئے کسی پتھر کی طرف یہ بھاگ کر جاتے ہیں کہ وہاں پہلے کون پہنچے، پورا زور لگا کر، پورا زور صَرف کر کے

بھاگتے ہیں، تو جس وقت نفخ صور ہوگا تو قبروں سے اُٹھ کر یہ اسی طرح سے بے تحاشا بھاگیں گے، جو آج کہتے ہیں کہ اُٹھیں گے نہیں، اُس دن ایسے بھاگیں گے کہ ان کے اوسان خطا ہو جائیں گے، ان کو ہوش نہیں رہے گی۔ اور نصب سے اگر گاڑے ہوئے پتھر مراد ہوں جن کی وہ عبادت کرتے تھے تو یہ بھی بعض تفاسیر میں ذکر کیا گیا ہے (مظہری)، جس طرح سے صبح صبح اُٹھ کر یہ اپنے عبادت خانوں کی طرف دوڑتے ہیں اسی طرح سے قبروں سے نکل کر یہ میدانِ حشر کی طرف آئیں گے، "نکلیں گے یہ اپنی قبروں سے جلدی کرتے ہوئے گویا کہ یہ گاڑے ہوئے پتھروں کی طرف بھاگتے ہیں، جھکنے والی ہوں گی ان کی آنکھیں، ڈھانپ لے گی ان کو ذلت" ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ: یہ وہ دن ہے جس کا کہ وہ وعدہ دیے جاتے تھے۔

اٰیاتھا ۲۸ ۷۱ سُوْرَةُ نُوْحٍ مَكِّيَّةٌ ۷۱ رکوعاتھا ۲
سورۂ نوح مکہ میں نازل ہوئی اس کی ۲۸ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے
اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ
بے شک ہم نے نُوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ ڈراؤ اپنی قوم کو قبل اس کے کہ ان کے پاس دردناک عذاب
اَلِيْمٌ ۝۱ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ
آجائے ۝ نُوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! بے شک میں تمہارے لیے صریح ڈرانے والا ہوں ۝ کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اور اسی سے ڈرو اور
اَطِيْعُوْنِ ۝۳ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ
میرا کہنا مانو ۝ اللہ بخش دے گا تمہیں تمہارے گناہ، اور مہلت دے گا تمہیں ایک وقتِ معین تک، بے شک اللہ کا متعین کیا ہوا
اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ
وقت جب آجاتا ہے تو پیچھے نہیں ہٹایا جاتا، کیا ہی اچھا ہو کہ تم جان لو ۝ نُوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بے شک میں نے اپنی قوم کو بلایا
لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ
رات اور دن ۝ نہیں زیادہ کیا ان کو میرے بلانے نے مگر بھاگنا ۝ اور بے شک میں نے جب بھی ان کو دعوت دی تا کہ تُو انہیں بخش دے

جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا

تو کرلیں انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں، اور لپیٹ لیا اپنے کپڑوں کو، اور انہوں نے اِصرار کیا، اور تکبر کیا

اسْتِكْبَارًا ۚ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ

تکبر کرنا ○ پھر میں نے ان کو علی الاعلان بلایا ○ پھر میں نے ان کے لئے اعلان کیا اور ان کے لئے پوشیدہ طور پر چپکے چپکے

اِسْرَارًا ۙ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ

بات بھی کی ○ میں نے انہیں کہا کہ تم اپنے رَبّ سے معافی مانگو، بے شک وہ بخشنے والا ہے ○ بھیجے گا بادل

عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ

تم پر بہت برسنے والا ○ اور مدد دے گا تمہیں مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ، اور کردے گا تمہارے لیے باغات، اور کردے گا

لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ○

تمہارے لیے نہریں ○ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کے لئے عظمت کا عقیدہ نہیں رکھتے ○ حالانکہ اس نے پیدا کیا تمہیں مختلف احوال میں ○

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ

کیا تم دیکھتے نہیں کیسے پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو اُوپر نیچے ○ اور بنایا اللہ نے چاند اِن آسمانوں میں نُور، اور

جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ○ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ

بنایا سورج ایک جلتا ہوا چراغ ○ اور اللہ تعالیٰ نے اُٹھایا تمہیں زمین سے اُٹھانا ○ پھر لوٹائے گا اللہ تمہیں اسی زمین میں اور پھر

يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ○ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ○

نکالے گا تمہیں نکالنا ○ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا ○ تاکہ تم اس زمین سے کشادہ کشادہ راہوں میں چلو ○

سورت کا مضمون

سورۂ نُوح مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۲۸ آیتیں ہیں، ۲ رُکوع ہیں۔ اوّل سے لے کر آخر تک یہ ساری کی ساری سورت حضرت نُوح علیہ السلام کے واقعے پر مشتمل ہے جو آپ کے سامنے بارہا گزر چکا، توحید، رسالت، معاد تینوں مضمون حضرت نُوح علیہ السلام کی تقریر کے تحت اس میں آرہے ہیں۔

تفسیر

نُوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ: ”بے شک ہم نے نُوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، یہ پیغام دے کر کہ ڈراتُو اپنی قوم کو قبل اس کے کہ ان کے پاس دردناک عذاب آجائے، نُوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! بے شک میں تمہارے لیے صریح ڈرانے والا ہوں“ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ: اُس ڈرانے میں تمہیں یہ بات کہتا ہوں کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، میں اللہ کی طرف سے رسول اور نمائندہ بن کے آیا ہوں میری اطاعت کرو، يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ: جب تم یہ صورت اختیار کرلو گے کہ اللہ کی عبادت کرو گے اور میری اطاعت کرو گے، جیسے نبی کا حق اطاعت ہے اور اللہ کا حق عبادت ہے، اللہ کا حق ادا کرو اور میرا حق ادا کرو تو اللہ کی طرف سے تمہارے ساتھ یہ معاملہ ہوگا کہ اللہ بخش دے گا تمہیں تمہارے گناہ، مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ یہ کئی دفعہ آپ کے سامنے ذکر ہوا کہ مِن کو زائد بنالیا جائے تو ٹھیک ہے، اور تبعیضیہ بنالیا جائے تو ٹھیک ہے، کیونکہ ایمان لانے کے ساتھ حقوق اللہ معاف ہوتے ہیں، حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، اس لیے بعض گناہ بھی مراد لیے جاسکتے ہیں، ”بخش دے گا اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے کچھ گناہ“ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى: اور تمہیں ایک وقتِ معین تک مہلت دے گا، اس وقتِ معین سے موت کا وقت مراد ہے، مہلت دینے کا مطلب یہ ہے کہ عافیت سے تمہارا وقت گزرے گا تم عذاب کا نشانہ نہیں بنو گے، باقی! موت، موت تو وقت پہ آنی ہے، وہ تو کسی صورت میں ٹل نہیں سکتی، ”مہلت دے گا تمہیں وہ ایک وقتِ معین تک، بے شک اللہ کا متعین کیا ہوا وقت جب آجائے گا تو پیچھے نہیں ہٹایا جاتا، لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ تم اِن باتوں کو جان لو، ان کا علم حاصل کرلو۔

نُوح علیہ السلام کی بے مثال دعوت، اور قوم کی ہٹ دھرمی کی اِنتہا

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا: نُوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بے شک میں نے اپنی قوم کو بُلایا رات اور دِن، رات دِن ہر وقت میں نے ان کو دعوت دی، اور یہ واقعہ بہت مفصل آپ کے سامنے گزر چکا ہے کہ نُوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال قوم کو دعوت دی، وقت کے لحاظ سے کوئی وقت نہیں چھوڑا، کوئی انداز نہیں چھوڑا، تنہا تنہا بھی لوگوں کو بُلایا، مجمعوں کے اندر بھی وعظ کہی، خلوت میں بھی وعظ کہی، چپکے چپکے بھی کہا، جہاراً بھی کہا، جو طریقہ بھی سمجھانے کا اختیار کیا جاسکتا تھا نُوح علیہ السلام نے اختیار کیا، آخر تھک ہار کے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ فریاد کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب یہ اطلاع مل گئی کہ اب تیری قوم میں اور کوئی ایمان لانے والا نہیں، جنہوں نے ایمان لانا تھا وہ لے آئے، جیسے سورۂ ہود کے اندر صراحت ہے، تب پھر حضرت نُوح علیہ السلام نے دُعا کی کہ یا اللہ! پھر ان فاسقوں، فاجروں کو باقی رکھنے کا کیا فائدہ؟ پھر ان کو تباہ و برباد کردے، جس کے نتیجے میں وہ سارے کے سارے پانی میں ڈُبو دیے گئے۔ ”کہا نُوح علیہ السلام نے کہ اے میرے رَبّ! بے شک میں نے پکارا اپنی قوم کو رات اور دِن“ فَلَمْ

یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ: نہیں زیادہ کیا ان کو میرے بُلانے نے، دُعَآءِیْٓ میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے، میں جو ان کو دعوت دیتا تھا تو "میرے بُلانے نے نہیں زیادہ کیا ان کو مگر بھاگنا" میں جتنا ان کو بُلاتا ہوں، جتنی ترغیب دیتا ہوں اتنے ہی وہ بِدکتے ہیں، اتنے ہی بھاگتے ہیں، وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ: اور بے شک میں نے جب کبھی ان کو دعوت دی تاکہ تُو انہیں بخش دے، جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ: کرلیں انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں، یعنی میری بات سننا نہیں چاہتے، میں بات کرتا ہوں، دعوت دیتا ہوں، دعوت بھی اس لیے دیتا ہوں تاکہ وہ سیدھے ہوجائیں تو تُو انہیں بخش دے، تو اُنگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں، میری آواز سننا نہیں چاہتے، "اور لپیٹ لیتے ہیں اپنے کپڑوں کو" جس طرح سے انسان دُوسرے سے نفرت کرتا ہوا اپنے منہ پر کپڑا ڈال لیتا ہے، وَاَصَرُّوْا: اور انہوں نے اِصرار کیا، ضد کی، وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا: اور تکبر کیا تکبر کرنا، اپنے خیالات پہ اڑے ہوئے ہیں اور میرے مقابلے میں تکبر کررہے ہیں، ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا: پھر میں نے ان کو علی الاعلان بُلایا، جِهَارًا: جَهْرًا أَمُجَاهَرَةً، پھر میں نے ان کو دعوت دی برملا، "پھر میں نے ان کے لئے اعلان کیا، اور اُن کے لئے پوشیدہ طور پر چپکے چپکے بات بھی کی" مطلب یہ ہے کہ واعظ جس طرح سے مختلف انداز اختیار کیا کرتا ہے، کہ مجمعِ عام میں آواز اُونچی ہوتی ہے، علیحدہ انسان چپکے چپکے بات کرتا ہے، پھر علیحدہ بات کرتا ہے تو وہاں بھی کبھی آواز بُلند ہوجاتی ہے، تو جو انداز بھی سمجھانے کا اِختیار کیا جاسکتا تھا میں نے ان کے ساتھ وہ کیا ہے۔

اِستغفار کی برکات

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ: میں نے انہیں کہا کہ تم اپنے رَبّ سے معافی مانگو، اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا: بے شک وہ بخشنے والا ہے، يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا: بھیجے گا تم پر بارش مسلسل برسنے والی، سماء سے بادل مراد ہے، مدرار: برسنے والا، "بہت برسنے والا بادل تم پہ بھیجے گا"، اور وہ لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوگئے تھے، بارش نہیں ہورہی تھی، چونکہ یہ بارش کی بندش ان کے اُوپر بطورِ سزا کے تھی ان کے کُفر، شرک اور معصیت کی بنا پر، اس لیے حضرت نُوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ توبہ کرو، اِستغفار کرو، ایمان لے آؤ، تو اللہ تعالیٰ تمہاری یہ قحط سالی دُور کردے گا، "بھیجے گا وہ بادل تم پر بہت برسنے والا، اور مدد دے گا تمہیں مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ، اور کردے گا تمہارے لیے باغات، اور کردے گا تمہارے لیے نہریں" دُنیا کے اندر بھی خوش حالی ہوجائے گی اگر اللہ کے سامنے تم اِستغفار کرو اور اللہ پر ایمان لے آؤ۔

دلائلِ توحید اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا: یہ سب ان کے وعظ کے حصے ہیں، تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے عظمت کا عقیدہ نہیں رکھتے، وقار سے عظمت مراد ہے، اور رَجاء سے اِعتقاد مراد ہے، "کیا ہوگیا تمہیں کہ تم اللہ کے لئے عظمت کا عقیدہ نہیں رکھتے حالانکہ اس نے پیدا کیا تمہیں مختلف احوال میں" کبھی تم مٹی تھے، کبھی نطفہ تھے، کبھی خون تھے، اور پھر بچپن سے لے کر بڑھاپے تک

کتنی منزلیں انسان طے کرتا ہے، اَطْوَارًا کا مصداق یہ سب بن سکتی ہیں،'' پیدا کیا اس نے تمہیں طَوْرًا بعدَ طورٍ ایک حال سے دُوسرے حال کی طرف، مختلف حالات میں، طرح طرح سے تمہیں پیدا کیا۔'' اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا: کیا تم دیکھتے نہیں کیسے پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے سات آسانوں کو اُوپر نیچے، ابھی سورۂ مُلک میں اس کی تفصیل آئی تھی، وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا: اور بنایا اللہ نے چاند اِن آسانوں میں نُور، اور بنایا سورج کو ایک جلتا ہوا چراغ'' سراج: چراغ کو کہتے ہیں، اور نُور: روشنی کو کہتے ہیں، فِيْهِنَّ: یعنی بظاہر دیکھنے میں یہ آسمان میں معلوم ہوتے ہیں، ہمارے اسی احساس کی بنا پر اِن کو ذکر کیا، یہ ضروری نہیں کہ اُس میں جڑے ہوئے ہوں، یہ مضمون بھی کئی دفعہ آپ کے سامنے گزر گیا، فِيْهِنَّ سے مراد ہو گیا فِي جِهَتِهِنَّ، آسمانوں کی جانب، بظاہر دیکھنے میں چونکہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آسمانوں میں ہیں اس لیے اس کو اس طرح سے تعبیر کر دیا گیا،'' بنایا اللہ نے چاند ان میں نُور، اور بنایا اللہ نے سورج ایک جلتا ہوا چراغ''، وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا: اور اللہ نے اُٹھایا تمہیں زمین سے اُٹھانا، اَنْبَتَ اِنبات اُگانے کو کہتے ہیں، تو گویا کہ انسان بھی زمین سے ہی اُگایا گیا ہے، چونکہ آپ جانتے ہیں کہ غذا سے اس کی اِبتدا ہوتی ہے اور غذا زمین سے نکلتی ہے، تو اس کا بننا، اس کا بڑھنا، اس کا پھلنا پھولنا، سب اسی غذا کی بنا پر ہی ہے جو زمین سے آتی ہے، اس لیے حیوانات جتنے ہیں وہ بھی سب زمین سے نکلتے ہیں، تو اِنسان جتنے ہیں وہ بھی زمین سے نکلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی صنعت اور اس کی قدرت کے تحت،'' اُگایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین سے اُگانا'' لیکن اپنے اپنے انداز میں، جو بھی اُگانے کا طریقہ ہے، بنانا اور پیدا کرنا مراد ہے، ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ: پھر لوٹائے گا اللہ تعالیٰ تمہیں اسی زمین میں، وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا: اور پھر نکالے گا تمہیں نکالنا، پہلے بھی تمہیں زمین سے ہی اُٹھایا، پھر زمین میں پہنچا دے گا، مٹی میں ملا دے گا، پھر تمہیں مٹی سے نکال لے گا،'' اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا'' بساط: بچھائی ہوئی چیز، مبسوط کے معنی میں،'' اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا'' لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا: تاکہ تم اس زمین سے کشادہ کشادہ راہوں میں چلو، سبل سبیل کی جمع ہے، فجاج فَجّ کی جمع، کشادہ راستہ۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ
نُوح علیہ السلام نے کہا: اے میرے رَبّ! بے شک ان لوگوں نے میری نافرمانی کی، اور انہوں نے اتباع کی اُس کی جس کو نہیں زیادہ کیا اس کے مال نے اور
وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۚ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ
اس کی اولاد نے سوائے خسارے کے ﴿۲۱﴾ اور انہوں نے بہت بڑی بڑی چالیں (میرے خلاف) چلیں ﴿۲۲﴾ اور یہ کہتے ہیں ہرگز نہ چھوڑنا اپنے
اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ﴿۲۳﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ۬
معبودوں کو اور ہرگز نہ چھوڑنا وَدّ کو، نہ سواع کو، نہ یغوث کو، نہ یعوق کو، نہ نسر کو ﴿۲۳﴾ انہوں نے بہت سارے لوگوں کو بھٹکا دیا،

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ

اور تُو نہ زیادہ کر ظالموں کو مگر گمراہی ﴿۲۴﴾ وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کر دیے گئے پھر داخل کر دیے گئے وہ آگ میں، پس نہ

يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ

پائے انہوں نے اپنے لیے اللہ کے علاوہ کوئی مددگار ﴿۲۵﴾ اور کہا نُوح علیہ السلام نے: اے میرے رَبّ! نہ چھوڑ زمین پر

الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا

کافروں سے کوئی پھرنے والا ﴿۲۶﴾ اگر تُو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نہیں جنیں گے مگر کافر

كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ

فاجر ﴿۲۷﴾ اے میرے رَبّ! مجھے بخش دے، اور میرے والدین کو بخش دے اور ان لوگوں کو بخش دے جو میرے گھر میں داخل ہو گئے

مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ ع

مؤمن ہونے کی حالت میں اور عام مؤمنین کو بخش دے اور مؤمنات کو بخش دے، اور نہ زیادہ کر تُو ظالموں کو مگر بربادی ﴿۲۸﴾

تفسیر

کافر جن سرداروں کے پیچھے لگے وہ خود خسارے میں تھے

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ: نُوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بے شک اِن لوگوں نے میری نافرمانی کی، وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا: اور اِتباع کی انہوں نے ان لوگوں کی (مَن کا لفظ مفرد ہے، اس لیے یَزِدْہُ مَالُہٗ وَوَلَدُہٗ میں ضمیریں بھی مفرد لوٹائی جارہی ہیں، اور معنیٰ یہ جمع ہے اس لیے ترجمہ جمع کے ساتھ کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے) حضرت نُوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے بطورِ شکایت کے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میری تو یہ مانتے نہیں، یہ لگے ہوئے ہیں سرمایہ داروں کے پیچھے اور سرداروں کے پیچھے، جو صاحبِ مال ہیں، صاحبِ اولاد ہیں، جن کے بڑے بڑے خاندان ہیں، بہت بڑے مال دار ہیں، یہ اُن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، حالانکہ ان کا مال اور ان کی اولاد ان کے لئے کوئی کمال نہیں، بلکہ خسارے کا باعث ہے، اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے وہ خسارے میں پڑے ہوئے ہیں، اس قسم کے خسارے والوں کے پیچھے یہ لگے ہوئے ہیں، جن سرداروں کی وہ اطاعت کر رہے تھے ان سرداروں کی حیثیت یہاں نمایاں کی ہے، کہ ان کی سرداری جو تھی وہ کسی عقل کی بنا پر نہیں، کسی اخلاق کی بنا پر نہیں، یہ ان کی جو بات مان رہے ہیں تو کوئی دلائل کی بنا پر نہیں، کہ وہ اپنی بات کو دلیل سے منواتے ہوں یا ان کو کوئی عقل اور شرافت حاصل ہے، بلکہ

صرف اس وجہ سے کہ وہ مال دار ہیں اور صاحب اولاد ہیں یعنی خاندان والے ہیں، اُن کے خاندان والے ہونے کی وجہ سے اور ان کے مال دار ہونے کی وجہ سے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ مال اور اولاد ان کے لئے کوئی نفع کی چیز نہیں، بلکہ ان کے لئے خسارے کا باعث ہے، تو جب وہ اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے خود بھی خسارے میں واقع ہونے والے ہیں، تو جو ان کے مال دار ہونے کی وجہ سے یا صاحب خاندان ہونے کی وجہ سے ان کے پیچھے لگیں گے، وہ کیا نفع اُٹھائیں گے؟

مال دار لوگ خسارے میں کیسے ہوتے ہیں؟

جیسے کل بھی غالباً میں نے اِسی بات کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ آج کل بھی ہمارے سامنے بات یہی ہے، کہ جو شخص زمین دار ہے، کارخانہ دار ہے، مال دار ہے، خاندانی اعتبار سے اُونچا ہے، جتھے والا ہے، تو لوگ اس کی بات مانتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ وڈیرا ہے، لیکن جس بنا پر وہ وڈیرا ہے وہ وجہ تو خود اس کے لئے باعثِ خسارہ ہے، مال اور اولاد اس کے لئے کوئی نفع کی چیز نہیں، یہ بہت بڑی بات ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے اشارہ کیا ہے، کہ مال و اولاد اِن کے لئے خسارے کی بات ہے، اور یہ اُن کے پیچھے لگ گئے تو یہ نفع کیسے اُٹھالیں گے؟ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے زمین دے دی اور وہ بہت بڑا زمین دار ہے، لیکن اس زمین دار ہونے کے ساتھ ساتھ جو لوازمات آپ کے سامنے آتے ہیں، زانی یہ ہوتے ہیں، شرابی یہ ہوتے ہیں، بدکار یہ ہوتے ہیں، رسہ گیر یہ ہوتے ہیں، اب ایک زمین دے کر اللہ تعالیٰ نے اگر ان سے شرافت لے لی، دیانت لے لی، صلاحیت لے لی، حیا لے لی، ان سے اخلاق لے لیا، سب کچھ لے لیا، ایک زمین ان کو دے دی تو یہ کیا نفع کی تجارت ہے؟ ایک سرمایہ دار کو اگر اللہ تعالیٰ نے سرمایہ دے کر اس سے حیا لے لی، امانت لے لی، دِین لے لیا، ایمان لے لیا، اخلاق لے لیا، شرافت اس سے چھین لی، اب وہ بدکار ہے، شراب نوش ہے، زانی ہے، رسہ گیر ہے، اور اس قسم کی دُنیا میں کون سی بدمعاشی، عیاشی ہے جس کو وہ اپنے سرمائے کی بنا پر نہیں کرتا، تو کون عقل مند کہتا ہے کہ سرمایہ لے کر یہ نفع میں رہ گئے، اللہ تعالیٰ نے اگر اِن کو زمین دی یا سرمایہ دیا تو مقابلے میں جو کچھ ان سے لے لیا یقیناً یہ لوگ خسارے میں ہیں، جو کچھ یہ دیے بیٹھے ہیں اپنی زمین اور سرمائے کی بنا پر، وہ زیادہ قیمتی ہے، یہ تو اخلاق کی بات ہے جس کا نتیجہ آخرت میں جا کے سامنے آئے گا، وہاں جا کے پتا چلے گا کہ اِن لوگوں نے سرمایہ لے کے یا خاندان اور جتھے والے بن کے انہوں نے دُنیا میں کیا کمایا؟ معلوم ہوگا کہ آخرت میں ان کے پلے عذاب ہی عذاب ہے، باقی کچھ نہیں۔ یہ تو اُخروی خسارہ ہے۔

بے دِین مال دار لوگ درحقیقت اب بھی عذاب میں ہیں

میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر غور کرو تو دُنیا میں بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، آج آپ جا کر دیکھئے ان کے ہاں جن کے پاس دِین نہیں، صرف دُنیا ہے، تو تمہیں پتا چلے گا کہ اس وقت بھی وہ لوگ جہنم میں ہیں، چاہے نمرود کی طرح جُوتے کھانے کی عادت پڑ گئی، اس لیے اِن کو پتا نہیں چلتا کہ ہمارے سر پر جُوتے پڑ رہے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں مزہ آ رہا ہے، نمرود جیسے جُوتے کھاتا تھا، اور جُوتے کھانا اس کے لیے باعثِ راحت ہوگیا، اس طرح سے یہ لوگ بھی عذاب میں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی

طرف سے یہ ایک مستقل عذاب ان کے اُوپر اور ہے کہ اس عذاب کو سمجھتے نہیں ہیں، کتوں کے خدمت گار یہ ہیں، گھوڑوں کے خدمت گار یہ ہیں، افسروں کے سامنے سجدے یہ کرتے ہیں، افسروں کے چپڑاسیوں کی جوتیاں یہ چاٹتے ہیں، لیکن ان کو اللہ کے دربار میں جھکنا نصیب نہیں ہوتا، امن چین کے ساتھ ان کو روٹی نصیب نہیں، صبح پریشان، رات پریشان، رات کو ان کو نیند نہیں آتی جس وقت تک کہ کوئی نشہ آور گولی نہ کھائیں۔ نیند سے محروم، چین سے محروم، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے کتنے دروازوں کے اُوپر یہ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، تھانیداروں کے سامنے یہ ذلیل، اور ان کے سامنے جا کے جس طرح سے نیازمندی یہ ظاہر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں محفوظ رکھا ہے، زندگی میں ایک دفعہ بھی ہمیں جا کے اس طرح سے ان کو سلام کرنے کی نوبت نہیں آتی جن کے سامنے جا کر صبح شام یہ نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں، کس طرح سے یہ دفتروں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں، کتوں پر ان کے سرمائے خرچ ہو رہے ہیں، گدھے گھوڑوں پر ان کے سرمائے خرچ ہو رہے ہیں، کنجریاں ان کے سرمائے کھا رہی ہیں، مراثی ان کے سرمائے کھا رہے ہیں، لیکن یہ عذاب ان کے اُوپر مسلط ہے کہ ان کا پیسہ اللہ کے راستے میں خرچ نہیں ہوگا اور کسی نیک کام میں نہیں لگے گا، مراثی لے جائیں گے، کنجرلے جائیں گے، کتے کھا جائیں گے، جُوئے میں ہار دیں گے، شراب میں اُڑا دیں گے، جس کے نتیجے میں گھروں میں بے رونقی، بے چینی، ہر وقت آمدنی کا فکر، ہر وقت دشمن اردگرد پڑے ہوئے ہیں، حکومت کے مطالبات علیحدہ ان کے سر پر چڑھے ہوئے ہیں، تو اگر صبح سے لے کر شام تک ان کی زندگی آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعۃً انتہائی پریشانی کی زندگی ہے، نہ ان کو چین کے ساتھ کھانا نصیب، نہ ان کو چین کے ساتھ سونا نصیب۔

غریب دِین دار اور بے دِین سرمایہ دار کی زندگی میں موازنہ

اور اس کے مقابلے میں اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو زمین نہیں دی، سرمایہ نہیں دیا، دِین دیا ہے، دیانت دی ہے، امانت دی ہے، شرافت دی ہے، اُس کا سر اللہ کے سامنے جھکتا ہے، کسی تھانیدار کو وہ جھک کے سلام نہیں کرتا، کسی افسر کے جا کے اس کو جُوتے سیدھے نہیں کرنے پڑتے، نیازمندی نہیں کرنی پڑتی، وہ آتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے، وقت پہ سوتا ہے، امن چین سے جو روکھی سوکھی ملتی ہے، کھالیتا ہے، نہ اس کے کوئی اردگرد دشمن ہیں، اور نہ اس کو کسی سے خوف اور خطرہ ہے، چوروں سے وہ نہیں ڈرتا، ڈاکوؤں سے وہ نہیں ڈرتا، ہے ہی کچھ نہیں، کوئی لینے کیا آئے گا؟ جیسے ''گلستاں'' میں آتا ہے کہ ایک درویش کے گھر میں رات کو چور آ گھسے، اور درویش کی آنکھ کھل گئی، وہ کہتا ہے کہ بھائی! تُو رات کی تاریکی میں یہاں کیا تلاش کرتا ہے؟ ہمیں تو یہاں دن کی روشنی میں کچھ نہیں ملتا۔ تو ایسے لوگ کتنے امن کے ساتھ سوتے ہیں اور کتنی پیاری ان کی نیند ہوتی ہے، اور ہگنا موتنا اپنی مرضی کا، مفت میں...... اِن لوگوں کو ہگنے کے لئے علیحدہ پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں، موتنے کے لئے علیحدہ خرچ کرنے پڑتے ہیں، جب تک یہ ٹیکے نہ لگوائیں ان کو وقت پہ پاخانہ نہیں آتا، جب تک گولیاں نہ کھائیں ان کو وقت پہ نیند ہی نہیں آتی، ان کے ظاہری صاف ستھرے چہرے یا صاف ستھرے لباس دیکھ کر دھوکے میں نہ آیا کرو کہ یہ لوگ بہت خوش حال ہیں، خدا کی قسم! دُنیا کے اندر سب سے زیادہ بدحال یہ طبقہ ہے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ تمہیں سمجھنے کے لئے عقل دے دے۔ اور سب سے زیادہ دُنیا میں بھی خوش حال ہے تو

وہ شخص خوش حال ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دِین اور دیانت دی ہے، جو امن سکون اُس کے قلب کے اندر ہے ان کو تو کبھی زندگی میں ایک دِن نصیب نہیں ہوتا۔ باقی! آخرت جس وقت آجائے گی تو پتا چل جائے گا کہ کس کو یہ کامیابی سمجھ رہے تھے اور کیا خسارہ نکلا؟ سرمایہ ملنے پر گھر سے جاتا بہت کچھ ہے، اگر سرمایہ آتا ہے تو گھر سے جاتا بہت کچھ ہے، اور جو کچھ جاتا ہے وہ زیادہ قیمتی ہے بمقابلہ اس کے جو کچھ آتا ہے، دیکھنے میں یہی آتا ہے، بس اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے دے کہ دِین کے ساتھ دُنیا اور دُنیا کے ساتھ دِین اگر بڑے کسی کو مل جائے تو یہ اللہ کا خاص اِنعام ہے، لیکن ایسا کم ہوتا ہے، ورنہ اکثر و بیشتر جیسے جیسے مال آتا چلا جائے گا شرافت رُخصت ہوتی چلی جائے گی، حیا رُخصت ہوتی چلی جائے گی، عفت رُخصت ہوتی چلی جائے گی، ظلم وستم کا دور دورہ ہو جائے گا، آپس میں دشمنیاں بڑھتی چلی جائیں گی، شراب وزِنا کا اِنسان عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ تو یہ ان زمین داروں سرمایہ داروں کی زندگیاں جاکے دیکھو، بالکل حقیقت ہے کہ جہنم والی زندگی ہے، سوال ہی نہیں کہ اس میں کوئی کسی قسم کی اور شرافت کا گزر ہو۔

اس لیے حضرت نُوح علیہ السلام نے ایک ایسا لفظ بولا جس سے واقعی سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک نقشہ سامنے آگیا کہ ان کے لئے مال اور اولاد خسارے کا باعث ہے، اور یہ بے وقوف ان کے مال اور اولاد سے متاثر ہو کر ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، تو جب اس مال اور اولاد کی بنا پر وہ بھی خسارے میں ہیں تو یہ اُن کے پیچھے لگ کر کیا نفع حاصل کرلیں گے؟ یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حضرت نُوح علیہ السلام شکایت کر رہے ہیں اور اِسی سے لوگوں کا مزاج سمجھ میں آتا ہے۔ ''انہوں نے اتباع کی اُس کی جس کو نہیں زیادہ کیا اُس کے مال نے اور اس کی اولاد نے سوائے خسارے کے۔''

قومِ نُوح کی ہٹ دھرمی اور چالیں

وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا: اور انہوں نے بہت بڑی بڑی چالیں میرے خلاف چلیں، مکر کیا انہوں نے مکر کُبّار، کبار یہ کبیر کا مبالغہ ہے، بہت بڑی بڑی چالیں میرے خلاف یہ چلتے ہیں مجھے شکست دینے کے لئے، ''اور انہوں نے بڑی بڑی چالیں میرے خلاف چلیں'' وَقَالُوْا: اور یہ کہتے ہیں لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ: یہ وڈیرے کہتے ہیں اپنے چھوٹوں کو، آپس میں ایک دوسرے کو کہتے ہیں: ہرگز نہ چھوڑنا اپنے معبودوں کو، یعنی اس نُوح کے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا، دیکھو! جن کی وہ پُوجا کر رہے تھے ان کو آلِہہ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، اُن کو اِلٰہ کہتے تھے، ''نہ چھوڑنا اپنے معبودوں کو، اور ہرگز نہ چھوڑنا وَدّ کو، نہ سواع کو، نہ یغوث کو، نہ یعوق کو، نہ نسر کو'' یہ ان کے پانچ معبودوں کے نام ہیں، علی الاطلاق سب اور خاص طور پر یہ ''پنج پیر'' اِن کو تو بالکل نہیں چھوڑنا، یہ پانچ کا عدد آگیا یہاں، گن کر دیکھ لو، وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر، اِن پانچ کو تو بالکل نہیں چھوڑنا، یہ ''پنج پیر'' تو بالکل کسی صورت میں چھوڑنے کے نہیں ہیں، اور یہ ہیں بھی آلِہہ، اِن کے اُوپر وہ اِلٰہ کا لفظ بولتے تھے۔

قومِ نُوح کے پانچ معبودوں کا تعارف

باقی یہ پانچ تھے کیا؟ ''بخاری شریف'' میں روایت آتی ہے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے، اور دوسرے مفسرین نے بھی

اس کو ذکر کیا ہے[1] کہ یہ نوح علیہ السلام کی قوم کے صالحین تھے، اچھے لوگ تھے، لوگ ان کو وقت میں ولی سمجھتے تھے، اچھے طریقے پر چلنے والے تھے، بعد میں یہ فوت ہو گئے، لوگوں نے محبت کے طور پر ان کی یادداشت رکھنے کے لئے ان کی شکل پر پتھر کے بت تراش کے رکھ لیے، پرانے زمانے میں بت تراشی یونہی ہوتی تھی، لوگ پتھر تراش لیتے تھے، تاکہ یہ سامنے رہیں تو یہ ہمیں یاد رہیں، ان کی زندگی ہمیں یاد آتی رہے، اور اس کی وجہ سے ہمیں نیکی کی ترغیب ہوتی رہے، آہستہ آہستہ شخصیات نظر سے اوجھل ہو گئیں اور یہ تصویریں ہی سامنے رہ گئیں، اب یہ جو بت پڑے ہوئے تھے یہی سب کچھ ہو گئے، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ''فوز الکبیر'' میں بیان فرمایا، آپ نے پڑھ لیا ہوگا ''اُصولِ تفسیر'' میں، کہ شرک کی اِبتدا تو ایسے ہی ہوئی ہے کہ لوگوں نے صالحین کی تصویریں بنائیں، لیکن آہستہ آہستہ ایسا خلطِ عظیم واقع ہوا کہ شخصیات نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور یہ صرف تصویریں سامنے رہ گئیں۔[2]

مشرکانہ پکار کس طرح کی تھی؟

اب اگر فرض کر لیجئے کہ یہ وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر وغیرہ یہ کوئی اولیاء اللہ تھے، لیکن ان اولیاء اللہ کو وہ خودمختار سمجھ کر، مشکل کشا سمجھ کر پکارتے تھے تو پکارنے کے لئے وہ سامنے تصویریں ہی رکھتے تھے، جہاں کہیں جاتے، سفر میں بھی اپنے ساتھ یہ تصویریں رکھ لیتے، اب اگر کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پکارے اور پکارنے کی صورت یہ ہو کہ یہاں ان کا فوٹو رکھا ہوا ہے، اور فوٹو کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ یا ابراہیم! یا ابراہیم! یا ابراہیم! مجھے بیٹا دے دے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر تو اُردن میں یا اسرائیل میں ہے، قریۂ خلیل میں، تو یہاں بیٹھ کے اگر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پکارتا ہے سامنے تصویر رکھ کے تو یہ غائبانہ پکار ہے، اور یہ غائبانہ پکارنا ایسے ہی ہے کہ یوں سمجھیں کہ جہاں سے بھی ہم پکاریں وہ سنتے ہیں، ہم جو کچھ کہیں وہ سنتے ہیں، جس وقت پکاریں سنتے ہیں، یہی عقیدہ شرک ہے اور یہی مشرکانہ طرزِ عمل ہے، تو اُن کے پکارنے کی صورت یہ تھی، وہ فوٹو جو سامنے رکھا کرتے تھے، بت جو سامنے رکھا کرتے تھے، چاہے ان کو اصل کی تصویر کے طور پر ہی رکھتے ہوں اس سے انکار نہیں ہے، بناتے وقت تصویریں انہوں نے اولیاء اللہ کی ہی بنائی تھیں، اگرچہ لات، عزّیٰ، منات اگر یہ مؤنث کے صیغے مراد لیے جائیں تو پھر یہ اولیاء اللہ کی یا نبیوں کی تصویریں نہیں تھیں، یہ ملائکہ کی یا جنّات کی تھیں، ملائکہ کو چونکہ وہ اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے تو ان کی طرف نسبت کر کے بعض فوٹو بنا لیتے تھے، فرشتوں کو پکارتے تھے، اور سورۂ نجم کے اندر جہاں اِن بتوں کا ذِکر کیا ہوا ہے آگے فرشتوں کا ذِکر ہے، کہ انہوں نے فرشتوں کو لڑکیاں قرار دے دیا، ان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے لڑکیوں کا کیا جاتا ہے، اس لیے ان کے نام پر جو تصویریں بناتے تھے وہ زنانی تصویریں تھیں، عورتوں کو پکارتے اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا (سورۂ نساء: ۱۱۷)، مؤنث چیزوں کو پکارتے ہیں۔

---

(۱) ان پانچ بتوں کے متعلق ایک اور تفسیر جو شاہ عبدالعزیز نے کی ہے، وہ اگلے درس میں دیکھیں۔

(۲) وتدرج الجهلة من هذا الطريق إلى أن بدأوا يعبدون هذه الصور والتماثيل ويعتقدون أنها آلهة بذاتها. (الفوز الكبير)

مشرکین کی پکار والی آیات سے مماتیوں کا غلط استدلال

اب وہ فرشتوں کو جو پکارتے تھے تو فرشتے تو مُردہ نہیں ہیں، اب اللہ تعالیٰ تو کہے کہ تم ان کو جو پکارتے ہو تو یہ سنتے نہیں، اس کا معنی یہ لے لیا جائے کہ مُردے نہیں سنتے، یہ کسی درجے میں سینہ زوری ہے، میں نے یہ مضمون آپ کے سامنے کئی دفعہ عرض کیا ہے، اصل بات یہی ہے کہ فرشتے اپنی جگہ ہیں، اور تم ان کی تصویریں اپنے سامنے رکھ کر پکار رہے ہو، تو یہ تو تب صحیح ہوتا کہ اگر ان کو یہ سماع دائم لازم حاصل ہوتا کہ جب پکارو، جہاں سے پکارو وہ سنتے ہیں، اور یہ صفت اللہ کے علاوہ کسی دُوسرے کو حاصل نہیں۔ لہٰذا یہ آیات اُس عدمِ سماع پر دلالت نہیں کرتیں جو علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ قبر کے پاس جا کر سلام کہا جائے، کوئی بات کی جائے تو قبر والا سنتا ہے یا نہیں سنتا؟ تو اہلِ سُنّت والجماعت کا، اہلِ حق کا جو مسلک ذکر کیا جاتا ہے کہ انبیاء ﷤ کا سماع تو مختلف فیہ نہیں، تو اُس سے مُراد ہے قبر کے پاس جا کر اگر کوئی بات کرتا ہے، حضور ﷺ کی قبر کے پاس جا کر کوئی کہتا ہے کہ یا رسول اللہ! میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے، اللہ تعالیٰ مجھے نیکی کی توفیق دے، جس کو استشفاع کہتے ہیں، حضور ﷺ سے سفارش طلب کی جائے، اللہ کے سامنے ان کو شفیع بنا کر پیش کیا جائے، فقہاء نے یہ لکھا ہے، علماء نے یہ لکھا ہے، اُمّت کے اندر تعامل کے طور پر یہ چلا آتا ہے، اِس کو کیا نسبت ہے اُس پکارنے سے جو مشرکین اپنے معبودوں کو پکارتے تھے، تو یہ صورت اور ہے اور مشرکین کے پکارنے کی صورت اور ہے، دونوں کو آپس میں خلط نہ کیجئے، تب جا کے مسئلہ صاف ہوتا ہے۔ تو قومِ نُوح اگر ان کو پکارتی تھی تو چاہے اولیاء اللہ سمجھ کر پکارتی تھی لیکن پکارنے کی کیا صورت تھی؟ پکارنے کی صورت یہ تھی کہ ان کی تصویریں بنا کر سامنے رکھ لیں، تو اس طرح سے پکارا جائے گا تو تبھی پکارا جا سکتا ہے جب عقیدہ یہ ہو کہ یہ ہر جگہ سے سنتے ہیں، اور یاددہانی کے طور پر سامنے چاہے تصویر رکھ لی، تو یہ پکارنا اور ہے اور اس میں سماع کا عقیدہ اور ہے، اور قبر کے پاس جا کر کسی نبی سے بات کرنا یا کسی ولی کو سلام کہنا وہ مسئلہ اور ہے، دونوں کو آپس میں خلط نہیں کرنا چاہیے، مشرکانہ عقیدہ اور مشرکانہ طرزِ عمل اور چیز ہے، اور جو مسلمانوں کے اندر مروّج ہے، علماء صلحاء کے اندر، وہ اور چیز ہے، دونوں کو خلط کر لینے کی وجہ سے آپ کو ساری اُمّت ہی مشرک نظر آ رہی ہے، اور مسلمان اگر نظر آتے ہیں تو صرف یہی دواڑھائی جو آج کل اُچھلتے کُودتے پھرتے ہیں، اگر اِن کا بیان کردہ ایمان وکُفر کا معیار لے لیا جائے تو اُمّت کی اُمّت ہی ساری کی ساری کافر اور مشرک نظر آتی ہے۔ تو یہ چاہے اولیاء تھے اور مقبول لوگ تھے لیکن اِن لوگوں کو پکارنے کی صورت یہی تھی کہ سامنے تصویریں رکھ کے وہ اِن کو پکارتے تھے۔

مشرکین کا خود پتھروں کو معبود سمجھ لینا کوئی بعید نہیں

اور بقول شاہ ولی اللہ ﷫ کے پھر شخصیات نظروں سے اوجھل ہو گئیں، اور صرف یہ پتھر کے بُت سامنے رہ گئے، انہی کی پُوجا شروع کر دی۔ اور جب کہا جائے کہ بھائی! یہ پتھروں کو پُوجتے تھے، کہتے ہیں لو! کوئی بے وقوف آدمی پتھر کو بھی پُوج سکتا ہے،

یہ بات بھی آپ کبھی سنیں گے، اگر کبھی ذکر کیا جائے نا کہ ان کے معبود تو پتھر کے تھے، کہتے ہیں لو! یہ بھی بھلا ہو سکتا ہے کہ کوئی عقل مند پتھر کو پُوج لے؟ اُن سے پوچھو کہ کیا ولی کو پُوجنا عقل مندی ہے؟ فرشتے کو پُوجنا عقل مندی ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے فرشتے کو پُوجنا عقل مندی ہے؟ (نہیں!) اور کسی ولی کو پُوجنا عقل مندی ہے؟ (نہیں!)، ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو فرشتے کو پُوجتا ہے ایسا بے وقوف، بے عقل ہے، اور جو جن کو پُوجتا ہے، کسی ولی کو پُوجتا ہے وہ تو اگر کسی گدھے کے ذکر کو بھی پُوجنے لگ جائے تو اس سے کوئی بعید نہیں، اس لیے اگر وہ پتھر کو کسی شکل پر تراش کر اپنا معبود قرار دے لے تو اس سے کیا بعید ہے؟ اللہ کے غیر کے لئے جس نے بھی عبادت ثابت کر دی یا اُلوہیت ثابت کر دی، وہ پرلے درجے کا احمق ہے، اس سے کوئی توقع نہیں کہ وہ سانپ کو بھی پُوج سکتا ہے، بچھو کو بھی پُوج سکتا ہے، آگ اور پانی کو بھی سجدہ کر سکتا ہے اور اُن کو بھی پُوج سکتا ہے، چاہے ان میں جان ہے، چاہے جان نہیں ہے، اسی طرح سے پتھر سے بنائی ہوئی تصویروں کو بھی پُوج سکتا ہے، ہمیں تو سارے احمق ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں، چاہے کوئی فرشتوں کا پجاری ہے، چاہے پتھروں کا پجاری ہے، تمہارے نزدیک فرشتوں کو پُوجنے والے شاید عقل مند تھے، اور بتوں کو پُوجنے والے عقل مند نہیں تھے اور نہ کوئی عقل مند آدمی کسی بت کو پُوج ہی سکتا ہے، ایسی بات نہیں، ان کے معبودوں میں جاندار چیزیں بھی داخل تھیں، بے جان بھی داخل تھیں، تصویریں یہ بناتے تھے، چاہے بنانے کا اُصول انہوں نے کوئی گھڑ رکھا تھا، لیکن عملاً پھر معاملہ ایسا ہی تھا کہ ان تصویریں کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے جو معبود سے کیا جاتا ہے۔ شرک کی اِبتدا چاہے اسی طرح سے ہوئی، لیکن آخر اِنتہا اس میں تصویر پرستی ہوگئی، یہی تو وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تصویروں کے پھاڑنے اور بتوں کے توڑنے کو ان کے معبودوں کا عجز بیان کیا، ورنہ کسی کی تصویر پھاڑ دینا اس کے عجز کی دلیل کیسے بنتا ہے؟ آج اگر کوئی شخص قائداعظم کی تصویر کو پھاڑ دے اور یہ کہے کہ ''قائداعظم میں کوئی طاقت نہیں ہے!'' تو لوگ کہیں گے کہ یہ تو قائداعظم کا فوٹو ہے اس کے فوٹو پھاڑنے سے قائداعظم کا عجز کیسے معلوم ہوگیا؟ آج ضیاء الحق کی تصویر پکڑ کر آپ ریزہ ریزہ کر دیجئے اور کہیے کہ ''لو! میں نے تو ضیاء کو ریزہ ریزہ کر دیا!'' تو لوگ آپ کو احمق کہیں گے، کہ ضیاء تو ایک مستقل شخصیت ہے، تو اس کی تصویر پھاڑنے سے اس کا عجز کیسے ثابت ہوگیا؟ لیکن یہاں ہمیشہ بتوں کو توڑ کے، بتوں کا عجز ثابت کر کے، کہا جاتا ہے کہ جن کو تم پُوج رہے ہو وہ تو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے، یہ آیات اور واقعات بتاتے ہیں کہ مشرکین کا آخر آخر تعلق جو تھا وہ صرف تصویروں سے رہ گیا تھا، اور ان تصویروں کو سامنے رکھ کر اگر کوئی پکارتا ہے تو بے جا اپنا وقت ضائع کرتا ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہے کہ آ، میرے منہ تک پہنچ جا، پانی نہیں پہنچتا، اسی طرح سے یہ نہ سنیں نہ یہ کچھ کر سکیں۔ تو مشرکین کے معبودوں کے متعلق جو آئی ہوئی آیتیں ہیں ان کو مسلمانوں کے عقیدے کے اُوپر منطبق کر کے مسلمانوں کو کافر اور مشرک ثابت کرنے کی کوشش کرنا یہ کوئی عقل مندی نہیں۔ تو یہ جو پانچ پیروں کے جو قائل تھے، کہتے ہیں کہ اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو، اور خاص طور پر ان کو تو بالکل نہیں چھوڑنا، نہ وَدّ کو، نہ سواع کو، نہ یغوث کو، نہ یعوق کو، نہ نسر کو۔

حضرت نُوح علیہ السلام کی بددُعا

قَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا: حضرت نُوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انہوں نے بہت سارے لوگوں کو بھٹکا دیا، وَلَا تَزِدِ اور نہ زیادہ تُو کر ظالموں کو مگر گمراہی، اب تُو ان کی گمراہی اور بڑھا دے تا کہ تیرے علم وحکمت کے مطابق جس نقطے پر پہنچنے کے بعد عذاب آئے گا، یہ اس نقطے پہ جلدی پہنچ جائیں، کیونکہ مؤمن تو انہوں نے ہونا نہیں، اور تیرے علم وحکمت کے مطابق جب تک ان کی ضلالت فلاں درجے تک نہیں پہنچے گی، یہ تباہ نہیں ہوں گے، اب تو میں یہ کہتا ہوں کہ اِن کو اُس گمراہی کی حد تک جلدی پہنچا، تا کہ یہ تیرے غضب کا نشانہ جلدی بن جائیں، کیونکہ اب ان کے سمجھنے کی توتوقع نہیں۔

قومِ نُوح کا انجام

مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ: مِمَّا میں ''ما'' زائدہ ہے، مِنْ خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا: وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کر دیے گئے فَاُدْخِلُوْا نَارًا: فاء تعقیب بلامہلت کے لئے ہے، ڈُبو دیے گئے اور ڈُبوئے جانے کے متصل آگ میں داخل کر دیے گئے، گویا کہ بظاہر وہ پانی میں ڈُوبے، حقیقت میں آگ میں گئے، یہ آگ کا عذاب ان کو برزخ میں ہو رہا ہے جو قبر کے عذاب کی دلیل ہے، ''داخل کر دیے گئے وہ آگ میں'' فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا: پس نہ پائے انہوں نے اللہ کے علاوہ کوئی مددگار، جن کو یہ پُوجتے تھے، جن کے یہ چڑھاوے چڑھاتے تھے، کوئی ان کی مدد کے لئے نہیں آیا۔

نُوح علیہ السلام کی بددُعا اور اس کی وجہ

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا: اور کہا نوح علیہ السلام نے اے میرے رَبّ! نہ چھوڑ زمین پر کافروں سے کوئی پھرنے والا، دیار اصل میں دَیْوار ہے، دارَ یَدُوْرُ: گھومنا، ''کوئی گھومنے والا، کوئی چلنے پھرنے والا باشندہ نہ چھوڑ'' اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ: اگر تُو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا: اور نہیں جنیں گے مگر کافر فاجر، ان کے ہاں جو آگے نسل پیدا ہوگی وہ بھی کافر فاجر ہی ہوگی، یہ اتنے گندے ہو چکے ہیں کہ اِن سے اب کسی صلاحیت کی توقع نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا تھا اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (سورۂ ہود:۳۶) کہ اب تیری قوم میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں سوائے ان کے جو ایمان لا چکے، یہ اللہ کی طرف سے جب خبر آ گئی تو حضرت نُوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ پھر ان کافروں فاجروں کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت ہے، آگے بھی جن کو جنیں گے وہ بھی کافر فاجر ہی ہوں گے۔

اہلِ ایمان کے لئے دُعائے مغفرت

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ: اے میرے رَبّ! مجھے بخش دے اور میرے والدین کو بخش دے اور ان لوگوں کو بخش دے

جو میرے گھر میں داخل ہو گئے یعنی جو میرے اہل بیت ہیں، جو میرے گھر میں داخل ہو گئے مؤمن ہونے کی حالت میں، اور عام مؤمنین کو بخش دے اور مؤمنات کو بخش دے، وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا: اور نہ زیادہ کر تو ظالموں کو مگر بربادی، تبار ہلاکت کو کہتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سورۂ نُوح کی ایک آیت کی دُوسری تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ کل سورۂ نُوح میں یہ جو پانچ بتوں کا ذکر آیا تھا لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا، تو اس کی تفسیر آپ کے سامنے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق کی گئی تھی کہ یہ پانچ قوم کے بزرگ تھے، صالحین تھے، یہ اُن کے نام ہیں، اور جس وقت وہ مر گئے تو اس قوم نے یادگار کے طور پر ان کی تصویریں بنالیں، اور آہستہ آہستہ پھر انہی کو اِلٰہ قرار دے کر ان کی پُوجا شروع کر دی۔ عام طور پر مفسرین نے ان پانچ کا مصداق اور قرار دیا ہے، یہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا قول بھی تفسیر میں موجود ہے، ''بخاری شریف'' میں بھی اِسی کو اختیار کیا گیا ہے، اور بعض مفسرین نے اس کا مصداق اور چیزوں کو بنایا ہے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اچھی تفصیل کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ ''وَدّ'' جو ہے یہ بُت تھا مرد کی شکل پہ، اور ''سواع'' عورت کی شکل پہ تھا، اور ''یغوث'' یہ گھوڑے کی شکل پہ تھا، اور ''یعوق'' یہ شیر کی شکل پہ تھا، اور ''نسر'' یہ گدھ کی شکل پہ تھا۔ تو یہ مختلف شکلوں کے اُوپر انہوں نے یہ بُت بنائے ہوئے تھے، تو پھر اس کا مصداق ان صالحین کو قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو اپنے خیال کے مطابق متشکل کیا، اور اللہ کی صفات کو متشکل کر کے سامنے یہ تصویریں بنالیں اللہ کی صفت کا تصور کرنے کے لئے، بعد میں اللہ کی صفت نظروں سے غائب ہو گئی، صرف تصویریں رہ گئیں، چنانچہ ان کی لفظی تحقیق کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں یہ جو پانچ بُت مشہور ہیں ایک کا نام لکھا ہے ''بشنو''، دُوسرا ''برہما''، تیسرا ''اندر''، چوتھا ''شیو''، اور پانچواں ''ہنومان''، وہ کہتے ہیں کہ یہ بالکل انہی لفظوں کے ہم معنی ہیں جو قومِ نُوح کے بُت تھے، جس تصور کے تحت قومِ نُوح نے یہ پانچ بُت بنائے تھے کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اسی مفہوم میں، اسی معنی میں یہ پانچ بُت ہیں جس کو ہندو اعلیٰ درجے کے قرار دیتے ہیں اور ان کی پُوجا کرتے ہیں، اور عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچوں بُت قومِ نُوح کے غرق ہو جانے کے بعد کچھ دیر تک تو ممکن ہے ناپید ہو گئے ہوں، لیکن بعد میں پھر ان کا اِحیاء ہوا، اور مشرکینِ عرب کے اندر یہ بُت اسی طرح سے انہی ناموں کے ساتھ ہی پھر مروّج ہوئے، مختلف قبیلوں نے مختلف بُت اختیار کر رکھے تھے، اس لیے مشرکین کے ناموں میں ''عبدیغوث'' کا ذکر بھی آتا ہے، ''عبدوَدّ'' کا ذکر بھی آتا ہے، تو یہ نام جو رکھتے تھے تو نام رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اِنہی ناموں کے تحت یہ بُت معظم قرار پائے، تفصیل اس کی ''تفسیر عزیزی'' میں ہے، یہ میں نے اشارہ سا کر دیا۔

آیاتها ۲۸ ۷۲ سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ ۴۰ رکوعاتها ۲

سورۂ جن مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۸ آیتیں ہیں، ۲ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱

آپ کہہ دیجئے، میری طرف وحی کی گئی کہ جنوں کے ایک گروہ نے توجہ سے سنا، پھر انہوں نے کہا آپس میں: بے شک ہم نے سنا عجیب قرآن ۝

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝۲

جو راہنمائی کرتا ہے بھلائی کی طرف، پھر ہم اس قرآن پہ ایمان لے آئے، اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے ۝

وَّاَنَّهُ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ

اور (انہوں نے آپس میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ) ہمارے رب کی عظمت بہت اونچی ہے، نہیں اختیار کیا اس نے بیوی کو نہ

لَا وَلَدًا ۝۳ وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴ وَّ

اولاد کو ۝ اور (انہوں نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ) ہم میں سے نادان بولتا تھا اللہ پر حد سے بڑھی ہوئی بات ۝ اور (انہوں نے یہ بات بھی

اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵ وَّ

ذکر کی کہ) ہم یہ گمان کرتے تھے کہ ہرگز نہیں بولیں گا انسان اور جن اللہ کے اوپر جھوٹ ۝ اور (انہوں نے یہ تذکرہ بھی کیا کہ)

اَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶

انسانوں میں سے کچھ آدمی تھے جو پناہ لیتے تھے جنوں میں سے کچھ آدمیوں کی، پس اُن انسانوں نے اِن جنوں کو ازروئے ظلم کے زیادہ کر دیا ۝

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝۷ وَّ

اور (یہ بھی انہوں نے ذکر کیا کہ) بے شک انسانوں نے گمان کیا تھا جیسے کہ تم نے گمان کیا کہ نہیں اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ ہرگز کسی کو ۝ اور (انہوں نے یہ

اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝۸ وَّاَنَّا كُنَّا

بات بھی ذکر کی کہ) ہم نے ٹٹولا آسمان کو پس پایا ہم نے کہ وہ بھر دیا گیا ہے سخت پہرے داروں کے ساتھ اور شعلوں کے ساتھ ۝ اور بے شک ہم

نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿٩﴾ وَأَنَّا لَا نَدْرِي

بیٹھا کرتے تھے اس آسمان سے سننے کی جگہوں میں، اور جو کوئی سنتا ہے اب تو پاتا ہے وہ اپنے لیے ایک تیار شعلہ ﴿٩﴾ اور ہم نہیں جانتے

أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿١٠﴾ وَ

کہ کیا شر کا ارادہ کیا گیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں موجود ہیں یا ارادہ کیا ان کے متعلق ان کے رب نے بھلائی کا؟ ﴿١٠﴾ اور (انہوں نے

أَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا ﴿١١﴾ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّن

ذکر کیا کہ) بے شک ہم میں سے کچھ اچھے لوگ بھی ہیں اور کچھ اس کے علاوہ ہیں، ہم مختلف طریقوں والے تھے ﴿١١﴾ اور بے شک ہم نے سمجھ لیا کہ ہم اللہ کو

نُّعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَن نُّعْجِزَهُ هَرَبًا ﴿١٢﴾ وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ

عاجز نہیں کر سکتے زمین میں اور ہم ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اس کو بھاگ کر ﴿١٢﴾ اور (انہوں نے یہ بات بھی آپس میں ذکر کی کہ) جب ہم نے ہدایت سنی

آمَنَّا بِهِ ۖ فَمَن يُؤْمِن بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ﴿١٣﴾ وَ

تو ہم اس پر ایمان لے آئے، پس جو شخص بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا پس نہیں اندیشہ کرے گا وہ کمی کا اور نہ ظلم کا ﴿١٣﴾ اور (انہوں نے یہ بات بھی

أَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿١٤﴾ وَأَمَّا

ذکر کی کہ) بے شک ہم میں سے کچھ مسلمان ہیں اور کچھ ظالم ہیں، پس جو شخص بھی اسلام لائے گا تو یہی لوگ ہیں جنہوں نے بھلائی پائی ﴿١٤﴾ لیکن

الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿١٥﴾ وَأَن لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ

ظالم لوگ، وہ جہنم کے لئے ایندھن بنیں گے ﴿١٥﴾ اور (اللہ کی طرف سے مجھے یہ بھی وحی کی گئی کہ) اگر یہ (مشرکین) سیدھے راستے پر استقامت اختیار کرتے

لَأَسْقَيْنَاهُم مَّاءً غَدَقًا ﴿١٦﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَمَن يُعْرِضْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ

تو ہم پلاتے ان کو بہت پانی ﴿١٦﴾ تاکہ آزمائیں ہم ان کو اس میں، جو کوئی اپنے رب کی نصیحت سے اعراض کرے گا تو داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو

عَذَابًا صَعَدًا ﴿١٧﴾ وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ﴿١٨﴾

چڑھتے ہوئے عذاب میں ﴿١٧﴾ اور (یہ بات بھی میرے سامنے ذکر کی گئی کہ) سجدے سارے اللہ ہی کے لئے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارا کرو ﴿١٨﴾

وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ ع

اور یہ (بات بھی ذکر کی گئی کہ) جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوتا، اللہ کو پکارتا ہے، تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں اس کے اوپر ٹھٹھ کے ٹھٹھ ﴿١٩﴾

سورۂ جنّ کا مضمون

آگے آرہی ہے سورۂ جنّ، مکہ معظمہ میں نازل ہوئی، اوراس کی ۲۸ آیتیں ہیں، ۲ رُکوع ہیں۔اس کے پہلے رُکوع میں جنوں کاایک واقعہ نقل کیا گیاہے جس کے ضمن میں اِثباتِ توحید بھی ہے، رَدِّ شرک بھی ہے، اور جنّ جس قسم کی کارروائیاں کرتے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

شانِ نزول

سرورِ کائنات ﷺ ایک دفعہ صبح کی نماز میں قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے کہ جنوں کا ایک وفد وہاں آ گیا، اس وفد کی حضور ﷺ سے ملاقات ثابت نہیں، اور یہ وفد پھر رہا تھا ایک واقعے کی تحقیق کرنے کے لئے جیسے روایات سے معلوم ہوتا ہے، حضور ﷺ پر جب نزولِ وحی ہوا، اس وقت سے جنوں کے اُوپر عالمِ بالا کی طرف جانے میں کچھ تشدّد زیادہ شروع ہوگیا، پہلے یہ جاتے تھے تو ان کو روکا نہیں جاتا تھا، بادلوں میں، بادلوں سے اُوپر آسمانوں کی طرف جا کر فرشتوں کی کلام سُن آتے، اور آ کے اپنے کاہنوں کو بتاتے تھے، اور وہ کاہن اپنی دُکانیں چمکاتے، لوگوں کے سامنے یہ واقعات ذکر کرتے، جس سے معلوم ہوتا کہ یہ کاہن غیب دان ہیں، اور لوگ ان کو فیس دیتے تھے، وظیفے دیتے تھے، اور اِن سے غیب کی خبریں پوچھا کرتے تھے، ''کہانت'' ایک مستقل پیشہ تھا، جس کا حاصل یہی تھا کہ لوگ وظائف کر کے جنّات کے ساتھ مناسبت پیدا کرتے، اور ان کو پھر خبریں طلب کرنے کا ذریعہ بناتے، کوئی ایک آدھی خبر ان کو مل جاتی تو اس میں سو جھوٹ ملاتے، اس طرح سے وہ اپنی دُکانیں چمکاتے تھے۔تو رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہوا تو تشدّد شروع ہوگیا، یہ اُوپر جاتے تو ان کو مار پڑتی، ان کے اُوپر سختی ہوتی، تو انہوں نے اپنی قومی سطح پر یہ مشورہ کیا کہ دُنیا میں کوئی واقعہ پیش آیا ہے، جس کی بنا پر ہمارے ساتھ یہ معاملہ شروع ہوگیا، تو اس کی تحقیق کے لئے ان کے وفود مختلف علاقوں میں گئے، تو ان کا جو وفد اِدھر حجاز کی طرف آیا تھا انہوں نے صبح کے وقت دیکھا کہ حضور ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں اور قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہے ہیں، تو انہوں نے توجہ کے ساتھ اِس قرآن کو سُنا، اور سننے کے بعد انہوں نے تأثر یہی لیا کہ یہی واقعہ ہے جس کی بنا پر ہمارے ساتھ یہ معاملہ شروع ہوا ہے، قرآنِ کریم کی عظمت کے قائل ہوگئے، اپنے طور پر انہوں نے ایمان قبول کرلیا، اور اپنی قوم کی طرف داعی بن کر چلے گئے،[1] سورۂ اَحقاف کے آخری رُکوع میں بھی ان کا ذکر آپ کے سامنے آیا تھا، جہاں جا کے انہوں نے قرآنِ کریم کی عظمت کا ذکر اپنی قوم کے سامنے کیا ہے۔اور پھر مختلف اوقات میں جنوں کے وفود سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آئے ہیں اور آپ سے ملاقات ہوئی ہے، اور آپ نے ان کے سامنے وعظ کی، اور ان کے سامنے اَحکام بیان فرمائے، اس طرح سے جنوں کا تعلق بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قائم ہوا، اور وہ متأثر ہو کے ایمان بھی لاتے رہے، تقریباً چھ واقعات ایسے آتے ہیں کہ جن میں حضور ﷺ کا جنوں کے پاس جانا، اور ان کو جا کر وعظ و تلقین کرنا مذکور ہے، روایات کے اندر اُن کا ذکر آتا ہے، اور اب بھی مکہ معظمہ میں ایک مسجد ''مسجدِ جنّ'' کے نام سے مشہور ہے قبرستان ''معلیٰ'' کے

(۱) بخاری ۱/۱۰۶ باب الجهر بقراءة صلاة الفجر۔ توجهوا نحو تهامة الى النبي ﷺ وهو بنخلة عامدين الى سوق عكاظ وهو يصلى بأصحابه صلاة الفجر۔

قریب، وہ مقام بھی ایسا ہے کہ جہاں حضور ﷺ کی ملاقات جنوں کے ساتھ ہوئی تھی، دو مسجدیں قریب قریب ہیں ان میں سے ایک مسجد ''مسجدِ جن'' کہلاتی ہے۔

جنّات کے وجود کا منکر کافر ہے

تو ''جن'' یہ مستقل مخلوق ہے اللہ تعالیٰ کی، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا، فرشتوں کو پیدا کیا، اسی طرح ایک یہ جن بھی ہیں، فرشتوں کو پیدا کیا گیا نُور سے، اُن کی خلقت نورانی ہے، نُور کا غلبہ ہے، اور انسان کو پیدا کیا گیا مٹی سے، اس لیے انسان کی خلقت ظلمانی ہے، اس میں مٹی کا غلبہ ہے، تو قرآنِ کریم کی آیات کے تحت یہ بالکل منصوص ہے کہ جنّات کو پیدا کیا گیا آگ سے، جس طرح سے ہم میں مٹی کا عنصر غالب ہے، لیکن باقی عناصر بھی شامل ہیں، اسی طرح سے جنوں کے اندر بھی آگ کا عنصر غالب ہے اور باقی عناصر کی آمیزش بھی ہوگی، لیکن بہرحال آگ سے پیدا کیے جانے کی وجہ سے ان میں لطافت ہے، اَشکالِ مختلفہ اختیار کر لیتے ہیں، مختلف شکلوں میں بدل جاتے ہیں، انسان کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں، متشکل ہو کر ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔ تو جنوں کے وجود پر ایمان لانا ضروریاتِ دِین میں سے ہے، اگر کوئی شخص اس نوع کا انکار کرتا ہے جس طرح آج کل یہ دہریے، یہ رُوسی اور اس قسم کے لوگ جو ان چیزوں سے متاثر ہیں، خصوصیت کے ساتھ رُوسی تہذیب سے، وہ ان کے وجود کے سرے سے منکر ہیں، اور صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص جنوں کے وجود کا منکر ہو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کی بیسیوں آیتیں ان کے وجود پر دلالت کرتی ہیں، اور روایات کا ذخیرہ بھی اس بارے میں موجود ہے کہ یہ ایک مستقل نوع ہے، ان کے مختلف حالات ہیں، اور یہ نبیوں پر ایمان بھی لاتے رہے، جیسے اُس (سورۂ اَحقاف کے آخری) رُکوع میں ان کے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا ذکر بھی ہے، مِنۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی جس طرح سے ذِکر کیا۔ بہرحال اِن کا وجود ہے۔

جنّات سے حفاظت کی تدابیر

اور یہ انسانوں کے ساتھ بھی مختلف طرح سے معاملہ کرتے رہتے ہیں، تکلیف بھی پہنچاتے ہیں، لپٹ بھی جاتے ہیں، ان واقعات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کا لپٹنا، تکلیف پہنچانا سب اللہ کے اِذن کے تحت ہے، اس لیے انسان کو اِن سے خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں، جس طرح سے انسانوں میں کچھ انسان بدمعاش درجے کے ہوتے ہیں جو دُوسروں کو تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں، اسی طرح سے جنوں میں بھی کچھ جن اس قسم کے ہوتے ہیں جو تکلیف پہنچاتے ہیں، تو جس طرح سے دُنیا کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنی جان مال کا تحفظ کرتا ہے بدمعاش انسانوں سے، اسی طرح سے ان جنّات وغیرہ سے بھی تحفظ کی تدبیریں شریعت نے بتائی ہیں، اگر اس طرح سے انسان کچھ اللہ تعالیٰ کے نام کا ذِکر کرتا رہے، اَدعیہ اور وظائف کچھ پڑھتا رہے تو پھر یہ تکلیف نہیں پہنچاتے، عام طور پر لوگوں کو جو جن لگتا ہے، جب عامل اس کو حاضر کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر وہ یہی شکایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ہماری جگہ پیشاب کر دیا تھا، ہماری جگہ یہ کر دیا تھا، اس طرح سے وہ عموماً عذر کیا کرتے ہیں، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب

انسان پیشاب پاخانے کے لئے جائے تو وہاں کپڑا اُٹھانے سے پہلے "بِسْمِ الله" پڑھ لے،[1] یا "اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ"[2] یہ دُعا پڑھ لے تو اِنسان کے درمیان اور جنوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے کہ یہ انسان کو دیکھ ہی نہیں سکتے، تو اس طرح سے دُعائیں جو تلقین کی گئی ہیں، چونکہ ایک تو یہ غیبی مخلوق ہے، ہمیں سامنے نظر نہیں آتی، تو ان سے بچنے کے لئے اور ان سے تحفظ حاصل کرنے کے لئے اللہ کا نام لینا چاہیے اور وہ دُعائیں پڑھنی چاہئیں، وظائف پڑھنے چاہئیں، تو ایسی صورت میں پھر یہ کچھ نہیں کرتے کراتے۔

جِنّات کا واقعہ ذِکر کرنے کا مقصد

تو یہ واقعہ جو پیش آیا تھا اور انہوں نے قرآنِ کریم کو سُن کے جو تأثر لیا تو اس سورت میں وہ ذِکر کیا جا رہا ہے، اور مشرکینِ مکہ کو سُنانا مقصود ہے، کہ تم انسان ہو کر متأثر نہیں، جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے شرافت کا مادّہ بمقابلہ جنوں کے زیادہ رکھا ہے، اور جنوں کے اندر شرافت اور تأثر کا مادّہ کم ہے، اس کے باوجود وہ قرآنِ کریم سے متأثر ہو گئے۔ پھر اس میں یہ بھی ذِکر کرنا مقصود ہے کہ جنوں کے اندر بھی اسی طرح سے غلط نظریات تھے، قرآنِ کریم سننے کے بعد اِس گروہ نے اُن نظریات کی اصلاح کر لی، اور جو تمہارے اندر نظریات موجود ہیں اِن کا بھی اُنہوں نے ذِکر کیا کہ انسان اور جن دونوں کے اندر جو شرک کی باتیں پائی جاتی ہیں یہ غلط ہیں، آج تک ہم غلطی پر ہی رہے۔ تو اس مضمون کے ذِکر کرنے سے گویا کہ مشرکین کی اصلاح بھی مقصود ہے۔

تفسیر

جِنّات کا توجہ سے قرآن سننا

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ آپ کہہ دیجئے، قُلْ کا لفظ آ گیا جس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو وحی کے ذریعے سے اطلاع جو دی گئی تو ساتھ حکم دیا گیا کہ آپ اس کو ظاہر کیجئے، لوگوں کو سُنایئے، تاکہ مشرکین اس سے متأثر ہوں، "آپ کہہ دیجئے" اُوْحِيَ اِلَيَّ: میری طرف وحی کی گئی اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ: کہ جنوں کے ایک گروہ نے توجہ سے سُنا۔ پیچھے سورۂ اَحقاف کے آخری رُکوع میں آیا تھا: يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ، قرآنِ کریم کو توجہ سے سُنا۔ "جنوں کے ایک گروہ نے توجہ سے سُنا۔"

متأثر ہونے کے بعد قبولِ اِیمان اور شرک سے توبہ

فَقَالُوْٓا: پھر انہوں نے کہا آپس میں، اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا: بے شک ہم نے سُنا عجیب قرآن، ایک عجیب قرآن سُنا، قابلِ تعجب، یعنی ایسی کتاب پہلے دیکھنے سننے میں نہیں آئی، يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ: یہ اُن کا تأثر ہے قرآنِ کریم کو سننے کے بعد، "ہم نے سُنا عجیب قرآن جو بھلائی کی طرف راہنمائی کرتا ہے" رُشد بھلائی کو کہتے ہیں، "راہنمائی کرتا ہے بھلائی کی طرف" فَاٰمَنَّا بِهٖ: پھر ہم اس

(۱) ترمذی ۱/۱۳۲ باب ما ذکر من التسمیة عند دخول الخلاء۔ مشکوٰۃ ۱/۴۳ باب آداب الخلاء، فصل ثانی۔
(۲) بخاری ۱/۲۶ باب ما یقول عند الخلاء۔ مشکوٰۃ ۱/۴۲ باب آداب الخلاء، فصل اوّل و فصل ثانی۔

قرآن پہ ایمان لے آئے، جب اس قرآن پہ ایمان لے آئے تو قرآن نے جو کچھ بتایا اس کا یقین کرلیا، ممکن ہے اس وقت حضور ﷺ جو آیات پڑھ رہے تھے اُن آیات کے اندر توحید کا تذکرہ تھا، معاد کا تذکرہ تھا، اور انہوں نے اس پر ایمان کا اقرار جو کیا، ایمان کا اظہار جو کیا تو گویا کہ موحد بن گئے، شرک سے توبہ کرلی اور آخرت کا عقیدہ اختیار کرلیا، جیسے آگے وضاحت کررہے ہیں، ''پھر ہم اس قرآن پہ ایمان لے آئے''، اور ہمارے اس ایمان کا حاصل یہ ہے کہ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا: ہم اپنے رَبّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، یعنی آج تک ہم جو اللہ کے ساتھ دُوسروں کو شریک ٹھہراتے رہے اب قرآنِ کریم پر ہم ایمان لے آئے ہیں، ہم اپنے رَبّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا: اور انہوں نے اِس بات کو بھی ذکر کیا، ذَكَرُوْا اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا: جنوں نے آپس میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا، یہ ''ذَكَرُوْا'' اس لیے نکال رہا ہوں کہ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا، قال کے بعد نحوی قاعدے کے مطابق ''اِنَّ'' آیا کرتا ہے، ''اَنَّ'' نہیں آیا کرتا، تو فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا یہ تو اُس قاعدے کے مطابق ہے کہ قالو کے بعد ''اِنَّ'' آگیا، اور آگے آگیا ''اَنَّ'' اس لیے قَالُوْا کے تحت اس کو داخل نہیں کیا جاسکتا زبان کے قاعدے کے تحت، تو اس کا فعل محذوف نکالنا پڑے گا: وَذَكَرُوْا اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا: انہوں نے آپس میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا، جَدّ کہتے ہیں عظمت کو، ''ہمارے رَبّ کی عظمت بہت اُونچی ہے'' ہمارا رَبّ عالی شان ہے، اس کی شان بہت بلند ہے، مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا: نہیں اختیار کیا اس نے بیوی کو نہ اولاد کو، یعنی ہم جو آج تک اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد اور بیوی کی نسبت کرتے رہے جس طرح سے کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کے اندر بھی کچھ اس قسم کے تأثرات تھے، اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے رَبّ کی شان تو بہت اُونچی ہے، بیوی اور اولاد کی نسبت اُس کی طرف کرنا یہ تو اس پر عیب لگانا ہے، ''نہ اس نے کوئی بیوی اختیار کی اور نہ اولاد۔''

غلطی کا اِعتراف

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا: اور انہوں نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ ہم میں سے نادان، سفیہ کہتے ہیں نادان کو، خفیف العقل، ''ہم میں سے نادان بولتا تھا اللہ پر (شَطَطًا: قَوْلًا ذَا شَطَطٍ) حد سے بڑھی ہوئی بات''، ہم میں سے نادان اللہ کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی بات بولتا تھا، یعنی اب اُن لوگوں کو جن کے پیرو ہو کر یہ مشرک تھے، یعنی ان کے سردار جو ان کو غلط نظریات کی تلقین کرتے تھے، اب ان کو یہ سفیہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ پرلے درجے کے بےوقوف ہیں، ان کو تو عقل ہی کوئی نہیں، آج تک ہم ان کے پیچھے لگ کے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی اولاد کا عقیدہ اختیار کرتے رہے، صاحبہ کا عقیدہ اختیار کرتے رہے، اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے رہے، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو تو عقل ہی نہیں۔ ''ہم میں سے بےوقوف بولتا تھا اللہ پر ایک حد سے بڑھی ہوئی بات۔''

شرک میں مبتلا ہونے کی وجہ اور بِلا دلیل اِتباعِ آباء کی مذمّت

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: یہ اپنے مغالطہ لگنے کی وجہ بیان کرتے ہیں، ''انہوں نے یہ بات بھی ذکر کی کہ ہم یہ سمجھے تھے کہ انسان اور جن ہرگز اللہ کے اُوپر جھوٹ نہیں بول سکتے'' اس لیے ہم نے اپنے بڑوں کا اعتبار کرلیا، کہ جو یہ

کہتے ہیں سچ ہی کہتے ہوں گے، جب یہ کہتے تھے کہ فلاں اللہ کی بیوی ہے، فلاں اللہ کی اولاد ہے، اور فلاں اللہ کے ساتھ شریک ہے، تو ہم نے اس اعتماد پر مان لیا کہ ہم سمجھتے تھے کہ انسان ہو یا جن، اللہ پہ جھوٹ نہیں بول سکتا، اس لیے ان وڈیروں کا اعتبار کر کے ہم نے بھی وہی عقیدہ اختیار کر لیا، لیکن یہ حقیقت تو اَب کھلی کہ انسان بھی اللہ کے متعلق جھوٹ بولتے ہیں اور جن بھی اللہ کے متعلق جھوٹ بولتے ہیں۔ تو جس سے اس بات کی طرف نشاندہی ہوگئی کہ صرف اس بات کو دیکھ لینا کہ اُوپر سے یہ بات چلی آرہی ہے، یا پھر ہمارے بڑوں نے یوں کہہ دیا تو وہ بات سچی ہی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کے متعلق اس قسم کا عقیدہ اختیار کر لینا، یہ کوئی تحقیق پسندی نہیں ہے، دیکھنا تو یہ ہے کہ دلیل کے تحت بات ٹھیک ہے کہ نہیں؟ اب اللہ کی یہ کتاب سُن کر، قرآن سُن کر ہمیں پتا چلا کہ یہ تو بہت جھوٹ بولتے ہیں، بڑی غلط بیانی کرتے ہیں، اور ہم پہلے اعتماد میں مارے گئے کہ ہم سمجھتے تھے کہ یہ سچ ہی کہتے ہیں، جھوٹ بولنے کی ان کو عادت نہیں ہے، اور اکثر و بیشتر لوگ اسی طرح سے پھنسا کرتے ہیں، کسی پر اعتماد کر لیا، جو کچھ اس نے کہہ دیا اسی کے متعلق عقیدہ اختیار کر لیا، یہ نہیں دیکھنا کہ قرآن میں کیا آتا ہے؟ حدیث میں کیا آتا ہے؟ اور یہ علمی تحقیق کے مطابق ہے یا نہیں؟ تو جاہلوں کے پیچھے لگ جانا، سفہاء کے پیچھے لگ جانا، اپنی برادری کے بڑے لوگوں کے پیچھے لگ جانا، یہی وجہِ مغالطہ ہے، جس کو جنّات اپنے متعلق بھی ذکر کرتے ہیں، ''ہم میں سے نادان آدمی بولتا تھا اللہ پہ حد سے بڑھی ہوئی بات، اور ہم یہ گمان کرتے تھے کہ ہرگز نہیں بولے گا انسان اور جن اللہ کے اُوپر کوئی جھوٹ۔''

مشرکین نے جنّات کا دماغ مزید خراب کر دیا

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا: اور انہوں نے یہ تذکرہ بھی کیا کہ انسانوں میں سے کچھ آدمی تھے جو پناہ لیتے تھے جنوں میں سے کچھ آدمیوں کی، اس سے معلوم ہوگیا کہ ''رِجال'' کا لفظ جنّات پر بھی بولا جاتا ہے، كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ: انسانوں میں سے رجال، يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ: جنوں میں سے رجال کے ساتھ پناہ لیتے تھے، فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا: رھق کا اصل مفہوم ہوا کرتا ہے کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا، ظلم، تعدی، زیادتی بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے، تو فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا کا معنی یہ ہوگیا کہ اُن انسانوں نے اِن جنوں کو رھق بڑھا دیا، زیادہ کر دیا اُن انسانوں نے اِن جنوں کو از روئے رھق کے، رھق کا معنی اگر ظلم اور زیادتی لے لیا جائے تو اس کا معنی ہوگا ظلم و زیادتی میں اِن جنوں کو بڑھا دیا، مطلب یہ ہوا کہ یہ انسانوں کی غلطی ہے، اور یہ مشرکین اس غلطی میں مبتلا تھے جس کی نشان دہی یہ جن کر رہے ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشرک جس وقت کہیں سفر پہ جاتے، ان کا خیال یہ تھا کہ یہ وادیاں اور یہ پہاڑ جنّات کے مساکن ہیں، جنّات ان میں ٹھہرتے ہیں، اور جنوں کے مقابلے میں یہ مرعوب حد سے زیادہ تھے، مشرک قوم جو بھی ہوتی ہے ویسے ہی بزدل ہوتی ہے، مرعوبیت ان میں بہت ہے، آپ کے پڑوس میں سب سے بڑی مشرک قوم جس جیسی مثال دُنیا میں موجود نہیں، وہ ''ہندو'' ہیں، اور یہ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کو پوجتے ہیں، ان کے دیوتاؤں کی تعداد جن کو یہ پوجتے ہیں ۳۳ کروڑ ہے، جن میں سے یہ بڑے بڑے ہیں جن کا پہلے ذکر آیا ہے، ''برہما'' سب سے بڑا ہے، اس لیے ان کا مذہبی طبقہ ''برہمن'' کہلاتا ہے اُسی بت کی طرف نسبت کی وجہ سے، ''برہمن'' یہ مذہبی طبقہ

ہے ہندوؤں کا''برہما'' بت کی طرف نسبت کی بنا پر وہ''برہمن'' کہلاتے ہیں، اور ان کی بزدلی جنات کے مقابلے میں قابلِ دید اور قابلِ شنید ہے، اتنی کثرت کے ساتھ یہ جنات سے متاثر ہوتے ہیں، اور اتنا اُن کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اور ان کا نام کی پکاریں کرتے ہیں، اور ان کی جگہیں متعین کی ہوئی ہیں جہاں جا کر مختلف قسم کی چیزیں، جانور چھوڑ کر آتے ہیں، کبھی ذبح کر کے ڈال کے آتے ہیں صرف جنات کو خوش کرنے کے لئے تا کہ ہمیں یہ تکلیف نہ پہنچائیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کے مشرکین کے نظریات بھی ایسے ہی تھے، جنات کے مقابلے میں بہت ڈرتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے، اُن سے مرادیں مانگتے، ان کے نام کی نیاز مانتے، بچہ پیدا ہوتا تو اس کی طرف سے مختلف قسم کے نذرانے جنات کی جگہوں پر جا کر چھوڑتے جن کے متعلق سمجھتے تھے کہ یہ جنات کی جگہیں ہیں، جا کر چھوڑ آتے، جانور زندہ چھوڑتے، ذبح کرتے، حتیٰ کہ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ جنوں کے نقصانات سے بچنے کے لئے ان کو خوش کرنے کے لئے بچوں تک کی قربانی دیتے تھے، سورۂ انعام کے اندر ذکر آیا تھا کہ قتلِ اولاد کو بھی اِن کے شرکاء نے اِن کے لئے مزین کر رکھا ہے، وہ یہی تھا کہ کاہن اِن کو کہتے کہ تمہارے اتنے بچے ہو گئے ہیں، تم ایک بچہ جنوں کے نام پر قربان کردو تو بچ جاؤ گے، ورنہ سب کو جن کھا جائے گا، بچوں تک کی بھینٹ چڑھاتے تھے، قربانی دیتے تھے۔تو یہ جنات کہتے ہیں کہ آدمیوں میں سے بعض رجال نے، بعض آدمیوں نے جو جنوں کی پناہ پکڑنی شروع کر دی، اُن کے ساتھ تعوّذ کرنا شروع کر دیا کہ ہمیں بُرائی سے بچاؤ، تو انہوں نے جنوں کا دِماغ اور خراب کر دیا، ان کی نخوت اور غرور آسمان پہ پہنچ گیا، وہ سمجھتے ہیں کہ دیکھو! ہم آپس میں ایک دُوسرے کے سردار تو تھے ہی، انسانوں نے بھی ہمیں سردار مان لیا، جس سے اُن کا ظلم، تعدی اور اس قسم کی حرکتیں زیادہ ہو گئیں، یعنی انسان اُن کے سامنے اس طرح سے مرعوب جو ہوا جیسے میں نے عرض کیا کہ جب یہ باہر وادیوں میں جاتے تو یہ سمجھتے کہ یہ جنوں کی وادی ہے، کوئی جن ہمیں نقصان نہ پہنچائے، تو وہاں جا کر یوں کہا کرتے تھے کہ''ہم اِس وادی کے سردار جن کی پناہ میں آتے ہیں اس وادی کے اَشرار جن سے بچنے کے لئے'' یعنی تا کہ یہاں کے اَشرار جن جو ہیں، وہ ہمیں تکلیف نہ پہنچائیں، جو اِس وادی کا سردار ہے ہم اس کی پناہ میں آتے ہیں، اس طرح سے اپنی زبان سے وہ کلمات ادا کرتے جس سے جنوں کا دماغ اور خراب ہوتا، کہ انسانوں نے بھی ہماری عظمت کا اعتراف کر لیا، اور وہ اور شرارتوں پہ آمادہ ہوتے۔تو یہ ذِکر کر دیا کہ جنوں کے بگڑنے کا سبب، وہ بھی انسانوں کا تعوّذ ہے، اور اِنسانوں کی بزدلی، کہ اللہ کی پناہ میں آنے کی بجائے وہ بھی جنوں کی پناہ مانگتے ہیں، جس دُشمن سے بچنا ہے، اسی سے ہی پناہ مانگتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے سامنے یہ پست ہو گئے، اور جب دُشمن کے سامنے انسان پست ہو جاتا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ پھر دُشمن اس کو خوب دباتا ہے، اس لیے اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے جنوں کے ظلم وستم میں اضافہ کر دیا کہ جن انسانوں کو اور زیادہ پریشان کرنے لگ گئے، اور اس پریشانی کے نتیجے میں پھر اور زیادہ دِن بہ دِن انسان ان کے سامنے مرعوب ہوتا چلا گیا۔عورتوں کو لگ جاتے، کہتے کہ وہاں بکرا چڑھاؤ، بچوں کو لگ جاتے، کہتے فلاں کام کرو تب چھوڑیں گے، تو دِن بہ دِن انہوں نے انسانوں کے اُوپر بوجھ زیادہ ڈال دیا انسانوں کی اس مرعوبیت کے نتیجے میں، اس لیے جتنا انسان اِن سے ڈرتا ہے اتنا ہی یہ سر چڑھتے ہیں، اور جتنا انسان ان سے مستغنی ہو کر رہے، ان کی پروا نہ

کرے، اتنا ہی یہ اثر نہیں ڈال سکتے۔"انسانوں میں سے کچھ رجال ہیں جو پناہ پکڑتے ہیں جنوں میں سے رجال کی، پس اُن انسانوں نے اِن جنوں کو اَزروئے ظلم کے زیادہ کردیا" یعنی جنوں کا ظلم وستم بڑھادیا، وہ اور زیادہ ظالم ہوگئے۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ: اور یہ بھی انہوں نے آپس میں ذکر کیا کہ بے شک انسانوں نے بھی سمجھا تھا جیسے تم نے سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نہیں اُٹھائے گا، اس سے معلوم ہوگیا کچھ جن بھی بعث بعد الموت کے منکر تھے، آپس میں ذکر کرتے ہیں کہ انسان بھی اسی غلطی میں پڑے ہوئے تھے کہ مرنے کے بعد اللہ کسی کو نہیں اُٹھائے گا، تم بھی اسی طرح سے غلطی میں پڑے ہوئے ہو۔"انہوں نے ذکر کیا کہ بے شک انہوں نے گمان کیا تھا یعنی انسانوں نے جیسے کہ تم نے گمان کیا کہ نہیں اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ ہرگز کسی کو۔"

جنّات کے اُوپر جانے پر پابندی

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا: اور انہوں نے یہ بات بھی ذکر کی کہ ہم نے چھوا آسمان کو، یعنی ہم آسمان کو لمس کرنے کے لئے گئے، سماء عالمِ بالا کو کہتے ہیں جو بادلوں پر بھی صادق آتا ہے، "ہم نے چھوا آسمان کو، آسمان کو ہم نے ٹٹولا، فَوَجَدْنٰهَا: پس پایا ہم نے اُس سماء کو، مُلِئَتْ: بھر دیا گیا، حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا: حرس یہ اسمِ جمع ہے "حارِس" کی، اور "حارس" کہتے ہیں پہرے دار کو، تو "شدیدًا" یہ چونکہ صفت مفرد آئی ہوئی ہے اس لیے ہم حرس کو اسمِ جمع کہتے ہیں (آلوسی)، "سخت پہرے داروں کے ساتھ اور انگاروں کے ساتھ" شہب شِہاب کی جمع، بھڑکتا ہوا انگارہ، شعلہ، "شعلوں کے ساتھ اور سخت پہرے داروں کے ساتھ وہ آسمان بھر دیا گیا ہے" یعنی جس طرح سے پہلے ہم آتے جاتے تھے اب ایسا نہیں، اب نگرانی لگ گئی، بہت سخت پہرے دار وہاں موجود ہیں یعنی فرشتے، اور "شہب" موجود ہیں جن کے ذریعے سے اب حفاظت کی جاتی ہے اور ہمارا داخلہ وہاں ممنوع کردیا گیا ہے۔ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا: اور بے شک ہم بیٹھا کرتے تھے اُس آسمان سے سننے کی جگہوں میں، مقاعد مقعد کی جمع، بیٹھنے کی جگہ، سننے کے ٹھکانے، ہم ایسی جگہوں میں بیٹھ جایا کرتے تھے جو ہمارے ٹھکانے بنے ہوئے تھے باتیں سننے کے لئے، فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ: اور جو اَب سننے کی کوشش کرے گا، جو اَب سنتا ہے، يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا: تو پاتا ہے وہ اپنے لئے ایک شعلہ تیار، رَّصَدًا کے معنی منتظر، ایک شعلہ تیار پڑا ہوتا ہے اس کی طرف آنے کے لئے، یعنی یوں معلوم ہوتا ہے جب سننے کے لئے جائیں جیسے وہ شعلہ ہمارے لیے منتظر ہی تھا کہ کب آتے ہیں تو میں ان کے اُوپر لگوں، یہ سنگ باری یا بمباری اُن کے اُوپر ہوتی ہے، وہ واقعہ جو پیش آیا تھا اُس کی تفصیل گویا کہ اِن آیات کے اندر ذکر کررہے ہیں۔"جو کوئی سنتا ہے اب، پاتا ہے اپنے لیے ایک تیار شعلہ۔"

قرآنی اِنقلاب کا نتیجہ سمجھنے سے جنّات کا عجز

وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ: اور ہم نہیں جانتے کہ مَنْ فِي الْاَرْضِ کے متعلق کسی بُرائی کا ارادہ کیا گیا ہے؟ اَشَرٌّ اُرِيْدَ: کیا "شر" کا ارادہ کیا گیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں موجود ہیں؟ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا: یا ارادہ کیا ان کے متعلق ان کے رَبّ نے بھلائی کا؟ یعنی یہ جو انقلاب آیا ہے کہ اللہ نے رسول بھیج دیا، کتاب اُترنی شروع ہوگئی، اس کا نتیجہ زمین والوں کے

حق میں کیا نکلتا ہے ہم ابھی یہ سمجھنے سے عاجز ہیں، اگر تو انہوں نے اس کو قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ کا اِرادۂ تکوینی مخلوق کو بھلائی کی طرف لے جانے کا ہے، اور اگر یہ تکذیب پر اُتر آئے اور اِنکار کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آ جائے گا تو اللہ کا اِرادۂ تکوینی ان کو عذاب کی طرف لے جانے کا ہے، نتیجہ کیا نکلے گا اس واقعے کا؟ اس کو ابھی ہم سمجھ نہیں سکتے، آپس میں انہوں نے تذکرہ کیا "ہم نہیں جانتے کہ اِس واقعے کے ساتھ اہلِ زمین کو کسی تکلیف میں مبتلا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق بھلائی کا ارادہ کیا ہے" نتیجہ کیا نکلے گا؟ اللہ کا اِرادۂ تکوینی کیا ہے؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، اگر تو یہ لوگ اِس ہدایت کو قبول کر لیں تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِرادۂ تکوینی یہی ہے کہ مخلوق بھلائی کی طرف چلی جائے، اور اگر یہ قبول نہیں کرتے تو عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

جنّات میں کچھ اچھے ہیں اور کچھ بُرے ہیں

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ: اور انہوں نے ذِکر کیا کہ بے شک ہم میں سے کچھ اچھے لوگ بھی ہیں اور کچھ اس کے علاوہ ہیں، كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا: طرائق طریقہ کی جمع ہے، اور قِدَدْ یہ قِدَّةٌ کی جمع ہے، كُنَّا ذَوِیْ طَرَائِقَ قِدَدٍ، جس وقت "ذَوِی" کا لفظ محذوف نکالیں گے طرائق مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہو جائے گا، اور اب یہ "قِدَدًا" منصوب ہے "طرائق" کی صفت کے طور پر، مختلف طریقے، "بے شک ہم مختلف طریقوں والے تھے" کوئی صالح ہے، کوئی اس کے علاوہ کسی دوسرے طریقے پہ ہے۔

جنّات کا اِعترافِ عجز

وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ: اور بے شک ہم نے سمجھ لیا کہ ہم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے زمین میں، ہرگز نہیں عاجز کریں گے ہم اللہ کو زمین میں، وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا: اور ہم ہرگز نہیں عاجز کر سکتے اُس کو بھاگ کر، تو فِی الْاَرْضِ کے مقابلے میں آگے لفظ فی السماء مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو زمین میں کہیں چھپ کے ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں کہ اللہ پکڑنا چاہے اور ہم پکڑے نہ جائیں، اور نہ آسمان کی طرف بھاگ کر کہیں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں کہ ہم اُس کی گرفت میں نہ آئیں، زمین و آسمان میں کسی جگہ بھی اب ہمارے لیے پناہ نہیں ہے، جہاں بھی ہم جائیں گے پکڑے جا سکتے ہیں۔

اِیمان کا اِظہار اور دُوسروں کو ترغیب

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ: اور انہوں نے یہ بات بھی آپس میں ذکر کی کہ جب ہم نے ہدایت سنی ("ہدایت" کا مصداق قرآنِ کریم) ہم اس پہ اِیمان لے آئے، فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ: پس جو شخص بھی اپنے رَبّ پر اِیمان لائے گا، فَلَا یَخَافُ بَخْسًا بخس کمی کو کہتے ہیں، پس نہیں اندیشہ کرے گا وہ کمی کا، وَّ لَا رَهَقًا: نہ ظلم کا، تعدی کا، یعنی اس کی کوئی نیکی بلا وجہ گھٹا دی جائے یا بلا وجہ اس کے اُوپر کوئی گناہ کا بوجھ ڈال دیا جائے، کوئی بات بھی نہیں، بالکل عدل و انصاف کے ساتھ اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ: اور انہوں نے یہ بات بھی ذکر کی کہ بے شک ہم میں سے کچھ مسلمان ہیں اور کچھ ظالم ہیں، قاسط ظالم کے معنی میں، فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا: پس جو شخص بھی اسلام لائے گا یہی لوگ ہیں جنہوں نے بھلائی پالی، تحرّی کا معنی ہے

پالیا، انہوں نے قصد کیا بھلائی کا، کوشش کر کے انہوں نے بھلائی پالی، وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا: لیکن ظالم لوگ، وہ جہنم کے لئے ایندھن بنیں گے، حطب کہتے ہیں ایندھن کو، قاسط یہ لفظ لیا گیا ہے قسط سے، قسط انصاف کو کہتے ہیں، اور مجرد سے یہ استعمال ہو تو یہ ظلم کے معنی میں ہوتا ہے، اور باب اِفعال سے اگر آئے تو پھر یہ انصاف کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اَقسط: انصاف کرنا، مُقسِط: انصاف کرنے والا، اور قاسط ہو جائے گا ظلم کرنے والا، قُسوط ظلم کو کہتے ہیں، اور قِسط عام طور پر انصاف کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن فعل جس وقت مجرد سے آئے تو اس میں ظلم والا معنی ہے، اور باب اِفعال سے اگر آئے تو اس میں انصاف کرنے والا معنی ہے، حطب ایندھن کو کہتے ہیں۔

مشرکینِ مکہ کو ترغیب وترہیب

وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا: فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا پر جنوں کے حالات کا تذکرہ ختم ہو گیا جو انہوں نے آپس میں کیا تھا، جنوں نے جو تاثر قرآنِ کریم کے متعلق لیا تھا اور اپنی قوم کے سامنے جا کر جو کچھ ذکر کیا اس کی تفصیل ہو چکی، آگے اسْتَقَامُوْا کی ضمیر مشرکینِ مکہ کی طرف ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو باتیں حضور ﷺ کو بتائی گئیں، وحی کی گئیں، ان باتوں میں یہ بھی ہے، کہ اگر یہ لوگ سیدھے راستے پر اِستقامت اِختیار کرتے، طریقہ راستے کو کہتے ہیں اور یہاں سے صراطِ مستقیم مراد ہے، ''اگر یہ سیدھے راستے پر اِستقامت اختیار کرتے'' لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا: مَآءً غَدَقًا: ماءِ کثیر، ''تو ہم پلاتے ان کو بہت پانی'' تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان دنوں میں اُتری تھی جن دِنوں میں اہلِ مکہ قحط کے اندر مبتلا تھے، جس کا ذکر روایات میں آتا ہے (جلالین)، ''اگر یہ سیدھے راستے پر قائم رہتے، اِستقامت اِختیار کرتے تو ہم ان کو پلاتے کثیر پانی'' لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ: اور وہ کثیر پانی پلانا بھی آزمائش کے لئے ہی ہوتا، کہ آگے وہ کتنا شکر ادا کرتے ہیں اور کتنی ناشکری کرتے ہیں، ''تاکہ آزمائیں ہم ان کو اس میں'' وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ: جو کوئی اپنے رَبّ کی نصیحت سے اِعراض کرے گا، يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا: داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں، صَعَدًا یہ عذاب کی صفت ہے، صَعَدًا کا ترجمہ عام طور پر شدید کے ساتھ کیا گیا ہے، سخت عذاب، اور صعد یہ لفظ صعود سے ہے، چڑھنے کے معنی میں آتا ہے، تو صَعَدًا کے اندر یہ مفہوم ہے کہ ایسا عذاب جو دِن بہ دِن ترقّی کرتا چلا جائے گا، جیسے زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (سورۂ نحل: ۸۸) اس قسم کے الفاظ آتے ہیں، کہ ہم ان کے لئے عذاب دِن بہ دِن زیادہ کریں گے، تو عَذَابًا صَعَدًا کا مطلب یہ ہو گیا چڑھتا ہوا عذاب، یعنی آئے دِن اس میں ترقّی ہوتی چلی جائے گی، ہم اس قسم کے عذاب میں انہیں داخل کریں گے، تو سخت والا مفہوم بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔

اللہ کی مساجد میں غیر اللہ کو پکارنا کس قدر بدتمیزی ہے!

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ: اور میں اس بات کا حکم بھی دیا گیا ہوں کہ مساجد اللہ ہی کے لئے ہیں، مساجد اگر یہ جمع مسجد کی ہو جیم کے کسرہ کے ساتھ، تو پھر اس سے یہی مسجد مراد ہے جو اللہ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہے، آپ پڑھا کرتے ہیں کہ سَجَدَ يَسْجُدُ: سجدہ کرنا، اس میں لغوی مفہوم کے طور پر ظرف کا صیغہ آنا چاہئے مَسْجَد سجدہ کرنے کی جگہ، اور یہ جو بنی ہوئی مسجدیں ہیں یہ لفظ جیم

کے کسرہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مسجد: نماز پڑھنے کے لئے جگہ جو بنائی گئی ہو، تو اگر یہاں مساجد سے یہی مسجدیں مراد ہوں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ مسجدیں جتنی بھی ہیں سب اللہ کے لئے ہیں، تو مسجدوں میں جا کر غیر اللہ کو پکارنا یہ کوئی شرافت نہیں ہے، صیغہ عموم کا آ گیا لیکن مقصد یہاں ہوگا صرف مسجدِ حرام کے متعلق، یہ بیت اللہ، مسجدِ حرام جو مکہ معظمہ میں ہے، یہ اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ کا گھر ہے، اور وہاں پھر غیر کو پکارنے کی کیا گنجائش رہی؟ اور عموم کا صیغہ استعمال کر لیا تا کہ دُنیا میں جتنی بننے والی مسجدیں ہیں سب اس میں آ جائیں، جیسا کہ سورۂ براءت کے اندر لفظ آیا تھا مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ (آیت:۱۷) مشرکوں کے لئے یہ مناسب ہی نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، مسجدوں کا بنانا، مسجدوں کو آباد کرنا تو مؤمنین کا کام ہے، مشرکین کا کام نہیں ہے، تو وہاں بھی مشرک جس مسجد کو آباد کرتے تھے وہ مسجدِ حرام ہے، لیکن عموم کا صیغہ اختیار کر لیا گیا یہ بتانے کے لئے کہ جو مسجد بھی ہو اس کا حکم اسی طرح سے ہے، تو یہاں بھی اصلاً تو ذِکر ہے مسجدِ حرام کا، لیکن عنوان جمع کا لے آئے تا کہ معلوم ہو جائے کہ دُنیا میں جتنی بھی مسجدیں ہوں گی، جو ''مسجد'' کے نام سے عمارت بنے گی وہ اللہ کے لئے ہی ہے، اس کے اندر کسی غیر کی پُوجا کرنا، غیر کو پکارنا بالکل صحیح نہیں ہے، تو پھر اس سے مسجدیں بھی مراد ہو سکتی ہیں، اور مشرکین کو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی مسجد میں، اللہ کے گھر میں تم جو غیر اللہ کو پکارتے ہو یہ کتنی بدتمیزی ہے..... اور اگر مَسْجِد کی جمع اس کو بنایا جائے لغوی مفہوم کے طور پر، پھر یہ مصدر میمی ہے، سجدے کے معنی میں، ''یہ بات بھی میرے سامنے ذِکر کی گئی کہ سجدے سارے کے سارے اللہ ہی کے لئے ہیں'' اللہ کے غیر کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ مسئلہ آپ کے سامنے آ ہی گیا کہ سجدۂ عبادت تو ویسے ہی شرک ہے، تعظیماً بھی سجدہ کرنا ہماری شریعت میں کسی غیر کے لئے دُرست نہیں ہے، ''سجدے سارے اللہ ہی کے لئے ہیں'' فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا: پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارا کرو۔

مشرکین اللہ کو پکارنے کی بجائے اللہ کو پکارنے والے کا اِستہزا کرتے ہیں

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا: اور یہ بات بھی ذِکر کی گئی کہ جس وقت اللہ کا بندہ کھڑا ہوتا ہے اللہ کو پکارتا ہے، قریب ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں اس کے اُوپر ٹھٹھ کے ٹھٹھ۔ لِبَدًا یہ لِبْدَة کی جمع ہے، لبدة کہتے ہیں نمدے کو، اصل مفہوم اس کا یہ ہوا کرتا ہے کہ چیز پر چیز رکھ کر جوڑتے چلے جائیں تو جو ایک مجموعہ بن جاتا ہے اس کو ''لِبْدَة'' کہتے ہیں، اس لیے جو لوگ بھیڑ کر لیا کرتے ہیں تو یہ جماعت جو بن جاتی ہے تو اس کو بھی ''لِبْدَة'' سے تعبیر کر دیتے ہیں، ''جماعتوں کی جماعتیں اس کے اردگرد اکٹھی ہو جاتی ہیں'' یعنی مسجد اللہ کے لئے ہے وہاں اللہ کو پکارنا چاہیے، لیکن ان مشرکین کا مزاج اتنا خراب ہو گیا کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ مسجد میں کھڑا ہو کے اللہ کو پکارتا ہے تو یہ تعجب کے ساتھ یا اس کے ساتھ اِستہزا اور تکذیب کرنے کے لئے جماعتوں کی جماعتیں اس کے اِردگرد جمع ہو جاتی ہیں، تو کتنا ان کا فہم بگڑ گیا، حالانکہ مسجد تو ہے ہی اللہ کے لئے، وہاں پکارنا ہی صرف اللہ کو چاہیے، لیکن یہ اس توحید کے طرز سے اتنے اجنبی ہو گئے اور مسجد کے مقصد سے اتنے غافل ہو گئے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ مسجد میں اکیلے اللہ کو پکارتا ہے تو یہ تعجب کے ساتھ یا اس کا مذاق اُڑانے کے لئے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اکٹھے ہو جاتے ہیں، یہ مشرکین کے مزاج کا فساد ہے۔ اور ''عبداللہ'' سے مراد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کہ جب وہ توحید کا وعظ کہتے، کوئی ایسی سورتیں پڑھتے جن میں توحید کا ذکر آتا، تو مشرکین سب اکٹھے

ہوجاتے تھے، تماشا دیکھنے کے لئے، اِستہزا کرنے کے لئے، شور مچانے کے لئے۔ تو یہی ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے گھر میں، اللہ کی مسجد میں اللہ کو پکارنا اس علاقے کے اندر کتنا عجیب سا ہو گیا ہے، حالانکہ مسجد تو تھی ہی اللہ کے لئے، وہاں کسی دُوسرے کو پکارنے کا سوال ہی نہیں تھا، ''جب کھڑا ہوتا ہے اللہ کا بندہ، پکارتا ہے اس کو، قریب ہے کہ اس کے اُوپر ہو جائیں جماعت در جماعت'' گروہ در گروہ، ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں، اُردو میں ایسے موقع پر ''ٹھٹھ'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ
آپ کہہ دیں کہ میں پکارتا ہوں اپنے رَبّ کو اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ﴿۲۰﴾ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک میں نہیں اختیار رکھتا
لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ
تمہارے لیے نقصان کا نہ بھلائی کا ﴿۲۱﴾ آپ کہہ دیجئے کہ ہرگز پناہ نہیں دے گا مجھے اللہ کے مقابلے میں کوئی بھی، اور نہیں پاؤں گا میں اللہ کے علاوہ
مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
کوئی پناہ گاہ ﴿۲۲﴾ مگر اللہ کی طرف سے پہنچانا اور اس کے اَحکامات کا ادا کرنا (میرے ذِمّے ہے)، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا
فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ
پس بے شک اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ رہنے والا ہوں گے اس میں ﴿۲۳﴾ (یہ باز نہیں آئیں گے) حتّٰی کہ جب دیکھیں گے اس چیز کو جس کا یہ وعدہ دیے
فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ
جاتے ہیں تو عنقریب جان لیں گے یہ کہ کون زیادہ کمزور ہے از روئے مددگار کے اور کون زیادہ کم ہے از روئے عدد کے ﴿۲۴﴾ آپ کہہ دیجئے، میں نہیں جانتا
اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ
کہ جس چیز کا تم وعدہ دیے جاتے ہو وہ قریب ہے یا اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی مدّت دراز قرار دی ہے ﴿۲۵﴾ وہ غیب جاننے والا ہے
فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ
نہیں مطلع کرتا اپنے غیب پر کسی کو ﴿۲۶﴾ مگر جس رسول کو وہ پسند کرلے، پس بے شک بھیجتا ہے
مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ
اس رسول کے سامنے اور اس کے پیچھے محافظ فرشتے ﴿۲۷﴾ تاکہ اللہ معلوم کرلے کہ ان لوگوں نے اپنے رَبّ کے پیغامات پہنچا دیے ہیں، اور

أَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

احاطہ کیا اللہ نے ان چیزوں کا جو ان کے پاس ہیں، اور گن لیا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گننا ﴿٢٨﴾

تفسیر

منصبِ نبوّت کی وضاحت

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ تمہیں میرے طریقے سے یہ اجنبیت کیوں ہے؟ یا تم تعجب کیوں کرتے ہو؟ میرا طریقہ تو صاف ہے، ''آپ کہہ دیں کہ میں پکارتا ہوں اپنے رب کو'' وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا: میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ قُلْ: آپ کہہ دیجئے کہ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا: بے شک میں نہیں اختیار رکھتا تمہارے لیے نقصان کا نہ بھلائی کا، نقصان کا نہ نفع کا، ہدایت کا نہ ضلالت کا، مجھے کوئی اختیار نہیں، میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام آتے ہیں وہ پہنچانے والا ہوں، جیسے الفاظ آگے آرہے ہیں۔ باقی! میں کوئی عجیب قسم کا دعویٰ نہیں رکھتا، کوئی عجیب قسم کے اختیارات کا مدعی نہیں ہوں، ''نہیں اختیار رکھتا میں تمہارے لیے نقصان کا'' اس کے مقابلے میں لفظ آجائے گا نفع کا، اور رَشَد یہ ہدایت اور بھلائی ہو جائے گی تو اس کے مقابلے میں لفظ آجائے گا ضلالت اور غی کا، تمہاری ہدایت اور ضلالت، تمہارا نفع اور نقصان یہ میرے بس میں نہیں ہے، میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں، اللہ کے پیغام پہنچاتا ہوں، باقی! نفع نقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہدایت بھی اسے نصیب ہوگی جس کو اللہ دے گا، میرے اختیار میں اس قسم کی چیزیں اللہ نے نہیں دیں۔ قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ: یہ جواب ہے ان کے مطالبے کا جو مطالبہ کرتے ہیں کہ تو بھی ہمارے والا طریقہ اختیار کرلے، یا اس قرآنِ کریم کے اندر کچھ تبدیلی لے آ، سورۂ یونس کے اندر جس طرح سے آیا تھا کہ یہ کہتے ہیں کہ اِس کو بدل دے یا کوئی اور قرآن لے آ،[1] تو ان لفظوں میں اس کا جواب دیا جارہا ہے، کہ اگر میں اِس طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کروں گا تو آپ کہہ دیجئے کہ ہرگز پناہ نہیں دے گا مجھے اللہ کے مقابلے میں کوئی بھی، اور نہیں پاؤں گا میں اللہ کے علاوہ کوئی مُلْتَحَدًا، اِلْتَحَدَ: ایک جانب کو ہٹنا۔ ملتحد سے مراد ہوجائے گا عذاب سے بچنے کی جگہ، ''کوئی پناہ نہیں دے گا مجھے اللہ کے مقابلے میں اور نہیں پاؤں گا میں اللہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ'' اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں اور اللہ کی گرفت میں آجاؤں، اللہ کا عذاب آجائے تو مجھے کوئی انسان نہیں بچا سکتا، اور کوئی جگہ نہیں ہے جہاں جا کر میں چھپ جاؤں، میں بھی اللہ کے عذاب کا نشانہ بن جاؤں گا، إِلَّا بَلَاغًا مِّنَ اللَّهِ وَرِسَالَاتِهِ: اس کا تعلق ہے لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا کے ساتھ، نفع نقصان کا تو میں مالک نہیں ہوں، تمہارا نفع نقصان میرے ہاتھ میں نہیں دیا گیا، میں کسی چیز کا تمہارے لیے اختیار نہیں رکھتا سوائے تبلیغ کے، اللہ کے احکام کا پہنچا دینا میرے ذمے ہے، اللہ کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغامات کا ادا کرنا

---

(۱) قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ (آیت: ۱۵)

یہ میرے ذمے ہے، اور یہ کام میں کر رہا ہوں، رسالات رسالہ کی جمع، یہاں سے پیغامات مراد ہیں، "اللہ کی طرف سے پہنچانا اور اس کے احکامات کا ادا کرنا یہ میرے ذمے ہے۔"

اللہ اور اس کے رسول کے نافرمانوں کا انجام

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا: اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا پس بے شک اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں، حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضْعَفُ نَاصِرًا وَأَقَلُّ عَدَدًا: یہ حتیٰ کے بعد غایت ہے، اس کا مُغَیّا محذوف ہے، یعنی اس طرح سے سمجھانے کے باوجود یہ مشرکین باز نہیں آئیں گے جب تک کہ یہ واقعہ نہ پیش آ جائے، یعنی بظاہر معلوم یونہی ہوتا ہے کہ جب تک عذاب ان کے سامنے نہیں آئے گا اس وقت تک یہ ماننے والے نہیں، آج ان کو اپنے مددگاروں پر ناز ہے، اپنے جتھے پر یہ نازاں ہیں، اور اپنے مال و دولت پر غرور کرنے والے ہیں، جس وقت اللہ کا عذاب سامنے آ جائے گا تب ان کو پتا چلے گا کہ غلطی پر کون تھا اور مددگار کس کے کمزور ہیں؟" یہ باز نہیں آئیں گے حتیٰ کہ جب دیکھیں گے اس چیز کو جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں تو عنقریب جان لیں گے یہ مشرک کہ کون زیادہ کمزور ہے از روئے مددگار کے اور کون اقل ہے از روئے عدد کے" آج ان کو اپنی جماعت پر بہت اعتماد ہے، لیکن معلوم ہوگا کہ اللہ کے فرشتوں کے مقابلے میں اور حضور ﷺ کے ناصروں کے مقابلے میں یہ تو بہت ہی کم تعداد میں ہیں، "کون زیادہ کم ہے از روئے تعداد کے۔"

قیامت کی تعیین نبی کو بھی معلوم نہیں!

قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا: اور جب بھی اس قسم کے عذاب کا ذکر آتا ہے تو پھر وہ پوچھنے والے پوچھتے ہیں، یہ بھی استہزا کے طور پر، کہ وہ کب آئے گا؟ تو آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ مَا تُوعَدُونَ قریب ہے یا اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی مدت مدید متعین کی ہے، جس چیز کا تم وعدہ دیے جاتے ہو وہ قریب ہے یا اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے کوئی مدت دراز قرار دی ہے، مجھے نہیں معلوم۔

اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر صرف رسولوں کو پوری حفاظت کے ساتھ مطلع کرتا ہے

عَالِمُ الْغَيْبِ: غیب کا جاننے والا وہ ہے، اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے، فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا: وہ اپنے غیب کے اُوپر کسی کو مطلع نہیں کرتا، چھپی چھپائی چیزیں راز اور بھید کی جتنی ہیں وہ سب اللہ کے پاس ہیں، اللہ تعالیٰ اس غیب کے اُوپر کسی کو مطلع نہیں کرتا، ہاں جو رسول اللہ پسند کرلے، جس طرح سے آگے ذکر آ گیا، اس پر اللہ تعالیٰ اپنے پیغامات پہنچاتے ہیں اور پوری حفاظت کے ساتھ پہنچاتے ہیں، اور اس میں کوئی کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہونے دیتے، پہرے دار متعین کر دیتے ہیں، کوئی شیطان اس میں تصرف نہیں کر سکتا، بس جو پیغام کسی رسول کے پاس آتا ہے، جتنا غیب اس پیغام کے ذریعے سے اللہ ظاہر کر دیتا ہے اتنا پتا چل جاتا ہے، اور جو نہ بتائے تو اللہ کے بھیدوں کے اُوپر کوئی دوسرا شخص از خود مطلع نہیں ہو سکتا، "وہ غیب جاننے والا ہے، نہیں مطلع کرتا اپنے

غیب پر کسی کو" اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ: مِنۡ رَّسُوۡلٍ یہ "مَن" کا بیان ہے، مگر جس رسول کو اللہ پسند کر لے، فَاِنَّهٗ یَسۡلُكُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ رَصَدًا: پس بے شک وہ اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے اس رسول کے آگے اور پیچھے نگران، رَصَدًا یہ جمع یعنی راصدین کے معنی میں آجائے گا، محافظین اللہ بھیج دیتا ہے، پوری حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پھر اُس تک اپنے پیغامات پہنچاتا ہے، اور وہ رسول بھی بے کم وکاست آگے مخلوق تک پہنچاتا ہے، اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے راز اور بھید کی باتیں جو اللہ پیغام کے ذریعے سے واضح کردے وہ ہوتی ہیں، اور انسانوں کے لئے جو مفید ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ظاہر کرتا ہے، باقی! جو اللہ کے خصوصی غیوب ہیں ان کے اُوپر کوئی مطلع نہیں۔

کسی مخلوق کے پاس کوئی چیز ذاتی نہیں

"علمِ غیب" کے بارے میں آپ کے سامنے عقیدہ بارہا آچکا، کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق جتنی بھی ہے اس کے پاس اپنی ذاتی چیز کوئی نہیں، نہ اس کی ذات نہ اس کی صفات، جو کچھ دیتا ہے اللہ ہی دیتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ بھی اللہ کی مخلوق ہیں، تو جو صفات اللہ نے آپ کو دیں وہ بھی اللہ کی دی ہوئی ہیں، باقی! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو علم دیا، کتنا دیا؟ ذاتی طور پر تو علم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مخلوق کے اندر ہو، جب اس کی اپنی ذات اپنی نہیں ہے، اپنے وجود کے وہ خود مالک نہیں ہیں، تو صفات کے مالک کس طرح سے ہوسکتے ہیں، تو جس طرح سے اللہ نے وجود دیا، اسی طرح سے صفات دیں، ان صفات میں سے ایک علم بھی ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ مخلوق میں سب سے زیادہ علم والے ہیں

"علم" اللہ تعالیٰ دیتا ہے، باقی! کس کو کتنا علم دیا؟ اس کو کسی پیمانے کے ساتھ ماپا نہیں جاسکتا، سرورِ کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کے سب سے اَتم مظہر ہیں، جتنا علم اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے اُوپر منکشف کیا ہے، اتنا کسی پر منکشف نہیں کیا، اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ "اُعْطِیَ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ" "اگلوں پچھلوں کے علوم حضور ﷺ کو دے دیے گئے"،[1] انبیاء ﷺ پر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُتارا اس کا علم بھی حضور ﷺ کو ہوا، اور پیچھے جو کچھ اللہ تعالیٰ کا علم ظاہر ہونے والا تھا حضور ﷺ کو وہ بھی بتایا گیا۔ لیکن کیسا علم؟ جو شریعت سے تعلق رکھتا ہے، جو کسی کمال سے تعلق رکھتا ہے، اور ایسی ایسی جزئیات کا علم کہ جن کا حاصل ہونا انسان کے لئے کمال نہیں وہ حضور ﷺ کو اگر نہ بھی دیا گیا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جس طرح سے مختلف قسم کی صنعتیں ہیں، مختلف قسم کے کاروبار دُنیا کے اندر چلتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ انبیاء ﷺ کو اِس کا علم بھی دیا جائے، کیونکہ یہ کوئی رُوحانی کمال نہیں ہے۔

اللہ نے "علمِ کلّی" اور "علمِ محیط" کسی کو نہیں دیا

سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت علوم دیے لیکن کسی اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ برابری نہیں ہوسکتی، اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ کا سارا علم حضور ﷺ کو حاصل ہوگیا تو یہ یقیناً شرک ہے، جس کے شرک ہونے میں کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں، یوں کہا جائے کہ اللہ نے اتنے علوم دیے کہ مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیے، ساری مخلوق کے علوم اکٹھے کر لیے جائیں تو

(۱) "المهند علی المفند" سوال نمبر ۱۸، فیض الباری للکشمیری ج۶ ص ۷۳ باب لا یدخل الدجال المدینة۔

حضور ﷺ کے علوم ان سے زیادہ ہیں، اِس میں کوئی حرج نہیں، یہ کہہ سکتے ہیں، یہ عقیدہ ٹھیک ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے جو واقعات ذِکر فرمائے قیامت کے، جنّت کے، دوزخ کے، یہ سب علمِ غیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیا، آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے سے قبل جو کچھ ہوا یہ سب علمِ غیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دیا، گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات یہ سب علمِ غیب کا شعبہ ہیں، انہی واقعات میں سے ایسی باتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلّی اور محیط علم کسی کو نہیں دیا، یہ اُس کی اپنی ذات کے ساتھ خاص ہے۔

تعیینِ قیامت کا علم حضور ﷺ کو آخری وقت تک نہیں ملا

حدیث شریف میں آتا ہے اور یہ میدانِ قیامت کا واقعہ ہے، زندگی میں تو آخر زندگی میں جبریل علیہ السلام تشریف لائے،[1] جس کا ذِکر حدیثِ جبریل میں ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''کتاب الایمان'' کی پہلی روایت، جہاں پہ جبریل علیہ السلام نے مختلف سوالات کیے تھے رسول اللہ ﷺ سے، ایمان کیا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ احسان کیا ہے؟ قیامت کب آئے گی؟ تو یہ آخری سوال جو ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ تو حضور ﷺ نے اس کے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ ''مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ'' جس سے پوچھا جارہا ہے قیامت کے متعلق، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔[2] مطلب یہ ہے کہ ''مَن وتُو برابریم در نادانستن'' اس کا علم نہ تجھے، نہ مجھے، جس سے معلوم ہوا کہ ساعت کا علم تعیین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو آخر وقت تک نہیں دیا، جیسے قرآنِ کریم میں صراحت کے ساتھ ذِکر کیا جارہا ہے۔

قیامت کے دِن کے کچھ حالات جو حضور ﷺ کو معلوم نہیں ہوئے

اور پھر جب قیامت کا دِن آئے گا، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ آئیں گے میرے حوض کی طرف پانی پینے کے لیے، اور ان کو راستے میں روک لیا جائے گا...... یہ دیکھو! یہ واقعہ قیامت کا ہونے والا ہے، یہ آنے والے واقعے کو رسول اللہ ﷺ بیان فرمارہے ہیں، یہ دلیل ہے کہ اس واقعے کا علم بھی دیا گیا...... کچھ لوگ میری طرف آئیں گے، ان کو روک لیا جائے گا، میرے تک پہنچنے نہیں دیا جائے گا، میں ان کو پہچانوں گا، کیونکہ انہوں نے میری زندگی میں اسلام قبول کیا تھا، تو میں کہوں گا: ''أُصَيْحَابِي أُصَيْحَابِي'' یہ تو کچھ میرے ساتھی ہیں، ان کو آنے دو میری طرف، فرشتے کہیں گے کہ نہیں نہیں! ''لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ'' آپ کو نہیں پتا کہ انہوں نے آپ کے پیچھے کیا کیا کیا؟[3] اب یہاں حضور ﷺ کو میدانِ محشر میں فرشتے ''لَا تَدْرِي'' کے ساتھ خطاب کریں گے کہ آپ کو نہیں پتا ''مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ'' کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا اِحداث کیا، کیسی کیسی بدعتیں جاری کیں، انہوں نے دِین کے اندر کیا تغیّر کردیا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نومسلم اَعرابی تھے، جنہوں نے بعد میں

---

(۱) وَجَاءَ فِي طَرِيقٍ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي آخِرِ عُمْرِهِ (مرقاۃ المفاتیح)۔

(۲) بخاری ص ۱۲۔ مشکوٰۃ ص ۱۱۔ مسلم ۱/ ۲۷، کتاب الایمان کی پہلی حدیث۔

(۳) مسلم ۲/ ۲۵۲ باب اثبات حوض نبینا۔ نیز دیکھیں: بخاری ۲/ ۶۶۵، کتاب التفسیر، سورہ مائدہ کا آخر۔ ۲/ ۹۷۴ باب فی الحوض۔ وغیرہ

زکوۃ کا انکار کر دیا، یا بعض مسیلمہ کذاب کے ساتھ مل گئے تھے، اس قسم کے لوگ مراد ہیں، ''اُصَیحَابِی'' سے اُن کے تھوڑے سے ہونے کی طرف اشارہ ہے، تو جب فرشتے آپ کے سامنے اس تفصیل کو ذکر کریں گے کہ یہ تو محدث اور بدعتی قسم کے لوگ ہیں جنہوں نے دین کے اندر نئی نئی باتیں پیدا کر لیں، تو پھر ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ فرمائیں گے: ''سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِي'' جنہوں نے میرے بعد دین کی باتیں بدل دیں، دفع ہو جائیں، دفع ہو جائیں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔(۱) تو میدانِ حشر میں بھی فرشتے حضور ﷺ کو ''لا تدری'' کے ساتھ خطاب کریں گے، جس سے معلوم ہو گیا کہ بعض چیزوں کی تفصیل حضور ﷺ کو معلوم نہیں، یہ واقعہ تو بتا دیا گیا کہ ایسا ہو گا لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کو یہ پتا نہیں ہو گا کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے میرے پیچھے گڑبڑ کی تھی، دین میں تغیّر کیا، یا بدعتیں جاری کیں، اس بات کا پتا نہیں...... اور اسی طرح حضور ﷺ نے یہ تو بتا دیا کہ قیامت کے دن لوگ عاجز آ جائیں گے کھڑے کھڑے، پھر وہ سفارشی تلاش کریں گے کہ اللہ کے دربار میں ہماری کوئی سفارش کرے اور ہمارا حساب کتاب شروع ہو جائے، تا کہ ہم اس تکلیف سے چھوٹ جائیں، بڑی لمبی حدیث ہے حدیثِ شفاعت، حدیث شریف کی کتابوں میں ''حدیثِ شفاعت'' کے عنوان سے روایات موجود ہیں، تو وہ واقعہ جو غیب ہے کہ قیامت کے دن ایسے حالات پیش ہوں گے، تو حضور ﷺ کو بتا دیے گئے، اس میں یہ تو ذکر ہو گیا کہ انبیاء ﷺ کے پاس جائیں گے، آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، لیکن ہر کوئی جواب دے دے گا کہ ہم تو آج جرأت نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ سے جا کر کسی قسم کی بات کریں، پھر میرے پاس آئیں گے تو میں کہوں گا کہ ہاں! میں اس منصب کا ہوں، میں یہ بات کروں گا۔ اب یہ بھی غیب ہے جو حضور ﷺ بتا رہے ہیں، یہ بات بتا دی گئی، لیکن اسی واقعے میں ایک یہ بات بھی آ گئی کہ میں پھر اللہ کے دربار میں جاؤں گا، جا کے سجدہ ریز ہو جاؤں گا، اور سجدہ ریز ہو کے، سجدے میں پڑ کے میں اللہ تعالیٰ کی تعریفیں کروں گا، حمد و ثناء کروں گا، اور ایسے الفاظ کے ساتھ میں حمد و ثناء کروں گا جو مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ میں نے کیا کیا کہنا ہے، وہ اُسی وقت اللہ تعالیٰ مجھے اِلہام کرے گا، یعنی اتنی بات تو بتا دی گئی قیامت کے یہ حالات ہوں گے، یہ غیب ظاہر کر دیا گیا اور حضور ﷺ نے واضح کر دیا، لیکن اس کے ضمن میں یہ بھی بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء میں کس طرح سے کروں گا؟ آج مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اللہ کے سامنے کیا کیا کہنا ہے، اسی وقت اللہ تعالیٰ مجھے اِلہام کرے گا، ''يُلْهِمُنِي'' وہاں لفظ اس قسم کے آتے ہیں کہ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ مجھے اِلہام کرے گا، ''لَا تَحْضُرُنِي الْآنَ'' اِس وقت مجھے وہ حاضر نہیں ہیں، مستحضر نہیں ہیں، کہ میں کن کن الفاظ کے ساتھ اللہ کی تعریف کروں گا۔(۲) دیکھو! اگر ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جس کا غیب سے تعلق ہے، تو اسی کے ضمن میں ایسی چیزیں بھی آ رہی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کلی غیب حضور ﷺ کو نہیں دیا گیا، آئے دن آپ ﷺ کے علم میں ترقی ہو گی، حتیٰ کہ محشر میں بھی آپ کے علم میں ترقی ہو گی، کہ اللہ تعالیٰ کے محامد، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے الفاظ جو حضور ﷺ کو اس وقت تک نہیں دیے گئے تھے اُس وقت اللہ تعالیٰ سکھائے گا۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۹۷۴ باب فی الحوض۔ وغیرہ

(۲) بخاری ۲/ ۱۱۱۸، کتاب التوحید باب کلام الرب یوم القیامۃ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۸ باب الحوض والشفاعۃ فصل اوّل۔

حضور ﷺ کے علم کے بارے میں معتدل عقیدہ

معتدل عقیدہ اس بارے میں یہی ہے، کہ حضور ﷺ کے علم کا کسی کے علم سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں جتنا ہے، بلکہ سب سے زیادہ لیکن اللہ سے کم، اور اتنا ملا جتنا اللہ نے دیا، اللہ کے دینے سے ملتا ہے اور اگر اللہ نہ دے تو کچھ پتا نہیں، اور کتنا دیتا ہے؟ وہ اللہ ہی جانتا ہے! دینے والا جانے، یا لینے والا جانے، لیکن ہم اس عقیدے کے مکلّف ہیں کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے علم ساری مخلوق کے مقابلے میں زیادہ دیا۔ اور ''علم'' سے مراد ایسا علم ہے کہ جس کا حاصل ہونا کوئی رُوحانی کمال ہے، اور جس کا حاصل ہونا کمال نہیں تو اس کے حاصل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ذرّے ذرّے کے جاننے والے ہیں، پتّے پتّے کے جاننے والے ہیں، چونکہ وہ تو خالق ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (سورۂ مُلک: ۱۴) جس نے پیدا کیا ہے کیا وہ نہ جانے؟ اللہ کی ذات کے علاوہ جو کچھ ہے، مخلوق ہے، تو اس کی پوری تفصیل اللہ تعالیٰ جانتا ہے، لیکن ان تفصیلات کا جاننا مخلوق میں سے کسی کے بس کی بات بھی نہیں، کسی کے لئے کمال بھی نہیں، اس لیے جتنا جتنا اللہ تعالیٰ کسی کو علم دے اتنا حاصل ہوتا ہے، بس یہی ہمارا اور ہمارے اکابر کا عقیدہ ہے، کہ پیمائش نہیں کی جا سکتی، اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا جتنا اللہ ہی جانتا ہے، یا وہ لینے والے جانتے ہیں جتنا دیا، لیکن اللہ کے علم کے ساتھ مساوات بالکل نہیں، اور جو اس مساوات کا عقیدہ رکھتا ہے وہ مشرک ہے۔ اور اوّلین اور آخرین کے مقابلے میں حضور ﷺ کا علم زیادہ ہے، تمام لوگوں کے علوم اکٹھے کر لیے جائیں، جو بھی اللہ نے دیے پہلے انبیاء کو یا اولیاء کو، اپنی ذات صفات کے علوم، اور اسی طرح سے دوسرے علوم اپنی معرفت کے متعلق، تو حضور ﷺ کے علوم سب کے مقابلے میں زیادہ ہیں، ماضی کے واقعات انبیاء ﷺ کے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بتلائے یہ بھی علم غیب ہیں، آدم اور آدم سے پہلے کے حالات وہ سب علم غیب ہیں جو حضور ﷺ کو بتائے گئے، اِنباءُ الغیب جسے کہتے ہیں، غیب کی خبر دی گئی، اور اسی طرح سے آنے والے حالات میں فتن کی آپ ﷺ نے خبریں دیں، اور قیامت کے حالات بیان فرمائے، جنّت دوزخ کے بیان فرمائے، یہ سب وہ غیب ہے جو اللہ نے حضور ﷺ کو دیا، اور حضور ﷺ نے جتنا اللہ کو منظور تھا اُمّت کے اندر پھیلایا، اور اُمّت کے لیے وہ ہدایت کا باعث بنا۔ مساوات کا قول کرنا شرک ہے، اور یہ کہنا کہ ذرہ ذرہ جانتے ہیں، پتا پتا جانتے ہیں، کوئی چیز آپ سے مخفی نہیں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں ویسے حضور ﷺ بھی ہیں، یہ عقیدہ شرک ہے۔

''مگر جس رسول کو اللہ پسند کر لے، پس بے شک بھیجتا ہے اُس کے سامنے اور اس کے پیچھے'' رَصَدًا: نگرانی کرنے والے، محافظ فرشتے، لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ: تا کہ اللہ معلوم کر لے کہ اِن لوگوں نے اپنے رَبّ کے پیغامات پہنچا دیے ہیں، یعنی فرشتوں نے رسول تک اور رسول نے عوام تک، یہ انتظامات اس لیے کیے جاتے ہیں تا کہ صحیح طور پر علم رسول تک پہنچ جائے، کوئی شیطان کسی قسم کا خلل راستے میں نہ ڈال سکے، یعنی لوگ تو کہانت کہتے ہیں لیکن کہانت کے ساتھ اس کا کیا تعلق؟ یہاں تو اتنے سخت پہرے لگا دیے جاتے ہیں کہ کسی جن، شیطان کا پاس سے بھی گزر نہیں ہوتا، صحیح صحیح باتیں رسول نے پہنچا دیں مخلوق تک، فرشتوں

نے رسول تک،'' کہ پہنچا دیے اپنے رَبّ کے پیغامات، اور اِحاطہ کیا اللہ نے ان چیزوں کا جو کہ اِن کے پاس ہیں'' مَالَدَیْھِمْ کا اللہ تعالیٰ نے پورا اِحاطہ کیا ہے، اِن راصدین کا، رسولوں کا، فرشتوں کا اللہ تعالیٰ نے احاطہ کیا ہے، جو کچھ ان کے احوال ہیں،'' اور گن لیا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گننا'' ہر چیز اللہ کے شمار میں ہے، اللہ کے علم سے اور اللہ کے شمار سے چھپی ہوئی چیز کوئی نہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتھا ۲۰ — ۷۳ سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ ۳ — رکوعاتھا ۲

سورۂ مزمل مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں بیس آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳

اے چادر میں لپٹنے والے ۝ رات کو قیام کیجئے مگر کچھ وقت ۝ رات کا نصف قیام کیجئے یا اس سے کچھ گھٹا دیجئے ۝

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ

یا اس سے کچھ بڑھا دیجئے، اور قرآنِ کریم کو صاف صاف پڑھیئے ۝ بے شک ہم عنقریب آپ پر ایک وزن دار بات ڈالیں گے ۝

نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ

رات کے وقت اُٹھنا یہ زیادہ سخت ہے از روئے روندنے کے اور زیادہ دُرست ہے از روئے بولنے کے ۝ بے شک آپ کے لئے دن میں

سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ

بہت طویل مشغولیت ہے ۝ اور اپنے رَبّ کا نام یاد کرتے رہیے اور منقطع ہو جایئے اس کی طرف منقطع ہونا ۝ وہ مشرق اور

الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ

مغرب کا رَبّ ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، پس اسے ہی وکیل بنا لیجئے ۝ اور صبر کیجئے اس بات پر جو یہ بولتے ہیں اور ان کو اچھے طریقے

هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱ اِنَّ

سے چھوڑ دیجئے ۝ مجھے چھوڑ یے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ یے جو خوش حالی والے ہیں، اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیجئے ۝ بے شک

لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ
ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکنے والی آگ ہے ﴿۱۲﴾ اور گلے میں اٹکنے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے ﴿۱۳﴾ جس دن کانپے گی
الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا
زمین اور پہاڑ، اور ہو جائیں گے پہاڑ بہنے والی ریت ﴿۱۴﴾ بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے
شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ
جو تم پر گواہ ہے جیسے کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا ﴿۱۵﴾ پھر نافرمانی کی فرعون نے اس رسول کی
فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ
پھر ہم نے پکڑ لیا اس کو پکڑنا سخت ﴿۱۶﴾ پھر کیسے بچو گے تم اگر تم نے کفر کیا اس دن سے جو کہ بچوں کو بوڑھا
شِيْبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ
کردے گا ﴿۱۷﴾ اس دن میں آسمان پھٹنے والا ہوگا، اللہ کا وعدہ پورا کیا ہوا ہے ﴿۱۸﴾ بے شک یہ آیات نصیحت ہیں
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾
پھر جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرلے ﴿۱۹﴾

شانِ نزول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ مزمل مکہ میں نازل ہوئی، اور اس میں ۲۰ آیتیں ہیں، ۲ رکوع ہیں۔ یہ سورت اور آئندہ آنے والی سورت سورۂ مدثر دونوں میں اندازِ خطاب ایک جیسا ہے، سورۂ مدثر کے بارے میں تو روایاتِ صحیحہ کے اندر یہ صراحت ہے کہ بالکل ابتدا زمانے میں اُتری تھی، بعض روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اُترنے والی آیات سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں، لیکن متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ نزولِ قرآن کی ابتدائے حقیقی سورۂ اقرأ کے ساتھ ہوئی ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ، اِس کی ابتدائی آیتیں سب سے پہلے اُتری ہیں، اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ رُک گیا تھا جس کو ''فترتِ وحی'' کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، اور ''فترتِ وحی'' کا زمانہ تقریباً تین سال تک ممتد ہے، اور پھر جس وقت وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت ابتدا میں یہی سورۂ مدثر کی آیات اُتریں، تو اُن روایات کی طرف دیکھ کے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ابتدائے اِضافی یعنی ''فترتِ وحی'' کے بعد سب سے پہلے اُترنے والی آیات سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں۔ اور سورۂ مزمل بھی اس کے آس پاس زمانے ہی میں اُتری ہے، لیکن اُن آیات کے بعد، روایات کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے۔ اور اس سورت میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ہدایات بھی

بظاہر اسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کچھ قرآن اُتر چکا تھا جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات اُتریں، کیونکہ اس میں صراحت کے ساتھ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا کا لفظ آ رہا ہے، تو اس سے پہلے کچھ قرآن اُترا ہوا تھا، تبھی حضور ﷺ کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ رات کی نماز میں، تہجد میں قرآنِ کریم صاف صاف پڑھا کیجئے۔ بہر حال ہیں یہ ابتدائی دور کی..... سرورِ کائنات ﷺ اپنی ابتدائی زندگی میں جیسا کہ آپ سنتے رہتے ہیں، بہت خلوت گزین ہو گئے تھے، اور غارِ حرا میں خلوت میں ہی تھے جس وقت آپ پر یہ وحی اُتری، اور اُس وقت آپ اُن آیات کو لے کر جو آیات آپ پر اُتری تھیں اپنے گھر آئے تھے، تو اس وقت گھر آ کر بھی آپ نے مطالبہ یہی کیا تھا: "زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ" مجھے کپڑا اُڑھادو، کپڑا اُڑھادو۔ (بخاری، ص ۳) مزمل کہتے ہیں چادر اوڑھنے والے کو، کمبل اوڑھنے والے کو، چونکہ فرشتے کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی، ابتدا ابتدا میں وحی اُتری تھی، تو سرورِ کائنات ﷺ پر کچھ ہیبت سی طاری ہو گئی، اور بدن میں جس طرح سے کپکپی ہوتی ہے، اس قسم کے حالات ہوئے، يَرْجُفُ فُؤَادُهٗ کا لفظ متفق علیہ روایت میں ہے[1] کہ آپ کا دل دھڑک رہا تھا، دل کانپ رہا تھا۔ تو ان حالات کے تحت آ کے آپ کمبل اوڑھ کے لیٹ گئے، تو اُس وقت بھی کمبل اوڑھنے کا ذکر ہے "زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ" کے لفظ کے ساتھ..... اور پھر مدتِ مدید کے بعد یعنی "فترتِ وحی" کا زمانہ جب ختم ہوا، دوبارہ سلسلہ شروع ہونے لگا، تو سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ آسمان کی طرف دیکھا تو وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں میرے پاس آیا تھا، مجھے کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا، اور وہ اتنا عظیم الجثہ تھا کہ اس نے آسمان کے کنارے کو بھر رکھا تھا، تو جبریل علیہ السلام کو گویا کہ اصلی شکل کے اندر حضور ﷺ نے دیکھا، تو اس وقت بھی آپ کے اُوپر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی،[2] بلکہ بعض روایات میں آتا ہے کہ غشی کی کیفیت طاری ہو کے آپ زمین کی طرف گر گئے،[3] اور اسی گھبراہٹ کی حالت میں پھر گھر آئے، تو گھر آ کے پھر اسی طرح سے کپڑا اوڑھا اور لیٹ گئے، تو اس وقت پھر يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ یہ آیات اُتریں (بخاری، ص ۳)، تو وہاں بھی اسی طرح سے کپڑے کے اوڑھنے کا ذکر آتا ہے..... تو یہ تو ابتدائی حالات میں تھا، اور پھر جس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے قوم کے سامنے اپنے منصب کا اظہار کیا، اور قُمْ فَاَنْذِرْ کے حکم کے تحت اِنذار شروع کیا، اور لوگوں کے سامنے ذکر کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تو لوگوں نے مخالفتیں شروع کر دیں، مشرکین کی طرف سے رَدِّ عمل بہت سخت ہوا، سوائے چند افراد کے کسی نے حضور ﷺ کی تصدیق نہ کی، تصدیق کرنے والوں میں ابتداءً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، یا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں، یا اسی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی بالکل ابتدائی ایام میں مسلمان ہو گئے تھے، تو چند افراد کے علاوہ قوم کی طرف سے جو رَدِّ عمل ظاہر ہوا وہ حضور ﷺ کے لئے بہت اندوہ ناک تھا اور آپ پر غم کی کیفیت طاری تھی۔ اور بعض تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الندوہ میں اکٹھے ہو کر مشرکین نے ایک دفعہ حضور ﷺ کی ذات پر جو تبصرہ کیا، بہت بُرے انداز میں تبصرہ کیا، کسی نے کہا شاعر ہے، کسی نے کہا کاہن ہے، کسی نے کہا ساحر ہے، کسی نے کہا

---

(۱) بخاری ص ۳۔ مسلم ۱/ ۹۰ باب بدء الوحی۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۲ باب المبعث، فصل اول۔

(۲) ترمذی ۲/ ۱۶۳، کتاب التفسیر۔ سورۃ النجم۔

(۳) بخاری ۱/ ۵۹۱ باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ سے پہلے۔

مجنون ہے، دیوانہ ہے، تو آپ ﷺ کے سامنے جب اس قسم کی باتیں آئیں تو آپ ﷺ غم زدہ ہو گئے، اور آپ جانتے ہیں کہ غم زدہ آدمی کی حالت یہی ہوا کرتی ہے کہ وہ اکیلا تنہائی میں کپڑا اوڑھ کر لیٹ جاتا ہے اور اپنے خیالات میں غرق ہو جاتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، یہ کیا سمجھ رہے ہیں، اور میں ان کا کتنا خیر خواہ ہوں اور یہ مجھے اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں، میں ان کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن یہ کسی طرح سے بات سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، تو انہی خیالات کے غلبے میں غم زدہ ہو کر حضور ﷺ چادر میں لپٹ گئے، اور غمگین آدمی کا کام یہی ہوا کرتا ہے کہ علیحدگی میں منہ چھپا کر لیٹ جاتا ہے، چلتے پھرتے بھی اکثر و بیشتر اپنے اُوپر وہ کپڑا اوڑھ لیتا ہے، یہ ایک انسان کی کچھ طبیعت کا تقاضا ہے کہ کپڑا اوڑھ کے انسان اپنے آپ کو چھپا کے اپنے خیالات میں مست ہوتا ہے، غم کی حالت میں اکثر و بیشتر دیکھنے میں یونہی آتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ کسی ایسے موقع پر ہی کپڑا اوڑھ کے لیٹے ہوئے تھے، کپڑے میں اپنے آپ کو چھپائے ہوئے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے یہ خطاب کیا یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا۔ تو یہ دونوں عنوان ہی اس قسم کے ہیں، مدثر کا معنی بھی ہے دِثار اوڑھنے والے، دِثار کہتے ہیں اس کمبل کو یا لحاف کو جو انسان اپنے بدن کے کپڑوں کے اُوپر سے اوڑھ لیتا ہے، اور مزمّل کا معنی بھی چادر اوڑھنے والے، اور اس چادر سے بڑی چادر ہی مراد ہے، کمبل اور چادر جس کے اندر انسان عموماً لپٹ جاتا ہے۔

تفسیر

خطاب کا محبت بھرا انداز

تو رسول اللہ ﷺ کو خطاب اس لفظ کے ساتھ کیا گیا، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ملاطفت اور پیار کا اظہار ہے کہ جو حال کسی انسان کے اُوپر طاری ہو اسی حال سے کوئی لفظ اخذ کر کے اس کو خطاب کیا جائے تو اس میں عنایت اور شفقت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ ناراض ہو کے گھر سے باہر تشریف لے آئے، مسجد میں جا کے لیٹ گئے، اور وہیں ان کو نیند آ گئی، تو جب لیٹے ہوئے تھے تو بدن کچھ مٹی آلود ہو گیا، سرور کائنات ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر آئے تو معلوم ہوا کہ علی رضی اللہ عنہ کچھ ناراض ہو کر باہر چلے گئے ہیں، تو آپ گئے، دیکھا مسجد میں لیٹے ہوئے تھے اور مٹی بدن کو لگی ہوئی تھی، تو آپ نے اُن کو جا کر خطاب کیا: "قُمْ یَا اَبَا تُرَاب!" اے ابوتراب! اُٹھ۔ ابو تراب: مٹی میں آلودہ، تو مٹی کی طرف نسبت کر کے حضور ﷺ نے ذکر کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، تو جو حال اس وقت ان کے اُوپر طاری تھا اسی سے یہ لفظ اخذ کر لیا گیا، تو روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک محبوب ترین کنیت "ابوتراب" ہی تھی جو حضور ﷺ کی زبان سے یہ لفظ نکلا تھا۔[1] تو یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ یہ بھی اسی حال سے اخذ کیا ہوا لفظ ہے کہ آپ غم زدہ ہو کر چادر میں لپٹے ہوئے تھے، تو اللہ تعالیٰ خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے چادر میں لپٹنے والے! قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا: رات کو قیام کیجئے، اِلَّا قَلِیْلًا: اِلَّا زَمَانًا قَلِیْلًا: مگر کچھ وقت، کچھ وقت کو چھوڑ کے باقی

(۱) بخاری ۱/ ۶۳ باب نوم الرجال فی المسجد/ ۲/ ۹۱۶ / ۲/ ۹۲۹ باب التکنی بأبی تراب/ ۲/ ۹۲۹ باب القائلۃ فی المسجد/ مسلم ۲/ ۲۸۰ باب من فضائل علی بن ابی طالب۔

رات میں قیام کیجئے، قیام کرنے سے مراد نماز پڑھنا، نِّصْفَهٗۤ: رات کا نصف قیام کیجئے، اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا: یا اس سے کچھ گھٹا دیجئے، اَوْ زِدْ عَلَیْهِ: یا اس سے کچھ بڑھا دیجئے۔

''ترتیل'' کا مفہوم

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا: اور قرآنِ کریم کو ترتیل کے ساتھ صاف صاف پڑھیے، ترتیل کا مطلب ہوتا ہے صاف صاف ادا کرنا کہ ایک ایک لفظ علیحدہ معلوم ہو، غور اور تدبر کے ساتھ اُس کو پڑھا جائے، اور جس قسم کی آیات ہوں اُسی قسم کا تاثر ظاہر کیا جائے، آیاتِ رحمت کے اُوپر طبیعت میں بشاشت آئے، آیاتِ عذاب کے اُوپر طبیعت کے اندر اِنقباض آئے اور خوف طاری ہو، چنانچہ سرورِ کائنات ﷺ کے پڑھنے کا طریقہ یہی آیا ہے احادیث میں، کہ آپ ﷺ قرآنِ کریم بہت صاف صاف ادا کیا کرتے تھے، ٹھہر ٹھہر کے پڑھتے تھے، اور جہاں آیاتِ رحمت ہوتیں وہاں ٹھہرتے اور اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے، نماز کے دوران ہی اللہ سے دُعا کرتے، اور جہاں آیاتِ عذاب آتیں تو وہاں ٹھہرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعوّذ کرتے،[1] رسول اللہ ﷺ کے پڑھنے کا طریقہ یہی تھا، اور یہ سب ترتیل میں شامل ہے، ادائیگی صحیح ہو، غور اور تدبر کے ساتھ پڑھا جائے، اور جس قسم کی آیات ہوں اسی قسم کی طبیعت کے اُوپر کیفیت طاری ہو۔

وقتِ تہجد کی مقدار

نِّصْفَهٗۤ کا مطلب یہ ہوگیا کہ رات کا نصف قیام کریں، نصف آرام کرلیں، اور اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا: یا اس میں سے کچھ گھٹا دو، تو نصف میں جس وقت کچھ گھٹا دیں گے تو وہ ثلث کے قریب آجائے گا، اور اگر نصف میں کچھ اضافہ کردیں گے تو دوثلث کے قریب چلا جائے گا، تو اس کا مطلب یہ ہوگیا کہ قیامِ لیل تو فرض ہے، باقی! اوقات میں اتنی بات کہہ دی گئی کہ قیام طویل ہونا چاہیے، ثلثِ شب کے قریب قریب ہو، یا نصفِ شب ہو، یا دوثلث کے قریب قریب ہو، چنانچہ اسی مفہوم کو دُوسرے رُکوع میں جا کر ذِکر کیا جائے گا اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ، یہ تین درجے جو پیدا ہوں گے وہ اسی طرح سے پیدا ہوں گے، نصف، اس میں کچھ کمی آگئی تو ثلث کے قریب چلا گیا، اور اس کے اُوپر کچھ اضافہ ہوگیا تو دوثلث کے قریب چلا گیا، تو وقت کافی خرچ کیجئے، اور اس کو اِن تین درجوں کے درمیان میں کردیا گیا، کہ نصف شب قیام کریں، یا ثلث کے قریب، یا دوثلث کے قریب، اتنا لمبا قیام کیا کیجئے اور اس میں قرآنِ کریم صاف صاف پڑھا کیجئے۔

تہجد کی فرضیت اور اس کے رُوحانی فوائد

تو سرورِ کائنات ﷺ پر اِس آیت کے تحت تہجد فرض کردی گئی، اور بظاہر معلوم یوں ہوتا ہے جیسے اگلی نسخ کی آیات کے اندر قوم کو اور اُمت کو سامنے رکھ کر اُس کو منسوخ کیا گیا ہے تو حضور ﷺ کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی تہجد کو فرض کردیا گیا

(۱) ابوداؤد ۱/۱۲۷ باب ما یقول الرجل فی رکوعه وسجوده۔ ابن ماجه ۱/۹۶ باب ما جاء فی القراءة فی صلاة اللیل۔

تھا...... اور یہ رات کی عبادت آپ کے اُوپر جو لازم کی گئی ہے اور اتنے طویل وقت میں، اس سے یہ ریاضت جو کروائی جارہی ہے، آپ ﷺ سے مجاہدہ اور مشقت جو کروائی جارہی ہے، تو آگے آنے والی آیات یہ بتاتی ہیں کہ اس سے انسان میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے، رُوحانی کیفیات بڑھتی ہیں، مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے انوار اور تجلیات جب قلب کے اُوپر واقع ہوتے ہیں تو قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے، تو جو مشن لے کر آپ چل رہے ہیں یعنی تبلیغ والا، اس میں جو مشکلات ہوں گی ان کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوگی، رُوحانی کمالات پیدا کرنے کے لئے رات کا قیام ضروری قرار دیا گیا ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو برکات رات کے قیام میں ہیں، اور رات کے قیام کرنے کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق قائم ہوتا ہے دوسری عبادات کے اندر یہ چیز کم ہے، رات کا وقت خلوت کا وقت ہوتا ہے، ساری کائنات کے اُوپر ایک قسم کا سکون طاری ہوتا ہے، اور صبح کے وقت جب انسان اُٹھتا ہے تو اُس وقت نہ تو پیٹ اتنا بھرا ہوا ہوتا ہے کہ انسان میں گرانی ہو، جیسے شام کے وقت تازہ تازہ کھانا کھایا ہوا ہو تو اِنسان کو نفل پڑھنے مشکل ہوجاتے ہیں، کھڑا ہونا مشکل ہوجاتا ہے، اور نہ کوئی ایسی بھوک کا وقت ہوتا ہے کہ بے چینی کی وجہ سے انسان کو کوئی کام کرنا مشکل ہوجائے، کان بھی فارغ ہوتے ہیں کہ کہیں سے کوئی کان میں ایسی آواز نہیں آتی جو اِنسان کی مشغولیت کا باعث بنے، آنکھ کے سامنے کوئی ایسے نظارے نہیں ہوتے جو اِنسان کے ذہن کو پریشان کرسکیں، تو اس تاریکی میں جس وقت انسان اُٹھتا ہے اور اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتا ہے، اِس وقت کے بارے میں حدیث شریف کے اندر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود نصف شب کے بعد اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور انہیں آواز دے دے کر کہتے ہیں کہ آؤ، مجھ سے مانگو، میں دیتا ہوں، مجھ سے معافی مانگو، میں معاف کرتا ہوں، جیسے احادیث کے اندر یہ جملے آتے ہیں: ''هَلْ مِنْ دَاعٍ فَأَسْتَجِيْبَ لَهٗ'' کوئی ہے دُعا کرنے والا؟ کہ میں اس کی دُعا کو قبول کرلوں، ''هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهٗ'' کوئی ہے سوال کرنے والا؟ کہ میں اسے دے دوں، ''هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهٗ'' کوئی ہے معافی مانگنے والا؟ کہ میں اسے معاف کردوں، ''هَلْ مِنْ مُسْتَرْزِقٍ فَأَرْزُقَهٗ'' کوئی ہے رزق طلب کرنے والا؟ کہ میں اُس کو رزق دے دوں، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود بندوں کو خطاب کیا جاتا ہے کہ کوئی ایسا ہے؟ میں اسے یہ کردوں،[1] تو جب اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی کامل طریقے سے متوجہ ہو......! تو نصف شب یہ ایک قسم کا رات کا دِل ہے، اور اُدھر انسان بھی اپنے دِل کو لے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوجائے، تو یہ وقت بہت برکات کا حامل ہے، اور اس وقت میں انسان کو رُوحانی کمالات بہت حاصل ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب یہ رحمت حاصل ہوجائے گی، دِل کو قوت حاصل ہوگی، تو آئندہ جو کام کیا جائے گا اس میں برکت ہوگی، اللہ تعالیٰ کامیابی دیں گے، مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت اس سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے حضور ﷺ کو تاکید کردی گئی کہ رات کے اکثر حصے کے اندر آپ قیام کیا کیجئے، اور اُس میں قرآن صاف صاف پڑھا کیجئے۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر۔ آل عمران آیت ۱۷، واللفظ له ولكن فيه: حين يبقى ثلث الليل الآخر/ نیز دیکھئے: مسلم ۱/۲۵۸، باب الترغيب في الدعاء والذكر في آخر الليل۔ وفيه: إذا مضى شَطْرُ اللَّيْلِ أَوْ ثُلُثَاهُ۔ بخاری ۱/۱۵۳ باب الدعاء في الصلوة من آخر الليل۔

''قولِ ثقیل'' کا مصداق

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا: بے شک ہم عنقریب آپ کے اُوپر قولِ ثقیل ڈالیں گے، ایک بوجھل بات ڈالیں گے وزن دار بات ڈالیں گے ہم آپ پر۔ اِس ''قولِ ثقیل'' سے کیا مراد ہے؟ اکثر و بیشتر مفسرین تو یونہی کہتے ہیں کہ اس سے وحی مراد ہے، کہ جس طرح سے اِبتدا اِبتدا میں وحی اُتری ہے، آئندہ اسی طرح سے ''قولِ ثقیل'' آپ پر ہم اُتارتے رہیں گے، اور اس وزن دار بات کو برداشت کرنے کے لئے اسی قسم کی ہمت اور عزیمت چاہیے جس کے پیدا ہونے میں قیامِ لیل دخیل ہے، جب رات کو اُترے ہوئے قرآن کو پڑھتے رہو گے، رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام کیے رہو گے تو پھر اس ''قولِ ثقیل'' کا برداشت کرنا آپ کے لئے آسان ہوجائے گا۔ وحی جس وقت سرورِ کائنات ﷺ پر اُترتی تھی تو اس میں بھی ظاہری طور پر ثقل تھا، نمایاں قسم کا ثقل، کہ جب وحی اُترتی تو آپ کی حالت غیر ہوجاتی تھی، آپ کے حواس اس طرح سے ہوجاتے جیسے کہ غشی کی کیفیت ہے،[1] اور سخت سردی کا زمانہ ہوتا تو آپ کی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا (بخاری، ص ۲)، اور اگر آپ اُونٹنی پر سوار ہوتے تو اُونٹنی کو کھڑا رہنا اور سنبھلنا مشکل ہوجاتا تھا،[2] حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کے پاس زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، جس طرح سے پاس پاس بیٹھے ہوں تو طریقہ ہے کہ انسان ایک کی ران کے اُوپر اپنی ران رکھ لیتا ہے، آپ کا گھٹنا زید بن ثابت کی ران پر تھا اور اسی صورت میں حضور ﷺ کے اُوپر وحی کا نزول ہوا، وہ کہتے ہیں کہ اتنا بوجھ پڑا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ میری ران ٹوٹ جائے گی،[3] تو اس میں بظاہر حسی طور پر بھی ثقل تھا...... اور پھر وحی جس قسم کی ذمہ داری عائد کرتی ہے تو وہ تو بہت بھاری ذمہ داری ہے، آپ سمجھ ہی رہے ہیں، کہ حضور ﷺ کے اُوپر آئے دن تبلیغ کی ذمہ داری بڑھتی جارہی تھی، اور یہ ''قولِ ثقیل'' ہے، اور اس تبلیغ میں جو مشکلات سامنے آتی تھیں، جس قسم کی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں وہ سب اس ثقل میں داخل ہیں...... یا تو وہ حسی طور پر جب اُترتی تھی اسی وقت ہی وزن دار ہوتی، اور یا پھر اس بات کا بوجھ آپ پر پڑتا تھا جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، ان ذمہ داریوں کی طرف دیکھتے ہوئے بھی یہ ''قولِ ثقیل'' ہے (مظہری وغیرہ)۔ ''ہم آپ کے اُوپر عنقریب قولِ ثقیل ڈالیں گے'' یعنی ڈالتے چلے جائیں گے، ورنہ وحی اُترنی تو شروع ہوگئی تھی۔ اور یہ بوجھل بات آپ پر ڈالی جائے گی، اور اس کی ذمہ داریاں آپ کو نبھانی پڑیں گی، ان کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ رات کو قیام کیجئے، اور قرآنِ کریم جو اُتر چکا ہے اسے بار بار پڑھتے رہیے اور صاف صاف پڑھتے رہیے۔

نفس کشی اور یکسوئی کے لئے شب خیزی کی اہمیت

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا...... نَاشِئَةَ الَّیْلِ: رات کا اُٹھنا، اور یہ اِضافت ظرفی ہے، ''رات کے وقت اُٹھنا

---

(۱) بل یعرض له علیه الصلاة والسلام کالغشی لشدۃ انجذاب روحه الشریفة للملأ (آلوسی)۔

(۲) مستدرک حاکم ۲/۵۰۵، تفسیر سورۃ المزمل۔ رقم ۳۸۶۵۔ عن عائشة ولفظه: کان اذا اوحی الیه وهو علی ناقته وضعت جرانها. فلم تستطع ان تحرک.

(۳) بخاری ۱/۵۳ باب ما یذکر فی الفخذ۔ ۲/۶۶۰، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب لا یستوی القاعدون.

یہ زیادہ سخت ہے از روئے روندنے کے اور زیادہ دُرست ہے از روئے بولنے کے" یعنی اس کے ساتھ نفس خوب روندا جاتا ہے، کیونکہ نیند ویسے ہی پیاری، اور پھر رات کے آخری حصے کی نیند تو پھر بہت ہی پیاری، ایسے وقت میں اُٹھنا ہر کسی کا کام نہیں ہے، تو جو شخص اُس وقت بھی اپنی پیاری نیند کو چھوڑتا ہے، بستر کو چھوڑتا ہے، اس کا نفس تو کچلا گیا، نفس کی خواہشات تو اس سے ختم ہوتی ہیں، نفس کشی کے لیے سب سے اعلیٰ طریقہ یہی شب خیزی ہے، یہی وجہ ہے کہ پُرانے زمانے کے اندر تو اولیاء اللہ کے ہاں اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونے کے لئے ایک قسم کی شرط کے درجے میں یہ بات تھی کہ رات کو جاگنے کی عادت ہو، اور رات کو اُٹھ کر انسان اللہ کی عبادت کرے، رُوحانی کمالات اِس کے بغیر حاصل نہیں ہوتے، جس طرح سے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

عطار ہو، رُومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو　　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی [1]

اس قسم کا ان کا شعر ہے جس کا مفہوم یہی ہے کہ جس وقت تک انسان صبح کو اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے آہیں نہیں بھرتا اس وقت تک کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، رُوحانی کمال حاصل ہونے کے لئے تقریباً تقریباً اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عادت کے طور پر ایک لازم چیز ہے کہ انسان کو رات کو اُٹھ کے اللہ تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلانے کی عادت ہو، تب جا کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت حاصل ہوتی ہے اور رُوحانی کمالات حاصل ہوتے ہیں، اس میں نفس روندا جاتا ہے، نفس کی خواہشات مسلی جاتی ہیں، کیونکہ نیند اور پھر آخری وقت کی نیند یہ نفس کی ایک بہت بڑی خواہش ہے۔ تو "یہ رات کا اُٹھنا بہت سخت ہے از روئے روندنے کے اور زیادہ دُرست ہے از روئے بولنے کے" کہ ایسے وقت میں جو بات نکلتی ہے دِل سے نکلتی ہے، انسان دُعا کرتا ہے تو تہ دِل سے کرتا ہے، تلاوت کرتا ہے تو قلب پوری طرح سے متوجہ ہوتا ہے، جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ کوئی مشغولیت نہیں ہوتی، نہ کانوں کو نہ آنکھوں کو، اور پیٹ کی کیفیت بھی درمیانے درجے کی ہوتی ہے، نہ زیادہ بھوک نہ زیادہ ثقل، تو ایسے وقت میں جو بات منہ سے نکلتی ہے دُرست نکلتی ہے، اور دِل کے ساتھ اس کی موافقت ہوتی ہے...... ہمارے ہاں قراءت چونکہ وَطْأً ہے تو اس کا معنی ہے روندنا، اور "جلالین" میں جو قراءت نقل کی گئی ہے وہ "وِطَاءً" ہے، وِطَاءٌ مواطاۃ کے معنی میں، موافقت، یعنی دِل اور زبان کی موافقت اس وقت میں بہت ہوتی ہے، تو موافقت والا مفہوم جہاں لکھا ہوا دیکھیں وہ دُوسری قراءت کے اعتبار سے ہے، ہماری قراءت میں جو لفظ ہے وَطْأً یہ روندنے کے معنی میں ہے، اس میں نفس روندا جاتا ہے، نفس کی خواہشات مٹتی ہیں، اور جس وقت تک نفس کی خواہشات کو مٹایا نہ جائے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے مطابق چلنا انسان کے لئے مشکل ہوتا ہے۔

اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا...... سَبْحًا: چلنا، پھرنا، مشغولیت، کام، "بے شک آپ کے لئے دِن میں بہت طویل مشغولیت ہے" یعنی دِن میں آپ کو اور بہت کام ہیں، مختلف جگہ جانا، لوگوں کے ساتھ ملنا، وعظ تبلیغ کرنا، اس لیے رات کا وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور اللہ تعالیٰ کے قیام کے لئے رکھئے، یعنی حضور ﷺ کا چلنا پھرنا اور لوگوں سے ملنا جلنا یہ بھی عبادت تھا، لیکن اس کے باوجود یہ خلوت اور خلوت کے اندر قرآنِ کریم کا پڑھنا اور اللہ کی یاد، اِس کو ضروری ٹھہرایا گیا، "بے شک آپ کے لئے دِن میں بہت مشغولیت ہے۔"

(۱) "بالِ جبریل" غزلیات، حصہ دوم، غزل ۳۴۔

مشکلات کو برداشت کرنے کی بہترین صورت

وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ: اپنے رَبّ کا نام یاد کیجئے، یاد کرتے رہیے، وَتَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا: تبتل یہ بتل سے لیا گیا ہے۔ بَتَلَ: کاٹنا۔ تَبَتُّل: کٹ جانا۔ یعنی مخلوق سے کٹ کر اللہ کی طرف ہوجائیے، سب سے اپنا تعلق توڑ لو اور اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو جوڑلو، یہ ہے قلبی کیفیت، کہ انسان رہے مخلوق میں، اور ان کے ساتھ معاملہ بھی رکھے، لیکن دِلی تعلق مخلوق کے ساتھ اتنا نہ ہو جتنا اللہ کے ساتھ ہو، اور یہی چیز ہے جو اِنسان کو مشکلات میں سہارا دیتی ہے، اللہ کی یاد اطمینان کا باعث بنتی ہے، اور اللہ کے ساتھ تعلق اور باقی مخلوق سے قطع تعلق قلبی طور پر اِنسان کو مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار کرتا ہے، اس کو تبتل کہتے ہیں، مخلوق سے اِنقطاع اختیار کرلو اللہ کی طرف، اس تبتل سے قلبی تبتل مراد ہے، ورنہ تو آپ کا منصب تھا لوگوں سے ملنا، وعظ کرنا، تبلیغ کرنا، رہو سب میں لیکن آپ کا قلبی تعلق جتنا اللہ کے ساتھ ہو کسی دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔'' اور منقطع ہوجائیے اُس کی طرف منقطع ہونا۔'' رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ: وہ مشرق اور مغرب کا رَبّ ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا: پس اسے ہی وکیل بنالیجئے، وکیل کہتے ہیں موکول الیہ الأمر، جس کے معاملہ سپرد کردیا جائے، اپنے کاموں کے لئے وکیل اللہ کو بنالو، اپنے معاملے کو اسی کے سپرد کردو، اسی کا مفہوم ہے کہ توکل کیجئے، توکل کا معنی بھی ہوتا ہے اللہ کو وکیل بنالینا، اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرکے آپ بےفکر ہوجائیے کہ جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔

سات اَحکام اور ان کا مقصد

یہ حضور ﷺ کو جو تاکید دی جارہی ہے تو اس میں پہلا حکم آگیا قیامِ لیل کا، اور دُوسرا حکم آیا قرآنِ کریم کی ترتیل کا، تیسرا حکم آیا ذِکرِ اِسمِ رَبّ کا، اور چوتھا حکم آیا تبتل کا، اور پانچواں حکم آیا اِتخاذِ وکیل کا، اور چھٹا حکم آیا وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ کا، اور ساتواں حکم آیا وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا: ان لوگوں کو اچھے طریقے سے چھوڑ دیجئے، یہ سات حکم ہیں جو حضور ﷺ کو دیے گئے، اور یہ آپ ﷺ کی ایک قسم کی رُوحانی تربیت، اور آپ کو کمال تک پہنچانے کے لئے یہ ہدایات دی جارہی ہیں، تاکہ آنے والی زندگی میں جو مشکلات پیش آنے والی ہیں ان میں آپ پر کسی قسم کی گھبراہٹ طاری نہ ہو، اور ان کو برداشت کرنے کی آپ میں ہمت اور حوصلہ پیدا ہوجائے۔

رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ: مشرق اور مغرب کا رَبّ ہے، یعنی ساری کائنات کا رَبّ ہے، مغرب مشرق میں سب کچھ آگیا، جیسے بعض جگہ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ (سورۂ معارج) ذِکر کیا گیا ہے، اور یہاں مشرق اور مغرب جنس کے طور پر آجائے گا، مشرق اور مغرب دونوں ہر روز بدلتے ہیں، سردی میں، گرمی میں، تو مطلب یہ ہے کہ سارے اوقات کا مالک وہی ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا: اسی کو اپنا وکیل بنالیجئے، اپنا معاملہ اسی کے سپرد کردیجئے، اسی پر اعتماد کیجئے، بھروسہ کیجئے، کہ اپنی کوشش کرنے کے بعد نتیجہ اسی کے سپرد ہو، توکل کا حاصل یہی ہوتا ہے، تدبیر کرو لیکن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں عقیدہ یہ رکھو کہ نتیجہ وہی نکلے گا جو اللہ کو منظور ہوگا۔ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ: جو کچھ یہ بولتے ہیں اس کے اوپر صبر کیجئے، اگر یہ آپ کو کاہن کہتے ہیں، شاعر کہتے

ہیں، مجنون کہتے ہیں، اور اس قسم کی خرافات بولتے رہتے ہیں تو کوئی بات نہیں، برداشت کرتے چلے جایئے، وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا: اور ان کو اچھے طریقے سے چھوڑ دیجئے، ہجر جمیل سے مراد یہی ہے کہ اِن کے انتقام کے درپے نہ ہوں، اگر یہ کوئی کسی قسم کا بُرا معاملہ کرتے ہیں تو شکوہ شکایت نہ کیجئے، یہ ہجر جمیل ہے، اِن کو اچھے طریقے سے چھوڑ دیجئے، جیسے پیچھے تبتل کا ذکر آیا کہ اللہ کے ساتھ دل لگایئے، مخلوق کے ساتھ دل لگانے کی ضرورت نہیں، اور یہ دشمن اگر آپ کے ساتھ دشمنیاں کرتے ہیں اور بُرائیاں کرتے ہیں تو ان کو چھوڑ دو، یعنی ان کی طرف توجہ نہ دو، نہ کوئی شکوہ شکایت، نہ کوئی انتقام کا فکر، کوئی نہیں، بس اللہ کے لیے صبر کیجئے، "برداشت کیجئے اُس بات کو جو یہ کہتے ہیں، صبر کیجئے اُس بات پر جو یہ بولتے ہیں اور اِن کو اچھے طریقے سے چھوڑ دیجئے۔"

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اِن آیات کی تفسیر کرتے ہوئے عنوان یہی رکھا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے خرقہ پوشی کے آداب بیان کیے ہیں، خرقہ پوش درویش، جس طرح سے مزمل کمبل اوڑھنے والا، اور پُرانے زمانے میں صوفیہ جو تھے "خرقہ پوش" ہی کہلاتے تھے، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے خرقہ پوش بننا چاہتا ہے، درویش بننا چاہتا ہے، تو اس کے آداب یہی ہیں کہ ان چیزوں کو اپنائے، جب تک ان چیزوں کو نہیں اپنائے گا تو خرقہ پوشی کامل نہیں ہوتی، انسان پورے طریقے سے درویش نہیں بنتا، صوفی نہیں بنتا، صوفی بننے کے لئے انہی چیزوں کا اپنانا ضروری ہے جس کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی گئی۔

حضور ﷺ کو تسلی اور کُفّار کو وعید

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ: مجھے چھوڑیے اور اِن جھٹلانے والوں کو چھوڑیے جو خوش حالی والے ہیں، وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا: اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیجئے، مطلب کیا ہوا؟ کہ آپ اپنی طرف سے تبلیغ کرکے فارغ ہو جائیں، اللہ کے ساتھ اپنے معاملے کو ٹھیک رکھیں، خلوت میں بیٹھیں، اللہ کو یاد کریں، اور آپ کو جو تکلیفیں پہنچاتے ہیں برداشت کریں، اور ان سے ہجر جمیل اختیار کرلیں، باقی! اِن کافروں کا معاملہ میرے سپرد، میں جانوں اور یہ جانیں، ذَرْنِي: مجھے چھوڑیے، کیا مطلب؟ کہ اِن کا معاملہ میرے سپرد کر دیجئے، وَالْمُكَذِّبِينَ: مجھے چھوڑیے اور جھٹلانے والوں کو، میں جانوں اور وہ جانیں، جھٹلانے والوں کی آگے جو صفت ذکر کی گئی ہے وہ أُولِي النَّعْمَةِ یعنی خوش حال لوگ، یہ آپ کے سامنے بارہا آچکا کہ اکثر و بیشتر انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے خوش حال لوگ ہی ہوتے ہیں، چونکہ جو ہدایات اللہ کی طرف سے آتی ہیں ان کا ماننا تسلیم کرنا اِنہی کی خواہشات کے خلاف ہوتا ہے، تو سب سے پہلے یہی ٹکراتے ہیں، تو یہاں بھی رُؤسائے مکہ جو تھے سب سے پہلے حضور ﷺ کی مخالفت کرنے والے وہ أُولِي النَّعْمَةِ کا مصداق ہی تھے، "یہ خوش حال لوگ جو جھٹلانے والے ہیں اِن کو اور مجھے چھوڑیے" وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا: انہیں تھوڑی سی مہلت دیجئے، یہ مہلت ہے جو ان کو دی جا رہی ہے، جب ان کی مہلت کا وقت گزر جائے گا تو پھر سامنے نتیجہ آجائے گا۔

"مکذبین" کے لئے سامانِ عذاب

إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا: یہ ہم نے آزمائش کے طور پر اِن کو دُنیا میں خوش حالی دی ہے، "بے شک ہمارے پاس اَنکال اور جحیم ہیں" اَنکال نِکل کی جمع ہے، نکل بیڑی کو کہتے ہیں، جو بیڑیاں مجرم کو پہنائی جاتی ہیں، "ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور

بھڑکنے والی آگ ہے" وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ: اور گلے میں اٹکنے والا کھانا ہے، ذَا غُصَّۃٍ کا معنی جو نگلا نہ جائے، یعنی آج تو ان کو تر تر نوالے حاصل ہیں، بڑے مزے کے ساتھ یہ کھاتے ہیں، لیکن اب اگر یہ کھانے کا شکر ادا نہیں کرتے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو ایسا کھانا دے گا جو گلے میں اٹکے گا، اور اس کھانے کا ذکر دوسری جگہ ہے کہ یہ شجرۂ زقوم ہے، اور اسی طرح سے بعض دوسری چیزوں کا بھی ذکر آتا ہے۔"اور کھانا ہے گلے میں اٹکنے والا" وَعَذَابًا اَلِیْمًا: اور دردناک عذاب ہے۔ یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ: اور یہ عذاب اس دن ہوگا جس دن کہ زمین کانپے گی اور پہاڑ کانپیں گے، اور پہاڑ کثیب مہیل بن جائیں گے، کثیب کہتے ہیں ریت کے ٹیلے کو، مہیل: بہنے والا، بہنے والے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ریت جو ٹکائی ٹکتی نہیں ہے، بھربھری قسم کی ریت، آپ اس کو یوں کر کے ٹھہرائیں گے تو یوں بہتی چلی جاتی ہے، یعنی آج یہ جو اتنے سخت معلوم ہوتے ہیں اُس دن یہ ایسے ہو جائیں گے جس طرح سے کہ بھربھری ریت ہے جو کہ ٹکائی ٹکتی نہیں، بلکہ اس کو ایک جگہ ٹکائیں تو وہ دوسری طرف کو پھسل جاتی ہے، یہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے سارے کے سارے، "جس دن کہ کانپے گی زمین اور پہاڑ" اِن پہ زلزلہ طاری ہو جائے گا، جیسے دوسری جگہ ہے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا"اور ہو جائیں گے پہاڑ بہنے والی ریت۔"

فرعون کے انجام سے عبرت حاصل کرو

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا: یہ تنبیہ ہے ان مشرکین کو، مکذبین کو، کہ بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے، شَاهِدًا عَلَیْکُمْ: جو تم پر شاہد ہے، گواہ ہے، کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا: جیسے کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا، فرعون کی طرف جو رسول بھیجے گئے تھے وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، اور موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا جو قصہ ہوا وہ آیات کے اندر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا، اب مشرکینِ مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ جیسے فرعون کی طرف رسول آیا تھا اللہ کی طرف سے گواہ بن کر، جو بتاتا تھا کہ اللہ کے نزدیک یہ پسندیدہ ہے، یہ پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح سے تمہارے پاس بھی ایک رسول آ گیا، اور اگر اس کی بات نہیں مانو گے تو جو انجام فرعون کا ہوا تھا اسی قسم کا تمہارا ہوگا۔ تو موسیٰ علیہ السلام بھی مستقل شریعت لے کر آئے تھے، صاحبِ کتاب تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ بھی مستقل شریعت لے کر آئے اور صاحبِ کتاب ہیں، یہ آیت تورات کی ایک پیش گوئی کا مصداق ہے، تورات کے اندر اِس وقت تک کہتے ہیں کہ وہ عبارت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ میں بنی اسرائیل کے بھائیوں میں ایک رسول اُٹھاؤں گا تیرے جیسا، اور بالکل اِن الفاظ کے اندر اُسی چیز کو بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیل کی اولاد میں سے تھے اسحاق کی اولاد میں، اور حضور ﷺ بنی اسماعیل میں سے ہیں جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں، "بے شک بھیجا ہم نے تمہاری طرف رسول جو تم پر گواہ ہے" گواہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے شاہد بن کر آیا، جو تمہیں بتاتا ہے کہ یہ چیز اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے، یہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، "جیسے کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا، پھر نافرمانی کی فرعون نے رسول کی" اَلرَّسُوْلَ سے مراد وہی رسول جو فرعون کی طرف آیا تھا یعنی موسیٰ علیہ السلام۔ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا: پھر ہم نے پکڑ لیا اس کو پکڑنا سخت، وبیل سخت کے معنی میں، یہ لفظ وبال سے لیا گیا ہے۔

قیامت کے ہولناک مناظر

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ: پھر کیسے بچو گے تم اگر تم نے کُفر کیا، يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا: ایسے دِن سے، یا، ایسے دِن تم کس طرح سے بچو گے جو دِن بوڑھا کر دے گا بچوں کو۔ یہ مشرکینِ مکہ کو سُنا کے کہا جارہا ہے کہ فرعون کا انجام تو تمہارے سامنے آ گیا، تو جیسے ایک مستقل شریعت والا رسول فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا اسی طرح سے ایک مستقل شریعت والا رسول تمہاری طرف بھی بھیجا گیا، اور فرعون نے نافرمانی کی تو بہت سخت گرفت میں آ گیا، اور وہ سخت گرفت آپ کے سامنے مذکور ہو چکی، پہلے تو چھوٹے عذاب اُس کے اُوپر آتے رہے، لیکن جب بہت ہی سرکش ہوا تو آخر ناک میں پانی ڈال کے مار دیا گیا، اور یوں اس کو چلتا کر دیا گیا، اسی طرح سے اگر تم نافرمانی کرو گے تو تمہارا انجام بھی یہی ہونے والا ہے، پچھلی آیت کے اندر یہ بتایا گیا ہے، اب آگے قیامت کے ساتھ وعید ذِکر کی جارہی ہے، کہ اگر بالفرض! اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے تحت دُنیا کے اندر عذاب کی گرفت میں نہ بھی آئے تو آخر آخرت میں کس طرح سے بچو گے، فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ: پس کیسے بچو گے تم اگر تم نے کُفر کیا، کُفر سے انکار اور تکذیب مراد ہے، يَوْمًا یہ تَتَّقُوْنَ کا مفعول ہے، کیسے بچو گے تم اس دِن سے يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا: جو کہ بچوں کو بوڑھا کر دے گا، شَابَ يَشِيْبُ: بوڑھا ہونا۔ ''بچوں کو بوڑھا کر دے گا'' یہ اس کی سختی کا بیان ہے، حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے میدان میں جب سارے کے سارے لوگ جمع ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو خطاب کریں گے، اور کہیں گے کہ اے آدم! اپنی اولاد میں سے جہنّم کا حصّہ علیحدہ کر دے، آدم علیہ السلام پوچھیں گے کہ یا اللہ! مِنْ كَمْ كَمْ؟ کتنوں میں سے کتنے؟ جہنّم کے لئے جو علیحدہ کرنے ہیں تو کتنوں میں سے کتنے؟ یعنی کس نسبت کے ساتھ، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آئے گا ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے، ہزار سے میں سے ایک جنّت کے لئے، اور نو سو ننانوے جہنّم کے لئے، جس وقت یہ اعلان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گا اس وقت حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے، حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے، دُودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی،(۱) تو یہ اس دِن کی سختی کی طرف اشارہ ہے، اور یہ ہمارا محاورہ بھی ہے، ہم کہتے ہیں کہ فلاں مصیبت نے تو مجھے بوڑھا کر دیا، فلاں صدمہ پیش آیا تھا، فلاں شخص اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا، اُس کی تو کمر ٹیڑھی ہو گئی، وہ تو بوڑھا ہو گیا، اور حدیث شریف میں بھی یہ لفظ آتا ہے: شَيَّبَتْنِيْ سُوْرَةُ هُوْد، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا،(۲) سورۂ ہود کے اندر چونکہ اُمتوں کی تباہی کا ذِکر ہے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی بنا پر، تو آپ اپنی اُمت کا فکر رکھتے تھے، اس فکر کی بنا پر آپ بھی بوڑھے ہو گئے، اور اس طرح سے بچوں کے بال سفید ہو جائیں گے، بچے اس طرح سے کمزور اور ہیبت زدہ ہو جائیں گے جس طرح

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/۴۸۱، باب لا تقوم الساعۃ، فصل اوّل۔ مسلم ۲/۴۰۳، باب ذکر الدجال کا آخر۔

(۲) ترمذی ۲/۱۶۵، کتاب التفسیر۔ سورۃ الواقعۃ۔ مشکوٰۃ ۲/۴۵۸، باب البکاء، فصل ثانی۔ شیبتنی ھود والواقعۃ والمرسلات وعم یتساءلون واذا الشمس کورت۔

سے کوئی سو سالہ بوڑھا ہوتا ہے، چہرے پہ رونق نہ رہے، انسان ڈھیلا سا ہو جائے، کمر ٹیڑھی ہو جائے، ہڈیاں کمزور ہو جائیں، بال سفید ہو جائیں، تو بوڑھا یہی ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے، اور صدمہ جب کثرت کے ساتھ بڑھتا ہے تو بچے پر بھی یہ کیفیت طاری ہو سکتی ہے، تو وہ دِن بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ: اور اس دِن میں آسمان پھٹنے والا ہوگا، بِہٖ فِیْہِ کے معنی میں ہے، كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا: اللہ کا وعدہ مفعول ہے، مفعول کا معنی کیا ہوا، اللہ کا وعدہ پورا کیا ہوا ہے، یعنی جو اللہ وعدہ کرتا ہے اس کو پورا کر کے ہی رہتا ہے، تو وعدے کے مطابق یہ سخت دِن بھی پیش آنے والا ہے، اگر تم کفر کے اندر لگے رہے تو اس دِن پھر تم اللہ کے عذاب سے کس طرح سے بچو گے جو دِن اتنا سخت ہے۔ آخرت کے عذاب کے ساتھ یہ وعید سنائی گئی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ: هٰذِهٖ کا اشارہ ان آیات کی طرف ہے، بے شک یہ آیات نصیحت ہیں، فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا: پھر جو شخص چاہے اپنے رَبّ کی طرف راستہ اختیار کر لے، یعنی نصیحت کے طور پر یہ آیات اُتار دی گئیں، اب تمہاری مرضی، اگر اللہ کی طرف کوئی راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو ان آیات سے نصیحت حاصل کر کے وہ اپنے رَبّ کی طرف راستہ اختیار کر لے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ
بے شک تیرا رَبّ جانتا ہے کہ بے شک تُو قیام کرتا ہے رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ
وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ
اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان میں سے بھی ایک گروہ قیام کرتا ہے، اور اللہ اندازہ کرتا ہے رات اور دِن کا، اللہ کو معلوم ہے
اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ
کہ تم اس وقت کو گھیر نہیں سکتے، اللہ نے تم پر توجہ کی، پس قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لیا کرو، اللہ کو معلوم ہے
اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ
کہ تم میں سے عنقریب کچھ لوگ بیمار بھی ہوں گے، اور کچھ اور لوگ چلیں پھریں گے زمین میں،
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ
تلاش کریں گے اللہ کا فضل، اور کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں لڑائی کریں گے،
اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ
پس قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لیا کرو، قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور اللہ تعالیٰ کو

قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ

قرضِ حسن دو، اور جو بھلائی تم اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجو گے پاؤ گے تم اس کو

عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾

اللہ کے نزدیک بہتر اور بڑی از روئے اَجر کے، اور معافی مانگو اللہ تعالیٰ سے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ⑳

دُوسرے رُکوع کا مضمون

اِس رکوع میں اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے جو شروع سورت میں دیا گیا تھا، شروع سورت میں خطاب اگرچہ بظاہر سرورِ کائنات ﷺ کو ہی تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد آپ ﷺ پر فرض کی گئی تھی، لیکن روایات کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی اُمّت پر بھی فرض کردی گئی تھی، صحابہ کرام ؓ بھی آپ کے ساتھ تہجد پڑھنے میں شریک ہوتے تھے، اور رات کو اتنا لمبا قیام کرتے تھے کہ پاؤں پھول جاتے، پاؤں پھٹ جاتے، کیونکہ جب زیادہ دیر تک انسان کھڑا رہے تو خون کی گردش پاؤں کی طرف ہوتی ہے اور پاؤں بھاری ہوجاتے ہیں۔ اور چونکہ اس وقت گھڑیاں، گھنٹال، ٹائم پیس، یہ تو ہوتے نہیں تھے، اس لیے رات کا اندازہ کرنا بڑا مشکل تھا کہ تیسرا حصّہ ہوگیا، آدھی ہوگئی، دوثلث باقی رہ گئے، اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا وہ نصف شب والا یا دوثلث والا معیار پورا نہ ہو بسا اوقات ساری ساری رات نہ سوتے، اس خیال سے کہ کہیں وقت میں کمی نہ ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ ہم سوجائیں اور آنکھ نہ کھلے، اور وقت تھوڑا رہ جائے، اور یہ بہت بڑی مشقت تھی جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحابہ کرام ؓ کے اُوپر ڈالی، اور مقصد بھی تھا کہ یہ ریاضت کر کے مشقتیں برداشت کرنے کے عادی ہوجائیں، تو کچھ مدّت کے بعد پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کردیا۔ یہ آیات اُتری بہت بعد میں ہیں، لیکن ان کو جوڑ دیا گیا اُنہی پہلی آیات کے ساتھ، تاکہ اِس کے دونوں پہلو بیک وقت سامنے آجائیں، کہ ایک وقت میں حکم دیا گیا اور دُوسرے وقت میں تسہیل کردی گئی۔

اور اِن آیات کا حاصل یہ ہے کہ جیسا حکم آپ کو دیا گیا تھا آپ ایسے ہی کرتے ہیں، اور آپ کے ساتھی بھی ایسے ہی کرتے ہیں، اللہ کو معلوم ہے کہ تم بڑا لمبا قیام کرتے ہو، نصف شب، ثلث شب کے قریب قریب، دوثلث کے قریب قریب، لیکن رات کا صحیح اندازہ لگانا یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ جس طرح سے لفظ آرہا ہے، تمہارے بس میں نہیں کہ تم اس کا پوری طرح سے شمار کرلو، کیونکہ سونے کے بعد اُٹھنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے، اور ایک خاص مدّت تک جاگنا بھی بسا اوقات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا، مجبور ہوکر انسان کی آنکھ لگ جاتی ہے، آپ اپنے خیال کے مطابق مطالعہ کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں، کتاب آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن آپ پہنچ جاتے ہیں، پتا ہی نہیں ہوتا کتاب ہاتھ میں ہے، کتاب سینے پر گرگئی اور نیند آگئی، خیال آپ کا تھا کہ ایک گھنٹہ مطالعہ کروں گا لیکن پانچ منٹ کے بعد بلا اختیار آنکھ بند ہوگئی، پتا ہی نہیں، کبھی نماز میں ہوتا ہے کہ نماز میں انسان کھڑا ہوجاتا ہے، بسا اوقات سجدے میں گیا اور بلا اختیار آنکھ لگ گئی، تو پوری طرح سے رات کا اندازہ کرنا یہ اللہ کا کام ہے، اور اللہ جانتا ہے کہ تم

اس کا پوری طرح سے اِحصاء نہیں کر سکتے، اسی اِحصاء کے لئے تم نے بہت مشقت برداشت کی، اب تمہارے اُوپر آسانی کی جاتی ہے کہ اب اتنا لمبا قیام کرنے کی ضرورت نہیں، آسانی کے ساتھ جتنا قرآن پڑھ سکو رات کو پڑھ لیا کرو، یہاں بھی قرآن پڑھنا نماز میں ہی مراد ہے، اور وہی تہجد میں قرآن پڑھنا مراد ہے، اور یہ کہ جتنا پڑھ سکو پڑھ لیا کرو یہ بھی اِستحبابی حکم ہے، اس لیے باتفاقِ اُمّت سرورِ کائنات ﷺ کی اُمّت پر سے تو تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی، حضور ﷺ سے منسوخ ہوئی تھی یا نہیں، اس میں مفسرین اور محدثین کے دونوں قول ہیں، اور یہ مسئلہ آپ کے سامنے سورۂ اِسراء میں فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ اس آیت کے تحت بیان کیا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے فرضیت منسوخ ہوجائے حضور ﷺ سے بھی اور صحابہ سے بھی، لیکن حضور ﷺ نے زندگی بھر اس عمل کو باقی رکھا ہے، چاہے وقت میں کچھ کمی بیشی کردی ہو لیکن تہجد چھوڑی نہیں، اس لیے بعض حضرات کے نزدیک یہ تہجد اَب بھی سُنّتِ مؤکدہ ہے، چاہے فرضیت ساقط ہوگئی، لیکن سُنّتِ مؤکدہ اب بھی ہے،(1) اور صحابہ کرام ﷺ بھی پڑھتے تھے، اولیاء اللہ بھی ہمیشہ سے پڑھتے آتے ہیں، تو فرضوں کے بعد، جو فرض نماز آپ پڑھا کرتے ہیں اس کے بعد افضل ترین نماز فقہاء کے نزدیک اور صوفیہ کے نزدیک یہی نماز ہے جو رات کو پڑھی جاتی ہے، تہجد کی نماز فرضوں کی نماز کے بعد افضل ترین نماز ہے، اور رُوحانی درجات اور کمالات حاصل کرنے کے لئے تو اس کے اثرات کا انکار کرنا دوپہر کو سورج کا انکار کرنے کے برابر ہے۔ حضور ﷺ نے عمل نہیں چھوڑا، عمل اسی طرح سے جاری رہا ہے، لیکن اُمّت پر تخفیف کردی، اور تخفیف کرنے میں وجہ یہ بیان کردی کہ ایک تو وقت کا اندازہ لگانا تمہارے لیے مشکل، تم اس میں ساری رات پریشان رہتے ہو، دُوسرے اب آنے والے حالات میں تم میں سے لوگ سفر کریں گے، کوئی طلبِ علم کے لئے، کوئی طلبِ رِزق کے لئے، تجارت کے لئے، اور کوئی اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے جائیں گے، جہاد کے سفر ہوں گے، اور پھر سفر کے اندر اس شب خیزی کو باقی رکھنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، جس کی بنا پر اللہ نے تمہیں اجازت دے دی کہ جتنا آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اور یہ حکم بھی اِستحبابی ہے۔ تو یہ وجوہ بیان کیے گئے ہیں، جہاد کے لئے سفر کرنا، تجارت کے لئے سفر کرنا، اور يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ فضل کا ذِکر جو آئے گا تو اس اِبتغائے فضل کے اندر رِزق بھی داخل ہے اور علم بھی داخل ہے، طلبِ علم کے لئے سفر کروگے، طلبِ رِزق کے لئے سفر کروگے، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سفر کروگے، اور سفر کے اندر پھر اس حکم پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے، جس کی بنا پر اللہ کی طرف سے تسہیل ہوگئی۔ اور پھر حضور ﷺ نے یہ بھی بشارت سُنادی کہ جو شخص اپنے گھر میں رہتے ہوئے تہجد کا عادی ہے، پھر وہ سفر پہ چلا جائے اور سفر میں اس عمل کو باقی نہ رکھ سکے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ثواب برابر دیتے رہتے ہیں۔ جو عمل وہ اپنے گھر کے اندر کرتا تھا، سفر میں اگر وہ عمل نہیں ہوسکا، تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب برابر لکھتے رہتے ہیں،(2) اسی طرح سے بیماری کا عذر ذِکر کیا کہ تم میں سے بعض بیمار ہوجائیں گے، اور بیمار کے لئے بھی رات کو اُٹھنا مشکل، اور اتنا قیام کرنا مشکل، اس لیے بھی تسہیل کردی، اور بیماری کے بارے میں بھی حدیث شریف میں ایسے ہی ذِکر کیا گیا کہ اگر کوئی شخص عمل کا عادی ہو

---

(1) والمختار عندی انها من سنن الهدی......وهما يدل على كونه سُنّة مؤكدة حديث ابن مسعود. (مظهری)

(2) بخاری ۱/ ۴۲۰، باب یکتب للمسافر...الخ. مشکوۃ ۱/ ۱۳۵، باب عيادة المريض، فصل اول۔ إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهٗ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيْمًا صَحِيْحًا

اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اُوپر کوئی بیماری آ گئی اور اس بیماری کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کو جاری نہ رکھ سکے، تو جتنا عمل وہ صحت کے زمانے میں کرتا تھا اللہ تعالیٰ اس کے ثواب کو برابر جاری رکھتے ہیں (حوالہ مذکورہ)...... تہجد کو منسوخ کر دیا لیکن آگے تاکید کر دی کہ نماز کی پابندی رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو، اور صدقہ خیرات کرتے رہو، جو کچھ تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو گے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر طریقے سے اس کو پاؤ گے۔ اگلی آیات کے اندر یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔

آیات کی تفسیر

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ: بے شک تیرا رَبّ جانتا ہے، اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ: ثُلُثَي اصل میں ثُلُثَيْنِ تثنیہ ہے، کہ بے شک تُو قیام کرتا ہے رات کے دوثلث کے قریب، دوتہائی کے قریب، یعنی اگر بارہ گھنٹے کی رات ہو تو آٹھ گھنٹے کے قریب قیام ہو گیا، وَنِصْفَهٗ: اور اس کا نصف، یعنی بارہ گھنٹے میں سے چھ گھنٹے، وَثُلُثَهٗ: اور اس کا تیسرا حصہ، یعنی بارہ میں سے چار گھنٹے، اگر بارہ گھنٹے کی رات فرض کر لی جائے تو بارہ گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے دوثلث ہیں اور چھ گھنٹے نصف ہیں اور چار گھنٹے ثلث ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوثلث کے قریب، نصف کے قریب، ثلث کے قریب آپ قیام کرتے ہیں، اللہ جانتا ہے، کہ جیسے آپ کو حکم دیا گیا تھا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ، یہ جس طرح سے درجے ذِکر کیے گئے تھے اسی کے مطابق آپ قیام کرتے ہیں۔ آپ بھی کرتے ہیں وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ: اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان میں سے بھی ایک گروہ قیام کرتا ہے، طائفہ ٹولے اور گروہ کو کہتے ہیں، چھوٹے بڑے سب گروہ کے اُوپر بولا جاتا ہے، "جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، طائفہ، گروہ، جماعت، وہ بھی اسی طرح سے قیام کرتی ہے، آپ کے ساتھیوں میں سے بھی ایک طائفہ آپ کے ساتھ قیام کرتا ہے" اس میں تو پہلے تصدیق کر دی کہ جیسے حکم دیا گیا تھا آپ نے اس کے اُوپر عمل کر کے دکھا دیا، آپ کا عمل اس کے مطابق جاری ہے، اور آپ کے ساتھیوں کا بھی جاری ہے، آگے فرمایا وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ: اور اللہ اندازہ کرتا ہے رات اور دِن کا، وقت کا پورا اندازہ کرنا، اس کی تقدیر یہ اللہ کے اختیار میں ہے، عَلِمَ: اللہ کو معلوم ہے، اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ: کہ تم اس کا اِحصاء نہیں کر سکتے، یعنی اس وقت کو گھیر نہیں سکتے، اِحصاء: شمار کرنا، اور یہاں اِحصائے عملی مراد ہے، یعنی اس وقت میں جو حکم دیا گیا اس کے اُوپر عمل کرنے پر پوری طرح سے تم قادر نہیں رہو گے، اللہ کو معلوم ہے، "تم نہیں شمار کر سکتے اس کا، تم اس کو پورا نہیں کر سکو گے" فَتَابَ عَلَيْكُمْ: تاب توبۃً: توجہ کرنا، علیٰ صلہ آ گیا، "اللہ نے تم پر توجہ کی" فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ: پس پڑھ لیا کرو جو قرآن آسان ہو، قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لیا کرو، اور یہ فَاقْرَءُوْا کا اَمر بھی استحبابی ہے، کیونکہ رات کو دو رکعت پڑھنا، چار رکعت پڑھنا، تھوڑی سی آیات پڑھنا، یہ بھی فرض نہیں ہے۔ "پڑھ لیا کرو اس قرآن سے جو آسان ہو۔"

نماز میں قرآن کی کوئی متعین سورت پڑھنا فرض نہیں ہے

اسی سے فقہاء نے وہ مسئلہ بھی نکالا ہے، وہ صرف لفظوں کی تعمیم کے طور پر ہے، آیت جو یہاں آئی ہے یہ تہجد کے بیان میں ہے، لیکن: العبرۃ لعموم الالفاظ، جس طرح سے کہا کرتے ہیں، تو قرآنِ کریم کے بارے میں آ گیا مَا تَيَسَّرَ جو آسان ہو پڑھ

لو، اس لیے ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی کوئی متعین مقدار نماز میں پڑھنی فرض نہیں ہے، صرف اتنا پڑھنا فرض ہے جس کو قرآن کہہ سکیں، تو حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک آیت اور صاحبین کے نزدیک کم از کم تین آیتیں، ایک آیت یا تین آیتیں اگر نماز میں پڑھ لی جائیں تو فرض ادا ہو جاتا ہے، اسی لیے ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کو فرض ہونے کے طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ سورۂ فاتحہ کی تو سات آیتیں ہیں، اور یہاں عموم کے ساتھ آ گیا کہ جو آسان ہو پڑھ لیا کرو، تو ایک شخص کے لئے اگر آسانی ایک آیت پڑھنے میں ہے دو آیتیں پڑھنے میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اتنی بھی پڑھ لے گا تو فرض ادا ہو جائے گا۔ تو یہ آیت اگرچہ آئی ہوئی تہجد کے بیان میں ہے، لیکن اس سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ قرآنِ کریم کی کوئی خاص مقدار کسی نماز میں پڑھنی فرض نہیں، بلکہ جو آسان ہو اتنا پڑھنا فرض ہے، یعنی قرآن ہونا چاہیے، جس کی مقدار کم از کم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک آیت اور صاحبین کے نزدیک تین آیتیں ہیں، فرض اس سے ادا ہو جائے گا، یہ علیحدہ بات ہے کہ فاتحہ کا پڑھنا واجب، اور اسی طرح سے اس کے ساتھ سورت کا ملانا بھی واجب، اور واجب اگر چھوٹ جائے تو آپ جانتے ہیں کہ نماز کا دوہرانا ضروری ہے، بھول کے چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو کے ساتھ بھی گزارہ ہو سکتا ہے، اس لیے یہ کہنا اپنی جگہ صحیح ہے کہ اگر فاتحہ نہیں پڑھی گئی تو نماز نہیں ہوئی، کیونکہ جس نماز کا لوٹانا ضروری ہو وہ اتنی ناقص ہوتی ہے کہ نہ پڑھنے کے برابر، تَنْزِيْلُ النَّاقِصِ مَنْزِلَةَ الْمَعْدُوْمِ کے طور پر ہمارے ہاں بھی یہ بات ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، یعنی اتنی ناقص ہوتی ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے، اس کا دوہرانا ضروری ہے، لیکن فقہی طور پر درجات اسی طرح سے ہیں کہ فرض ادا ہو جاتا ہے قرآنِ کریم کی تھوڑی سی مقدار پڑھنے کے ساتھ، اور واجب ادا ہوگا سورۂ فاتحہ کے ساتھ اور ضمِ سورت کے ساتھ، کہ فاتحہ کے ساتھ قرآن کا کچھ اور حصہ بھی پڑھا جائے۔

تہجد کی فرضیت کے نسخ کی وجوہات

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى: اللہ کو معلوم ہے کہ تم میں سے عنقریب کچھ لوگ بیمار بھی ہوں گے، مرضیٰ مریض کی جمع ہے، وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ: اور کچھ اور لوگ چلیں پھریں گے زمین میں، ضرب فی الارض چلنے پھرنے کو کہتے ہیں، یعنی سفر کریں گے ''چلیں پھریں گے زمین میں، تلاش کریں گے اللہ کا فضل'' اللہ کے فضل کا مصداق رزق بھی ہے، اور اللہ کے فضل کا مصداق علم بھی ہے، تم علم کے لئے سفر کرو گے، رزق کے لئے سفر کرو گے، تمہارے تجارتی سفر ہوں گے، اللہ کو یہ بھی معلوم ہے، ''اور کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں لڑائی کریں گے'' ان کا سفر جہاد کے لئے ہوگا کافروں کے ساتھ لڑنے کے لئے، فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ: تو ان سفروں کے اندر اور ان بیماریوں کے اندر تم اس حکم کو پوری طرح سے قابو میں نہیں رکھ سکتے، یہ حکم جو دیا گیا تو اس کا اِحصاء تم نہیں کر سکتے سفر میں اور بیماری میں، اللہ کو معلوم ہے، یہ مشقت تو تمہاری برداشت سے باہر ہو جائے گی، اس لیے تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ، قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لیا کرو، اب زیادہ لمبا لمبا قیام کرنے کی ضرورت نہیں، اور یہ خود حکم بھی تہجد کے معاملے میں اِستحبابی ہے۔

تہجد کی فضیلت وترغیب

اور عرض میں نے آپ کے سامنے کردیا کہ فرضیت اگرچہ منسوخ ہوگئی، لیکن روایات کے اندر بہت کثرت کے ساتھ تہجد کی ترغیب دی گئی ہے، اور عملاً حضور ﷺ نے ساری زندگی پابندی کی ہے، اور جولوگ طلوعِ فجر تک سوئے رہتے ہیں ان کے بارے میں وعید آئی ہے حدیث شریف میں، حضور ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر ہوا اور یہ کہا گیا کہ وہ صبح تک سویا رہتا ہے (صبح سے مراد ہے طلوعِ فجر، شرعی طور پر ''صبح'' طلوعِ فجر کے ساتھ آتی ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایسا شخص ہے جس کے کانوں میں شیطان پیشاب کرجاتا ہے،[1] اس طرح سے آپ نے تحقیر کے ساتھ اس کا ذکر کیا، تو جولوگ طلوعِ فجر تک سوئے رہتے ہیں تو یوں سمجھا کرو کہ شیطان ان کے کان میں پیشاب کرجاتا ہے، اور کسی چیز کے اُوپر پیشاب کرنا اس کی تحقیر ہے، کوئی چیز آپ کے سامنے پیش کی جائے تو آپ کہیں میں تو اس پر پیشاب بھی نہیں کرتا، تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کہ میرے نزدیک اس کی کوئی قدر ومنزلت نہیں ہے، تو جس پہ شیطان پیشاب کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگیا کہ شیطان کی نظر میں اس شخص کی کوئی قدر وقیمت نہیں، اس قسم کی مذمتیں بھی حدیث شریف کے اندر آئی ہوئی ہیں، جس کی طرف دیکھتے ہوئے علماء کہتے ہیں کہ کہ تہجد کی فرضیت اگرچہ منسوخ ہوگئی، لیکن اس کی سنیت بلکہ سنیت کے اندر بھی تاکد جس کو آپ ''سنّتِ مؤکدہ'' کے ساتھ تعبیر کرسکتے ہیں یہ باقی ہے، اور اولیاء اللہ کا تو ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے، اللہ کو منانے اور اللہ سے مانگنے کے لئے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں کہ انسان صبح کے وقت میں اُٹھے اور اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

نماز، زکوٰۃ، صدقات کی تاکید

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: وہ فرضیت تو منسوخ ہوگئی، اور نماز کو قائم رکھو، جتنا آسان ہو رات کو پڑھ لیا کرو، اور قائم رکھو نماز کو، اس ''نماز'' سے بالاتفاق ''فرض نماز'' مراد ہے، پانچ نمازیں، جس سے معلوم ہوگیا کہ تہجد کی منسوخیت پانچ نمازوں کے فرض ہونے کے بعد ہوئی ہے، ''قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ، اور اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسن دو، اللہ تعالیٰ کو قرض دو اچھا قرض'' قرض دینے سے مراد نفلی صدقہ خیرات ہے، ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس کو ''قرض'' کے ساتھ تعبیر فرماتے ہیں، قرآنِ کریم کی کئی آیتوں کے اندر اس بات کا ذکر آیا، ''قرض'' کے لفظ کے ساتھ ذکر کرکے اصل میں ترغیب دینا مقصود ہے کہ قرض جب کسی کو دیا جاتا ہے تو اس اعتماد پر دیا جاتا ہے کہ واپس مل جائے گا، تو اللہ کے نام پر جب تم خرچ کرو تو اس اعتماد کے ساتھ خرچ کرو کہ یہ تمہاری طرف واپس آئے گا، اور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ کے آئے گا، جیسے سورۂ حدید کے اندر اس کی تفصیل آئی تھی۔ ہاں! البتہ اگر قرض لینے والا ایسا شخص ہو جو مفلس ہے یا ظالم ہے، دُوسرے کا حق دبا لیتا ہے پھر وہ واپس نہیں کیا کرتا، لیکن اللہ کے متعلق ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صبح کے وقت بندوں کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتے ہیں کہ ایسے کو قرض دو جو ظلوم بھی نہیں اور عدوم بھی نہیں،[2] نہ وہ

---

(۱) بخاری ۱/۱۵۳، کتاب التهجد باب اذا نام ولم يصل۔ ۱/ ۴۶۳ باب صفة ابليس/ مشكوٰة ۱/۱۰۹ باب التحريض على قيام الليل، فصل اوّل۔

(۲) مسلم ۱/۲۵۸ باب الترغيب فی قيام رمضان سے پہلے۔ مشكوٰة ۱/۱۰۹ باب التحريض على قيام الليل، فصل اوّل۔

مفلس ہے، نہ ظالم ہے، مفلس نہیں ہے اس لیے لیا ہوا تمہیں واپس دے گا، اور ظلوم نہیں ہے کہ تمہاری حق تلفی نہیں کرے گا۔ تو ترغیب دینے کے لئے ''قرض'' کا لفظ بولا گیا۔ تو فرض مقدار وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ میں آ گئی، اور نفلی صدقات وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا میں آ گئے۔ اور ''قرض'' کے ساتھ ''حسن'' کا لفظ بڑھا دیا گیا، اس میں یہ آ گیا کہ حلال کمائی میں سے دو، خلوص کے ساتھ دو، محبت کے ساتھ دو، جس طرح سے دُوسری جگہ آیا اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (سورۂ بقرہ: ۱۷۷)، اللہ کی محبت کی بنا پر خرچ کرو، یہ قرضِ حسن میں داخل ہے، خلوص کے ساتھ دو اور جس کو دو اس کے اُوپر احسان نہ جتلاؤ، ''اچھا قرض دو اللہ کو قرض دینا'' وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ: اور جو کچھ تم آگے بھیجو گے اپنے نفسوں کے لئے، مِّنْ خَيْرٍ یہ ''مَا'' کا بیان ہے، جو بھلائی، جو نیکی تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو گے، تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا: پاؤ گے تم اس کو اللہ کے نزدیک بہتر اور بڑی از روئے اجر کے، دُنیا میں جو کچھ تم نے دیا ہے وہ خیر کی شکل میں تمہارے سامنے آئے گا اور بڑے اَجر کی شکل میں تمہارے سامنے آئے گا، وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ: اور چھوٹی موٹی کوتاہیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کیا کرو، معافی مانگو اللہ تعالیٰ سے، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اٰیاتہا ۵۶ ۷۴ سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ ۴ رکوعاتہا ۲

سورۂ مدثر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵۶ آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴ وَالرُّجْزَ

اے لحاف میں لپٹنے والے! ۝ اُٹھیے پھر ڈرائیے ۝ اور اپنے رَبّ کی بڑائی بیان کیجئے ۝ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھیے ۝ اور پلیدی کو

فَاهْجُرْ ۝۵ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷ فَاِذَا نُقِرَ

چھوڑے رکھیے ۝ اور احسان نہ کیجئے اس حال میں کہ آپ زیادتی کے طالب ہوں ۝ اور اپنے رَبّ کی رضا کے لئے صبر کیجئے ۝ پس جس وقت صور

فِي النَّاقُوْرِ ۝۸ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝۹ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝۱۰ ذَرْنِيْ وَمَنْ

میں پھونک ماری جائے گی ۝ پس یہ وقت یعنی جس دن کہ ایسا ہوگا بہت سخت دن ہے ۝ کافروں پر آسان نہیں ہے ۝ چھوڑ مجھے اور اس شخص کو

خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝۱۱ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝۱۲ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝۱۳ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ

جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا ۝ اور میں نے بنایا اس کے لئے مال پھیلایا ہوا ۝ اور حاضر رہنے والے بیٹے ۝ اور میں نے اس کے لئے ہموار کیا

تَمْهِيْدًا ۝۱۴ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝۱۵ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝۱۶ سَاُرْهِقُهٗ

ہموار کرنا ۝ پھر وہ اُمید رکھتا ہے کہ میں اور زیادہ دُوں ۝ ہرگز نہیں، بے شک وہ ہماری آیات کے لئے ضد کرنے والا ہے ۝ عنقریب چڑھاؤں گا میں اس کو

صَعُوْدًا ۝۱۷ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹ ثُمَّ قُتِلَ

جہنم کے صعود پہاڑ پر ۝ بے شک اس نے سوچا اور اندازہ کیا ۝ پس یہ برباد ہو جائے، اس نے کیسے اندازہ کیا ۝ پھر یہ برباد ہو جائے

كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰ ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۲۲ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳ فَقَالَ

اس نے کیسا اندازہ کیا ۝ پھر دیکھا ۝ پھر اس نے منہ بنالیا پھر اور زیادہ منہ بگاڑا ۝ پھر اس نے پیٹھ پھیری اور تکبر کیا ۝ پھر اس نے کہا

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝۲۴ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵ سَاُصْلِيْهِ

نہیں ہے یہ مگر جادو جو پہلے سے چلا آتا ہے ۝ نہیں ہے یہ مگر انسان کا کلام ۝ عنقریب داخل کروں گا میں اس کو

سَقَرَ ۝۲۶ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝۲۷ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝۲۸ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝۲۹ عَلَيْهَا

جہنم میں ۝ اور آپ کو کیا پتا جہنم کیا چیز ہے؟ ۝ وہ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی ۝ جھلس دے گی وہ چمڑے کو ۝ اس جہنم کے اُوپر

تِسْعَةَ عَشَرَ ۝۳۰ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا

اُنیس فرشتے متعین ہیں ۝ جہنم کا انتظام کرنے والے نہیں بنائے ہم نے مگر فرشتے، اور نہیں بنایا ہم نے ان کی تعداد کو مگر

فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ

آزمائش کا ذریعہ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا، تا کہ یقین کرلیں وہ لوگ جو کتاب دیے گئے، اور زیادہ ہو جائیں وہ لوگ جو

اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ

ایمان لائے از روئے ایمان کے، اور نہ شک کریں وہ لوگ جو کتاب دیے گئے اور ایمان والے، اور تا کہ کہیں وہ لوگ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ

جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافر لوگ کہ کیا ارادہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ ایسے ہی گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ

يَّشَآءُ وَيَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾

جس کو چاہتا ہے، اور سیدھے راستے پہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، نہیں جانتا تیرے رَبّ کے لشکروں کو مگر وہی، نہیں ہیں یہ آیات مگر نصیحت انسانوں کے لئے ﴿۳۱﴾

وجہِ تسمیہ، شانِ نزول، سورت کا مضمون

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ مدثر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۵۶ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رُکوع ہیں۔ جہاں تک تو اِس سورت کے نام کا تعلق ہے وہ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی آیت سے ماخوذ ہے يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ یہ جو لفظ پہلی آیت میں آیا، اسی سے اس کا نام اختیار کرلیا گیا۔ اور اِس سورت کے متعلق کچھ تذکرہ سورۂ مزمل کی اِبتدا میں آ گیا تھا، اِس کی اِبتدائی آیتیں پہلے پہلے نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہیں، اِبتدائے حقیقی قرآنِ کریم کے نزول کی وہ تو سورۂ اِقرأ کے ساتھ ہوئی ہے، روایاتِ صحیحہ میں آتا ہے کہ غارِ حرا میں جس وقت سورۂ اِقرأ کی اِبتدائی آیتیں اُتری تھیں تو اس کے بعد وحی منقطع ہوگئی تھی، اور (ایک قول کے مطابق) تقریباً تین سال تک پھر وحی کا انقطاع ہے (فتح الباری وغیرہ)، جس کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہا جاتا ہے، تین سال تک سرورِ کائنات ﷺ وحی کے انتظار میں رہے، اور بسا اوقات آپ کے اُوپر بہت زیادہ غم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، اور جی یہ چاہتا تھا کہ یا تو وحی آجائے یا پھر میں اپنے آپ کو ہلاک کردوں، اس طرح سے غم کی کیفیت آپ پر طاری ہوتی تھی، "بخاری شریف" کی روایت میں ہے حضور ﷺ کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹی پر اس خیال سے گئے کہ میں اپنے آپ کو گرادوں، لیکن جبریل نمایاں ہوتے، کسی طرف سے آواز آتی: "اِنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ حَقًّا!" آپ تو اللہ کے سچے رسول ہیں، تو پھر آپ کی طبیعت کو کچھ سکون ہو جاتا۔[1] تو تین سال کے بعد ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے آسمان کی طرف دیکھا تو آسمان اور زمین کے درمیان میں جبریل علیہ السلام کو کُرسی پر بیٹھا ہوا آپ نے مشاہدہ کیا (بخاری، ص ۳)، اور وہ جبریل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں تھے، ان کے ۶۰۰ پَر تھے، اور اتنا بڑا جثہ تھا کہ اس نے آسمان کے کنارے کو بھر رکھا تھا،[2] تو یہ دیکھ کر آپ ﷺ کے اُوپر ہیبت طاری ہوگئی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی،[3] بعد میں اپنے آپ کو سنبھالا، گھر تشریف لے آئے، تو بدن کے اُوپر کپکپی طاری تھی، جس طرح سے ہیبت ہوتی ہے، تو آپ نے گھر آ کے کہا: "زَمِّلُوْنِي زَمِّلُوْنِي"، یا "دَثِّرُوْنِي دَثِّرُوْنِي" (حوالہ مذکورہ) مجھے لحاف اُڑھادو، مجھے کمبل اُڑھادو، میرے اُوپر کپڑا دے دو، جس طرح سے کانپنے والا انسان کیا کرتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ کمبل یا لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے، اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اِس سورت کی اِبتدائی پانچ آیتیں اُتریں، جن میں رسول اللہ ﷺ کو آمادہ کیا گیا کہ اب آپ کے لئے لیٹ رہنا نہیں ہے، بلکہ کمرِ ہمت باندھیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے لوگوں کو ڈرائیں، اِنذار کا حکم دیا

---

(۱) بخاری ۲/ ۱۰۳۴، باب اول ما بدء بہ رسول اللہ من الوحی۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۲ باب المبعث، فصل اوّل۔

(۲) ترمذی ۲/ ۱۶۳، کتاب التفسیر، سورۃ النجم۔

(۳) بخاری ۲/ ۷۳۲، ۷۳۳، کتاب التفسیر، سورۃ المدثر۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۳ باب المبعث، فصل اوّل۔

گیا، تبلیغ کا حکم دیا گیا، پہلی آیتیں اسی سے متعلق ہیں۔ اور اس سے پچھلی جو آیتیں ہیں سات آیتوں کے بعد یہ بہت بعد میں اُتریں، جب قرآنِ کریم کی خاصی مقدار اُتر آئی تھی اور آپ ﷺ تبلیغ فرمانے لگ گئے تھے، مشرکینِ مکہ نے آپ کے خلاف سازشیں شروع کردی تھیں، اور آپ کا اِستہزا کیا جاتا تھا، قرآنِ کریم کی آیات کا مذاق اُڑایا جاتا تھا، اُس وقت وہ آیات اُتریں، اور اُن میں زیادہ تر مضمون اِنذار کا ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر کرکے اور دوزخ کا ذکر کرکے کافروں کو ان کے انجام سے ڈرایا ہے۔

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ: مدثر یہ مزمل کی طرح ہے، اصل میں تھا مُتَدَثِّرٌ، تاء کو دال کرکے دال میں اِدغام کردیا گیا، دِثار کہتے ہیں ایسے کپڑے کو جو انسان اُوپر اوڑھ لیتا ہے، جیسے کمبل ہوگیا، لحاف ہوگیا، تو مدثر کا معنی لحاف میں، کمبل میں لپٹنے والا، ''اے لحاف اوڑھنے والے! اے کمبل اوڑھنے والے!'' یہ خطاب حضور ﷺ کو ویسے ہی ہے جس طرح سے یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ میں آیا تھا، اور اس کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی گئی تھی، یہ ایک محبت اور پیار کا خطاب ہوا کرتا ہے کہ جو آدمی جس حال میں ہو اسی سے لفظ اختیار کرکے اس کو خطاب کرلیا جائے، جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن کو ''یا ابا تراب!'' کہا، یہ کنیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک بہت محبوب تھی۔

''قیام'' اور ''اِنذار'' کا مفہوم

''اے لحاف اوڑھنے والے! اے لحاف میں لپٹنے والے!'' قُمْ فَاَنْذِرْ: اُٹھ پھر ڈرا، اَنذِر اَمر کا صیغہ آگیا، اُٹھنے کا یہی معنی کہ اب لپٹ کے نہ لیٹیں، لحاف اوڑھ کے نہ لیٹیں، آپ اُٹھیں اور باہر نکلیں اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔ اور اُٹھنا حقیقتاً بھی ہوتا ہے کہ لیٹے ہوا آدمی کو کہا جائے کہ اُٹھ، اور ایک کسی کام کا تہیہ کرنے کے لیے بھی کہتے ہیں، قوم ساری اُٹھ کھڑی ہوئی، ہم اس مطالبہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، تو وہ آمادہ ہونے کے معنی میں بھی ہوتا ہے، کسی کام کی ہمت کرنا اور اس کے لیے آمادہ ہوجانا، تیار ہوجانا، اس کو بھی قیام کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''اُٹھئے پھر ڈرائیے'' اِنذار ایسا ڈرانا ہوتا ہے کہ جس کے اندر شفقت پائی جائے، تو سرورِ کائنات ﷺ بھی قوم کو عذاب سے ڈارتے تھے تو اُس ڈرانے کے اندر بھی محبت، شفقت اور اُن کے اُوپر مہربانی کا پہلو تھا۔

اِسلام میں ''اللہ اکبر'' کی اہمیت

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ: اور اپنے رَبّ کی بڑائی بیان کیجئے، یعنی لوگ مختلف چیزوں کی بڑائی کے قائل ہوگئے، اور آپ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کریں، اپنے پروردگار کی کبریائی ظاہر کریں، اُن کی بڑائی بیان کریں، ''کبریائی بیان کریں اپنے رَبّ کی، بڑائی بیان کریں'' لوگوں کے سامنے یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے، اُس کے مقابلے میں کوئی دُوسرا بڑا نہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کو جو اِبتدا اِبتدا میں قوم کے اِنذار کے لئے آمادہ کیا گیا، تیار کیا گیا، تو سب سے پہلے اللہ کی کبریائی

بیان کرنے کے لیے کہا گیا، یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اندر ''اللہُ اَکْبَر'' کلمے کو بہت مرکزی حیثیت حاصل ہے، بہت اعلیٰ قسم کا ذکر ہے، اور اَذان کی اِبتدا اسی سے ہے، نماز کے اندر بار بار اسی کلمے کو دہرایا جاتا ہے، اور خوشی کے موقع پر، جوش وخروش کے موقع پر ابتدا سے ہی مسلمان یہی نعرہ لگاتے ہیں، جب کوئی ایسا موقع آتا ہے تو ''اللہُ اَکْبَر'' ہی پکارتے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی کبریائی اچھی طرح سے ذہن میں بیٹھ جائے تو پھر اِنسان کو توحید سمجھ میں آجاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دُوسرے کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے سب سے پہلے حکم یہی دیا گیا کہ آپ اپنے رَبّ کی بڑائی بیان کیجئے، اللہ کی کبریائی کو ظاہر کیجئے، اور لوگوں کو بتائیے کہ حقیقتاً بڑائی اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی دُوسرا بڑا نہیں، تو یہ توحید کا اعلان ہو گیا۔

''تطہیرِ ثیاب'' کے دو مفہوم

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ: اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے، رَبَّكَ فَكَبِّرْ کے اندر بنیادی عقیدہ تھا توحید کا، اور یہ چیز عمل سے تعلق رکھتی ہے، اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھئے، کپڑوں سے یہی ظاہری کپڑے مراد لیے جائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ اب اللہ کے دِین کی تبلیغ شروع کرنی ہے اور اللہ کی توحید کو پھیلانا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ظاہر اور باطن کے اعتبار سے پاک صاف ہو، کپڑے آلودہ ہوں، گندے ہوں، ناپاک ہوں، تو ان کے ساتھ اللہ کا ذکر پھبتا نہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عبادات کے اندر طہارت کو بنیادی حیثیت دی ہے، ہماری جتنی کتابیں فقہ کی ہیں سب ''کتاب الطھارۃ'' سے شروع ہوتی ہیں، جس میں پوری طرح سے بدن کی اور کپڑوں کی صفائی کے اَحکام بیان کیے جاتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ بدن پاک ہو اور کپڑے پاک ہوں تو اِنسان کی طبیعت میں لطافت ہوتی ہے، اُس کی رُوحانیت کو جلا ملتا ہے، اور اگر بدن بھی ناپاک ہو، کپڑے بھی ناپاک ہوں تو ایسی صورت میں انسان کی طبیعت میں کثافت پیدا ہوتی ہے، اس لیے بنیادی طور پر یہ حکم دیا گیا کپڑوں کو پاک کیجئے، اور کپڑے بدن سے ایک الگ چیز ہے، جس وقت کپڑوں کی پاکی کا پورا اہتمام کیا گیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بدن کی پاکی کا اہتمام اس سے زیادہ ہونا چاہیے، تو بدن بھی پاک اور کپڑے بھی پاک، یہ ظاہری طہارت پھر باطنی طہارت کا ذریعہ بنتی ہے...... اور بعض حضرات نے ثیاب کا لفظ بول کر اخلاق مراد لیے ہیں، اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھیے یعنی اپنے اخلاق کو ستھرا رکھیے، ہمارے ہاں بھی ایک لفظ بولا جاتا ہے ''فلاں شخص بڑا پاک دامن ہے'' یہ لفظ ہم بولا کرتے ہیں، پاک دامنی، پاک دامن ہے، دامن تو اصل میں قمیص کے اگلے حصے کو کہتے ہیں، اور اِس کو پاک قرار دے کر کہ اُس کا دامن پاک ہے مراد یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بداخلاقی میں مبتلا نہیں ہے، اور جب کوئی شخص کسی بداخلاقی میں مبتلا ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا دامن پاک نہیں، تو کپڑے کی پاکی بول کر اخلاق کی پاکی محاورۃً مراد لی جاتی ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے اخلاق کو اور اپنے اعمال کو صاف ستھرا رکھئے، ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے یہ مراد بھی ہو سکتا ہے...... اور عموم کے طور پر پوری طہارت ہی مراد لی جائے جس طرح سے پہلے میں نے لفظ بولا کہ ظاہری اور باطنی طہارت دونوں کی طرف اشارہ ہو جائے گا، تو ظاہری کپڑوں کو بھی پاک صاف رکھو، اور اپنے اخلاق کو بھی ستھرا رکھو، یہ مفہوم اِس میں آ گیا۔ اور طہارت کے اندر یہ بھی بات ہوا کرتی ہے کہ نجس نہ ہوں، اور یہ بات بھی ہوتی ہے کہ میلے کچیلے نہ ہوں۔

طہارت کے بارے میں جاہلانہ تصوّر اور اِسلام کی تعلیم

تو معلوم ہوگیا کہ کپڑوں کو صاف رکھنا، پاک رکھنا، یہ اسلام کے بنیادی اَحکام میں سے ہے، جاہلیت میں لوگوں نے درویشی کا معیار یہ بنا رکھا تھا کہ جتنا آدمی میلا کچیلا، گندا، پھٹے پُرانے کپڑے، میلے کچیلے کپڑے ہوں وہ کہتے تھے یہ بہت پہنچا ہوا ہے، راہب اور درویش ہونے کی علامت یہ ہوتی تھی کہ انسان میلا کچیلا ہو۔ اسلام نے آ کر اس ذہنیت کو ختم کیا ہے، حضور ﷺ خود اچھا لباس پہنتے تھے، صاف ستھرا لباس پہنتے تھے، اور صاف ستھرے لباس کی آپ نے تلقین کی، کسی کے کپڑے میلے دیکھتے تھے تو آپ اس کو تنبیہ فرماتے تھے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''کتاب اللباس'' میں روایت موجود ہے، بال کسی کے بکھرے ہوئے ہوتے، گرد آلود ہوتے، تو اس کو بھی دیکھ کے تنبیہ فرماتے تھے کہ اپنے بالوں کو سنوارو،[1] اور جب بال سر کے اُوپر رکھے ہیں تو ان کو سنوار کے رکھا کرو، اور اسی طرح سے کپڑوں کو صاف ستھرے رکھا کرو، ایسے کپڑے پہنا کرو کہ دیکھنے والا سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے، جیسی جیسی اپنی مالی حیثیت ہو اس کے مطابق انسان کو کپڑے بھی پہننے چاہئیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی نشان دہی ہو۔ اور آج جو لوگ اہلِ علم نہیں ہیں، جاہل ہیں، تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ اِس وقت بھی وہ ایسے ہی ملنگوں کے پیچھے لگتے ہیں کہ جن کے کپڑے میلے کچیلے، پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے ہوں، جن کو اپنی بھی ہوش نہیں، لوگ سمجھتے ہیں یہی اہل اللہ ہیں، اس قسم کے مجذوبوں کے پیچھے یا اس قسم کے گندے اور نجس لوگوں کے پیچھے جاہل لوگ زیادہ لگتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو بس دُنیا کی کوئی خبر نہیں، بس یہ صرف اللہ کے مست ہیں اور اللہ کے ساتھ ہی تعلق رکھنے والے ہیں، یہ جاہلانہ نظریہ ہے، جو شخص اپنے آپ کو صاف ستھرا نہیں رکھ سکتا، اپنے آپ کو پاک صاف نہیں رکھ سکتا وہ کسی کام کا نہیں ہے، اور اس قسم کے گندے اور نجس لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کوئی کسی قسم کی فضیلت نہیں دی ہوئی، کہ لوگ جائیں اور جا کر ان سے مرادیں مانگیں اور ان سے دُعائیں کروائیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ وہی جاہلانہ تصور ہے جس کو شریعت نے آ کر مٹایا تھا، کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ درویش وہی ہوتا ہے کہ جو نہ اچھے کپڑے پہنے، نہ اُس کے بال سنورے ہوئے ہوں، گندا ہو، اور ہر طرح سے پھٹے پُرانے کپڑوں میں ہو، یہ جاہلانہ تصور ہے جس کو اسلام نے آ کر ختم کیا ہے، اور اَب تک جاہلوں کے اندر یہی بات چلی آتی ہے، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کے اندر یہ سب چیزیں آگئیں۔

پلیدی سے بچے رہنے کا حکم اور اس کا مصداق

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ: رُجز: نجس چیز کو کہتے ہیں، رُجز، رِجز، رِکس، نجس یہ سب ایک جیسے مفہوم پر مشتمل الفاظ ہیں، ''پلیدی کو چھوڑ دیجئے'' پلیدی کی اعلیٰ قسم تو ہے شرک، رِجس مِن الأوثان کا ذکر قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ آیا ہوا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (سورۂ حج: ۳۰) رِجس مِن الأوثان: بتوں کی گندگی، اور اعلیٰ مصداق تو اس کا یہی ہوا کہ بتوں کی گندگی سے دُور رہیے، اس کو چھوڑ دیجئے، چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے پہلے چھوڑے ہوئے ہیں، اسی طرح سے آپ اس کو چھوڑے رکھیں، اس گندگی کے ساتھ اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیں، جب آپ نے دُوسروں کو توحید سکھائی ہے تو آپ کا عمل،

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/۳۷۵، کتاب اللباس، فصل ثانی، عن جابر۔ نیز دیکھیں ۲/۳۸۴ باب الترجل کا تقریباً آخر۔

آپ کا قول، آپ کا فعل اتنا ستھرا ہونا چاہیے کہ اس میں شرک کا شائبہ نہ پایا جائے، جس طرح سے پہلے نہیں پایا جاتا آئندہ بھی آپ اپنے آپ کو محفوظ رکھئے۔ اور ظاہری نجاست سے دُور رہنا بھی ہو گیا، کہ جب پہلے کپڑوں کو پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے تو اُس کے ساتھ یہ حکم بھی آ گیا کہ پلیدی سے دُور رہیے، پلیدی اپنے پاس نہ آنے دیجئے، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ: پلیدی کو چھوڑ دیجئے، امر جس طرح سے ایجادِ فعل کے لئے ہوتا ہے بقائے فعل کے لئے بھی ہوتا ہے، ''چھوڑ دیجئے، چھوڑے رکھیے، چھوڑے رہیے'' یعنی جس طرح سے پہلے چھوڑی ہوئی ہے اسی طرح سے آئندہ بھی اس کو چھوڑے رکھیں، اپنے دامن پر کوئی پلید دھبّا نہ لگنے دیں، قریب نہ آنے دیں، اور اسی طرح سے اپنے عقیدے میں، اپنے عمل میں شرک کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے دیں، اس طرح سے دوام مطلوب ہو گیا اس اَمر کے صیغے سے۔

بدلہ لینے کی نیت سے اِحسان کرنے کی ممانعت اور صبر کا حکم

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ: یہ اخلاق کا بیان آ گیا۔ مَنَّ یَمُنُّ: احسان کرنا، استکثار کا معنی ہوتا ہے زیادہ طلب کرنا، لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کا معنی ہو گیا کہ احسان نہ کر اس حال میں کہ تو زیادہ طلب کرے، آپ کے اخلاق کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ آپ لوگوں پہ احسان کیجئے اور اُدھر سے بدلہ نہ چاہیے، اور بدلہ لینے کی نیت سے کسی کے اُوپر احسان کرنا اگرچہ شرعاً اس کا جواز ہے، لیکن اخلاقِ عالیہ کے خلاف ہے، جب انسان احسان کرے تو اِحسان کرتے ہوئے انسان کے دِل میں جذبہ یہی ہونا چاہیے کہ اس کا بدلہ اللہ دے گا، میں جس پر اِحسان کر رہا ہوں اس سے مجھے کسی بدلے کی توقع نہیں ہے، میں اس سے کوئی بدلے کی اُمید نہیں رکھتا۔ اور اگر احسان کرتے وقت دِل میں یہ ہو کہ میں اِس کو اِس وقت یہ تھوڑا سا دے رہا ہوں، دوسرے وقت میں یہ زیادہ مجھے دے گا، تو آپ جانتے ہیں کہ یہ بات اخلاق کے خلاف ہے، اس کو کسی درجے میں کمینگی سمجھا جاتا ہے، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ کو اِبتدائی طور پر یہ تعلیم دی گئی کہ آپ جب بھی کسی پر احسان کریں خلوص سے کریں، اللہ کی رضا کے لئے کریں، اللہ سے اس کا بدلہ چاہیں، زیادہ طلب کرنے کے لیے آپ کسی کے اُوپر احسان نہ کریں، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ: احسان نہ کیجئے اس حال میں کہ آپ زیادتی کے طالب ہوں، تو زیادتی کے طلب کی نہی کرنی مقصود ہے، احسان کی نہی کرنی مقصود نہیں ہے، احسان تو کرنا ہے لیکن زیادہ طلب کرتے ہوئے، اس جذبے کے تحت کہ دُوسرے وقت ہمیں زیادہ وصول ہو گا، اس جذبے سے احسان نہ کیجئے...... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ: تو جب آپ لوگوں کے لئے اِنذار کریں گے، لوگوں کو ڈرائیں گے، دِین کی دعوت دیں گے لوگ مخالفت کریں گے، تکلیفیں پہنچائیں گے، تو یہ حکم بھی بنیادی طور پر دے دیا گیا کہ اپنے رَبّ کی رضا کے لئے صبر کیجئے، جو کچھ بھی اس راستے کے اندر پیش آئے اس کو برداشت کرتے جائیے اپنے رَبّ کی رضا کے لئے۔

مذکورہ اَحکام کا حاصل

یہ ہیں وہ اِبتدائی اَحکام جو سرورِ کائنات ﷺ کو تبلیغ کا حکم دیتے ہوئے دیے گئے، قُمْ فَأَنْذِرْ: اُٹھیے، لوگوں کو ڈرائیے، آگے حکم آ گیا اللہ کی توحید بیان کرنے کا، پھر حکم آ گیا اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنے کا، پھر آ گیا نجاست، پلیدی، شرک، کفر سے

دُور رہنے کا، اور پھر اخلاق آ گیا کہ لوگوں پہ احسان کرو، لیکن دل کے اندر بدلے کی طلب نہ ہو، اس خیال سے نہ کیجئے کہ دوسرے وقت میں ہم زیادہ لیں گے، اخلاص کے ساتھ، محبت کے ساتھ، اللہ سے جزا کی اُمید رکھتے ہوئے لوگوں کے اُوپر احسانات کرو، جیسے کہ سورۂ دہر کے اندر لفظ آئے گا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ، یہ اہل اللہ کی شان اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ جب وہ کسی کو کھانا کھلاتے ہیں تو یہ کہتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ: ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں، لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (آیت:۹) ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ کوئی شکر گزاری چاہتے ہیں۔ تو یہی حال ہونا چاہیے مبلغین کا، دِین کی تعلیم دینے والوں کا، کہ اُن کا برتاؤ ہر کسی کے ساتھ احسان کا ہو اور بغیر بدلہ لینے کی نیت کے، زیادہ طلب کرنے کی تو بہت بعد کی بات ہے، احسان کریں تو اُس وقت دِل میں یہی بات ہو کہ اِس کا بدلہ اللہ دے گا، جس کے اُوپر ہم احسان کر رہے ہیں ہم اُس سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ اور پھر صبر تو بہت ہی بنیادی خلق ہے، جس طرح سے کہ سورۂ مزمل کے اندر بھی ذِکر کیا گیا تھا وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ۔

قیامت کے دِن کی سختی

اگلی آیات بعد میں اُتریں جبکہ مشرکین مخالفت کرنے لگ گئے تھے، اور حضور ﷺ کے خلاف ان کی کوششیں تیز ہو گئی تھیں، اِن کے اندر اِنذار کا مفہوم ہی ہے زیادہ تر، قرآنِ کریم نے جہنم کا ذِکر کر کے، آخرت کے احوال ذِکر کر کے، قیامت کا حال ذِکر کر کے لوگوں کو ڈرایا ہے۔ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ: ناقور سے صور مراد ہے، صور جو پھونکا جائے گا، نَقَرَ کا اصل میں معنی ہے بجانا، آواز نکالنا، ناقور: بجنے والی چیز، نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ کا لفظی معنی بنتا ہے کہ بجنے والی چیز میں جس وقت آواز پیدا کی جائے گی، اور اِس کا مفہوم یہی ہے کہ جس وقت صور میں پھونک ماری جائے گی، کیونکہ پھونک مارنا سبب بنے گا آواز پیدا ہونے کا، فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ (سورۂ مؤمنون:۱۰۱) قرآنِ کریم کے اندر جو ذِکر کیا گیا، تو ناقور سے صور مراد ہے، اور نَقَرَ سے اس میں پھونک مارنا مراد ہے، اور صور میں پھونک مارنا یہ اشارہ ہے قیامت کے آنے کی طرف، ''پس جس وقت صور میں پھونک ماردی جائے گی'' فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ: يَوْمَئِذٍ یہ ذٰلِكَ سے بدل ہے، یوم اذ کان کذا، ''پس یہ وقت جس دِن کہ ایسا ہوگا بہت سخت دِن ہے'' ذٰلِكَ اور يَوْمَئِذٍ دونوں لفظوں کا ترجمہ کر رہا ہوں، ''یہ وقت جس دِن کہ ایسا ہوگا بہت سخت دِن ہے'' جس دِن یہ واقعہ پیش آئے گا صور میں پھونک مارنے کا اور قیامت آئے گی یہ بہت سخت دِن ہے، يَوْمٌ عَسِيْرٌ: بہت سخت دِن ہے، فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ: پس جس وقت صور میں پھونک ماری جائے گی، فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ: يَوْمٌ عَسِيْرٌ یہ ذٰلِكَ کی خبر ہے، یہ سخت دِن ہے، اور يَوْمَئِذٍ یہ ذٰلِكَ سے بدل ہوگا تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ وقت یعنی جس دِن کہ ایسا ہوگا سخت دِن ہے، کافروں پر آسان نہیں، عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ: غَيْرُ يَسِيْرٍ یہ عَسِيْرٌ کا ہی مفہوم ہے، تاکید کے طور پر اس کو مثبت اور منفی دونوں عنوانوں سے ذِکر کر دیا گیا، ''کافروں پر آسان نہیں، دُشوار ہے۔''

اگلی آیات کا شانِ نزول اور ولید بن مغیرہ کا تعارف

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا: وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ کا لفظ سورۂ مزمل میں آیا تھا، یہ مضمون بھی ویسے ہی ہے، واقعات میں لکھا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے ولید بن مغیرہ کے پاس جا کر میٹنگ کی کہ محمد ﷺ کی تبلیغ پھیلتی جا رہی ہے، لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں، تو

ان کے خلاف کیا پروپیگنڈا کیا جائے جس کی بنا پر لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں؟ ولید بن مغیرہ قوم کا سردار تھا، اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، یہ وہی ولید ہے جس کے بیٹے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بعد میں اسلامی فوجوں کے سپہ سالار ہوئے اور ''سیف من سیوف اللہ'' کا لقب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پایا، اور اسلام کے بہت بڑے فاتحین میں سے ہیں خالد بن ولید، یہ اسی ولید کے لڑکے ہیں۔ تو یہ ولید باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور بہت مال دار تھا، اس کے دس بیٹے تھے جو ہر وقت مجلسوں کے اندر موجود رہتے، اور اپنے باپ کی عزت بڑھاتے تھے، کام کاج کے لئے، تجارت کے لئے خدام تھے، غلام تھے، اور طائف تک اس کی جائیداد پھیلی ہوئی تھی، مالی برتری اس کو حاصل تھی، اس لیے مشرکینِ مکہ کے ہاں اس کا خاصا مقام تھا، ابوجہل بھی وہیں تھا، دوسرے لوگ بھی وہیں تھے، تو یہ طے کرنا چاہا کہ ہم ان کے خلاف کیا پروپیگنڈا کریں جس سے لوگ متاثر ہوں۔ کسی نے کہا: ان کو کاہن کہا جائے، تو ولید انکار کر دیتا کہ کہانت والے تو یہ حالات نہیں ہیں، کاہن کیسے ہوتے ہیں ہمیں پتا ہے، یہ جو غیب کی خبریں جنوں سے لے کر دیتے ہیں، جنوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتے ہیں، اخلاق، کردار کے گندے ہوتے ہیں، حریص ہوتے ہیں، لالچی ہوتے ہیں، تو یہ بات ان پہ صادق نہیں آتی، لوگ کہیں گے یہ بات غلط ہے۔ کوئی کہتا: شاعر۔ وہ کہتا کہ شاعر کہنا بھی مشکل ہے، شعر گوئی ہم خود بھی کرتے ہیں، شاعروں کی کلام بھی ہم نے سنی ہے، ان کی کلام تو شعر کے ساتھ بھی ملتی جلتی نہیں۔ کوئی مجنون کہے، کوئی دیوانہ کہے، کوئی کچھ کہے، لیکن کوئی بات بھی ایسی منطبق نہیں ہوتی تھی کہ جس سے لوگوں کو متاثر کیا جاسکے۔ پھر سب نے مل کر کہا کہ اچھا! تُو ہی بتا کہ پھر کیا کہا جائے؟ وہ کہتا ہے کہ اچھا! مجھے کچھ سوچنے دو، سوچا، سوچنے کے بعد اپنے دِل کے اندر ایک بات بنائی، اور منہ بگاڑ کر نفرت کے ساتھ جس طرح سے انسان جب کسی کا تحقیر کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہے تو جیسے دِل کے اندر تحقیر کا جذبہ ہوتا ہے تو چہرے پر بھی ویسے اثرات ہوا کرتے ہیں، انسان پیشانی چڑھالیتا ہے، منہ بُرا کر لیتا ہے، جس وقت کسی کا ذِکر نفرت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو چہرے پر بھی اثرات آتے ہیں، تو اس طرح سے منہ بگاڑ کر کہنے لگا کہ یہ تو جادو ہے اور پہلے سے چلا آتا ہے، پہلے بھی کوئی لوگ اس قسم کے تھے جو جادو کے ساتھ لوگوں کو قابو کر لیتے تھے، میاں بیوی میں، بہن بھائیوں میں، اولاد والدین میں پھوٹ ڈال دیتے تھے، یہ بھی جادوگر ہے اور اس کی کلام کے اندر جادو کے سے اثرات ہیں، جس کی وجہ سے گھر گھر کے اندر پھوٹ پڑگئی اور لوگوں کا آپس میں اختلاف ہوگیا، بیوی خاوند کا اختلاف ہے، بھائیوں میں اختلاف ہوگیا، اولاد والدین میں اختلاف ہوگیا، گھر گھر اس نے پھوٹ ڈال دی، یہ جادوگر ہے اور اس کی جو کلام ہے یہ جادو ہے، اس قسم کی بات اس نے بنائی لوگوں کے سامنے ذِکر کرنے کے لئے، قرآنِ کریم اسی مجلس کا خاکہ کھینچتا ہے اور اس کی مذمت کرتا ہے، کیونکہ یہ سِحر اور ساحر، جادو اور جادوگر یہ بھی کوئی ایسی مخفی چیز نہیں کہ جادو کیا ہوتا ہے، جادوگر کیسے کرتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کے حالات جادوگروں کے ساتھ کسی اعتبار سے بھی مشابہت نہیں رکھتے، آگے یہی نقل کیا ہے، عام طور پر بھی سب کی مذمت ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اس ولید بن مغیرہ کی، جیسے کہ روایات میں ذِکر کیا گیا۔

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا: چھوڑ مجھے اور اس شخص کو جس کو میں نے وحید پیدا کیا، پیدا کیا وحید، وحید کا معنی یکتا، وہ یکتا تھا اس اعتبار سے کہ باپ کا ایک ہی بیٹا تھا، اور یکتا تھا اس اعتبار سے کہ اس کے مقابل کا کوئی دُوسرا مال دار اور باعزت شخص مکہ معظمہ

میں نہیں تھا، وحید اور فرید یعنی تنہا یکتا، جس کی مثل کوئی دوسرا نہ ہو، میں نے اس کو وحید پیدا کیا، یہ مفہوم بھی اس کا ہے اور اس کے ضمن میں یہ بات بھی آگئی کہ جب یہ پیدا ہوا تو تنہا تھا، نہ اس کے بیٹے تھے، نہ اس کے پاس مال تھا نہ دولت تھی، میں نے اس کو وحید پیدا کیا یعنی واقع کے اعتبار سے بھی وہ اپنے آپ کو وحید ہی کہلاتا تھا، اور اُس زمانے کے اندر بھی وہ یونہی سمجھا جاتا تھا جیسے اس کے برابر کا کوئی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو پیدا بھی وحید کیا، کہ جس دِن یہ پیدا ہوا ہے تو اکیلا تھا، اس کے پاس نہ کوئی اولاد تھی، نہ اس کے پاس کوئی مال اور دولت تھی، بعد میں میں نے اس کو مال دیا، اولاد دی، تو وہ اپنے خیال میں وحید اور متی میں تھا، یہاں وحید اور معنی میں ذکر کیا جارہا ہے۔ ''چھوڑ مجھے اور اس کو جس کو میں نے وحید پیدا کیا'' یعنی تنہا پیدا کیا، اور ویسے بھی وہ وحید تھا، وحید کہلاتا تھا، اُس مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا: اور میں نے اس کے لئے مال بنایا پھیلایا ہوا، اس کا مال بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے، ریوڑ ہیں دُور دُور تک چلتے ہیں، جانور ہیں مختلف جگہوں پہ چرتے ہیں، باغات ہیں، زمینیں ہیں، تجارت ہے، تجارتی کوٹھیاں ہیں، بڑا پھیلا ہوا مال میں نے اس کے لئے بنا دیا، وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا: شھود شاھد کی جمع، اور میں نے اس کے لئے حاضر رہنے والے بیٹے بنائے، جن کو کام کاج کے لئے باہر نہیں جانا پڑتا، کام کرنے کے لئے غلام اور خدام بہت ہیں، اور یہ بیٹے سامنے موجود رہتے ہیں، باپ کی عزت بڑھاتے ہیں، مجلسوں میں بیٹھتے ہیں، وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا: مَهَّدَ تَمْهِيْدًا: ہموار کرنا، سامان تیار کرنا، اور میں نے اس کے لئے ہموار کیا ہموار کرنا، یعنی سرداری کے راستے میں نے اس کے لئے ہموار کر دیے، اور جاہ اس کے لئے مہیا کر دیا، یہ بڑے مرتبے کا آدمی ہے، بہت بڑا اس کو مرتبہ دے دیا، مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا: میں نے سرداری کا راستہ اس کے لئے ہموار کیا ہموار کرنا، یہ مفہوم اس کا ہو جائے گا، آپ جو تمہید باندھا کرتے ہیں کسی بات کے بیان کرنے کے لئے اس کا معنی بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ راہ ہموار کرتے ہیں تاکہ اس راستے پہ چل کر دوسروں کو ایک بات سمجھا سکیں، اگر تمہید نہ باندھی جائے، پہلے راستے کو ہموار نہ کیا جائے، یک دَم اپنے مطلب کی بات کہہ دی جائے تو بسا اوقات دوسرا سمجھتا بھی نہیں اور قبول بھی نہیں کرتا، اس لیے تمہید باندھ کر پہلے حالات کو سنوار لیا جاتا ہے، راہ ہموار کر لی جاتی ہے، اس کے بعد پھر اپنے مطلب کی بات کہی جاتی ہے، تو یہ تمہید وہی ہے، ''میں نے ہموار کیا اس کے لئے ہموار کرنا'' یعنی سرداری کا راستہ۔ تو مال کا ذکر بھی آگیا، جاہ کا ذِکر بھی آگیا، اس کو مال دار بھی بنایا، صاحبِ اولاد بھی بنایا اور سردار بھی بنایا، میں نے یہ سب کچھ اسے دیا۔

ولید بن مغیرہ کا زوال

ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ: پھر وہ اُمید رکھتا ہے کہ میں اور زیادہ دوں، زَادَ يَزِيْدُ: زیادہ کرنا، یعنی وہ جو دیا ہے اس کا شکر ادا کرتا نہیں، اُمید رکھتا ہے کہ اور زیادہ نعمتیں ملیں، كَلَّا: ہرگز نہیں، اب اس کو مزید نعمتیں نہیں ملیں گی، نہ دُنیا میں نہ آخرت میں، ہرگز ایسا نہیں ہوگا، اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا: بے شک وہ ہماری آیات کے لئے عناد رکھنے والا ہے، ضدی ہے، جب وہ ہماری آیات سے ضد رکھتا ہے اب آئندہ اس کے لئے میں نعمتیں زیادہ نہیں کروں گا، آخرت میں تو بالکل بھی نہیں ملے گی، اور دُنیا میں بھی اب ترقی نہیں

ہوگی، روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس آیت کے اُترنے کے بعد پھر اس میں زوال شروع ہو گیا۔ كَلَّا: ہرگز نہیں، اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا: بے شک وہ ہماری آیات کے لئے ضد کرنے والا ہے۔

ولید بن مغیرہ کا انجام

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا: صعود اصل کے اعتبار سے تو چڑھائی کو کہتے ہیں، صَعِدَ چڑھنے کو کہتے ہیں، اُونچی جگہ جس کی دُشوار گزار چڑھائی ہو اس کو صعود کہہ دیا جاتا ہے، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ صعود جہنم کے اندر ایک پہاڑ ہے بہت اُونچا، ۷۰ سال تک کافر کو اس کے اُوپر چڑھایا جائے گا، پھر چوٹی کے اُوپر سے جا کے گرا دیا جائے گا، صعود سے جہنم کا پہاڑ مراد ہے، ''عنقریب چڑھاؤں گا میں اُس کو جہنم کے صعود پہاڑ پر'' یعنی یہ جہنم میں جائے گا، جہنم میں جانے کے بعد اِس کو اُس پہاڑ کے اُوپر چڑھایا جائے گا۔

ولید بن مغیرہ کی غیر مہذب حرکات

اِنَّهٗ فَكَّرَ: اب اُس مجلس کا ذِکر آ گیا، بے شک اس نے سوچا، وَقَدَّرَ: اور اندازہ کیا، فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ: پس یہ برباد ہو جائے اِس نے کیسے اندازہ کیا؟ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ: پھر یہ برباد ہو جائے، قتل کیا جائے، مارا جائے، اس نے کیسا اندازہ کیا؟ یہ قُتِلَ بددُعا کے طور پر ہے۔ ثُمَّ نَظَرَ: پھر دیکھا، یعنی اس مجمع کی طرف جہاں موجود تھا، پھر دیکھا، ثُمَّ عَبَسَ: پھر اس نے منہ بنایا، وَبَسَرَ: اور زیادہ منہ بگاڑا، بسر یہ عبس سے آگے بڑھ کر ہے، کچھ ترشی منہ پہ آ گئی یہ عَبَسَ ہے، یہ لفظ آگے بھی آئے گا آپ کے سامنے عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى (سورۂ عبس)، منہ بنایا اور پیٹھ پھیر لی، اور ایک اور جگہ ہے يَوْمًا عَبُوْسًا (سورۂ دہر)، اور بَسَرَ منہ بسورنا جسے کہتے ہیں، ہمارے ہاں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے منہ بسور لیا، جیسے کسی سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انسان بُری سی شکل بنالیتا ہے، اس نے تیوریاں چڑھائیں، منہ بسورا، منہ بُرا کیا، یہ بَسَرَ کا لفظ بھی قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے اگلی سورت میں آئے گا وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ، تو بَسَرَ یہ عَبَسَ کی ترقی ہے، ''پھر اُس نے منہ بنایا پھر اور زیادہ منہ بگاڑا'' ثُمَّ اَدْبَرَ: پھر اس نے پیٹھ پھیری، وَاسْتَكْبَرَ: اور تکبر کیا، فَقَالَ: پھر اس نے کہا، اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ: نہیں ہے یہ مگر جادو جو چلا آتا ہے، يُّؤْثَرُ: جو نقل کیا جاتا ہے، جو پہلے سے چلا آتا ہے یہ جادو ہے، هٰذَاۤ کا اشارہ حضور ﷺ کے بیان کردہ کلام کی طرف ہے، یہ جو کچھ پڑھتے ہیں سُناتے ہیں یہ جادو ہے جو چلا آتا ہے، اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ: نہیں ہے یہ مگر انسان کا کلام، یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ قولِ بشر ہے، یہ جو کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام ہے ایسی بات نہیں ہے، ہاں! اس میں تاثیر ہے، متاثر کرتا ہے، لیکن یہ تاثیر جادو والی ہے، اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے نہیں۔

جہنم کی ہولناکی

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ: عنقریب داخل کروں گا میں اس کو جہنم میں، سَقَرَ جہنم کا نام ہے، یہ وعید آ گئی، واقعہ اگرچہ اکیلے ولید کا ہو لیکن جس شخص کی بھی ایسی ذہنیت ہو گی اس کے لئے یہی وعید ہے، ''عنقریب داخل کروں گا میں اس کو جہنم میں'' وَمَاۤ اَدْرٰىكَ: تجھے کس چیز نے بتایا، مَا سَقَرُ: جہنم کیا چیز ہے؟ آپ کو کیا پتا جہنم کیا چیز ہے؟ وہ جب سامنے آئے گی تبھی پتا چلے گا، یہ ہیبت پیدا کرنے

کے لئے ہے، ''کیا پتا آپ کو، جہنم کیا چیز ہے؟'' لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ: اَبْقٰی یُبْقِیْ اِبْقَاءً، اس کا معنی ہے باقی رکھنا، اور لَا تَذَرُ یہ وَذَرَ سے ہے چھوڑنے کے معنی میں، ذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اور ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا، یہ اسی سے اَمر کا صیغہ آیا ہے، تو لَا تُبْقِیْ کا معنی یوں بھی ہوسکتا ہے ''باقی نہیں چھوڑے گی'' یعنی کسی کافر کو باقی نہیں چھوڑے گی، یا، جو کافر جہنم میں چلے جائیں گے ان کی کسی چیز کو جلانے سے نہیں چھوڑے گی، اور لَا تَذَرُ کا معنی کسی کافر کو باہر نہیں چھوڑے گی، جہنم میں جانے کے بعد کافروں کے کسی حصے کو جلانے سے نہیں چھوڑے گی، اور لَا تَذَرُ کا معنی ہوجائے گا کہ کسی کافر کو اندر لینے سے نہیں چھوڑے گی، سب کافروں کو اپنے اندر لے لے گی اور اندر لینے کے بعد اُن کا کچھ باقی نہیں چھوڑے گی......اور یہ معنی بھی بعض مترجمین نے کیا ہے کہ اَبْقٰی عَلَیْهِ یہ عربی میں محاورہ آتا ہے رحم کرنا، ترس کھانا، اَبْقٰی عَلَیْهِ رَحِمَ کے معنی میں، تو لَا تُبْقِیْ کا معنی ہوگا وہ ترس نہیں کھائے گی، وَلَا تَذَرُ: اور نہ کسی کو جلانے سے چھوڑے گی، ترس نہیں کھائے گی، جس طرح سے رحم کھا کے کسی کو چھوڑ دیا جاتا ہے ایسی بات نہیں ہوگی۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ: بشر سے یہاں اُوپر والی کھال مراد ہے چمڑا، لواحہ کی معنی بدل ڈالے گی، جھلس دے گی، جلا دے گی، ''جھلس دے گی وہ چمڑے کو'' بشر اُوپر والے چمڑے کے معنی میں ہے، بشر انسان کو بھی کہتے ہیں اور اُوپر والے چمڑے کو بھی کہتے ہیں، اور یہاں حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ''وہ جلا دینے والی ہے آدمیوں کو''، تو انہوں نے بشر کو انسان کے معنی میں لیا ہے، اور دوسرا نسخہ دے کے حاشیے میں دوسرا ترجمہ بھی کیا ہے ''نظر آتی ہے بدن پر'' یعنی جو کھال بدن پہ نظر آتی ہے، بشر کا یہ معنی بھی ہے، لواحۃ کے معنی بدل ڈالے گی، جھلس دے گی چمڑے کو، یعنی یہ انسان کا یہ ظاہری چہرہ جو ایک خوبصورتی کا معیار ہے، اور ہر انسان اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، تو آگ اسی چہرے کو ہی جلائے گی، اور متغیر کر کے رکھ دے گی۔

جہنم پر اُنیس بڑے فرشتوں کا تعین

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ: اُس جہنم کے اُوپر اُنیس متعین ہیں، اُنیس یہ عدد آگیا، معدود اور تمیز اس کی یہاں ذکر نہیں کی گئی کہ وہ اُنیس کون ہیں؟ اگلی آیات میں ذکر کیا جارہا ہے کہ ان اُنیس سے فرشتے مراد ہیں، اُس جہنم پر اُنیس فرشتے متعین ہیں اس کے انتظام کے لئے۔ اب یہ اُنیس کا عدد جو یہاں ذکر کیا گیا اس کی اصل حکمت تو اللہ ہی جانتے ہیں کہ اُنیس کے عدد میں کیا حکمت ہے؟ یہ اُنیس جہنم کے اُوپر افسر ہیں، جن میں افسرِ اعلیٰ کا نام ''مالک'' ہے، یٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (سورۂ زُخرف: ۷۷)، یہ مالک داروغۂ جہنم ہے جو جہنم کے فرشتوں میں سب سے اُوپر بڑا افسر ہے، اور ان کے ماتحت اور بے شمار لشکر ہوں گے، جیسے اسی رُکوع کے آخر میں آئے گا وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ، تیرے رَبّ کے لشکروں کی تعداد نہیں جانتا کوئی بھی سوائے اُس کے۔ تو یہ اُنیس افسر متعین کیے گئے ہیں جہنم کا انتظام کرنے کے لئے، یہ فرشتے جو جہنم میں ہوں گے ان کو کوئی کسی قسم کی سزا نہیں ہوگی، جس طرح سے آج کل ہم بھی اگر جیل میں جائیں تو وہاں افسر بھی ہیں قیدی بھی ہیں، قیدیوں کو سزا ہوتی ہے، افسروں کو کوئی سزا نہیں ہوتی، رہتے وہ بھی جیل میں ہی ہیں، اسی طرح سے یہ جہنم میں رہنے والے فرشتے جہنم میں تکلیف نہیں اُٹھائیں گے، یہ تو منتظم ہونے کی حیثیت سے وہاں جائیں گے۔

اُنیس کے عدد کی پہلی حکمت

باقی رہا کہ اِس عدد میں کیا حکمت ہے؟ حقیقتِ حال تو اللہ جانتے ہیں، لیکن دو قسم کی توجیہیں اس بارے میں معروف ہیں کہ اُنیس کا عدد کیوں بولا گیا ہے؟ ایک تو جیہ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، اورایک توجیہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر عزیزی'' میں کی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل میں جہنم کے اندر جو جانا ہے اور دائماً اس میں رہنا ہے یہ کُفر کی بنا پر ہے، اور مؤمن دائماً جہنم میں نہیں جائے گا، مؤمن اگر جہنم میں جائے گا تو کسی کافرانہ حرکت کی بنا پر جائے گا، اور ہر گناہ ایک کُفر کی حرکت ہے، مؤمن ایمان کی حالت میں جب گناہ کرتا ہے تو گویا کہ عملاً وہ کُفر کی طرف چلا جاتا ہے، اس لئے جہنم میں جائے گا، اور جس وقت اس عملی غلطی کا ازالہ ہوجائے گا تو ایمان کی برکت سے جنت میں چلا جائے گا۔ تو جہنم اصل کے اعتبار سے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ہے (سورۂ بقرہ: ۲۴) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، مؤمنین کے لئے نہیں۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤمن بننے کے لئے بنیادی عقیدے جو اِسلام نے تعلیم دیے ہیں وہ اُنیس ہیں، اور باقی سب ان کے ملحقات ہیں، اُنیس عقیدے ہیں بنیادی طور پر، جو اِنسان کو اِختیار کرنے پڑتے ہیں تب جاکے انسان مؤمن بنتا ہے، نو چیزیں تو قلبی ہیں، خیال کے متعلق ہیں، اللہ پر ایمان لانا، اوراس عالم کے حدوث پر ایمان لانا کہ یہ اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، اور پہلے نہیں تھا، اللہ کے پیدا کرنے سے ہوا، اور جب اللہ چاہے گا یہ ختم ہوجائے گا، حدوثِ عالم یہ بھی بنیادی عقائد میں داخل ہے۔ تو اللہ پر ایمان لانا، حدوثِ عالم پر ایمان لانا، فرشتوں پہ ایمان لانا، نبیوں پہ اِیمان لانا، کتابوں پر ایمان لانا، آخرت پر اِیمان لانا، تقدیر پر ایمان لانا، جنّت اور دوزخ کو ماننا، یہ تعداد ۹ ہوگئی، یعنی یہ جاننا کہ جنت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق ہے، یہ ہیں بنیادی چیزیں، باقی سب ان کے ملحقات ہیں، قلبی عقائد کے درجے میں تو یہ ۹ چیزیں آگئیں...... اور باقی رہ گئے مامورات، اعمال، اُن بھی پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کو فرض جاننا ضروری ہے، یہی جن کو آپ ارکانِ خمسہ کہتے ہیں، تلفظ شہادتین، اِقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، صومِ رمضان اور حج، یہ مامورات میں سے پانچ بنیادی چیزیں ہیں جن کو عقیدے کے طور پر فرض جاننا ضروری ہے کہ اگر انسان ان میں سے کسی ایک کا بھی منکر ہو تو کافر ہوجاتا ہے...... اور اسی طرح سے منہیات جن سے روکا گیا وہاں بھی بنیادی چیزیں پانچ ہیں جن کا ذِکر سورۂ ممتحنہ کے اندر کیا گیا ہے، زِنا ہے، چوری ہے، قتل ہے، بہتان ہے اور عصیان لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ، تو یہ پانچ چیزیں بنیادی طور پر منہیات میں سے ہیں..... تو مامورات میں بنیادی طور پر پانچ چیزیں، اور منہیات میں پانچ چیزیں، دس ہوگئیں، اور ۹ بنیادی قلبی عقیدے کے طور، تو اُنیس ہوگئیں، تو جو کافر ہے تو یوں سمجھو! کہ اُنیس چیزوں کا منکر ہے، اور مؤمن بننے کے لئے ان اُنیس چیزوں کو اپنانا ضروری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے کافر کو سزا دینے کے لئے ایک ایک عقیدے کے مقابلے میں ایک ایک فرشتے کو متعین کردیا، یہ حکمت ہوسکتی ہے اُنیس کے عدد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفصیل کے مطابق جو انہوں نے ''بیان القرآن'' میں لکھی۔

دُوسری حکمت

اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدّثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دُوسری توجیہ کی، اور اس کو حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حاشیے میں لطیف قرار دیا ہے، اُس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بنایا، ایک ایک فرشتے کو اتنی قوت دی ہے کہ وہ اکیلا ہی سارے انسانوں کے مقابلے میں آسکتا ہے، بڑی بڑی اُس میں قوت ہے، لیکن ان کو بنایا ایسے طور پر ہے کہ جو کام ان کے سپرد کر دیا جائے ایک کام، وہی کام کر سکتے ہیں، دوسرا کام نہیں کر سکتے، ان کی صلاحیت محدود ہے، جزئی ہے، انسان کو جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے مدرکِ کلیات بنایا ہے کہ اس کو اللہ نے مختلف قدرتیں دی ہیں کہ یہ بھی کر سکتا ہے، وہ بھی کر سکتا ہے، فرشتے اس طرح سے نہیں، مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ عزرائیل علیہ السلام کو جان نکالنے کے لئے اللہ نے بنایا ہے تو وہ جان تو نکال سکتا ہے بارش کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے، میکائیل علیہ السلام وغیرہ بارش کا انتظام تو کر سکتے ہیں، کسی کی جان نکال لینا ان کے بس کی بات نہیں ہے، اور اسی طرح سے دوسرے فرشتے، جن کو رُوح ڈالنے پر متعین کر دیا وہ رُوح ہی ڈال سکتے ہیں، نکال نہیں سکتے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ اپنی حکمت کے تحت فرشتوں کے ذِمّے مختلف ڈیوٹیاں لگائی ہیں اور جس فرشتے کی جو ڈیوٹی متعین کر دی وہ وہی کام کر سکتا ہے، دوسرا نہیں کر سکتا...... کہتے ہیں قرآن وحدیث کے اُوپر اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو جہنّم کے اندر اُنیس قسم کے عذاب ہیں جو اللہ نے کافروں کے لئے رکھے ہیں، یہ جو آتا ہے کہ جہنّم میں یہ بھی ہوگا، یہ بھی ہوگا، کہتے ہیں قرآن وحدیث پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو عذاب اُنیس انواع کے ہیں جو کافروں کو ہوں گے، تو ایک ایک نوع کے عذاب کے لئے ایک ایک فرشتہ متعین کر دیا، گرم پانی کا انتظام کرنا ایک فرشتے کے ذِمّے ہے، آگ کا انتظام کرنا ایک فرشتے کے ذِمّے ہے، سانپوں کا کنٹرول ایک فرشتے کے ذِمّے ہے، بچھوؤں کا دوسرے فرشتے کے ذِمّے ہے، اس طرح سے جو مختلف عذاب ذِکر کیے گئے ہیں تو ان عذابوں کی جتنی انواع ہیں ان میں سے ہر نوع کے لئے ایک فرشتے کو متعین کر دیا، تو اُنیس متعین کرنے میں یہ بھی حکمت ہو سکتی ہے۔ یہ ہیں ان شعبوں کے سربراہ، انچارج، باقی! ان کے معاون، اُن کی تعداد کتنی ہے؟ وہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔

اُنیس کا عدد سُن کر مشرکینِ مکہ کا اِستہزا اور اہلِ ایمان کے ایمان میں اضافہ

لیکن جس وقت یہ قرآنِ کریم میں ذِکر آیا کہ اُنیس فرشتے ہیں تو کافروں نے اس کا مذاق اُڑایا، کوئی کہتا کہ اُنیس کا کیا ہے؟ ہم دس دس مل کے ایک ایک کو سنبھال لیں گے، کچھ نہیں ہوگا، کوئی کہتا کہ کوئی بات نہیں، سترہ کے لئے تو میں کافی ہوں، دو کا تم انتظام کر لو، جیسے لوگوں کی عادت مذاق اُڑاتے ہیں، تو آگے اللہ تعالیٰ یہی ذِکر کرتے ہیں کہ اس قسم کی چیزیں جو ذِکر کی جاتی ہیں یہ فتنہ بن جاتی ہیں، آزمائش بن جاتی ہیں، مؤمنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اہلِ کتاب بھی یقین لاتے ہیں، کیونکہ اہلِ کتاب کی کتابوں کے اندر بھی اس قسم کی باتیں مذکور ہیں، جب وہ قرآنِ کریم میں سنیں گے ان کو یقین آجائے گا کہ یہ بات صحیح ہے، مؤمنین کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے، اور باقی جو کافر ہیں وہ اس قسم کی چیزوں کا اِستہزا اُڑا کے زیادہ گمراہ ہو جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے

آزمائش کے طور پر اس قسم کی باتیں قرآنِ کریم میں ذکر کی ہیں، جیسے سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے آیا تھا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (سورۂ بقرہ:۲۶) وہاں بھی اسی قسم کی بات ذکر کی گئی ہے کہ مچھر، مکھی کا ذکر قرآنِ کریم میں کیوں آیا؟ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کا ذکر کیوں کرتا ہے؟ کافر اس چیز کا مذاق اُڑا کے زیادہ گمراہ ہوتے ہیں، اور مؤمنین کے لئے یہ باتیں ایمان کی ترقی کا باعث بنتی ہیں...... عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ: اُس جہنم کے اُوپر ۱۹ فرشتے متعین ہیں، وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً: نہیں بنایا ہم نے ناروالوں کو مگر فرشتے، اصحاب النار سے یہاں منتظم مراد ہیں، جہنم کا انتظام کرنے والے نہیں بنائے ہم نے مگر فرشتے، وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً: اور نہیں بنایا ہم نے ان کی تعداد کو مگر آزمائش کا ذریعہ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا، ''تاکہ یقین کرلیں وہ لوگ جو کتاب دیے گئے اور زیادہ ہوجائیں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ازروئے ایمان کے، اور نہ شک کریں وہ لوگ جو کتاب دیے گئے اور ایمان والے، اور تاکہ کہیں وہ لوگ جن کے دِلوں میں بیماری ہے اور کافر لوگ، کیا ارادہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ ایسے ہی گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، اور سیدھے راستے پہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، نہیں جانتا تیرے رَبّ کے لشکروں کو مگر وہی'' کہ لشکروں کی کیا تعداد ہے؟ کتنے لشکر ہیں؟ کتنی فوج ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، یہ نہیں کہ اُس کے ہاں صرف اُنیس فرشتے ہی ہیں، یہ تو کسی مصلحت کے طور پر اس عدد کو ذکر کیا ہے جو اہلِ کتاب کے لئے یقین کا باعث بن جائے گا، کیونکہ اہلِ کتاب بھی اپنے انبیاء علیہم السلام سے یہ باتیں سنتے تھے، آپ کو معلوم ہوگا کہ اہلِ کتاب جتنے بھی ہیں وہ سارے کے سارے وہی عقیدے رکھتے ہیں جو اِسلام نے تعلیم دیے ہیں، توراۃ وہی عقیدے بتاتی ہے، اِنجیل وہی عقیدے ذِکر کرتی ہے، انبیاء علیہم السلام سب ایک جیسی باتیں کرتے ہیں، اہلِ کتاب اگر کافر ہوئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت کا انکار کرکے، ورنہ وہ جنت کے قائل، دوزخ کے قائل، اللہ کے قائل، توحید کے مدّعی، یہ سب باتیں ان میں مشترکہ ہیں، تو جب یہ بات وہ سنیں گے تو چونکہ ان کی کتاب میں بھی ایسی باتوں کا ذکر آتا ہے تو ان کو یقین آجائے گا، کسی شک میں نہیں پڑیں گے، اور اسی طرح سے جن کو اللہ نے ایمانِ خالص دے دیا وہ بھی اللہ کی بات سُن کے یقین کرلیں گے اور کسی شک میں نہیں پڑیں گے۔ کافر لوگ یا جن کے دِل میں تردّد کی بیماری ہے، شک والی بیماری، یہ کہیں گے کہ ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ ایسی مثالیں اللہ تعالیٰ کیوں بیان کرتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی مثالیں اس لیے بیان کی جاتی ہیں کہ اللہ اپنی حکمت کے تحت جس کو چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے صحیح بات سمجھنے کی توفیق دے دیتا ہے، ''اور تیرے رَبّ کے لشکروں کو نہیں جانتا مگر وہی'' وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ: هِيَ کی ضمیر اِن آیات کی طرف لوٹ گئی جن آیات کے اندر جہنم کا ذکر آیا ہے، ''نہیں ہیں یہ آیات مگر نصیحت انسانوں کے لئے۔''

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى
بالتحقیق قسم ہے چاند کی! ﴿﴾ اور قسم ہے رات کی جب وہ پیٹھ پھیرتی ہے! ﴿﴾ اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے! ﴿﴾ بے شک وہ جہنم بہت بڑی

الْكُبَرِ ۝٣٥ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ۝٣٦ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۝٣٧ كُلُّ نَفْسٍ

چیزوں میں سے ایک ہے ۝ انسان کے لئے ڈرانے والی چیز ہے ۝ اس شخص کے لئے جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہنا چاہے ۝ ہر نفس

بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝٣٨ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝٣٩ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝٤٠

اپنے کئے کے بدلے محبوس ہوگا ۝ سوائے اَصحابِ یمین کے ۝ یہ (اَصحابِ یمین) باغات میں ہوں گے، سوال کریں گے آپس میں ۝

عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۝٤١ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝٤٢ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝٤٣ وَ

مجرموں کے متعلق ۝ کس چیز نے داخل کیا تمہیں جہنم میں؟ ۝ وہ مجرم جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے ۝ اور

لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝٤٤ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝٤٥ وَكُنَّا نُكَذِّبُ

ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلایا کرتے تھے ۝ اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر باتیں بنایا کرتے تھے ۝ اور ہم بدلے کے دن کی

بِيَوْمِ الدِّينِ ۝٤٦ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝٤٧ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۝٤٨

تکذیب کیا کرتے تھے ۝ یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی ۝ نہیں نفع دے گی ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش ۝

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝٤٩ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ۝٥٠ فَرَّتْ مِن

ان کو کیا ہوگیا کہ یہ نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں ۝ گویا کہ یہ گدھے ہیں بدکنے والے ۝ جو بھاگے ہوں

قَسْوَرَةٍ ۝٥١ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝٥٢ كَلَّا بَل لَّا

شیر سے ۝ بلکہ ارادہ کرتا ہے ان میں سے ہر انسان کہ دیا جائے وہ کھلے کھلے صحیفے ۝ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، بلکہ

يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝٥٣ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝٥٤ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝٥٥ وَمَا يَذْكُرُونَ

یہ نہیں خوف رکھتے آخرت کا ۝ یہ پکی بات ہے کہ یہ قرآنِ کریم یاددہانی ہے ۝ پس جو کوئی چاہے اس کو یاد رکھے ۝ اور نہیں یاد رکھیں گے یہ

إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝٥٦

مگر اللہ کے چاہنے کے وقت، اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے، اور اللہ ہی بخشنے کے لائق ہے ۝

تفسیر

كَلَّا وَالْقَمَرِ: یہ کلا حقًا کے معنی میں ہے "بیان القرآن" کے بیان کے مطابق، یہ بات تحقیقی ہے، اور اگر "کلا" ردع

کے لئے ہوتو پھر معنی یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو ہرگز جہنم کا اور جہنم کی چیزوں کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے، انکار نہیں کرنا چاہیے، جس طرح سے یہ کہتے ہیں کہ آخرت نہیں آئے گی، جہنم نہیں ہوگی، ہرگز ایسی باتیں نہیں ہیں، تو کلّا ردع کے طور پر بھی ہوسکتا ہے، ان لوگوں کو ہرگز ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، رُک جانا چاہیے ان باتوں سے، ردع کا مفہوم اس طرح سے ادا کردیا جائے گا، ورنہ یہ بالتحقیق کے معنی میں ہے۔ وَالْقَمَرِ: قسم ہے چاند کی، وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ: اور قسم ہے رات کی جب وہ پیٹھ پھیرتی ہے، وَالصُّبْحِ إِذَآ أَسْفَرَ: اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے، إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ: بے شک وہ جہنم بہت بڑی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے، کُبَر یہ کبریٰ کی جمع ہے، کبریٰ بڑی چیز کو کہتے ہیں، بڑے بڑے حادثات میں سے ایک حادثہ ہے، بڑی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت ہے، ''بہت بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔'' چاند کی قسم کھائی، رات اور صبح کی قسم کھائی۔

قسم کی جوابِ قسم کے ساتھ مناسبت

قرآنِ کریم میں قسمیں جو آیا کرتی ہیں یہ بعد والے مضمون کے لئے ایک قسم کی شاہد اور دلیل بنتی ہیں، چاند ہے گھٹتا ہے بڑھتا ہے، اس کے مختلف طبقات ہیں جن کے اُوپر یہ چلتا جاتا ہے، اسی طرح سے دُنیا بھی مختلف درجات کے تحت بڑھتی جاتی ہے، ایک وقت آئے گا کہ جس وقت اپنے کمال کو پہنچنے کے بعد پھر یہ ختم ہوجائے گی۔ اور اسی طرح سے رات کی تاریکی بہت سارے حقائق کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے، صبح آتی ہے تو بہت سارے حقائق روشن ہوجاتے ہیں، اسی طرح سے یہ دُنیا کی زندگی رات کی طرح ہے جس میں آخرت کے حقائق چھپے ہوئے ہیں، جب قیامت آئے گی تو ایسے ہوگا جس طرح سے فجر طلوع کرآئی اور ساری چیزیں روشن ہوکر سامنے آجائیں گی، تو یہ کائنات کے اندر جس قسم کے تصرف اللہ تعالیٰ کے چلتے ہیں ان تصرفات کی طرف دیکھتے ہوئے دُنیا کے بعد آخرت کا عقیدہ کوئی مشکل نہیں ہے...... ''بے شک یہ جہنم'' لَإِحْدَى الْكُبَرِ: بڑی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے، نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ: انسان کے لئے ڈرانے والی چیز ہے، نذیر ہے، لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ أَنْ يَّتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ: اس شخص کے لئے جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہنا چاہے، ہر قسم کے لوگوں کے لئے، جو نیکی کی طرف آگے بڑھنا چاہتے ہیں، پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں، سب کے لئے یہ نصیحت ہے، ڈرانے والی چیز ہے۔

کافر محبوس، اور اہلِ ایمان آزاد ہوں گے

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔ رَهْن: رہن رکھنا، محبوس کرنا، ''ہر نفس اپنے کیے کے بدلے محبوس ہوگا سوائے اصحابِ یمین کے'' اَصحابِ یمین: جن کو دائیں ہاتھ میں نامۂ اَعمال ملے گا، اس میں سابقون الاوّلون بھی آجائیں گے، یہ جو پیچھے آیا تھا وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (سورۂ واقعہ)، تو مقربون بھی اِس میں آجائیں گے اور جن کو آگے اَصحابِ یمین کے ساتھ ذِکر کیا تھا وہ بھی آجائیں گے، چونکہ یہاں کافروں کے ساتھ مقابلہ ہے، وہاں تو تین درجے بنائے گئے تھے، سابقون کا ایک درجہ تھا، اَصحابِ یمین کا دُوسرا تھا، اَصحابِ شمال کا تیسرا تھا، لیکن یہاں چونکہ کافروں کے مقابلے میں اِس کو ذِکر کیا جارہا ہے تو یہاں سے مطلقاً ایمان والے مراد ہیں، ایمان والے تو چھوٹے ہوئے ہوں گے، باقی تمام لوگ (جس سے معلوم ہوگیا کہ اس سے کافر مراد

ہیں) وہ اپنے کیے کے بدلے میں محبوس ہوں گے، جیل میں ڈالے ہوئے ہوں گے،'' ہر نفس اپنے کیے کے بدلے پھنسا ہوا ہوگا، رہن رکھا ہوا ہوگا، محبوس ہوگا سوائے اصحابِ یمین کے، یہ اصحابِ یمین باغات میں ہوں گے۔''

جہنم میں جانے کی وجوہات خود جہنمیوں کی زبانی

يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِينَ: مجرموں کے متعلق آپس میں پوچھ گچھ کرتے ہوں گے، آپس میں تذکرہ کریں گے جس طرح سے سورۂ صافات کے اندر یہ تفصیل آئی تھی، آپس میں تذکرہ کریں گے، بعد میں جہنم والوں کو خطاب کر کے ان سے کچھ باتیں کریں گے، سورۂ صافات میں اس کی تفصیل گزری ہے اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ (آیت:۵۱) جہاں سے یہ تذکرہ ہوا ہے، یہ آپس میں تذکرہ ہے، اور پھر وہ جہنم کی طرف جھانکیں گے اور اپنے دوستوں کو پہچان کر جہنمیوں کے ساتھ پھر وہ باتیں کریں گے۔ سورۂ اعراف میں بھی اس کا ذکر آیا تھا اور سورۂ صافات میں بھی۔ ''سوال کریں گے آپس میں مجرموں کے متعلق'' مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ: پہلے آپس میں بھی تذکرہ کریں گے، پھر مجرموں کو خطاب کر کے پوچھیں گے، کس چیز نے داخل کیا تمہیں جہنم میں؟ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ: وہ مجرم جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، ہمارے جہنم میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، لَمْ نَكُ اصل میں لَمْ نَكُنْ تھا، آخر سے نون گرا ہوا ہے، ''نہیں تھے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے'' وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ: اور ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلایا کرتے تھے، کوئی مسکین محتاج ہمارے سامنے آجاتا تو ہم اس کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا بھی حق ادا نہیں کرتے تھے، بندوں کا حق بھی ادا نہیں کرتے تھے، وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ: خوض: باتوں میں لگنا، باتیں بنانا، ''اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر باتیں بنایا کرتے تھے'' جس طرح سے یہ بے عمل لوگوں کی عادت ہوا کرتی ہے، مجلسوں میں بیٹھ جاتے ہیں، ہنسی مذاق میں لگے رہتے ہیں، نہ نماز کی خبر، نہ کسی مسکین کی خدمت، کچھ بھی نہیں، مجلسیں جب ان کی لگتی ہیں، ہنسی، مذاق، ٹھٹھا، مخول آپس میں کرتے رہتے ہیں، وقت یوں ہی گزرتا ہے، تو اس قسم کے وقت گزارنے والے یہ ہوئے كُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ، ہم باتیں کرنے والوں کے ساتھ مل کر باتیں بنایا کرتے تھے، مشغلہ کرنے والوں کے ساتھ مشغلہ کیا کرتے تھے، وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ: اور ہم بدلے کے دن کی تکذیب کیا کرتے تھے، ہم کہتے تھے قیامت کا دن آئے گا ہی نہیں، اعمال کا بدلہ نہیں ملے گا، حَتّٰى أَتَانَا الْيَقِينُ: یہاں یقین سے موت مراد ہے یعنی ہم انہی حالات میں لگے رہے کہ ہمیں موت آگئی، اس لیے آج ہم جہنم کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔ نماز نہیں پڑھتے تھے، مسکینوں کی خدمت نہیں کرتے تھے، سارا دن مشغلوں میں گزر جاتا تھا، اور قیامت کے دن کی ہم تکذیب کرتے تھے، موت تک ہمارا یہی حال رہا، جس کے نتیجے میں آج ہم جہنم کے اندر جل رہے ہیں۔

کافروں کو شفاعت کام نہیں دے گی

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ: نہیں نفع دے گی کوئی ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش، اول تو ان کی سفارش کرے گا ہی کوئی نہیں، اور بالفرض اگر کرے بھی تو فائدہ کوئی نہیں، اللہ تعالیٰ کافروں کے متعلق کسی کی سفارش قبول نہیں کرے گا، تو جو ان لوگوں

نے شافعین کے اُوپر اعتماد کیا ہوا ہے کہ یہ سفارش کریں گے، شفاعت کریں گے، تو اس کی گویا کہ نفی کر دی کہ اوّل کوئی کرے گا ہی نہیں، کرے گا تو اس کی شفاعت قبول نہیں ہوگی۔ مؤمنوں کی شفاعت ہوگی، اور مؤمنوں کو شفاعت کے ساتھ نفع بھی پہنچے گا، اس کی تفصیل مختلف آیات میں گزر چکی۔ ''نہیں نفع دے گی اُن کو سفارش کرنے والوں کی سفارش۔''

کافر بدکنے والے گدھوں کی طرح ہیں

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ: اب ان کے موجودہ حال کے اُوپر انکار کیا جارہا ہے کہ ان کو کیا ہو گیا کہ وہ نصیحت سے اِعراض کرنے والے ہیں، اتنا خطرناک انجام سامنے آنے والا ہے، اور آج ان کو تذکرہ کیا جاتا ہے یاددہانی کی جاتی ہے تو یہ منہ موڑ جاتے ہیں، كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ: حُمُرٌ یہ حمار کی جمع ہے، گویا کہ یہ گدھے ہیں مُّسْتَنْفِرَةٌ: بدکنے والے، فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ: جو بھاگے ہوں شیر سے، حمر مستنفرہ بول کر جنگلی گدھے مراد ہیں، یہ جو گدھے آپ نے گھروں میں رکھے ہوئے ہیں، مانوس گدھے، یہ انسان کو دیکھ کے یا کسی دوسری چیز کو دیکھ کے جلدی بدکتے نہیں ہیں، اور جنگلی گدھے جن کو حمارِ وحشی کہا جاتا ہے، گورخر، تو جنگلی جانوروں کی طرح یہ بہت بدکنے والے ہیں، پھر اگر ان کے سامنے شیر آجائے پھر تو بے تحاشا بھاگتے ہیں، تو ان کافروں کا حال بھی ایسے ہے، گدھوں کی طرح کندذہن، بلید، اور جب نصیحت کی بات کی جاتی ہے تو یوں دولتیاں مارتے ہوئے بھاگتے ہیں جس طرح سے کوئی گدھا شیر کو دیکھ کر بھاگے۔ یہ ان کی نفرت کی ایک تصویر ہے کہ جب نصیحت کی بات کی جاتی ہے تو کیسے وہ بدکتے ہیں، اور کس طرح سے دُور کو ہٹتے ہیں، جس طرح سے جنگلی گدھے شیر کو دیکھ کے بھاگتے ہیں۔ ''گویا کہ یہ گدھے ہیں بدکنے والے ہیں جو بھاگے ہیں شیر سے'' قسورة: شیر کو کہتے ہیں۔

کافروں کی ہٹ دھرمی اور اس کی وجہ

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً: بلکہ ارادہ کرتا ہے ان میں سے ہر انسان کہ دیا جائے وہ صحیفے کھلے کھلے، یعنی رسول اللہ ﷺ پر جو کتاب اُتری اُس سے یہ متاثر نہیں ہوتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی ایسے خط دیے جائیں جن کو ہم کھول کھول کے پڑھیں، تب ہم جا کے ایمان لائیں گے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر بھی ایک تحریر اُتر آئی جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ آخرت ہوگی یا یہ ہمارے رسول ہیں، اس کی بات مان لو، ہمارے نام یہ صحیفے آئیں تب ہم اس کو مانیں گے، اور آیات کے اندر بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے، ''بلکہ ارادہ کرتا ہے ان میں سے ہر ایک کہ دے دیا جائے وہ کھلے کھلے صحیفے'' كَلَّا: ہرگز ایسا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ ہر کسی کے اُوپر صحیفے نہیں اُتارتا، نہ ہی ہر ایک میں صلاحیت ہے، نہ یہ اللہ کی حکمت کے مطابق ہے...... بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ: بلکہ اصل وجہ یہ ہے ان کے اس قسم کے انکار کرنے کی کہ ان کے دِل میں آخرت کا اندیشہ نہیں ہے، یہ آخرت سے خوف نہیں کھاتے، جس سے معلوم ہو گیا کہ آخرت کا خوف ہر قسم کی سعادت کی کنجی ہے، اگر کوئی شخص یہ عقیدہ بنالے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے، اور اس دُنیا کے اعمال کی جزا وسزا سامنے آئے گی، تو پھر انسان لاپروائی کے ساتھ باتیں نہیں کیا کرتا، مشغلے وشغلے سب چھوٹ جاتے ہیں۔ ''بلکہ یہ نہیں خوف رکھتے آخرت کا۔''

حق قبول کرنے کی ترغیب

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ: یہ كَلَّا بھی حقًا کے معنی میں ہے،''یہ پکی بات ہے کہ یہ قرآنِ کریم تذکرہ ہے، یاددہانی ہے'' فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ: پس جو کوئی چاہے اس کو یادر کھے، وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: اور نہیں یادرکھیں گے یہ مگر اللہ کے چاہنے کے ساتھ، اللہ کی مشیت متعلق ہو جائے، اور اللہ کی مشیت تب متعلق ہوتی ہے جب کوئی انسان نیک نیتی کے ساتھ یاد بھی کرنا چاہے، ''مگر وقت چاہنے اللہ کے'' یہ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ میں ''اَن'' مصدر یہ ہے، ''نہیں یادکریں گے یہ، نہیں نصیحت حاصل کریں گے یہ مگر اللہ کے چاہنے کے وقت۔'' هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى: اللہ ہی اِس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے، وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ: اور اللہ ہی بخشنے کے لائق ہے، یعنی جس وقت بھی کوئی شخص اس سے ڈرے گا، تقویٰ اختیار کرے گا، تو اللہ اس لائق ہے کہ پھر اس کو بخش دے گا، هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ کی یہ توجیہ جو آپ کے سامنے کر رہا ہوں روایت کے اندر صراحتًا آئی ہوئی ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَنَا اَهْلُ اَنْ اُتَّقٰى کہ میں اس لائق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے، اور جس وقت کوئی شخص مجھ سے ڈرے گا اور میرے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں بنائے گا تو میں اس لائق ہوں کہ میں اس کو بخش دوں،[1] تو ڈرنے والوں کو اللہ بخشے گا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

آیاتها ۴۰ ۷۵ سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ مَكِّیَّةٌ ۳۱ رکوعاتها ۲

سورۂ قیامہ مکہ میں نازل ہوئی اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ① وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ② اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ

نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی! ○ اور قسم کھاتا ہوں بہت ملامت کرنے والے نفس کی! ○ کیا انسان سمجھتا ہے کہ

اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ③ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ

ہم ہرگز اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے ○ کیوں نہیں! (ہم جمع کریں گے) اس حال میں کہ قدرت رکھنے والے ہیں اس بات پر کہ برابر کردیں

(۱) ترمذی ۱۷۲/۲، تفسیر سورۂ مدثر۔ ولفظ الحدیث: قال اللہ عزوجل: انا اھل ان اتقی فمن اتقانی فلم یجعل معی الھا فانا اھل ان اغفر لہ۔

بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ

انسان کے پوروں کو ○ بلکہ ارادہ کرتا ہے انسان کہ وہ فسق وفجور کرتا رہے اپنے آگے ○ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دِن کب ہوگا؟ ○ پس جب نظر چندھیا

الْبَصَرُ ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ

جائے گی ○ اور چاند بے نور ہوجائے گا ○ اور چاند اور سورج کو اکٹھا کر دیا جائے گا ○ اس دِن انسان کہے گا

اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ

کہ کہاں ہے بھاگنے کی جگہ؟ ○ (کہا جائے گا:) ہرگز نہیں! کوئی پناہ گاہ نہیں! ○ تیرے رَبّ کی طرف ہی اس دِن ٹھکانا ہے ○ بتلا دیا جائے گا انسان

يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى

کو اس دِن جو کچھ اس نے آگے بھیجا اور جو کچھ اس نے پیچھے چھوڑا ○ بلکہ انسان خود ہی اپنے نفس پر دلیل ہوگا ○ اگرچہ وہ ڈالے گا

مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا

اپنے عذر ○ آپ حرکت نہ دیا کریں اِس قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو تاکہ آپ اس کے ساتھ جلدی کرلیں ○ بے شک ہمارے ذِمّے ہی ہے

جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾

اس کا اکٹھا کرنا اور اس کا پڑھوانا ○ پس جس وقت ہم اس کو پڑھیں تو آپ اس کے پڑھنے کا اِتباع کیا کیجئے ○ پھر اس کا بیان بھی ہمارے ذِمّے ہے ○

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ

ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم محبت کرتے ہو جلدی حاصل ہونے والی چیز کے ساتھ ○ اور چھوڑتے ہو تم پیچھے آنے والی چیز کو ○ کچھ چہرے اس دِن

نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ

تر وتازہ ہوں گے ○ اپنے رَبّ کی طرف دیکھنے والے ہوں گے ○ اور بعض چہرے اس دِن بگڑے ہوئے ہوں گے ○ وہ سمجھتے ہوں گے

يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾

کہ ان کے ساتھ کمر توڑ معاملہ کیا جائے گا ○ ہرگز نہیں! جس وقت جان ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی ○ اور کہا جائے گا کہ کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا ○

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾

اور سمجھ جائے گا انسان کہ یہ مصیبت فراق کا سبب ہے ○ اور لپٹ جائے گی پنڈلی پنڈلی کے ساتھ ○ تیرے رَبّ کی طرف ہی اس دِن چلنا ہے ○

ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ قیامہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۴۰ آیتیں ہیں اور ۲ رُکوع ہیں۔ یہ سورت قیامت کے حالات پر ہی مشتمل ہے، پچھلی سورت کے آخر میں بھی اسی کا تذکرہ آیا تھا بَلْ لَا یَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ، کہ یہ لوگ آخرت کا خوف نہیں کرتے، تو یہ آخرت سے ڈرانے کے لئے، یاد دلانے کے لئے اگلی سورت بیان ہو رہی ہے۔ نام اس سورت کا پہلی آیت سے ہی ماخوذ ہے۔

تفسیر

''لَآ اُقْسِمُ'' میں لفظِ ''لا'' میں دو اِحتمال

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ: قسم کے شروع میں لفظ لَا عام طور پر آیا کرتا ہے، اور اس کا تعلق مابعد والے فعل کے ساتھ نہیں ہوتا، اس لیے اس کا ترجمہ یوں نہیں کریں گے لَآ اُقْسِمُ میں قسم نہیں کھاتا، اس کا ترجمہ یہ نہیں ہے۔ یا تو اِس کو زائدہ قرار دیا جاتا ہے، یا ''لَا'' اصل کے اعتبار سے کسی بات پر نفی اور انکار ہوتا ہے، اور آگے قسم کھا کر کسی دوسری بات کا اِثبات ہوتا ہے، چونکہ یہاں ذکر ہی آخرت کا کیا جا رہا ہے، اور وہ مشرک کافر جو قرآنِ کریم کے مخاطب تھے وہ آخرت کا انکار کرنے والے تھے، قیامت کا انکار کرنے والے تھے، تو یوں سمجھئے کہ گفتگو ہو رہی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ آخرت نہیں ہے، مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر لَا کے ساتھ انکار کیا گیا کہ نہیں! میں قیامت کے دِن کی قسم کھاتا ہوں آخرت ضرور آئے گی، یہ ''نہیں'' کے ساتھ اس بات کی تردید ہوگئی، اور ہم بھی جس وقت آپس میں کوئی گفتگو کیا کرتے ہیں، تو کوئی شخص ایک بات کہے جو ہماری منشا کے خلاف ہے یا ہم اُس کو ثابت نہیں مانتے، تو اکثر وبیشتر ہم بھی اپنی کلام کی اِبتدا یونہی کیا کرتے ہیں ''نہیں! بات اس طرح سے ہے''، تو یہ ''لا'' اسی نفی کے قائم مقام ہے۔ زائدہ کہہ لیں تو ٹھیک ہے پھر اس کا ترجمہ نہیں ہوگا، ترجمہ شروع ہوگا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ سے، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دِن کی۔ اور اگر ''لَا'' سے کسی دُوسری بات پہ انکار کرنا ہو تو پھر ترجمہ یونہی کریں گے ''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دِن کی اور نفسِ لوامہ کی، تم مرنے کے بعد دوبارہ ضرور اُٹھائے جاؤ گے''، تو ''مرنے کے بعد دوبارہ ضرور اُٹھائے جاؤ گے'' یہی ہے اصل بات جو کہنی ہے، قسم کے ساتھ اسی بات کی تاکید کرنی مقصود ہے، اور اس کے خلاف جو شخص بات کرتا ہے تو ''لَا'' کے ساتھ اس کی تردید ہوگئی، اس لیے ہم ترجمہ یوں کر سکتے ہیں ''نہیں!''، یہ ''نہیں'' کے ساتھ پچھلی بات کی تردید ہوگئی، اور آگے بات کہہ دی گئی ''میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دِن کی اور میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی''، جوابِ قسم محذوف ہے جو یہی ہے کہ تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، مرنے کے بعد اُٹھنا ضروری ہے، یہ واقعہ ضرور پیش آئے گا، اور اس کے خلاف جو کوئی بات کہتا ہے تو اس کو ''لَا'' کے ساتھ نفی کر دیا گیا۔ ورنہ عام طور پر اِس ''لَا'' کو زائدہ قرار دیا جاتا ہے اور ترجمہ اُقْسِمُ سے شروع کر دیا جاتا ہے، یہ میں جو سامنے لیے بیٹھا ہوں حضرت شیخ (الہندؒ) کا ترجمہ، اس میں بھی ہے ''میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے

دن کی'' "لا" '' کا کوئی ترجمہ نہیں کیا۔ اور اسی طرح سے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ، جتنی جگہ بھی یہ لفظ آئے گا تو وہاں ترجمہ اُقْسِمُ کا کریں گے، "لا" کا نہیں کریں گے، اور اگر "لا" کا ترجمہ کرنا ہو تو پھر اس طرح سے ہے جیسے میں نے عرض کیا، کہ نہیں، نہیں کا مطلب یہ ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ آخرت نہیں آئے گی، یا مر کے اُٹھنا نہیں ہے، تو یہ بات غلط ہے، نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نفسِ لوامہ کی، قیامت ضرور آئے گی، اور مرنے کے بعد ضرور اُٹھنا ہے، پھر گفتگو کا انداز یہ ہو جائے گا اگر "لا" کا ترجمہ بظاہر کرنا چاہیں۔ بہرحال یہ بات متیقن ہے کہ "لا" کا تعلق اُقْسِمُ کے ساتھ نہیں ہے، اس لیے لَآ اُقْسِمُ کا ترجمہ یوں نہیں کریں گے کہ میں نہیں قسم کھاتا، یہ ترجمہ غلط ہے، تو یہ قسم کھانے کی نفی نہیں، بلکہ قسم تو کھائی جارہی ہے، ''میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔''

نفس کے تین درجات

''اور میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی'' یہاں بھی لَآ ہے، اس کا بھی وہی مفہوم ہے جس طرح سے آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا۔ نفسِ لوامہ، لوامۃ یہ لفظ لوم سے لیا گیا ہے، لَامَ يَلُوْمُ: ملامت کرنا، لَوَّامَة: بہت ملامت کرنے والا، ''ملامت کرنے والا نفس''، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ یہ جو نفس لگایا ہے اس کی مختلف حالتیں ہیں، اگر تو یہ نفس بالکل ہی بُرائی کی طرف مائل ہو، کھیل کود کی طرف، بے کار چیزوں کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہو، جس طرح سے کہ بچپن میں ہوتا ہے یا جو لوگ بُرائی کے عادی ہوتے ہیں جس طرح سے اُن کا نفس ہو جاتا ہے کہ ہر وقت ان کو بُرائی کا ہی مشورہ دیتا ہے، بُرائی کی طرف لے جاتا ہے، بُرائی کی طرف اس کی رغبت ہوتی ہے، تو یہ درجہ جو نفس کا ہے یہ نفسِ امارہ کہلاتا ہے، تیرہویں پارے کی پہلی آیت کے اندر اسی کا ذکر ہے وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ، نفسِ اَمّارہ سے مراد ہے امّارۃ بالسوء، بُرائی کے ساتھ بہت حکم دینے والا نفس، جو ہر وقت بُرائی کا حکم دیتا ہے...... اور ایک دُوسرا درجہ ہوا کرتا ہے کہ نفس کی یہ کیفیت ہے کہ اس کے اندر شعور ہے بُرائی کا اور اچھائی کا، وہ بُری چیز کو بُرا سمجھتا ہے، اچھی چیز کو اچھا سمجھتا ہے، اور اگر کبھی بھول چوک کے ساتھ بُرائی کے اندر مبتلا ہو جائے تو پھر وہ اپنے آپ کو خود ملامت کرتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، کوئی نیکی کا کام چھوٹ گیا تو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ یہ نیکی کرنی چاہیے تھی، اس کو ترک نہیں کرنا چاہیے تھا، اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، دل میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اکثر و بیشتر لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ اچھائی اور بُرائی کا احساس قلب میں پڑا ہوا ہے، بُرا کام کر کے کسی نہ کسی درجے میں انسان پچھتاتا ضرور ہے کہ میں نے یہ کیوں کرلیا، اور اگر کوئی نیکی کا کام کرنے کا موقع تھا نہیں کیا، تو بھی کچھ نہ کچھ پچھتاوا انسان کو ہوتا ہے، یہ نفس جو ہے ''نفسِ لوامۃ'' کہلاتا ہے، ملامت کرنے والا، جو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے بُرائی کے کرنے پر، یا اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے نیکی کے چھوڑنے پر...... اور تیسرا درجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ نفس میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ اس کی رغبت نیکی کی طرف ہی ہے، وہ اللہ سے غافل نہیں ہوتا، اللہ کو یاد کرتا ہے، جس طرح سے اعلیٰ درجے کا معیار ہے انبیاء ﷺ کا، اور اسی طرح سے درجہ بدرجہ اولیاء عظام کا، کہ ان کے نفس میں نیکی کی رغبت ہوتی ہے، بُرائی کی نفرت ہوتی ہے، غفلت طاری نہیں ہوتی، ہمیشہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اس درجے کے

اعتبار سے اس نفس کو کہا جاتا ہے ''نفسِ مطمئنہ''، یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (سورۂ فجر) جس کو وفات کے وقت رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً کی بشارت ملتی ہے وہ نفسِ مطمئنہ ہے۔

دونوں قسموں کی جوابِ قسم سے مناسبت

تو یہاں اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں کھائیں، ایک یومِ قیامہ کی اور ایک نفسِ لوامہ کی، اور جوابِ قسم یہاں محذوف ہے لَتُبْعَثُنَّ تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، قیامت ضرور آئے گی، یہ مضمون ہے جس کی تاکید کرنی مقصود ہے قسم کے ذریعے سے، اور یومِ قیامہ کو تو اس مضمون کے ساتھ مناسبت ہے ہی، کہ جزا جو واقع ہوگی تو قیامت کے دِن ہی واقع ہوگی، اور نفسِ لوامہ کا ذِکر جو آ رہا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ اگر اِنسان اپنے اندر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس نفس میں اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کی تمیز رکھی ہے، جس کی بنا پر خود اس کا نفس بُرائی کے ارتکاب پر شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، اور اچھائی کی طرف اس کی رغبت ہے، اچھائی نہ کرنے پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ انسان کو مہمل نہیں پیدا کیا گیا، یہ شترِ بے مہار نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا رہے، بلکہ جس طرح سے اس کے ضمیر کے اندر خیر و شر کا امتیاز ہے قیامت اسی لیے تو لائی جائے گی تاکہ خیر و شر کا امتیاز ہو جائے، تو گویا کہ انسان کا نفس یہ ایک مختصر سی عدالت ہے جو اِنسان کو بتاتا ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے یہ کرنے کا نہیں، یہ بُرا ہے یہ اچھا ہے، اور قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کی ایک عمومی عدالت ہو جائے گی جس میں ہر اچھے بُرے کام کا فیصلہ ہو جائے گا، تو اس طرح سے نفسِ لوامہ کا جو یہ احساس ہے خیر اور شر کا، بُرائی پر اُس کا ملامت کرنا، اچھائی چھوڑنے پر ملامت کرنا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ انسان اچھائی اور بُرائی کا مکلف ہے، کہ یہ ان دونوں کے درمیان میں امتیاز کرے، اچھائی کو اختیار کرے، بُرائی کو چھوڑے، اور اسی کا محاسبہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن کریں گے، تو نفسِ لوامہ خود دلیل ہے اس بات کی انسان مکلف ہے، اس کو اچھائی کرنی چاہیے، بُرائی سے بچنا چاہیے اور اسی کا حساب کتاب اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن لیں گے، گویا کہ اب یہ نفسانی دلیل ہے قیامت کے وقوع پر، یوں ان دونوں قسموں کی مناسبت ہو جائے گی اُس مضمون کے ساتھ جس مضمون کو قسم کے ذریعے سے پکا کیا جا رہا ہے۔

اِثباتِ معاد کے لئے اُنگلیوں کے پوروں کا ذِکر اور اس کی وجوہات

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ: کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم ہرگز اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ جیسے وہ کہتے تھے مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ (سورۂ یٰس: ۷۸) ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہوگئیں؟ عام طور پر یہ کہتے تھے، تو یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم ہرگز اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ اس لیے وہ قیامت کا انکار کرتا ہے؟ بعث بعد الموت کا انکار کرتا ہے؟ بَلٰی: کیوں نہیں، قٰدِرِیْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ: قٰدِرِیْنَ یہ حال ہے بَلٰی نَجْمَعُ قٰدِرِیْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ کیوں نہیں، ہم جمع کریں گے اس حال میں کہ ہم قدرت رکھنے والے ہیں اس بات پر کہ انسان کے پوروں کو برابر کردیں، نُسَوِّیَ یہ تسویہ سے لیا گیا ہے، سَوّٰى تَسْوِیَةً: برابر کرنا، اور بنان: پورے، اُنگلیوں کے آخری کنارے، ہم تو ان کو بھی ٹھیک کرنے پر قادر ہیں، ''کیوں نہیں جمع کریں گے ہم ہڈیوں کو، جمع کریں گے ہم اس حال میں کہ ہم قدرت رکھنے والے ہیں کہ برابر کردیں انسان کے پوروں کو''

پوروں کے تسویہ پراور پوروں کے برابر کرنے پر بھی ہم قدرت رکھنے والے ہیں، پوروں کا ذکر کس لیے کیا؟ اس کی دو وجہیں ہیں، یا تو پوروں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ اطراف بدن ہیں، نیچے کی طرف پاؤں کی اُنگلیوں کے پورے یہ آخری حصہ آگیا، اور اِدھر یہ ہاتھوں کی اُنگلیوں کے پورے یہ بدن کا آخری حصہ آگیا، تو جس وقت اللہ تعالیٰ پوروں کو بھی برابر کرنے پہ قادر ہے تو اس کا مطلب ہے کہ سارے بدن کے ٹھیک کرنے پر قادر ہے (آلوسی)۔ اطراف بدن ذکر کر کے مراد سارا بدن ہوگیا، جیسے کہا کرتے ہیں میرے پور پور میں درد ہے، تو اس کا مطلب ہوتا ہے سارے بدن میں، تو یہ اطراف بدن ذکر کر کے سارا بدن مراد لے لیا گیا...... اور یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہڈیاں تو ایک موٹی سی چیز ہے، اور پورے بہت باریک چیز ہیں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی چہرے کے اندر اپنی قدرت نمایاں کی ہے اسی طرح سے انسان کے پوروں میں بھی قدرت نمایاں ہے، چہرے تو آپ دیکھتے ہی ہیں، یہ تو ایک نمایاں بات ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر اِس وقت تک معلوم نہیں کتنے کروڑوں اربوں انسان پیدا ہوئے، اور چہرے کے اندر یہ پیشانی ہے، یہ دو رخسارے ہیں، یہ دو آنکھیں ہیں، یہ ناک ہے، یہ منہ ہے، یہ ٹھوڑی ہے، اور یہ چند اِنچ کا مجموعہ ہے، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے اندر اتنی نمایاں ہے کہ ایک کا چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا، اب اگر کوئی شخص اپنی قلم کے ساتھ خاکے بنانا چاہے تو کتنے سے بنالے گا؟ تو چہروں کے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت نمایاں ہے، آپ دیکھتے ہی رہتے ہیں، ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے شکل کے اعتبار سے، تو جیسے یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت نمایاں ہے اسی طرح سے یہ جو اُنگلیوں کے پورے ہیں ان میں بھی قدرت نمایاں ہے، یہ انگوٹھا لگانے کا رواج تو آپ نے سُنا ہی ہوگا، یہ پہچان کے لئے جو انگوٹھا لگایا کرتے ہیں، دستخط کرتے ہیں یا انگوٹھا لگاتے ہیں، تو انگوٹھا لگانا اسی لیے ہے کہ ایک شخص کا انگوٹھا دوسرے سے ملتا نہیں ہے، کروڑ ہا انسانوں کو اکٹھا کرلو، اور ان کے انگوٹھوں کے نشان لے لو، ان کے اندر یہ جو خطوط ہیں ان کو آپ دیکھیں گے کہ یہ بالکل ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اسی لئے انگوٹھا پہچان لیا جاتا ہے کہ کس شخص کا ہے کس شخص کا نہیں، ہر پورے کی صنعت میں یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خطوط اور نمبر اِس میں اس طرح سے لگائے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملتے نہیں، اب یہ اتنی چھوٹی سی چیز ہو اور اس میں اس قسم کی صنعت کی رعایت رکھی ہو تو اللہ تعالیٰ ایک دفعہ اِن کو بناتا ہے، بنانے کے بعد دوبارہ ان کو پھر برابر کرنے پہ قادر ہے، تو یہ موٹی موٹی ہڈیاں اور یہ موٹا موٹا گوشت چڑھانا کیا مشکل ہے؟ تو اس باریک صنعت والی چیز کو ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو نمایاں کیا ہے (عام تفاسیر) ''کیوں نہیں اُٹھائیں گے ہم، کیوں نہیں جمع کریں گے ہم ہڈیوں کو، ہم تو پوروں کو برابر کرنے پر بھی قادر ہیں''، اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ذکر کیا ہے، کہ جب پورے برابر کیے جاسکتے ہیں، میرے لیے یہ بھی کوئی مشکل نہیں، تو باقی ہڈیوں کو اور باقی گوشت کو اکٹھا کرنا کیا مشکل ہے۔ تو قٰدِرِیْنَ حال واقع ہوگیا، نَجْمَعُ فعل یہاں محذوف ہوگا، اس کی ضمیر سے یہ حال ہے، ''کیوں نہیں جمع کریں گے ہم ہڈیوں کو، ہم جمع کریں گے اس حال میں کہ ہم قدرت رکھنے والے ہیں اس بات پر کہ برابر کردیں انسان کے پورے۔''

کافر قیامت کے منکر کیوں ہیں؟

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ: بلکہ ارادہ کرتا ہے انسان کہ وہ فسق و فجور کرے اپنے آگے، اَمَام: آنے والا وقت، بَلْ کا

مطلب یہ ہے کہ انسان قیامت کا جو اِنکار کرتا ہے تو اس کے انکار کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ فسق وفجور چھوڑنا نہیں چاہتا، اور اگر قیامت کا عقیدہ اپنا لے، آخرت کا عقیدہ اختیار کرلے تو پھر فسق وفجور کی گنجائش نہیں رہتی، چونکہ یہ عادی ہے فسق وفجور کا، اور آنے والے وقت میں بھی فسق وفجور کے اندر مبتلا رہنا چاہتا ہے، اس لیے اس کا دِل اس عقیدے کو قبول نہیں کرتا، اپنے اس فسق وفجور میں مبتلا رہنے کی وجہ سے یہ قیامت کا انکار کیے ہوئے ہے، یعنی یہ آنکھیں بند کرتا ہے اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے تاکہ اِس کے فسق وفجور میں فرق نہ آئے، تو گویا یہ نفسانی تقاضے سے اپنے نفس کے سامنے مغلوب ہونے کی بنا پر انکار کرتا ہے، ورنہ اس انکار کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ''بلکہ ارادہ کرتا ہے انسان کہ اپنے آنے والے وقت میں، اپنے سامنے زمانے میں فسق وفجور کرتا رہے۔''

قیامت کے ہولناک واقعات

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ: پوچھتا ہے کہ قیامت کا دِن کب ہوگا؟ یہ سوال کرنا بطور انکار کے ہے، کیوں جی! کب ہوگا قیامت کا دِن، یہ بطور اِستہزا کے پوچھتے تھے، بطور اِنکار کے، فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ: بصر: نظر، نگاہ، بَرِقَ: چندھیا جائے گی، ''جس دِن کہ نظر چندھیا جائے گی'' چندھیانے کا مطلب یہ ہوتا ہے جیسے تیز روشنی آپ کی آنکھ میں ڈال دی جائے تو نظر آنا بند ہوجاتا ہے، اس کو ''چندھیانا'' کہتے ہیں، ''جس دِن کہ نظر چندھیا جائے گی'' اور خَسَفَ الْقَمَرُ: چاند بےنُور ہوجائے گا، وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ: چاند اور سورج کو اکٹھا کردیا جائے گا، اکٹھا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں بےنُور ہونے میں جمع ہوجائیں گے، جیسے چاند بےنُور ایسے سورج بےنُور، اِن کا نُور ختم ہوجائے گا، ''جمع کردیے جائیں گے سورج اور چاند'' یعنی بےنُور ہونے میں (عام تفاسیر)، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اب تو نظم قائم ہے، سورج اپنے محور میں گردش کررہا ہے اور چاند اپنے حلقے میں پھر رہا ہے، اور جب قیامت آئے گی تو یہ ستارے سب آپس میں ٹکرا جائیں گے، اکٹھے ہوجائیں گے، پھر یہ علیحدہ علیحدہ نہیں رہیں گے، یہی علامت ہوگی کہ اب یہ کائنات ختم ہوگئی۔ ''جمع کردیا جائے گا سورج کو اور چاند کو'' يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ: آج جو شوخیاں کرتا ہوا پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ اس دِن انسان کہے گا کہ کہاں ہے بھاگنے کی جگہ؟ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ: کہے گا انسان، يَوْمَىِٕذٍ: اُس دِن جس دِن کہ ایسا ہوجائے گا جس کا ذِکر اُوپر آیا، آنکھیں چندھیا جائیں گی، چاند بےنُور ہوجائے گا، سورج اور چاند اکٹھے ہوجائیں گے، جس دِن ایسا ہوگا، یوم اذ کان کذا، جیسے آپ تاویل کیا کرتے ہیں ''نحو'' کی کتابوں میں، ''جس دِن ایسا ہوگا کہے گا انسان'' اَيْنَ الْمَفَرُّ: مَفَرّ کا ترجمہ دو طرح سے ہوسکتا ہے یا تو یہ مصدر میمی ہے، اور یا یہ ظرف کا صیغہ ہے، ''کہاں ہے بھاگنے کی جگہ'' میں کہاں بھاگ جاؤں، بھاگ کے کہاں چلا جاؤں، اس طرح سے انسان پوچھے گا جب یہ حالات طاری ہوں گے، كَلَّا: پھر اس کو کہا جائے گا ہرگز نہیں، اب کوئی مفر نہیں ہے، کہیں بھاگ کے نہیں جانا، بھاگنا نہیں ہے اب، کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں، لَا وَزَرَ: کوئی پناہ گاہ نہیں ہے، وَزَر کہتے ہیں پناہ گاہ کو، ''کوئی پناہ گاہ نہیں'' اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ: تیرے رَبّ کی طرف ہی اُس دِن ٹھکانا ہے، مستقر ظرف کا صیغہ ہے، قرار پکڑنے کی جگہ، ''ٹھکانا اور قرار پکڑنے کی جگہ تیرے رَبّ کی طرف ہی ہے'' اب بھاگ کے کہیں نہیں جاسکتے۔

’’مَاقَدَّمَ‘‘ اور ’’مَا اَخَّرَ‘‘ کا مصداق

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ: نَبَأٌ: تنبیہ کرنا، ’’خبردار کیا جائے گا انسان کو، بتلا دیا جائے گا انسان کو‘‘ نبأ اس کا مادّہ ہے خبر کے معنی میں، ’’بتلا دیا جائے گا انسان کو اُس دِن جو کچھ اس نے آگے بھیجا اور جو کچھ اس نے پیچھے چھوڑا‘‘ اس کے اگلے پچھلے سب اعمال اس کو بتا دیے جائیں گے، اگلے پچھلوں سے کیا مراد؟ جو کر لیے وہ آگے بھیج دیے، اور جو کرنے چاہئیں تھے نہیں کیے وہ مَا اَخَّرَ وہ پیچھے چھوڑ دیے، اگلے پچھلے سب اس کو بتا دیے جائیں گے کہ تُو نے یہ کیے تھے، اور یہ تُو نے پیچھے چھوڑے تھے جو کرنے چاہئیں تھے نہیں کیے۔ یا مَاقَدَّمَ تو وہ عمل ہے جو آپ نے کرلیا، اور مَا اَخَّرَ وہ آثار ہیں جو آپ کے عمل کے پیچھے جاری رہتے ہیں، مثال کے طور پر ایک شخص نے مسجد بنائی، یہ تو اس کا عمل ہو گیا، یہ تو مَاقَدَّمَ ہے، اب جب تک لوگ اس میں نماز پڑھتے رہیں گے اور اس کا ثواب جاری رہے گا یہ مَا اَخَّرَ ہے، کوئی اچھا طریقہ جاری کردے اور پیچھے لوگ اس طریقے کے اُوپر چلتے رہیں وہ مَا اَخَّرَ میں داخل ہے، کوئی بُرا طریقہ جاری کردے اور مرنے کے بعد بھی لوگ اس کے پیچھے بُرے طریقے پر چلتے رہیں تو یہ بھی مَا اَخَّرَ میں داخل ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کے اگلے پچھلے، کیے ہوئے، یا اس کے آثار باقیہ، جو کچھ بھی ہے سب انسان کو بتلا دیے جائیں گے، کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔

اِنسان اپنے نفس پر خود گواہ ہوگا

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ: بصیر دیکھنے والے کو کہتے ہیں اور بصیرۃ کے آخر میں جو تاء ہے یہ مبالغے کی ہے، اور یا بصیرۃ مؤنث کا صیغہ آیا ہے کہ انسان سے انسان کے اعضا مراد ہیں، ’’بلکہ انسان اپنے نفس کے اُوپر خود ہی دیکھنے والا ہوگا‘‘ یعنی اس کو اپنے حالات کی خود ہی خبر ہو جائے گی، ہمارے بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یا ’’اپنے آپ کے خلاف خود دلیل ہوگا‘‘ بصیرہ دلیل کو کہتے ہیں کہ انسان کے اعضا انسان کے خلاف حجت ہوں گے، اس کے ہاتھ اس کے خلاف گواہی دیں گے، اس کے پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے، ہمارے بتانے کی ضرورت ہی نہیں، انسان خود ہی اپنے نفس پر گواہ ہوگا۔ بصیرۃ: دیکھنے والا بھی، گواہ اور دلیل کو بھی کہتے ہیں، تاء مبالغے کی ہو جائے گی، یا، انسان اعضا کی تاویل میں ہو کر مؤنث کی تاویل میں آجائے اور بصیرۃ مؤنث کا صیغہ آ گیا، اور تاء مبالغہ کی قرار دی جائے گی تو پھر یہ مذکر ہی ہے جیسے علامۃ کے آخر میں تاء ہوتی ہے، ’’بلکہ انسان خود ہی اپنے نفس پر دلیل ہوگا‘‘ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ: اگرچہ وہ اپنے عذر ڈالے گا، یعنی حیلے بہانے تو بہت کرے گا کہ میں نے یوں نہیں کیا، وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (سورۂ انعام: ۲۳) اللہ کی قسم! ہمارے ربّ کی قسم! ہم تو مشرک نہیں تھے، یوں بہت عذر معذرت کرنے کی کوشش کرے گا لیکن حقیقت میں ہر چیز اس کے سامنے نمایاں ہو جائے گی، ’’اگرچہ وہ ڈالے گا اپنے عذر‘‘ مَعَاذِيْرَهٗ: معذرۃ: عذر کرنا، معاذیر، یہ جمع آگئی۔ ’’اگرچہ وہ ڈالے گا حیلے بہانے، اگرچہ وہ عذر ڈالے گا‘‘ عذر ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ بہت حیلے بہانے کرے گا ان باتوں کا انکار کرنے کے لئے کہ یہ نہیں ہوا تھا، وہ نہیں ہوا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز خود اس کے سامنے واضح ہو جائے گی۔

"لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ... اِلخ" کا شانِ نزول

یہ اگلی جو آیتیں ہیں (لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ...اِلخ) ان کا تعلق تو ہے سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ، جس وقت آپ پر وحی اُترتی تھی تو آپ اس وحی کو یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی زبان کو حرکت دیتے تھے، اس خیال سے کہ کہیں اس میں سے کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے، بھول نہ جائے، جبریل علیہ السلام آپ پر جس وقت وحی نازل کرتے تو حضور ﷺ کوشش کر کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے، زبان کو حرکت دیتے تھے، ہونٹ ہلاتے تھے، جیسے "بخاری شریف" (ص ۳) میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے، ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اپنے شاگردوں کو اس طرح سے ہونٹ ہلا کے دکھایا کرتے تھے کہ حضور ﷺ یوں ہونٹ ہلاتے تھے جس وقت وحی اُترتی تھی۔ اب جبریل علیہ السلام کی بات کو سننا، سمجھنا، پھر اس کو یاد کرنے کی کوشش کرنا، الفاظ کو ضبط کرنے کی کوشش کرنا، اس میں حضور ﷺ کو خاصی مشقت ہوتی تھی، اور آپ کرتے اس لیے تھے کہ تاکہ کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے، کیونکہ وحی آنے کا آپ کو شدت سے انتظار ہوتا تھا، اور وحی آپ کے لئے ایک بہت بڑا سرمایہ تھا، اسی میں تسلی بھی ہوتی تھی، آنے والا پروگرام بھی نمایاں ہوتا تھا، معترضین کے اعتراضات کے جواب بھی ہوتے تھے، پھر اللہ کی کلام ہوتی تھی، جس کی بنا پر شوق کے ساتھ آپ اُس کو جلدی جلدی لینا چاہتے، اور ساتھ ساتھ ضبط کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ تکلیف حضور ﷺ کو جو تھی اس کا ازالہ یہاں کیا گیا، جس میں یہ بات بتائی گئی کہ آپ زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے قرآنِ کریم کو یاد کرنے کے لئے جس وقت کہ وحی آ رہی ہو، آپ بے فکر ہو جایئے، اس میں سے کوئی لفظ گم نہیں ہوگا، اس کا اکٹھا کرنا ہمارے ذمے ہے، اور پھر اس کی قراءت کا آپ کی زبان پہ جاری کر دینا یہ بھی ہمارے ذمے ہے، اور کوئی اس میں مبہم اور مجمل بات آ جائے تو اس کی شرح اور اس کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے، تو آپ بے فکر ہو کر اس کو سنا کیجئے جس وقت ہمارا نمائندہ پڑھے، اِذَا قَرَاْنٰهُ کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم پڑھیں یعنی ہمارا نمائندہ پڑھے، آپ اس کے پڑھنے کی اتباع کیا کیجئے، آپ اپنے طور پر زبان کو حرکت دے کر اس کو ضبط کرنے کی جلدی کوشش نہ کیا کریں، یہ آپ کے لئے باعثِ مشقت ہے، اور اس اندیشے کو اپنے دل سے نکال دیجئے کہ اس میں سے کوئی لفظ گم ہو جائے گا، یہ لفظ آپ کے پاس محفوظ رہیں گے، اس کا جمع کرنا، آپ کی زبان سے پڑھوانا، اس کا بیان کرنا، سب ہمارے ذمے ہے۔ اگلی آیتوں کا مضمون تو یہ ہے۔

مذکورہ آیات کا ماقبل سے ربط

ماقبل کے ساتھ اِن آیات کا کیا ربط ہے؟ یہ اِس سورت میں معروف سوال ہے، کیونکہ ابتدا میں بھی قیامت کا ذکر، اور اس کے بعد پھر قیامت کا ذکر آ رہا ہے كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ، یہ آیات بھی قیامت کے حالات میں ہیں، اور درمیان کے اندر یہ وحی کا مسئلہ آ گیا، اس کا ربط کیا ہوا ماقبل کے ساتھ؟ تو آسان توجیہ اس میں یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ تو اس میں یہ بات نمایاں ہو گئی کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، جو بولتا رہے، جتنے بھی اس کے اعمال، اقوال ہیں، چاہے انسان کو یاد نہ رہے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ چاہے تو ایک ہی وقت میں ساری معلومات اس کے

ذہن میں اکٹھی کردے گا، جیسے قیامت میں آپ کو زندگی بھر کی باتیں یاد آجائیں گی کہ ہم نے کیا کیا بولا تھا؟ زندگی بھر کے کام یاد آجائیں گے کہ ہم نے کیا کیا کیا تھا؟ کوئی چیز آپ فراموش نہیں کر سکیں گے، یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ: جو کچھ اس نے کیا اگلے پچھلے سب اس کو بتادیئے جائیں گے، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نمایاں ہے اس بات سے کہ معلومات یک دَم انسان کے ذہن میں اکٹھی کردینا یہ اللہ کی قدرت میں ہے، اگر اِنسان خود بھول بھی جائے لیکن اللہ تعالیٰ تو نہیں بھولتا، جب چاہے گا وہ دماغ کے اندر سب چیزوں کو اکٹھا کردے گا۔ اسی مناسبت سے یہاں یہ بات ذِکر کردی گئی کہ پھر آپ فکر کیوں کرتے ہیں کہ وحی کا کوئی لفظ آپ سے چھوٹ جائے گا، آپ کوئی بات بھول جائیں گے، ضبط نہیں رہے گی، ان سب کو اکٹھا کرکے آپ کے دماغ میں مستحضر کردینا یہ ہماری قدرت میں ہے، جس طرح سے قیامت کے دِن ہر اِنسان کی زندگی کی معلومات ہم اس کے دماغ میں اکٹھی کردیں گے، اس طرح سے اِس مضمون کا ربط ماقبل کے ساتھ ہوجائے گا، اوراس کے بعد پھر کلام منتقل ہوجائے گی آخرت کے احوال کی طرف۔

مذکورہ آیات کا خلاصہ

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ: بِهٖ کی ضمیر وحی کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی قرآن، ''حرکت نہ دیا کر اِس قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو'' لِتَعْجَلَ بِهٖ: تاکہ آپ اس کے ساتھ جلدی کرلیں، اس کو جلدی حاصل کرنے کے لئے آپ اِس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کریں، اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ: بے شک ہمارے ذِمّے ہی ہے اس کا اکٹھا کرنا اوراس کا پڑھوانا، قرآن یہ مصدر کے معنی میں ہے، اِس کا پڑھنا یعنی آپ کی زبان سے پڑھوانا، آپ کی زبان کے اُوپر اِس کی قراءت کا ثابت کرنا یہ ہمارے ذِمّے ہے، آپ کے سینے کے اندراس کا جمع کرنا، دل دماغ کے اندر اس کا اکٹھا کرنا، پھر آپ کی زبان کے اُوپر اس کی قراءت کو ثابت کرنا یہ سب ہمارے ذمے ہے، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ: پس جس وقت ہم اس کو پڑھیں، ہم پڑھیں کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا بھیجا ہوا فرشتہ پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قراءت رسول اللہ ﷺ کے سامنے بواسطہ جبرئیل ہی ہوتی تھی، ''تو آپ اس کے پڑھنے کا اتباع کیا کیجئے۔''

''اِتباع'' کا معنیٰ ''صحیح بخاری'' سے

توجہ فرمایئے......! بخاری شریف میں جس جگہ یہ روایت آئی ہے، ''باب بدء الوحی'' کے اندر بھی ہے، اوراسی طرح سے آگے ''کتاب التفسیر'' کے اندر بھی اِمام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ذِکر کیا ہے، تو وہاں فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں اِسْتَمِعْ لَهٗ وَاَنْصِتْ اس کے پڑھنے کی اتباع کیا کر، اس کے پڑھنے کی اتباع کرنے کا کیا معنیٰ؟ اِسْتَمِعْ لَهٗ وَاَنْصِتْ توجہ سے سُنا کر اور چپ رہا کر، تو اتباع قراءت کا معنیٰ اِمام بخاری نے حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا اِسْتَمِعْ لَهٗ وَاَنْصِتْ توجہ سے سُن اور خاموش رہ۔

مسئلۂ قراءت خلف الامام

توہمارے علماء کہتے ہیں کہ اسی طرح سے حدیث شریف میں جو آیا کہ ''اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِهٖ'' اِمام تو بنایا اسی

لیے جاتا ہے تا کہ اس کی اتباع کی جائے،"إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا" اس اتباع کی تفصیل یہ آ گئی کہ جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو، "إِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا" جس وقت وہ رُکوع کرے تو تم بھی رُکوع کرو،"إِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا" جس وقت وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اِس میں اتباع تو یوں ذکر کی گئی،[1] اوراُس اِمام کے قرآنِ کریم پڑھنے کی اتباع کیا ہے؟"إِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا" جب وہ قرآن پڑھے توتم چپ رہا کرو،[2] معلوم ہوگیا کہ اس حدیث کے اندر جو قراءتِ قرآن کے وقت میں اِنصات کا حکم ہے وہ بالکل قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر کے طور پر ہے فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ کہ ہمارا نمائندہ جس وقت پڑھے تو تو اس کے پڑھنے کی اتباع کیا کر، اور قراءت کی اتباع کا مطلب یہی ہے کہ اس کو چپ کر کے سنو، اس لیے امام جس وقت قراءت کرے تو اس کی اتباع کا تقاضا یہی ہے کہ مقتدی چپ کر کے سنیں، اپنے طور پر نہ پڑھیں، تو اِمام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے اس پر اِستدلال ہمارے علماء نے یہاں سے بھی کیا ہے، تقریباً تمام شراحِ حدیث نے اِس بات کو ذکر کیا ہے،"معارف القرآن" کے اندر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے، یہاں حکم ہے اتباعِ قراءت کا، جبریل کی قراءت کا اِتباع کر، اور اس اتباع کا معنی اِبنِ عباس نے بیان کیا اِسْتَمِعْ اور اَنْصِتْ سُن اور چُپ رہ، تو بالکل وہ روایت اِس کے ساتھ ملتی ہے جس میں آیا:"إِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا" کہ جب اِمام پڑھے توتم چُپ رہا کرو، کیونکہ اِتباعِ اِمام فی القراءت وہ اِستماع اور اِنصات کی صورت میں ہوسکتا ہے، اور قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی اس کی طرف اشارہ ہے إِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (سورۂ اعراف: ۲۰۴) جب بھی قرآن پڑھا جائے تو تم توجہ کے ساتھ سنا کرو اور چُپ ہوجایا کرو، اور فاتحہ کا پڑھنا یہ قرآن کا پڑھنا ہی ہے، تو جب اِمام فاتحہ پڑھے گا، قرآن پڑھے گا، تو دُوسروں کو خطاب ہے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا: سنو اور چُپ رہو، چُپ رہنا بہر حال ضروری ہے، اِستماع اس وقت ہوگا جس وقت کہ وہ جہراً پڑھے گا۔ تو اِن الفاظ کے ساتھ بھی تائید ہوتی ہے اُن ائمہ کے اقوال کی جو اِمام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا قول نہیں کرتے، جو کہتے ہیں کہ اِمام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے، کہ اِتباعِ قراءت کا تقاضا یہی ہے کہ چُپ کر کے اس کو سنا جائے۔

وحی کا نہ کوئی لفظ ضائع ہوگا نہ معنی

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ: پھر اُس کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے یعنی آپ سے بیان کروالینا،"اُس کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے، وضاحت بھی اس کی ہم کریں گے، اور لوگوں کے سامنے آپ سے بیان بھی ہم کروائیں گے، مطلب یہ ہے کہ آپ مطمئن ہوجائیے، نہ کوئی لفظ گم ہوگا نہ کوئی معنی ضائع ہوگا، اس لیے آپ اس مشقت میں نہ پڑیے کہ جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش کریں، بلکہ توجہ کے ساتھ سنتے رہا کیجئے، کوئی لفظ ضائع نہیں ہوگا، کوئی معنی نہیں چھوٹے گا، یہ سب ذمہ داری ہماری ہے۔ اور ماقبل کے ساتھ مناسبت یہی ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کی تمام معلومات بیک وقت اس کے دماغ میں اکٹھا کرنے پہ قادر ہے يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ، اسی طرح سے وحی کو آپ کے سینے میں جمع کردینا، آپ کے دل دماغ میں اس کے معانی کا محفوظ

---

(۱) بخاری ۱/۵۵ باب الصلاۃ فی السطوح وغیرہ۔

(۲) نسائی ۱/۱۰۷، باب تاویل قولہ عز وجل: واذا قرئ القرآن الخ/ ابن ماجہ ۱/۶۱، باب اذا قرء الامام فانصتوا/ مشکوۃ ۱/۸۱، باب القراءۃ فی الصلاۃ، فصل ثانی۔

کردینا یہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے، تو آپ فکر نہ کیجئے، اس میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہوگی۔ یہ درمیان میں بات آگئی، آگے پھر وہی احوالِ قیامت ہیں!

کفار میں آخرت کی فکر نہ ہونے کی وجہ

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ: كَلَّا سے ردع ہے، تم جو کہتے ہو قیامت نہیں آئے گی، ہرگز ایسا نہیں ہے، بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ: آخرت کی تم فکر نہیں کرتے اس کی بنا کسی دلیل پر نہیں، بلکہ تم دُنیا کی محبت میں مبتلا ہو، دُنیا کی محبت تمہیں آخرت کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی، دُنیا کی لذتوں کے اندر مشغول ہو، ''بلکہ محبت کرتے ہو تم عاجلہ سے'' عاجلہ کہتے ہیں جلدی حاصل ہونے والی چیز کو، اور اس سے مراد یہی دُنیا ہے، دُنیا اور دُنیا کا سامان، اور لفظ ''دُنیا'' یہ بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ ''دُنیا''، ''ادنیٰ'' کی مؤنث ہے، زیادہ قریب چیز، جو نقد بہ نقد حاصل ہوتی ہے، اسی کو عاجلہ سے تعبیر کیا گیا، یہی دُنیا ہے، دُنیا بھی عربی کا لفظ ہے، ادنیٰ کی مؤنث ہے، ''بلکہ تم محبت کرتے ہو جلدی حاصل ہونے والی چیز کے ساتھ اور چھوڑتے ہو تم پیچھے آنے والی چیز کو'' آخرت کو تم چھوڑے ہوئے ہو، دُنیا کے ساتھ تم محبت کرتے ہو۔

قیامت کے دِن تروتازہ چہرے

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ: ناضرۃ یہ لفظ نَضْرَۃ سے لیا گیا ہے۔ نضرۃ: تروتازہ ہونا، ''کچھ چہرے اس دِن تروتازہ ہوں گے'' تروتازہ کا مطلب ہوتا ہے چہرے پر خوشی نمایاں ہوگی، سرور نمایاں ہوگا، جس وقت دِل کے اندر خوشی ہوتی ہے تو چہرے کے اُوپر بھی تازگی معلوم ہوتی ہے، اور جب دِل کے اندر کوئی غم یا صدمہ یا فکر ہوتی ہے تو چہرہ بھی اُترا ہوا ہوتا ہے جس طرح سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، تو دِل کے جذبات فوراً چہرے کے اُوپر اثر ڈالتے ہیں، اگر کوئی خوشی کی خبر سُن لیں تو چہرہ چمک اُٹھتا ہے، تروتازہ ہو جاتا ہے، اور غم اور افسوس کی خبر ہو تو فوراً انسان کے چہرے کا خون سکڑ جاتا ہے اور میلا سا چہرہ اور بدنما سا ہو جاتا ہے۔ ''کچھ چہرے اُس دِن تروتازہ ہوں گے۔''

جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ: اپنے رَبّ کی طرف دیکھنے والے ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، یہ مسئلہ اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک محقق ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، اور انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، سر کی آنکھوں کے ساتھ دیکھیں گے، کیسے دیکھیں گے؟ اُس وقت کیا کیفیت ہوگی؟ وہ اللہ بہتر جانتا ہے! لیکن دُنیا کے اندر رہتے ہوئے انسان اِس بیدار آنکھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا، اس مسئلے کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں کی گئی تھی جہاں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آیا تھا: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (آیت: ۱۴۳)، بہر حال یہ عقیدہ اہلِ سُنّت والجماعت کا کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی اللہ تعالیٰ کا

دیدار کریں گے، یہ مسئلہ تو اپنی جگہ محقق ہے اور صحیح روایات میں آیا ہوا ہے، باقی! قرآنِ کریم کی اِس آیت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے "اپنے رَبّ کی طرف دیکھنے والے ہوں گے" یعنی رَبّ کا دیدار کریں گے...... لیکن یہاں معنی یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے منتظر ہوں گے، اُمیدوار ہوں گے، کیونکہ یہ بات بھی محاورے کے مطابق ہے، انسان کہتا ہے کہ میری نظریں تیری طرف لگی ہوئی ہیں، فلاں شخص فلاں کی طرف جھانک رہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے توجہ کا اور اس کی طرف سے اِنعام کا اور مہربانی کا طالب ہے، تو قیامت کے میدان میں اگر یہ بات ہو تو پھر یہ معنی زیادہ انسب ہے، کہ قیامت کے میدان میں جس وقت مؤمنین کو اچھی جزا کی بشارتیں ہوجائیں گی تو چہروں پہ تازگی آجائے گی اور اپنے رَبّ کی رحمت کے حصول کے وہ منتظر ہوں گے، کہ اللہ کی طرف سے ہمارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے گا...... وہ بھی اپنی جگہ صحیح بات ہے کہ اپنے رَبّ کو دیکھنے والے ہوں گے، لیکن یہ بات جنّت میں جانے کے بعد ہوگی، اہلِ سُنّت والجماعت کا یہ عقیدہ بالکل صحیح ہے، جنّت میں جنتیوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، صحیح روایات میں آیا ہے، بلکہ اُن روایات میں تو یہ بھی ذِکر کیا گیا ہے کہ جس وقت جنّتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو جنّت کی کوئی نعمت اِس کے مقابلے میں اُن کو اچھی نہیں لگے گی۔[1] سب سے فائق اور سب سے اعلیٰ نعمت اللہ کا دیدار ہوگا، جنّتی اس کے اندر اتنی لذت پائیں گے کہ جنّت کی کسی دُوسری نعمت کے اندر اتنا مزہ نہیں آئے گا۔ تو وہ مسئلہ تو اپنی جگہ متیقن، لیکن ضروری نہیں کہ ہم اس کو اِسی آیت سے ثابت کریں، اس لیے اس کا یہ ترجمہ بھی صحیح ہے کہ اپنے رَبّ کو دیکھنے والے ہوں گے، اور یہ ترجمہ بھی صحیح ہے کہ اپنے رَبّ کی رحمت کے امیدوار ہوں گے، کیونکہ نَظَرَ اِلَیْهِ کا معنی یہ بھی ہوتا ہے کسی کی طرف جھانکنا، اُمید لگانا، اس کی طرف سے شفقت اور عنایت کی اُمید رکھنا، یہ مفہوم بھی اِس کا ہوتا ہے، یہ بات بھی یوں ذِکر کی جاسکتی ہے، اگرچہ جمہور مفسرین نے اس کی تردید کی ہے۔

قیامت کے دِن بدرونق چہرے

وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ: اور بعض چہرے اس دِن باسرہ ہوں گے، یہ بَاسِرَةٌ وہی ہے جو پچھلی سورت کے اندر لفظ آیا تھا عَبَسَ وَبَسَرَ، یہ باسِرہ اسی سے ہے، عَبَسَ وَبَسَرَ میں جس طرح سے مفہوم ذِکر کیا تھا، منہ کو بگاڑنا، منہ کو بسورنا، "بعض چہرے اس دِن اُداس ہوں گے، بگڑے ہوئے ہوں گے" تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ: وہ خیال کریں گے کہ ان کے ساتھ فاقرہ کیا جائے گا، فاقرہ یہ لفظ لیا گیا ہے فَقار سے، فقار کہتے ہیں یہ ریڑھ کی ہڈی جو علیحدہ علیحدہ منکے بنے ہوئے ہیں، تو ایک منکا ریڑھ کی ہڈی کا فَقارۃ کہلاتا ہے، فقارِ ظہر: پشت کے منکے، تو فاقرہ سے مراد ہے ایسا معاملہ جو کہ کمر کو توڑ دے، "بعض چہرے اس دِن اُداس ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ کمر توڑ معاملہ کیا جائے گا" یعنی ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جو ان کی کمر کو توڑ کر رکھ دے گا، یعنی وہ اس

---

(۱) فما اعطوا شیئًا احب الیهم من النظر الی ربهم. (مسلم ۱/۱۰۰، باب اثبات رؤیة المؤمنین الخ. مشکوٰۃ ۲/۵۰۱، باب رؤیة الله، فصل اوّل)، فلا یلتفتون الٰی شیء من النعیم ما داموا ینظرون الیه. (ابن ماجه ص ۱۷، باب فی ما انکرت الجهمیة. مشکوٰۃ ۲/۵۰۲، باب رؤیة الله، فصل ثالث)

قسم کے عذاب سے ڈر رہے ہوں گے کہ ہمارے ساتھ تو کمر توڑ معاملہ ہونے والا ہے، جب اس قسم کی توقع لگی ہوئی ہو، اندیشہ لگا ہوا ہو تو آپ جانتے ہیں کہ چہرے اُتر ہی جاتے ہیں، ہوائیاں اُڑ جاتی ہیں، چہرے پر اُداسی طاری ہو جاتی ہے، اُن کے چہروں پہ یہ کیفیت طاری ہوگئی۔

موت کے وقت اِنسان کی بے بسی قیامت کے حق ہونے کی دلیل ہے

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ: كَلَّا اسی طرح سے ردع ہے، تم جو قیامت کا انکار کرتے ہو تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے، تمہاری یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے، ذرا موت کو مستحضر کرو، تمہیں پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انسان کی بے بسی کیسی ہے، یہ آگے موت کا نقشہ پیش کیا ہے، اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ: جس وقت جان تراقی تک پہنچ جائے گی، تراقی تَرْقُوَۃٌ کی جمع ہنسلی، یعنی جان نکلتی ہوئی یہاں گلے تک آجائے گی، جیسے سورۂ واقعہ کے اندر لفظ آیا تھا اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ، حلقوم یہی حلق ہوگیا، جب یہ جان، یہ رُوح نکلتی ہوئی حلق تک آجائے گی، "جس وقت یہ جان، رُوح ہنسلی تک پہنچ جائے گی" تراقی: آگے سینے کے اُوپر والی ہڈیاں، جس کو ہم ہنسلی کہتے ہیں، یہ جو اُوپر والی ہڈی ہے یہ ترقوۃ ہے، "جس وقت جان ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی، تراقی تک پہنچ جائے گی" یعنی سینے کی بالائی ہڈیوں تک پہنچ جائے گی، وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ: اور کہا جائے گا کہ کون ہے دَم کرنے والا؟ یعنی دوا، دَارو سے مایوس ہو جائیں گے، پھر سارے بے تابی کے اندر پوچھتے پھریں گے کہ کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟ کوئی دَم کرنے والا ہے؟ جو دَم کر کے ہی اِس کی جان کو بچالے، رَقٰی یَرْقِیْ رُقْیَۃً: دَم کرنا، پھونک مارنا، جھاڑ پھونک کرنا، رُقیہ کہتے ہیں افسوں کو، دَم کو، جو کچھ پڑھ کے کسی کے اُوپر پھونکا جاتا ہے، جھاڑ پھونک، "کوئی ہے دَم کرنے والا؟ کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟" لوگ بے تابی کے ساتھ پوچھیں گے یعنی اس مرنے والے کے رشتے دار، قریبی۔ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ: اور مرنے والا بھی سمجھ جائے گا، انسان سمجھ جائے گا کہ یہ جدائی کا وقت ہے، اَنَّهُ الْفِرَاقُ: اَنَّهُ وَقْتُ الْفِرَاقِ، یعنی یہ جو مصیبت یہ تکلیف جو نازل ہوگئی یہ فراق کا سبب ہے اَیْ مَا نَزَلَ بِهٖ سَبَبُ الْفِرَاقِ، جو تکلیف اس کے اُوپر اُتری ہوئی ہے اب یہ جدائی کا سبب بن جائے گی، سب کچھ چھوڑ کے چل دیں گے۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ: اور لپٹ گئی پنڈلی پنڈلی کے ساتھ، "جب تراقی تک جان پہنچ جائے گی اور کہا جائے گا کہ کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور سمجھے گا انسان کہ یہ مصیبت فراق کا سبب ہے اور لپٹ جائے گی پنڈلی پنڈلی کے ساتھ" یہ اس کے بے جان ہونے کی طرف اشارہ ہے، ساق کہتے ہیں پنڈلی کو، کیونکہ جب ٹانگوں کی طرف سے جان نکل کر گلے تک آجائے تو پھر ٹانگیں مریض سے سنبھالی نہیں جاتیں، ٹانگ ایک دوسرے کے اُوپر گرتی ہے، یہ اُسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے، "لپٹ جائے گی ٹانگ ٹانگ کے ساتھ" اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ: تیرے رَبّ کی طرف ہی اُس دن چلنا ہے، دُنیا کو چھوڑ کر پھر انسان اپنے رَبّ کی طرف چل دیتا ہے، مساق یہ بھی مصدر میمی ہے، سَاقَ سَوْقًا: ہانکنا، جیسے وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (سورۂ زمر: ۷۱)، مساق مصدر میمی، "تیرے رَبّ کی طرف ہی اُس دن چلنا ہے۔"

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾

پس نہ اس نے تصدیق کی نہ نماز پڑھی ﴿۳۱﴾ لیکن اس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیری ﴿۳۲﴾ پھر چلا گیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا ﴿۳۳﴾

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾

خرابی ہے تیرے لیے پھر خرابی ہے ﴿۳۴﴾ پھر خرابی ہے تیرے لیے پھر خرابی ہے ﴿۳۵﴾ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بے کار چھوڑ دیا جائے گا؟ ﴿۳۶﴾

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾

کیا یہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو ٹپکایا جاتا ہے ﴿۳۷﴾ پھر یہ جما ہوا خون ہوا، پھر اللہ نے اس کو پیدا کیا پھر اس کے اعضا درست کیے ﴿۳۸﴾

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْـِۧيَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

پھر اس سے دو قسمیں بنادیں مذکر اور مؤنث ﴿۳۹﴾ کیا وہ اس بات پہ قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کردے؟ ﴿۴۰﴾

تفسیر

اِنسان کی تکذیب کا حال

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى: پس نہ تو اس شخص نے تصدیق کی اور نہ نماز ہی پڑھی، یعنی آخرت سے غافل رہا، اللہ کی باتوں کی تصدیق نہیں کی، اللہ کی عبادت نہیں کی، "نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی، لیکن اس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیری" كَذَّبَ یہ صَدَّقَ کے مقابلے میں آ گیا، اور تَوَلّٰى یہ صَلّٰى کے مقابلے میں آ گیا، اِس نے باتیں مانی نہیں، تصدیق نہیں کی بلکہ تکذیب کی، نماز نہیں پڑھی بلکہ اعراض کیا، ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى: پھر چلا گیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا، فخر کرتا ہوا گھر والوں کی طرف چلا گیا، یعنی اپنے اہل وعیال، مال، ہر چیز پہ اُس کو فخر ہے، اللہ کی باتوں کی تصدیق کر کے اللہ کے راستے میں مال خرچ نہیں کرتا، عبادت نہیں کرتا، بلکہ اکڑتا ہوا گھر کو جاتا ہے۔

تکذیب کرنے والے کا انجامِ بد

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى: یہ اس کے لئے ایک قسم کا بددُعائیہ کلمہ ہے، اولی یہ وَیل سے بنا ہوا ہے، اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے "افسوس ہے تیرے لیے، پھر افسوس ہے، پھر افسوس ہے تیرے لیے پھر افسوس ہے"، یعنی جو اللہ کی بات نہیں مانتا، تکذیب کرتا ہے، نماز نہیں پڑھتا، پیٹھ پھیرتا ہے، مال ودولت پر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف جاتا ہے، اس پر افسوس، بار بار افسوس۔ یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ یا پھر "خرابی ہے تیرے لیے خرابی ہے، پھر خرابی ہے تیرے لیے خرابی ہے"، بار بار ذکر کیا جا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلسل اس کے لئے خرابی ہے، اور اس کا بُرا انجام اس کے سامنے آنے والا ہے جس نے اللہ کے

اَحکام کی تصدیق نہیں کی، عبادت نہیں کی، مال دولت پر اللہ کا شکر اَدا نہیں کیا، بلکہ اپنے اہل وعیال مال اولاد کی بنا پر اکڑتا ہوا وہ گھر کی طرف جاتا ہے ایسے شخص کے لئے خرابی ہے، لیکن یہ خطاب کے انداز میں کہہ دیا گیا ''خرابی ہے تیرے لئے خرابی ہے، پھر خرابی ہے تیرے لیے خرابی ہے''، بار بار تکرار کے ساتھ بطور تاکید کے کہا جا رہا ہے۔

کیا اِنسان کو بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى: یہ جو تصدیق نہیں کرتا، نماز نہیں پڑھتا، کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بے کار چھوڑ دیا جائے گا؟ اس کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے؟ جیسے سورۂ مؤمنون کے آخر میں آیا تھا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا: کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور فضول پیدا کیا ہے؟ تمہارے اُوپر کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے؟ تم یہ سمجھتے ہو؟'' کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے گا بے کار؟'' بے کار نہیں چھوڑا جائے گا، پیدا کرنے والا اِس کو پیدا کرنے کے بعد بے کار نہیں چھوڑے گا، بلکہ اِس کو پکڑا جائے گا، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور اس کی زندگی کا محاسبہ کیا جائے گا، انسان کو عبث نہیں پیدا کیا گیا، اِس کو سدیٰ اور بے کار نہیں چھوڑا جائے گا۔

اِثباتِ معاد کے لئے تخلیقِ اِنسانی کا ذِکر

اب اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ میں چونکہ اِستفہامِ انکاری ہے کہ انسان کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے، یہ بے کار نہیں بلکہ مکلّف ہے، اور اس کے اعمال کے اُوپر جزا سزا مرتّب ہوگی، اور جزا سزا کے مرتّب ہونے میں اس بات کا دخل ہے کہ اللہ کو اتنی قدرت ہو کہ اس کے مرنے کے بعد دوبارہ اِس کو زندہ کرے، آگے یہی قدرت ذکر کی جارہی ہے، اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى: یَكُ اصل میں یَكُنْ تھا، نطفہ: ٹپکایا ہوا قطرہ، نَطَفَ ٹپکانے کو کہتے ہیں، نُطفہ: ٹپکایا ہوا قطرہ، ''کیا یہ ایک قطرہ نہیں تھا مَنی کا جو ٹپکایا جاتا ہے؟ کیا یہ مَنی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو ٹپکایا جاتا ہے'' یعنی ایک قطرہ مَنی کا ماں کے رحم میں ٹپکایا گیا، وہاں سے انسان بنا، تو جو اللہ اتنی قدرتوں والا ہے کہ پانی کے ایک ٹپکائے ہوئے قطرے سے انسان بنا کے کھڑا کر دیا، تو کیا وہ دوبارہ اِس کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟'' کیا یہ مَنی کا ٹپکایا ہوا قطرہ نہیں تھا، پھر یہ جما ہوا خون ہوا'' فَخَلَقَ: پھر اللہ نے اس کو پیدا کیا، فَسَوّٰى: پھر اس کے اعضا دُرست کیے فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى: پھر اس کی دو قسمیں بنا دیں مذکر اور مؤنث، ایک ہی پانی کا قطرہ ہے، اسی سے لڑکی بن رہی ہے، وہی پانی کا قطرہ ہے جس سے لڑکا بن رہا ہے، اور دونوں کی حالتوں کیفیتوں میں دیکھو کتنا فرق ہے، یہ سب اللہ کی قدرت نمایاں ہے، تو اگر اپنی پیدائش کی طرف دیکھو تو اللہ کی قدرت کو سمجھ جاؤ گے، تو پھر یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنا بھی ہے، فَخَلَقَ: پھر پیدا کیا، فَسَوّٰى: پھر اس کے اعضا برابر بنائے، ٹھیک کیے، دُرست کیے، فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ: پھر اس سے دو قسمیں بنائیں، اُسی قطرے سے، الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى: مذکر اور مؤنث، اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ: کیا یہ قدرت رکھنے والا نہیں اس بات پہ کہ مُردوں کو زندہ کردے؟ جس کی یہ قدرت نمایاں ہے کہ پانی کے قطرے سے سب کچھ پیدا کر کے رکھ دیا کیا وہ اس بات پہ قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کردے؟ اب یہ ہے اِستفہام، اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ: کیا یہ قادر نہیں؟ تو حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ آیت سنو تو

اِس کا جواب دینا چاہیے: ''بَلٰى وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ'' کیوں نہیں؟ یعنی قادر ہے، اور میں گواہوں میں سے ہوں، میں اقرار کرنے والوں میں سے ہوں اس بات پر کہ اللہ اس بات پہ قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کردے، اس اِستفہام کا جواب اس طرح سے دینا چاہیے،[1] ''کیا وہ قادر نہیں اس بات پر کہ زندہ کردے مُردوں کو؟'' یقیناً قادر ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰياتها ۳۱ — ۷۶ سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَدَنِيَّةٌ ۹۸ — رکوعاتها ۲

سورۂ دَہر مکہ میں نازل ہوئی اس کی اکتیس آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ① اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ

انسان پر زمانے میں سے ایسا وقت یقیناً آیا ہے کہ یہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا ① بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو

مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ② اِنَّا هَدَيْنٰهُ

ایک ملے ہوئے قطرے سے جو مخلوط تھا، اس حال میں کہ ہم اس کو آزمائش میں ڈالتے تھے، پھر بنادیا ہم نے اس کو سمیع و بصیر ② بے شک ہم نے اس کو

السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ③ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَ اَغْلٰلًا

راستہ دکھایا، اس حال میں کہ یہ شکرگزار ہے یا ناشکرا ہے ③ بے شک ہم نے تیار کیں کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق

وَّ سَعِيْرًا ④ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۚ⑤ عَيْنًا

اور بھڑکتی ہوئی آگ ④ بے شک نیک لوگ پئیں گے ایسے بھرپور پیالے سے جس میں ملاوٹ کافور کی ہوگی ⑤ وہ ایسا چشمہ ہے

يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ⑥ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ

جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اور جاری کریں گے اس کو جاری کرنا ⑥ پورا کرتے ہیں وہ (ابرار) نذر کو اور ڈرتے ہیں

---

(۱) کنز العمال ۲/ ۲۲۳، رقم: ۴۱۳۹، بحوالہ ابن نجار، ولفظہ: صلیت مع رسول اللہ ﷺ بعد عتمته فاذا قال أَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى أَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى سمعته يقول: بلى وأنا على ذلك من الشاهدين۔ نوٹ: قولی حدیث میں اس کا جواب صرف ''بلیٰ'' کے ساتھ مذکور ہے۔ ابو داؤد وغیرہ۔

يَوۡمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسۡتَطِيۡرًا ۝٧ وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا

ایسے دن سے جس کی تکلیف عام ہوگی۝ اور وہ کھلاتے ہیں کھانا اللہ کی محبت کی بنا پر مسکین کو اور یتیم کو

وَّاَسِيۡرًا ۝٨ اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا ۝٩ اِنَّا

اور قیدی کو۝ سوائے اس کے نہیں، کھلاتے ہیں ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لئے، نہ ہم تم سے جزا چاہتے ہیں نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۝ بے شک ہم

نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا يَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِيۡرًا ۝١٠ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الۡيَوۡمِ

ڈرتے ہیں اپنے رَبّ کی طرف سے ایسے دن سے جو بہت ترش رو اور بہت سخت ہوگا۝ پس بچالے گا ان کو اللہ تعالیٰ نے اس دن کی سختی سے

وَلَقّٰهُمۡ نَضۡرَةً وَّسُرُوۡرًا ۝١١ وَجَزٰهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّةً وَّحَرِيۡرًا ۝١٢ مُّتَّكِـِٕيۡنَ

اور اللہ تعالیٰ دے گا انہیں تر و تازگی اور خوشی۝ بدلہ دے گا اللہ تعالیٰ ان کو ان کے صبر کے سبب سے جنّت اور ریشم۝ ٹیک لگانے والے ہوں گے

فِيۡهَا عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوۡنَ فِيۡهَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِيۡرًا ۝١٣ وَدَانِيَةً عَلَيۡهِمۡ

اس جنّت میں مزین تختوں پر، نہیں دیکھیں گے اُس جنّت میں سورج اور نہ سردی۝ اور قریب ہونے والے ہوں گے ان کے اُوپر

ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتۡ قُطُوۡفُهَا تَذۡلِيۡلًا ۝١٤ وَيُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّ

اُس جنّت کے سائے، اور تابع کر دیے جائیں گے اس کے پھل تابع کرنا۝ گھمائے جائیں گے ان کے اُوپر برتن چاندی کے، اور

اَكۡوَابٍ كَانَتۡ قَوَارِيۡرَا۟ ۝١٥ قَوَارِيۡرَا۟ مِنۡ فِضَّةٍ قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا ۝١٦ وَ

آبخورے جو شیشہ ہوں گے۝ وہ شیشہ چاندی سے ہوگا، اندازہ کیا ہوگا انہوں نے ان برتنوں کا اندازہ کرنا۝ اور

يُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا ۝١٧ عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا ۝١٨

پلائے جائیں گے وہ جنّت کے اندر پیالہ جس میں ملاوٹ سونٹھ کی ہوگی۝ زنجبیل ایک چشمہ ہے جنّت میں جس کا نام رکھا جاتا ہے سلسبیل۝

وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُـؤۡلُـؤًا مَّنۡثُوۡرًا ۝١٩

اور چکر لگائیں گے ان کے اُوپر بچے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے، جب تُو انہیں دیکھے گا تو تُو انہیں سمجھے گا بکھرے ہوئے موتی۝

وَاِذَا رَاَيۡتَ ثَمَّ رَاَيۡتَ نَعِيۡمًا وَّمُلۡكًا كَبِيۡرًا ۝٢٠ عٰلِيَهُمۡ ثِيَابُ سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ

اور جب تُو دیکھے گا وہاں تو دیکھے گا خوش حالی اور ایک بہت بڑی سلطنت۝ ان جنّتیوں کے اُوپر سبز کپڑے ہوں گے باریک ریشم کے

وَّاِسْتَبْرَقٌ ۚ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ

اور موٹے ریشم کے، اور پہنائے جائیں گے وہ کنگن چاندی کے، اور پلائی ان کو ان کے رَبّ نے شرابِ طہور ﴿۲۱﴾ بے شک

هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

یہ چیز تمہارے لیے بدلہ ہے اور تمہاری کوشش کی قدر کی ہوئی ہے ﴿۲۲﴾

سورت مکی ہے یا مدنی؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ دہر، (اس قرآنی نسخے کے) اُوپر جو عربی لکھی ہوئی ہے تو اس میں لکھا ہے: ''سورة الدھر مدنية'' اور نیچے جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے تو اس ترجمے میں لکھا ہے کہ سورۂ دہر مکہ میں نازل ہوئی، راجح یہی ہے کہ یہ سورت ''مکی'' ہے، جمہور مفسرین کا قول یہی ہے کہ یہ سورت ''مکی'' ہے، مکہ معظمہ میں نازل ہوئی، اور اس سورت کا مضمون بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے، اور ''مکی'' سورتوں کی طرح ہی اس کے اندر مضمون بیان کیا گیا ہے، ''مدنیہ'' کا خیال ٹھیک نہیں ہے، اور بعض حضرات نے اِس میں سے کچھ آیتوں کو ''مدنی'' قرار دیا ہے، لیکن وہ بھی مرجوح ہے، راجح قول یہی ہے کہ یہ ساری کی ساری سورت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اور اس کی ۳۱ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رُکوع ہیں۔

ماقبل سے ربط اور سورت کے مضامین

پچھلی سورت کے اِختتام پر یہ لفظ آیا تھا اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُس کو بے کار چھوڑ دیا جائے گا؟ یعنی وہ مکلف نہیں ہے، اور پیدا ہوا، کھائے، پیے، اپنی مرضی کے ساتھ زندگی گزار کے ختم ہوجائے، کیا انسان اپنے آپ کو اس طرح سے سمجھتا ہے؟ ایک جگہ یہی سوال اُٹھایا گیا تھا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (سورۂ مؤمنون: ۱۱۵) کیا ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے؟ تمہارا یہی خیال ہے؟ اِن سب سوالوں کا جواب یہی ہے کہ نہ انسان سُدیٰ ہے، نہ عبث ہے، بلکہ اس کو مکلف پیدا کیا گیا ہے، اور اس کو خیر وشر کی تمیز دی گئی ہے، اور اس کے سامنے ایک انجام آنے والا ہے، اچھا کام کرے گا تو اس کے سامنے اچھا انجام آئے گا، کوئی بُرا کام کرے گا تو اس کے سامنے بُرا انجام آئے گا۔ تو سب سے پہلے جو انسان کے ذہن بات ڈالنا ضروری ہے وہ یہی ہے کہ انسان مکلف ہے، یہ شتر بے مہار نہیں، یہ اس بات کا مکلف ہے کہ اس کو خیر اختیار کرنی چاہیے اور شر سے بچنا چاہیے، اور اس کے اعمال کے اُوپر آخرت میں جزا اور سزا کا سلسلہ ہے، تو یہی مضمون جو سورۂ قیامہ کے آخر میں ذکر کیا گیا تھا یہاں بھی اسی کو ذِکر کیا گیا ہے نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔ یہ اس سورت کی ابتدا کی پچھلی سورت کے انتہا کے ساتھ مناسبت ہے۔ اور پھر جب اِس کو مکلف بنایا گیا تو آگے اس کی جزا اور سزا کا ذکر ہے۔ اور مکی سورتوں میں زیادہ تر زور اسی بات پہ دیا گیا ہے اِثباتِ آخرت، اور اِنسان کے سامنے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ خیر کا نتیجہ یہ سامنے آئے گا، شر کا نتیجہ یہ سامنے

آئے گا، اعتقادِ آخرت تمام قسم کی اچھائیوں کی بنیاد ہے، اور جب کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور میرے اعمال کا محاسبہ ہوگا، پھر وہ ہر قدم پھونک پھونک کے رکھتا ہے۔

تفسیر

اِنسان پر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ کوئی قابلِ ذِکر شئے نہیں تھا

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ: هَلْ عام طور پر تو اِستفہام کے لئے آیا کرتا ہے، لیکن بسا اوقات اِستفہام ایک ثابت شدہ حقیقت کا ہوتا ہے، اور مخاطب سے صرف اس کا اقرار ہی کروانا مقصود ہوتا ہے کہ کیا یہ بات ایسے نہیں ہے؟ جواب متعین ہوتا ہے کہ واقعی ایسے ہی ہے۔ اس لیے ایسے موقع پر یہ اِستفہام قد، تحقیق کا معنی ادا کرتا ہے، اور یہاں بھی عام طور پر مترجمین نے اس ''ھل'' کو ''قد'' کے معنی میں کیا ہے، هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ: انسان پر زمانے میں سے ایسا وقت یقیناً آیا ہے، لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا: کہ یہ کوئی قابلِ ذکر شئی نہیں تھا، اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ: بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا نطفہ سے، نطفہ فُعْلَةٌ کے وزن پر ہے، یہ لفظ بارہا آپ کے سامنے گزر گیا، ٹپکائی ہوئی بوند، نَطَفَ: ٹپکانا، اور فُعلہ مقدار کے لئے آیا کرتا ہے، جس طرح سے لَقَمَ لُقمة، اَكَلَ اُكلة، لَقَمَ: نگلنا، لُقْمَةٌ: ایک دفعہ نگلنے کی مقدار، اَكَلَ: کھانا، اُكْلَةٌ: ایک دفعہ کھانے کی مقدار، اسی طرح سے نَطَفَ ٹپکانے کو کہتے ہیں، اور نطفہ: ایک دفعہ ٹپکائی ہوئی مقدار، جس کو قطرے کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، بوند کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ اور اَمشاج کے معنی خلط ملط، یہ مَشَجٌ کی جمع ہے، یا مشیج کی جمع ہے، دونوں کی جمع ہو سکتی ہے، خلط ملط، ایسا نطفہ جو کہ مخلوط تھا، مخلوط یا تو عورت اور مرد کے پانی سے وہ مخلوط ہے، یا مخلوط کا معنی ہے کہ مختلف قسم کے عناصر سے وہ لیا گیا ہے، انسان کے اندر جو اخلاط ہیں اُن اخلاط کا نچوڑ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ ایک بوند کی شکل میں تیار کرتے ہیں اور پھر اس سے انسان کی بنیاد اُٹھاتے ہیں۔ ''وقت ایسا گزرا ہے کہ یہ کوئی قابلِ ذکر شئے نہیں تھا'' اس سے یا تو نطفے سے لے کر پیدا ہونے کے وقت تک کا زمانہ مراد ہے، کوئی پتا نہیں ہوتا کہ انسان کی بنیاد کس طرح سے اُٹھ رہی ہے، صحیح پیدا ہوگا، اپاہج پیدا ہوگا، ذہین ہوگا، کند ذہن ہوگا، بد شکل ہوگا، خوش شکل ہوگا، کیسی اس کی صلاحیتیں ہوں گی، کیسی اس کی شکل صورت ہوگی، کچھ پتا نہیں، تو کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اِبتدا میں پتا ہی نہیں ہوتا کہ بنے گا بھی یا نہیں بنے گا۔ یا نطفے کی شکل میں آنے سے قبل بھی جب یہ عناصر کی شکل میں پھیلا ہوا تھا زمین میں، چونکہ نطفہ بھی آخر غذاؤں سے اخذ کیا جاتا ہے، انسان غذا کھاتا ہے، غذا سے آگے جا کر اخلاط تیار ہوتے ہیں، اس سے نطفہ بنتا ہے، تو جیسے پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے تو یہ بے نام ونشان ہے، اللہ کے علم میں ہے کہ کہاں کہاں اس کے اجزا بکھرے ہوئے ہیں؟ اور کہاں کہاں سے اس نطفے کو اِختیار کیا جائے گا؟ انسان کو کچھ پتا نہیں ہوتا، اور آج تحقیقات کے طور پر بھی ہم نہیں بتا سکتے کہ ایک بننے والے انسان کے اَجزا کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں؟ تو یہ تو انسان کی اِبتدا ہے کہ نا قابلِ ذکر چیز تھا، پھر اس کی یوں بنیاد اُٹھائی گئی۔

اِنسان کی پیدائش کا مقصد اور اس کا نتیجہ

اور یہ بنیاد جس وقت تم اُٹھا رہے تھے تو اس وقت ہمیں کیا منظور تھا، نَّبْتَلِیْهِ: یہ حالِ مقدرہ ہے، یعنی اس وقت ہم نے یہ مقدر کر رکھا تھا کہ ہم نے اس کو آزمائش میں ڈالنا ہے، اس کی تخلیق کے وقت ہی ہمارا ارادہ اس کو اِبتلا اور آزمائش میں ڈالنے کا تھا، یہیں سے اس کی تکلیف کی اِبتدا ہوتی ہے، پیدا ہوتے ہی اس کے متعلق اللہ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہم نے آزمائش میں ڈالنا ہے، اور آزمائش میں ڈالنے کے بعد پھر اس کو یہ صلاحیتیں تو دی ہیں کہ خیر اور شر میں فرق کرے، اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ کے اندر یہی ذکر کیا ہے کہ پھر ہم نے اس کو راستہ دکھایا، آگے اس کے دو حال بن گئے کہ یا یہ شاکر ہے، یا یہ کفور ہے، شاکر کے معنی شکر گزار، اللہ کی نعمتوں کی قدر کرنے والا اور اللہ کی اطاعت کرنے والا، اور کفور کے معنی ناشکرا، اور آپ جانتے ہیں کہ کُفر سب سے بڑی ناشکری ہے، اور ایمان لانا یہ شکر کا اِبتدائی درجہ ہے، جتنا انسان شکر گزار ہوتا چلا جائے گا ایمان لانے کے بعد اللہ کی اطاعت کرتا چلا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا یا اس کے وجود کا انکار کرنا یا اس کے اَحکام کا انکار کرنا یہ انتہائی درجے کی ناشکری ہے، تو دونوں قسم کے راستے اس کے سامنے آ گئے، چاہے یہ شکر گزاری کا راستہ اختیار کرے، چاہے یہ کُفران اور ناشکری کا راستہ اختیار کرے، ہم نے اس کو آزمائش میں ڈال کے اس کے سامنے دونوں راستے واضح کر دیے، ''بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک ٹپکائے ہوئے قطرے سے'' اَمْشَاجٍ: جو مخلوط تھا، نَّبْتَلِیْهِ: اس حال میں کہ ہم اس کو آزمائش میں ڈالتے تھے، یعنی ہمارا ارادہ تھا، یہ حالِ مقدرہ ہے، اُس وقت تقدیر یہی تھی کہ ہم اِس کو آزمائش میں ڈالیں گے، ''پھر بنا دیا ہم نے اس کو سمیع وبصیر'' آزمائش میں چونکہ ڈالنا تھا اس لیے ہم نے اس کو سمیع وبصیر بنایا، سمیع کا معنی سننے والا، بصیر کا معنی دیکھنے والا، دونوں سے مراد ہے سمجھ دار، عقل مند، کیونکہ سمع وبصر یہی دو ذریعے ہیں جن کے ذریعے سے انسان معلومات حاصل کرتا ہے، معلومات حاصل کرنے کے بعد پھر عقل سے اس میں تصرف کر کے صحیح نتائج اخذ کرتا ہے، ''دانا بینا'' جس طرح سے ہم کہتے ہیں، تو اس سے مراد سمجھ دار ہے، ''ہم نے اس کو سمیع وبصیر بنایا'' اس کے کان بنائے جن کے ذریعے سے صحیح علم حاصل کر سکتا ہے، اس کو آنکھیں دیں جن کے ذریعے سے صحیح معلومات حاصل کر سکتا ہے، تو ہم نے اِس کو سننے والا بنایا اور دیکھنے والا بنایا۔

ہدایت آنے کے بعد اِنسان کی دو قسمیں

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ: بے شک ہم نے اس کو راستے کی ہدایت دی، ہم نے اس کو راستہ دکھایا، اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا: شَاكِرًا اور كَفُوْرًا یہ دونوں حال بھی ہو سکتے ہیں هَدَیْنٰهُ کی ضمیر مفعول سے، اور یہ سبیل کی صفت بھی بن سکتے ہیں، دونوں طرح سے مفسرین نے اس کی تفسیر کی ہے، ''ہم نے اس کو راستہ دکھایا اس حال میں کہ یہ شکر گزار ہے یا ناشکرا ہے'' اِنْ شَكَرَ، اِنْ كَفَرَ دونوں صورتوں میں، دونوں حالتوں میں ہم نے اس کے سامنے راستہ واضح کیا ہے، ہدایتِ طریق، هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ جس طرح سے دُوسری جگہ قرآن کریم میں ذکر کیا گیا، تو ہم نے پیدا ہونے کے بعد اس کے سامنے دونوں راستے واضح کر دیے، شکر گزار ہے تو بھی اس کے سامنے راستہ واضح ہے، اور اگر یہ ناشکری کرنا چاہتا ہے تو بھی اس کے سامنے راستہ واضح ہے، اپنے اختیار کے ساتھ جو راستہ

چاہے اختیار کر لے۔ اور اگر شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا کو سبیلاً کی صفت بنانا چاہیں تو یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا سَبِيْلًا شَاكِرًا وَّاِمَّا سَبِيْلًا كَفُوْرًا لیکن سبیل کی صفت جس وقت شاکر یا کفور کو بنائیں گے یہ بھی بحالِ متعلقہ ہے، اصل کے اعتبار سے اس راستے پہ چلنے والا شاکر یا کفور ہے، اور یہ صفت سبیل کے ساتھ لگادی گئی مجازاً، جس کو آپ صفت بحالِ متعلقہ کہہ سکتے ہیں، تو سَبِيْلًا شَاكِرًا شکر گزاری کا راستہ، یہ مفہوم ہوگا اِس کا، لیکن اصل کے اعتبار سے شکر گزار وہ ہے جو اس راستے پر چلنے والا ہے، جس راستے پر چلنے کی وجہ سے آدمی شکر گزار سمجھا جائے اس ''سبیل'' کو بھی سبیلِ شاکر کہہ سکتے ہیں، اور اصل کے اعتبار سے ناشکرا چلنے والا ہے، تو جس راستے پر چلنے کی بنا پر چلنے والے کو ناشکرا کہا جائے اس کو ناشکری کا راستہ کہتے ہیں، تو یوں بھی ترکیب کردی گئی ہے هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا سَبِيْلًا شَاكِرًا وَّاِمَّا سَبِيْلًا كَفُوْرًا۔

ناشکروں کا انجام

بنیاد واضح کردی گئی کہ انسان کو پیدا کیا گیا مکلف بنا کے، شکر گزاری اور کفران دونوں راستے اس کے سامنے واضح ہیں، اب ان دونوں راستوں میں سے جس راستے پر بھی انسان چلے اس کا انجام اس کے سامنے آجائے گا، اب آگے مضمون اسی کے متعلق ہے، اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاْ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا: یہ كَفُوْرًا کی مناسبت سے پہلے کفر کا انجام آگیا، اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ: بے شک ہم نے تیار کیا کافروں کے لئے، کافر وہی ہیں جن کو کفور کے لفظ سے ذکر کیا گیا، ناشکرے، ناقدرے، جو اللہ کی نعمتوں کی اور اللہ کے احکام کی قدر نہیں کرتے، ''ہم نے اُن کے لئے تیار کیا'' سَلٰسِلَاْ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا: سلاسل سِلْسِلَةٌ کی جمع، زنجیریں، اَغلال غُلٌّ کی جمع، گلے میں پہنانے کا طوق، جس طرح سے مجرم کو جکڑا جاتا ہے، ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگادی جاتی ہیں، پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں، زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے، یہ سَلٰسِلَاْ ہوگیا، اور گلے میں طوق ڈال دیا جاتا ہے، اور سعیر: بھڑکنے والی آگ، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو زنجیروں کے اندر جکڑ کر، جس طرح مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ذکر کیا گیا (سورۂ ابراہیم: ۴۹)، پھر ان کو آگ کے اندر ڈال دیا جائے گا، کفر کا نتیجہ تو یہ نکلنے والا ہے۔ انجام دکھایا جارہا ہے دونوں راستوں کا، کہ جس راستے پر چلو گے اس کے بعد یہ نتیجہ سامنے آئے گا۔

شکر گزاروں کے لئے کافور ملی ہوئی شراب

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ: یہ اَبرار وہی ہیں جن کو شَاكِرًا کے عنوان سے ذکر کیا گیا، جو اللہ کے قدردان ہیں، اللہ کی باتوں کے قدردان ہیں، اَحکام کے قدردان ہیں، اس کی نعمتوں کے شکر گزار ہیں، وہ ہیں اَبرار۔ ابرار یہ بَرٌّ کی جمع ہے یا بَارٌّ کی، دونوں طرح سے اس کو ذکر کیا جاتا ہے، بِرٌّ: نیکی کرنا۔ اصل کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے وفاداری، تو اللہ کے وفادار ہیں، جس قسم کا عہد اللہ کے ساتھ کیا تھا اس کو نبھاتے ہیں، وہ حقیقت کے اعتبار سے ابرار ہوتے ہیں۔ کَاْس کہتے ہیں پیالے کو، لیکن ہر پیالے کو نہیں کہتے بلکہ جامِ شراب یعنی ایسا پیالہ جو شراب کے ساتھ لبریز ہو، اس کے لئے کَاْس کا لفظ بولا جاتا ہے، كَاْسًا دِهَاقًا آگے ایک سورت کے اندر آئے گا (پ ۳۰، سورۂ نبا)، بھرپور پیالے، لبریز پیالے، ''بے شک اَبرار، نیک لوگ'' يَشْرَبُوْنَ: پئیں گے ایسے

پیالے سے کہ جس کی ملاوٹ کافور ہوگی۔ مزاج: ملونی، جو چیز کسی چیز کے ساتھ ملادی جائے۔ ''اس کی ملاوٹ کافور ہوگی''، اب جنت کی نعمتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ جو ذکر کیا کرتے ہیں تو ایسے الفاظ کے ساتھ ہی ذکر کرتے ہیں جن کو دُنیا میں رہتے ہوئے انسان سمجھتا ہے، اور یہ صرف الفاظ کی مشارکت ہوتی ہے، باقی! اس کی حقیقت اللہ جانتا ہے۔ کافور رنگ کا سفید ہوتا ہے، خوشبودار ہوتا ہے، ٹھنڈا ہوتا ہے، مفرّح ہوتا ہے، مقوّیٔ قلب ہوتا ہے، اب وہاں جو چیز اس شراب کے اندر ملائی جائے گی، جس طرح سے دُنیا کے اندر بھی شرابی شراب پیتے ہیں، تو اُس میں کسی نہ کسی چیز کی آمیزش کرتے ہیں، تو جو چیز اس میں ملائی جائے گی تو اس میں اسی طرح سے تفریح قلب بھی ہوگی، تقویت قلب بھی ہوگی، فرحت بھی ہوگی، خوش رنگ بھی ہوگی، خوشبودار بھی ہوگی، ان صفات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اُس کو سمجھانے کے لئے ہمارے سامنے کافور کا لفظ بول دیا، ورنہ دُنیا کے کافور اور آخرت کے کافور میں سوائے اسمی مشارکت کے اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے، اُس کی حقیقت اللہ جانتے ہیں کہ وہ کیسے ہوگی، بہرحال اُس میں ملاوٹ کافور کی ہوگی، کہتے ہیں کہ شراب پینے والے شراب کے اندر کسی نہ کسی چیز کو ملا کر پیا کرتے ہیں، جس طرح سے آگے بھی كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا آرہا ہے۔

نیک بندوں کے لئے چشمہ

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا: عَيْنًا کی ترکیب بھی یہاں دو طرح سے کی گئی ہے، یا تو اس کو مِنْ كَاْسٍ سے بدل بنایا گیا ہے، ''بیان القرآن'' میں یہی ترجمہ اختیار کیا گیا، پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ بے شک اَبرار پئیں گے ایسے چشمے سے، پھر یہ يَشْرَبُوْنَ کا مفعول بن جائے گا مِنْ كَاْسٍ سے بدل ہونے کی صورت میں۔ اور اس کو كَافُوْرًا سے بھی بدل بنایا گیا ہے، اس میں ملاوٹ کافور کی ہوگی اور وہ کافور ایک چشمہ ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا: ''بے شک اچھے لوگ، جو اللہ کے وفادار ہیں، اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو نبھانے والے، نیک لوگ، پئیں گے ایسے بھرپور پیالے سے جس میں ملاوٹ کافور کی ہوگی یعنی ایسے چشمے سے پئیں گے جس سے اللہ کے بندے پیتے ہیں اور اس کو جاری کرتے ہیں جاری کرنا۔ عباد اللہ، ''پئیں گے اُس سے اللہ کے بندے اور جاری کریں گے اُس کو جاری کرنا، وہ ایسا چشمہ ہے'' عباد اللہ سے اَبرار مراد ہو جائیں، اور ''جاری کرنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جدھر چاہیں گے اس کی نہر کو بہا کرلے جائیں گے، جیسے ایک تو چشمہ ہے، پھر چشمے سے مختلف نہریں جاری کرلی جاتی ہیں، تو وہ اللہ کے بندے جدھر چاہیں گے، جدھر ان کی منزل ہوگی، جدھر اُن کا ٹھکانا ہوگا، جدھر کو اس کا پانی لے جانا چاہیں گے، جس طرح سے ایک نالی نکال لی جاتی ہے، نہر کھود لی جاتی ہے تو چشمے سے اسی طرح سے اس پانی کو بہا کے لے جائیں گے...... دونوں طرح سے ترجمہ صاف ہوگیا، مِنْ كَاْسٍ سے اِس کو بدل بناؤ تو ''بے شک ابرار پئیں گے ایسے چشمے سے جس سے اللہ کے بندے پیتے ہیں، اور اس سے جاری کرتے ہیں جاری کرنا، یا جاری کریں گے جاری کرنا'' تَفْجِيْرًا مفعولِ مطلق بطورِ تاکید کے ہے۔ یا یہ بدل ''کافور'' سے ہے، تو ''کافور'' ایک چشمے کا نام ہے جس سے اللہ کے بندے پیتے ہیں اور اس کو جاری کرتے ہیں جاری کرنا، یا، پئیں گے اور جاری کریں گے جاری کرنا۔ جاری کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ چشمے سے نہر جدھر کو چاہیں گے نکال کرلے

جائیں گے، یہ نہیں کہ ان کو پانی پینے کے لئے ایک ہی جگہ آنا پڑے گا، چشمے سے نالی نکالیں گے اور جہاں جہاں ان کی منزل ہے، جدھر جدھر ٹھکانا ہے، ادھر کو بہا کے لے جائیں گے۔

نیک بندوں کی صفات: وفائے نذر، خوفِ آخرت

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ: اب یہ اَبرار کی صفت ذِکر کی جارہی ہے کہ اَبرار کون لوگ ہیں جن کی یہ جزا ذکر کی گئی؟ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا: پورا کرتے ہیں وہ نذر کو اور خوف کھاتے ہیں ایسے دِن سے جس کی بُرائی پھیلنے والی ہے، شر سے آفت اور تکلیف مراد ہے، ''پورا کرتے ہیں نذر کو'' نذر سے مراد ہے کہ اللہ کا نام لے کے اپنے اُوپر جس چیز کو لازم کر لیتے ہیں اس کو پھر پورا کرتے ہیں، اور جس وقت اپنے آپ پر لازم کی ہوئی چیز کو پورا کرتے ہیں، وفا کرتے ہیں، تو جو براہِ راست اللہ کی طرف سے لازم کیے ہوئے اَحکام ہیں ان کو تو بدرجۂ اَولیٰ پورا کریں گے۔ واجبات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو براہِ راست اللہ کی طرف سے ہم پر واجب اور لازم کر دیا گیا، جس طرح سے پانچ وقت کی نماز مثال کے طور پر، اور ایک ہے جس کو آپ نذر کے ذریعے سے واجب کرتے ہیں، آپ خود اِلتزام کر لیتے ہیں کہ اگر میرا فلاں کام ہوجائے تو میں اللہ کے لئے دس رکعت نفل پڑھوں گا، تو یہ نفل جو واجب ہوگئے یہ نذر کے ذریعے سے ہوئے ہیں، تو جب وہ اللہ کے بندے اپنے اُوپر خود اِلتزام کیے ہوئے کاموں کو نبھاتے ہیں اور پورا کرتے ہیں، تو جو براہِ راست اللہ کی طرف سے لازم کیے ہوئے ہیں ان کو تو بدرجۂ اَولیٰ نبھائیں گے (عام تفاسیر)، تو اس میں سب اَحکام آگئے...... یا نذر سے مطلقاً واجبات مراد ہیں، چاہے مِن جانب اللہ ہوں، چاہے مِن جانب العبد ہوں، ''پورا کرتے ہیں وہ واجبات کو'' جو چیز ان پہ لازم ہے اس کو وہ وفا کرتے ہیں، میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ بِرّ کے اندر وفاداری کا مفہوم ہوتا ہے، تو یُوْفُوْنَ کے اندر وہی لفظ آگیا، ''پورا کرتے ہیں وہ نذر کو، پورا کرتے ہیں واجبات کو'' وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا: یہ اُن کی بنیادی چیز ہے، ہر وقت ان کے دِل میں آخرت کا اندیشہ رہتا ہے، ''ایسے دِن سے ڈرتے ہیں کہ جس کی تکلیف عام ہوگی'' سب لوگ اس تکلیف اندر مبتلا ہوں گے، کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا، مُسْتَطِیْرًا: پھیلنے والی، عام ہونے والی، اس کی آفت عام ہوگی جو سب کو گھیر لے گی، ایسے دِن سے وہ ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔ اور یہ فکرِ آخرت ہی ہے جو اِنسان کو واجبات کے ادا کرنے کے اُوپر آمادہ کرتا ہے، اور اللہ کی اطاعت کے لئے اس میں حوصلہ پیدا کرتا ہے، یہ فکرِ آخرت ہے، تو اَبرار کی خاص صفت یہ ہے کہ ایسے دِن سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔

یتیم، مسکین اور قیدیوں کو اللہ کے لئے کھانا کھلانا

یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ: اور وہ کھلاتے ہیں کھانا، عَلٰی حُبِّہٖ: حُبِّہٖ کی ضمیر کے مرجع بھی دو ہو سکتے ہیں، یا تو ''اللہ'' کی طرف یہ ضمیر لوٹتی ہے، ''اللہ کی محبت کی بنا پر'' یعنی ان کے سامنے کوئی دُنیوی غرض نہیں، اللہ کی محبت کی بنا پر وہ کھانا کھلاتے ہیں مسکین کو، یتیم کو، اَسیر کو۔ قیدی ہے، محتاج ہے، اس کو بھی مدد دیتے ہیں، یتیم ہے، اس کی سرپرستی کرتے ہیں، مسکین کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اور کرتے ہیں محض اللہ کی محبت کی بنا پر، اللہ سے اُن کو محبت ہے، اس لیے اللہ کے اَحکام مانتے ہیں، اس طرح سے جس طرح سے ایک عاشق معشوق کے اَحکام مانا کرتا ہے، مزے لیتے لیتے محب محبوب کے اَحکام کی جس طرح سے تکمیل کرتا ہے، اس طرح سے یہ خلوص

کے ساتھ اور محبت کے ساتھ کھانا کھلاتے ہیں، اور کوئی دُنیوی غرض سامنے نہیں ہوتی سوائے اپنے محبوب کی رضا کے، اگر ''اللہ'' کی طرف ضمیر لوٹائیں گے تو اس کا مفہوم یوں ہوگا...... اور حُبِّہٖ کی ضمیر ''طعام'' کی طرف بھی لوٹائی گئی ہے کہ باوجود اس بات کے کہ خود کھانے کی خواہش ہوتی ہے، خود کھانے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن کوئی مسکین سامنے آجائے، کوئی یتیم آجائے، کوئی قیدی کی ضرورت سامنے آجائے، تو وہ اپنی حاجت کو چھوڑ کر اُن کو ترجیح دیتے ہیں اور انہیں کھانا کھلاتے ہیں، باوجود اس بات کے کہ اپنے دِل میں اس کھانے کی خواہش ہوتی ہے اور کھانے کی محبت ہوتی ہے۔ اس مضمون کو آپ کے سامنے سورۂ حشر میں یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ کے تحت ذِکر کیا گیا تھا۔ دونوں طرح سے ضمیر کا مرجع واضح ہوجاتا ہے۔ ''کھلاتے ہیں وہ کھانا باوجود اس کھانے کی محبت کے مسکین کو یتیم کو اور قیدی کو، یا، کھلاتے ہیں کھانا اللہ کی محبت کی بنا پر۔''

نیکی کے وقت اَبرار کا جذبۂ اِخلاص

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ: عَلٰی حُبِّهٖ کی ضمیر جب ''اللہ'' کی طرف لوٹی تو جس خلوص کی طرف اشارہ عَلٰی حُبِّهٖ میں نکل رہا ہے اسی کی آگے وضاحت ہے، کہ کھلاتے ہیں یا باوجود اپنے محتاج ہونے کو ان کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن پھر احسان کوئی نہیں جتلاتے، اور ان کے دِل میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ ہم اگر تمہیں کھلا رہے ہیں تو اللہ کی رضا کے لئے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی شکرگزاری چاہتے ہیں نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں، ان کے دل میں یہ جذبہ ہوتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ جس کو کھلایا جائے تو اس کے منہ پہ کہہ بھی دیا جائے کہ ہم تجھ سے جزا نہیں چاہتے، شکرگزاری نہیں چاہتے، یہ ان کے باطن کے جذبے کی ایک تعبیر ہے، کہ جب وہ کھلا رہے ہوتے ہیں، کھانے کو دے رہے ہوتے ہیں، تو اُن کے دِل میں یہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص ہماری شکرگزاری کرے، شکریہ ادا کرے، یا ہمارے اِس کھلانے کا دوسرے وقت میں ہمیں بدلہ دے، نہیں! اُن کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی رضا کے لئے کر رہے ہیں، بدلہ ہمیں اللہ دے گا، ہم مخلوق سے اس کا اجر نہیں چاہتے، یہ اُن اَبرار کے دِل کی کیفیت ہے جس کو یہاں ذِکر کیا گیا ہے، یعنی یہ کہتے ہوئے، یہ جذبہ رکھتے ہوئے کھلاتے ہیں کہ سوائے اس کے نہیں کہ کھلاتے ہیں ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لئے، لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا: نہ ہم تم سے جزا چاہتے ہیں نہ شکرگزاری چاہتے ہیں۔

اَبرار کی صفات ذِکر کرنے کا مقصد

اگرچہ اَبرار کا ذِکر بطور صفت کے آرہا ہے، لیکن یہ قرآنِ کریم کا ایک طرز ہے کہ جب نیکوں کی تعریف کرتا ہے تو اس کے ضمن میں نیکی کا معیار بتلاتا ہے، کہ اگر کوئی شخص اَبرار میں داخل ہونا چاہے تو اس کی یہ صفات ہونی چاہئیں، یہ اس کے جذبات ہونے چاہئیں، ساتھ ساتھ یہ چیز خود سمجھ میں آتی جاتی ہے۔ بُروں کی جس وقت بُرائی بیان کی جائے گی کہ کافر ایسے ہیں، مشرک ایسے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اِس گروہ میں شامل نہیں ہونا چاہتا تو اس کو اِن صفتوں سے بچنا چاہیے، جو یہ صفتیں اپنائے گا وہ ان میں شامل ہوجائے گا۔ تو جب اَبرار کے سامنے اچھا نتیجہ آنے والا ہے، تو اَبرار میں شامل ہونے کا آپ کو شوق ہوگا، تو ان کی صفات آپ کو بتائی جارہی ہیں کہ اَبرار ایسے ہوتے ہیں، اگر آپ یہ جذبات اپنالیں گے، یہ کردار اپنالیں گے،

مخلوق پر آپ کی یہ شفقت ہوگی، اللہ کی محبت آپ کے دل میں ہوگی، تو آپ اَبرار میں شامل ہو جائیں گے، یہی نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا۔ اور مخلوق پر اِحسان کرتے ہوئے اللہ کی رضا مطلوب ہونی چاہیے، احسان جتلایا نہ جائے، اور ان کی طرف سے کسی قسم کی شکرگزاری کا مطالبہ نہ ہو۔

قیامت کے دِن ہر کوئی دُوسرے کے لئے تُرش رُو ہوگا

اور پھر ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا: اصل بنیاد یہی ہے جیسے بار بار آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ ہر وقت آخرت ان کے سامنے رہتی ہے، جس کی بنا پر ان کی ہر نیکی کے اندر خلوص پیدا ہو جاتا ہے، ''بے شک ہم اندیشہ کرتے ہیں اپنے رَبّ کی طرف سے'' يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا: عبوس یہ لفظ عَبَسَ سے لیا گیا ہے جو ابھی آپ کے سامنے سورۂ مدثر میں گزرا تھا عَبَسَ وَبَسَرَ، اور آگے بھی آرہا ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰی، عَبَسَ کا معنی ہوتا ہے منہ بنالینا، چہرے کے اُوپر جس طرح سے ایک اُکتاہٹ کے اور نفرت کے سے آثار آجاتے ہیں، اس کو عَبَسَ سے تعبیر کیا جاتا ہے، عبوس کہتے ہیں تُرش رُو انسان کو، جس کے چہرے کے اُوپر کوئی بشارت نہیں، بشاشت نہیں، اور کسی دُوسرے اِنسان کے سامنے آتا ہے تو بڑا اکڑا ہوا، عبوس اُسے کہا جاتا ہے، اور قمطریر اسی مفہوم کی تاکید ہے، عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا دونوں کا مفہوم ایک ہے، دوسرا لفظ پہلے کی تاکید ہے، اور یہاں یوم کی صفت آرہی ہے عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا، جو بہت تُرش رُو اور بہت سخت مزاج دِن ہوگا، اور یہ یوم کی صفت ''لا'' کے یہی بتایا جارہا ہے کہ ہر شخص اس دِن دُوسرے کے حق میں عبوس قمطریر ہوگا، کوئی کسی کے ساتھ خوشی سے پیش نہیں آئے گا کہ کسی سے ہمدردی کرے، خیرخواہی کرے، اپنی نیکیاں دُوسرے کو دے کے چھڑالے، کسی کی بُرائی کے بدلے میں اپنے آپ کو پھنسالے، جس طرح سے دُنیا کے اندر خوش اخلاق انسان مروّت کیا کرتے ہیں، اپنی ضرورتوں کو حذف کر کے دوسروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں، دوسرے کی تکلیف اور مصیبت کو اپنے سر لے لیتے ہیں، غمی کے اندر خوشی میں شریک ہوتے ہیں، وہاں ہر کوئی ایک دوسرے کے حق میں عبوس قمطریر ہوگا، ہر کوئی دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں اس کی وجہ سے میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں، تو یہ چونکہ عام طور پر افراد کی صفت ہوگی کہ ایک دوسرے کے بارے میں عبوس قمطریر ہوں گے، تو اس کو یوم کی صفت کے طور پر ہی ظاہر کر دیا گیا گویا کہ وہ دِن ہی تُرش رُو ہے، اُس دِن میں ہر چہرہ تُرش ہوگا ایک دُوسرے کے حق میں، کوئی کسی کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آئے گا، کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوگا، جس طرح سے قرآنِ کریم کے اندر بہت ساری آیات میں یہ کیفیات بیان کردی گئی ہیں، ''بے شک ہم ڈرتے ہیں اپنے رَبّ کی طرف سے ایسے دِن سے جو کہ بہت تُرش رُو اور بہت سخت ہوگا'' قمطریر یہ عبوس کی تاکید ہے۔ یہ اُن کو اندیشہ رہتا تھا، اور یہ اُن کا کردار تھا جو پیچھے ذِکر کر دیا گیا کہ اللہ کے واجبات کو بھی ادا کرتے ہیں، مخلوق کے ساتھ بھی احسان سے پیش آتے ہیں اور خلوص کے ساتھ، آخرت کا اندیشہ رکھتے ہوئے۔

قیامت کے دِن اَبرار کے لئے اِنعامات

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ: جب دُنیا کے اندر انہوں نے اِس چیز کا اندیشہ رکھا تو اللہ تعالیٰ نے اُس دِن کی خرابی سے،

بُرائی سے، سختی سے اُن کو بچالیا، ماضی کے ساتھ تعبیر کیا جارہا ہے تحقق وقوع کے طور پر، گویا کہ جب یہ واقعہ پیش آگیا تو وہ بھی پیش آہی گیا ہے، "پس بچالیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے اُس دِن کی سختی سے، اس دِن کی بُرائی سے" وَلَقّٰہُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا: وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ یہ ابھی آپ کے سامنے سورۂ قیامہ میں لفظ آیا تھا۔ نضرۃ: تروتازگی۔ سرور: خوشی۔ "اور دی اللہ نے انہیں تروتازگی اور خوشی" دِل میں خوشی ہوگی، چہرے پر تروتازگی ہوگی، تو معلوم ہوگیا کہ یہ عبوست کافروں، فاسقوں پر ہوگی جن کے سامنے کسی اچھے انجام کی بشارت نہیں ہے، اور جب مؤمنین کو اللہ تعالیٰ اس دِن کی سختی سے بچائے گا، اچھا انجام ان کے سامنے آجائے گا، تو ان کے چہرے کھل جائیں گے، دِل میں سُرور ہوگا، چہرے پر تروتازگی ہوگی، "اللہ تعالیٰ دے گا اُنہیں تروتازگی اور خوشی۔"

جنّت میں اَبرار کے لئے اِنعامات

وَجَزٰىہُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِيْرًا: اور اللہ نے ان کو بدلہ دیا (ماضی کے طور پر، تحقق وقوع کے لئے ماضی آگئی، ورنہ ترجمہ وہی مضارع کے ساتھ ہوگا جیسے "وَقٰی" میں کیا ہے) "بدلہ دے گا اللہ تعالیٰ ان کو ان کے صبر کے سبب سے جنّت اور ریشم" مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْہَا عَلَى الْاَرَآئِكِ: ٹیک لگانے والے ہوں گے اُس جنّت میں تختوں پر، آرائك اریکہ کی جمع ہے، مزین تخت، جس طرح سے ایک تخت بچھالیا جاتا ہے، اس کے اُوپر گدے بچھا کر اچھی طرح سے اس کو مزین کرلیا جاتا ہے، تو مزین تختوں کے اُوپر ٹیک لگانے والے ہوں گے، لَا يَرَوْنَ فِيْہَا شَمْسًا وَّلَا زَمْہَرِيْرًا: نہیں دیکھیں گے وہ اُس جنّت میں سورج اور نہ سردی، زمھریر سردی کو کہتے ہیں، اور شمس: سورج، سورج بول کر گرمی اور دُھوپ مراد ہے، گرمی اور دُھوپ تک اُن کو نہیں پہنچے گی، اور نہ ایسی سردی ہوگی جو کہ باعث تکلیف ہو۔

"صبر" کسے کہتے ہیں؟

"صبر کے سبب سے اللہ نے ان کو جزادی" صبر کا اصل مفہوم یہی ہے اپنی خواہشات کو دبالینا، حبس نفس کے ساتھ جس وقت آپ اس کو تعبیر کرتے ہیں حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَكْرَہُ جو چیز نفس کو ناگوار ہے اُس ناگواری کے اُوپر اپنے نفس کو پابند کرلیا جائے یہ ہے اصل کے اعتبار سے صفت صبر والی، اور یہ خلق ایک بہت بڑا جامع خلق ہے، نیکی کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی، آپ طبیعت کے خلاف اس نیکی پہ پابند ہوجایئے یہ صبر علی الطاعۃ ہے، اور بُرائی چھوڑنے کو دِل نہیں چاہتا تو اپنی طبعی خواہش کے خلاف اس بُرائی کو چھوڑ دیجئے، اس کے قریب نہ جایئے یہ صبر عن المعصیۃ ہے، اور کوئی تکلیف اور مصیبت اپنی مرضی کے خلاف کوئی واقعہ پیش آجائے تو چیخنے کو، چلانے کو، شکوہ شکایت کرنے کو، آہ وزاری کرنے کو دِل چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سنبھال لیجئے، یہ صبر علی المصیبۃ ہے۔ تو اَبرار وہی ہیں جو کہ صابر ہیں، جنہوں نے اپنی خواہشات کو مٹالیا، اللہ کے اَحکام کے تابع ہوگئے، نیکی کا وقت آتا ہے تو چاہے ناگوار گزرے لیکن نیکی کرتے ہیں، بُرائی کی طرف نفس راغب ہوتا ہے، رُکنا ناگوار ہوتا ہے لیکن وہ رُکتے ہیں، اور اللہ کے راستے میں اللہ کی طرف سے کوئی خلاف طبیعت واقعہ پیش آجائے، مصیبت آجائے، تکلیف آجائے تو اس کو سہہ جاتے ہیں، جو لوگ یہ صفت اپناتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی اِس صفت کے بدلے میں ان کو جزا دے گا ان کے صبر کرنے کے سبب

سے، اور اِنسان نیک بنتا ہی نہیں جس وقت تک کہ صبر والاخلق نہ آئے، یہ تینں ہی تو چیزیں ہیں جن کے اندر پختگی پیدا ہونے کے بعد انسان نیک کہلانے کا حق دار ہے، گناہ سے بچے، نیکی کرے اور مصیبت کو بھی اللہ کی رضا کے مطابق سہہ جائے اور برداشت کر جائے، یہ نہیں کہ ذرا سا بخار ہو گیا تو۔ نعوذ باللہ۔ اللہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دے، اور اس طرح سے شکوہ شکایت کرے جیسے دُنیا کے اندر اللہ نے کوئی احسان کیا ہی نہیں، اس کے اُوپر صرف مصیبت تھی جو اس پہ ڈالی ہے، ایسی بات نہیں ہونی چاہیے، تو نیکی کا معیار یہی ہے، صبر بنیاد ہے ہر قسم کی اچھائی کی۔

جنت میں روٹی، کپڑا، مکان

''ان کے صبر کرنے کے سبب سے اللہ نے ان کو بدلہ دیا جنت، باغ'' یہ تو ہو گئی رہائش گاہ، یہ تو مکان مل گیا، اور حریر یہ آپ کو لباس مل گیا، اور ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا یہ کھانے پینے کے لئے میوے مل گئے، تو روٹی کپڑا مکان تینوں قسم کا انتظام ہو گیا، یہی ہے جس کے لئے انسان مرتا ہے، ساری کوشش کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حسبِ منشا ان چیزوں کا انتظام ہو گا، دُنیا کے اندر صبر اِختیار کرو، اللہ کی رضا کے مطابق چلو۔ ورنہ دُنیا کے اندر اِنسان صبح سے لے کر شام تک کھپتا ہے، شام کو جس وقت بیٹھ کے سوچتا ہے تو اس کے منہ پہ یہی ہوتا ہے کہ ضرورتیں پوری نہیں، روٹی، کپڑا، مکان پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا، تو یہ اگر پورا کامل مکمل طریقے سے انتظام ہو گا تو اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کے بعد جنت میں ہو گا، یہ تینوں چیزیں اس کی واضح ہو گئیں، باغ ملیں گے، پہننے کے لئے ریشم ہو گا، اور پھر بیٹھنے اُٹھنے کے لئے مزین تخت ہوں گے، موسم سازگار ہو گا، نہ گرم نہ دُھوپ اور نہ زیادہ ٹھنڈا، اور سائے قریب قریب ہوں گے جس طرح سے جھکی ہوئی شاخیں ہوتی ہیں اور ان کا سایہ فرحت بخش ہوتا ہے، ''اور مسخر کر دیے جائیں گے ان کے پھل مسخر کرنا'' یعنی کھانے والوں کے تابع ہوں گے، جیسے چاہیں گے کھائیں گے، جس وقت چاہیں گے توڑیں گے، کوئی کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں ہو گی، مرضی کے مطابق ملیں گے۔

جنت کی نعمتوں کی دُنیا کی نعمتوں کے ساتھ صرف لفظی مشارکت ہے

یہ بھی میں عرض کر دوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں یہ اُس وقت کی لوگوں کے سامنے جو خوش حال ترین زندگی ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہیں، ورنہ یہاں بھی صرف لفظی مشارکت ہے، یعنی اُس زمانے میں جو قیصر و کسریٰ تھے، جو سب سے بڑے سمجھے جاتے تھے، دُنیا کے اندر ان کو بادشاہتیں حاصل تھیں، جس قسم کی عیش وعشرت ان کی زندگی میں تھی اور جس کے قسم الفاظ سے لوگ مانوس تھے اسی قسم کا نقشہ اللہ تعالیٰ دِکھاتے ہیں کہ کامل طریقے سے یہ چیزیں جنت میں جا کر ملیں گی، ورنہ وہاں تخت کیسے ہوں گے، دُنیا میں تخت کس طرح کے ہوتے ہیں، اور وہاں کا سایہ کیسا ہو گا، اور وہاں پھل کس طرح سے جھکے ہوئے ہوں گے، پھل کیسے ہوں گے، یہ جس وقت جائیں گے اسی وقت ہی دیکھیں گے، صحیح کیفیت ان کی اسی وقت ہی سمجھ میں آئے گی، یہ ایک تمثیل ہے جس کے ساتھ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دُنیا میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عیش اور زیب وزینت کا تصور جو آپ کر سکتے ہیں

اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے یہ واضح کرتے ہیں کہ جنت میں یہ سب کچھ ہوگا، دُنیا کے اندر تو رہتے ہوئے ہر شخص وہ مرتبہ حاصل نہیں کرسکتا جو اِنسان سمجھتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ خوش حال ہے، لیکن اگر نیکی کے راستے پہ چلو گے تو اللہ تعالیٰ انتہائی درجے کی خوش حالی جس سے زیادہ آپ سوچ بھی نہیں سکیں گے، اس قسم کی خوش حالی اللہ تبارک وتعالیٰ دیں گے، تو یہ الفاظ ہیں، ریشم، دُنیا میں بھی ریشم ہے، آخرت میں بھی ریشم ہوگا، لیکن حقیقت کے اعتبار سے آپس میں کوئی نسبت نہیں ہوگی۔ ''ٹیک لگا کے بیٹھنے والے ہوں اُس باغ میں مزین تختوں پر، نہیں دیکھیں گے اُس کے اندر دُھوپ اور نہ سردی'' شمس سورج کو کہتے ہیں، یہاں گرمی اور دُھوپ مراد ہے جو باعثِ تکلیف ہو، اور زمھریر سے سردی مراد ہے، ''قریب ہونے والے ہوں گے اُن کے اُوپر اُس جنت کے سائے'' یعنی درخت گھنے ہوں گے، شاخیں جھکی ہوئی ہوں گی، سائے قریب ہوں گے، ذُلِّلَتْ یہ تذلیل سے ہے هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا (سورۂ ملک:۱۵)، لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ (سورۂ بقرہ:۷۱)، اسی طرح فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (سورۂ نحل:۶۹) وہ سب اسی مادّے سے ہیں، تذلیل تابع کرنے کو کہتے ہیں، ''تابع کردیے جائیں گے ان کے لئے پھل تابع کرنا'' تابع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے چاہیں گے ویسے ملیں گے، جب چاہیں گے اسی وقت ملیں گے، کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی ان کے حاصل کرنے میں، بالکل اُن کے مطیع کردیے جائیں گے۔

جنت کے برتن

وَیُطَافُ عَلَیْهِمْ بِاٰنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ: یہ گھر کا سامان، جس طرح سے برتن وغیرہ ہوا کرتے ہیں، ''گھمائے جائیں گے ان کے اُوپر'' یعنی خادم لیے لیے پھریں گے، ''گھمائے جائیں گے ان کے اُوپر آنیہ چاندی کے'' آنیہ برتن کو کہتے ہیں، وَّاَكْوَابٍ: اکواب یہ کُوب کی جمع ہے، کوب: گلاس جس میں ٹونٹی بھی نہیں ہوتی اور دستہ بھی نہیں ہوتا، ہم اس کو ''گلاس'' ہی کہتے ہیں، عام طور پر اس کا ترجمہ ''آب خورے'' کے ساتھ کردیا جاتا ہے، آبخورہ: پانی پینے کا برتن، ہمارے ہاں اگرچہ اس کی شکلیں مختلف ادوار میں مختلف ہوتی ہیں لیکن گلاس کے ساتھ ہی آج ہم اس کو تعبیر کرتے ہیں، ''برتن چاندی کے اور آب خورے'' كَانَتْ قَوَارِیْرَا: جو شیشہ ہوں گے، قواریر: قارورہ کی جمع ہے، قارورہ شیشے کو کہتے ہیں، قَوَارِیْرَا مِنْ فِضَّةٍ: وہ شیشہ چاندی سے ہوگا، یہ آپ نے ''نُور الانوار'' میں پڑھا، اس آیت کو خفی کی قسم مشکل میں داخل کیا گیا ہے، کہ شیشہ چاندی سے بنا ہوا ہوگا، دُنیا کے اندر اصل میں چاندی ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں سفیدی ہے لیکن وہ شفاف نہیں ہوتی کہ نظر آر پار ہوجائے، اور شیشہ شفاف ہے کہ اس میں سے نظر آر پار ہوجاتی ہے لیکن اس میں چاندی جیسی سفیدی نہیں ہوتی، اب یہ چاندی جیسا سفید ہو اور شفاف ہو کہ نظر آر پار ہوجائے، عام طور پر اس قسم کا شیشہ دیکھنے میں نہیں آتا، تو وہ برتن اتنے صاف ستھرے ہوں گے کہ سفیدی میں چاندی جیسے ہوں گے لیکن ہوں گے شفاف، تو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار ذکر کردیا گیا، جیسے آج بھی شیشے کے درجات مختلف ہیں، بعض شیشے میلے سے ہوتے ہیں، ان میں کوئی خوبصورتی نہیں ہوتی، اور بعض شیشے بہت صاف ستھرے ہوتے ہیں، ان کا برتن خوبصورت لگتا ہے، تو آخرت میں جو آپ

کے سامنے برتن لائے جائیں گے، گلاس لائے جائیں گے، وہ ہوں گے شیشے کے، شیشہ چاندی کا، یعنی اس میں دونوں صفتیں ہوں گی، چاندی والی بھی اور شیشے والی بھی، چاندی کی صفت یہ ہے کہ وہ سفید ہوتی ہے، اور شیشے کی صفت یہ ہے کہ شفاف ہوتا ہے، دونوں صفتوں کے وہ جامع ہوں گے۔

خدام ہر چیز موقع محل کے مطابق پیش کریں گے

قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا: قَدَّرُوْ کی ضمیر لوٹ رہی ہے ان خدام کی طرف جو یُطَافُ عَلَیْهِمْ کے اندر مذکور ہیں، گھمائے جائیں گے ان کے اُوپر، پھیرے جائیں گے، یعنی پھیرنے والے پھیریں گے، آگے جس طرح سے ''وِلْدَان'' کا ذکر بھی آ رہا ہے، ''اندازہ کیا ہوگا اُنہوں نے اُن برتنوں کا اندازہ کرنا'' اندازے کے مفہوم میں یہ بات بھی ہے کہ بڑے چھوٹے ہونے کے اعتبار سے ایک مناسب اندازہ ہوگا، اور جب اس میں کھانا یا پینا لائیں گے تو ایک مناسب اندازے سے لائیں گے، جس طرح سے جنتی کی خواہش ہوگی، ہر چیز اس میں متناسب ہوگی، کوئی چیز غیر متناسب نہیں ہوگی، اور تناسب ہی اصل میں مجلس میں، محفل میں، ہر چیز کے اندر حسن پیدا کرتا ہے، اب کھانے کے لئے بیٹھیں، کھانے والا آدمی ایک ہو مثال کے طور پر، اور اس کے سامنے اتنا بڑا تھال بھر کے رکھ دیا جائے یہ غیر متناسب ہے، اور کتنے سارے بیٹھے ہوئے ہوں اکٹھے کھانے کے لئے تو اتنے چھوٹے سے برتن میں کھانا لا کر رکھ دیں تو یہ غیر متناسب ہے، تو جیسی مجلس ہو اور جس قسم کا موقع ہو اسی کے مناسب انہوں نے اندازے کیے ہوں گے، کہ اس وقت کیسے برتن چاہئیں؟ کیسا مشروب چاہیے؟ کیسا کھانا چاہیے؟ کتنی مقدار میں چاہیے؟ ہر چیز وہاں فرحت بخش ہوگی، کوئی چیز بھی انسان کے لئے نامناسب یا ناگواری کا باعث نہیں ہوگی، قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا کے اندر یہ مفہوم ذکر کر دیا گیا، اب اعلیٰ سے اعلیٰ دعوت، اعلیٰ سے اعلیٰ محفل جو بھی آپ سوچ سکیں دُنیا کے اندر، مہذب ترین، اس میں جو نقشہ آپ سوچ سکتے ہیں اس سے بھی بڑھ کر نقشہ ہوگا جنتیوں کے جنت کے اندر رہنے کا۔

جنت کا جام

وَیُسْقَوْنَ فِیْهَا كَاْسًا: پلائے جائیں گے وہ جنت کے اندر پیالہ۔ کاْس: جیسے پیچھے مِنْ كَاْسٍ آیا تھا، كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا: زنجبیل اصل کے اعتبار سے دُنیا کے اندر تو ''سونٹھ'' کو کہتے ہیں، ''سونٹھ'' آپ نے دیکھی ہوگی، سوکھا ہوا اُدرک، اور ہو سکتا ہے کہ شراب کے اندر کچھ اس قسم کی آمیزش بھی کرتے ہوں گے جو ذائقے میں تیزی پیدا کرنے کے لئے یا حرارت بڑھانے کے لئے ہو، تو یہ بھی جس طرح پیچھے کافور آیا تھا، اس میں ٹھنڈک تھی، تو زنجبیل کے اندر حرارت کی تیزی ہوتی ہے، تو دُنیا کے اندر رہتے ہوئے جیسے مختلف چیزیں شراب میں، مختلف ذائقوں کے لئے، مختلف فوائد کے تحت ملائی جاتی ہیں، تو وہاں بھی اسی طرح سے مختلف چیزیں ہوں گی، یہ بھی صرف اسمی مشارکت ہے۔ عَیْنًا فِیْهَا تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا: یہاں بھی اسی طرح سے دونوں ترکیبیں ہیں، یا تو ''زنجبیل ایک چشمہ ہے جس کا نام رکھا جاتا ہے سلسبیل''، یا یہ كَاْسًا سے بدل ہے ''پلائے جائیں گے وہ ایسے چشمے سے جو جنت میں ہوگا، نام رکھا جاتا ہے سلسبیل'' دونوں طرح سے ترجمہ یہاں بھی ہو جائے گا۔

جنّت کے خادم

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ: اب یہ خدّام کا ذکر آ گیا جو وہاں خدمت کے لئے ملیں گے، تو خادم جو ہے وہ بھی فرحت بخش ہونا چاہیے، خدمت کے اندر جو چیزیں ہوا کرتی ہیں کہ خادم مزاج شناس ہو، چست چالاک ہو، اور چلتا پھرتا اچھا بھی لگے، اور اس کو خدمت کا سلیقہ ہو، یہ چیزیں اگر ہوں تو پھر خدمت طبیعت کے لئے فرحت بخش ہوتی ہے، اور اگر خادم ایسا دے دیا جائے کہ جس کی شکل دیکھ کے انسان کو متلی شروع ہو جائے، تو پھر وہ کوئی کھانے پینے کی چیز اُٹھا کر بھی لائے گا، کپڑے گندے ہوں، ناک ٹپک رہی ہو، ہاتھ اس کے میلے ہوں، تو کیا ایسے شخص کے ہاتھ سے لے کر کھانا کوئی خوشی کا باعث ہوتا ہے؟ یا اس طرح سے بوڑھا ہو کہ آپ اس سے پانی مانگیں اور وہ اُٹھتا اُٹھتا ہی گھنٹہ لگا دے گھٹنے سیدھے کرتے کرتے، وہ جا ہی نہ سکے، حرکت ہی نہ کر سکے، یا اس قسم کا بے سمجھ ہو کہ آپ کہیں کچھ اور وہ کرے کچھ، ایسی بات نہیں، وہاں جو خدّام دیے جائیں گے ہر لحاظ سے فرحت بخش ہوں گے، چلتے پھرتے یوں لگیں گے گویا کہ موتی بکھرے ہوئے ہیں، اور ان کو سلیقہ اس قسم کا ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو پیدا ہی اس کام کے لئے کیا ہوگا، اور ہمیشہ وہ ایک ہی ہیئت اور کیفیت پر رہیں گے، یہ نہیں کہ خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہو جائیں پھر وہ کام کے نہ رہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ تو جس طرح سے حوریں ایک مستقل مخلوق ہے جنّت میں، اسی طرح سے غلمان، وِلدان یہ بھی (ایک قول کے مطابق) ایک مستقل مخلوق ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ جنتیوں کی خدمت کے لئے پیدا فرمائیں گے (مظہری، نسفی)، وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ: گھومیں گے ان کے اُوپر، چکر لگائیں گے ان کے اُوپر بچے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے، یعنی وہ بڑھ کے بوڑھے نہیں ہوں گے، مخلدون ہوں گے، إِذَا رَأَيْتَهُمْ: ایسے صاف ستھرے ہوں گے کہ جب تو انہیں دیکھے گا حَسِبْتَهُمْ: تو تُو انہیں سمجھے گا، لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا: بکھیرے ہوئے موتی، جس طرح سے کسی میدان میں موتی بکھیر دیے جائیں تو بکھرے ہوئے اچھے لگتے ہیں، تو وہ بھی چلتے پھرتے اسی طرح سے اچھے لگیں گے جیسے موتی بکھیرے ہوئے ہیں۔ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا: یہ اِجمال کر دیا کہ کہاں تک ان کی نعمتیں تمہیں بتائی جائیں، ''جب تُو دیکھے گا تُو دیکھے گا وہاں خوش حالی اور ایک مُلکِ عظیم'' بہت بڑی سلطنت، مُلکِ عظیم اور خوش حالی، جدھر دیکھو بس یہی چیز نظر آئے گی، بڑی بادشاہی حاصل ہوگی جنتیوں کو، بہت خوش حالی حاصل ہوگی، جدھر آنکھ اُٹھاؤ گے خوش حالی ہی خوش حالی ہوگی۔

جنّت کا لباس اور زیور

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ: جیسے پیچھے حریر کا ذکر آیا تھا یہ اُسی کی کچھ تفصیل ہے، عٰلِيَهُمْ: فَوْقَهُمْ کے معنی میں، ''ان جنتیوں پر کپڑے ہوں گے سندس کے سبز'' خُضْرٌ یہ ثِيَابُ کی صفت ہے، ثِيَابُ سُندُسٍ نکرہ کی اضافت نکرہ کی طرف ہو تو اس میں معرفہ والا معنی نہیں پیدا ہوا کرتا، اس لیے خُضْرٌ صفت جو نکرہ آ رہی ہے وہ ٹھیک ہے۔ سندس اور استبرق یہ دونوں ریشم کی قسم ہیں،

استبرق ہوتا ہے موٹا ریشم، سندس ہوتا ہے باریک ریشم، مختلف موسموں کے لحاظ سے لوگ کبھی موٹا پہنتے ہیں کبھی باریک پہنتے ہیں، اور خضر سبز ہوگیا، ''ان کے اُوپر سبز کپڑے ہوں گے باریک ریشم کے اور موٹے ریشم کے'' وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ: اور پہنائے جائیں گے وہ کنگن چاندی کے، اَسَاوِرَ اَسْوِرَةٌ کی جمع ہے، اور اَسْوِرَةٌ سِوارٌ کی جمع، کنگن۔

جنّت کی نعمتوں کو اپنے ماحول پر قیاس نہ کریں

یہ بھی آج آپ کو اپنے ماحول کے اندر یہ کنگن کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی کہ مرد کنگن پہنیں، لیکن یہ چیز بھی ماحول اور علاقے کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتی ہے، اب آپ گھڑی باندھے ہوئے ہیں تو یہ خوبصورتی کا باعث ہے، اور جس ماحول کے اندر یہ گھڑی نہیں پہنچی جاتی ہوگی وہاں اگر کوئی بتائے کہ مرد اس طرح سے اسٹیل کی بنی ہوئی چیز کو پہنتے ہیں، تو ان کو سمجھ میں نہیں آتا ہوگا کہ یہ کیا خوبصورت لگے گی؟ اور آج بھی بعض قومیں ایسی ہیں کہ جس وقت وہ بیاہ شادی کے لئے جاتی ہیں تو دلہا کے گلے کے اندر سونے کا زیور ڈالتے ہیں، مختلف علاقوں کے مختلف رواج ہیں، یہ خانہ بدوش لوگ جن کو ''اوڈ'' کہا جاتا ہے اِن کی عورتوں کو دیکھا کرو، انہوں نے اپنی چاندی کتنی چڑھا رکھی ہوتی ہے، پاؤں سے لے کر گھٹنے تک جکڑی ہوئی ہوں گی، یہاں سے لے کر یہاں تک بازو بھرے ہوئے ہوں گے، کان اتنے بھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ دوہرے ہوئے جارہے ہوتے ہیں وزن سے، ان کے نزدیک یہ خوبصورتی ہے، ہمیں دیکھ کے ویسے ہی اپنے دل پہ بوجھ معلوم ہونے لگ جاتا ہے کہ یہ اتنا بوجھ کہاں سے اُٹھائے پھر رہی ہیں۔ اور پٹھانوں کے کپڑے دیکھ لیجئے، خاص طور پر عورتوں کے، گرمی کے موسم میں بھی کس قسم کے پہنے ہوئے ہوتے ہیں، تو ان کے لئے وہی خوبصورتی ہے، اور ہمیں وہ عجیب سے لگتے ہیں۔ تو ماحول کے اعتبار سے حالت بدل جایا کرتی ہے، اُس زمانے میں بادشاہ اور بڑے بڑے رُؤساء جو تھے وہ سونے چاندی کے کنگن پہنا کرتے تھے، اس لیے قرآنِ کریم ذکر کرتا ہے کہ جنّت کے اندر بھی اسی طرح سے ہے، یعنی خوش حال سے خوش حال طبقے کو سامنے رکھ کر جو نعمتیں انسان تصور کرسکتا ہے، تو اسی قسم کے الفاظ کے تحت جنّت کی نعمتیں سمجھائی جارہی ہیں۔ یہاں چاندی کے زیورات کا ذکر ہے اور دُوسری جگہ مِنْ ذَهَبٍ سونے کا بھی ہے (سورۂ کہف: ۳۱ وغیرہ)، کسی کو سونا پہنا دیا جائے، کسی کو چاندی، یا مختلف حالات کے اعتبار سے، کیونکہ جب یہ کیفیات بدلتی رہتی ہیں تو یہ بھی فرحت کا باعث ہیں، جس طرح سے آپ کبھی سفید کپڑے پہن لیتے ہیں، کبھی رنگ دار پہنتے ہیں، کبھی کوئی جوتا پہن لیا، کبھی کوئی پہن لیا، بدل بدل کے جس وقت پہنے جاتے ہیں تو یہ بھی انسان کے لئے خوشی کی بات ہے، اسی طرح سے وہاں بھی لباس سبز بھی ہوگا، سفید بھی ہوگا، پتلا بھی ہوگا، موٹا بھی ہوگا، زیورات چاہے آپ چاندی کے پہنیں، چاہے سونے کے پہنیں، یہ بدلتے رہیں گے، اس میں بھی ایک تفریح ہے۔ ''پہنائے جائیں گے وہ کنگن چاندی کے۔''

شرابِ طہور

وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا: اور پلائی اُن کو ان کے ربّ نے شرابِ طہور، طہور: طاء کے فتح کے ساتھ پاک کرنے والی،

پاک، پاک کرنے والی، جو خود پاک ہوگی اور پینے کے ساتھ بھی انسان کو طہارت ہی حاصل ہوگی، دُنیا کی طرح نہیں کہ گندی شراب، اور پینے کے بعد بھی گندے اخلاق اُبھریں، باطن کے اندر بھی وہ گندگی پیدا کرے، ایسی بات نہیں، یہ شرابِ طہور ہوگی، "پلائی ان کو ان کے رَبّ نے شرابِ طہور" ماضی کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے، حقیقت میں وہی مستقبل والا معنیٰ ہے۔

جنتیوں کی کوشش کی قدر کی جائے گی

اور پھر ساتھ یہ بشارت بھی دی جائے گی اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً: بے شک یہ چیز تمہارے لیے بدلہ ہے، یعنی جو کچھ تم نے دُنیا میں تکلیفیں اُٹھائی تھیں اس کا بدلہ آج دیا جارہا ہے، وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا: اور تمہاری کوشش قدر کی ہوئی ہے، شَكَرَ اصل میں قدردانی کو کہتے ہیں، تم نے دُنیا کے اندر جو کوشش کی تھی وہ قدر کی ہوئی ہے، اسی قدردانی کے طور پر آج تمہیں یہ نعمتیں دی جارہی ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ

بے شک اُتارا ہم نے آپ کے اُوپر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے ﴿۲۳﴾ پس اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے صبر کیجئے، اور نہ اطاعت کریں ان میں سے

اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ

کسی گنہگار کی اور نہ ناشکرے کی ﴿۲۴﴾ اور یاد کیجئے آپ اپنے رَبّ کا نام صبح وشام ﴿۲۵﴾ اور رات کے ایک حصے میں بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے، اور

سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ

اللہ کی تسبیح پڑھیے دراز رات ﴿۲۶﴾ بے شک یہ لوگ محبت کرتے ہیں جلد حاصل ہونے والی چیز سے اور چھوڑتے ہیں یہ اپنے پیچھے

يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ

ایک بہت بوجھل دِن ﴿۲۷﴾ ہم ہی نے اِن کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے، اور جب چاہیں گے ہم بدل دیں گے ان کے اَمثال

تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا

بدلنا ﴿۲۸﴾ بے شک یہ آیات یاددہانی ہیں، پس جو شخص چاہے اپنے رَبّ کی طرف راستہ اختیار کرلے ﴿۲۹﴾ اور

تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ مَنْ

تم نہیں چاہ سکتے مگر اللہ کے چاہنے کے وقت، بے شک اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے ﴿۳۰﴾ داخل کرتا ہے جس کو

یَشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمِیۡنَ اَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۳۱﴾

چاہتا ہے اپنی رحمت میں، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۳۱﴾

تفسیر

حضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے تسلی اور کچھ ہدایات

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا: بے شک ہم نے آپ کے اُوپر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا، یہ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی بھی ہے اور تبلیغ پر زیادہ آمادہ کرنا بھی ہے، ''بے شک اُتارا ہم نے آپ کے اُوپر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے'' یعنی اہتمام کے ساتھ، تا کہ آپ اسی طرح سے اہتمام کے ساتھ اس کو یاد بھی کرتے جائیں اور آگے پہنچاتے بھی جائیں۔ فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ: ہم نے قرآن اُتارا، اور اس قرآن کی وجہ سے آپ تبلیغ کرتے ہیں تو آپ کے سامنے مختلف قسم کی تکالیف پیش آتی ہیں، ان سب کو آپ برداشت کرتے جائیں، ''اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے صبر کیجئے، یا، اپنے رَبّ کے فیصلے کے انتظار کے لئے صبر کیجئے، صبر کیجئے انتظار کرتے ہوئے اپنے رَبّ کے حکم کا'' دونوں طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے، ''آپ اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے صبر کیجئے، برداشت کیجئے، یا، اپنے رَبّ کے حکم کے انتظار کے لئے آپ برداشت کرتے جائیے'' وَلَا تُطِعۡ مِنۡہُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا: نفی کے اندر یہ جو ''اَوۡ'' آ گیا یہ بھی عموم کے لئے ہے، نہ اطاعت کر ان میں سے کسی گنہگار کی اور نہ ناشکرے کی، اِن میں کوئی گنہگار ہو یا ناشکرا ہو آپ کسی کا کہنا نہ مانیں، جو آپ کو بھی گناہ کی طرف لے جانا چاہتا ہے یا ناشکری کی طرف لے جانا چاہتا ہے، جو کہتا ہے کہ آپ اللہ کے اَحکام کو چھوڑ دیں، اس تبلیغ کو ترک کر دیں، ایسا نہ کیجئے۔ آثم: گنہگار، یہ عموماً حقوق العباد تلف کرنے والے کے لئے بولا گیا ہے، اور کَفُور: جو اللہ کے حقوق تلف کرتا ہے۔ جو بندوں کے حق میں بخیل ہے، ظالم ہے، گناہگار ہے، اللہ کے حقوق کا تلف کرنے والا ہے، وہ آپ کو کوئی بات کہے آپ نہ مانیں، آپ اپنا کام کرتے جائیے، اور جو مشکلات آتی ہیں انہیں برداشت کرتے چلے جائیے، لَا تُطِعۡ کا معنی ومفہوم یہاں یہ ہے کہ ان کی پرواہ نہ کیجئے، جو چاہیں کرتے رہیں۔ وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا: یہ ہے اصل میں دل کو قوت پہنچانے والی چیز، کہ دُنیا میں کوئی تکلیف آجائے، لوگ آپ کو بُرا بھلا کہیں، آپ کی مخالفت کریں، بس آپ اپنے رَبّ کی یاد میں لگ جائیے، کسی دُوسری طرف دھیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں، یہ ہے ہتھیار دُنیا کے اندر کامیاب زندگی گزارنے کے لئے یہ سہارا ہے، ''یاد کیجئے آپ اپنے رَبّ کا نام صبح وشام اور رات کے ایک حصے میں بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے'' یعنی رات کو بھی نماز پڑھو، وَسَبِّحۡہُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا: اور اللہ کی پاکی بیان کیجئے، تسبیح پڑھیے لیلِ طویل، دراز رات، یعنی کافی دیر تک، رات کے کچھ حصے میں نماز پڑھیں، اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید رات کے زمانہ دراز میں کیجئے۔

کافر دُنیا کی محبت میں آخرت کو بھول گئے

اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ یُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ: اِن کی جو مخالفت ہے آپ کے ساتھ، یہ جو بات نہیں مانتے، بنیاد یہی ہے کہ یہ آخرت کے

قائل نہیں، دُنیا کی محبت میں مبتلا ہیں، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا ''حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ''(۱) یہ واقعہ بھی ہے کہ جب انسان کا دھیان اپنی موت کی طرف نہیں ہوتا، مرنے کے مابعد حالات کی طرف نہیں ہوتا، اور دُنیا کی محبت کے اندر گرفتار ہوتا ہے، پھر وہ کوئی ایسی بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو، تو اصل بیماری یہی ہے کہ یہ لوگ دُنیا کی محبت میں مبتلا ہیں، '' بے شک یہ لوگ محبت کرتے ہیں عاجلہ سے'' عاجلہ کے معنی جلد حاصل ہونے والی چیز، وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا: اور چھوڑتے ہیں یہ اپنے پیچھے ایک بہت بوجھل دِن، بہت بوجھل دِن جو پیچھے آیا ہوا ہے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، اس کو انہوں نے چھوڑ رکھا ہے۔

اِثباتِ معاد کے لئے تخلیقِ اِنسانی کا ذِکر

اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دِن آئے گا نہیں، جب بات ہوتی ہے تو کہتے ہیں مرنے کے بعد کون زندہ کرے گا؟ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آگے پھر انسان کی تخلیق کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتا ہے، جہاں بھی بعث بعد الموت کا ذکر آیا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی اِبتدا کی طرف ہی متوجہ کیا کہ دیکھو! جس نے اِبتداءً تمہیں پیدا کردیا، بکھرے ہوئے ذرّات تمہارے اکٹھے کر کے تمہیں ایک انسان بنادیا، تو ذرّات بکھر جانے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ بہت دفعہ آپ کے سامنے یہ مضمون گزر گیا، جب بھی بعث بعد الموت کی بات آتی ہے تو اللہ تعالیٰ انسان کو خود اِنسان کی تخلیق کی متوجہ کرتے ہیں، اور اپنی قدرت کو بیان کرنے کے لئے زمین آسمان کا پیدا کرنا اور دوسری چیزیں بھی بتاتے ہیں۔ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ: ہم نے اِن کو پیدا کیا، یہ نَحْنُ مبتدأ جو علیحدہ کر کے ذِکر کردیا، یہ مزید تاکید کے لئے ہے، ''ہم ہی نے اِن کو پیدا کیا'' وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ: اَسر کہتے ہیں یہ انسان کے جوڑ بند، ''مضبوط کیے ہم نے اِس کے جوڑ'' یعنی یہ جوڑوں کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی صنعت ہے کہ دُنیا کے اندر مضبوط سے مضبوط اسٹیل اور لوہے کی بھی اگر کوئی چیز بنائی جاتی ہے تو پھر اگر وہ چلتی رہتی ہے تو چلنے کے ساتھ کچھ مدت بعد ہی وہ گھِس جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے کیسے لطیف طریقے سے یہ جوڑ جوڑے ہیں کہ کس طرح سے ساری زندگی چلتے رہتے ہیں اور استعمال ہوتے رہتے ہیں، لیکن نہ ان کو کبھی تیل دینے کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ ان کی صفائی کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ یہ گھِستے ہیں اور نہ ان میں کوئی اور ایسی بات ہے، یہ اللہ کی قدرت ہے، ایک ایک جوڑ کے اندر اللہ کی قدرت نمایاں ہے۔ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ: ہم ہی نے انہیں پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے، وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا: اور جب ہم چاہیں گے تو ہم اِن جیسی چیز بدل کے لے آئیں گے، جب ایک دفعہ ہم ان کو بنا سکتے ہیں تو دوبارہ ایسا نہیں بنا سکتے؟ ''جب ہم چاہیں گے بدل دیں گے ہم اِن کے امثال بدلنا۔ بے شک یہ آیات تذکرہ ہیں، یاد دہانی ہیں'' فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا: پس جو شخص چاہے اپنے رَبّ کی طرف راستہ اختیار کرلے۔ باقی! صرف تمہارا

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/۴۴۴، کتاب الرقاق، فصل ثالث۔ بحوالہ رزین۔

چاہنا کافی نہیں جس وقت تک کہ اللہ کی طرف سے توفیق نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ اپنی برتری اور اپنی گرفت مخلوق کے اُوپر ہمیشہ ذکر کرتے ہیں، لیکن اس کا چاہنا اُس کے قانون وحکمت کے تحت ہے، یہ نہیں کہ بغیر کسی حکمت کے ہی اللہ تعالیٰ کی مشیت نمایاں ہو جائے، جو مشیت ہوگی حکمت کے تحت ہوگی، ''اور تم نہیں چاہ سکتے مگر اللہ کے چاہنے کے وقت'' یعنی تمہاری مشیت بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، اللہ کی مشیت ہوتی ہے تو انسان کو آگے کسی چیز کے چاہنے کی توفیق ہوتی ہے۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے، داخل کرتا ہے جس کو چاہے اپنی رحمت میں، اور ظالموں کے لئے اس نے عذابِ الیم تیار کر رکھا ہے، دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

آیاتها ۵۰ ۷۷ سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّیَّةٌ ۳۳ رکوعاتها ۲

سورۂ مرسلات مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی پچاس آیتیں ہیں اور اس میں دو رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ

قسم ہے ان ہواؤں کی جو بھیجی ہوئی ہیں نفع پہنچانے کے لئے ○ پھر ان ہواؤں کی قسم جو کہ تیز اور تند چلنے والی ہیں ○ اور ان ہواؤں کی قسم جو کہ پھیلانے والی ہیں

نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾

پھیلانا ○ پھر ان ہواؤں کی قسم جو کہ جُدا جُدا کرنے والی ہیں جُدا جُدا کرنا ○ پھر قسم ان ہواؤں کی جو کہ یاد ڈالنے والی ہیں ○ یعنی توبہ یا انذار ○

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ

بے شک وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو البتہ واقع ہونے والی ہے ○ پس جب ستارے بے نُور ہو جائیں گے ○ اور جب آسمان

فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾ لِاَیِّ یَوْمٍ

کھول دیا جائے گا ○ اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے ○ اور جب رسول وقت متعین کیے جائیں گے ○ کس دن کے لئے

اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ

اُن کو مؤجل کیا گیا ہے؟ ○ فیصلے کے دن کے لیے ○ تجھے کون سی چیز بتاتی ہے کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ ○ خرابی ہے اس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۵ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۶ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۷ كَذٰلِكَ

جھٹلانے والوں کے لئے ۝ کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ۝ پھر ہم پچھلوں کو ان کے پیچھے لگا دیتے ہیں ۝ ایسے ہی

نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۸ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۹ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ

کیا کرتے ہیں ہم مجرمین کے ساتھ ۝ خرابی ہے اس دن ان لوگوں کے لئے جو کہ جھٹلانے والے ہیں ۝ کیا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا ایک بے قدر

مَّهِيْنٍ ۝۲۰ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۲۱ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۲۲ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ

پانی سے ۝ پھر کیا ہم نے اس پانی کو کیا ایک محفوظ جائے قرار میں ۝ ایک معلوم اندازے تک ۝ پھر ہم نے اندازہ کیا، پس ہم بہت

الْقٰدِرُوْنَ ۝۲۳ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۲۴ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝۲۵

ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں ۝ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ۝ کیا ہم نے زمین کو جمع کرنے والی نہیں بنایا ۝

اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۝۲۶ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۝۲۷

زندوں کو بھی اور مُردوں کو بھی ۝ اور بنائے ہم نے اس زمین کے اندر مضبوط اور اُونچے پہاڑ، اور پلایا ہم نے تمہیں پیاس بجھانے والا پانی ۝

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۲۸ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۲۹ اِنْطَلِقُوْٓا

خرابی ہوگی اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ۝ چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ۝ چلو

اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝۳۰ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝۳۱ اِنَّهَا تَرْمِيْ

ایسے سائے کی طرف جو کہ تین شاخوں والا ہے ۝ نہ وہ گھنا ہوگا اور نہ آگ کی تپش سے فائدہ دے گا ۝ بے شک وہ آگ پھینکے گی

بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝۳۲ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝۳۳ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۴ هٰذَا

چنگارے مثل اُونچے محل کے ۝ گویا کہ وہ اُونٹ ہیں کالے کالے ۝ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ۝ یہ

يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝۳۵ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝۳۶ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

ایسا دن ہے کہ وہ بولیں گے نہیں ۝ اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ کوئی عذر معذرت کریں ۝ خرابی ہوگی اس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۷ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ۝۳۸ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ

جھٹلانے والوں کے لئے ۝ یہی ہے فیصلے کا دن، ہم نے تمہیں اکٹھا کرلیا اور پہلے لوگوں کو بھی ۝ اگر تمہارے لیے کوئی تدبیر ہے،

فَكِيْدُوْنِ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

تو تم میرے متعلق تدبیر کرلو۔ تکذیب کرنے والوں کے لئے اس دن خرابی ہے۔

سورت کا مضمون اور ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ مرسلات مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۵۰ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رُکوع ہیں۔ پچھلی سورت میں بھی تذکیرِ آخرت تھی، اس میں زیادہ تر بیان تھا رحمت کا، ترغیب کا بیان تھا، ترہیب کا مضمون کم تھا، اور اِس سورت میں بھی تذکیرِ آخرت ہے، اِمکانِ آخرت اور اس کے بعد اِنذار، ڈرانے کا مضمون زیادہ ہے، اور تبشیر کم ہے، جس طرح سے آخری رُکوع کی اِبتدائی آیات میں متقین کے اَنجام کا ذِکر آئے گا۔

تفسیر

قسم میں ہواؤں کی پانچ صفات کا ذِکر

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا: مُرسلات صفت کا صیغہ ہے، بھیجی ہوئی چیزیں، اور اس کا موصوف ''رِیاح'' ہے ''ریح'' کی جمع، واؤ قسمیہ ہے، ''قسم ہے ان ہواؤں کی جو بھیجی ہوئی ہیں'' عُرْفًا: یہ معروف کے معنی میں ہے، نفع، احسان، ''قسم ان ہواؤں کی جو بھیجی ہوئی ہیں نفع پہنچانے کے لئے''، فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا: پھر وہ ہوائیں جو کہ تند اور تیز چلنے والی ہیں، عصف: جھکڑ ہوائیں، ''پھر اُن ہواؤں کی قسم جو کہ تیز اور تند چلنے والی ہیں''، وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا: اور ان ہواؤں کی قسم جو کہ پھیلانے والی ہیں پھیلانا، ناشرات سے مراد ہے جو بادل کو آگے فضا میں پھیلا دیتی ہیں، فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا: پھر ان ہواؤں کی قسم جو کہ جدا جدا کرنے والی ہیں جدا جدا کرنا، اس سے مراد بھی وہی ہوائیں ہیں جو کہ بادلوں کو لاتی ہیں اور اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیتی ہیں، فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا: پھر قسم ان ہواؤں کی جو کہ ڈالنے والی ہیں نصیحت یعنی عذر یا نُذر، عذر سے توبہ مراد ہے، اور عُذْرًا اَوْ نُذْرًا یہ ذِكْرًا سے بدل ہے، ''پھر وہ ہوائیں جو کہ یاد ڈالنے والی ہیں'' اللہ کا ذِکر قلوب میں پیدا کرنے والی ہیں، القاء کرتی ہیں، ''یعنی توبہ یا انذار'' نُذر انذار کے معنی میں ہے، یعنی اُن کے حالات اللہ کی یاد پیدا کرتے ہیں، تو کبھی کسی کو اس کے ساتھ توبہ کی توفیق ہوتی ہے، اور کبھی کسی کے دل میں خوف ہی پیدا ہوتا ہے، اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ: بے شک وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو البتہ واقع ہونے والی ہے۔

قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت

یہ پانچ قسمیں ہیں اور اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ یہ قسموں کا جواب ہے، یعنی وہ بات جس کی تاکید کی جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ جس چیز کا وعدہ تم دیے جاتے ہو البتہ واقع ہونے والی ہے۔ اور قسمیں قرآنِ کریم میں بار ہا آپ کے سامنے گزریں، اور یہ بات آپ کی خدمت میں متعدد بار عرض کر دی گئی کہ قرآنِ کریم کی قسمیں ایک قسم کی شاہد ہوا کرتی ہیں بعد والے مضمون کے لئے، جزا کا

واقع ہونا، قیامت کا آنا یہ ایک مضمون ہے جس کو ذکر کیا جارہا ہے، کہ یہ عقیدہ رکھو، قیامت آئے گی اور اس میں نیک اور بد کے لئے جس قسم کا انجام ہے وہ سامنے آئے گا، اور اس کے اُوپر بطور شہادت کے ہواؤں کو پیش کیا جارہا ہے، ہواؤں کی شہادت اس مضمون کے لئے بایں طور ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات ہیں جس میں قدرت نمایاں ہے، اور اس قدرت کے نمایاں ہونے کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قادر علی البعث ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس کی یہ قدرت ہے، جو اس طرح سے ہواؤں کو بھیجتا ہے جن میں نفع کا پہلو ہے، ہوائیں آتی ہیں، مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے، اور کبھی ہوائیں آتی ہیں اور جھکڑ چلتے ہیں جس کے ساتھ خوف پیدا ہوتا ہے، نفع کے مقابلے میں اس میں نقصان کا پہلو آجاتا ہے، پھر یہی ہوائیں ہیں کسی وقت بادل لاتی ہیں اور کس طرح سے فضا کے اندر تغیر پیدا ہوجاتا ہے، اور وہ بادل برستے ہیں، زمین سے نباتات اُگتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت کو کئی دفعہ اِسی بارش کے آنے اور زمین سے نباتات اُگنے کی تمثیل کے ساتھ بھی سمجھایا، ایک وقت ہوتا ہے کہ ہوائیں فضا کو بادلوں سے بھر دیتی ہیں، اور دُوسرا وقت آتا ہے کہ یہی ہوائیں بادلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے بکھیر دیتی ہیں، تو یہ جتنے بھی تغیرات واقع ہوتے ہیں یہ سب انسان کے قلوب پر اثر ڈالتے ہیں اگر کوئی سوچے، اللہ کی یاد پیدا ہوتی ہے، اور اللہ کی یاد کے پیدا ہونے کے ساتھ کسی کو اپنے گناہوں کا احساس ہوکر توبہ کی توفیق ہوتی ہے، اور کسی کے اندر کچھ خوف ہی پیدا ہوجاتا ہے، تو یہ سارے کے سارے تغیرات تصرفات اللہ کی قدرت کو نمایاں کرتے ہیں، جب اس کی قدرت سمجھ میں آجائے تو پھر یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ واقعی مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ آخرت واقع کریں گے قیامت آئے گی، اور نیکوں کو نیکی کا بدلہ ملے گا، بُروں کو بُرائی کا بدلہ ملے گا، تو اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ اس طرح سے اِن قسموں کے ذریعے سے مضمون پختہ ہوجاتا ہے۔

اِبتدائی آیات کے مصداق کے متعلق مزید اَقوال

تو یہ جو پانچ صفت کے صیغے آئے ہیں مرسلات، عاصفات، ناشرات، فارقات، ملقیات، اس میں راجح تفسیر یہی ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ یہ پانچوں ہی ہواؤں کی صفتیں ہیں (بیان القرآن)، اگرچہ ان پانچوں کو فرشتوں کی صفتیں بھی بنایا گیا ہے (عام تفاسیر)، اور پہلی تین کو ہوا کی صفتیں اور پچھلی دو کو فرشتوں کی صفت (خازن)، یا پہلی چار کو ہواؤں کی صفت اور پچھلی پانچویں کو فرشتوں کی صفت (تفسیر عثمانی)، اس طرح سے بھی تفسیر کی گئی ہے،[1] لیکن راجح اور اَحسن تفسیر یہی ہے کہ ان پانچوں کو ہواؤں کے ساتھ لگالیا جائے، اور ہوا کی یہ مختلف کیفیتیں ہیں جو آپ کے سامنے ذکر کی گئیں، اور ان تغیرات، تصرفات کے ساتھ اللہ کی یاد پیدا ہوتی ہے غور کرنے والوں کے قلوب میں، پھر اس کے بعد کسی کو توبہ کی توفیق ہوگی اور کوئی کم از کم دل کے اندر ہیبت پیدا ہوجانے کے بعد ڈر ہی جاتا ہے، اور آئندہ اس کو اِیمان لانے کی توفیق ہوجاتی ہے یا اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے ماننے کی توفیق ہوجاتی ہے تو اِن تصرفات کو بطور شہادت کے ذکر کرکے بعد میں کہا جارہا ہے کہ ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (اس سے مراد انجام، یوم جزا، یوم قیامہ) وہ البتہ واقع ہونے والا ہے۔''

---

(۱) ''جلالین'' میں پہلے تین کو ہواؤں کی، چوتھے کو آیاتِ قرآن کی، اور پانچویں کو فرشتوں کی صفت بتایا گیا ہے۔

قیامت کے ہولناک مناظر!

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ: طمس: بے نور کر دینا، مٹا دینا، پس جس وقت ستارے بے نور ہو جائیں گے، وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ: اور جب آسمان کھول دیا جائے گا، ستاروں کے بے نور ہونے کا ذکر بھی بہت ساری سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے، کسی جگہ انْكَدَرَتْ کا لفظ آیا ہے (سورۂ تکویر)، کسی جگہ انْتَثَرَتْ کا لفظ آیا ہے (سورۂ انفطار)، اور یہاں طُمِسَتْ کا لفظ ہے، مقصد سب کا ایک ہے، یہ نظم درہم برہم ہو جائے گا، آج ستاروں کا نظام بہت محکم ہے، ان میں بڑی چمک ہے، لوگ ان کے ذریعے سے بڑے بڑے فوائد حاصل کرتے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب یہ بے نور ہو جائیں گے، بے نام و نشان ہو جائیں گے، یہ نظم سارے کا سارا درہم برہم ہو جائے گا، آسمان آج مضبوط چھت کی طرح نمایاں ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی دراڑ نہیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ اس میں دراڑیں پڑ جائیں گی، اور اس کو کھول دیا جائے گا۔ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ: نَسف کا معنی ہوتا ہے ریزہ ریزہ کرنا، بکھیر دینا، اور جبکہ پہاڑ بکھیر دیے جائیں گے، ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے، اب دیکھنے میں یہ کتنے ہی مضبوط نظر آتے ہیں، کتنے ہی اُونچے ہیں، لیکن اس وقت ان کو بھی درہم برہم کر دیا جائے گا۔

رسولوں کے لئے وقت معین کیا جائے گا

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ: اُقِّتَتْ یہ اصل میں ''وُقِّتَتْ'' تھا، یہ لفظ وقت سے لیا گیا ہے، تَوْقِیْت: وقت متعین کرنا، واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا، وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ: جبکہ رسولوں کے لئے وقت متعین کیا جائے گا اللہ کے سامنے حاضری کا، اور وہ رسول اپنے اپنے وقت پہ آئیں گے اور اپنی اُمت کے خلاف آ کے بیان دیں گے کہ ہم نے اللہ کے احکام بیان کیے اور انہوں نے ان کے اُوپر عمل نہیں کیا، ''جبکہ رسول وقت متعین کیے جائیں گے'' یعنی وقتِ معین پر، اُس وقت بُلایا جائے گا اور آ کے اپنی اُمتوں کے حالات بیان کریں گے۔ اِذَا کا جواب بھی محذوف ہے جس کے اُوپر آنے والے الفاظ دلالت کرتے ہیں، ''جب یہ واقعات پیش آئیں گے وہی وقت فیصلے کا وقت ہے، وہی دِن فیصلے کا دِن ہے'' یہ اِس کا جواب سمجھ میں آئے گا، ''جب یہ واقعات پیش آئیں گے یہی یوم الفصل ہے، فیصلے کا دِن یہی ہے۔''

رسولوں کا معاملہ کیوں ملتوی کیا جا رہا ہے؟

''جب رسول وقت متعین کیے جائیں گے'' لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ لِیَوْمِ الْفَصْلِ: کس دِن کے لئے رسولوں کو ڈھیل دی جا رہی ہے؟ اُجِّلَتْ کی ضمیر اُقِّتَتْ کی طرح رسولوں کی طرف ہے، ''رسولوں کے لئے کون سے وقت کے لئے تاخیر کی جا رہی ہے؟'' خود ہی جواب دے دیا: لِیَوْمِ الْفَصْلِ: فصل کے دِن کے لئے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ایک وقت متعین کر دیا ہے، جب رسول اپنی جماعت اور اپنی اُمت کے خلاف آ کر بیان دیں گے پھر ان کے لئے فیصلہ ہوگا، دُنیا کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسولوں کو اور ان کی اُمتوں کو کچھ وقت کے لئے ڈھیل دی ہے، تاخیر دی ہے، اس لیئے دُنیا میں ہر قوم کے لئے اس کے عمل کے اُوپر

جزا مرتب نہیں ہوتی، بلکہ اس کو آخرت کے وقت تک مؤخر کر دیا گیا ہے، ''کس دن کے لئے ان کو مؤجل کیا گیا ہے'' لِيَوْمِ الْفَصْلِ: فیصلے کے دِن کے لئے۔

قیامت کے دِن بربادی کس کے لئے ہوگی؟

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ: یہ بھی تہویل پیدا کرنے کے لئے ہے، تجھے کون سے چیز بتلاتی ہے کہ فیصلے کا دِن کیا ہے؟ یعنی تم اس کی پوری طرح سے کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے ایسا ہیبت ناک دِن ہوگا، یہ اِستفہام ہیبت پیدا کرنے کے لئے ہے، ''تجھے کون سی چیز بتاتی ہے'' مَا يَوْمُ الْفَصْلِ: فیصلے کا دِن کیا ہے، وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: خرابی ہے اس دِن جھٹلانے والوں کے لئے، ویل کے اندر ہر قسم کا عذاب ہر قسم کی خرابی جو آخرت میں ہونے والی ہے وہ سب اس میں آجاتی ہے، تکذیب کرنے والے جو کہ اس یومِ فصل کی تکذیب کرتے ہیں، آخرت کے دِن کی تکذیب کرتے ہیں، ان کے لئے خرابی ہے، جس دِن کہ یہ واقعات پیش آئیں گے، يَوْمَىِٕذٍ: يَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا، ''نحو'' میں جس طرح سے اِس کی توجیہ کیا کرتے ہو، ''جس دِن یہ واقعات پیش آئیں گے اس دِن جھٹلانے والوں کے لئے خرابی ہے۔'' یہ آیت بار بار ذکر کی جائے گی تنبیہ کے لئے، تقریباً دس دفعہ اس سورت میں اس آیت کو دوہرایا گیا ہے، جس طرح سے سورۂ رحمٰن میں فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کا تکرار آیا ہے نعمتیں یاد دِلانے کے لئے، اور یہاں ترہیب کے لئے اور اِنذار کے لئے اس آیت کو بار بار دوہرایا جائے گا۔

گزشتہ اُمتوں سے عبرت حاصل کرنے کی ترغیب

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ: اب یہ پچھلی تاریخ کی طرف متوجہ کیا عبرت حاصل کرنے کے لئے، ''کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟'' اس سے اشارہ ان اُمتوں کی طرف ہے جن کی تفصیل دُوسری سورتوں کے اندر کردی گئی، ''کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟'' ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ: پھر ہم پچھلوں کو ان کے پیچھے لگا دیتے ہیں، یعنی پہلوں کو ہلاک کیا پھر پیچھے جو بھی ان کے طریقے پر چلتا ہے اس کو انہی کے پیچھے لگا دیتے ہیں، یکے بعد دیگرے کتنی اُمتیں برباد کی گئیں، ثُمَّ نُتْبِعُهُمْ: پھر پیچھے لگا دیتے ہیں، تابع بنا دیتے ہیں ہم اُن کا پیچھے آنے والوں کو، كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ: ایسے ہی کیا کرتے ہیں ہم مجرمین کے ساتھ، جو لوگ جرم کا ارتکاب کریں ان کے ساتھ ہمارا معاملہ ایسے ہی ہوتا ہے، تو گناہوں کی سزا کا اعتقاد یہ بھی ضروری ہے، جو اس کی تکذیب کرتے ہیں تو ان کے لئے بھی وَیل ہے، ''خرابی ہے اُس دِن ان لوگوں کے لئے جو کہ جھٹلانے والے ہیں۔''

اِثباتِ بعث کے لئے تخلیقِ اِنسانی کا ذِکر

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ: یہ وہی! انسان کو اس کی خلقت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے جس کے ساتھ اِمکانِ بعث پر اِستدلال کرنا مقصود ہے، کہ جو اِبتدا میں اس طرح سے ایک پانی کی بوند سے انسان کو بنا سکتا ہے تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے، اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ: کیا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا ایک بے قدر پانی سے، مھین ذلیل کو کہتے

ہیں، اور وہ بے قدر ہے نجس ہونے کی بنا پر، یہ نطفہ، نجس ہونے کی بنا اس کو ماء مھین کہا، بے قدر پانی، بظاہر اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں، جو کوئی دیکھتا ہے اس سے نفرت کرتا ہے،''کیا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا ایک بے قدر پانی سے؟'' فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ: قرار: ٹھہرنا، ٹھہرنے کی جگہ، دونوں معنوں میں آیا کرتا ہے، مکین سے مضبوط مراد ہے،''پھر ہم نے اس پانی کو کیا ایک مضبوط ٹھہرنے کی جگہ میں'' اس سے مراد رحم مادر ہے، ماں کا رحم جس میں یہ پانی جا کر قرار پکڑتا ہے، وہ ہر طرح سے محفوظ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بچے کے خلقت کے لئے ایک بہت محفوظ جائے پناہ بنایا ہے،''پھر کیا ہم نے اس پانی کو ایک محفوظ جائے قرار میں'' اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ: ایک معلوم اندازے تک، فَقَدَرْنَا: پھر ہم نے اندازہ کیا، یعنی رحم مادر میں اس کا اندازہ کیا کہ اس کا قد کیسا ہوگا، اس کی شکل کیسی ہوگی، اس کی باطنی صلاحیتیں کیسی ہوں گی، شکل صورت، باطنی ملکات، جذبات ہر چیز کا ہم نے اندازہ کیا، فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ: پس ہم بہت ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں، فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ نحن، نِعْمَ اَفعالِ مدح میں سے آ گیا، الْقٰدِرُوْنَ: فاعل ہے، اور مخصوص بالمدح بعد میں محذوف نکال لیا جائے گا نِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ نحن، یعنی انسان کی تخلیق کا نمونہ پیش کر کے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کو نمایاں کرتے ہیں، کہ دیکھو! ہم کیسی اچھی قدرت والے ہیں، کیسے اچھے ہم نے اندازے لگائے اور کس طرح سے انسان کو ایک پانی کی بوند سے بنایا اور اس میں کیسی کیسی صلاحیتیں رکھیں۔

اِثباتِ بعث کے لئے زمین میں دلائلِ قدرت کا ذِکر

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا: اب یہ زمین کی آیات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے، کَفَتَ: جمع کرنا۔ کِفات: جمع کرنے والی چیز،''کیا ہم نے زمین کو اکٹھا کرنے والی، جمع کرنے والی نہیں بنایا؟'' اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا: زندوں کو بھی اور مُردوں کو بھی، زمین سب کو سمیٹے ہوئے ہے، زندے بھی اسی میں ہیں، مُردے بھی اسی میں ہیں، یعنی مرنے کے بعد اِنسان کہیں زمین سے باہر نہیں چلا جاتا، وہ زمین میں ہی ہے، جس طرح سے زندہ انسان زمین کی پشت پر پھرتے ہیں، اور مرے ہوئے انسان اس کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں، تو پہلے بھی انسان کو اِسی زمین میں سے ہی اللہ نے کشید کیا ہے اپنی قدرت کے تحت، اور مرنے کے بعد بھی وہ زمین میں ہی رہتے ہیں، کہیں باہر نہیں چلے جاتے، تو جب اللہ تعالیٰ پہلے اِس کی بنیاد مٹی سے اُٹھا کے مختلف درجات کی طرف لے جا کر بنا سکتا ہے، تو مارنے کے بعد دوبارہ اس کا بنانا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں۔

''مکی'' سورتوں میں قیامت کا تذکرہ زیادہ کیوں ہے؟

بار بار اس چیز کو ذکر کیا جا رہا ہے، آخرت کو، اِمکانِ بعث کو، وقوعِ بعث کو، کیونکہ اصل کے اعتبار سے بنیادی یہی عقیدہ بنتا ہے، کہ جو شخص آخرت کا عقیدہ اختیار کر لے باقی سب کام اس کے لئے آسان ہو جاتے ہیں، اور مشرکین بڑی شدت کے ساتھ اس کا اِنکار کرتے تھے، تو''مکی'' سورتوں میں اس مضمون کو بہت دوہرایا گیا ہے، اور جس شخص نے بھی یہ عقیدہ اختیار کر لیا

کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے، باقی سارا دین اس کے لئے آسان ہوگیا۔ ''کیا ہم نے زمین کو جمع کرنے والی نہیں بنایا؟ زندوں کو بھی اور مُردوں کو بھی۔''

پہاڑوں کی تخلیق اور فوائد

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ: یہ لفظ بار بار گزر گئے، رَوَاسِيَ رَاسِیَۃٌ کی جمع، مضبوط، اور شامخات کے معنی اُونچے، اور یہ صفت ہے پہاڑوں کی، جِبَالًا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ، ''اور بنایا ہم نے اس زمین کے اندر مضبوط اور اُونچے اُونچے پہاڑوں کو'' اور ان پہاڑوں میں کیا کیا حکمتیں اللہ نے رکھیں، انسانوں کے لئے کیا کیا فوائد رکھے، مختلف آیات کے اندر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ پہاڑ زلزلے سے مانع ہیں، اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی میخیں لگادیں تاکہ یہ زمین غیر متزلزل حرکت نہ کرے جس طرح سے کشتی یوں یوں لگ جاتی ہے، ہچکولے لینے لگ جاتی ہے، تو ان کے ساتھ توازن پیدا ہوا، اور پھر ہواؤں اور بادلوں کے نظام کا تعلق پہاڑوں کے ساتھ ہے، ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں، ہواؤں کے سامنے رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اسی طرح سے بادلوں کا نظم، تو پانی کا اُترنا پھر پہاڑوں کی چوٹیوں کے اُوپر برف کی شکل میں پانیوں کا جمارہ جانا، پھر ایک خاص نظم کے تحت اس کا تقسیم ہونا، پتا نہیں کیا کیا حکمتیں اللہ تعالیٰ نے ان پہاڑوں کے اندر رکھی ہیں، اور اِنسان کو کس کس جہت سے اِن پہاڑوں سے فائدہ پہنچ رہا ہے! ''بنائے ہم نے اس زمین کے اندر مضبوط اور اُونچے پہاڑ۔''

میٹھے پانی کا ذکر

اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا: اور ہم نے تمہیں خوشگوار پانی پلایا، فرات: کہتے ہیں خوشگوار کو، جو پینے میں لذیذ ہو اور پھر اچھی طرح سے ہضم بھی ہوجائے، عَذْبٌ فُرَاتٌ سورۂ فاطر (آیت ۱۲) کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا، ''پلایا ہم نے تمہیں خوشگوار پانی، پیاس بجھانے والا پانی''، وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: جو اللہ تعالیٰ کی اِس قدرت کا انکار کرتے ہیں، احسانات کا شکر ادا نہیں کرتے، اللہ کی تعلیم کے مطابق آخرت کا عقیدہ اختیار نہیں کرتے، ایسے جھٹلانے والوں کے لئے اس دن خرابی ہوگی۔

''مکذبین'' کو دیے جانے والے عذاب کا تذکرہ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ: اِنْطَلِقُوْٓا یہ خطاب ہے مجرمین کو، جب قیامت آجائے گی تو اللہ تعالیٰ کہیں گے ''چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے''، یعنی آگ کی طرف، عذاب کی طرف جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے آج اس کی طرف چلو، اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ: چلو ایسے سائے کی طرف جو کہ تین شاخوں والا ہے، یہاں ظل سے مراد ہے دھویں کا سایہ، جیسے سورۂ واقعہ کے اندر آیا تھا ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ، جہنم سے ایک دُھواں اُٹھے گا، اور وہ سائبان کی شکل اختیار کرلے گا، میدان حشر میں قیامت کے دن مجرمین کو اسی دُھویں کی طرف دھکیل دیا جائے گا، جس طرح سے متقین کے لئے اللہ کے عرش کے تحت سایہ ہوگا، اللہ

کی رحمت کے سائے میں ہوں گے، اور یہ جہنم کے دُھویں کے سائے میں ہوں گے، "چلوتم ایک سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے" تین حصوں میں بٹا ہوا، سر پر بھی ہوگا، دائیں بائیں سے بھی گھیرے ہوئے ہوگا، لَا ظَلِیْلٍ: وہ کوئی گھنا سایہ نہیں جو آرام دینے والا ہو، وَلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ: اور نہ وہ آگ کی تپش سے فائدہ دے گا، لَا یُغْنِیْ: فائدہ نہیں پہنچائے گا، مِنَ اللَّهَبِ: لہب آگ کی لپٹ کو کہتے ہیں، جس طرح سے سورج کی تمازت ہوتی ہے، گرمی ہوتی ہے، آپ سائے میں چلے جائیں تو گرمی سے وہ سایہ فائدہ پہنچاتا ہے، گرمی سے بچاتا ہے، یہ سایہ آگ کی لپٹ سے نہیں بچائے گا، کیونکہ یہ آگ کا ہی دُھواں ہوگا، اور اس کے اندر وہی آگ کے اثرات ہوں گے، تو اس سائے میں جا کر اِنسان آگ کی تپش سے بچے گا نہیں، اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ: اور یہ چونکہ "لہب" کا ذکر آ گیا تو نارِ جہنم اس سے خود سمجھ میں آ گئی، اور اسی طرح سے "ظِل" یہ بھی دُھواں ہے جو جہنم سے اُٹھا ہوا ہے، تو اِنَّهَا کی "ھا" ضمیر اسی "نار" کی طرف لوٹ رہی ہے جو ان الفاظ سے دلالۃً سمجھ میں آ رہی ہے، "بے شک وہ آگ پھینکے گی شرارے" كَالْقَصْرِ: قصر محل کو کہتے ہیں، اتنے بڑے بڑے چنگارے اور شرارے اس میں سے نکلیں گے جیسے کوئی گنبد ہوتے ہیں اُونچے اونچے محل، كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ: جِمال جِمالة: اُونٹ، صُفْرٌ: اصفر کی جمع ہے، لفظی معنی تو اس کا زرد ہے، لیکن یہاں سیاہ مراد ہیں، کیونکہ سیاہ اُونٹ زردی مائل ہوتے ہیں، تو عرب کے اندر سیاہ اُونٹوں کو صُفر کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، "گویا کہ وہ اُونٹ ہیں کالے کالے" وہ کالے کالے اُونٹوں کی طرح ہوں گے، حدیث شریف میں آتا ہے جہنم کی آگ روشن نہیں بلکہ یہ سیاہ رنگ کی ہے (مظہری)، اس لیے جہنم کے اندر آگ کی وجہ سے روشنی نہیں ہوگی، بلکہ گھٹا گھوپ اندھیرا ہوگا، تو اسی طرح سے اس سے جو شرارے اُٹھیں گے، گریں گے، تو پہلے جس وقت اُٹھے گا تو ایسے معلوم ہوگا جیسے بہت بڑا گنبد اور محل ہے، اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک چنگارہ اگر اُوپر کو جاتا ہے تو پھر وہ ٹوٹ کے چھوٹا چھوٹا ہو کر گرتا ہے، تو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو گریں گے وہ بھی کالے اُونٹوں کے برابر ہوں گے، تو گویا کہ "كَالْقَصْرِ" جو قرار دیا گیا یہ اِبتدائی طور پر ہے، اور جِمٰلَتٌ صُفْرٌ جو کہا گیا ہے یہ اِنتہائی طور پر ہے، جس وقت وہ شرر، شرارہ اُٹھے گا تو ایسے ہوگا جیسے کہ گنبد ہے اور محل ہے، اور اس کے بعد ٹوٹ کے اس طرح سے اردگرد بکھریں گے، اور وہ جو ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھریں گے وہ بھی کالے اُونٹوں کی طرح ہوں گے، اتنے بڑے بڑے ہوں گے، تو گویا کہ اس دُھویں میں جو جہنم کی آگ کا دُھواں ہے اس میں سے اس طرح سے آگ کے انگارے آئیں گے، اور جہنمیوں کے اُوپر برسیں گے، مجرمین کے اُوپر۔ تو جو لوگ اس سزا کی تکذیب کرتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ کُفر کی سزا آخرت میں نہیں ہوگی، آخرت میں کوئی کسی قسم کا عذاب ہونے والا نہیں، ایسے جھٹلانے والوں کے لئے بھی خرابی ہے وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ۔

قیامت کے دِن "مکذبین" کی ناقابلِ دِید حالت

هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ: یہ وہ دِن ہے کہ بولیں گے نہیں، بول نہیں سکیں گے، زبانیں اِن کی گنگ ہو جائیں گی، دُنیا کے اندر اس وقت جو رسولوں کے مقابلے میں اور انبیاء ﷺ کے وارثوں کے مقابلے میں ان کی زبانیں اتنی اتنی لمبی ہیں، بولتے ہیں اور شور

جاتے ہیں، اس دن ان کی آواز نہیں نکلے گی، هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ: یہ ایسا دن ہے کہ وہ بولیں گے نہیں، وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ: اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ کوئی عذر معذرت کرلیں، وہ معذرت کرنے کا وقت ہی نہیں ہے، "نہیں اجازت دی جائے گی ان کو کہ وہ عذر کرلیں"، وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: اس دن کی تکذیب کرنے والے، مکذبین، اُن کے لئے اُس دن خرابی ہوگی، جو یوم قیامہ کی تکذیب کرتے ہیں جس میں کہ کفر کی سزا ملنے والی ہے اُن کے لئے اُس دن خرابی ہوگی، وَیل کے اندر ہر قسم کا عذاب آگیا۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ: یہی ہے فیصلے کا دن، اُس دن انہیں کہا جائے گا جب یہ حالات ان کے سامنے نمایاں ہوں گے یہ ہے فیصلے کا دن، جَمَعْنٰكُمْ: ہم نے تمہیں اکٹھا کرلیا اور پہلے لوگوں کو بھی، جو وہ کہا کرتے تھے کہ کیا ہمیں بھی اُٹھالیا جائے گا اور ہمارے آبائے اوّلین کو بھی اُٹھالیا جائے گا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو ہزاروں سال پہلے مرگئے ان کو بھی اُٹھالیا جائے، اس قسم کے وہ شبہات وارد کیا کرتے تھے، تو ان سب کو اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ لو! ہم نے تمہیں بھی اکٹھا کرلیا اور پہلے لوگوں کو بھی اکٹھا کرلیا، فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ: کید: مکر، تدبیر، خفیہ تدبیر، "اگر تمہارے لیے کوئی تدبیر ہے تو کرلو" ہمارے عذاب سے بچنے کے لئے، ہم سے چھوٹنے کے لئے اگر کوئی تدبیر کرسکتے ہو تو کرلو، "اگر تمہارے لیے کوئی تدبیر ہے" فَكِيْدُوْنِ: نون کے اُوپر جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم کے اُوپر دلالت کرنے والا ہے، "تم میرے متعلق تدبیر کرلو" اپنا کوئی داؤ چلا سکتے ہو تو چلالو، وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: تکذیب کرنے والوں کے لئے اُس دن خرابی ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا

بے شک متقین سایوں میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۱﴾ اور دل چاہے میووں میں ہوں گے ﴿۴۲﴾ (انہیں کہا جائے گا کہ) کھاؤ اور پیو

هَنِيْٓئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

مزے لے لے کر ان کاموں کے سبب سے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۴۳﴾ ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۴﴾ تکذیب کرنے والوں کے لئے

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

اس دن خرابی ہوگی ﴿۴۵﴾ (اے مجرمو!) تم کھالو اور فائدہ اُٹھالو تھوڑی مدت تک، بے شک تم مجرم ہو ﴿۴۶﴾ خرابی ہے اس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

ان لوگوں کے لئے جو کہ جھٹلانے والے ہیں ﴿۴۷﴾ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم جھکو تو وہ جھکتے نہیں ﴿۴۸﴾ تکذیب کرنے والوں کے لئے

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

اس دن خرابی ہوگی ﴿۴۹﴾ پس کس بات پر اس قرآن کے بعد یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ ﴿۵۰﴾

تفسیر

متقین کے لئے اِنعامات اور متقین کا تعارف

آگے اچھے لوگوں کی جزا آ گئی، اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ: قرآنِ کریم اسی طرح سے مقابلۃً دونوں قسم کی باتیں کیا کرتا ہے، جہاں مجرمین کا ذکر آیا تو ساتھ متقین کا ذکر آ گیا، عذاب کا ذکر آیا تو ساتھ ثواب کا ذکر آ گیا، تاکہ دونوں پہلو سامنے ہو جائیں، اور ہر شخص یہ سوچ کر قدم اُٹھائے کہ میں کس گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور کس قسم کے انجام سے دوچار ہونا چاہتا ہوں، دونوں پہلو نمایاں کردیئے جاتے ہیں، بِضِدِّھَا تَتَبَیَّنُ الْاَشْیَاءُ، ہر چیز اپنی ضد کے ساتھ ہی واضح ہوا کرتی ہے، تو دونوں نوعیں ایک دُوسرے کے متقابل کر کے ذکر کردی جاتی ہیں، ''بے شک متقین سایوں میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے'' اِن کا سایہ رحمت کا سایہ ہے جس میں آرام ہی آرام ہوگا، ظلال ظِلّ کی جمع ہے، عیون عین کی جمع ہے، وَّفَوَاکِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ: اور میوہ جات میں ہوں گے، فَوَاکِهَ فاکِھۃٌ کی جمع ہے، مِمَّا یَشْتَهُوْنَ: اس چیز میں سے جس کو چاہیں گے، جو چیز چاہیں گے، میوہ جات اس طرح سے ہوں گے گویا کہ ان کے چاروں طرف یہ نعمتیں بکھری ہوئی ہیں، یہ درمیان میں آئے ہوئے ہیں، ''سایوں میں، چشموں میں اور دِل چاہے ہوئے میوہ جات میں ہوں گے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں اُن کے چاروں طرف بکھری ہوئی ہوں گی، گویا کہ یہ اُن نعمتوں کے اندر گھرے ہوئے ہیں، اس لیے فِیْ کا مفہوم واضح ہوگیا، ''بے شک متقین سایوں میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے اور دِل چاہے میوں میں ہوں گے'' مَا یَشْتَهُوْنَ: جو وہ چاہیں گے، فَوَاکِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ: میوے اس قسم سے جس کو وہ چاہیں گے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا: انہیں کہا جائے گا، یُقَالُ لَهُمْ، انہیں کہا جائے گا کہ کھاؤ اور پیو، هَنِیْٓـًٔا: یہ یا تو كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کے مفعول سے حال ہے، کیونکہ كُلُوْا اس کے آگے وہ طعام آ گیا، وَاشْرَبُوْا، اس کے بعد پانی آ گیا جس طرح سے فَوَاکِهَ یہ ماکول آ گیا، اور عیون کے اندر شراب کا ذکر ہے، پینے کی چیزیں، ''کھاؤ پیو اس حال میں کہ وہ چیز خوشگوار ہے'' اچھی ہضم ہونے والی ہے، نفع بخش ہے، اور یا اَكْلًا هَنِیْٓـًٔا، کھانا خوشگوار، جس میں کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں۔ فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا (سورۂ نساء: ۴) یہ پہلے بھی لفظ آیا ہے۔ ''کھاؤ پیو مزے لے لے کر، خوشگوار، جس میں کوئی کسی قسم کی دِقّت اور تکلیف نہیں، اُن کاموں کے سبب سے جو تم کیا کرتے تھے'' گویا کہ یہ تمہارے عملوں کی تمہیں جزا دی جارہی ہے، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ: ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں، محسنین یہ مجرمین کے مقابلے میں آ گیا، محسنین ہو گئے ہر کام کو اچھی طرح سے کرنے والے، ہر وقت اللہ کی طرف دھیان رکھنے والے، ایسے طور پر عبادت کرنے والے گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں، اس یقین پہ عبادت کرتے ہیں، اور ہر وقت ان کے تصور میں یہ چیز پائی جاتی ہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے، اسی لئے کسی علیحدگی کے مقام پر بھی اور رات کی تاریکی میں بھی وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتے، محسنین کا مصداق وہ لوگ ہوا کرتے ہیں، ہر وقت اللہ سے ڈرتے ہیں، اور ہر وقت یہ دھیان رکھتے ہیں گویا کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں، یا ان

کے خیال میں یہ بات رہتی ہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے، جب یہ کیفیت کسی کے اُوپر طاری ہو جائے پھر وہ محسنین کے درجے کو پہنچتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محسنین کے لئے ایسا ہی بدلہ ہے جس طرح سے ذکر کیا گیا۔ تو نیکی کا بدلہ، جو شخص اس کی تکذیب کرتا ہے وہ بھی مکذبین میں شامل ہو گیا، اس لیے وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ میں وہی آیت دوہرا دی گئی، ''تکذیب کرنے والوں کے لئے اس دن خرابی ہو گی'' جو اس بات کی تکذیب کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ آخرت میں نیکی کا کوئی بدلہ نہیں، آخرت ہی نہیں اس لیے نیکی کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا، اس قسم کے تکذیب کرنے والوں کے لئے خرابی ہے۔ تو جس طرح سے عذاب کی تکذیب کفر، ثواب کی تکذیب بھی کفر، چونکہ دونوں کا تعلق ہی انکارِ آخرت کے ساتھ ہے، تو یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ آخرت میں دیں گے، جو اس کی تکذیب کرتا ہے وہ بھی مکذبین میں شامل ہو گیا۔

''مجرموں'' کے لئے وعید اور ''مجرمین'' کا تعارف

آگے كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ..... اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ یہ قرینہ ہے کہ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا کا خطاب مجرموں کو کیا جا رہا ہے، ''اے مجرمو! تم کھاؤ اور فائدہ اٹھا لو تھوڑی مدت تک'' یعنی دنیا کے اندر تم کھا پی لو، یہ تھوڑا سا وقت تمہیں کھانے پینے کے لئے دیا گیا ہے، ''بے شک تم مجرم ہو، گنہگار ہو''؛ ''کھا لو اور فائدہ اُٹھا لو کچھ مدت، بے شک تم مجرم ہو'' وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: خرابی ہے اُس دن ان لوگوں کے لئے جو کہ جھٹلانے والے ہیں۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ: اور جب انہیں کہا جاتا ہے..... جو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم جھکو، تو وہ جھکتے نہیں، اللہ کے لئے رُکوع کرنے کے لئے کہا جاتا ہے، رُکوع: خشوع، خضوع، جھکنا، عاجزی اختیار کرنا (آلوسی)، اور اس کا مطلب نماز پڑھنا بھی ہو سکتا ہے (عام تفاسیر)، کیونکہ نماز پڑھنا اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا ایک بہت اعلیٰ طریقہ ہے۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم جس کا کھاتے ہو، جس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہو، اس کے سامنے جھک جاؤ، اس کے سامنے تواضع اختیار کرو، خشوع اختیار کرو، یا، نماز پڑھو اس کی شکر گزاری کے طور پر، تو لَا يَرْكَعُوْنَ: یہ جھکتے نہیں ہیں، اللہ کے مقابلے میں بھی اکڑتے ہیں، جو اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی کرتا ہے اس کے سامنے بھی اکڑتے ہیں، وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: ان کی اس اکڑ کا مدار بھی چونکہ تکذیب پر ہے، اگر یہ آخرت کے قائل ہوتے تو ان کی گردنیں اس طرح سے اُونچی نہ ہوتیں، ''تکذیب کرنے والوں کے لئے اس دن خرابی ہو گی۔''

قرآنِ کریم کے بعد کس چیز پر تم ایمان لاؤ گے؟

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ: پس کس بات کے ساتھ اِس قرآن کے بعد یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن ہدایت کے لئے اُتارا، اس میں ہر قسم کی فطری دلیلیں پیش کیں، اَنفسی، آفاقی، ہر قسم کی دلیلیں واضح کر دیں، بار بار تکرار کے ساتھ ایک ایک بات کو سمجھایا، پوری طرح سے علم و حکمت کے تحت ہر چیز کو بیان کیا، اگر یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو قرآن کے بعد کون سی بات اِن کے سامنے آئے گی جس کو یہ مانیں گے، یعنی قرآنِ کریم کے بعد قرآن جیسی مؤثر اور کوئی چیز سامنے نہیں

آسکتی، تو اِن لوگوں کو چاہیے کہ اسی پر ہی ایمان لائیں۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ: کس بات پر اِس قرآن کے بعد ایمان لائیں گے؟ اب یہ بھی چونکہ استفہام ہے، اور پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جہاں اِستفہام کے صیغے آتے ہیں وہاں ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا جواب بھی زبان سے ذکر کیا جائے، سورۂ قیامہ کے آخر میں آیا تھا اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْـيِۦَ الْمَوْتٰى، تو اُس کا جواب ذکر کیا تھا: بَلٰى: کیوں نہیں، اِنَّا عَلٰى ذٰلِكَ لَمِنَ الشّٰهِدِيْنَ، ہم گواہوں میں سے ہیں، ہم اقرار کرنے والوں میں سے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کے زندہ کرنے پہ قادر ہے، یہ جواب ذکر کیا جائے۔ تو اسی طرح سے یہاں یہ سوال ہے کہ کس بات کے ساتھ اِس اللہ کی کتاب کے بعد ایمان لائیں گے؟ تو جواباً ذکر کیا جائے: بِحَدِيْثِكَ يَارَبَّنَا نُؤْمِنُ، اے اللہ! ہم تو تیری بات پر ہی ایمان لاتے ہیں، ہمیں کسی اور دُوسری بات کی ضرورت نہیں ہے، ہم قرآنِ کریم پر ہی ایمان لاتے ہیں، تیری بات پر ایمان لاتے ہیں۔ تو اِس آیت کو سننے کے بعد اس طرح سے جواب ذکر کرنا یہ بھی آدابِ تلاوت میں شامل ہے۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ: پس کس بات پر اِس قرآنِ کریم کے بعد ایمان لائیں گے؟ یعنی اِس کو نہیں مانتے تو اور کون سی اِس سے اچھی بات آئے گی جس کو یہ تسلیم کریں گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

پارہ
عم
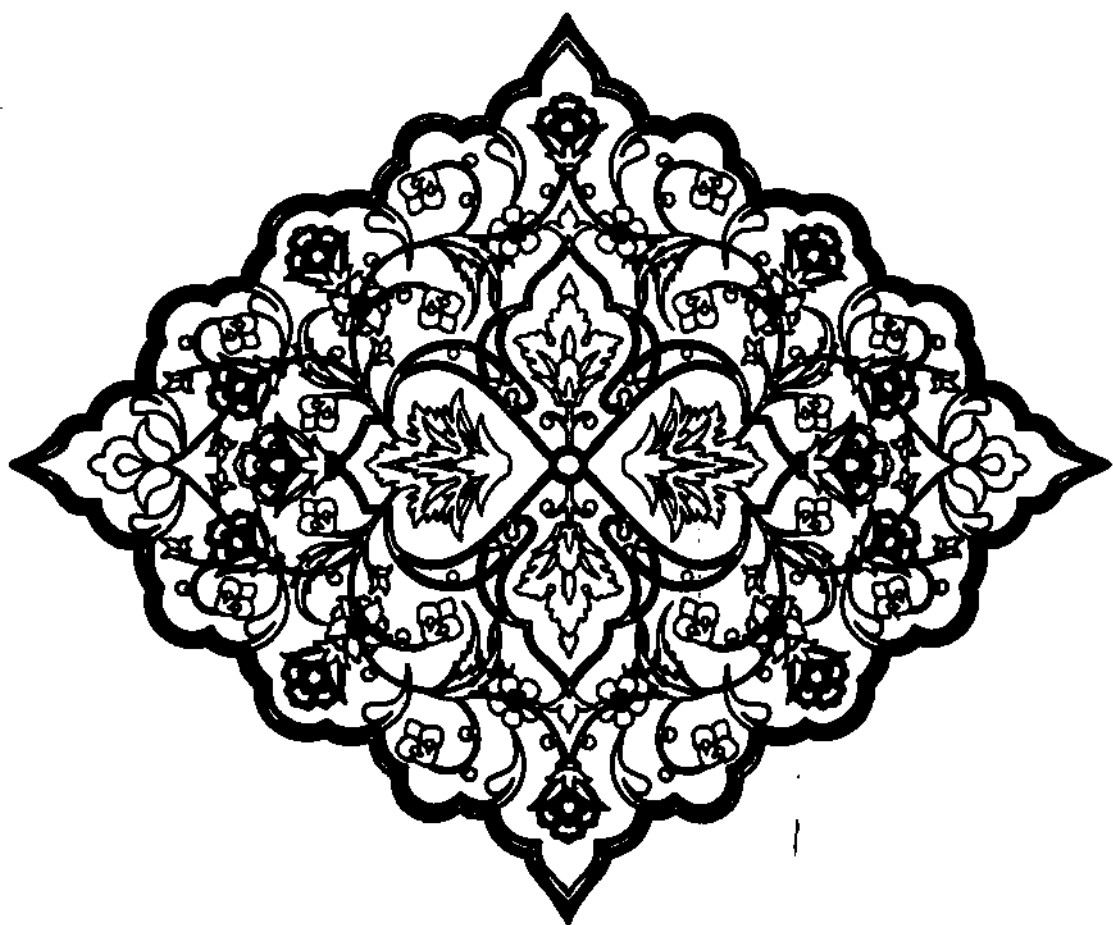
آیاتها ۴۰ — ۷۸ سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ ۸۰ — رکوعاتها ۲

سورۂ نبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چالیس آیتیں ہیں اور اس میں دو رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳

کس چیز کے متعلق یہ آپس میں پوچھ گوچھ کر رہے ہیں؟ ۝۱ بڑے واقعے کے متعلق؟ ۝۲ جس میں یہ اختلاف کرنے والے ہیں ۝۳

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶

ہرگز ایسا نہیں، ان کو عنقریب پتا چل جائے گا ۝۴ پھر ہرگز ایسا نہیں، ان کو عنقریب پتا چل جائے گا ۝۵ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ ۝۶

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ وَّجَعَلْنَا

اور کیا ہم نے پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ ۝۷ اور ہم نے پیدا کیا تمہیں جوڑے جوڑے ۝۸ اور ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا ۝۹ اور بنایا

الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲

ہم نے رات کو لباس ۝۱۰ اور بنایا ہم نے دن کو تمہارے معاش کا وقت ۝۱۱ اور ہم نے تمہارے اُوپر سات مضبوط آسمان بنائے ۝۱۲

وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝۱۴ لِّنُخْرِجَ

اور ہم نے ایک چراغ بنایا چمکتا ہوا ۝۱۳ اور اُتارا ہم نے پانی کے بھرے ہوئے بادلوں سے بہت برسنے والا پانی ۝۱۴ تاکہ ہم نکالیں

بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝۱۵ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝۱۶ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝۱۷ يَّوْمَ يُنْفَخُ

اس پانی کے ذریعے سے غلّہ اور نباتات ۝۱۵ اور گھنے باغات ۝۱۶ بے شک فیصلے کا دن وقت معیّن ہے ۝۱۷ جس دن کہ پھونک ماری جائے گی

فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝۱۸ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۱۹ وَّسُيِّرَتِ

صور میں، پھر آؤ گے تم گروہ در گروہ ۝۱۸ اور کھول دیا جائے گا آسمان پھر وہ ہو جائے گا دروازے ہی دروازے ۝۱۹ اور چلا دیے جائیں گے

الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۰ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝۲۲

پہاڑ، پس ہو جائیں گے وہ ریت ۝۲۰ بے شک جہنم گھات لگانے کی جگہ ہے ۝۲۱ سرکشوں کے لئے ٹھکانا ہے ۝۲۲

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّ

ٹھہرنے والے ہوں گے وہ اس جہنم کے اندر سالہا سال ﴿۲۳﴾ نہیں چکھیں گے اس میں ٹھنڈک نہ کوئی پینے کی چیز ﴿۲۴﴾ سوائے گرم پانی کے

غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

اور پیپ کے ﴿۲۵﴾ بدلہ دیے گئے یہ ایسا بدلہ جو ان کے عملوں کے موافق ہے ﴿۲۶﴾ بے شک وہ لوگ نہیں اُمید رکھتے تھے حساب کی ﴿۲۷﴾ اور جھٹلایا انہوں نے ہماری

كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾

آیات کو جھٹلانا ﴿۲۸﴾ اور ہر چیز کو ہم نے محفوظ کر لیا لکھ کر ﴿۲۹﴾ پھر (انہیں کہا جائے گا) مزہ چکھو تم، ہرگز نہیں زیادہ کریں گے ہم تمہیں مگر ازروئے عذاب کے ﴿۳۰﴾

''مکی'' سورتوں میں عقیدۂ آخرت پر زیادہ زور کیوں؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ نبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۴۰ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رُکوع ہیں۔ ''مکی'' سورتوں میں خصوصیت سے جب کہ وہ اِبتدائی دور کی ہیں زیادہ زور اِثباتِ آخرت پہ دیا گیا ہے، کیونکہ آخرت کا عقیدہ ہی ایک ایسا عقیدہ ہے جس کے ساتھ انسان کی زندگی میں توازن پیدا ہوتا ہے، فکرِ آخرت کے بعد اِنسان صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی کوشش کرتا ہے، اچھائی اور بُرائی میں فرق کرتا ہے، اور مشرکین شدّت کے ساتھ اس بات کا انکار کرتے تھے، تو اس لئے ''مکی'' سورتوں میں مختلف انداز کے ساتھ، عنوان بدل بدل کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخرت کا تذکرہ کیا، اِمکانِ وقوع، اور پھر واقع ہونے کے بعد کے واقعات تفصیل کے ساتھ ذِکر کئے گئے ہیں۔

ماقبل سے ربط

اِس سورت میں بھی سورۂ مرسلات کی طرح آخرت کا ہی ذِکر ہے، وہاں بھی کچھ اِبتدا کے اندر سوالیہ انداز اِختیار کیا گیا تھا لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ، اور یہاں بھی اِبتدا کے اندر سوالیہ انداز ہی ہے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ، اور آگے جا کر یوم الفصل کا ذِکر ہی آئے گا اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا۔ اور پچھلی سورت کے اندر بھی منکرین کا بُرا انجام ذِکر کیا گیا تھا اور اس سورت میں بھی یہی بات آرہی ہے۔ اور گزشتہ سورت کے آخری رُکوع میں متقین کا ذِکر تھا تو اس سورت کے آخر میں بھی متقین کا ذِکر آرہا ہے دُوسرے رکوع میں۔ تو مضمون دونوں کا آپس میں بالکل ملتا جلتا ہے، اندازِ بیان کا فرق ہے۔

تفسیر

''تسائل'' کا مفہوم ومصداق

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ: میم کے بعد اصل کے اعتبار سے الف تھا، عَنْ مَا، مَا استفہامیہ، اور اس کے اُوپر عَنْ جارہ آگیا، تو جس

وقت مَا استفہامیہ کے اُوپر حرف جار آ جائے، مِن ہو، یا عَن ہو، یا کوئی اور ہو، تو آخر سے الف کو گرادیا کرتے ہیں، اس لیے یہاں الف لکھنے میں نہیں آیا۔ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ: تَسَائُل: آپس میں پوچھ گچھ کرنا، آپس میں سوال کرنا۔ اور آپس میں سوال کرنا کبھی تو ہوا کرتا ہے تحقیق کے لئے، جیسے ایک مسئلہ زیرِ بحث آیا تو ہم آپس میں ایک دُوسرے سے پوچھتے ہیں تاکہ اس کے سارے پہلو روشن ہوجائیں، اور ایک آپس میں گفتگو ہوا کرتی ہے اِستہزاءً، ایک بات زیرِ بحث آ گئی اور اس کے اُوپر ایک فقرہ آپ نے کسا، دُوسرے نے دُوسرا فقرہ کس دیا، کیوں بھئی! سنا ہے قیامت آئے گی، اور ہمارے ہزاروں سال کے مرے ہوئے جو باپ دادے پڑے ہیں وہ بھی سارے کے سارے اُٹھ کے آ جائیں گے، کیا ایسا ہی ہوگا؟ اور یہ سارے کے سارے کیے ہوئے عمل بھلا کس نے یاد رکھے ہوں گے؟ اور ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو ان میں کون جان ڈالے گا؟ بھلا یہ باتیں عقل میں آتی ہیں؟ اُدھر سے کوئی کچھ بولتا ہے اُدھر سے کوئی کچھ بولتا ہے، جس طرح سے کسی بات کا مذاق اُڑایا جاتا ہے کسی مجلس کے اندر بیٹھ کے، تو یہ ''تسائل'' اُس قسم کا ہے، آپس میں چہ میگوئیاں کرنا، فقرہ بازی کرنا، اور اِستہزا کے طور پر پوچھ گچھ کرنا، تو عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کا معنی ہوگا کس چیز کے متعلق یہ آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں؟ کس چیز کے متعلق یہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہیں؟ کیا بات ہے جس کے متعلق یہ آپس میں ایک دوسرے پہ سوال کرتے ہیں اِستہزاءً؟

''عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ'' کے دو مفہوم، اور ''مُخْتَلِفُوْنَ'' کا مفہوم

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۝ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ: اس کو اِستفہام کے تحت بھی رکھا جاسکتا ہے، تو پھر اِستفہام کے انداز میں بات یوں ہوجائے گی ''کیا ایک بڑے واقعے کے متعلق یہ گفتگو کر رہے ہیں؟ جس میں کہ یہ اختلاف کرنے والے ہیں، بڑے واقعے کے متعلق یہ پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ جس میں کہ یہ آپس میں اختلاف کر رہے ہیں''، پھر یہ انداز اِستفہامیہ ہے یعنی ان کو ہوش آنی چاہیے کہ کس چیز کے متعلق یہ پوچھ گچھ کرتے ہیں، وہ تو بہت بڑا واقعہ، بہت بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اور بعض مفسرین رحمہم اللہ نے اس کو خبریہ کے انداز میں بھی ذکر کیا، کہ پہلے سوال اُٹھایا گیا کہ کس چیز کے متعلق آپس میں گفتگو کرتے ہیں؟ پھر خود جواب ذکر کر دیا گیا کہ ایک بڑے حادثے کے متعلق، ایک بڑے واقعے کے متعلق جس میں اِن کو اختلاف ہے...... اختلاف مسلمانوں کے ساتھ بھی ہے، اور اختلاف آپس میں بھی کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا، کوئی کہتا ہے اگر ہوا بھی تو ہمارے معبود چھڑالیں گے، کوئی کہتا ہے کہ ہم چونکہ فلاں کی اولاد میں سے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے فلاں ہمیں بچالے گا، اس قسم کی مختلف باتیں یہ کرنے والے ہیں...... تو خبریہ انداز ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اظہار ہوگیا کہ آپس میں یہ جو سوال کر رہے ہیں تو ایک بڑے واقعے کے متعلق سوال کر رہے ہیں جس میں ان کو اختلاف ہے، جس میں یہ اختلاف کرنے والے ہیں۔ اور اگر اِستفہام کے تحت رکھیں گے پھر بات ویسے ہوگی ''کس چیز کے متعلق یہ آپس میں پوچھ گچھ کرتے ہیں؟ بڑے واقعے کے متعلق؟ جس میں یہ اختلاف کرنے والے ہیں'' یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ اس نبأ عظیم کو سُن لینے کے بعد ان کی نیند حرام ہوجاتی، ان کا کھانا پینا چھوٹ جاتا، کہ

یہ ہماری زندگی مجرمانہ ہے، مرنے کے بعد اگر ہم اُٹھیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہمارا کیا حال ہوگا؟ لیکن یہ ایسے غافل ہیں کہ اُلٹا اسی کا ہی مذاق اُڑا رہے ہیں۔

آیاتِ قدرت کی ماقبل کے ساتھ مناسبت

انکار کرنے کی وجہ چونکہ اکثر و بیشتر یہ ہوا کرتی تھی کہ ان کو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے کیا جاسکتا ہے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیشہ آخرت کے اِثبات کے ساتھ اپنی قدرت کا اِثبات فرمایا کرتے ہیں، بہت ساری سورتوں میں آپ کے سامنے یہ انداز گزر گیا، اسی طرح سے یہاں بھی اللہ تعالیٰ آگے اپنی قدرت کا اظہار فرماتے ہیں، جس کے ساتھ یہ بات واضح ہوگی کہ ایسے عظیم القدرت کے لئے مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

مشرکین کے لئے وعید

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ، ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ: یہ تو اِنکار ہے ان کے اس قسم کے اِستہزا پر، (آیاتِ قدرت اس کے بعد شروع ہورہی ہیں)، یہ جو کہتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی، مرنے کے بعد دوبارہ جینا نہیں ہے، كَلَّا: ہرگز ایسا نہیں سَيَعْلَمُوْنَ: اِن کو عنقریب پتا چل جائے گا، اور پھر دوبارہ تاکید کے طور پر کہا جارہا ہے ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ: پھر ہرگز ایسا نہیں جیسے یہ لوگ کہتے ہیں، اِن کو عنقریب پتا چل جائے گا، بہت قریب وقت آرہا ہے، اور اُس قریب وقت سے مراد ہے موت کا وقت، کیونکہ جس وقت انسان مرتا ہے تو اسی وقت ہی عالمِ آخرت کے واقعات منکشف ہونا شروع ہوجاتے ہیں، جیسے مشہور ہے: ''مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ'' کہ جو شخص مرجائے اس کی تو قیامت آگئی، کیونکہ قیامت کے واقعات اس کے سامنے اسی وقت ہی نمودار ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ تو اس وقت ان کو پتا چل جائے گا کہ جو کچھ اللہ اور اس کا رسول بیان کرتا تھا وہی باتیں صحیح تھیں اور ان کا انکار کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

آیاتِ قدرت واِنعامات

آگے وہی! قدرت کا اِظہار ہے جس کے اندر اِنعامات بھی ہیں، اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا: مہاد: بچھونا، کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ یہ کتنی بڑی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور کتنا بڑا اِنعام ہے جو زمین کی شکل میں انسانوں پہ کیا، جس طرح سے انسان بچھے ہوئے بستر پر آرام کرتا ہے اسی طرح سے انسان کے لئے زمین بھی آرام گاہ ہے۔

پہاڑوں میں قدرت واِنعامات

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا: اوتاد وَتَد کی جمع ہے، وَتَد: میخ کو کہتے ہیں، یہ کیل جو ٹھونکی جاتی ہے، ''اور کیا ہم نے پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟'' یہ مضمون آپ کے سامنے کتنی دفعہ پہلے گزر چکا کہ یہ پہاڑ جو اللہ نے بنائے ہیں یہ اس طرح سے ہیں جس طرح سے تختوں میں میخیں گاڑ دیں، اور اس کے ساتھ زمین اپنی جگہ مضبوط ہوگئی اور متوازن ہوگئی، اور ان پہاڑوں کا بہت بڑا دخل ہے زلزلوں کے

روکنے میں، اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو یہ زمین کسی ایک طرف کو ڈھلک جاتی، کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو، اور اس کے اُوپر آبادی ممکن نہ ہوتی، پہاڑ قائم کر کے اللہ تعالیٰ نے اِس کی اِس متزلزل حرکت کو روک دیا، بہت ساری سورتوں کے اندر یہ بات واضح کی گئی اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ تا کہ یہ زمین تمہیں لے کر ایک طرف کو مائل نہ ہو جائے (سورۂ نحل: ۱۵ وغیرہ)، اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا وزن ڈال کر اس کو متوازن کر دیا، پہاڑوں میں بہت ساری حکمتیں ہیں، مختلف آیات کے اندر اُن کا ذِکر گیا، پچھلی سورت کے اندر بھی ذکر آیا تھا وَ جَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ، ہم نے اِس زمین کے اندر مضبوط مضبوط اُونچے اُونچے پہاڑ بنائے، وَّ اَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا، اور ہم نے تمہیں خوشگوار پانی پلایا، وہاں کچھ آپس میں مناسبت معلوم ہو رہی تھی کہ پہاڑوں کی بلندی یہ پانی کے نظم ونسق کے ٹھیک رکھنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قائم کی ہے اپنی حکمت کے تحت، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ پہاڑوں سے ہواؤں کے رُخ متعین ہوتے ہیں، بادلوں کا نظم قائم ہوتا ہے، اور بارشیں اِن کے ذریعے سے ہوتی ہیں، پھر پہاڑوں کے اندر پانی کا ذخیرہ ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں کے اُوپر کروڑوں مَن پانی برف کی شکل میں جما کر رکھ دیا جاتا ہے، تو دُوسرے موقع پر پھر پگھل پگھل کر ساری دُنیا کے اندر پھیلتا ہے اور لوگ اس پانی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تو پانی کی تقسیم میں، ہواؤں کے چلنے میں، بادلوں کے آنے جانے میں بھی پہاڑوں کا دخل ہے، اور اسی طرح سے زمین کی متزلزل حرکت کے روکنے کے لئے بھی پہاڑ کارآمد ہیں، اور اس میں کتنی حکمتیں ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں!

اِنسانی زندگی کا نظم جوڑے سے ہی ٹھیک رہتا ہے!

وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا: اور ہم نے تمہیں جوڑے جوڑے بنایا، اور ہم نے پیدا کیا تمہیں جوڑے جوڑے، اَزواج زوج کی جمع ہے، تمہیں جوڑے جوڑے پیدا کیا یعنی تمہارے ساتھ تمہاری زوجہ بھی پیدا کی، جس طرح سے حضرت آدم علیہ السلام کا پیدائش کا قصہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ذِکر کیا، تو آدم کو پیدا کرنے کے بعد آدم کی بیوی اسی وقت بنادی۔ اور یہ بیوی کا نظم جو اللہ نے ساتھ ساتھ بنایا ہے یہ بھی انسان کے اُوپر بہت بڑا احسان ہے، بہت بڑا احسان فرمایا، کیونکہ سکون، اطمینان اور گھریلو زندگی دُرست ہوتی ہے تو اسی جوڑے کے ساتھ ہی دُرست ہوتی ہے، تو اس میں قدرت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا اِنعام بھی نمایاں ہے، پچھلی سورت کے اندر بھی آیا تھا کہ ایک ہی قطرہ پانی کا ہے جو ٹپکایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے مذکر اور مؤنث دونوں بنا دیتے ہیں، سورۂ قیامہ کے آخر میں ذِکر آیا تھا۔ تو اِس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی ہے اور اِنسان کے اُوپر ایک اِنعام بھی ہے کہ انسان کے ساتھ دُوسرا جوڑا بنادیا جس کے ساتھ اس کی زندگی میں اطمینان اور سکون پیدا ہوا، یہ ایسے ہے جیسے گاڑی کے دو پہیے ٹھیک ہو گئے تو پھر رفتار ٹھیک رہتی ہے، اکیلا مرد یا اکیلی عورت دُنیا کے اندر اطمینان کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا، بہت سی ضرورتیں ایسی ہیں جو عورت سے متعلق ہیں، عورت کا وجود ہی ان کو پورا کر سکتا ہے، اور بہت ساری ضرورتیں ایسی ہیں جو مَردوں سے متعلق ہیں، تو یہ جوڑا ملتا ہے تو زندگی کا نظم ٹھیک ہوتا ہے۔

نیند میں قدرت و اِنعام کا پہلو

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا: اور ہم نے تمہاری نیند کو سبات بنایا، سبات یہ سَبَتَ سے ہے، سَبَتَ قَطَعَ کے معنی میں، ''ہم نے تمہاری نیند کو سبات بنایا'' اَیْ قَطْعًا لِاَعْمَالِكُمْ وَرَاحَةً لِاَبْدَانِكُمْ، ہم نے تمہاری نیند کو ایسا بنایا کہ جس کے ساتھ تمہارے کام ختم ہوجاتے ہیں، حرکت ختم ہوجاتی ہے، جس کے نتیجے میں تمہیں راحت حاصل ہوتی ہے، حاصل ترجمہ کردیا جاتا ہے کہ ''ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا'' لیکن آرام کا ذریعہ سبات کا لفظی معنی نہیں، لفظی معنی ہے ''اعمال کے قطع کرنے کا ذریعہ ہم نے اس کو بنایا'' تمہارے کام ختم ہوجاتے ہیں، اَفکار ختم ہوجاتے ہیں، تمہیں راحت اور آرام حاصل ہوجاتا ہے۔ تو نیند جو ہے یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے، کیونکہ نیند کے ساتھ انسان کی تھکاوٹ دُور ہوتی ہے، اور جس وقت سویا ہوا اُٹھتا ہے انسان تو بالکل اس طرح سے ہے جس طرح سے تازہ دم ہوتا ہے، ''اوور ہال'' جس طرح سے ہوگیا، تھکاوٹ ختم ہوگئی، نئے سرے سے انسان کی قوتِ عملیہ مضبوط ہوجاتی ہے، تو نیند اللہ تبارک وتعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور یہ ایک ایسی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے غریبوں کو بمقابلہ سرمایہ داروں کے زیادہ دی ہے، آج کل بڑے بڑے سرمایہ دار جتنے بھی ہیں، سب جس طرح سے اور مصیبتوں میں مبتلا ہیں، ایک مصیبت اُن پہ یہ بھی ہے کہ انہیں نیند نہیں آتی جس وقت تک کہ خواب آور گولیاں نہ کھائیں، پھر بھی کروٹیں لیتے رہتے ہیں، اور غریب آدمی جس وقت اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر مست ہو کر سوتا ہے، اور جس وقت صبح اُٹھتا ہے تو بالکل تازہ بہ تازہ، اور ساری کی ساری قوتیں دُرست، ٹھیک ٹھاک ہو کے دوبارہ اپنے کام میں شروع ہوجاتا ہے۔ بہت بڑی نعمت ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کہ نیند اِنسان کو صحیح طور پہ آجائے، تو یہ بھی نعمت بیان فرمائی۔

نیند اِثباتِ آخرت کی دلیل ہے

اور پھر نیند کا آنا اور پھر جاگنا یہ دونوں کے دونوں اِثباتِ آخرت کے لئے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطور دلیل کے قرآنِ کریم میں کئی جگہ ذِکر فرمائے ہیں، سوجانا ایسے ہے جیسے انسان مرگیا، اور سونے کے بعد اُٹھنا ایسے ہے جیسے بعث بعد الموت، اسی لئے سرورِ کائنات ﷺ جو دُعا جاگنے کے بعد پڑھا کرتے تھے اس میں بھی یہی لفظ آتے ہیں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ''(۱) کہ سویا ہوا اِنسان اُٹھے تو اُٹھتے ہی یہ دُعا پڑھے کہ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں موت کے بعد دوبارہ زندگی دے دی۔ تو نیند ایسے ہے جیسے موت آگئی، اور سو کے اُٹھنا ایسے ہے جس طرح سے دوبارہ زندگی حاصل ہوگئی، اسی سے پھر آخرت کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ کہ حقیقتاً جو موت آئے گی اس موت کے بعد بھی اُٹھنا اور اُٹھ کے جانا اللہ کی طرف ہی ہے۔ ویسے بھی حدیث میں ہے ''اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ''(۲) کہ نیند موت کی بہن ہے، ''سویا مویا برابر'' ہمارے محاورے

---

(۱) بخاری ۲/ ۹۳۶ باب ما یقول اذا اصبح/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۸ باب ما یقول عند الصباح... الخ کی دُوسری حدیث۔

(۲) مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۰ باب صفۃ الجنۃ کی آخری حدیث/ شعب الایمان للبیہقی ۶/ ۴۰۹، رقم الحدیث: ۴۴۱۶۔

میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، تو یہ نعمت ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت کے لئے ایک دلیل بھی ہے، ''اور بنائی ہم نے تمہاری نیند تمہارے لیے راحت کا ذریعہ۔''

رات اور دِن میں قدرت واِنعام کا پہلو

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا: اور ہم نے رات تمہارے لئے لباس بنادی، جس طرح سے لباس انسان کو چھپالیتا ہے اور اس کے لئے راحت کا باعث ہے، اسی طرح سے رات کی تاریکی بھی چھپالیتی ہے اور اس تاریکی کے ساتھ انسان کو صحیح معنی میں آرام حاصل ہوتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ روشنی میں ایسی شان دار نیند نہیں آیا کرتی جیسی تاریکی میں آتی ہے، تو بہت ساری چیزوں کے لئے رات پردہ بن جاتی ہے،'' بنایا ہم نے رات کو لباس۔'' وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا: معاش اصل کے اعتبار سے تو مصدر میمی ہے، عَاشَ يَعِيْشُ: زندگی گزارنا، معاش سے یہاں وقتِ معاش مراد ہے (آلوسی)، ''اور بنایا ہم نے دِن کو تمہارے معاش کا وقت'' کہ جس میں تم کماتے ہو، کھاتے ہو، اپنی زندگی گزارنے کے اسباب مہیا کرتے ہو۔ دِن گویا کہ کام کاج کے لئے ہوگیا اور رات آرام کے لئے ہوگئی، اصل وضع اِسی لیے ہے۔

آسمان سورج اور بارش میں قدرت واِنعام کا پہلو

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا: سَبْعًا: سات، شداد: شدید کی جمع ہے، اور ہم نے تمہارے اُوپر سات مضبوط آسمان بنائے، وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا: اور ہم نے ایک چراغ بنایا چمکتا ہوا، وھاج: جوش مارتا ہوا، چمکتا ہوا، جس میں روشنی اور گرمی جوش مار کے آتی ہے، اور اس سے سورج مراد ہے، سورج سے روشنی بھی آتی ہے اور گرمی بھی آتی ہے، جس کے ساتھ زمین کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا: ثجاج: کے معنی بہت بہنے والا، اور مُعْصِرات: مُعْصِرَۃٌ کی جمع ہے، نچڑنے والے بادل، یعنی یہ پانی کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں، نچڑنے کے قریب ہیں، ''اور اُتارا ہم نے پانی کے بھرے ہوئے بادلوں سے بہت بہنے والا پانی، بہت برسنے والا پانی'' موسلا دھار بارش اُتاری۔ اب آسمان کی طرف سے بارش بھی ہوتی ہے، اور آسمان کی طرف سے سورج کے ذریعے سے روشنی اور گرمی بھی آتی ہے، یہ ساری کی ساری نعمتیں ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے دلائل بھی ہیں، عظیم قدرت کی نشانیاں بھی ہیں، جن کے ساتھ یہ بات بھی آسان ہوجاتی ہے کہ ایسی قدرتوں والے کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک دفعہ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کردے۔'' اُتارا ہم نے نچڑنے والے بادلوں سے بہت بہنے والا پانی'' لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا: تا کہ نکالیں ہم اس پانی کے ذریعے سے غلہ اور نباتات، حب یہ غلہ ہوگیا، اور نبات یہ مطلقاً نباتات جتنی بھی ہے۔ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا: الفاف لَفٌّ یا لَفِيْفٌ کی جمع ہے، لپٹنے والے گھنے، جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں، ''اور گھنے باغات'' جنّات جنت کی جمع آگئی، اور الفاف کے معنی گھنے، جو درخت آپس میں لپٹے ہوئے ہیں،'' تا کہ نکالیں ہم اس پانی کے ذریعے سے غلہ اور نباتات اور خوب گھنے باغات۔''

دونوں نفخوں کے واقعات ایک ہی دِن میں ہوں گے

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا: یہ آ گئی اصل بات، بے شک فیصلے کا دِن البتہ وقت معین ہے، كَانَ مِیْقَاتًا اس کا وقت متعین کیا ہوا ہے، میقات: متعین وقت، ''فیصلے کا دِن ایک متعین وقت ہے'' یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ: جس دِن کہ صور میں پھونک ماری جائے گی، فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا: پھر تم آ جاؤ گے گروہ در گروہ، افواج: فوج کی جمع ہے، اور اس نفخِ صور سے ثانی نفخہ مراد ہے، کیونکہ گروہ در گروہ قبروں سے نکل کے آنا یہ نفخِ ثانی کے وقت ہی ہوگا، تفصیل آپ کے سامنے بارہا آ چکی کہ نفخے دو ہیں، پہلے نفخے کا اثر ہوگا کہ یہ جہان ٹوٹ پھوٹ جائے گا، اور دوسرے نفخے کا اثر ہوگا کہ مُردے وغیرہ سب نکل آئیں گے اور زمین دوبارہ ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو جائیں گے حساب کتاب کے لئے۔ تو نفخۂ اُولیٰ سے لے کے جو قیامت کا دِن شروع ہوگا آگے وہ سب ایک ہی دِن ہے، اس لئے اس کے اندر دونوں قسم کے واقعات بیان کر دیے جاتے ہیں جو واقعات نفخۂ اُولیٰ کے بعد پیش آئیں گے یا جو واقعات نفخۂ ثانیہ کے بعد پیش آئیں گے، کیونکہ دِن ایک ہی شروع ہو گیا قیامت کا نفخۂ اُولیٰ سے، اس دِن میں جو واقعات بھی پیش آئیں گے وہ ایک ہی دِن کے واقعات ہیں چاہے نفخۂ اُولیٰ کے بعد کے ہوں چاہے نفخۂ ثانیہ کے بعد کے ہوں۔

''صور'' کسے کہتے ہیں؟

''جس دِن کہ پھونک ماری جائے گی صور میں'' صور اصل میں بجانے والی چیز کو کہتے ہیں، جس طرح سے بگل بجایا جاتا ہے، فوجوں کی جب پریڈ ہونے لگتی ہے تو بگل بجاتے ہیں جس سے سارے کے سارے فوجی اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور پھر دوبارہ جس وقت ان کو منتشر کرنا ہوتا ہے پھر بگل بجاتے ہیں تو سارے منتشر ہو جاتے ہیں، یا اس کی ادنیٰ سی مثال آپ کے مدرسے کی گھنٹی ہے، کہ کبھی اکٹھا کرنے کے لئے بجائی جاتی ہے، کبھی منتشر کرنے کے لئے بجائی جاتی ہے، اسی طرح سے پہلی آواز جو اس میں سے آئے گی وہ آئے گی ذرات منتشر کرنے کے لئے، زمین آسمان پہاڑ ہر چیز منتشر ہو جائے گی، اور اِسرافیل دوبارہ اس کے اندر پھونک ماریں گے اللہ کے اِذن کے ساتھ، وہ آواز جو پیدا ہوگی تو ساری چیز موجود ہو جائے گی۔

گروہ در گروہ آنے کا مطلب

فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا: تم آؤ گے گروہ در گروہ، فوج در فوج، ہر اُمت علیحدہ فوج ہوگی، پھر اُمت کے اندر مختلف گروہ، جیسے سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت کے اندر پھر مختلف گروہ بنتے چلے جائیں گے، حنفی علیحدہ ہوں گے، شافعی علیحدہ ہوں گے، پھر حنفیوں میں جتنے طبقے ہیں اچھے بُرے ہر قسم کے لوگ علیحدہ علیحدہ اکٹھے ہوتے چلے جائیں گے، یعنی کافر علیحدہ، مسلمان علیحدہ، پھر مسلمانوں کے اندر مختلف قسم کے طبقات، ایک ایک بزرگ سے تعلق رکھنے والے، مرکزی شخصیات، اِن کے ساتھ مل مل کر سارے کے سارے لوگ گروہ در گروہ آئیں گے، اسی طرح سے بُروں کے بھی گروہ بنتے چلے جائیں گے، ایک ایک قسم کے لوگ ایک طرف اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ ''آؤ گے تم گروہ در گروہ۔''

قیامت کے دِن آسمان اور پہاڑوں کی حالت

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا: اور کھول دیا جائے گا آسمان پھر وہ ہوجائے گا دروازے ہی دروازے، یوں پھٹ جائے گا جس طرح سے کسی عمارت کے دروازے کے دروازے ہی دروازے کھول دیے جائیں، وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ: اور چلا دیے جائیں گے پہاڑ، فَكَانَتْ سَرَابًا: پس ہوجائیں گے وہ ریت، سراب کہتے ہیں اس ریت کو جو دُور سے چمکتی ہوئی نظر آیا کرتی ہے۔ دریاؤں کے کنارے پر، ریگستان میں دوپہر کو اگر آپ دیکھیں جس وقت خوب دُھوپ نکلی ہوئی ہو تو دُور سے وہ ریت ایسے معلوم ہوا کرتی ہے جس طرح سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا ہے اور جب پاس جائیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا، سورۂ نُور کے اندر بھی اس کی تفصیل آئی تھی، مطلب یہ ہے کہ ریزہ ریزہ ہوکر ریت کی طرح سارے کے سارے پہاڑ ہوجائیں گے۔

جہنم سرکشوں کا ٹھکانا ہے

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا: مِرْصَادًا یہ لفظ رَصد سے لیا گیا ہے، رصد انتظار کرنے کو کہتے ہیں، مِرصاد: انتظار کرنے کی جگہ، یہ وزن اگرچہ بظاہر آلہ کا ہے لیکن اس میں مکان والا معنی ہے، گھات لگانے کی جگہ، جس طرح سے کوئی مورچہ لگا کے بیٹھا ہوا ہو اور کسی کا منتظر ہو کہ جب یہ گزرے گا تو میں اس کو پکڑلوں گا، تو مرصاد کا معنی یہ ہوا کرتا ہے، گھات، گھات لگانے کی جگہ، جہاں کوئی انسان دُوسرے کو تاکنے کے لئے بیٹھا ہو، ''بے شک جہنم گھات ہے، گھات لگانے کی جگہ ہے'' فرشتے وہاں تاک میں بیٹھے ہیں، جس وقت مجرم آئیں گے اسی وقت ان کو پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینکنا شروع کردیں گے، ''بے شک جہنم گھات لگانے کی جگہ ہے۔'' لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا: اور سرکشوں کے لئے ٹھکانا ہے، مآب: ٹھکانا، لِلطَّاغِيْنَ: سرکشوں کے لئے: ''سرکشوں کے لئے ٹھکانا ہے'' سرکش: جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں سرکشی کرتے ہیں، اِن کے اب آگے درجات نکل آئیں گے، جو تو اتنی سرکشی اختیار کریں کہ ایمان ہی نہ لائیں تو وہ کافر ہوگئے، اور اگر ایمان لانے کے بعد پھر دوسرے اَحکام سے سرکشی کرتے ہیں تو وہ فاسق ہوگئے، قاعدے کے اعتبار سے جہنم میں دونوں ہی جائیں گے، یہ علیحدہ بات ہے کہ انجام کے اعتبار سے فرق ہوجائے، کہ جو کافر ہیں ان کو نکلنا نصیب نہیں ہوگا، جو فاسق ہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت، اللہ کی رحمت سے، یا کسی کے سفارش کرنے سے یا اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر وہ نکل بھی آئیں گے، بہرحال جیسا جیسا طغیان اور عصیان ہوگا ویسی ویسی سزا ہوگی، لیکن یہاں سے اشارہ کافروں کی طرف ہی ہے جیسے کہ آگے آئے گا كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا، آیات کی تکذیب یہ چونکہ کافروں کا ہی کام ہے تو یہاں طاغین کا مصداق کافروں کو ہی بنایا گیا ہے، مسئلہ ویسے یہی ہے کہ چاہے وہ طغیان وعصیان کُفر تک پہنچا ہوا ہو، چاہے کُفر تک پہنچا ہوا نہ ہو، فسق وفجور کے درجے میں ہو، اصل کے اعتبار سے دونوں ہی جہنم میں جائیں گے، دونوں جہنم میں بھیجے جائیں گے، باقی یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے فاسقوں کو جلدی معاف کردے، کسی کے کہنے سے معاف کردے، یا سزا بھگت کر، بہرحال فاسقین نکل جائیں گے جن کا ایمان محفوظ ہے، اور جن کے پاس ایمان نہیں ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے، دوسری آیات کے اندر یہ تفصیل موجود ہے۔ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا: اَحقاب حقب کی جمع، زمانہ دراز، ''ٹھہرنے والے ہوں گے وہ اُس جہنم کے اندر قرن ہا قرن، سال ہا سال''

جس کی کوئی اِنتہا نہیں، خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا کے ساتھ جس طرح سے قرآنِ کریم کے اندر ذکر کر دیا گیا ہے،[1] کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس میں رہنے والے ہوں گے جبکہ کافر ہوں، اور فاسق ہوں گے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنا زمانہ ٹھہریں گے اور بعد میں ان کو نجات ہو جائے گی، "ٹھہرنے والے ہوں گے اُس جہنم کے اندر قرن ہا قرن، سال ہا سال" یعنی مدت دراز تک۔

جہنم میں کسی قسم کی راحت نہیں ہوگی

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا: نہیں چکھیں گے اُس جہنم میں ٹھنڈک نہ کوئی پینے کی چیز، نہ اُن کو پینے کی چیز ملے گی چکھنے کے لئے، نہ ٹھنڈک نصیب ہوگی، بَرْدًا یہاں نکرہ ذکر کر دیا گیا ہے نفی کے نیچے، اور نکرہ تحت النفی عموم کو چاہا کرتا ہے، کسی قسم کی ٹھنڈک وہ محسوس نہیں کریں گے، ٹھنڈک ایک تو یہ ہوتی ہے جو ظاہری بدن کو لگتی ہے، کہ موسم ٹھنڈا ہو گیا، گرمی چلی گئی، اور اس کے علاوہ برد کا اطلاق بعض دوسری چیزوں پر بھی ہوتا ہے، کوئی اچھی خبر سُن لی جس سے انسان کے دل میں ٹھنڈک پہنچ گئی، جس کو آپ کہتے ہیں کہ ہاں ٹھر گیا، اور دِل ٹھنڈا ہو جاتا ہے انسان کا، کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، کسی اچھی چیز کے دیکھنے کے ساتھ، کسی اچھی خبر کے سننے کے ساتھ، تو ان کو کوئی کسی قسم کی ٹھنڈک نصیب نہیں ہوگی، نہ یہ ایسی خبر سنیں گے جو ان کے لئے باعثِ ٹھنڈک ہو، اور نہ کوئی ایسی چیز ان کی آنکھوں کے سامنے آئے گی جس کے ساتھ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، بہر حال برد کسی قسم کی ہو اس کو یہ جہنمی نہیں چکھیں گے، "نہیں چکھیں گے اُس جہنم کے اندر ٹھنڈک کو"۔ وَّلَا شَرَابًا: اور نہ پینے کی چیز کو، پینے کی چیز کوئی بھی نہیں ملے گی۔

جہنمیوں کا مشروب

اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا: اس کو شَرَابًا سے مستثنیٰ کر لیا گیا، نہیں چکھیں گے وہ اس جہنم کے اندر پینے کی چیز سوائے گرم پانی کے اور پیپ کے، یعنی گرم پانی اور پیپ تو ملے گا تو اس کو آپ جانتے ہیں کہ عرفاً ہم مشروب نہیں کہہ سکتے، مشروب سے مراد ایسا مشروب ہوتا ہے جو انسان کی پیاس بجھائے، باعثِ راحت ہو، لیکن یہ گرم پانی کھولتا ہوا، جس کو منہ کے قریب کریں تو وہ ہونٹوں کو جلا دے، پیٹ میں چلا جائے تو انتڑیوں کو کاٹ دے، یہ کیسا مشروب ہے، یہ تو نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ نہ ہونے سے بھی برا ہے۔ حمیم گرم پانی ہو گیا، غَسَّاق کہتے ہیں پیپ کو یا زخموں کے دھوون کو، یعنی جہنمیوں کے زخموں سے جو لہو پیپ اور ان کا پسینہ جو کچھ ہو گا سب اکٹھا ہو کے ایک گڑھے کے اندر جمع ہوتا چلا جائے گا، جہنمیوں کو پینے کے لئے وہی دیا جائے گا، جیسے سورۂ ابراہیم کے اندر لفظ آیا تھا یُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ۝ یَّتَجَرَّعُهٗ، پینے کے لئے جو پانی دیا جائے گا وہ پیپ ہو گا، صدید پیپ کو کہتے ہیں، اسی طرح سے غساق یہ لہو، پیپ، پسینہ سب کا مجموعہ ہے، زخم وغیرہ نچڑ کر جو کچھ جائے گا اس کو غساق کہتے ہیں، اور وہی ان کو پینے کے لئے دیں گے۔ جَزَآءً وِّفَاقًا: جُوْزُوْا جَزَآءً مُّوَافِقًا لِاَعْمَالِهِمْ، بدلہ دیے گئے یہ ایسا بدلہ جو کہ ان کے عملوں کے موافق ہے، جیسے انہوں نے عمل کیے تھے ویسا اُن کو بدلہ مل گیا۔

---

(۱) سورۃ النساء: آیت ۱۶۹۔ سورۃ الاحزاب: آیت ۶۵۔ سورۃ الجن: آیت ۲۳۔

کافروں کی بنیادی خرابی

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا: بنیادی طور پر ان میں خرابی یہی تھی کہ بے شک یہ لوگ حساب کی اُمید نہیں رکھتے تھے، ان کو یہ اندیشہ ہی نہیں تھا کہ کل کو ہم نے اللہ کے سامنے جا کر حساب دینا ہے، اگر اِن کو یہ اُمید ہوتی کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اس بات کا اندیشہ ہوتا (رَجاء خوف اور اُمید دونوں کے معنی کو اَدا کرتا ہے) اگر ان کو یہ اندیشہ ہوتا کہ اللہ کے سامنے حساب دینا ہے تو پھر یہ اتنی طغیان اور سرکشی اختیار نہ کرتے۔ تو ان کے سرکشی اختیار کرنے کی وجہ، جو سرکشی ان کو جہنم میں لے جانے کا باعث بنی، یہی ہے کہ ان کو حساب کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لئے جو شخص اپنی زندگی کے اندر حساب کا اندیشہ پیدا کر لے، ہر وقت اس کو خوف ہو کہ میں جو کر رہا ہوں کل کو میں نے اِس کا حساب دینا ہے وہ شخص اپنے اعمال کی اصلاح کر لیتا ہے، پھر وہ زیادہ غلط کاری کی طرف نہیں جایا کرتا، اس کا ہر عمل ایک صحیح طریقے پر آجایا کرتا ہے، حساب کا اندیشہ ایک بہت بڑی سعادت ہے اگر کسی کے دل کے اندر آجائے، خوفِ آخرت اور حساب کا اندیشہ۔ ''بے شک وہ لوگ نہیں اندیشہ کرتے تھے، نہیں اُمید رکھتے تھے حساب کی'' اُمید کے اندر یہاں خوف والا معنی ہے۔ وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا: كِذَّابًا یہ كَذَّبُوْا کا مفعول مطلق ہے، اور جھٹلایا انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلانا، جس وقت ہم ان کے سامنے اپنی آیات پیش کیا کرتے تھے اس کی یہ تکذیب کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ ہے

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا: كِتٰبًا مکتوبًا کے معنی میں، ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لکھ کر، لکھی ہوئی ہر چیز ہمارے پاس محفوظ ہے، اس لئے کسی کا کوئی عمل، کسی کا کوئی قول، کسی کا کوئی حال مخفی نہیں، نامۂ اَعمال کی شکل میں اس دن سب کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، جیسے آخر میں لفظ آئے گا يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ: جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے انسان اُس کو دیکھ لے گا، نامۂ اَعمال کی شکل میں سب کچھ اس کے سامنے آجائے گا۔ ''بے شک ہم نے محفوظ کیا ہے ہر چیز کو لکھ کر'' اَحْصَيْنٰهُ کی ''ہٗ'' ضمیر كُلَّ شَيْءٍ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ''ہر چیز، ہم نے اس کو شمار کر لیا لکھ کر، محفوظ کر لیا لکھ کر۔'' فَذُوْقُوْا: پھر انہیں کہا جائے گا، ذوقوا اُمر کا صیغہ ہے، کہ مزہ چکھو تم، فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا: ہر گز نہیں زیادہ کریں گے ہم تمہیں مگر از روئے عذاب کے، ہم تمہارا عذاب ہی بڑھائیں گے اور کچھ نہیں، یعنی یہ نہیں کہ تمہارا عذاب ختم ہو کے کسی قسم کی راحت ہو جائے، نہیں! دِن بدن عذاب میں اضافہ ہوگا...... یہ تو بُروں کا انجام تھا، آگے مقابلۃً نیکوں کا انجام ذکر کیا جا رہا ہے، اور یہ دونوں راستے واضح کر دینے کے بعد انسان کے لئے سوچنا آسان ہو جاتا ہے کہ ہمیں کس گروہ میں شامل ہونا چاہیے؟

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّكَاْسًا
بے شک متقین کے لئے کامیابی ہے ﴿۳۱﴾ یعنی باغات اور انگور ﴿۳۲﴾ اور نوخواستہ نوخیز لڑکیاں ہم عمر ﴿۳۳﴾ اور چھلکتے ہوئے

وِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ﴿٣٥﴾ جَزَآءً مِّن رَّبِّكَ عَطَآءً

جام۞ نہیں سنیں گے اس جنت میں کوئی بیہودہ بات اور نہ جھٹلانا۞ بدلہ دیے گئے یہ تیرے رب کی طرف سے عطا

حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُونَ

کافی۞ وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان میں ہیں، بہت رحم کرنے والا ہے، نہیں مالک ہوں گے

مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ

اس اللہ سے خطاب کرنے کے۞ جس دن کہ روح اور فرشتے قطاریں باندھ کر کھڑے ہوں گے، بات نہیں کریں گے مگر وہ شخص (بات کرے گا)

أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَن شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهِ

جس کو رحمٰن اجازت دے دے اور وہ بات بھی درست کہے۞ یہ دن حق ہے، پس جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا اختیار

مَاٰبًا ﴿٣٩﴾ إِنَّآ أَنذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ

کرلے۞ بے شک ہم نے تمہیں ڈرادیا ہے قریب آنے والے عذاب سے، جس دن کہ دیکھے گا انسان اس چیز کو جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی

وَيَقُولُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِي كُنتُ تُرٰبًا ﴿٤٠﴾

اور کہے گا کافر: ہائے کاش! میں مٹی ہوتا۞

تفسیر

متقین کے لئے جنت میں انعامات

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا: مفاز یہ مصدر میمی ہے، فَازَ یَفُوْزُ: کامیاب ہونا، بے شک متقین کے لئے کامیابی ہے، کامیابی کا راستہ آ گیا تقویٰ جو متقین کے لفظ میں مذکور ہے، یعنی تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ کا مفہوم آپ کے سامنے بارہا ذکر کیا جاچکا، اللہ سے ڈر کر، بچ بچ کر چلنا، احتیاط کے ساتھ چلنا، نافرمانی سے بچنا، اور ہر وقت اللہ سے ڈرنا، یہی ہے تقویٰ، احتیاط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اَحکام پر نظر رکھتے ہوئے بچ بچ کے جو لوگ چلنے والے ہیں ان کے لئے کامیابی ہے، اور جو گردن اُٹھا کر اکڑ کر طغیان اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چلتے ہیں ان کا انجام پہلے ذکر کردیا گیا ہے، "بے شک ڈرنے والوں کے لئے کامیابی ہے۔" حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا: یہ مفاز کی کچھ تفصیل آ گئی، حدائق یہ حدیقۃ کی جمع ہے، حدیقہ باغ کو کہتے ہیں، اعناب عِنَبٌ کی جمع ہے، عنب: انگور کو کہتے ہیں، کواعب کاعب کی جمع ہے، کاعب: نوخیز لڑکی، نوجوان، نوجوان لڑکیاں جو بطور بیویوں کے ملیں گی، کیونکہ انسان کی

راحت وآرام کے اندر اِس کا بہت بڑا دخل ہے، اتراب تِرب کی جمع ہم عمر، "متقین کے لئے کامیابی ہے یعنی باغات اور انگور اور نوخواستہ نوخیز لڑکیاں ہم عمر" یعنی عمروں کا بھی آپس میں تناسب ہوگا، جس کا محبت کے اندر بہت دخل ہے، عمر کا تناسب ہو تو محبت زیادہ ہوتی ہے۔ وَّكَاْسًا دِهَاقًا: اور چھلکتے ہوئے جام، بھرے ہوئے پیالے یعنی جام شراب کے، یہاں ان کو اِجمالاً ذکر کیا جارہا ہے، تفصیلات پہلے آپ کے سامنے بہت آیات میں آچکی ہیں۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا: نہیں سنیں گے اس جنت میں (یہ آیات چونکہ دلالت کرتی ہیں جنت پر، اس لئے فِيْهَا کی ضمیر جنت کی طرف لوٹ جائے گی، یہ باغات وغیرہ جو بھی آئے) نہیں سنیں گے اُس میں کوئی لغو اور نہ کِذاب۔ کِذّاب: جھوٹ بولنا، جھٹلانا، یعنی عام طور پر دنیا کے اندر لوگ جو شراب پیتے ہیں تو اس میں لذت کے ساتھ ساتھ بہت ساری مصیبتیں بھی ہیں، عقل ماری جاتی ہے، ہوش اُڑ جاتے ہیں، اور اس وقت پھر بے ہودہ بکتے ہیں، ایک دُوسرے کے اُوپر بہتان لگاتے ہیں، ایک دُوسرے کی تکذیب کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں لڑائیاں ہوجاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ جب بھی جنت کی شراب کا ذِکر کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ ان قباحتوں کی نفی کردیتے ہیں، کہ وہ شراب تو پئیں گے جس میں تلذذ اور راحت ہوگی، ذائقہ اُس کا بہترین ہوگا، لیکن اس میں کوئی لغو اور کوئی تکذیب اور جھوٹ بولنا نہیں ہوگا، جس طرح سے دُنیا میں لوگ شراب پینے کے بعد بک بک جھک جھک کرنا شروع کردیتے ہیں، وہاں اس قسم کی بات نہیں ہوگی، "نہیں سنیں گے اس کے اندر کوئی کسی قسم کی بے ہودہ بات اور نہ تکذیب، جھٹلانا، جھوٹ بولنا" نہ کوئی جھوٹ بولے گا، نہ ایک دُوسرے کی کوئی تکذیب کرے گا۔ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ: جُوْزُوْا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ۔ بدلہ دیے گئے یہ تیرے ربّ کی طرف سے، عَطَآءً حِسَابًا: حِسَابًا کافی کے معنی میں۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا: نہیں سنیں گے اُس جنت میں لغو اور نہ کوئی بیہودہ بات" کِذّاب: ایک دوسرے کو جھٹلانا، جھوٹ بولنا، اس قسم کی کوئی بات نہیں سنیں گے، جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا: بدلہ دیے گئے تیرے ربّ کی طرف سے عطائے کافی، حساب: کافی کے معنی میں بھی آتا ہے، یعنی وہ چیز جو ان کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوگی، یا حساب کا معنی محاسبۃ، باب مفاعلہ، یعنی اُن کے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے، جس قسم کے اُن کے عمل تھے ویسے ان کو عطا دے دی گئی، اور کافیاً کے معنی میں زیادہ حضرات نے کیا ہے۔ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا: وہ ربّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ الرَّحْمٰنِ: یہ رَبّ کی صفت ہے، بہت رحم کرنے والا ہے، بڑی رحمت والا ہے۔

قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کی شانِ جلال

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا: اس سے خطاب کرنے کا اختیار نہیں رکھیں گے، نہیں مالک ہوں گے اس کے ساتھ خطاب کرنے کے، لَا يَمْلِكُوْنَ کی ضمیر اہلِ سماوات والارض کی طرف لوٹ رہی ہے رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے قرینے سے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ضمیر فرشتوں کی طرف لوٹ رہی ہو، کیونکہ مشرکین مکہ فرشتوں کو اپنا سفارشی سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ اللہ کی چہیتی بیٹیاں ہیں، ان کی وہ نذر نیاز زیادہ دیتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے گی تو اللہ تعالیٰ سے کہہ سُن کے یہ ہمارا کام

کروالیتے ہیں، آخرت یا تو ہوگی نہیں اور اگر ہوگی بھی تو ہماری سفارش کریں گے، تو جگہ بہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نفی کی ہے کہ اس کے سامنے تو کوئی بولنے کی طاقت نہیں رکھتا، کسی نے اپنی بات کیا منوالینی ہے، ''نہیں اختیار رکھتے اُس سے خطاب کرنے کا، اللہ سے خطاب کرنے کے وہ مالک نہیں ہوں گے'' یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا: جس دن کہ رُوح اور فرشتے کھڑے ہوں گے قطاریں باندھ کر، رُوح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، ان کو خصوصیت سے ذِکر کردیا اِن کے شرف کے طور پر، ملائکہ عام ہوگئے، ''جس دن کہ رُوح یعنی جبریل اور فرشتے قطاریں باندھ کر کھڑے ہوں گے۔'' لَا یَتَکَلَّمُوْنَ: بات نہیں کریں گے۔

اللہ کے ساتھ خطاب کی اجازت کس کو ہوگی؟

اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا: مگر وہ شخص بولے گا اور بات کرے گا جس کو رحمٰن اجازت دے دے، اور وہ بات بھی دُرست کہے، خلافِ واقع بات نہیں کہہ سکیں گے، اس لئے کسی بُرے کو وہ اللہ کی دربار میں وہ اچھا نہیں ثابت کرسکیں گے، اور کسی اچھے کو اللہ کی دربار میں بُرا نہیں کہہ سکیں گے، جو بات ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی، تو اِن کے اُوپر اعتماد کرکے اگر تم کُفر شرک کرتے ہو کہ ہمیں چھڑالیں گے یہ بات غلط ہے، وہاں تو کوئی زبان نہیں ہلا سکے گا، دَم نہیں مار سکے گا اللہ کے سامنے، وہی بولے گا جس کو اللہ اجازت دے گا، اور پھر وہ بات بھی صحیح کہے گا، دُرست کہے گا، خلافِ واقع بات نہیں آسکتی۔

پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی

ذٰلِکَ الْیَوْمُ الْحَقُّ: یہ دِن حق ہے، یعنی واقع کے مطابق ہے، یقیناً آنے والا ہے، فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا: پس جو شخص چاہے اپنے رَبّ کی طرف ٹھکانا اختیار کرلے، مقصد یہ ہے کہ ہم نے واضح کردیا، اب جو چاہے اپنے رَبّ کی طرف ٹھکانا اختیار کرلے، یعنی اللہ کی عبادت کرکے، اللہ کو یاد کرکے، نیکی کرکے اپنا اچھا ٹھکانا بنالے، اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا: بے شک ہم نے تمہیں ڈرادیا ہے قریب آنے والے عذاب سے۔

قیامت کے دِن کافر کی تمنّا

یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ: جس دِن کہ دیکھے گا انسان اس چیز کو جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی، یعنی جو عمل اس نے کیا ہے اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے گا۔ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا: اور کہے گا کافر ہائے کاش! میں مٹی ہوتا، یعنی پیدا ہی نہ ہوتا، یا پیدا ہونے کے بعد جب مرگیا تھا اور مرنے کے بعد مٹی ہوگیا تھا، تو ویسے ہی رہ جاتا، دوبارہ مجھے اُٹھایا نہ جاتا (آلوسی، نسفی)، اس وقت یہ کافر لوگ تمنّا کریں گے۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ حیوانات کو بھی اُٹھائیں گے، جانوروں کو، جانوروں کے اُٹھانے کے بعد اپنے عدل کا مظاہرہ کریں گے کہ اگر کسی جانور نے بھی بلاوجہ کسی دوسرے جانور کو مارا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ بھی دلائیں گے، اور اِس شانِ عدل کا اظہار کرنے کے بعد پھر جانوروں کو حکم دے دیں گے کہ مٹی ہوجاؤ، وہ

سارے کے سارے مٹی ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے لئے جنّت اور دوزخ کا معاملہ نہیں ہے۔ تو جس وقت ان کو مٹی کر دیا جائے گا تو اس وقت کافر کہیں گے کہ ہائے کاش! ہم بھی مٹی ہو جاتے۔[1] تو مقصد یہ ہے کہ اس وقت یہ جو بڑیں مارتے ہیں، اور بڑی بڑی بڑھکیں مارتے ہیں، فخر اور غرور کی باتیں کرتے ہیں، قیامت آ جائے گی تو پھر یہ مٹی ہونے کی تمنا کریں گے، تو بہتر یہ ہے کہ آج یہ مٹی ہو جائیں، تواضع اختیار کریں، تکبّر کو چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو مانیں، تو قیامت کے میدان میں پھر اس قسم کی تمنا نہیں کرنی پڑے گی۔ "کہے گا کافر: اے کاش! کہ ہوتا میں مٹی۔"

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

آیاتها ۴۶ ۷۹ سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ ۸۱ رکوعاتها ۲

سورۂ نازعات مکہ میں نازل ہوئی، اس کی ۴۶ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝۱ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ وَّالسّٰبِحٰتِ

قسم ہے ان فرشتوں کی جو کہ کھینچنے والے ہیں سختی سے ۝ اور قسم ان فرشتوں کی جو نرمی کے ساتھ کھول دینے والے ہیں ۝ اور قسم ان فرشتوں کی جو کہ تیرنے

سَبْحًا ۝۳ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ فَالْمُدَبِّرٰتِ أَمْرًا ۝۵

والے ہیں خوب تیرنا ۝ پھر قسم ان فرشتوں کی جو کہ سبقت لے جانے والے ہیں سبقت لے جانا ۝ پھر قسم ان فرشتوں کی جو تدبیر کرنے والے ہیں امر کی ۝

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝۸ أَبْصَارُهَا

جس دِن کانپے گی کانپنے والی ۝ اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی ۝ دِل اس دِن دھڑکنے والے ہوں گے ۝ ان کی آنکھیں

خَاشِعَةٌ ۝۹ يَقُوْلُوْنَ ءَإِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝۱۰ ءَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱

جھکنے والی ہوں گی ۝ یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم لوٹا دیے جائیں گے پہلی حالت میں؟ ۝ کیا جس وقت ہم کھوکھلی بجنے والی ہڈیاں بن جائیں گے؟ ۝

(۱) مستدرک حاکم ۲/۳۱۶، تفسیر سورۃ الأنعام. عن ابی ھریرۃ موقوفًا، رقم ۳۲۳۱۔ ۴/۵۷۵، کتاب الأھوال. عن عبد اللہ بن عمرو موقوفًا، رقم ۸۷۱۶۔ نیز عام تفاسیر۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ
یہ کہتے ہیں: تب تو یہ لوٹنا خسارے والا ہوگا ﴿۱۲﴾ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک ہی ڈانٹ ہوگی ﴿۱۳﴾ پس اچانک وہ سارے کے سارے
بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾
زمین کی سطح پر ہوں گے ﴿۱۴﴾ کیا موسیٰ علیہ السلام کی بات آپ کو پہنچی ﴿۱۵﴾ جبکہ آواز دی موسیٰ کو اس کے رَبّ نے پاک وادی طویٰ میں ﴿۱۶﴾
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ
کہ آپ فرعون کی طرف جائیں، بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے ﴿۱۷﴾ پس آپ کہیں اس کو کہ کیا تجھے رغبت ہے اس بات کی طرف کہ
تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾
تُو پاک صاف ہوجائے ﴿۱۸﴾ اور میں تیری راہنمائی کروں تیرے رَبّ کی طرف پھر تُو ڈرنے لگ جائے ﴿۱۹﴾ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو بڑی نشانی دکھائی ﴿۲۰﴾
فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا
اس نے تکذیب کی اور نافرمان ہوگیا ﴿۲۱﴾ پھر اس نے پیٹھ پھیری کوشش کرتے ہوئے ﴿۲۲﴾ پھر لوگوں کو جمع کیا پھر اعلان کیا ﴿۲۳﴾ اور کہا کہ میں ہی
رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾
تمہارا سب سے بڑا رَبّ ہوں! ﴿۲۴﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا اس کو آخرت اور دُنیا کے عذاب میں ﴿۲۵﴾ بے شک اس واقعے میں البتہ نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو کہ ڈرتا ہے ﴿۲۶﴾

سورت کا مرکزی مضمون

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ نازعات مکہ میں نازل ہوئی، اس کی ۴۶ آیتیں ہیں اور اس میں ۲ رُکوع ہیں۔ ''نازعات'' اس کا نام اس سورت کے پہلے لفظ سے ماخوذ ہے وَالنّٰزِعٰتِ، یہیں سے سورت کا نام لے لیا گیا۔ اور مضمون اس سورت میں بالکل وہی ہے جو آپ کے سامنے سورۂ نبا کے اندر گزرا، یعنی اثباتِ قیامت، اِثباتِ بعث بعد الموت، درمیان میں کچھ مضمون آئے گا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ان دونوں کا، اُس میں یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ اللہ کے رسول کی مخالفت آخر یہ نتیجہ سامنے لاتی ہے، تو مشرکین مکہ کو تنبیہ کرنا مقصود ہوگی کہ ان کو سمجھ جانا چاہیے، ورنہ جس طرح سے فرعون کا انجام خراب ہوا، اِن کا انجام بھی خراب ہوگا، موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، اور فرعون ان کے سامنے اُکڑا، آخر برباد ہوگیا، دُنیا اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لیا گیا، یہ سمجھ ہوجائے گی۔ اور اسی طرح سے اچھے لوگوں کا انجام جو اچھا سامنے آنے والا ہے اور بُرے لوگوں کا انجام جو بُرا سامنے آنے والا ہے، وہ بھی ذکر ہوگا، اور آپ نے دیکھا کہ یہی مضمون پچھلی سورت کے اندر گزرا ہے۔

ماقبل سے ربط

پچھلی سورت میں اِبتدا کے اندراُن کے سوال کا ذکر تھا عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ، اور اِس سورت میں وہی مضمون آخر کے اندر آئے گا یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا، تو ان کے سوال کا ذکر یہاں بھی آرہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کو ذکر فرمائیں گے، زمین اور آسمان کی خلقت کو ذکر فرمائیں گے، کہ جو ان چیزوں کے اُوپر قادر ہے اس کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا، تو آسمان اور زمین کے بنانے کا ذکر کریں گے، اور اس پر پھر یہ سوال اُٹھائیں گے، جس طرح سے سورۂ یٰسٓ کے آخر میں بھی ذکر کیا گیا تھا، کہ جو آسمان اور زمین کو بنا سکتا ہے اس کے لئے تمہارا دوبارہ پیدا کرنا مشکل نہیں ہے، تم اس سے زیادہ سخت نہیں ہو۔

''مکی'' سورتوں میں اِثباتِ آخرت پر زور کیوں؟

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ''مکی'' سورتوں میں زیادہ زور اِسی بات پہ دیا گیا ہے، اِثباتِ آخرت، کیونکہ جو شخص آخرت کا عقیدہ حاصل کرلیتا ہے اور اس کے دِل میں یہ یقین آجاتا ہے کہ میں مرنے کے بعد اللہ کے سامنے جانے والا ہوں تو اس کے ہر عمل کے اندر توازن پیدا ہوجاتا ہے، سوچ سوچ کر قدم اُٹھاتا ہے۔ اور جب یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد مٹی ہوجاؤں گا، کوئی پوچھنے والا نہیں، تو پھر اِنسان کوشش کرتا ہے کہ اس دُنیا کے اندر عیش کرلو، عشرت کرلو، بعد میں کون سی ذمہ داری ہم پر عائد ہونے والی ہے! تو پھر اِنسان اپنی شہوات کے پیچھے چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کسی قاعدے اور قانون کی پروا نہیں کرتا۔ تو یہی فکر آخرت پیدا کرنے کے لئے ''مکی'' سورتوں کے اندر زیادہ تر مضمون یہی ذکر کیا گیا ہے۔

تفسیر

قسموں میں مذکور فرشتوں کی صفات اور ان کی وضاحت

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا: نازعات کا لفظ نزع سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہے کھینچنا، وَالنّٰزِعٰتِ صفت کا صیغہ ہے، اور جمہور مفسرین ﷭ کی رائے کے مطابق اس کا موصوف فرشتے ہیں (آلوسی)، اور واؤ قسمیہ ہے، ''قسم ہے ان فرشتوں کی جو کہ کھینچنے والے ہیں!'' غَرْقًا: ڈُوب کر، یا، سختی سے، یہ مفہوم اس طرح سے ہوگیا کہ ''اَغْرَقَ فِی النَّزْعِ'' یہ محاورہ آتا ہے، کھینچنے میں اس شخص نے سختی اختیار کی، سامان کو جو زور سے کھینچے پورا زور لگا کر اس کو کہتے ہیں: اَغْرَقَ فِی النَّزْعِ، اِس نے کھینچنے کے اندر خوب زور لگایا۔ اور ہم بھی جس وقت کسی کام کو مگن ہوکر کرتے ہیں اور پوری کوشش کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہمارے دل پر اور دماغ پر اُس کام کا فکر سوار ہوجائے تو ہم کہتے ہیں کہ ''فلاں شخص تو اپنے اس کام میں غرق ہوگیا!'' ''وہ تو اپنی اس فکر کے اندر غرق ہے!'' تو ''غرق'' کا لفظ ہم بھی استعمال کرتے ہیں اپنے محاورے میں، اس لیے یہاں معنی ہوگیا کہ ''وہ فرشتے جو کہ سختی کے ساتھ کھینچنے والے ہیں، ڈُوب کر کھینچنے والے ہیں'' کس چیز کو کھینچنے والے ہیں؟ اس کا بھی یہاں پر ذکر نہیں کیا گیا، اور جمہور مفسرین ﷭ کی رائے کے مطابق

یہاں سے اَرواحِ کُفّار مراد ہیں،''جو اِنسانوں کی جانوں کو سختی کے ساتھ کھینچنے والے ہیں''اور اس سے مراد ہو جائیں گی کافروں کی جانیں،''قسم ان فرشتوں کی جو کافروں کی جانوں کو سختی کے ساتھ کھینچنے والے ہیں! کھینچنے والے ہیں ڈوب کر'' یہ اس کا مفہوم ہوگیا۔ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا: نَشَط: کسی چیز کو آسانی سے کھول دینا، اور قسم ان فرشتوں کی جو کہ آسانی کے ساتھ کھول دینے والے ہیں۔ کس چیز کو کھول دینے والے ہیں؟ یعنی اَرواحِ مؤمنین کو، مؤمنین کی جانیں بہت آسانی کے ساتھ نکالتے ہیں، یہ ایسے ہیں جیسے کہ مشکیزے کا منہ کھول دیا جائے تو آسانی سے پانی نکل جاتا ہے، اور جس چیز میں ہوا بھری ہوئی ہو، اس کا منہ کھول دیا جائے تو ہوا خارج ہو جاتی ہے، تو مؤمنین کی جانیں اسی طرح سے آسانی کے ساتھ نکالتے ہیں، تو وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کا مفہوم ہوگیا کہ قسم ان فرشتوں کی جو کہ نرمی کے ساتھ کھول دینے والے ہیں۔ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا: سَبَح: تیرنے کو کہتے ہیں، كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ یہ پہلے بھی لفظ آیا تھا (سورۂ یٰس: ۴۰)، اس سے مراد بھی فرشتے ہیں،''اور قسم ان فرشتوں کی جو کہ تیرنے والے ہیں خوب تیرنا'' مطلب یہ ہے کہ فضا کے اندر جو اُڑتے ہیں تو اس طرح سے تیزی کے ساتھ اُڑتے ہوئے آتے ہیں جس طرح سے چیز تیرتی ہوئی آرہی ہے،''تیرنے والے ہیں تیرنا''۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا: پھر قسم ان فرشتوں کی جو کہ سبقت لے جانے والے ہیں سبقت لے جانا! یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، جس طرح سے کہ فرماں بردار بندوں کا کام ہوتا ہے،''سبقت لے جانے والے ہیں سبقت لے جانا'' یعنی ایک دُوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے والے ہیں، بھاگنے والے ہیں اللہ کے حکم کی تعمیل میں۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا: پھر قسم ان فرشتوں کی جو کہ اَمر کی تدبیر کرنے والے ہیں، یعنی انتظام کرنے والے ہیں اَمر کا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اَحکام صادر ہوتے ہیں ان اَحکام کے مطابق وہ انتظام کرنے والے ہیں، اگر کسی رُوح کو راحت پہنچانا مقصود ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ثواب پہنچنا ہے تو اس کا انتظام کرتے ہیں، اور اگر کسی رُوح کو عذاب دینا ہے اور اس کو تکلیف پہنچانی ہے تو اس کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ تو مدبرات یہ لفظ تدبیر سے لیا گیا ہے، يُدَبِّرُ الْاَمْرَ قرآنِ کریم کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں بارہا اس کا ذکر آیا ہے[1] کہ اللہ تعالیٰ اَمر کی تدبیر کرتا ہے۔ دُنیا کے اندر جتنے نظم چلتے ہیں وہ سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہی چلتے ہیں، تدبیرِ اَمر یہ اللہ کا کام ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اِس کائنات کا نظام چلانے کے لئے فرشتوں کو متعین کیا ہوا ہے، اس لئے اُن کو بھی مدبراتِ اَمر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ بھی اَمر کی تدبیر کرنے والے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ جو انہیں حکم دیتا ہے، جس کام کے کرنے کے لئے کہتا ہے، اس کام کا وہ فوراً انتظام کرتے ہیں اور اللہ کے اَحکام کے تحت اس کی تدبیر کرتے ہیں، فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کا یہ معنی ہے،''پھر اُن فرشتوں کی قسم جو کہ تدبیر کرنے والے ہیں اَمر کی، یعنی ہر اَمر کا انتظام کرنے والے ہیں، اسی لئے فرشتوں کو کہا جاتا ہے کارکنانِ قضا وقدر، اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو عملی طور پر نافذ کرنا ان فرشتوں کا کام ہوا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ان کو ان کاموں کے اُوپر متعین کیا ہوا ہے، کسی احتیاج کی بنا پر نہیں، اور نہ اِن کو کوئی مستقل اختیار دیا ہے، جو کام ذِمّے لگا دیا جاتا ہے اُس کا وہ انتظام کر دیتے ہیں، سورۂ تحریم میں آیا تھا لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ: اللہ جو انہیں حکم دیتے ہیں اس میں وہ نافرمانی نہیں کرتے، اور جو انہیں کہا جاتا ہے وہی کام کرتے ہیں۔

---

(۱) سورۂ یونس: آیت ۳، سورۂ رعد: آیت ۲، سورۂ الم سجدہ: آیت ۵۔

جوابِ قسم اور اس کی قسم کے ساتھ مناسبت

فرشتوں کی یہ پانچ صفتیں ذکر کر کے قسم کھائی گئی، اور جوابِ قسم محذوف ہے جس کے اُوپر آنے والے الفاظ دلالت کرتے ہیں، ''قیامت ضرور آئے گی، مرنے کے بعد تم دوبارہ ضرور اُٹھائے جاؤ گے'' یہ مفہوم ہے جو ان قسموں کے ساتھ مؤکد اور پکا کرنا مقصود ہے۔ فرشتوں کے چونکہ مشرکین بھی قائل تھے، اور اُن کے لئے اس قسم کی صفات بھی وہ مانتے تھے، اس لئے یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ یہی فرشتے! یہ بھی اپنے عمل کے ساتھ، اپنے حال کے ساتھ اس بات پہ شہادت دیتے ہیں کہ اگر ان سب چیزوں کا انتظام کرنا اور ان کا سنبھالنا اللہ کا کام ہے اور اللہ کے حکم کے تحت فرشتے کرتے ہیں تو اگر اللہ تعالیٰ توڑ پھوڑ کرنا چاہے تو انہی فرشتوں کے ذریعے سے توڑ پھوڑ بھی کروادے گا، اور جو فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں کل کو اللہ حکم دے گا تو وہ فرشتے دوبارہ جان بھی ڈال دیں گے، اس طرح سے فرشتوں کے احوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ کا حکم جس قسم کا آجائے فرشتے وہی کام کرتے ہیں، اگر ایک وقت میں یہ دُنیا کے لئے آبادی کا ذریعہ بنتے ہیں تو دُوسرے وقت میں اللہ کے حکم کے تحت یہی اس کو توڑ پھوڑ کر دیں گے، اور مضمون جس کی تاکید کرنی مقصود ہے وہ یہ نکل آیا کہ ''تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، مرنے کے بعد دوبارہ تم زندہ ضرور کیے جاؤ گے، قیامت ضرور آئے گی۔''

''راجفہ'' اور ''رادفہ'' کی وضاحت

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ: راجفہ: کانپنے والی، جس دِن کانپے گی کانپنے والی، تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ: اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی۔ راجفہ اور رادفہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ دونوں صفت کے صیغے ہیں، راجفہ سے نفخۂ اُولیٰ مراد ہے یعنی جو پہلی پھونک ماری جائے گی صور میں اس کو راجفہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے، کیونکہ اُس پھونک کے مارتے ہی زلزلہ آجائے گا، ہر چیز کانپ اُٹھے گی، آسمان کانپیں گے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، زمین کانپے گی ریزہ ریزہ ہوجائے گی، پہاڑ اپنی جگہ سے کانپیں گے، رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑ جائیں گے، تو وہ جو پہلا صور پھونکا جائے گا تو چونکہ وہ کپکپی کا ذریعہ بنے گا، زلزلے کا باعث بنے گا اس لئے اس نفخۂ اُولیٰ کو خود راجفہ کے ساتھ تعبیر کردیا، ورنہ رجفہ اصل میں اس نفخۂ اُولیٰ کا اثر ہے، کہ جب پہلی دفعہ پھونک ماری جائی گی تو ساری کائنات کانپنے لگ جائے گی، اور کانپ کے سب ٹوٹ پھوٹ جائیں گے جس طرح سے زلزلہ آتا ہے، اور یہ زلزلہ آنے کا باعث بنا وہ نفخہ، اس لئے اس نفخہ کو راجفۃ کے ساتھ تعبیر کردیا، یہ توڑنے پھوڑنے والا ہے، اور اس کے پیچھے دُوسرا نفخہ آئے گا اس کو رادفہ کے ساتھ تعبیر کیا۔ رادفہ: پیچھے آنے والی۔ رَدِفَ لَكُمْ (سورۂ نمل: ۷۲) یہ لفظ بھی قرآنِ کریم میں گزرا ہے، ردیف کہتے ہیں اس شخص کو جو کسی دُوسرے کے پیچھے سوار ہوتا ہے، تو رادفہ سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے، اس کے پیچھے پھر دُوسرا نفخہ آجائے گا اس کے پیچھے آنے والا، پہلے نفخے کا اثر ہوگا توڑ پھوڑ، اور دوسرے نفخے کا اثر ہوگا جوڑ، دوبارہ اسی طرح سے پھر زمین بن جائے گی، آسمان بن جائے گا، اور مرے ہوئے جتنے بھی ہیں وہ سارے کے سارے زمین سے نکلنے لگ جائیں گے، جس طرح سے پیچھے آیا تھا یَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا (سورۂ نبا)، یہ نفخۂ ثانیہ کا ذکر تھا، پچھلی سورت میں آپ کے سامنے ذکر ہوا، کہ بگل بجایا جائے گا،

پھونک ماری جائے گی، تم فوج در فوج اکٹھے ہو جاؤ گے، کون سی دیر لگے گی؟ تو رادفہ: پیچھے آنے والا۔ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ: اُس راجفہ کے پیچھے رادفہ آئے گا، یعنی نفخۂ اُولیٰ کے بعد پھر نفخۂ ثانیہ آئے گا، پہلے نفخے کا اثر یہ ہے کہ سب کچھ ذرّہ ذرّہ ہو جائے گا، زلزلے کے اثر سے ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی، اور دُوسرے کا اثر ہوگا کہ دوبارہ پھر اسی طرح سے بُڑ جائے گی۔

قیامت کے دِن دِلوں اور آنکھوں کی کیفیت

قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ: يَوْمَىِٕذٍ: يَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا، جس دِن یہ واقعات پیش آئیں گے، یہ راجفہ رادفہ والے، اُس دِن دِل دھڑک رہے ہوں گے، وَّاجِفَةٌ: دھڑکنے والے ہوں گے، ''دل اُس دِن دھڑکنے والے ہوں گے۔'' اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ: ''ھا'' ضمیر قلوب کی طرف لوٹ رہی ہے، ''اور اُن قلوب کی آنکھیں جھکنے والی ہوں گی'' ''قلوب کی آنکھیں'' یعنی اہلِ قلوب کی، انسان کے بدن کے اُوپر اثرات جو ظاہر ہوا کرتے ہیں وہ قلبی کیفیت کے ظاہر ہوا کرتے ہیں، اس لئے آنکھوں کے اُوپر جو خوف وخشیت طاری ہوگا وہ چونکہ دِل کے اندر خوف اور ہراس ہونے کی بنا پر ہوگا اس لئے ان آنکھوں کی نسبت قلوب کی طرف کر دی گئی، یعنی جو دِل دھڑک رہے ہوں گے ان دِلوں کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، آنکھ نہیں اُٹھا سکیں گے، تو آنکھوں کی نسبت قلوب طرف کر دی گئی چونکہ قلوب کی کیفیات ہی آنکھوں کے اندر زیادہ نمایاں ہوا کرتی ہیں۔ ''قلوب اُس دِن دھڑکنے والے ہوں گے اور اُن کی آنکھیں جھکنے والی ہوں گی۔''

قیامت کے متعلق مشرکین کا اِستہزا

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ: حافرہ، عربی میں محاورہ آتا ہے: رَجَعَ فِی حَافِرَتِهٖ، اپنی پہلی حالت پر لوٹ گیا، حافرہ اصل میں پاؤں کے نشان کو کہتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین اب باتیں کرتے ہیں، جس وقت ان کے سامنے قیامت کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم لوٹا دیے جائیں گے پہلی حالت میں؟ جب اُنہیں کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تم نے دوبارہ اُٹھنا ہے، کہتے ہیں: اچھا! کیا ہم پہلی حالت میں لوٹا دیے جائیں گے؟ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً: کیا جس وقت کہ ہم کھوکھلی بجنے والی ہڈیاں بن جائیں گے اس وقت ہم پہلی حالت میں لوٹا دیے جائیں گے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس قسم کے سوال ان کا اُٹھانا بطور اِستہزا کے تھا، جیسے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ کی تقریر کرتے ہوئے میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، جب ان کے سامنے بعث بعد الموت کا تذکرہ ہوتا تو یوں ایک دُوسرے کے سامنے کہتے کہ جب ہم ہڈیاں ہو جائیں گے جو کھڑکتی ہوں گی، بجتی ہوں گی، کھوکھلی ہوں گی، اس وقت ہم دوبارہ پیدا کر دیے جائیں گے؟ پہلی حالت میں لوٹا دیے جائیں گے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس طرح سے اِستہزا اور اِنکار کے انداز میں وہ آپس میں ایک دُوسرے پر سوال اُٹھاتے تھے۔ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ: یہ بھی اسی اِستہزا کے تحت ہی داخل ہے، کہتے ہیں کہ یہ بات تب تو بہت خسارہ والا لوٹنا ہوگا، اِذًا کا معنی تب، تب یہ بہت خسارے کا لوٹنا ہوگا، خاسرۃ: خسارے والا، کرّۃ: لوٹنا، ''یہ لوٹنا تو بہت خسارے کا ہوگا'' یعنی اللہ کے رسول سے باتیں سُن کے پھر آپس میں کہتے ہیں کہ اچھا بھائی! اگر اس طرح سے یوں لوٹا دیے گئے تو پھر ہم رگڑے میں آجائیں گے، ہمارا حال بڑا خراب ہوگا، یہ فکر کے طور پر نہیں کہتے تھے، مذاق اُڑاتے

تھے، کہ اگر اس طرح سے ہو گیا، دوبارہ لوٹا لیے گئے، پھر تو ہم بہت گھاٹے میں رہیں گے، بہت خسارے میں رہیں گے، یہ فکر کی بات نہیں ہے، آپس میں اِستہزا کرتے ہوئے، اللہ کے رسول کی ہنسی کرتے ہوئے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کَرَّةٌ خَاسِرَةٌ: لوٹنا خسارے والا، ''تب تو یہ لوٹنا خسارے والا ہوگا''

مشرکین کے اِستہزا کا جواب

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے، کہ تم یوں سمجھتے ہو کہ ہڈیاں کھوکھلی ہونے کے بعد کس طرح سے دوبارہ لوٹا دی جائیں گی؟ پہلی حالت میں کیسے لوٹا دیے جائیں گے؟ ہمیں تو کچھ اہتمام کرنا ہی نہیں پڑے گا، إِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک ہی ڈانٹ آئے گی، جس طرح سے جھڑک ماری جاتی ہے کہ اُٹھو، بس ایک ہی ڈانٹ آئے گی اور سب اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ گے، دیر ہی نہیں لگے گی، اب تمہیں یہ کام مشکل معلوم ہو رہا ہے لیکن فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک ہی ڈانٹ ہوگی، فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ: ساھرۃ کہتے ہیں وجہ الارض کو، پس اچانک سارے کے سارے زمین کی سطح کے اُوپر آجائیں گے۔ جس کو سمجھتے ہیں کہ بعید ہے، کیسے ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، ایک ہی آواز آئے گی، اور ایک ہی آواز کے ساتھ سب اُٹھ کے کھڑے ہو جائیں گے۔ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ: اچانک وہ سارے کے سارے زمین کی سطح پہ ہوں گے۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ اور اس کا مقصد

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى: اب اِن مشرکینِ مکہ کو جو اِس اُمت کے لئے فرعون کی جگہ ہی تھے، ان کو یہ واقعہ سُنایا جا رہا ہے فرعون کا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تنبیہ کے لئے، کہ تم کوئی فرعون سے زیادہ زور آور نہیں، اگر فرعون موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کر کے دُنیا اور آخرت میں برباد ہو گیا تو تم بھی بچو گے نہیں۔ یہ واقعہ اُن کو عبرت کے طور پر سُنایا جا رہا ہے اور بہت اختصار کے ساتھ، لیکن یہ آیات تمام زندگی کے واقعات پر حاوی ہیں، اشارہ اس طرح سے کر دیا گیا، باقی مفصل واقعات آپ کے سامنے مختلف سورتوں میں گزر چکے ہیں۔ هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى: كَ کا خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر سننے والے کو ہے، کیا آپ کے پاس موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آیا؟ یہ بات آپ کو پہنچی؟ کیا موسیٰ علیہ السلام کی بات آپ کو پہنچی؟ ہر مخاطب کو کہا جا رہا ہے، إِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى: یہ بات جو موسیٰ علیہ السلام کی ہم پوچھ رہے ہیں کہ تجھے پہنچی؟ یہ اُس وقت پیش آئی تھی جبکہ آواز دی موسیٰ علیہ السلام کو اس کے رَبّ نے پاک وادی طویٰ میں، طویٰ یہ الواد المقدس سے بدل ہے، ''پاک وادی طویٰ میں'' جس کا ذکر پہلے بھی آپ کے سامنے آیا تھا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (سورۂ طٰہٰ: ۱۲)۔ ''پاک وادی طویٰ میں جس وقت موسیٰ علیہ السلام کے رَبّ نے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی'' اس میں وہ سارا طور کا واقعہ آ گیا جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آ رہے تھے مدین کی طرف سے، آگ لینے کے لئے گئے تھے اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت ملی تھی، وہ جتنا قصہ تھا سارے کا سارا اِن الفاظ کے اندر سمیٹ لیا گیا۔ اور پھر جب آپ کو نبی بنایا گیا تو اس وقت کہا گیا کہ

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى: طغٰی یہ طغیان سے ہے آگے بھی اِسی سورت میں لفظ آرہا ہے فَاَمَّا مَنۡ طَغٰىۙ وَاٰثَرَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا، اور پچھلی سورت میں بھی یہ لفظ آیا تھا اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتۡ مِرۡصَادًا لِّلطّٰغِيۡنَ مَاٰبًا، یہ طاغین اِسی طغٰی سے ہے، سرکش، سرچڑھے، جو کسی کا حکم نہ مانے بلکہ مقابلے میں اکڑ جائے اس کو کہتے ہیں طاغی، طغیان سرکشی کو کہتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ آپ فرعون کی طرف جائیں بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے، تو فرعون کی ساری زندگی جو تھی وہ اِنَّهٗ طَغٰى کے اندر آگئی کہ اس کی کیا زندگی تھی؟ وہ طاغی تھا، باغی تھا، اللہ کے اَحکام کے پروا نہیں کرتا تھا، ہر معاملے میں اکڑتا تھا، سرچڑھا ہوا تھا، طغیانی میں تھا۔

پاکیزہ اور کمالِ اِنسانیت والی زندگی

فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى: پھر موسیٰ علیہ السلام سے کہا جارہا ہے کہ آپ کہیں اس کو کہ کیا تجھے رغبت ہے اس بات کی طرف کہ تو پاک صاف ہوجائے؟ کیا تو ستھری زندگی گزارنا چاہتا ہے؟ پاک صاف ہونا چاہتا ہے؟ تو میں تجھے طریقہ بتادوں۔ یہ شرک والی زندگی، نجس زندگی، اللہ کی نافرمانی والی زندگی، پلید زندگی سے کیا تو نکلنا چاہتا ہے؟ تو صاف ستھری زندگی گزرانا چاہتا ہے؟ جس سے معلوم ہوگیا کہ صاف ستھری زندگی وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے مطابق ہوتی ہے، اللہ کا انکار کر کے اور آخرت کا انکار کر کے کوئی شخص بھی صاف ستھری زندگی نہیں گزار سکتا، ظاہری اور باطنی نجاسات کا مجموعہ ہوتا ہے وہ شخص جو کہ اللہ کو نہیں مانتا اور آخرت کا فکر نہیں رکھتا، نہ اس کا اخلاق پاکیزہ رہ سکتا ہے، نہ اس کے قلبی حالات ٹھیک رہ سکتے ہیں، نہ اس کا ظاہری کردار ٹھیک رہ سکتا ہے۔ ''تو اُس سے پوچھیں آپ، کہ کیا تجھے اس بات کی طرف رغبت ہے کہ تو صاف ستھری زندگی گزارے، تو پاک صاف ہوجائے؟ اور میں تیری راہنمائی کروں تیرے رَبّ کی طرف پھر تیرے اندر خوف وخشیت پیدا ہوجائے؟'' کیا تُو چاہتا ہے کہ میں تجھے تیرے رَبّ کا تعارف کرادوں؟ تُو جو اپنے آپ کو رَبّ سمجھے ہوئے ہے، تُو رَبّ نہیں ہے، تیرا رَبّ کوئی دُوسرا ہے، تو اگر کہے تو میں تجھے تعارف کراؤں اس رَبّ کا اور تیری راہنمائی کروں اس رَبّ کی طرف پھر تیرے اندر خوف وخشیت پیدا ہوجائے، یہی انسانیت کا کمال ہے کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے کو، اپنے پالنے کو پہچان لے، اور پہچاننے کے بعد پھر اس کا خوف اور اُس کی خشیت انسان کے قلب کے اندر آجائے یہی صحیح طور پر مقامِ انسانیت ہے۔ تو ''کیا تجھے اس بات کی طرف رغبت ہے کہ میں تیری راہنمائی کروں تیرے رَبّ کی طرف پھر تو ڈرنے لگ جائے۔''

بڑی نشانی کا مصداق

فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى: اب وہ ساری تاریخ اپنے ذہن میں مستحضر کیجئے، فرعون آگے سے اکڑ گیا تھا اور کہا تھا کہ تیرے پاس کیا دلیل ہے کہ تُو اللہ کی طرف سے آیا ہے؟ میں تو اپنے علاوہ کسی دُوسرے رَبّ کو پہچانتا ہی نہیں! فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى: تو موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعون کو بڑی نشانی دِکھائی، اس بڑی نشانی سے عصائے موسیٰ مراد ہے، یاد ہوگا پہلی گفتگو جب فرعون کے ساتھ ہوئی تھی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنا معجزہ بھی دکھایا تھا، ''بڑی نشانی دِکھائی'' یعنی اپنی لاٹھی پھینکی جو کہ ایک اژدھے کی شکل میں ہوگئی۔

فرعون کا انکار، سرکشی، تکذیب اور اِستہزا

تو چاہیے تو یہ تھا کہ اس کو وہ دلیل بنالیتا اس بات کی کہ واقعی یہ کسی بہت بڑی طاقت کی طرف سے آئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا، لیکن وہ نہ مانا، فَكَذَّبَ: اس نے تکذیب کی، وَعَصٰى: اور نافرمان ہوگیا، ثُمَّ اَدْبَرَ: پھر اس نے پیٹھ پھیری، موسیٰ علیہ السلام سے علیحدہ ہوا، يَسْعٰى: کوشش کرتے ہوئے، پیٹھ پھیری کوشش کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کی، اس میں وہ ساری تاریخ آگئی جو اس نے مقابلہ کرنے کے لئے ملک سے بڑے بڑے جادوگر اکٹھے کروالئے تھے، اور میدانِ مقابلہ طے کرلیا تھا کہ یہاں ہم آپس میں مقابلہ کریں گے يَسْعٰى کے اندر وہ ساری تاریخ آگئی، ''پھر اُس نے پیٹھ پھیری کوشش کرتے ہوئے۔'' فَحَشَرَ: پھر اس نے لوگوں کو جمع کیا، فَنَادٰى: پھر اس نے اعلان کیا، اعلان کیا کیا؟ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى: سب سے بڑا ربّ تو تمہارا میں ہی ہوں، میں تمہارا رَبِّ اعلیٰ ہوں، یعنی میرے سے اُوپر کوئی رَبّ نہیں ہے جس کا اِقتدار مصر کے اندر ہو اور میرے حکم کے مقابلے میں اس کا حکم چلے، کوئی رَبِّ اَعلیٰ نہیں ہے میرے علاوہ۔ لوگوں کو جمع کر کے اس نے یہ اعلان کیا تھا، اس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ زُخرف میں آیا تھا کہ اپنی قوم کو اس نے اس طرح سے بےوقوف بنایا، کہنے لگا کہ دیکھو اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (سورۂ زُخرف: ۵۱) کہ لوگو! تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ کہ مصر کے ملک کا میں مالک ہوں، اور یہ میرے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ: میں بہتر ہوں یا یہ؟ جس کی نہ کوئی عزّت، نہ کوئی قدر، اور بات کرنے پر قادر نہیں، وہ زبان میں ذرا سی جو لکنت تھی اس کا مذاق اُڑایا، اس قسم کی باتیں کر کے اپنی برتری ثابت کی، تو فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ: قوم کو بےوقوف بنالیا، قوم اسی کے پیچھے لگی رہی، کیونکہ خود جرم کرنے کے عادی تھے، اور جو مجرم ہوتا ہے اس کو مجرم کی بات ہی پسند آیا کرتی ہے، جس کی طبیعت میں شرارت ہوتی ہے فسق و فجور ہوتا ہے وہ فاسقوں فاجروں کی بات کو پسند کیا کرتا ہے، تو اس نے ساری قوم کو بےوقوف بنالیا، قوم اس کے پیچھے لگی رہی، موسیٰ علیہ السلام کی بات نہ مانی، آخر ساری قوم غرق ہوگئی۔ تو یہ بھی اُسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ جمع کر کے اس نے جلسہ کیا، جلسہ کر کے خوب بلند آواز کے ساتھ اعلان کیا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى: میرے مقابلے میں کوئی دُوسرا نہیں ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو دھمکا دیا تھا کہ اگر میرے علاوہ کوئی دُوسرا ربّ یا کوئی اِلٰہ قرار دیا تو میں تجھے جیل میں ڈال دُوں گا، سورۂ قصص کے اندر اور سورۂ طٰہٰ میں، ان سب سورتوں کے اندر یہ واقعات گزر چکے ہیں۔

فرعون کا اَنجام

جب وہ اس طرح سے اَکڑ گیا، فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى: پھر اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا اُس کو آخرت اور دُنیا کے عذاب میں، اُولیٰ سے دُنیا مراد ہے، اور اللہ تعالیٰ نے پھر آخرت اور دُنیا کے عذاب میں کس طرح سے پکڑا؟ وہ بھی تفصیل آپ کے سامنے آگئی کہ ناک میں پانی ڈال کر ماردیا، کیا زور لگتا ہے اللہ تعالیٰ کا؟ اور کیا دیر لگتی ہے؟ اتنی بڑیں مارنے والا پانی کا گھونٹ برداشت نہیں کرسکا، آخر چت ہوگیا۔ اور یہ تو دُنیا کا عذاب سب نے دیکھ لیا کہ ساری قوم کو کس طرح سے برباد کیا اور کس طرح سے خود برباد ہوا، اور آخرت کا عذاب بارہا ذکر کردیا گیا۔

واقعۂ فرعون میں عبرت کا سامان!

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی: بے شک اس واقعے میں البتہ نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو کہ ڈرتا ہے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو وہ اس واقعے سے عبرت حاصل کرسکتا ہے، سوچنے کی جگہ ہے، کہ اگر فرعون جیسا بادشاہ اور اتنے ساز و سامان کا مالک، فوجوں کا مالک، اور ہر چیز کا مالک، وہ نافرمانی کے نتیجے میں یوں ایک لمحے میں فنا کر دیا گیا اور وہ اپنا بچاؤ اور تحفظ نہیں کر سکا، تو یہ مشرکینِ مکہ اُس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ تو ڈرنے والوں کے لئے، جو خوف و خشیت قلب میں رکھتے ہوں ان کے لئے اس واقعے میں عبرت ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ

کیا تم زیادہ سخت ہو از روئے پیدا کرنے کے یا آسمان؟ اللہ نے اس کو بنایا ﴿۲۷﴾ اس کی چھت کو اُونچا کیا، پھر اس کو دُرست کیا ﴿۲۸﴾ اور اس کی رات

لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ

کو تاریک بنایا اور اس کی روشنی نکالی ﴿۲۹﴾ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا ﴿۳۰﴾ نکالا اُس زمین سے اس کا پانی اور

مَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ فَاِذَا جَآءَتِ

اس کا چارہ ﴿۳۱﴾ اور پہاڑ، قائم کیا اُن کو ﴿۳۲﴾ تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے ﴿۳۳﴾ پس جب بہت بڑی آفت

الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰی ﴿۳۴﴾ یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ

آجائے گی ﴿۳۴﴾ جس دِن کہ یاد کرے گا انسان ان کاموں کو جو اس نے کیے ﴿۳۵﴾ اور جہنم نمایاں کردی جائے گی اس شخص کے لئے جو

یَّرٰی ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۳۹﴾

اس کو دیکھے ﴿۳۶﴾ پھر وہ شخص جس نے سرکشی اختیار کی ﴿۳۷﴾ اور اس نے دُنیوی زندگی کو ترجیح دی ﴿۳۸﴾ پس جہنم ہی ٹھکانا ہے ﴿۳۹﴾

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ

اور جو شخص اپنے رَبّ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو اُس کی خواہش سے روکا ﴿۴۰﴾ تو جنت ہی

الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾ یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ

ٹھکانا ہے ﴿۴۱﴾ پوچھتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ ﴿۴۲﴾ اس کے ذکر سے آپ

ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ

کس چیز میں ہیں ﴿٤٣﴾ اس کا منتہا تو آپ کے رَبّ کی طرف ہے ﴿٤٤﴾ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ ڈرانے والے ہیں اس شخص کو جو

يَّخْشٰىهَا ﴿٤٥﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿٤٦﴾

قیامت سے ڈرتا ہے ﴿٤٥﴾ جس دِن یہ لوگ اُس قیامت کو دیکھیں گے گویا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر شام یا اُس شام کی صبح ﴿٤٦﴾

تفسیر

اِثباتِ معاد کے لئے آیاتِ قدرت میں تفکر کی دعوت

آگے پھر وہی عود آ گیا اِثباتِ معاد کی طرف، ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا: کیا تم زیادہ سخت ہو از روئے پیدا کرنے کے یا آسمان؟ یعنی اپنا مقابلہ آسمان سے کر کے دیکھو کہ تمہاری حیثیت آسمان کے مقابلے میں کیا ہے؟ آسمان کا بنانا تمہارے مقابلے میں زیادہ سخت ہے، لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (سورۂ غافر:۵۷) کچھ اس قسم کے الفاظ بھی آپ کے سامنے آئے ہوں گے، زمین و آسمان کا پیدا کرنا انسان کے پیدا کرنے سے بڑی چیز ہے، اور جو اس پر قادر ہے وہ تمہیں دوبارہ بنانے پر قادر کیوں نہیں؟ اور جو پہلی مرتبہ پیدا کر سکتا ہے وہ دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتا؟ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (سورۂ یٰس:۷۹) آپ کہہ دیجئے کہ ہڈیوں کو زندہ وہی کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ بنایا، ''کیا تم زیادہ سخت ہو از روئے پیدا کرنے کے یا آسمان؟'' بَنٰىهَا: اللہ نے اس آسمان کو بنایا، بنی ماضی کا صیغہ ہے، رَفَعَ سَمْكَهَا: اس کی چھت کو اُونچا کیا، فَسَوّٰىهَا: پھر اس کو دُرست کیا، برابر کیا، یعنی اس کا نشیب و فراز ختم کیا، ''پھر اُس کو دُرست کیا، برابر کیا'' وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا: اور اس کی رات کو تاریک بنایا، وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا: اور اس کی روشنی نکالی، ضحیٰ روشنی کو کہتے ہیں۔ رات اور دِن (ضحیٰ: روشنی) اس کی نسبت آسمان کی طرف کی کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ سورج اور چاند کے چکروں کے ساتھ ہی رات آتی ہے، دِن آتا ہے، روشنی آتی ہے، تاریکی آتی ہے، تو اس لیے ان کی نسبت اُدھر کی۔ یہ سب قدرت کی طرف اشارہ ہو گیا، رات کیسی بنا دی؟ دِن کیسا بنا دیا؟ آسمان کیسے اُونچا کیا؟ کس طرح سے اس کا تسویہ کیا، اس کو ٹھیک کیا، دُرست بنایا۔

تخلیق میں آسمان مقدم ہے یا زمین؟

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا: اور اس کے بعد زمین کو بھی بچھایا۔ دَحو بچھانے کو کہتے ہیں۔ یعنی زمین کی خلقت مادّے کے اعتبار سے پہلے ہو گئی لیکن بچھایا اس کو بعد میں گیا، تو سورۂ حٰم السجدہ کے اندر یہ تفصیل آئی تھی کہ پیدا کرنے کے اعتبار سے زمین مقدم ہے یا آسمان؟ معلوم ہوتا ہے کہ من وجہٍ وہ مقدم ہے، اور من وجہٍ وہ، جیسے آسمان کا مادّہ دُخان کی شکل میں تیار کر لیا گیا تو اس کے بعد زمین موجود کر لی گئی، اور پھر دُخان کو سات آسمانوں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تو اس کے بعد پھر زمین کو بچھا دیا گیا، تو یہ مختلف

درجات کے اعتبار سے ہے، جس طرح سے آپ مکان بناتے ہیں، تو یہ زمین اس میں فرش کی طرح ہے اور آسمان چھت کی طرح ہے، کام کرتے وقت کبھی مستری اُوپر کا کام کیا کرتے ہیں چھت کی طرف، کبھی اس کام کو کسی وجہ سے ادھورا چھوڑ کر نیچے فرش میں کام کرنے لگتے ہیں، یہ ایک مثال دے رہا ہوں سمجھانے کے لئے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی حکمت کے تحت زمین کا کچھ حصہ پہلے بنایا، کچھ آسمان کا بنایا، پھر آسمان کی تکمیل کی، پھر زمین کی تکمیل کی، تو من وجہٍ اسے مقدم کہہ سکتے ہیں اور من وجہٍ اسے مقدم کہہ سکتے ہیں، کلیۃً تقدیم کسی کی نہیں، دونوں ہی یکے بعد دیگرے بنتے چلے گئے، اپنے درجات طے کرتے چلے گئے، اس لئے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مکمل آسمان زمین سے پہلے نہیں بنا، اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مکمل زمین آسمان سے پہلے نہیں بنی، کچھ حصہ پہلے، کچھ حصہ بعد میں، بعض چیزیں پہلے بنادی گئیں، بعض بعد میں بنادی گئیں۔ ''اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔''

بارش اور پہاڑوں کے نظام میں قدرت اور اِنعام کے مظاہر

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا: آسمان کی طرف رات اور دِن کی نسبت کی تھی، ''اور نکالا زمین سے اس کا پانی۔'' اور مَرْعٰی: چرنے کی چیز۔ رَعٰی یَرْعٰی: چرنا۔ مَرْعٰی سے یہاں مراد ہے چارہ وغیرہ جو جانور کھاتے ہیں، نباتات۔ ''نکالا اس زمین سے اس کا پانی اور اس کا چارہ۔'' وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا: اور پہاڑ، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے مضبوطی سے قائم کیا۔ ارسیٰ: قائم کیا۔ راسیات: قائم ہونے والے پہاڑ۔ رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا، راسیہ کی جمع، ''اور پہاڑ، قائم کیا اُن کو۔'' مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ: تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے، اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور تمہارے جانوروں کا بھی فائدہ ہے، تم بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے ہو اور تمہارے جانور بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں، اور جانور جو فائدہ اُٹھاتے ہیں تو ان فائدہ اُٹھانے والوں سے پھر آگے تم فائدہ اُٹھاتے ہو، چونکہ جانور آخر وہ بھی تمہارے کام کے ہی ہیں، ان کے لئے چارہ ان کے لئے پانی نکالا، کھاتے ہیں پلتے ہیں، بعد میں تمہارے ہی کام آتے ہیں۔ تو ان سب چیزوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے، اور ساتھ ساتھ احسان کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔

قیامت کے دِن کے کچھ حالات

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى: طامۃ بڑے حادثے کو کہتے ہیں، بڑی مصیبت کو، جو سب پہ طاری ہو جائے، کبریٰ اس کے ساتھ صفت اور زیادتی کے لئے آ گئی، ''پس جس وقت بہت بڑا حادثہ آجائے گا، بہت بڑی مصیبت آجائے گی'' طامۂ کبریٰ، طَمٌّ غالب آنے کو کہتے ہیں، طامۃ: غالب آنے والی چیز، کبریٰ: بہت بڑی، یعنی ایسا واقعہ پیش آجائے گا جو سب کے اُوپر بلائے ناگہانی کے طور پر طاری ہو جائے گا، ''جب بہت بڑی آفت آجائے گی'' یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى: جس دِن کہ یاد کرے گا انسان ان کاموں کو جو اِس نے کیے ہیں، جو کچھ اس نے دُنیا میں کیے تھے سب یاد آجائیں گے، اب تو پتا نہیں کہ کیا کیا کر چکے ہیں، کبھی توجہ نہیں کرتے، لیکن اُس وقت زندگی کے اعمال کی سب فلم سامنے نمایاں ہو جائے گی، ''یاد کرے گا انسان اس کام کو جو اس نے کیا۔'' وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى: اور جہنم نمایاں کردی جائے گی اس شخص کے لئے جو اس کو دیکھے، جب انسان اُٹھیں گے، قیامت

کے میدان میں جمع ہوں گے، تو ان کے سامنے جہنم کو بھی نمایاں کر دیا جائے گا، آنکھوں کے سامنے آ جائے گی اور نظر آئے گا کہ اپنی غلط کاریوں کی بنا پر ہم اِس میں جانے والے ہیں۔

دُنیا کو ترجیح دینے والوں کا ٹھکانا

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى: پھر آگے انجام کس طرح سے ہوگا؟ ''پھر وہ شخص جس نے سرکشی اختیار کی'' دُنیا کے اندر اللہ کے اَحکام نہیں مانے، طاغی ہوگیا، وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا: اور طغیان اصل میں ظاہر اسی طرح سے ہوتا ہے کہ دُنیوی زندگی کو اس نے ترجیح دی آخرت کے مقابلے میں، جب اس کے سامنے دو کام پیش ہوئے، ایک کام کرنے میں آخرت کا فائدہ تھا اور دُنیا کا نقصان، اور ایک کام کرنے میں دُنیا کا فائدہ تھا اور آخرت کا نقصان، تو جو شخص ایسے موقع پر دُنیا کے فائدے کو اِختیار کرتا ہے تو گویا کہ آخرت کے مقابلے میں وہ دُنیا کو ترجیح دیتا ہے، اور یہ دُنیا کی محبت یہی آخر کار ہر قسم کے فساد کا ذریعہ بنتی ہے۔ ابھی آپ کے سامنے رمضان شریف[1] گزرا تو بھوک اور پیاس بظاہر ایک تکلیف کی چیز ہے، اور اگر آپ کھاتے پیتے تو بظاہر ایک راحت کی چیز ہے، اگر آپ نے باوجود اس بات کے کہ آپ کو ٹھنڈا پانی میسر تھا اور کھانے کی چیزیں میسر تھیں، لیکن آپ نے وہ ترک کیں اور بھوک اور پیاس کو برداشت کیا تو آپ نے آخرت کو ترجیح دی دُنیا پر، اور اگر آپ نے کہا کہ کون پیاس اور بھوک اُٹھائے؟ یہ مصیبت کون جھیلے؟ اور اسی طرح سے مزے کے ساتھ ٹھنڈا پانی پیتے رہے اور کھانا کھاتے رہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے دُنیا کو ترجیح دے دی آخرت کے مقابلے میں۔ رات کے وقت بہت پیاری پیاری نیند آئی ہوئی ہے، سونے کو جی چاہتا ہے، لیکن آپ اس آرام کو چھوڑتے ہیں اور نماز کی طرف اُٹھتے ہیں، تو آپ آخرت کو ترجیح دے رہے ہیں دُنیا کے مقابلے میں، اور اگر آپ کہتے ہیں کہ چھوڑو، کیا نماز پڑھنی ہے، مزے کی نیند ہے، سوئے رہیں، تو آپ آخرت کے مقابلے میں دُنیا کو ترجیح دے رہے ہیں، اسی طرح سے حلال حرام کھانے میں، کمانے میں، اور باقی جتنے بھی انسان کے اعمال ہیں، اس میں جائز ناجائز کی جو تقسیم ہے، تو جو دُنیوی نقصان کو برداشت کرلے، دُنیوی تکلیف کو برداشت کرلے، اور آخرت کے اَحکام کی رعایت رکھے جو آخرت میں مفید ہیں، وہ آخرت کو ترجیح دے رہا ہے دُنیا کے مقابلے میں، اور جو دُنیا کی لذت کو سامنے رکھتا ہے، دُنیا کے آرام کو سامنے رکھتا ہے، اس بات کی پرواہی نہیں کرتا کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے، تو دُنیا کو ترجیح دے رہا ہے آخرت کے مقابلے میں۔ تو جو شخص سرکش ہوگیا، جس نے طغیان کی زندگی اختیار کی، اور اس نے دُنیوی زندگی کو ترجیح دی، فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى: پس پھر جہنم ہی ٹھکانا ہے، ماویٰ ٹھکانے کو کہتے ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم میں ہے۔

خواہشِ نفس سے بچنے والوں کا ٹھکانا

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ: اور جو شخص اپنے رَبّ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈر گیا، وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى: اور اپنے نفس کو اُس کی خواہش سے روکا، یہ نہیں کہ جو جی میں آیا کرلیا، بلکہ اپنے نفس پہ پابندی لگاتا ہے کہ خواہش پر نہیں چلنا، ہویٰ کی اتباع

---

(۱) غالباً یہ ۲۰۰۲ء کا رمضان تھا۔ واللہ اعلم۔

نہیں کرنی، بلکہ ہدیٰ کی اتباع کرنی ہے، خواہشاتِ نفس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اتباع کرنی ہے، اس طرح سے اپنے نفس پر پابندی لگا کے رکھتے ہیں، اتباعِ ہویٰ کو نہیں اپناتے "اور روکا اُس نے اپنے نفس کو خواہشات سے" فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى: تو جنّت ہی ٹھکانا ہے، تو جنّت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہو گیا کہ اپنے رَبّ کے سامنے کھڑے ہونے سے ہر وقت ڈرتے رہو، یہ عقیدہ رکھو کہ ہم نے اپنے رَبّ کے سامنے پیش ہونا ہے اور جا کر اپنے زندگی بھر کے اعمال کا حساب دینا ہے، اور خواہشاتِ نفس کو ترک کر دو، یعنی اگر نفس کی کوئی خواہش ایسی ہے......! نفس کی خواہش وہی ہے جو اللہ کے اَحکام کے خلاف ہے، نفس سونا چاہتا ہے اور اللہ کا حکم ہے جاگو، نفس کھانا چاہتا ہے اور اللہ کا حکم ہے بھوکے رہو، اور نفس آرام کرنا چاہتا ہے اور اللہ کا حکم ہے کہ جہاد کرو، چلو پھرو۔ تو اللہ کے اَحکام کے مقابلے میں دِل کے اندر جو خواہش پیدا ہوتی ہے اس خواہش کو مٹانا یہ ہے اصل میں جنّت میں لے جانے والی چیز۔

جنّت اور جہنّم کو دیکھ کر جبریل علیہ السلام کا تأثر

حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت جنّت اور دوزخ کو پیدا کیا، پہلے اللہ نے پیدا کیا جنّت کو، تو جبریل علیہ السلام سے کہا کہ جاؤ! ذرا دیکھ کر آؤ، سیر کر کے آؤ۔ جس وقت انہوں نے جا کر جنّت کو دیکھا کہ اس میں ایسی ایسی شان دار نعمتیں ہیں اور اس قسم کے عیش اور آرام کا سامان اس کے اندر رکھا ہوا ہے، تو آ کے کہتے ہیں کہ یا اللہ! اس جنّت کو تو جو بھی سنے گا وہ تو بھاگا بھاگا ہوا آئے گا، کوئی انسان بھی باہر نہیں رہے گا، سارے جنّت میں ہی آ جائیں گے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کے اردگرد باڑ کر دی مکارِہ کی، ناگواریوں کی، جس کا مطلب یہ تھا کہ جس وقت تک کوئی شخص اپنے نفس کی ناگواریوں کو برداشت نہیں کرے گا، اور شدائد اور مصیبتیں نہیں اُٹھائے گا اپنے نفس کی ناگواریاں برداشت کرتے ہوئے اور خواہشات کو ترک کر کے، اس وقت تک جنّت میں نہیں آ سکتا۔ تو جب جبریل علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ اس کے اردگرد تو بڑا مضبوط پہرہ لگا دیا گیا مکارہ کا، ناگواریوں کا، تو کہنے لگے کہ اب تو مجھے اندیشہ ہے کہ شاید کوئی انسان بھی اِدھر نہ آ سکے، اتنی مشقت کون برداشت کرے گا، اپنی خواہشات کو کون مٹائے گا۔ باہر والے دُشمن کا مقابلہ آسان ہوا کرتا ہے، باہر کوئی کتّا ہے، کوئی درندہ ہے اس کے ساتھ آپ مقابلہ کر لیں، کوئی انسان آپ پر حملہ آور ہو جائے اس کا آپ مقابلہ کر لیں، یہ بالکل آسان ہے، اس میں کوئی ایسی دِقت نہیں ہوتی، جب غصہ آ جاتا ہے انسان کو تو سب کچھ کر گزرتا ہے، لیکن اپنے دِل کی خواہش کو مٹانا اور اپنے خلاف جہاد کرنا یہ بہت بڑی بات ہے، یہ تو ایسے ہے جیسے ناخنوں سے چمڑے کو چھڑایا جائے، دِل کی خواہشات کا مٹانا اتنا مشکل ہوتا ہے، اور جنّت اس وقت تک ملے گی نہیں جب تک اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی پابندی میں اپنے دِل کی خواہشات ترک نہیں کرو گے، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی پابندی میں دِل کی خواہشات ترک کرو گے تب جا کے جنّت میں جاؤ گے۔ تو جبریل علیہ السلام نے دیکھ کے پھر یہ رائے قائم کی۔ اور اسی طرح سے پھر جہنّم کو دیکھنے کے لئے گئے تو وہاں مصیبتیں دیکھیں، عذاب دیکھا، تو کہتے ہیں کہ یا اللہ! جو شخص بھی سنے گا وہ تو بھاگے گا، اِدھر تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اردگرد خواہشات کی باڑ کر دی، کہ جو شخص دُنیا میں اپنی خواہشات پر چلے گا گویا کہ وہ جہنّم کا راستہ

طے کرتا چلا جارہا ہے، تو جب جبریل علیہ السلام نے دیکھا تو کہنے لگے کہ یا اللہ! مجھے تو اندیشہ ہے کہ سارے اِدھر کو ہی بھاگے آئیں گے۔[1]
تو بات اصل میں یہی ہے کہ جو اپنی خواہش کو مقدم رکھتا ہے اور اللہ کے اَحکام کو مقدم نہیں رکھتا وہ بڑی تیزی کے ساتھ جہنم کی طرف سفر طے کرتا چلا جارہا ہے، اور جو شخص اللہ کے اَحکام کی رعایت رکھتا ہے اور دِل کی خواہشات کو مٹاتا ہے وہ بڑی تیزی کے ساتھ جنت کا سفر طے کرتا چلا جارہا ہے۔ تو یہ دونوں راستے واضح کردیے کہ طغیان اور سرکشی اور دُنیوی زندگی کو ترجیح دینا یہ تو جہنم میں لے جانے والی چیز ہے، اور اللہ کے سامنے پیش ہونے سے ہر وقت ڈرنا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکنا یہ جنت کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔

قیامت کی تعیین کا علم صرف اللہ کے پاس ہے

آخر میں وہی پھر قیامت کا ذِکر آ گیا...... یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا: یہ مرسیٰ وہی لفظ ہے جو پہلے آپ کے سامنے گزرا، وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا، اَرسیٰ قائم کرنے کو کہتے ہیں، تو مُرسیٰ: قائم ہونے کا وقت، قائم ہونے کی جگہ، اس لئے مُرسیٰ لنگر اَنداز ہونے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں جہاز لنگر اَنداز ہوتا ہے، جیسے بندرگاہ ہوتی ہے،''پوچھتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ اس کا وقوع کب ہوگا'' یہ کب واقع ہوگی؟ یہ پوچھتے ہیں، جب ان کے سامنے قیامت کا ذِکر کیا جاتا تو وہ سوال یہی کرتے کہ ہمیں اس کی کوئی تاریخ بتاؤ، کوئی دِن بتاؤ، کوئی مہینہ بتاؤ، کب وہ آئے گی، اور یہ محض تکذیب کے لئے تھا، اور بار بار اللہ کی طرف سے یہ بات نمایاں کردی گئی کہ قیامت کا علم اللہ نے کسی کو نہیں دیا، اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (سورۂ لقمان: ۳۴) قیامت کا علم یعنی اس کی تعیین کا علم کہ وہ کب آئے گی صرف اللہ کے پاس ہے، کسی کو نہیں بتایا، ''حدیثِ جبریل'' جو ''مشکوٰۃ'' میں آتی ہے تو اس میں جبریل علیہ السلام نے جو سوال کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ مجھے قیامت کے متعلق بتاؤ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ''[2] جس سے پوچھا جارہا ہے قیامت کے متعلق، یعنی میں، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، یعنی میں اور تُو اس میں برابر ہیں، نہ تجھے پتا نہ مجھے پتا، یہ علم اللہ نے کسی کو نہیں دیا۔ اور وہ بار بار سوال اُٹھاتے تھے محض تکذیب کے لئے، جب وقت نہ بتایا جاتا پھر کہتے لو! اتنی بڑی بات ہونے والی ہے، اور ہر روز ہمیں ڈراتے رہتے ہیں، اور بتاتے ہیں نہیں کب آئے گی، اس طرح سے بہانہ بناتے تھے تکذیب کا، ''سوال کرتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ اُس کا وقوع کب ہوگا''

سَروَرِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا: اُس کے ذِکر سے تُو کس چیز میں ہے؟ یعنی تیرا کوئی تعلق نہیں اُس کی تاریخ ذِکر کرنے سے، ''اُس کے ذِکر سے تُو کس چیز میں ہے'' یعنی کسی چیز میں نہیں، یہ تیرا منصب نہیں ہے کہ تُو اس کا وقت بتا سکے، اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا: اس کا منتہیٰ تو

(۱) ترمذی ۲/ ۸۳ باب ما جاء حفت الجنة ...الخ/ ابوداؤد ۲/ ۲۹۶ باب فی خلق الجنة والنار/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۵ باب خلق الجنة، فصل ثانی۔
(۲) بخاری ص ۱۲ باب سوال جبریل/ مسلم ص ۲۷، کتاب الایمان کی پہلی حدیث/ مشکوٰۃ ص ۱۱، کتاب الایمان کی دُوسری حدیث۔

تیرے رَبّ کی طرف ہے، جب چاہے گا تیرا رَبّ اُس کو ظاہر کردے گا، اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ ڈرانے والے ہیں اس شخص کو جو کہ ساعت سے ڈرتا ہے، جس کے دِل میں اس قیامت کا خوف ہے اس کو آپ مزید ڈرایئے کہ اس کے اندیشے سے وہ نیک عمل کرے، مَنْ يَّخْشٰى کا ذکر اس لئے کردیا کہ اِنذار سے متاثر وہی ہوتا ہے، ورنہ ڈرایا تو سب کو جاتا ہے، جس کے دِل میں خوف وخشیت ہے آپ تو اس کو مزید اِنذار کرسکتے ہیں تاکہ وہ اپنا اہتمام کریں، تیاری کریں۔

دُنیا کا طویل زمانہ قیامت کے دِن کیسا معلوم ہوگا؟

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا: كَاَنَّهُمْ لَمْ يَلْبَثُوْۤا، كَاَنَّهُمْ کا تعلق لَمْ يَلْبَثُوْۤا کے ساتھ ہے، يَوْمَ يَرَوْنَهَا: جس دِن یہ لوگ اُس قیامت کو دیکھیں گے گویا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر شام یا اس شام کی صبح، یعنی اب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت دُور ہے، پتا نہیں کہ کب آئے گی، نہیں آئے گی، جس دِن وہ آجائے گی اُس دِن ایسے معلوم ہوگا جیسے دُنیا کی زندگی ایسے گزری ہے جیسے صبح شام، یہ برس ہا برس کی زندگی ایسے لگے گی جیسے ایک ہی دِن کی صبح شام گزری ہے، اب یہ اس طرح سے بار بار سوال کررہے ہیں، اور اس کے واقع ہوجانے کے بعد ایسے لگے گا جیسے کوئی دیر ہی نہیں لگی، "گویا کہ یہ لوگ جس دِن کہ دیکھیں گے اُس ساعت کو، نہیں ٹھہرے، گویا کہ یہ نہیں ٹھہرے مگر شام یا اس شام کی صبح" یعنی ایسے معلوم ہوگا کہ دُنیا کی طویل زندگی ایسے گزرگئی جس طرح سے صبح وشام کا وقت گزرجاتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتھا ۴۲ ۸۰ سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ ۲۴ رکوعھا ۱
سورۂ عبس مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۴۲ آیتیں ہیں، اور اس میں ایک رُکوع ہے
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ③ اَوْ
تیوری چڑھالی اور اِعراض کرلیا ○ اس سبب سے کہ اس کے پاس ایک نابینا آگیا ○ آپ کو کیا معلوم؟ کہ وہ پاک صاف ہوجاتا ○ یا
يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ⑥ وَمَا
وہ نصیحت حاصل کرتا پھر وہ نصیحت اس کو نفع دیتی ○ لیکن جو شخص لاپرواہ ہے ○ آپ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ○ نہیں ہے

عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝٨ وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠

آپ پر کوئی الزام کہ وہ پاک نہ ہو ۝ لیکن جو شخص آپ کے پاس بھاگا ہوا آتا ہے ۝ اور وہ ڈرتا بھی ہے ۝ آپ اس سے غفلت برتتے ہیں ۝

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝١٢ فِيْ صُحُفٍ

آپ اس طرح سے ہرگز نہ کیجئے، یہ تو ایک یاد دہانی ہے ۝ جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کرلے ۝ (یہ قرآن) ایسے صحیفوں میں ہے جو

مُّكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝١٤ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝١٥ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝١٦

بہت باعزت ہیں ۝ اونچے مرتبے والے ہیں، صاف ستھرے ہیں ۝ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں ۝ جو بڑے کریم ہیں بڑے نیک ہیں ۝

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝١٧ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝١٨ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ

انسان برباد ہو جائے! یہ کتنا ہی ناشکرا ہے ۝ کس چیز سے اللہ نے اس کو پیدا کیا؟ ۝ ٹپکائے ہوئے قطرے سے! اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا

فَقَدَّرَهٗ ۝١٩ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝٢٠ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝٢١ ثُمَّ اِذَا شَآءَ

پھر اس کا اندازہ کیا ۝ پھر راستہ، آسان کیا اللہ نے اس کو ۝ پھر اس کو موت دی، پھر اس کو قبر میں چھپالیا ۝ پھر جب چاہے گا

اَنْشَرَهٗ ۝٢٢ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝٢٣ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ

اس کو اٹھا کھڑا کرے گا ۝ ہرگز نہیں! ابھی تک اس نے پورا نہیں کیا اس بات کو جس کا اس کو اللہ نے حکم دیا تھا ۝ پس چاہیے کہ دیکھے انسان

اِلٰى طَعَامِهٖ ۝٢٤ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝٢٥ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝٢٦ فَاَنْبَتْنَا

اپنے کھانے کی طرف ۝ بے شک گرایا ہم نے پانی گرانا عجیب طریقے سے ۝ پھر ہم نے پھاڑا زمین کو پھاڑنا عجیب طریقے سے ۝ پھر ہم نے اُگایا

فِيْهَا حَبًّا ۝٢٧ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝٢٨ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝٢٩ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝٣٠ وَّفَاكِهَةً وَّ

اس زمین کے اندر غلہ ۝ اور انگور اور ترکاری ۝ اور زیتون اور کھجوریں ۝ اور گھنے باغات ۝ اور میوہ جات اور

اَبًّا ۝٣١ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝٣٢ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝٣٣ يَوْمَ يَفِرُّ

سبز گھاس ۝ تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے ۝ پس جس وقت آجائے گی کانوں کو بہرہ کرنے والی ۝ جس دن کہ بھاگے گا

الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝٣٤ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝٣٥ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝٣٦ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ

انسان اپنے بھائی سے ۝ اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے ۝ اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے ۝ ان میں سے ہر انسان کے لئے اس دن

شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَ

ایسا حال ہوگا جو اس کو دُوسروں سے بے پروا کردے گا۞ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے۞ ہنسنے والے ہوں گے، خوش ہونے والے ہوں گے۞ اور

وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

کچھ چہرے اس دِن ایسے ہوں گے کہ ان پر گرد وغبار ہوگا۞ ان کو سیاہی نے ڈھانپا ہوا ہوگا۞ یہی لوگ کافر فاجر ہیں۞

سورت کا مرکزی مضمون اور ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ عبس مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۴۲ آیتیں ہیں اور اس میں ایک رُکوع ہے۔ اور اب قرآنِ کریم کے آخر تک جتنی سورتیں آرہی ہیں ان سب میں رُکوع ایک ہی ہوگا۔ ''مکی'' سورتوں کی طرح اِس سورت میں بھی زیادہ تر ذِکر اِثباتِ معاد کا ہے، اور مضمون پچھلی سورت کے ساتھ بالکل ملتا جلتا ہے، پچھلی سورت میں دُوسرا رُکوع جب شروع ہوا تھا تو اس میں ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا، انسان کی خلقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے متوجہ کیا تھا، اور اسی کو مثال بنایا تھا اثباتِ معاد کے لئے، اور پھر اپنی قدرت کی دیگر نشانیوں کو بیان فرمایا تھا، اِس سورت کے اندر بھی اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی اپنی پیدائش کی طرف ہی متوجہ کرتے ہیں مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ، اور اس کے بعد اسی طرح سے آیات کا ذِکر ہے جو قدرت پر بھی دلالت کرنے والی ہیں اور اِنعامات پر بھی، جس میں اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت بھی نمایاں ہے اور وحدانیت بھی۔ اور پچھلی سورت کے آخر میں قیامت کے اَحوال ذِکر کئے گئے تھے فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى، اور اِس سورت میں بھی آرہا ہے فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ۔ اور وہاں بھی آخر میں دونوں فریقوں کا ذِکر تھا، اچھوں کا بھی اور بُروں کا بھی، اسی طرح سے یہاں بھی آخری آیات میں اچھے بُرے دونوں قسم کے انسان مذکور ہیں۔ اور پچھلی سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذِکر کیا گیا تھا، کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی اور فرعون نے مخالفت کی، تو اِس پیغمبر کی مخالفت کے نتیجے میں وہ دُنیا اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لیا گیا، اور اس سورت کے اندر قرآنِ کریم کی عظمت کو ذِکر کیا گیا ہے کہ ایسی عظیم الشان کتاب، جو شخص اس کی مخالفت کرے گا وہ دُنیا اور آخرت کی بربادی میں آئے گا، دُنیا اور آخرت میں اپنا نقصان کرے گا۔

اِبتدائی آیات کا شانِ نزول

اِبتدا کے اندر جو آیات ہیں وہ ایک واقعے سے متعلق ہیں، یہ مضمون اس سورت میں نیا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ رُؤسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے اور ان کے سامنے تبلیغ کر رہے تھے، مکہ معظمہ کے بڑے بڑے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، اور وہ بہت متکبر سرکش قسم کے لوگ تھے، برداشت نہیں کرتے تھے کہ کوئی مسکین یا غریب ہماری مجلس میں آکے بیٹھے، اِسی دوران میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ جو نابینا ہیں، خاندان کے اعتبار سے تو قریشی ہیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ اور اُمّ المؤمنین ہیں اُن کے یہ ماموں زاد بھائی

ہیں، اس اعتبار سے خاندان تو ان کا عالی ہے، لیکن یہ سمجھے جاتے تھے مساکین میں، اور نابینا بھی تھے، قرآنِ کریم میں بہت ساری آیات آپ کے سامنے گزری ہیں جن میں یہ مضمون ذکر کیا گیا تھا کہ مشرکین یہ مطالبہ کیا کرتے تھے کہ ہم تب آپ کی مجلس میں آکے بیٹھیں گے کہ آپ اِن مساکین کو اپنی مجلس سے اُٹھا دیجئے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اِن مسکینوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی گئی، کہ جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور مخلص ہیں سرورِ کائنات ﷺ سے بارہا کہا گیا کہ آپ کی توجہ انہی کی طرف ہی مبذول ہونی چاہیے، اسی قسم کا مضمون اِس واقعے میں بھی آگیا، تو جب یہ عبد اللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ مجلس میں آئے تو سرورِ کائنات ﷺ کو اُن کا آنا کچھ ناگوار گزرا، اتنا سا ناگوار کہ چہرے کے اُوپر کچھ ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے...... یہ ناگواری کے آثار کیوں نمایاں ہوئے؟ ۔نعوذ باللہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ آپ ﷺ کو مساکین سے کوئی نفرت تھی، یا آپ ﷺ کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت نہیں تھی، یہ بات نہیں۔ یہاں دو باتیں ہیں، ایک ہے رُؤسائے مشرکین کو تبلیغ کرنا، اور یہ اُمید کہ اگر یہ سمجھ جائیں گے اور اِسلام لے آئیں گے تو اِس سے دین کو بہت فائدہ پہنچے گا، تقویت پہنچے گی، اور وہ مبتلا بھی شرک میں تھے، اور ان کو شرک سے روکا جا رہا تھا، اور یہ جو عبد اللہ رضی اللہ عنہ آئے تھے یہ تو مسلمان ہو چکے تھے، انہوں نے اگر کوئی بات پوچھنی تھی تو ایسی تھی جو آئندہ کے لئے عمل کا فائدہ دیتی، اور یہ مزید پاک صاف ہو جاتے، ستھرے ہو جاتے، عمل کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب حاصل کرتے، ورنہ یہ کفر وشرک تو چھوڑ چکے تھے، اپنے گھر کے آدمی ہو گئے تھے، اور اِن کا آنا جانا تو حضور ﷺ کے ہاں دوسرے اوقات میں ہو سکتا تھا، بخلاف رُؤسائے مشرکین کے کہ ان کی ملاقات اتفاقی ہوتی تھی۔ ایسے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا رُجحان ادھر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ رُؤسا جو اِتفاقاً آگئے ہیں اور بات سُن رہے ہیں یہ اس وجہ سے منقبض ہو کے، متنفر ہو کے اُٹھ کر چلے جائیں کہ ہماری موجودگی میں یہ مسکین کیوں آیا، وہ لوگ متکبر تھے، اللہ تعالیٰ کو بھولے ہوئے تھے، اپنے مال ودولت کے اُوپر بہت پھولے ہوئے تھے، وہ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ کوئی مسکین ان کے برابر آکے بیٹھے، تو رسول اللہ ﷺ نے اس چیز کو ترجیح دی کہ ان کو شرک سے روکنا زیادہ اہم ہے، اور ان کو سمجھانا زیادہ اہم ہے، بایں معنی کہ اگر یہ مان جائیں گے تو دِین کو فائدہ زیادہ ہوگا۔ لیکن دُوسری بات جدھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے متوجہ کیا وہ یہ ہے کہ ایک آدمی تو رغبت کر کے آتا ہے، شوق کے ساتھ آتا ہے، دِین سمجھنے کے لئے آتا ہے، محبت اور عقیدت کے ساتھ آتا ہے، چاہے وہ مسکین ہے، اور ایک آدمی ہے جو سمجھنا نہیں چاہتا، تکبر میں ہے، سرکشی میں ہے، ہم اس کو اَز خود سمجھانے کی کوشش کریں اور وہ لاپروائی برتے، تو اللہ تعالیٰ نے متوجہ کیا ہے اپنے حبیب پاک ﷺ کو کہ آپ کو ایسے لوگوں کو ترجیح دینی چاہیے جو کہ راغب ہیں، شوق کے ساتھ آتے ہیں، محبت کے ساتھ آتے ہیں، سمجھنا اُن کا مقصود ہے، چاہے وہ مساکین ہی کیوں نہ ہوں، دِین کی عزّت اور عظمت مفلس مگر باوفا ساتھیوں کی وجہ سے ہوا کرتی ہے، اگر کوئی مال دار شخص متکبر ہو تو اس کو کوشش کرنا اور اس کے پیچھے پڑنا کہ اس کی لاپروائی ہو اور آپ کی طرف سے اتنی کوشش ہو، یہ مناسب نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو یہاں یہ ہدایات دیں، کہ مشرکین کے تو سمجھنے کی توقع نہیں، اور یہ (مفلس مؤمن) سمجھنے کے لئے آتے ہیں، جو مخلص ہو اس کے ساتھ اگر اعراض کا معاملہ ہو جائے، اور جو مشرک ہیں، متکبر ہیں، ان کے اِنسان پیچھے پڑے تو اس کا بسا اوقات یہ اثر ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والے یہ سمجھ لیں کہ شاید اللہ کا نبی بھی مساکین کی قدر نہیں کرتا اور یہ بھی سرمایہ دار اور

بڑے لوگوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، تو اس سے اس دین کو زیادہ نقصان پہنچ سکتا تھا، جتنا کہ مشرکین کے آنے کے ساتھ اتنے نفع کی توقع نہیں تھی جیسے اس قسم کا رُجحان پیدا ہو جانے کے ساتھ نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اب یہ ٹھیک ہے کہ ایک آدمی کے اندر مرض زیادہ شدید ہو، مثلاً ایک طبیب ہے، اس کے سامنے دو آدمی آئے، ایک ایسا ہے کہ اس کو سانپ لڑا ہوا ہے، سانپ نے اس کو کاٹا ہوا ہے، جس کے اندر زہر پھیلتی جا رہی ہے، اور خیال ہے کہ اگر اس کی طرف تھوڑی دیر توجہ نہ دی گئی تو وہ اسی زہر کے ساتھ ہی مر جائے گا، اور ایک آدمی کو محض نزلہ ہے، ناک ٹپک رہا ہے، اگر اس سے کچھ تھوڑی دیر کے لئے دُوری اختیار کر لی جائے تو ایسا کوئی نقصان نہیں ہے، تو جو شفقت والا طبیب ہوا کرتا ہے وہ تو کوشش یہی کرتا ہے کہ پہلے زہر والے کی طرف توجہ کرے اور اس کی زہر اُتارنے کی کوشش کرے تا کہ اس کی جان بچ جائے، اور جس کو نزلہ ہے یا جس کا ناک ٹپک رہا ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مؤخر بھی کر دیا جائے تو اس میں کوئی نقصان کا اندیشہ نہیں۔ لیکن دُوسرا پہلو یہ ہے کہ جس کو سانپ نے کاٹا ہوا ہے وہ بات ہی نہیں سنتا، وہ طبیب کو بُرا بھلا کہتا ہے، اور اس کی دوائی کی قدر ہی نہیں کرتا، اور جس کا ناک ٹپک رہا ہے یا اس کو نزلہ ہے وہ بہت نیاز مند اور عقیدت مند، اور طبیب کی طرف خود چل کے آیا ہے، تو جب یہ دو پہلو ہو جاتے ہیں تو ایسے وقت میں پھر اِجتہاد کے ساتھ ایک طبیب اگر ایک جانب کو ترجیح دیتا ہے تو اس میں کوئی قصور یا نقص والی بات نہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کا رُجحان اگر مشرکین کی طرف ہوا تو اسی اِجتہاد کے اعتبار سے ہوا، کہ یہ توجہ کے زیادہ حق دار ہیں بایں معنی کہ یہ شرک میں مبتلا ہیں، اور اگر یہ اسی حال میں مر گئے تو ان کا انجام تو جہنم ہے، اور وہ دُوسرے جو آئے تھے وہ تو صحابی تھے، انہوں نے تو کوئی مسئلہ ہی پوچھنا تھا یا کوئی مزید نصیحت حاصل کرنی تھی، اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مؤخر بھی کر دیا جائے تو اس میں چنداں نقصان نہیں ہے، حضور ﷺ اپنے اِجتہاد کے ساتھ اِس بات کو ترجیح دیے ہوئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے متوجہ دُوسری طرف کیا کہ نہیں! جو مخلص ہو اور جو خود طالب بن کے آئے اس کو ترجیح دینی چاہیے، اور جو اِعراض کیے ہوئے ہے، پیٹھ پھیرے ہوئے ہے، بات توجہ کے ساتھ سنتا نہیں، اس کے پیچھے زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پہلی آیات کے اندر یہی واقعہ ذِکر کیا گیا ہے۔

تفسیر

نابینا صحابی کا اعزاز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى: غائب کے صیغے کے ساتھ ذِکر کیا منہ موڑ کے، جس میں ایک قسم کا شکوہ ہے لیکن وہ رُوبرو نہیں، اور یہ ایک محبانہ انداز ہوتا ہے، بظاہر اس میں ایک عتاب کا پہلو جو نکلتا ہے وہ سرورِ کائنات ﷺ پر ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے عتاب مشرکینِ مکہ پر ہے، کیونکہ آپ ﷺ کو جو کہا جا رہا ہے کہ آپ اُدھر توجہ نہ کیجئے یہ ایسے لوگ ہیں، اور اِن کی طرف توجہ کیجئے جن کا یہ حال ہے، تو اس میں حقیقت کے اعتبار سے مذمت مشرکین کی نکلتی ہے، چنانچہ آئندہ سرورِ کائنات ﷺ ان کو بہت ترجیح دینے لگ گئے عبداللہ بن اُمِّ مکتوم کو، جب مجلس کے اندر آتے آپ ان کا بہت احترام فرماتے، اور ساتھ یہ بھی کہتے ''مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِيْ فِيْهِ رَبِّيْ مرحبا!'' جس طرح سے خوش آمدید کہا جاتا ہے، ''ایسے شخص کو مرحبا جس کے بارے میں میرے

رَبّ نے میرے پر عتاب کیا" (عام تفاسیر)۔ تو پھر ہر مجلس میں آپ ﷺ ان کا اعزاز کیا کرتے تھے اور اِکرام کیا کرتے تھے۔
چونکہ اُس وقت صورۃً اِن سے اِعراض ہوگیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو متوجہ کیا ہے۔ عَبَسَ کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزرا ہے سورۂ مدثر میں، عَبَسَ کا معنی ہوتا ہے منہ بسور لینا، چہرے کے اُوپر اِنقباض طاری کرلینا، تو عَبَسَ کا معنی کریں گے "تیوری چڑھالی" حضور ﷺ نے تیوری چڑھالی، فاعل یہاں مذکور نہیں، وہ آگے خود ذِکر ہوجائے گا، "منہ بنالیا، چہرے کے اُوپر ناگواری کے آثار آگئے" وَتَوَلّٰی: اور پیٹھ پھیرلی، منہ دُوسری طرف کو کرلیا، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى: اس سبب سے کہ اس کے پاس ایک نابینا آگیا تھا۔

معذور آدمی شفقت کا زیادہ مستحق ہوتا ہے

اعمیٰ کے لفظ کے ساتھ اس کو ذِکر کیا ہے، نام نہیں لیا، کیونکہ اعمیٰ کے لفظ میں یہ چیز موجود ہے کہ وہ تو قابلِ شفقت تھا، نابینا تھا، بے چارہ کتنی مشقت کے ساتھ ٹھوکریں کھاتا ہوا پہنچا تھا، اس قسم کا معذور آدمی جو دِین حاصل کرنے کے لئے آئے اور کوئی بات سننے سنانے کے لئے آئے اس پر تو زیادہ شفقت چاہیے، یہ عجیب معاملہ ہوا کہ ایک نابینا ان کے پاس آیا تھا انہوں منہ ہی بنالیا، اور منہ دُوسری طرف کو کرلیا، یہ گویا کہ گلا کیا جارہا ہے، شکوہ کیا جارہا ہے، کس کا کیا جارہا ہے؟ وہ اگلی آیات سے سمجھ میں آئے گا کہ اس سے مراد حضور ﷺ ہیں، اور عَبَسَ کی ضمیر آپ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ "منہ بنالیا، تیوریاں چڑھالیں اور اِعراض کرلیا اس سبب سے کہ ان کے پاس ایک نابینا آگیا" نابینا کے لفظ سے یہ بات ظاہر کی جارہی ہے کہ وہ تو زیادہ شفقت کا مستحق تھا کہ اس کی طرف توجہ کی جاتی۔

متکبر مال دار کی وجہ سے مخلص مسکین کی دِل شکنی نہ کریں

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى: یہاں خطاب ہوگیا حضور ﷺ کو، جس سے عَبَسَ کا فاعل بھی متعین ہوگیا، "آپ کو کیا معلوم کہ وہ پاک صاف ہوجاتا، تزکیہ حاصل کرلیتا" یعنی کوئی نصیحت آپ سے سنتا، اس کے اُوپر عمل کرتا، اس کو زیادہ صفائی ستھرائی حاصل ہوتی، اس کو تزکیہ حاصل ہوجاتا، اَوْ يَذَّكَّرُ: یا وہ نصیحت حاصل کرتا، فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى: پھر وہ نصیحت اس کو نفع دیتی، یعنی آپ کو کیا معلوم کہ وہ آپ کی توجہ سے کس قسم کے فوائد حاصل کرتا، اگر آپ اس کے ساتھ بات کرتے تو اس کو تزکیۂ نفس حاصل ہوتا، یا نصیحت کی بات اس کے پلے پڑجاتی جو آئندہ زندگی میں اس کو فائدہ دیتی۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى: لیکن جو شخص لاپروا ہورہا ہے، استغناء کا معنی ہوتا ہے لاپروا ہوجانا، دوسرے سے مستغنی ہوجانا، "لیکن جو شخص مستغنی ہے لاپروا ہے" فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى: آپ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، تَصَدّٰى اصل میں تَصَدَّدَ تھا، دُوسری دال کو تخفیفاً الف کے ساتھ بدلا ہوا ہے، جس طرح دَسَّسَ کو دَسّٰى بنالیا، دَسّٰهَا (سورۂ شمس)، اسی طرح سے یہاں بھی تَصَدَّدَ میں دُوسری دال کو الف کے ساتھ بدل دیا تو تَصَدّٰى ہوگیا، "جو مستغنی ہے، لاپروا ہے، پھر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں"، وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى: آپ کے ذِمے نہیں ہے، آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ پاک نہ ہو، اگر وہ تزکیہ اختیار نہیں کرتا تو اس کا آپ پر کوئی اِلزام نہیں ہے، آپ تو مبلغ ہیں، اللہ کی بات پہنچانی چاہیے، باقی! اگر کوئی شخص تزکیہ حاصل

نہیں کرتا، صاف ستھرا نہیں ہوتا، بُرے عقائد نہیں چھوڑتا، تو اس کی ذمہ داری کوئی آپ پر ہے جو آپ ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ اور آپ ان مساکین سے اِعراض کرتے ہیں جس سے ان کی دل شکنی کا اندیشہ ہے، تو جو ایسے مخلص ہیں ان کی دل جوئی کرنی چاہیے اور ان کی طرف توجہ کرنی چاہیے، جو مستغنی ہیں انہیں کسی قسم کی پروا نہیں، بس ان کو دِین پہنچادو، تبلیغ تو کردو، باقی زیادہ پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، آتے ہیں تو ہزار دفعہ آئیں، بات سنتے ہیں تو بڑی خوشی کے ساتھ سنیں، اور اگر وہ اعراض کرتے ہیں، نہیں سنتے، یا مجلس کے اندر بیٹھنا نہیں چاہتے، تو ان کی وجہ سے کسی مسکین کی دل شکنی نہیں ہونی چاہیے، وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى: اگر تزکیہ حاصل نہ کرے، نصیحت قبول نہ کرے اس بات کی ذمہ داری آپ پر کوئی نہیں ہے، وَمَا عَلَيْكَ: نہیں ہے آپ پر کوئی الزام کہ وہ نصیحت حاصل نہ کرے، تزکیہ حاصل نہ کرے، یعنی اس کے حاصل نہ کرنے کی بنا پر آپ پر کوئی الزام نہیں ہے۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى: لیکن جو شخص آپ کے پاس بھاگا ہوا آتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ کوشش کر کے آتا ہے، وَهُوَ يَخْشٰى: اور وہ ڈرتا بھی ہے، اس کے دل میں اللہ کا خوف ہے، آخرت کا خوف ہے، فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى: آپ اس سے غفلت برتتے ہیں، تَلَهّٰى کا لفظ لھو سے لیا گیا ہے، لھو غفلت کو کہتے ہیں۔

عظمتِ قرآن کا ذِکر اور اس کا مقصد

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ: آپ اِس طرح سے ہرگز نہ کیجئے، اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ: یہ آیاتِ قرآن یہ تو یاددہانی ہے، اِنَّہَا اور فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ، وہاں "ہٗ" اور یہ "ھا" دونوں کا مرجع قرآنِ کریم ہے، لیکن آیات کے اعتبار سے ایک جگہ مؤنث کی ضمیر لوٹائی جارہی ہے، یا خبر کا اعتبار کرتے ہوئے، کہ تَذْكِرَةٌ آگے مصدر مؤنث آرہا ہے، اور دوسری جگہ قرآنِ کریم کی تاویل سے ضمیر مذکر کی لوٹائی جارہی ہے (مظہری)، جو کچھ آپ پر اُتارا جارہا ہے یہ تو ایک یاددہانی ہے، جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کرلے، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ: جو چاہے اسے یاد کرلے، اس سے نصیحت حاصل کرلے، یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ آگے اس کی شان بیان کی جارہی ہے کہ قرآنِ کریم اتنی عظیم الشان کلام ہے، اس کی ایسی شان ہے، اس کے متعلق آپ بھی اس کی شان کو بحال رکھتے ہوئے پورے استغناء کے ساتھ اس کو سُنائیے، اور اگر کوئی شخص سننا نہیں چاہتا تو اس کے پیچھے نہ پڑیئے، یہ کوئی سائل کی درخواست نہیں ہے کہ ہم نے منت سماجت کر کر کے ان کو سُنانی ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی کلام ہے اور بہت اُونچی کلام ہے، اگر کوئی اس کو سنے گا قبول کرے گا فائدہ اُٹھائے گا، اور اگر کوئی اِعراض کرے گا خود برباد ہوگا۔ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ: هُوَ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ، تو یہ خبر ہے مبتدا محذوف کی، یہ قرآنِ کریم بہت مکرم صحف میں ہے، صحف صحیفہ کی جمع، صحیفہ کہتے ہیں لکھی ہوئی کتاب کو، اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے، اور وہاں سے فرشتے اِس کو نقل کر کے لاتے ہیں جس طرح سے آگے ذِکر ہوگا، "بہت باعزت صحیفوں میں ہے"، مَّرْفُوْعَةٍ: رفیع القدر ہیں، اُونچے ہیں، قدر وقیمت کے اعتبار سے، مرتبے کے لحاظ سے بہت مرفوع ہیں، مُّطَهَّرَةٍ: یہ ساری صُحُف کی صفتیں ہیں، "ایسے صحیفوں میں کہ جو کہ مکرم ہیں، مرفوع ہیں، مطہر ہیں، صاف ستھرے ہیں"، بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ: سفرۃ سافر کی جمع ہے، سافر لکھنے والے کو کہتے ہیں، "ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو کرام بررہ ہیں" کرام کریم کی جمع اور بررۃ بارّ کی جمع، کریم: کریم النفس، اچھے لوگ، بارّ: وفادار، مطیع،

فرماں بردار۔ "ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو کہ بڑے کریم ہیں اور بڑے نیک ہیں وفادار ہیں" اس سے مراد فرشتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم خود بھی عظیم المرتبت، اور اس کو سنبھالنے والے فرشتے بھی اعلیٰ درجے کے، جو لوحِ محفوظ سے اس کو نقل کر کے لاتے ہیں، اور جس پر یہ اُتارا گیا وہ بھی عظیم المرتبت، اور پھر دُنیا کے اندر بھی جن سینوں کے اندر منتقل کیا گیا اور جو اس کو لکھ لکھ کے رکھتے ہیں وہ بھی سارے کے سارے اچھے، تو ایسی عالی شان کلام، اِس کو آپ بہت استغناء کے ساتھ دُوسروں کے سامنے پیش کیجئے، جو قبول کرتا ہے ٹھیک ہے، اور جو قبول نہیں کرتا تو اس میں کلام کی کوئی بے قدری نہیں ہے، قرآنِ کریم کی عزت یا عظمت ان لوگوں کے قبول کرنے سے نہیں، یہ تو خود اپنی جگہ بہت عظیم المرتبت ہے، اگر کوئی اس کو قبول کرے گا تو قبول کر کے خود وہ عظمت حاصل کرلے گا، اور اگر کوئی قبول نہیں کرتا تو اس سے قرآنِ کریم کی عظمت پہ کوئی حرف نہیں آتا۔ صُحُف صحیفہ کی جمع، مُكَرَّمَةٍ اس کی صفت ہے، کرامت والے صحیفے، بزرگی والے صحیفے، مَّرْفُوْعَةٍ: اونچے کیے ہوئے، عظیم المرتبت، مُّطَهَّرَةٍ: صاف ستھرے۔ "ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں"...... "ایسے" یہ صفت موصوف کا ترجمہ کر رہا ہوں...... سَفَرَةٍ: سافر کی جمع، سافر: لکھنے والا، كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ یہ دونوں سَفَرَةٍ کی صفتیں ہیں، کرام یہ کریم کی جمع ہوگئی، اور بررۃ یہ بار کی جمع ہے، "کریم النفس، نیک وفادار لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔"

اِثباتِ معاد کے لئے اِنسان کی اِبتدا کا ذِکر

قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَآ أَكْفَرَهٗ: مَآ أَكْفَرَهٗ یہ فعل تعجب ہے مَآ أَحْسَنَ زَيْدًا کی طرح، اس لئے اس کا ترجمہ ہوگا کتنا ہی ناشکرا ہے، "انسان برباد ہوجائے یہ کتنا ہی ناشکرا ہے" اللہ تعالیٰ نے اس کو کتنی عظیم نعمت دی قرآنِ کریم کی شکل میں، لیکن یہ اِس کو قبول نہیں کررہا، اِس کی قدر نہیں کررہا، یہ کتنا ناشکرا ہے، قُتِلَ الْإِنْسَانُ یہ بددُعا ہے، برباد ہوجائے انسان، یہاں لفظ انسان اگرچہ عام اختیار کیا ہوا ہے لیکن مراد اس سے وہی! کافر ہیں جو مَآ أَكْفَرَهٗ کا مصداق ہیں، "کتنا ہی یہ ناشکرا ہے۔" مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ: یہ استفہام ہے، اللہ نے اس کو کس چیز سے پیدا کیا؟ یعنی اس نے یہ نہیں کبھی سوچا کہ اس کی بنیاد کیا ہے، آج اس کو ذرا صحت حاصل ہوگئی، جوانی حاصل ہوگئی، مال اور اولاد حاصل ہوگیا، تو یہ اکڑتا ہے، گردن اٹھاتا ہے، اس کو اپنی اِبتدا یاد نہیں رہی؟ اور اگر یہ اپنی اِبتدا کو دیکھتا سوچتا، تو پھر اس کو بعث بعد الموت کا مسئلہ بھی سمجھ میں آجاتا، مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا اس کی سمجھ میں آجاتا اگر یہ اپنی اِبتدا کو سوچتا کہ میں پیدا کس طرح سے ہوا ہوں۔ "کس چیز سے اِس کو پیدا کیا ہے؟" خود ہی آگے جواب ہے مِنْ نُّطْفَةٍ: نطفہ کا لفظ کئی دفعہ آپ کے سامنے گزرا، ٹپکایا ہوا قطرہ، "ٹپکائے ہوئے قطرے سے" خَلَقَهٗ: اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا، فَقَدَّرَهٗ: پھر اس کا اندازہ کیا، ہر چیز اندازے کے ساتھ اس کو دی، ظاہری اعضا بھی اور باطنی صلاحیتیں بھی دیں۔

"راستہ آسان کرنے" کے دو مفہوم

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ: پھر راستے کو اس کے لئے آسان کیا۔ يَسَّرَهٗ: آسان کیا اُس راستے کو، السَّبِيْلَ: راستہ، "پھر راستہ، آسان کیا اللہ نے اُس راستے کو۔" اِس راستے سے کیا مراد ہے؟ دو باتیں مفسرین رحمہم اللہ نے لکھی ہیں، یا تو اس راستے کی آسانی سے

مراد ہے آسانی کے ساتھ پیدا ہو جانا، پیٹ کے اندر اس کو بنایا، اس کے اعضا دُرست کیے، اور پھر اس کو بطنِ مادر سے آسانی کے ساتھ نکال دیا، ورنہ آپ اندازہ کریں کہ بچہ جس کا اتنا جثہ بنا ہوا ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیسیر نہ ہو تو اس کے پیدا ہونے کی کیا صورت ہے، ماں بھی مرجائے اور بچہ بھی مرجائے دَم گھٹ کر، لیکن اس راستے کو اللہ تعالیٰ ہی آسان فرماتے ہیں، تو نہایت آسانی کے ساتھ بطنِ مادر سے یہ باہر آجاتا ہے، تو یہ بھی ایک قدرت کا ذکر ہے، عالَمِ غیب سے عالَمِ شہود میں آگیا۔ اور یا سبیل سے یہاں سبیلِ ہدایت مراد ہے، زندگی گزارنے کا راستہ اس کے لئے آسان کر دیا، پھر اس راستے کو عام بھی کر سکتے ہیں، جو راستہ بھی اختیار کرنا چاہے اللہ تعالیٰ نے اس کو صلاحیت دی ہے، قوت دی ہے، اس کے اُوپر آسانی سے چلتا چلا جاتا ہے، اگر یہ کوئی نیکی کا راستہ اختیار کرنا چاہے تو وہ بھی اس کے لئے آسان ہے اور دِن بہ دِن آسان ہوتا چلا جاتا ہے، اور اگر یہ بُرائی کا راستہ اختیار کرنا چاہے تو وہ بھی اس کے لئے آسان ہے، اور جتنا اس کی طرف دوڑتا چلا جائے گا رستہ دِن بہ دِن آسان ہوتا چلا جائے گا، نیکی کی طرف لگ جاؤ تو نیکی میں ترقی ہوگی، وہ راستہ آسان ہے، اور اگر بُرائی کی طرف لگ جاؤ تو وہ بھی آسان ہے، یہ اللہ کا ایک انعام ہے کہ اس کو اتنی صلاحیت دی کہ اپنے اختیار کے ساتھ جو راستہ اختیار کرنا چاہے آسانی سے کر سکتا ہے، ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ، پھر اس سے یہ زندگی گزارنے کا راستہ مراد ہو جائے گا۔ دونوں معنی ہی مفسرین ﷭ نے لکھے ہیں۔ یہاں جیسے حضرت شیخ الاسلام لکھتے ہیں ''یعنی ایمان و کُفر اور بھلے بُرے کی سمجھ دی، یا ماں کے پیٹ میں سے نکالا آسانی سے'' (تفسیر عثمانی)، یہ دونوں مفہوم ہو گئے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ: پھر اس کو موت دی، فَاَقْبَرَهٗ: پھر اس کو قبر میں ڈال دیا، جس طرح سے پہلے اس کو عالَمِ عدم سے لائے تھے، موجود نہیں تھا اور موجود کیا، بعد میں اللہ تعالیٰ اِس کو موت دیتے ہیں، موت دینے کے بعد اس کو پھر زمین کے پیٹ میں پہنچا دیتے ہیں، تو جیسے ماں کے پیٹ میں اس کو بنایا تھا اور بنانے کے بعد اس کو ظاہر کر کے اس دُنیا میں لے آئے تھے، اس طرح سے دوبارہ اس کو زمین کے بطن میں منتقل کر دیا، تو ایک وقت آئے گا کہ وہاں سے ایسے ہی نکال کر کھڑا کر لیا جائے گا آسانی کے ساتھ، جس طرح سے کہ بطنِ مادر سے نکال لیا گیا تھا، یہ کہیں گم نہیں ہو جاتا، فنا نہیں ہو جاتا، اسی زمین کا پیوند بنتا ہے جہاں سے پہلے اس کو بنایا گیا تھا، فَاَقْبَرَهٗ: پھر اس کو قبر میں ڈال دیا، چھپا لیا، ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ: یہ ہے مقصد کی بات، پھر جب چاہے گا اٹھا کے کھڑا کر دے گا، اس لئے بعث بعد الموت یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، اگر کوئی شخص اپنی پیدائش کی ترتیب کو دیکھے کہ پیدا کس طرح سے کیا گیا؟ بعد میں اللہ نے صلاحیتیں کیسی دیں؟ اِس دُنیا کے اندر اس کو کس طرح سے لائے؟ تو اس کے لئے یہ مسئلہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ مارنے کے بعد دوبارہ بھی آسانی کے ساتھ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ: پھر جب اللہ چاہے گا اُس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔

اِنسان کی ناشکری پر تنبیہ

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ...... كَلَّا: یہ ردع اس انسان پر، اس کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیے، ''ہرگز انسان کو ناشکری نہیں کرنی چاہیے'' پیچھے اس کی ناشکری کا ذکر آیا تھا تو كَلَّا کہہ کر اس کو ڈانٹا جا رہا ہے، لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ: لَمَّا اور لَمْ یہ دونوں لفظ آتے رہتے ہیں، لَمْ یہ صرف ماضی کی نفی کیا کرتا ہے، اور لَمَّا میں نفی کے اعتبار سے ماضی کا اِستغراق بھی ہوتا ہے اور مستقبل میں توقع بھی ہوتی

ہے، لَمَّا یَقْضِ کا معنی ہوگا ”ابھی تک اس انسان نے پورا نہیں کیا اس بات کو جس کا اس کو حکم دیا تھا“ مَآ اَمَرَهٗ: جو حکم اللہ نے اس کو دیا تھا ابھی تک انسان نے پورا نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ کے اِنعامات اور دعوتِ فکر

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ: اب پیدا ہونے کے بعد اِنسان کی بقاء کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں اور جو سامان مہیا کیا ہے اب اس کی طرف اشارہ ہے، ”چاہیے کہ غور کرے انسان، دیکھے انسان“ انسان کو غور کرنا چاہیے، غور سے دیکھنا چاہیے اپنے کھانے کی طرف، چاہیے کہ دیکھے انسان اپنے طعام کی طرف، یہ طعام جو یہ کھاتا ہے، جس کے ساتھ اس کی زندگی گزرتی ہے، ہم نے اس کی تیاری کس طرح سے کی۔ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا: صَبًّا یہ مفعول مطلق ہے بطور تعجب کے، کہ ”ہم نے برسایا پانی عجیب طریقے سے برسانا“ یعنی یہ بارش کے نظم کی طرف اشارہ کیا کیونکہ انسان کے رزق کی اِبتدا بارش کی طرف سے ہوتی ہے، آسمان سے پانی اُترتا ہے تو زمین کے اندر نباتات پیدا ہوتی ہے جہاں سے انسان کو روزی ملتی ہے، ”عجیب طریقے سے اُتارا“ اب یہ اتنا پانی اُترتا ہے لاکھوں، کروڑوں منوں کے حساب سے، لیکن اللہ تعالیٰ قطروں میں تقسیم کر کے آہستہ آہستہ اس کو جو اُتارتے ہیں تو زمین بھی برداشت کر لیتی ہے اور آپ کے مکانات بھی برداشت کر لیتے ہیں، اگر کہیں یہ آبشار کی شکل میں آجاتا اور دھار کی شکل میں برستا تو جس چھت کے اُوپر گرا کرتا وہ تہس نہس ہو جاتی، جس انسان پہ اُترتا اس کی ہڈی بوٹی ایک ہو جاتی، کیسے آسانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کو قطرہ قطرہ کر کے اُتارتے ہیں، اور کیسے تناسب کے ساتھ اُتارتے ہیں، اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا میں اس سارے نظم کی طرف اشارہ کر دیا جو پانی اُتارنے کا ہے، ”بے شک اُتارا ہم نے، گرایا ہم نے پانی گرانا عجیب طریقے سے۔“ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا: پھر ہم نے پھاڑا زمین کو پھاڑنا عجیب طریقے سے، یعنی یہ زمین کے اندر انگوری پیدا ہوتی ہے، پھر کس طرح سے زمین سے باہر آتی ہے، کتنا نازک وہ پتا ہوتا ہے، لیکن زمین کو چیرتا ہوا باہر آجاتا ہے، بظاہر دیکھنے میں زمین سخت ہوگی لیکن انگوری پھوٹتی ہے، اللہ تعالیٰ عجیب طریقے کے ساتھ زمین کو پھاڑتے ہوئے اس کو باہر لے آتے ہیں، یہ نباتات کے اُگنے کا سارا نظم آگیا۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا: پھر ہم نے اُگایا اس زمین کے اندر غلہ، غلہ جات کے اندر وہ ساری چیزیں آگئی جو آپ کے کھانے کے کام آتی ہیں، گندم، گیہوں، جَو، مکی وغیرہ، اور اسی طرح سے دالیں، یہ سب غلہ جات میں شامل ہیں، دانے کی شکل میں جو چیز پیدا ہوتی ہے اور اس کو آپ کھاتے ہیں، ”اُگایا ہم نے اس زمین کے اندر غلہ۔“ وَّعِنَبًا: اور انگور، وَّقَضْبًا: اور ترکاری، سبزی، قضب کہتے ہیں ایسی چیز کو کہ جس کو کاٹ کر انسان کھاتا ہے، غلہ جات کے علاوہ دوسری، یہ سبزیاں، چاہے وہ کچی کھائی جائیں اور چاہے ان کو پکا کے کھایا جائے وہ سب قضب کا مصداق ہیں، ”انگور اور ترکاریاں۔“ وَّزَيْتُوْنًا: اور زیتون، زیتون اُس علاقے میں بہت اہمیت رکھتا تھا، اس کا تیل وہ کھانے کے استعمال میں بھی لاتے تھے، روشنی کے استعمال میں بھی لاتے تھے، مالش بھی کرتے تھے، تیل کی ضرورت جتنی ہے وہ سب اُس علاقے میں زیتون سے پوری ہوتی تھی، قرآنِ کریم میں اس کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، ”اور پیدا کیا ہم نے زمین کے اندر زیتون۔“ وَّنَخْلًا: اور کھجوریں، وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا: اور گھنے باغات، یہ عام آگیا، حدائق حدیقہ کی جمع ہے، حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے

اردگرد باڑ کی ہوئی ہو، دیوار کی ہوئی ہو، اور غُلبًا یہ غَلْبَاءُ کی جمع ہے یا اغلب کی، '' گھنے باغات۔'' وَّفَاكِهَةً: اور میوہ جات، اس کو بھی عام ذکر کردیا، پہلے انگور اور کھجور کا ذکر صراحتاً آ گیا پھر عام میوہ جات اِس میں آ گئے۔ وَّاَبًّا: اب کہتے ہیں چارے کو، سبزے کو، سبز گھاس کو، ''ہم نے چارہ، سبزہ، سبز گھاس اگائی'' یہ آخر میں ذکر کردیا چونکہ آگے لفظ آ رہا ہے مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ: تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اُگایا جس میں تمہارا فائدہ بھی ہے، تمہارے برتنے کی چیز بھی ہے، اور تمہارے جانوروں کے فائدہ اُٹھانے کی چیز بھی ہے، لیکن جانوروں کے فائدہ اُٹھانے کی چیز اللہ نے زمین سے پیدا کردی، آگے جانور تمہارے فائدے کی چیز ہیں، انسان کی بہت ساری ضروریات نباتات سے پوری ہوتی ہیں، آپ اپنی خوراک کے نظم کے طرف دیکھیں گے تو بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو نباتات سے پوری ہوتی ہیں، اور بہت ساری غذائیں آپ کی ایسی ہیں جو حیوانات سے پوری ہوتی ہیں، دُودھ، مکھن، دہی، لسی، اور گوشت، اور ایسے ہی چمڑا، ہڈی، کتنی چیزیں ہیں جو حیوانات سے حاصل ہوتی ہیں اور انسان ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے، مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ: بظاہر تو یہ اِنعام حیوانات کے لئے ذکر کیا کہ تمہارے فائدے کے لئے بھی چیزیں پیدا کیں اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے بھی کیں، لیکن وہ جانور آگے تمہارے فائدے کے لئے ہیں اور ان سے تمہیں بے شمار منافع حاصل ہوتے ہیں۔

اِنکار کی زیادہ تر وجہ عصبیت ہوتی ہے

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ: صاخۃ اصل میں کہتے ہیں کان پھاڑنے والی کو، بہرہ کردینے والی کو، یعنی وہ اتنی کڑک کی آواز آئے گی اور اتنی کرخت آواز ہوگی کہ کان پھٹے جائیں گے اور بہرے ہوجائیں گے، اس سے نفخۂ اُولیٰ مراد ہے، جس طرح سے پیچھے الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى کے ساتھ ذکر کیا تھا، غالب آنے والی مصیبت، آفت، جو سب کے اُوپر غالب آ جائے گی، اور یہاں اس کو صاخۃ کے ساتھ تعبیر کیا ہے، اور اِذَا کا جواب محذوف ہے، ''جس وقت صاخۃ آ جائے گی اس وقت حالات مختلف ہوجائیں گے (مظہری)۔ اب دُنیا کے اندر تو زیادہ تر انکار کی وجہ اُن کی عصبیت تھی، اپنے خاندان پہ ناز تھا، تعلقات پہ ناز تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہماری برادریاں ہیں، برادریوں کی وجہ سے دُنیا میں جس طرح سے ہم باعزت ہیں تو آخرت میں بھی یہی برادری ہمارے کام آئے گی، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، یعنی وہ سمجھتے تھے کہ اوّل تو آخرت ہوگی نہیں، اگر ہوگی تو جیسے ہمارے خاندان یہاں معزز ہیں وہاں بھی اسی طرح سے ہوجائیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کے حالات مختلف ہیں، وہاں نفسانفسی ہوگی، ہر شخص اپنی ذات کی فکر کرنے والا ہوگا، کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اس لیے ابھی فکر کرلو، یہ خیال کرنا کہ فلاں کام آ جائے گا، فلاں کام آ جائے گا، یہ محض جنون ہے۔ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ: پس جس وقت آ جائے گی کانوں کو بہرہ کرنے والی، مراد اس سے نفخۂ اُولیٰ ہے، جواب اِس کا محذوف ہے کہ پھر حالات مختلف ہوجائیں گے۔

قیامت کے دِن ساری عصبیت ختم ہوجائے گی

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ: جس دِن کہ بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے، اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی

سے، اور اپنے بیٹوں سے، بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ اِن سے لاتعلق ہو جائے گا، اور ایک دوسرے کے چونکہ یہی رشتہ دار ہیں جو گناہوں میں مبتلا کرتے ہیں، بھائی بھائی کو اُبھار کے نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے، اور اسی طرح سے ماں اور باپ انسان کو دین سے روکتے ہیں اور بُرائی کی ترغیب دیتے ہیں، بے دینی کی طرف لے جاتے ہیں، دُنیا کی محبت میں مبتلا کر دیتے ہیں، بیوی اور بیٹے یہ بھی اسی طرح سے۔ اور اُس دِن چونکہ سب بات سامنے آجائے گی، اور یہ سمجھیں گے کہ فلاں کی وجہ سے میں اللہ کا نافرمان ہوا، تو اندیشہ ہوگا کہ یہ ہمیں شکایت کرکے زیادہ نہ پھنسا دیں، پکڑوا نہ دیں، اس لئے ہر کوئی دوسرے سے بھاگے گا، کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ تو یہ خاندان، یہ جماعت، یہ برادری جس کے اُوپر انسان ناز کرتا ہے، اور اس ناز کی بنا پر اکڑتا ہے، عصبیت میں مبتلا ہے، یہ سب عصبیتیں اس وقت زائل ہو جائیں گی، ”جس دِن کہ بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے، اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی سے، اور اپنی بیٹوں سے۔“ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ: اَغْنٰی: غنی کر دینا، بے پروا کر دینا، لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ: اِن میں سے ہر انسان کے لئے اُس دِن حال ہوگا جو اُس کو دوسروں سے بے پروا کر دے گا، ہر کوئی شخص اپنے حال میں اس طرح سے مبتلا ہوگا کہ دُوسرے کی طرف دھیان ہی نہیں کرے گا۔

روشن چہرے اور سیاہ چہرے

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ: پھر یہی دو گروہ بن جائیں گے جن کا ذِکر پچھلی سورت کے آخر میں بھی آیا تھا، کچھ چہرے اس دِن روشن ہوں گے، ضَاحِكَةٌ: ہنسنے والے ہوں گے، مُّسْتَبْشِرَةٌ: بشاشت میں ہوں گے، خوش ہونے والے ہوں گے، ”کچھ چہرے اُس دِن روشن ہوں گے“ کیونکہ جب دل کے اندر خوشی ہوتی ہے اور اچھی اچھی بشارتیں سنی ہوئی ہوتی ہیں تو پھر انسان کا چہرہ بھی چمک اُٹھتا ہے، جیسے کہ غم زدہ انسان کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، بے رونق ہو جاتا ہے، چہرے کی ہوائیاں اُڑ جاتی ہے۔ ”کچھ چہرے اُس دِن روشن ہوں گے، ہنسنے والے ہوں گے اور خوشیاں منانے والے ہوں گے۔“ ”اور کچھ چہرے اس دِن ایسے ہوں گے“ کہ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ: اُن کے اُوپر گرد و غبار ہوگا، تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ: اور ان کو سیاہی نے ڈھانپا ہوا ہوگا، منہ سیاہ ہوئے ہوں گے، یعنی دل میں غم ہوگا، صدمہ ہوگا، ہولناک مستقبل سامنے ہوگا، تو ایسی صورت میں چہرے بھی اُترے ہوئے ہوں گے اور سیاہ ہو گئے ہوں گے، قترۃ کہتے ہیں سیاہی کو، اور غبرۃ یہ گرد و غبار ہو گیا۔ تو یہ لوگ جن کے چہروں کے اُوپر گرد و غبار ہوگا، سیاہی طاری ہوگی اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ: یہی لوگ کافر فاجر ہیں، تو معلوم ہو گیا کہ کُفر اور فجور، اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی، یہ چیز ہے جو آخرت میں اس قسم کی بربادی سامنے لائے گی، اس انجام کو سامنے رکھتے ہوئے انسان کو سوچنا چاہیے کہ یہ کس گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ تو ہمیشہ اللہ تبارک وتعالیٰ دونوں گروہوں کا ذِکر فرما دیتے ہیں، بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ، تاکہ دونوں سامنے رہیں تو اِنسان تجویز کر سکے کہ کس گروہ میں شامل ہونا بہتر ہے، اگر کُفر فسق فجور والی زندگی اختیار کرو گے تو انجام یہی سامنے آئے گا، اور پہلا انجام انہی لوگوں کا ہے جو کہ کافر فاجر نہیں ہیں، متقی اور پرہیزگار ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ايَاتُهَا ۲۹ ۸۱ سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ ۷ رُكُوْعُهَا ۱

سورۂ تکویر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۹ آیتیں ہیں اور ایک رُکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَإِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۝ اور جب ستارے بے نُور ہوجائیں گے۝۲ اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے۝

وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَإِذَا الْبِحَارُ

اور جب دس مہینے کی گابھن اُونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی۝ اور جب وحشی جانور اکٹھے کردیے جائیں گے۝۵ اور جب سمندر

سُجِّرَتْ ۝۶ وَإِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷ وَإِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸ بِأَيِّ ذَنْبٍۭ

بھڑکا دیے جائیں گے۝۶ اور جب نفسوں کو جوڑ دیا جائے گا۝ اور جب زندہ درگور کی ہوئی بچّی سے پوچھا جائے گا۝۸ کہ کس گناہ کی بنا پر

قُتِلَتْ ۝۹ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰ وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝۱۱ وَإِذَا الْجَحِيْمُ

وہ قتل کی گئی؟۝۹ اور جب صحیفے پھیلا دیے جائیں گے۝۱۰ اور جب آسمان کھول دیا جائے گا۝۱۱ اور جس وقت جہنّم کو

سُعِّرَتْ ۝۱۲ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝۱۳ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ ۝۱۴ فَلَآ أُقْسِمُ

دہکایا جائے گا۝ اور جب جنّت قریب کردی جائے گی۝ تو ہر نفس کو پتا چل جائے گا جو کہ اس نے کیا حاضر کیا ہے۝ میں قسم کھاتا ہوں

بِالْخُنَّسِ ۝۱۵ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝۱۶ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝۱۷ وَالصُّبْحِ إِذَا

ان ستاروں کی جو پیچھے ہٹنے والے ہیں۝ چلنے والے ہیں، چھپنے والے ہیں۝ اور رات کی جس وقت کہ وہ پھیل جائے۝ اور صبح کی جس وقت

تَنَفَّسَ ۝۱۸ إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝۱۹ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ

وہ ظاہر ہونے لگے۝ بے شک یہ ایک باعزّت بھیجے ہوئے کا قول ہے۝ جو قوت والا ہے، عرش والے کے نزدیک

مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ ۝۲۱ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْأُفُقِ

ذی مرتبہ ہے۝ وہاں اس کا کہنا مانا جاتا ہے، امانت دار ہے۝ اور تمہارا ساتھی بھی دیوانہ نہیں۝ اور اس (ساتھی) نے اُس کو واضح کنارے

الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ﴿۲۵﴾

پر دیکھا بھی ہے ﴿۲۳﴾ اور وہ (تمہارا ساتھی) غیب کے اُوپر بخیل بھی نہیں ﴿۲۴﴾ اور یہ کسی شیطان مرْدود کا قول بھی نہیں ہے ﴿۲۵﴾

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ

پس تم کہاں جارہے ہو ﴿۲۶﴾ نہیں ہے یہ قرآن مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے ﴿۲۷﴾ (خاص طور پر) اس شخص کے لئے جو تم میں سے

یَّسْتَقِیْمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۹﴾

سیدھی راہ پر چلنا چاہے ﴿۲۸﴾ اور نہیں چاہتے تم مگر اللہ کے چاہنے کے ساتھ جو ربّ العالمین ہے ﴿۲۹﴾

سورت کا مضمون اور اس کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ تکویر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۹ آیتیں ہیں۔ یہ تو پہلے ہی ذکر کر دیا تھا کہ قرآنِ کریم کے آخر تک اب جتنی سورتیں آئیں گی سب کا رُکوع ایک ہی ہوگا۔ اور اس سورت میں بھی قیامت کا ذکر کیا گیا ہے اور جزا اور سزا کی تفصیل کی گئی ہے۔ بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا جا چکا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِبتدائی سورتوں میں زیادہ تر زور اِثباتِ آخرت پر دیا ہے، کیونکہ آخرت کا عقیدہ ایسا عقیدہ ہے جس کے صحیح ہوجانے کے بعد باقی حقائق کا سمجھنا سمجھانا آسان ہوجاتا ہے، اور اِنسان کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کو عبث پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ یہ ایک مکلّف ہے، اور خیر وشر کے دونوں راستے اس کے سامنے واضح ہیں، اور جو عمل بھی یہ کرے گا اس کی جزا یا سزا اس کے سامنے آئے گی، یہ مقام اور مرتبہ انسان کا انسان کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور اسی پر ہی بنیاد اُٹھتی ہے اگلی زندگی میں انسان کے افکار کی اور انسان کے کردار کی ...... حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص قیامت کے دِن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہو، وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا پورا پورا نقشہ مکمل اس کے سامنے آجائے، تو اسے چاہیے کہ سورۂ تکویر، سورۂ انفطار اور اس قسم کی سورتوں کا مطالعہ کرے۔[1] صحیح طور پر ان آیات کے مفہوم کو سمجھ لیا جائے تو قیامت کا نقشہ بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے پیش آنے والے واقعات کو مختصر الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔

تفسیر

قیامت کے دِن سورج کا حال

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ: كُوِّرَتْ یہ تکویر سے لیا گیا ہے، تکویر کا معنی ہوتا ہے لپیٹنا۔ كَوَّرَ الْعِمَامَةَ عَلٰى رَاْسِهٖ: پگڑی اپنے سر پر لپیٹ لی، کَور عمامہ پگڑی کے بَل کو کہتے ہیں، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کا معنی ہوا ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا'' لپیٹنے کا مطلب یہ

(۱) ترمذی ۱۷۱/۲، تفسیر سورۃ التکویر۔ مشکوٰۃ ۴۸۴/۲ باب الحشر، فصل ثانی۔ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰى یَوْمِ الْقِیَامَةِ كَاَنَّهٗ رَاْیُ عَیْنٍ فَلْیَقْرَاْ ... الخ

ہے کہ اس کی پھیلی ہوئی شعاعیں اکٹھی کردی جائیں گی، یا خود اسے ہی لپیٹ دیا جائے گا حتیٰ کہ اس کا نُور بالکل ختم ہو جائے گا۔آپ جانتے ہیں کہ دُنیا کے اندر اگر روشنی ہے تو اس روشنی کا منبع اللہ تعالیٰ نے سورج کو بنایا ہے، اور یہ جدید قدیم تحقیقات سب اس بات پر متفق ہیں کہ ستاروں میں اور چاند میں روشنی بھی سورج کی وساطت سے آتی ہے، توجس وقت یہ منبع نُور ہی ختم کردیا جائے گا اور اس کو لپیٹ دیا جائے گا، تو پھر جو تاریکی کا عالم ہوگا آپ اس کا تصور کرسکتے ہیں، سورج ذرا اوٹ میں چلا جاتا ہے رات کو تو اس وقت کس طرح سے اندھیرا چھا جاتا ہے باوجود اس بات کے کہ لاکھوں کروڑوں ستارے آسمان کے اُوپر موجود ہوتے ہیں، اور جس وقت یہ سورج بالکل ہی لپیٹ دیا جائے اور روشنی کا منبع ہی ختم کردیا جائے تو پھر اندھیرا کس طرح سے ہوگا اور کتنا شدید اندھیرا ہوگا اس کا آپ تصور کرلیں۔''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔''

ستاروں اور پہاڑوں کا حال

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ: کدورت یہ لفظ آپ سنتے رہتے ہیں، اِنْکِدار: میلا ہونا، بے نُور ہوجانا،''اور جب ستارے بے نُور ہوجائیں گے'' جب سورج میں روشنی نہیں رہے گی تو ستاروں نے تو بے نُور ہو ہی جانا ہے۔وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ: اور جس وقت پہاڑ چلادیے جائیں گے، سُیِّرَتْ تسییر، اس کا مادّہ سیر ہے، سَارَ یَسِیْرُ: چلنا۔سَیَّرَ تَسْیِیْر: چلانا۔''پہاڑ چلادیے جائیں گے''یعنی اس وقت تو آپ کو یہ اتنے بوجھل اور اتنے مضبوط معلوم آتے ہیں کہ یہ ہلائے نہیں ہل سکتے، اور انسان بظاہر تصور نہیں کرسکتا کہ یہ کسی وقت اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس وقت قیامت میں نفخۂ اُولیٰ ہوگا تو اس وقت یہ اپنی جگہ سے ہل پڑیں گے، اور فضا کے اندر یوں اُڑتے پھریں گے جس طرح سے کہ رُوئی کے گالے اُڑا کرتے ہیں،''جس وقت کہ پہاڑ چلادیے جائیں گے'' اپنی جگہ سے ہلادیے جائیں گے، پھر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اور فضا کے اندر اُڑتے پھریں گے، قرآنِ کریم میں ایک جگہ آپ کے سامنے آیا تھا تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (سورۂ نمل:۸۸) کہ بظاہر دیکھنے میں تمہیں یہ جمے ہوئے نظر آتے ہیں جامد ہیں، لیکن اس وقت یہ ایسے گزریں گے جس طرح سے کہ بادل ہوا میں اُڑے پھرتے ہیں۔

گابھن اُونٹنیوں کا حال

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ: عِشار عُشَرَاء کی جمع ہے، عشراء کہتے ہیں دس مہینے کی گابھن اُونٹنی کو، ایسی اُونٹنی جس کے حمل پر دس مہینے گزر چکے ہوں، یہ قریب الولادۃ ہوتی ہے، بچہ دینے کا وقت قریب آیا ہوا ہوتا ہے۔قرآنِ کریم کے اوّلین مخاطب چونکہ عرب ہیں اور عرب کے نزدیک محبوب ترین مال ایسی اُونٹنی ہے جس کا بچہ دینے کا وقت قریب ہو، کہ اس سے دُودھ کی توقع بھی ہوتی ہے اور نسل کے بڑھنے کی توقع بھی ہوتی ہے، تو ان کے نزدیک یہ عزیز ترین مال ہے، اور مالک ایسی اُونٹنی کا بہت خیال کرتا ہے، تو وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کا مطلب یہ ہوگیا کہ دس مہینے کی گابھن اُونٹنیاں بےکار چھوڑ دی جائیں گی، ان کا کوئی خیال نہیں کرے گا، اُونٹنیوں کا ذکر اس کے نفیس مال ہونے کے اعتبار سے ہوا، تو اس بات کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ انسان کا قیمتی سے قیمتی مال وہ بھی اُس وقت بیکار ہوجائے گا، کوئی اس کا خیال نہیں کرے گا، سارے کے سارے ایسے ہی بکھرے پڑے ہوں گے، اور جس طرح

سے انسان دُنیا کے اندر اِن مالوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے اُس وقت ایسی افراتفری ہوگی اور ایسی نفسی نفسی ہوگی کہ عمدہ قسم کے مال اور محبوب ترین مال کی طرف بھی توجہ نہیں رہے گی، جیسے سورۂ حج کی اِبتدا کے اندر ذِکر کیا گیا تھا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ: دُودھ پلانے والی عورت اپنے بچے سے غافل ہوجائے گی، بچے کا دھیان نہیں رہے گا، تو اولاد یہ بھی ایک محبوب چیز ہے، اور مال یہ بھی ایک محبوب چیز ہے، تو جس وقت یہ دِن آجائے گا جس کی نشان دہی کی جارہی ہے تو اس وقت نہ اولاد کی طرف توجہ رہے گی نہ مال کی طرف توجہ رہے گی۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ: جب دس مہینے کی گابھن اُونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی۔

وحشی جانوروں کا حال

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ: وحوش وَحش کی جمع ہے، وحش کہتے ہیں جنگلی وحشی جانور کو، جو اِنسان سے بدکتا ہے، چاہے وہ درندہ ہو، چاہے وہ چرندہ ہو، ہرن وغیرہ اس قسم کے جانور یہ بھی ''وحشی جانور'' کہلاتے ہیں، چونکہ انسان سے مانوس نہیں، انسان کو دیکھ کے بدکتے ہیں، اور اسی طرح سے چیرنے پھاڑنے والے جانور جو جنگلوں میں موجود ہیں وہ بھی سب ''وحشی'' کہلاتے ہیں، حُشِرَتْ کا معنی ''جمع کردیے جائیں گے''، مطلب یہ ہوگیا کہ یہ وحشی جانور جو اِنسان کو دیکھ کے بدکتے ہیں اُس وقت ایسی افراتفری ہوگی، اور اس قسم کے ہولناک واقعات پیش آئیں گے کہ یہ سارے کے سارے اکٹھے کردیے جائیں گے، انسانوں کی آبادیوں میں آگھسیں گے، یا ہر قسم کے جانور خود ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں گے، جن میں وہ بھی ہوں گے جو درندے ہیں، کھانے والے، چیرنے پھاڑنے والے، اور وہ بھی ہیں جو ان کی غذا بننے والے ہیں، شیر اور ہرن ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں، اور شیر کو یہ خبر نہ رہے کہ میرے پاس کون سا جانور کھڑا ہے؟ ہرن کو یہ توجہ نہ رہے کہ میرا دُشمن میرے پہلو میں کھڑا ہے، اس طرح سے ایک ایسا عالم ہوجائے گا کہ کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں کرے گا، پتا بھی نہیں چلے گا کہ میرے پاس کون ہے، کون نہیں ہے؟ ہوش مارے جائیں گے سب کے، ہوش اُڑے ہوئے ہوں گے، جیسے اب بھی کہتے ہیں کہ جنگل میں جب آگ لگ جاتی ہے یا کسی جگہ کوئی زور کا سیلاب آجاتا ہے تو یہ جانور وغیرہ سب ایک طرف اکٹھے ہوجاتے ہیں، تو اس وقت بھی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ کسی کو خبر نہیں رہتی، اس ہیبت اور خوف میں دہشت اس قسم کی طاری ہوتی ہے کہ ایک دُوسرے کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی کہ کون ہے، کون نہیں ہے؟ تو وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کا معنی ہوگیا ''جب وحشی جانور اکٹھے کردیے جائیں گے''، یا تو انسانوں کے ساتھ اکٹھے کردیے جائیں گے کہ دوڑ دوڑ کے وہ انسانی آبادیوں کی طرف آئیں گے گھبرائے ہوئے، حالانکہ وہ ''وحشی'' ہیں ان کو انسان سے بدکنا چاہیے، یا مطلب یہ ہے کہ ان سب کو آپس میں جمع کردیا جائے گا۔

سمندروں کا حال

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ: سُجِّرَتْ یہ لفظ تسجیر سے لیا گیا ہے، تسجیر کہتے ہیں اصل میں تندور میں ایندھن ڈال کے اس کے بھڑکانے کو، تو وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کا معنی ہوگا جب دریا اور سمندر بھڑکا دیے جائیں گے، دریاؤں میں جب طغیانی آجاتی ہے اور جس وقت یہ اُبل پڑتے ہیں تو اس کو بھی تسجیر سے تعبیر کردیا جاتا ہے۔ گرمی کی شدت ہوگی اور یہ آگ کی شکل اختیار کرجائیں گے،

اپنی جگہ سے اُبل پڑیں گے، جس سے کھارے میٹھے سب ایک ہو جائیں گے، جیسے اگلی سورت کے اندر فُجِّرَتْ کا لفظ آئے گا جس کا معنی ہے کہ اُن کو جاری کر دیا جائے گا، اپنے کناروں سے نکل پڑیں گے، ارد گرد بہہ پڑیں گے، سب آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے، ''جس وقت سمندروں کو بھڑکا دیا جائے گا'' بھڑکا دیا جائے گا یعنی یہ اُبلنے لگ جائیں گے اور اپنی حدود سے باہر نکل پڑیں گے، حتیٰ کہ پھر آگ بن کر یہ ختم ہو جائیں گے، گیس بن کر اُڑ جائیں گے۔

نفوس کے جوڑنے کے دو مفہوم

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ: نفوس نفس کی جمع ہے، زُوِّجَتْ تزویج: جوڑنا، اور جب نفسوں کو جوڑ دیا جائے گا، نفسوں کو جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے مختلف گروہ بنا دیے جائیں گے، ہر قسم کے نفوس ایک ایک گروہ میں بٹتے چلے جائیں گے، جیسے کہ سورۂ واقعہ کے اندر بنیادی طور پر تین گروہوں کا ذکر آیا تھا کُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً: تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے، السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ایک گروہ ہوگا، اور اصحاب الیمین دُوسرا گروہ ہوگا، اصحاب الشمال تیسرا ہوگا، لیکن ان کے اندر پھر مختلف جوڑے بنا دیے جائیں گے، ایک ایک عمل کے اعتبار سے، ایک ایک مشرب کے لوگ، ایک ایک مسلک کے لوگ، ایک ایک کردار کے لوگ، یہ سب اکٹھے کر دیے جائیں گے، ان کے جوڑے کر دیے جائیں گے، ان کو آپس میں جوڑ دیا جائے گا۔ اور اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا یہ معنی بھی ذکر کیا گیا ہے کہ روحوں کو جسدوں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا، روحیں دوبارہ بدنوں کے اندر ڈال دی جائیں گی۔

زندہ درگور بچی سے سوال ہوگا

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ: موؤدۃ کہتے ہیں اس لڑکی کو جس کو زندہ درگور کر دیا گیا ہو، زندہ دفن کر دیا گیا ہو، جس طرح سے مشرکین میں یہ عادت تھی کہ اگر ان کے گھر لڑکی پیدا ہو جاتی تو لڑکی کے پیدا ہو جانے کے بعد والدین اس کو زندہ گڑھے میں گاڑ دیتے تھے اور ایسے ہی اس کو دفن کر دیتے۔ یہ ظالمانہ کارروائی وہ کیوں کرتے تھے؟ اس کے دو منشے تھے، بسا اوقات تو وہ معاشی تنگی کی بنا پر ایسا کرتے تھے کہ رزق کم ہے، یہ بچے جو ہوتے جا رہے ہیں تو کھائیں گے کہاں سے؟ یہ ان کو فکر ہوتا تھا کہ ویسے بھی ہمارے پاس رزق کم ہے، اور ان کے بڑھ جانے کے بعد ہم تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے، یا ہمارے پاس ہی کھانے کے لئے نہیں ہے تو ہم ان کو کہاں سے کھلائیں گے؟ تو فقر و فاقہ کا موجود ہونا یا فقر و فاقہ کا اندیشہ یہ بھی قتل اولاد کا باعث تھا، لیکن زیادہ تر اس کی وجہ جو تھی وہ تھی بے جا غیرت، غیرت کے اندر غلو، وہ یہ سوچتے تھے کہ ہمارے گھر لڑکی پیدا ہو گئی، تو آخر یہ جوان ہو گی تو کسی کو دینی پڑے گی، اور کوئی ہمارا داماد بنے گا، ہماری لڑکی کو کوئی دوسرا لے جائے گا، تو یہ بے جا غیرت ان کے اندر جو تھی اس کی بنا پر بھی لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو چپ کر کے اسی طرح سے زندہ ہی زمین میں گاڑ دیتے، یہ ظالمانہ کارروائی ان کے ہاں چلتی تھی تو اس لڑکی کو موءودۃ کہتے ہیں۔ ''جب موءودۃ سے پوچھا جائے گا، زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا'' بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ: کہ کس گناہ کی بنا پر وہ قتل کی گئی؟ اس کو کس گناہ کی بنا پر قتل کیا گیا؟ یہ سوال کیا جائے گا۔ اب یہاں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ موءودۃ کو ذکر فرمایا، اصل وجہ یہ ہے کہ ہر مظلوم کے متعلق پوچھا جائے گا کہ اس کے اُوپر ظلم کیوں ہوا؟ مظلوم سے پوچھا جائے گا تیرے اُوپر

دُوسرے نے زیادتی کیوں کی؟ وہ دعویٰ دائر کرے گا، پھر ظالم کو پکڑا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی۔ مظلوم تو بہت قسم کے ہوتے ہیں، لیکن یہ بچی جس قسم کی مظلوم ہے ایسے مظلوم کی مثال نہیں ملتی، ایک تو اس کے اُوپر ظلم کرنے والے اس کے والدین ہیں، جن سے شفقت کی، محبت کی، ہمدردی کی توقع ہوتی ہے، اور پھر اس کے اُوپر ظلم ایسے طور پر ہوا کہ اس کے متعلق آواز اُٹھانے والا کوئی نہیں، بسا اوقات کسی کو پتا بھی نہیں ہوتا کہ پیدا ہوئی اور دفن کردی گئی، کوئی اس کا دیکھنے والا، کوئی اس کے اُوپر شہادت دینے والا نہیں ہوتا، اور پھر جب باپ یہ کارروائی کرنے والا ہو تو باپ کے خلاف کسی دُوسرے کو آواز اُٹھانے کا دُنیا میں بظاہر کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تھا، تو ایسا مظلوم جس کے ظلم پر شہادت دینے والا بھی کوئی نہ ہو، اور ایسا مظلوم کہ جس کے اُوپر ظلم بھی وہ کریں کہ جن کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں، اور کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے اُوپر یہ ظلم اور زیادتی ہوئی، اس قسم کے مظلوم بھی سامنے لائے جائیں گے اور ان کو بھی اپنے ظالم کے خلاف آواز اُٹھانے کا حق دیا جائے گا، اور جس وقت وہ بتائیں گے کہ ہمیں بلاوجہ قتل کیا گیا یا بلاوجہ زندہ دفن کیا گیا تو پھر وہ ظالم پکڑے جائیں گے، جب ایسا مخفی ظلم بھی اللہ تعالیٰ ظاہر کردیں گے تو باقیوں کے متعلق بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ: صحف جمع صحیفہ کی، اور جب صحیفے پھیلا دیے جائیں گے، اور یہاں صحف سے نامۂ اَعمال مراد ہیں، ہر کسی کے سامنے اس کا نامۂ اَعمال آجائے گا۔

آسمان کا حال

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ: کَشط اصل کے اعتبار سے کہتے ہیں کھال اُتارنے کو، کسی چیز پر جو پردہ حائل ہو یا ہوا ہو اس کو کھینچ لیا جائے اور اصل چیز کو نمایاں کردیا جائے، جیسے جانور کی کھال اُتار لی جاتی ہے تو اس کا باطن نمایاں ہوجاتا ہے، آسمان کی کھال اُتار لی جائے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا، اور اس کے اُوپر جو چیزیں چھپی ہوئی ہیں وہ ساری کی ساری نمایاں ہوجائیں گی۔ ''جبکہ آسمان کو کھول دیا جائے'' یہ اس کا مفہوم ہوگا۔

جنّت وجہنّم کا حال

وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ: جحیم یہ جہنّم کا نام ہے، اور سُعِّرَتْ تَسْعِیْر: آگ بھڑکانا، جھونکنا، ''اور جس وقت کہ جہنّم کو دہکایا جائے گا، بھڑکایا جائے گا'' یعنی اس میں مزید جوش پیدا کردیا جائے گا، وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ: اور جب جنّت قریب کردی جائے گی، متقین کے قریب کردی جائے گی، جیسا کہ سورۂ قٓ کے اندر اس کی تفصیل آئی تھی، جنّت قریب کردی جائے گی اور متقی اس کو دیکھیں گے، دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے۔

دُنیا میں جو کچھ کیا تھا سامنے آجائے گا

تو یہ ساری کی ساری چیزیں ذکر کرنے کے بعد جواب آگیا عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ: جب یہ واقعات پیش آئیں گے ہر

نفس کو پتا چل جائے گا کہ اس نے کیا حاضر کیا ہے، دُنیا میں رہتے ہوئے اس نے آخرت کے لئے کیا حاضر کیا ہے ہر نفس کو پتا چل جائے گا جس وقت یہ واقعات پیش آئیں گے...... اس میں پہلے واقعات وہ ہیں جو نفخۂ اُولیٰ میں پیش آئیں گے، اور وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ سے آگے کے واقعات وہ ہیں جو نفخۂ ثانیہ کے بعد پیش آئیں گے، بہرحال یہ سارے کے سارے واقعات قیامت کے دن کے ہیں، کیونکہ قیامت کا دِن نفخۂ اُولیٰ سے شروع ہوگا اور آگے پھر ممتد ہوگا، سارے واقعات اسی دِن کی طرف منسوب ہیں..... تو یہ واقعات پیش آجانے کے بعد ہر نفس کے سامنے وہ چیز آجائے گی جو اس نے دُنیا کے اندر رہتے ہوئے آگے بھیجی، اگلی سورت کے اندر بھی بعینہٖ اسی قسم کا مضمون آرہا ہے، وہاں لفظ آئے گا عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ: جو آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا سب انسان کے سامنے آجائے گا، کیا کام اس نے کیے ہیں، اور کیا کرنے چاہئیں تھے جو نہیں کیے، یا کیا کام اس نے کیے ہیں اور کیا پیچھے اثرات چھوڑے ہیں اچھے بُرے، سب چیزیں انسان کے سامنے آجائیں گی جب یہ واقعات پیش آئیں گے۔

کسی بھی روایت کے پرکھنے کا فطری اُصول

اب قیامت کے دِن کی تفصیل کرنے والا قرآنِ کریم ہے، اور جو شخص اس کی حقانیت کا قائل ہوجائے اور یہ سمجھ جائے کہ یہ اللہ کی کلام ہے اس کے لئے اِن سب حقائق کا تسلیم کرنا آسان ہوجائے گا، اگلی آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی حقانیت کو پیش فرمایا ہے، پہلے تو قسمیں کھائی ہیں ستاروں کی، اور اس کے بعد جبریل علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ دُنیا کے اندر دستور ہے روایت کا، ایک شخص کسی دوسرے کی طرف سے بات کو نقل کرتا ہے، جب وہ بات کو نقل کرتا ہے تو جس کے سامنے نقل کرتا ہے وہ ماننے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ یہ راوی ثقہ ہے یا نہیں؟ یہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں؟ یہ سچا ہے یا جھوٹا؟ دھوکا باز تو نہیں ہے؟ خائن تو نہیں؟ کہ مجھے دھوکا دینے کے لئے بات کر رہا ہو یا اس بات میں خیانت کر رہا ہو، تو یہ ہر شخص سوچا کرتا ہے اور یہ ایک فطری اصول ہے۔ اور پھر یہ بھی ساتھ سوچا کرتا ہے کہ جس کی طرف سے یہ بات نقل کر رہا ہے کیا اِس کی اُس کے ساتھ ملاقات بھی ہوئی؟ یہ آپس میں ایک دوسرے کو جانتے بھی ہیں؟ جس کو ہم حدیث کی روایت کے ساتھ اتصال کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ سند متصل ہونی چاہیے، متصل ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راوی جس سے نقل کرتا ہے اُس کے ساتھ اس کی ملاقات ہو، ان کا زمانہ ایک ہے، آپس میں یہ ملے ہیں، تب جا کے اعتماد ہوتا ہے کہ جب ان کی ملاقات ہوئی تو واقعی یہ بات اِس نے اُس سے سنی ہوگی۔ پھر نقل کرنے والے کی ذاتی صفات دیکھی جاتی ہیں، کہ یہ آدمی قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، دیانت دار ہے، خائن ہے، متقی ہے، فاسق ہے، فاجر ہے، جھوٹا ہے، سچا ہے، یہ چیزیں راوی کے اندر دیکھی جاتی ہیں۔ اور جس وقت راوی کا اپنے مروی عنہ سے اتصال بھی ثابت ہوجائے اور پھر راوی اچھی صفات کا حامل ہو، اس کے اُوپر کوئی اعتراض والی بات نہ ہو، تو دُنیا کی اِبتدا سے لے کر اِس وقت تک یہ اُصول چلا آرہا ہے کہ ایسی بات کو پھر جھٹلایا نہیں جاتا، بلکہ اس کو تسلیم کرلیا جاتا ہے، اگر یہ اُصول چھوٹ جائے کہ سچے راوی کی بات بھی نہیں ماننی تو پھر دُنیا کا کوئی نظم بھی نہیں چل سکتا، ساری دُنیا کا نظم اس بات کے اُوپر چلتا ہے کہ جب بھی کوئی خبر ملتی ہے تو یہ تو سوچا کرتے ہیں کہ خبر دینے والا کون ہے؟ اور کیا واقعی یہ اس واقعے کو دیکھنے والا ہے؟ مشاہدہ کرنے والا ہے؟ جو یہ بتا رہا

ہے، ان سب چیزوں کے ثابت ہو جانے کے بعد پھر انکار کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، اور اگر ایسی خبر کو بھی تسلیم نہ کیا جائے تو دُنیا کا نظم ہی بحال نہیں رہ سکتا، گویا کہ یہ ایک فطری اُصول ہے بات کو قبول کرنے کے لیے۔

اب یہ قرآنِ کریم جو مخلوق تک آ رہا ہے، تو مخلوق تک اِس کے پہنچنے میں خالق اور مخلوق کے درمیان میں دو واسطے ہیں، اللہ تعالیٰ سے یہ کلام جبریل علیہ السلام لایا اور جبریل علیہ السلام نے لا کر حضور ﷺ کو پہنچایا، اور سرورِ کائنات ﷺ نے آگے مخلوق تک اس پیغام کو پہنچایا، تو خالق اور مخلوق کے درمیان میں دو واسطے آگئے، ایک جبریل کا اور ایک حضور ﷺ کا۔ اب اسی عقلی اور فطری اُصول کے مطابق آپ یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ یہ دونوں واسطے قابلِ اعتماد ہیں یا نہیں؟ اور اس سند کے اندر اتصال ہے یا نہیں؟ اگر سند کے اندر بھی اتصال ہو اور دونوں واسطے قابلِ اعتماد ہوں تو پھر انکار کرنا عقل اور فطرت کے خلاف ہے، دُنیا کے ایک معروف اُصول کے خلاف ہے، یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ نجم کے اندر واضح فرمائی تھی، وہاں بھی جبریل علیہ السلام اور حضور ﷺ کا تذکرہ آیا تھا اور ان کی آپس میں ملاقات بھی ثابت کی گئی تھی، اور یہی ذکر اِس سورت کے اندر کیا گیا ہے، جب دونوں راوی اپنی جگہ ثقہ ہوں گے اور دونوں کا آپس میں اتصال بھی ہوگا، سند میں اِنقطاع بھی نہیں اور راوی بھی سارے کے سارے ٹھیک ہیں، پھر اس بات کو تسلیم نہ کرنا عقل، فطرت، عرف، ہر چیز کے خلاف ہے، یہی چیز بیان کر کے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے، اور جس قسم کے حقائق قرآن واضح کر رہا ہے ان حقائق کو تسلیم کرنا تمہارے لیے کامیابی کی راہ ہے۔

''قسم'' کے شروع میں لفظِ ''لَآ'' کی وضاحت

پہلے قسم کھائی ستاروں کی، فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ: آپ کے سامنے لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ میں ذکر کیا تھا کہ قسم کے لفظ سے پہلے لَآ آیا کرتا ہے، لیکن یہ لَآ قسم کی نفی نہیں کیا کرتا، اس لیے ترجمہ یوں نہیں ہوگا کہ لَآ اُقْسِمُ: میں قسم نہیں کھاتا، لَآ علیحدہ ہے اور اُقْسِمُ علیحدہ ہے، عام طور پر تو اِس لَآ کو زائدہ قرار دے دیا جاتا ہے، اس لیے ترجمہ یوں ہی کریں گے کہ میں قسم کھاتا ہوں خنس کی، لَآ کا ترجمہ ہی نہیں کریں گے، تو اِس لَآ کو زائدہ قرار دے دیا۔ اور اگر اس لَآ کے ترجمے کو ظاہر کرنا ہی ہو تو اصل بات یہ ہے کہ جس مسئلے میں گفتگو ہو رہی ہے تو مخالف کے خیالات پر انکار پہلے کر دیا، اور دُوسری بات کو بعد میں ذکر کیا، جیسے آپ اور میں ایک مسئلے میں گفتگو کر رہے ہیں، اور آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے، تو میں کہوں ''نہیں، میں قسم کھا کے کہتا ہوں بات ایسے ہے'' یہ ''نہیں'' کے ساتھ آپ کی بات کی تردید ہوگئی، اور ''قسم کھا کے کہتا ہوں بات ایسے ہے'' یہ اگلی بات ہے۔ تو ہمارے عرف میں بھی گفتگو کے دوران میں قسم سے پہلے نہیں کا لفظ آیا کرتا ہے، اور نہیں کے ساتھ مخاطب کے خیالات کی تردید کرنی مقصود ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم کو کہانت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں

ذکر یہ چل رہا ہے کہ جو حقائق یہ کتاب پیش کر رہی ہے، کیا یہ حضور ﷺ کا اپنا قول ہے، کسی انسان کا بنایا ہوا ہے، یا کسی جن کا قول ہے جس طرح سے لوگ حضور ﷺ کو کہتے تھے کہ یہ کاہن ہے...... کاہن وہ ہوا کرتے تھے جو جنات کے ساتھ اپنے

تعلقات قائم کر کے وہاں سے کچھ باتیں معلوم کرتے جھوٹ سچ، اور جنات عالم بالا کی طرف جاتے تو کچھ باتیں سُن سُنا کر آتے، اس میں جھوٹ ملاتے، اور آ کر کاہنوں کو سناتے، کاہن آگے نقل کر دیتے تھے، سو میں سے کوئی ایک بات کبھی سچی بھی نکل آتی، ننانوے اُس میں جھوٹ ہوتے...... تو یہ کہتے تھے کہ یہ کاہن ہے اور اس کے تعلقات جنوں کے ساتھ ہیں جس کی بنا پر یہ اس قسم کی باتیں نقل کرتا ہے، ورنہ یہ اللہ کی کلام نہیں ہے، تو وہ کہانت کا قول کرتے تھے، جس طرح سے شاعر ہونے کا قول کرتے تھے کاہن ہونے کا قول بھی کرتے تھے، وَّمَاهُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ، وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ، یہ لفظ آپ کے سامنے پہلے آچکے ہیں (سورۂ حاقہ)۔ تو اصل میں یہاں کہانت کی تردید کرنی مقصود ہے کہ یہ کاہن نہیں ہیں، کاہن جھوٹے ہوتے ہیں، کاہنوں کے روابط شیاطین کے ساتھ ہوتے ہیں، شیاطین کو خوش کرنے کے لئے وہ شرکیہ کام کرتے ہیں، شرکیہ اقوال اختیار کرتے ہیں، شیاطین کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کے لئے ان کو ویسے ہی گندا رہنا پڑتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دُکان دار ہوتے ہیں، کاہن دُکان دار ہوتے ہیں، اوّل تو کسی کو وہ بات بتاتے ہی نہیں، اور اگر بتائیں گے بھی تو بھرپور فیس کا مطالبہ کرتے ہیں، "حُلوانِ کاہن" ایک معروف محاورہ ہے، کہ کاہن جس وقت تک مٹھائی نہ لے اور نذرانہ نہ لے اس وقت تک کوئی بات بتانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، تو وہ انتہائی بخیل ہوتے ہیں، تو یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کو کہانت کے ساتھ تو سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اِن ستاروں کو پیدا کیا ہے، ستاروں کا طلوع وغروب، اُن کا چلنا پیچھے ہٹنا سب ایک حکمت کے تابع ہے، اسی طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا رُوحانی نظم ہے، فرشتے آتے ہیں، کبھی آگے کو بڑھتے ہیں، کبھی پیچھے کو ہٹتے ہیں، کبھی چھپتے ہیں، کبھی رسول پر نمایاں ہوتے ہیں، اور یہ اللہ کی کلام پہنچاتے ہیں، اور جو واسطہ اللہ تعالیٰ نے یہاں درمیان میں کلام پہنچانے کے لئے بنایا ہے وہ کوئی شیطان نہیں ہے۔ نعوذ باللہ۔ اس کی صفات شیطانی نہیں، بلکہ انتہائی درجے کا ستھرا، پاک صاف، طاہر، مطہر، مقدس، چیز ہے یعنی جبریل علیہ السلام، اور آگے جن کو بات پہنچائی جارہی ہے اُن کی صفات کے اندر اگر غور کرو گے تو تمہیں پتا چلے گا کہ ان کو بھی کہانت سے کوئی مناسبت نہیں ہے، جس کا نتیجہ آگے یہ ہوگا کہ یہ اللہ کی کلام ہے، اللہ کی طرف سے بطور نصیحت کے آئی ہے، تم اِس قسم کے مغالطے دے کر اس کی تکذیب کرنے کی کوشش نہ کرو، تو لَآ کے ساتھ اُن کے اس قول کی تردید ہوگئی جو کہتے ہیں کہ یہ کہانت ہے یا یہ کہتے ہیں کہ رسول کاہن ہے۔ لَآ نہیں، ایسی بات نہیں، لَآ کے ساتھ اس کی تردید ہوگئی۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ: خنس خانس کی جمع ہے، خَنَسَ: پیچھے کو ہٹنا۔ الْجَوَارِ: جوارِی جاریہ کی جمع، چلنے والی چیز۔ اور الْكُنَّسِ یہ کانس کی جمع، چھپنے والی، کَنَسَ چھپنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ صفت ہے ستاروں کی، ستارے کبھی پیچھے کو ہٹتے ہیں اور کبھی اپنی متعین راہ پر چلتے ہیں اور کبھی غروب ہوجاتے ہیں، "قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو پیچھے کو ہٹنے والے ہیں، چلنے والے ہیں، چھپنے والے ہیں" وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ: اور رات کی جس وقت کہ وہ پھیل جائے، عَسْعَسَ: تاریک ہوجائے، دونوں طرح سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے،

"جب وہ جانے لگے یا جب وہ پھیل جائے۔" وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ: اور صبح کی جس وقت وہ ظاہر ہونے لگے۔ان ساری چیزوں کی قسم کھائی جارہی ہے اور قسم کھا کے یہ بات کہی جارہی ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ: بے شک یہ ایک باعزت بھیجے ہوئے کا قول ہے، کسی شیطان کا قول نہیں، یہ ہے جوابِ قسم۔

"قسم" اور "جوابِ قسم" میں مناسبت حضرت شیخ الاسلامؒ کے قلم سے

ستاروں کو اس قسم کے ساتھ کیا مناسبت ہے، اس کے بارے میں حضرتِ شیخ (شبیر احمد عثمانی) لکھتے ہیں "ان قسموں کی مناسبت آئندہ مضمون سے یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا، لوٹنا، چھپ جانا، یہ ایک نمونہ ہے اگلے انبیاء علیہم السلام پر بار بار وحی آنے اور ایک مدت دراز تک اس کے نشان باقی رہنے پھر منقطع ہو کر چھپ جانے اور غائب ہو جانے کا، اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے دُنیا پر گزرا، کہ کسی شخص کو حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے، اور اس کے بعد صبح صادق کا دم بھرنا، حضور ﷺ کا اس جہان میں تشریف لانا اور قرآن کا اُترنا ہے، کہ ہر چیز کو ہدایت کے نُور سے دِن کی مانند روشن کردیا، گویا اگلے انبیاء علیہم السلام کا نُور ستاروں کی طرح تھا اور اس نورِ اعظم کو آفتابِ درخشاں کہنا چاہیے.....اور بعض علماء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ ستاروں کا سیدھا چلنا، لوٹنا، چھپ جانا فرشتے کے آنے اور واپس جانے اور عالمِ ملکوت میں چھپ جانے کے مشابہ ہے، اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا قرآن کے سبب ظلمتِ کفر دُور ہو جانے اور نورِ ہدایت کے پوری طرح ظاہر ہو جانے کے مشابہ ہے، اس تقریر کے موافق مقسم بہ کی مناسبت مقسم علیہ سے زیادہ واضح ہے" (تفسیر عثمانی) یعنی اس طرح سے قسم کی مناسبت جس چیز پر قسم کھائی جارہی ہے واضح ہو جاتی ہے، کہ فرشتے جس طرح سے آتے ہیں جاتے ہیں چھپتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے یہ ستارے بنائے جن کو لوگوں کے لئے روشنی اور ہدایت کا ذریعہ بنایا، وہ بھی کبھی اپنے راہ پہ چلتے ہیں، کبھی چھپ جاتے ہیں کبھی ظاہر ہوتے ہیں، کبھی پیچھے کو ہٹتے ہیں کبھی آگے کو چلتے ہیں، جیسے ستاروں کا نظم ہے۔ تو ان کو شہادت میں پیش کر کے کہا جارہا ہے کہ یہ قرآنِ کریم بھی رسولِ کریم کا قول ہے، کسی شیطان کا یا جن کا قول نہیں ہے۔

جبریلِ امین علیہ السلام کی ثقاہت

پہلی صفت اس رسول کی......رسول: بھیجا ہوا، قاصد، اس کا مصداق یہاں جبریل ہیں......پہلی صفت اس کی ذکر کی گئی کریم، اس میں کرم کی صفت ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ کرم اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ ہی ہے، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (سورۂ حجرات: ۱۳) جس سے اس کے متقی ہونے کی طرف اشارہ ہوگیا کہ فرماں بردار ہے۔ ذِيْ قُوَّةٍ: زور آور ہے، قوت والا ہے، عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ: عرش والے کے نزدیک ذی مرتبہ ہے، مُطَاعٍ ثَمَّ: وہاں اس کا کہنا مانا جاتا ہے، مطاع ہے، اَمِيْنٍ: امین ہے، امانت دار ہے، کوئی کسی قسم کی خیانت اس میں نہیں پائی جاتی۔ طاقت والا ہے کسی سے مرعوب نہیں ہوتا، کوئی اس کے اُوپر زور نہیں ڈال سکتا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذی مرتبہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم ہے، کریم ہے، یہ اس کے متقی ہونے کی طرف اشارہ

ہے، امانت دار ہے کوئی کسی قسم کی خیانت نہیں ہے، ذی مرتبہ ہے، اور وہاں فرشتے اس کی اطاعت کرتے ہیں، مطاع ہے۔ تو یہ راوی جو اتنا ثقہ، اتنا عظیم المرتبت، اس کی بات کے متعلق شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ شاید یہ بات غلط کہہ رہا ہو، یا کسی کے دباؤ میں آکر اس نے کوئی بات تبدیل کر دی ہو، یا کسی خیانت کے جذبے کے تحت اس نے کوئی ملاوٹ کر دی ہو، اس راوی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

حضور ﷺ کی ثقاہت

وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ: اب دُوسرا لے لیجئے..... !صَاحِبُكُم: تمہارا ساتھی، تمہارے ساتھ رہنے والا، اس سے مراد حضور ﷺ ہیں، ''اور تمہارا ساتھی بھی کوئی دیوانہ نہیں'' تم اس کے ساتھ وقت گزار رہے ہو، اس کی چالیس سالہ زندگی دیکھے بیٹھے ہو، اس میں کون سی دیوانگی کی بات پائی جاتی ہے؟ تو یہ بھی کوئی دیوانہ نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی جبریل علیہ السلام سے ملاقات

وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ: اور اِس تمہارے صاحب نے اُس رسول کریم کو واضح کنارے پر دیکھا بھی ہے، یعنی ان کی آپس میں ملاقات بھی ثابت ہے، اصل شکل کے اندر حضور ﷺ نے جبریل کو دیکھا ہے، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بھی دیکھا جیسے سورۂ نجم میں آیا، اور اِسی آسمان کے کنارے پر بھی دیکھا جیسے کہ سورۂ مدثر کی ابتدا کے اندر ذکر کیا گیا تھا، لہٰذا ان کی آپس میں جان پہچان ہے، یہ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں، ایسا اندیشہ بھی نہیں ہے کہ کوئی شیطان آ کے بات نقل کر دے اور حضور ﷺ سمجھیں کہ یہ جبریل ہے، ایسی بات بھی نہیں ہے۔ ''اِنہوں نے اُس کو واضح کنارے پہ دیکھا ہے۔''

حضور ﷺ کی کاہنوں کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ: ضنین بخیل کو کہتے ہیں، ''اور وہ غیب کے اوپر بخیل بھی نہیں''، غیب کی خبریں بتانے پر بخیل بھی نہیں، غیب کے اندر اللہ کی ذات، اللہ کی صفات، اللہ کے اَحکام، جنت دوزخ کا ذِکر، مرنے کے بعد جو حالات پیش آنے والے ہیں برزخ میں، جو کچھ بھی حضور ﷺ نے واضح کر دیے سب مغیبات ہیں۔ کاہن تمہارے سامنے اگر کوئی غیب کی بات کرتا ہے جس کو تم جانتے نہیں وہ تمہارے سامنے ظاہر کرتا ہے تو باقاعدہ فیس لیتا ہے، ہزار نخرے کرتا ہے، لیکن یہ تو مغیبات کی خوب اچھی طرح سے اشاعت کرتے ہیں، کوئی کسی قسم کا بخل نہیں کرتے، تم سے کوئی کسی قسم کی فیس نہیں مانگتے، ان میں کون سی بات ایسی ہے جس کی بنا پر تم ان کو کاہن کہتے ہو۔

''قرآن'' شیطان کا قول بھی نہیں ہے

''اور یہ کسی شیطان مردود کا قول بھی نہیں ہے'' کیونکہ شیطان مردود تو اللہ کی نافرمانی سکھاتا ہے، اور یہ کتاب تو ساری کی

ساری ہدایت ہے اور شیطانی مشن کے سراسر خلاف ہے، تو شیطان ایسی بات کیسے لاسکتا ہے جو اُسی کے مشن کو نقصان دینے والی ہو، شیطان کمینی زندگی تو سکھا سکتا ہے، پاکیزہ زندگی نہیں سکھاتا، اور قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ خود پاک اور اس کی تعلیم پاک، اور یہ پاک ہی معاشرہ تیار کرے گی، اور پاک ہی لوگوں کو سکھاتی ہے، تو یہ شیطانِ رجیم کا قول بھی نہیں ہے۔

شکوۂ الٰہی

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ: جب یہ باتیں ساری کی ساری تمہارے سامنے واضح ہیں، پھر تم کدھر کو جا رہے ہو؟ تم قرآنِ کریم کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے اور اس کو کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ: پس تم کہاں جا رہے ہو؟

قرآن کس کے لئے نصیحت ہے؟

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ: نہیں ہے یہ قرآن مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے، یعنی تمام جہانوں کے لئے بطور نصیحت کے آیا ہے، لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ: خاص طور پر اس شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے، اس کے لئے یہ نصیحت ہے، اس کا ذکر خاص طور پر اس لیے کر دیا کہ فائدہ یہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتے ہیں، اور جو چلنا ہی نہیں چاہتے تو ان کے سامنے جتنی واضح ہدایت رکھ دیں وہ کوئی فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔

اللہ کی مشیت کس کے لئے ہوتی ہے؟

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے کتاب تو اُتار دی ہدایت کے لئے، اور جو چاہے اس سے فائدہ بھی اُٹھا سکتا ہے، لیکن ہدایت اللہ کی مشیت کے تحت ہی نصیب ہوتی ہے، اور اللہ کی مشیت متعلق اسی شخص سے ہوگی جو نیک ارادے کے ساتھ اخلاص کے ساتھ غور و فکر کر کے اس کو سمجھنا چاہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جو شخص حق کو جھٹلانے پر تُل جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہدایت مخفی کر دیتے ہیں پھر اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، ”اور نہیں چاہتے تم مگر اللہ کے چاہنے کے ساتھ جو رَبّ العالمین ہے“ یعنی تمہارا چاہنا یہ اللہ کے چاہنے کے تابع ہے، اللہ کی مشیت ہوگی تو تم صراطِ مستقیم پر چلنا چاہو گے، اور اللہ کی مشیت تمہارے متعلق اس وقت ہوگی جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا، اور اپنی کتاب کے اندر اس نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اسی کے متعلق ہی چاہتے ہیں جو اخلاص کے ساتھ صحیح ارادے کے ساتھ حقیقت معلوم کرنا چاہے تو اللہ کی مشیت متعلق ہو جاتی ہے اور وہ صحیح حقیقت پا لیتا ہے، اور اس کے لئے صراطِ مستقیم پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔

***

اٰیاتھا ۱۹ ۸۲ سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ ۸۲ رکوعھا ۱

سورۂ انفطار مکی ہے اور اس کی ۱۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳

جب آسمان پھٹ جائے گا○ اور جب ستارے بکھر جائیں گے○ اور جب دریا بہا دیے جائیں گے○

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵ يٰٓاَيُّهَا

اور جب قبروں کو اکھیڑا جائے گا○ تو ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا○ اے

الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ

اِنسان! کس چیز نے تجھے دھوکے میں ڈال دیا تیرے ربِّ کریم کے متعلق○ جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تیرے اَعضا درست کیے

فَعَدَلَكَ ۝۷ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝۸ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹ وَ

پھر تجھے معتدل بنایا○ جس صورت میں چاہا تیری ترکیب کردی○ ہرگز نہیں! بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو○ اور

اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲ اِنَّ

بے شک تمہارے اُوپر البتہ نگران ہیں○ بڑے نیک ہیں، لکھنے والے ہیں○ جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں○ بے شک

الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝۱۳ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝۱۴ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝۱۵

نیک لوگ خوش حالی میں ہوں گے○ اور فاسق فاجر لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوں گے○ جزا کے دِن اس میں داخل ہوں گے○

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝۱۶ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۷ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا

اور وہ اُس جہنّم سے غائب ہونے والے نہیں ہوں گے○ تجھے کیا پتا کہ جزا کا دِن کیا ہے؟○ پھر تجھے کیا پتا کہ

يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۸ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝۱۹

جزا کا دِن کیا ہے؟○ جس دِن کوئی نفس کسی نفس کے لئے کچھ اختیار نہیں رکھے گا، اور حکم اس دِن سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہوگا○

تفسیر

سورۂ انفطار ''مکی'' ہے، اور اس کی ۱۹ آیتیں ہیں، بالکل جیسا مضمون پچھلی سورت میں ہے ویسا ہی مضمون اس میں ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ: جب آسمان پھٹ جائے گا، وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ: اور جب ستارے بکھر جائیں گے، وہاں تھا کہ میلے ہو جائیں گے، بے نُور ہو جائیں گے، یہاں آ گیا کہ بکھر جائیں گے، ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، ادھر ادھر گر جائیں گے، وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ: اور جب دریا بہا دیے جائیں گے، جاری کر دیے جائیں گے، بہانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی حدود سے باہر نکل جائیں گے، شیریں اور تلخ سب ایک ہو جائیں گے، اب سمندر کے حدود علیحدہ ہیں، میٹھے دریاؤں کے علیحدہ ہیں، اور جب یہ تغیر ہو گی تو سب آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے، کوئی میٹھا اور کھاری علیحدہ علیحدہ نہیں رہے گا، جب زمین پہ زلزلہ آئے گا تو پانی بھی اُبل کر اور اُچھل کر اپنے کناروں سے باہر نکل کر آپس میں خلط ملط ہو جائے گا۔ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ: اور جس وقت قبروں کو اُکھیڑ دیا جائے گا، بُعْثِرَتْ کی ضمیر قبور کی طرف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قبروں کو اُکھیڑ کر سب کو نکال باہر کھڑا کریں گے، یہاں خصوصیت کے ساتھ قبروں کا ذِکر آ گیا، کیونکہ انسان بظاہر قبروں میں ہی دفن ہوتے ہیں ورنہ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (سورہ زلزال) آگے لفظ آ رہا ہے کہ زمین کے اندر جو بھی بوجھ پڑا ہوا ہو گا زمین سب کو نکال کے باہر رکھ دے گی، ''جبکہ قبروں کو اُکھیڑا جائے گا، قبریں زیر و زبر کر دی جائیں گی۔''

''مَاقَدَّمَتْ'' اور ''مَا اَخَّرَتْ'' کا مصداق

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ: اِس آیت کا مطلب آپ کے سامنے پچھلی سورت میں آ گیا، ''جان لے گا ہر نفس'' یہ اِذا کا جواب ہے، ''جب یہ واقعات پیش آئیں گے ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا'' آگے بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کر لیا وہ گویا کہ آگے بھیج دیا، اور جو کرنا چاہیے تھا نہیں کیا، وہ پیچھے چھوڑ دیا۔ یا آگے بھیج دیا یعنی اپنا عمل، اور پیچھے چھوڑ دیے یعنی اس کے آثار، ایک آدمی نیکی کرتا ہے تو اس کا نیکی والا عمل آگے چلا گیا، اور جو نیکی کو رواج دے دیا یہ وہ عمل ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا، تو پیچھے بُرا عمل چھوڑا ہو یا اچھا عمل چھوڑا ہو وہ بھی پتا چل جائے گا، ایک آدمی نے بُرائی کی اور ایک پیچھے بُرائی کا طریقہ ایجاد کر گیا تو جو بُرائی کا طریقہ ایجاد ہو گا کہ لوگ اس بُرائی کی نقل اُتارتے رہیں اور اس پہ چلتے رہیں یہ مَا اَخَّرَتْ کا مصداق ہے، اور جو اس نے اپنا عمل کیا ہے وہ مَا قَدَّمَتْ کا مصداق ہے۔ ''جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا ہر نفس کو پتا چل جائے گا۔''

اِنسان اپنے رَبِّ کریم سے کیوں دُور ہو گیا؟

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ: اے انسان!، یہ خطاب عمومی ہے، لیکن مراد اس سے وہی! کافر ہیں جو اس غور و فکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا قول نہیں کرتے اور اپنے آپ کو مکلف نہیں سمجھتے، ''اے انسان!'' مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ: غَرَّ: دھوکا دینا، یہ لفظ غرور سے

ہے،''کس چیز نے تجھے دھوکے میں ڈال دیا تیرے رَبِّ کریم کے متعلق؟''،''رَبّ'' کے ساتھ ''کریم'' کا لفظ ہے، تیرے پر تو صبح شام اس کا فضل وکرم ہے، تُو اس کی کتنی نعمتیں کھاتا ہے، ایسے رَبِّ کریم کے متعلق تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا؟ تجھے تو یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے، تجھے اپنے رَبّ کو پہچاننا چاہیے، اس کی اطاعت کرنی چاہیے، یہاں ''رَبّ'' کے ساتھ ''کریم'' کا لفظ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر اِنسان کے اندر کوئی شرافت باقی ہو تو جتنا یہ احسان اور کرم سے متاثر ہوتا ہے اتنا یہ سختی سے متاثر نہیں ہوتا، اگر کسی شخص کے اندر شرافت ہو تو یہ سب سے زیادہ متاثر اِحسان سے ہوتا ہے، اور اپنے محسن کی خلاف ورزی عقل کے نزدیک اور عرف کے نزدیک انتہائی درجے کی قبیح چیز ہے، ڈنڈے کے ساتھ سمجھانا یا ڈنڈے کے ساتھ کسی کو سیدھا کرنا یہ بھی دُنیا میں ایک اُصول ہے لیکن شرفاء کے لئے نہیں، یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کے اندر خبث ہوتا ہے، شرارت کا مادّہ ہوتا ہے وہاں تو ڈنڈے سے سرگوں ہوتا جاتا ہے، اس لیے یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ تم اپنے ''رَبِّ جبار'' سے ڈرتے نہیں ہو؟ تمہارا رَبّ جو ''شدید العقاب'' ہے تمہیں اس سے خوف نہیں آتا؟ یوں بھی کہہ سکتے ہیں، اور ترہیب کی آیات بھی قرآنِ کریم میں ہیں، ڈرا دھمکا کر بھی انسان کو سیدھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احسانات جتلا کر بھی سیدھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمہارا رَبّ جو اتنا کریم ہے، صبح شام تمہارے اُوپر اِحسان کرتا ہے، تم اس کے متعلق کس طرح سے دھوکے میں پڑ گئے؟ کس چیز نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا؟

''کرم'' کے نتیجے میں سرکش ہوجانا کمینوں کا کام ہے

اب یہاں چونکہ ''رَبّ'' کے ساتھ ''کریم'' کا لفظ آیا تو ایک بزرگ نے اس لفظ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نکتہ ذِکر کیا ہے کہ یَارَبِّ غَرَّنِیْ کَرَمُكَ: اے رَبّ! تیرے کرم نے ہی تو ہمیں دھوکے میں ڈال دیا ہے، اگر تُو کرم نہ کرتا، بلکہ جو گناہ ہوتا ساتھ ایک تھپڑ رسید ہوجایا کرتا اور ہر غلطی کے اُوپر فوراً سزا ہوجایا کرتی تو اِنسان کو دھوکا نہ لگتا، یہ تیرا کرم اور شرف اور تیرا فضل اور احسان ہی ہے کہ جس سے اِنسان دھوکے میں پڑا ہوا ہے۔ بہر حال یہ ایک چیز جس سے انسان کے اندر اطاعت کے جذبات اُبھرنے چاہئیں تھے، اللہ کے اِحسانات کو دیکھ کے......! اگر اللہ کا اِحسان انسان کے لئے نافرمانی کا باعث بن رہا ہے تو اس میں قصور اِحسان کا نہیں بلکہ انسان کی اپنی خباثت ہے، ''متنبی'' میں بھی ایک جگہ اس قسم کا تأثر بیان کیا ہے:

اِذَا اَنْتَ اَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهٗ وَاِنْ اَنْتَ اَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

کہتے ہیں کہ اگر کسی شریف انسان پر تم احسان کرو تو وہ تمہارا مملوک ہوجائے گا، تم اس کے مالک بن جاؤ گے، اِذَا اَنْتَ اَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهٗ، اگر کسی کریم پر اِحسان کرو جس کی طبیعت کے اندر شرافت ہے تو اِحسان کر کے تم اس کے مالک بن جاؤ گے، وہ ایسا ہوگا گویا کہ تمہارا مملوک ہے، وَاِنْ اَنْتَ اَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا، اور اگر کسی کمینے کے اُوپر اِحسان کرو گے تو وہ اُلٹا سرکش ہوجائے گا۔ تو اِحسان کے نتیجے میں سرکش ہوجانا، نرمی کے نتیجے میں آگے سے باغی ہوجانا یہ لئیم انسان کا کام ہے، کمینوں کا کام ہے، جو شریف ہوا کرتا ہے جس میں شرافت ہو وہ تو اِحسان کے سامنے دَب جاتا ہے جس طرح سے کہا کرتے ہیں ''اَلْاِنْسَانُ

عَنِ الْاِنْسَانِ'' اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ ''کریم'' کی صفت ذکر کی کہ تجھے اپنے رَبِّ کریم کا مطیع ہونا چاہیے، شکر گزار ہونا چاہیے، ''کس چیز نے تجھے تیرے رَبِّ کریم کے متعلق دھوکے میں ڈال دیا؟''

اللہ کے کرم کا ایک نمونہ

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ: دیکھ اس کا کیسا اِحسان ہے، جس نے تجھے پیدا کیا، فَسَوّٰىكَ: پھر تیرے اعضا دُرست کیے، فَعَدَلَكَ: پھر تجھے معتدل بنایا، ظاہری شکل میں معتدل، باطنی صلاحیتوں میں معتدل، فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ: پھر جس صورت میں چاہا تیری ترکیب کردی، تیری شکل وصورت جیسی چاہی بنادی، جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔

دھوکے میں پڑنے کی بنیادی وجہ

كَلَّا: تجھے ہرگز دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، یہ ذات دھوکے میں پڑنے کے قابل نہیں ہے کہ تم اس کے متعلق دھوکے میں پڑ جاؤ، تمہیں دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، تو كَلَّا یہ ردع ہو گیا۔ ''بلکہ تم تو جزا ہی جھٹلاتے ہو'' چاہیے تو یہ تھا کہ تم یہ احساس رکھتے کہ جس رَبِّ کریم نے ہمیں پیدا کیا، جس رَبِّ کریم نے ہمیں معتدل بنایا، ہمیں اَعضا دیے، اور کھانے پینے کے لئے دیا جس طرح سے دُوسری آیات میں ہے، تو آخر کل کو وہ پوچھے گا بھی، تو تمہیں چاہیے تھا کہ تم جزا کا تصور ہر وقت رکھتے کہ ہم جس وقت اس کے سامنے جائیں گے وہ حساب بھی لے گا، لیکن تم تو اُلٹا تکذیب ہی کر رہے ہو، جزا کے دِن کو جھٹلا ہی رہے ہو، اور یہ ایک وجہ ہے زیادہ تر دھوکے میں واقع ہونے کی کہ تمہارے سامنے جزا کا تصور نہیں، تم سمجھتے ہو کہ بس کھانا، پینا، ہگنا، بس یہی تمہارا کام ہے، باقی! جس کا کھا پی رہے ہیں، اس کو جا کے حساب کتاب نہیں دینا، اگر یہ حساب کتاب ذہن میں ہو تو پھر تم اس قسم کے دھوکے میں نہ آؤ۔ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ: كَلَّا کے ساتھ ردع ہو گیا کہ تمہیں اس کے متعلق دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، بلکہ یہ عقیدہ رکھو کہ اس کے سامنے جانا ہے اور جتنے بھی اس کے احسانات ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ شکر گزاری کی یا نہیں کی، اور اس کے اوپر جزا وسزا مرتب ہوگی، لیکن تم ایسا نہیں کرتے بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ: بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔

اِنسان کی زندگی کو ریکارڈ کرنے کے مختلف اِنتظامات

وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ: اور بے شک تمہارے اُوپر البتہ نگران ہیں، تم یہ نہ سمجھو کہ تمہاری کوئی حرکت چھپی ہوئی ہے، جو کچھ تم کرتے ہو سب ہمارے پاس لکھا ہوا آ جاتا ہے، ویسے تو اللہ کا علم ہی کافی، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اِن اعمال کو محفوظ کرنے کے لئے آپ کے جتنے اَعضا ہیں وہ بھی سارے کے سارے ریکارڈ مشینیں بنائی ہوئی ہیں، مختلف سورتوں کے اندر یہ بات واضح کردی گئی، انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی مشین بنایا ہے، زبان جو کچھ بولتی ہے یہ لفظ جو ادا ہو رہے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ زبان میں ریکارڈ بھی ہو رہا ہے، کل کو اللہ تعالیٰ اسی کو چلائے گا اور یہ سب کچھ بتادے گی کہ میرے ساتھ کیا کیا بولا گیا ہے، آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے آپ سمجھتے ہیں کہ وقتی طور پر چیز آنکھ کے سامنے سے گزر گئی، نہیں! اس طرح سے نہیں، بلکہ زندگی بھر کی دیکھی ہوئی چیزوں کی فلم آنکھ

میں تیار ہورہی ہے، اگر تم کسی بات کا انکار کرو گے کہ ہم نے یہ چیز نہیں دیکھی تو اللہ تعالیٰ وہی فلم آپ کے سامنے نمایاں کردیں گے، پتا چل جائے گا کہ آپ نے آنکھ کے ساتھ کیا کیا دیکھا ہے، کان کے ساتھ جو کچھ آپ سنتے ہیں تو یہ نہیں کہ سننے کے بعد وہ فوراً ضائع ہوجاتا ہے، نہیں، پورا ریکارڈ ہورہا ہے، ہاتھ کے ساتھ جو کچھ کرتے ہو وہ سب ہاتھ میں ریکارڈ ہورہا ہے، پاؤں کے ساتھ جدھر کو چلتے ہو وہ سب پاؤں میں ریکارڈ ہورہا ہے، انسان کا بدن جو ہے اس کے اندر اس کی زندگی کے سارے اقوال افعال کردار جو کچھ ہے سب اس میں محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ چاہے گا تو انسان کے سامنے ان چیزوں کو نکال کے رکھ دے گا۔ اور یہ چیز بھی کیا مشکل ہے کہ ایک مصالحے کا تسمہ ہے (کیسٹ کے اندر) جو کہ ہماری ہر چیز کو ضبط کرتا چلا جارہا ہے، کیمرہ مشین ہے جو ہماری ہر ہر حرکت کو ضبط کرتی چلی جارہی ہے، اس سے آپ سمجھ جائیے کہ ایک ناقص العقل انسان جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی اتنی قدرت دے دی کہ وہ اپنے کردار کو اقوال کو محفوظ کرسکتا ہے، تو جو ان سب کا خالق ہے پیدا کرنے والا ہے، تمام قدرتوں کا مالک ہے، اس کے لئے انسان کے اقوال اور کردار افعال کو محفوظ کرنا کیا مشکل ہے؟ تو اس نے نشاندہی کردی کہ جو کچھ تم کرتے ہو تمہارے بدن میں سب کچھ محفوظ ہے، انکار کرو گے تو تمہارے یہی اعضا اور تمہارا چمڑا بول کر بتادے گا کہ تم نے یہ کام کیا ہے، یہ نہیں کیا، سورۂ حم سجدہ کے اندر اس مضمون کی تفصیل آپ کے سامنے آئی شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ، اُسی آیت میں اس کا ذکر کیا گیا تھا...... اور ساتھ یہ دُوسری بات بھی آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے بھی پیچھے لگا رکھے ہیں، زبان سے کوئی لفظ نکلتا ہے وہ بھی ضبط کرلیتے ہیں، کوئی کام کرتے ہو وہ بھی ضبط کرلیتے ہیں، یہاں ان کا ذکر آگیا، یہ سی آئی ڈی کا عملہ مستقل پیچھے لگا ہوا ہے جس سے تمہاری کوئی حرکت مخفی نہیں ہے، تو لکھا لکھایا یہ بھی سامنے آجائے گا، پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ بتاؤ میرے لکھنے والوں نے ان کاتبوں نے اِن حافظوں نے تم پر کوئی زیادتی تو نہیں کی؟ تو تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے ٹھیک لکھا ہے کیونکہ یہ حافظین ہیں، کِرَامًا كَاتِبِيْنَ ہیں، کرام یہ کریم کی جمع ہے بڑے نیک، بڑے صالح، لکھنے والے، جن میں کسی قسم کی بددیانتی نہیں ہے، ایسا نہیں کہ تم نہ کرو اور خواہ مخواہ تمہارے متعلق کچھ لکھ دیں، یا تم کوئی نیکی کا کام کرو اور یہ نہ لکھیں، ایسی بات نہیں ہے، کرام ہیں، بڑے کریم ہیں، بڑے بزرگ طبیعت ہیں، کاتبین: لکھنے والے، كِرَامًا كَاتِبِيْنَ یہ لفظ عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں، اس کا لفظی معنی ہوگا بزرگ لکھنے والے، کِرَامًا کے لفظ کے اندر اس بات کی ضمانت ہے کہ کوئی خلافِ واقعہ بات نہیں لکھیں گے، جو کہو گے وہی لکھیں گے، جو کرو گے وہی لکھیں گے، تو اس میں کوئی گڑبڑ نہیں کریں گے، يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ: جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں، یہاں تو فعل کا ذکر ہے اور سورۂ ق کے اندر لفظ آیا تھا مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ: ایک لفظ بھی اگر تم زبان سے پھینکتے ہو تو اس کو بھی محفوظ کرنے والا ساتھ ہی بیٹھا ہوتا ہے۔

نیک و بد کا اَنجام

تو نہ تمہارا کوئی قول مخفی نہ تمہارا کوئی فعل مخفی، وہ سب ریکارڈ تیار کررہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ: ابرار

یہ "بَارّ" کی جمع ہے، باوفا قسم کے لوگ، نیک قسم کے جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، اچھے لوگ، نیک لوگ، باوفا قسم کے لوگ خوش حالی میں ہوں گے، نعیم: اچھی حالت، "خوش حالی میں ہوں گے، وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ: اور فاسق فاجر لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوں گے، سورۂ عبس کے آخر میں جس طرح سے لفظ آیا تھا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ، تو فَجَرَة بھی فاجر کی جمع ہے اور فُجّار بھی فاجر کی جمع ہے،" یہ فُجّار لوگ، فاسق فاجر لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوں گے، جحیم میں ہوں گے" یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ: جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ: اور وہ اس جہنم سے غائب ہونے والے نہیں ہوں گے، یعنی کوئی وقت نہیں آئے گا کہ یہ جہنم سے چھوٹ کر جہنم سے غائب ہوں، یہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا والی بات ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، اس سے غائب ہونے والے نہیں ہوں گے۔

قیامت کے دِن کسی کو کچھ اِختیار نہ ہوگا

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۙ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ: یہ مزید تہویل کے لئے ہے، ہول پیدا کرنا، "تجھے کیا پتا کہ جزا کا دِن کیا ہے؟ پھر تجھے کیا پتا کہ جزا کا دِن کیا ہے؟ تو نہیں سمجھ سکتا، جس وقت تک آنکھوں کے سامنے نہ آئے اس وقت تک اس کی حقیقت کو تو نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ہے جزا کا دِن، یہ دہشت پیدا کرنے کے لئے ایک عنوان ہے کہ بہت بڑی چیز ہے، اس کو معمولی نہ سمجھو۔ مختصری بات جو نقل کی جارہی ہے کہ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا: جزا کا دِن وہ ہے کہ جس دِن کوئی نفس کسی نفس کے لئے کچھ اختیار نہیں رکھے گا، آج تم اپنے شفعاء پر اعتماد کرتے ہو، اپنے بڑوں اور اپنے بزرگوں پر اعتماد کیے ہوئے ہو، یاد رکھو! وہ دِن ایسا ہوگا کہ کوئی نفس کسی نفس کے متعلق کچھ اختیار نہیں رکھے گا، وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ: اور حکم سارے کا سارا اس دِن اللہ ہی کے لئے ہوگا، حکم حکومت جو کچھ ہوگا سب اللہ کے لئے ہوگا، یوں نہیں ہوگا کہ اللہ کسی کو پکڑنا چاہے تو کوئی دُوسرا چھڑا لے، اللہ کسی کو چھوڑنا چاہے تو کوئی شکایت کرکے پکڑوا دے، ایسی بات نہیں ہوگی، سارے کا سارا حکم چلے گا تو اللہ کا چلے گا، کوئی کسی کے متعلق اختیار نہیں رکھے گا، ہاں! اللہ تعالیٰ اجازت دے گا تو کوئی بات کرسکے گا، جس کے متعلق اجازت دے گا بات کی جاسکے گی، دُوسری آیتوں کے اندر یہ مفہوم واضح ہے، بہرحال اصل بات یہی ہے کہ اس وقت سب کے اختیارات ختم ہوجائیں گے، دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اگر تم ایک دُوسرے کے لئے کچھ سہارا بنتے بھی ہو تو قیامت کے دِن یہ سارے سہارے ختم ہوجائیں گے، اور حکم اس دِن سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہوگا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

***

آیاتها ۳٦ ۸۳ سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ ۸٦ رکوعها ۱

سورۂ مطففین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳٦ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا

خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو کمی کرنے والے ہیں ۝ وہ لوگ کہ جب لوگوں سے کیل کر کر لیتے ہیں تو پورا پورا وصول کرتے ہیں ۝ اور جب

كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴

ان کو کیل کر کے دیتے ہیں یا ان کو تول کر دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں ۝ کیا ان کو اس بات کا خیال نہیں کہ یہ اُٹھائے جائیں گے ۝

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ

ایک بڑے دن کے لئے ۝ جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے رَبّ العالمین کے سامنے ۝ ہرگز ایسا نہیں! بے شک فاجروں کا نامۂ اعمال

لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۷ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝۸ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۹ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

البتہ سجین میں ہے ۝ اور آپ کو کیا معلوم کہ سجین کیا چیز ہے؟ ۝ وہ ایک نشان زدہ دفتر ہے ۝ خرابی ہے اس دِن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ

جھٹلانے والوں کے لئے ۝ جو کہ جھٹلاتے ہیں بدلے کے دِن کو ۝ نہیں تکذیب کرتا اُس (یوم دِین) کی مگر ہر حد سے بڑھنے والا

مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳

اور گناہگار ۝ جب اس کے اُوپر پڑھی جاتی ہیں ہماری آیات، کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ۝

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ

ہرگز ایسا نہیں! بلکہ جم گئے ان کے قلوب پر وہ کام جو یہ کرتے ہیں ۝ ہرگز ایسا نہیں، بے شک یہ لوگ اپنے رَبّ سے اس دِن

لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝۱۶ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ

البتہ پردے میں رکھے جائیں گے ۝ پھر یہ لوگ جہنم میں داخل ہونے والے ہوں گے ۝ پھر کہا جائے گا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی

تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٧﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ

تکذیب کیا کرتے تھے ⑰ ہرگز نہیں، بے شک نیکوں کا نامۂ اعمال البتہ علّیّین میں ہے⑱ آپ کو کیا معلوم کہ

مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ

علّیون کیا چیز ہے؟⑲ وہ نشان زدہ کتاب ہے⑳ حاضر ہوتے ہیں اُس میں مقربون㉑ بے شک نیک لوگ البتہ

نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾

خوش حالی میں ہیں㉒ تختوں کے اُوپر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے㉓ پہچانے گا تُو ان کے چہروں میں خوش حالی کی تروتازگی㉔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾

پلائے جائیں گے وہ خالص شراب سے جو مُہر زدہ ہوگی㉕ اس کی مُہر کستوری ہوگی، اس کو حاصل کرنے کے لئے چاہیے کہ رغبت کریں رغبت کرنے والے㉖

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا

اور اس شراب کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی㉗ وہ تسنیم ایک چشمہ ہے جس سے مقربون پئیں گے㉘ بے شک مجرم لوگ

كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَاِذَا

مؤمنوں کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے㉙ اور جب ان کے پاس سے گزرتے تھے تو آنکھوں سے اشارے کرتے تھے㉚ اور جب

انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ

وہ مڑ کے جاتے اپنے گھر والوں کی طرف تو مڑتے تھے باتیں بناتے ہوئے㉛ اور جب یہ مجرم لوگ ان مؤمنین کو دیکھتے تو کہتے کہ بے شک یہ لوگ

لَضَآلُّوْنَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ

البتہ بھٹکے ہوئے ہیں㉜ حالانکہ نہیں بھیجے گئے یہ لوگ ان پر نگران بنا کر㉝ اور آج مؤمن لوگ کافروں سے

يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

ہنسیں گے㉞ تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے㉟ یہ پکی بات ہے کہ کافر بدلہ دے دیے گئے ان کاموں کا جو یہ کیا کرتے تھے㊱

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ مطففین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۶ آیتیں ہیں۔ پچھلی سورت میں صراحت کے

ساتھ دوگروہوں کاذکرآیا تھا اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ، اس سورت میں بھی انہی دوگروہوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ آرہا ہے۔ اور یہ دو گروہ جو اِنسانوں کے بنیں گے وہ اس نکتے پر ہی بنیں گے کہ ایک گروہ آخرت کی تکذیب کرنے والا ہے، اور اس تکذیب کی وجہ سے اس نے اپنے کردار کو اچھا نہیں کیا، بُرے کردار کا وہ حامل رہا، اللہ تعالیٰ کے حقوق تلف کرتا رہا اور بندوں کے حقوق تلف کرتا رہا، اور ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بیان کے مطابق آخرت کا قائل ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا خیال اس کو ہر وقت رہتا ہے، جس کی بنا پر وہ بندوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے اور اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا ہے، اس اعتبار سے انسانوں کے دو گروہ بن جائیں گے، ایک فجار کا گروہ اور ایک اَبرار کا، تو اللہ تعالیٰ دونوں کا انجام اس سورت کے اندر واضح فرماتے ہیں، اور اِبتدا کے اندر ایک مسئلہ ذکر فرماتے ہیں جس کا تعلق حق العبد کے تلف کرنے کے ساتھ ہے۔

صحیح ماپ تول کی اہمیت اور اس میں خیانت کا نتیجہ

مُطَفِّفِین یہ لفظ تطفیف سے لیا گیا ہے۔ طَفَّفَ تَطْفِیْف: ناپنے تولنے میں کمی کرنا، ماپ تول میں کمی کرنا اس کو تطفیف کہتے ہیں۔ دُنیا میں ایک دوسرے کے حق ادا کرنے کا طریقہ جو شروع سے چلا آرہا ہے وہ کیل اور وزن ہے، ماپنا تولنا، پیمائش کرنا، کسی چیز کے ساتھ اندازہ کرنا، اس کے ساتھ اپنا صحیح حق وصول کیا جاتا ہے اور دوسرے کا صحیح حق ادا کیا جاتا ہے، یہ انسانوں کے اتفاق کے ساتھ بعض پیمانے قرار پاگئے لینے اور دینے کے لئے، جس وقت تک ان پیمانوں کو صحیح رکھا جائے اور لینے دینے کے وقت معیار دُرست ہو تو آپ جانتے ہیں کہ لوگوں کے حقوق محفوظ بھی ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کا حق تلف بھی نہیں ہوگا، اور جب ان پیمانوں کے اندر گڑبڑ کر دی جائے گی تو جب معیار ہی خراب ہو گیا تو اس کے بعد پھر حقوق کی ادائیگی یا حقوق کی وصول یابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، معاملات کا فساد یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ انسان لینے دینے میں خیانت کرنے لگ جائے، اپنا حق وصول کرتے وقت پورا پورا وصول کرے یا زیادہ وصول کرنے کی کوشش کرے، اور دوسرے کا حق ادا کرتے وقت اس میں کمی کرنے کی کوشش کرے، فساد یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ پچھلی اُمتوں کے واقعات جو تفصیل کے ساتھ آپ حضرات کے سامنے نقل کیے گئے ہیں ان میں سے خصوصیت کے ساتھ قومِ شعیب اہلِ مدین، اِن کا واقعہ قرآنِ کریم نے ذکر کیا، اور ان کی بربادی کے اندر ان کی اس عادت کو خاص طور پر دخیل قرار دیا ہے کہ ان کو تولتے وقت اور ناپتے وقت کمی کرنے کی عادت تھی، لوگوں کے حقوق وہ یوں تلف کرتے تھے، تاجر پیشہ قوم تھی، کاروباری لوگ تھے، جس وقت وہ دوسروں کو دیتے تو اس وقت کم دیتے تھے، سرورِ کائنات ﷺ نے وہ واقعہ جو بیان کیا تو اس سے بھی یہی تنبیہ کرنی مقصود ہے، اللہ تعالیٰ یہی سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ عادت اچھی نہیں، اس سورت کے اندر بھی اِبتدا میں اسی بات کو واضح کیا گیا ہے۔ سورت ''مکی'' ہے، تو مکہ معظمہ میں جو رہنے والے لوگ تھے قریش وہ بھی تاجر پیشہ تھے اور وہ بھی اس قسم کی گڑبڑ کرتے تھے جس پر یہاں تنبیہ کی گئی۔

تفسیر

ناپ تول میں ظالمانہ رویہ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ: مُطفّفين یہ تطفیف سے لے لیا گیا، وَیل: خرابی، بربادی، ''خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو کہ کمی کرنے والے ہیں'' ناپ تول میں کمی کرنے والے لوگوں کے لئے خرابی ہے، الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ: اِکتال: اپنے لیے کیل کرنا، یہ لفظ کیل سے لیا گیا ہے، کیل ووزن یہ دولفظ آتے ہیں فقہ کی کتابوں میں بھی، حدیث شریف کی کتابوں میں بھی، وزن ترازو کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اور کیل یہ کسی برتن کے ذریعے سے ماپ کر اندازہ کرتے ہیں، ٹوپے بنے ہوئے ہوتے تھے اُن کے پاس، اس کے ساتھ پیمائش کرتے تھے، اور ''صاع'' اور ''نصف صاع'' ان الفاظ کا ذکر جو آیا کرتا ہے، تو یہ برتن کی شکل کی چیز، جس طرح سے ہمارے ہاں بھی دُودھ ماپنے کے لئے بھی ایک برتن ہے، اور تیل بھی ایک پلی کے ذریعے سے اندازہ کر کے دیتے ہیں، یہ کیل کی ایک صورت ہے، کہ وزن نہ کیا جائے بلکہ کسی برتن کے ساتھ اندازہ کر لیا جائے، تو اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ کا معنی یہ ہے کہ لوگوں سے لیتے وقت کیل کرنا، ''جو لوگوں سے لیتے وقت کیل کرتے ہیں تو پورا پورا وصول کرتے ہیں'' جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا وصول کرتے ہیں، وَاِذَا كَالُوْهُمْ: اور جب ان کو کیل کر کے دیتے ہیں، اَوْ وَّزَنُوْهُمْ: یا ان کو تول کے دیتے ہیں يُخْسِرُوْنَ: تو گھٹا دیتے ہیں، لیتے وقت پورا لیتے ہیں اور دیتے وقت گھٹا کر دیتے ہیں، اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ لیتے وقت پورا لینا یہ کوئی عیب نہیں ہے، لیتے وقت کوئی شخص پورا لے تو یہ کوئی عیب نہیں، لیکن جو شخص لیتے وقت پورا لیتا ہے اس کے لئے اخلاقی طور پر بھی یہ فرض ہے کہ دیتے وقت بھی پورا دے، لیتے وقت پورا لینا اور دیتے وقت پورا نہ دینا یہ ایک ظالمانہ رویہ ہے، یا تو عادت یوں ہوتی کہ جب لیتا ہے تو بھی کم لیتا ہے، دیتا ہے تو بھی کم دیتا ہے، تو اگر ایک عیب ہے تو ایک خوبی بھی ہے، دیتے وقت کم دیتا ہے یہ عیب ہے تو لیتے وقت بھی کم لے لیتا ہے یہ خوبی بھی ہے، لیکن لیتے وقت تو وہ ایک رتی ماشہ بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو، اور دیتے وقت وہ ڈنڈی مارے اور دوسرے کے حق کو کم کر دے یہ بہت بُری بات ہے، اور اگر اس کا اور بھی زیادہ اضافہ ہو جائے کہ لیتے وقت زیادہ لیتا ہے اور دیتے وقت کم دیتا ہے، جس طرح سے کہ تاجروں کی عادت ہے کہ جب لینے کے لئے تولتے ہیں تو ڈنڈی ایسے طور پر مارتے ہیں کہ زیادہ وصول کر لیتے ہیں، اور جب دیتے وقت تولتے ہیں تو ڈنڈی یوں ماریں کہ کم دیں، تو اس کی مذمت تو آپ جانتے ہیں کہ پھر بالکل ہی نمایاں ہے، پورا لے کر کم دینا جس وقت یہ عیب ہے تو لیتے وقت زیادہ لینا اور دیتے وقت کم دینا یہ اس سے دوہرا عیب ہو جائے گا، تو یہاں اصل میں دیتے وقت کمی کرنے کی بُرائی بیان کرنا مقصود ہے جس میں شدت پیدا کر دی اس لفظ کے ساتھ کہ جب خود لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں، اس میں کمی نہیں کرتے، دیتے وقت کمی کرتے ہیں۔ ''مطففین وہ لوگ ہیں، کمی کرنے والے وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے کیل کر کے لیتے ہیں، جب لوگوں کے خلاف اپنے لیے کیل کرتے ہیں'' اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ، اپنے لیے جس وقت کیل کرتے ہیں لوگوں پر تو پورا پورا وصول کرتے ہیں، اور جس وقت اُن کو کیل کر کے دیتے ہیں یا اُن کو وزن کر کے دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں۔ یہ ہے تطفیف، کم تولنا، کم ماپنا۔ یہ عام طور پر ترازو یا ٹوپا جو استعمال ہو وہ بھی اس سے مراد ہے، اور اس کے

علاوہ جو بھی معیار قرار دے دیا جائے کسی حق کے وصول کرنے یا کسی حق کے ادا کرنے کا، جیسے گز ہو گئے، ذراع ہو گیا، کوئی اور معیار قرار دے گیا، اس میں خلل ڈالنا یہ سب تطفیف میں داخل ہے۔

''تطفیف'' کا تعلق صرف ماپ تول کے ساتھ نہیں

بلکہ مفسرین رحمہم اللہ نے یہاں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کیل و وزن تو ایک عنوان ہے ورنہ دوسرے کے حق کی ادائیگی کامل مکمل یہ ضروری ہے، جو بھی اس میں کمی کی جائے وہ تطفیف میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی کے ہاں مزدور جاتا ہے کام کرنے کے لئے، اور آٹھ گھنٹے کام کرنا طے ہوتا ہے، اور اس کے اُوپر اس کی اُجرت طے ہوتی ہے مثال کے طور پر بیس روپے، تو جس وقت وہ اُجرت وصول کرتا ہے تو بیس روپے وصول کرتا ہے، اس میں سے چار آنے چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں، لیکن جب کام کرتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ وقت بے کار گزار دے اور کام نہ کرے، کام میں چوری کرنے کی کوشش کرتا ہے، آٹھ گھنٹے کام نہیں کرتا بلکہ اگر دیکھا جائے تو آٹھ گھنٹے کی بجائے مجموعہ کام اس کا چار گھنٹے بھی نہیں ہے، کبھی حقہ پینے کے لئے بیٹھ گیا، کبھی سگریٹ پینے لگ گیا، کبھی پیشاب کے بہانے سے وقت گزار دیا، کبھی کسی کے ساتھ باتیں کرنے لگ گیا، کبھی ستانے کے لئے بیٹھ گیا، یوں کرتے کرتے وہ اپنا وقت ضائع کر دیتا ہے اور کام کا وقت بہت تھوڑا ہوتا ہے، حالانکہ طے ہوئے ہیں آٹھ گھنٹے، تو ایسی صورت میں یہ بھی تطفیف ہے کہ اپنا حق وصول کرتے وقت تو پورا وصول کر رہا ہے جتنے طے ہوا تھا، اور اس میں ذرا کمی کرنے کے لئے تیار نہیں، لیکن اس کے مقابلے میں جو چیز اس نے مالک کو دینی تھی، دُوسرے آدمی کو جو کام کر کے دینا تھا، وہ کام پورا کرتا نہیں، تو یہ بھی تطفیف میں داخل ہے، اور ایسے لوگوں کے لئے بھی خرابی اور بربادی ہے۔ اور یہی حال ہے ملازمین کا، چاہے وہ مدرّسین ہوں، چاہے دفتر میں کام کرنے والے ہوں، کوئی ہوں، جتنے گھنٹے کام تجویز ہو گیا اور اس کے مقابلے میں جو معاوضہ طے ہو گیا، معاوضہ تو پورا پورا وصول کرنے کی کوشش کریں، اس میں تو کمی کریں نہیں، اور کام سے وہ جان چرائیں، جی چرائیں، اور کام کریں نہیں، وقت اپنا فضول ضائع کر دیں، بے کار ضائع کر دیں، جو کام ذِمّے لگا ہے اس کو پوری ذمہ داری سے ادا نہ کریں، ایسی صورت میں وہ بھی عمل تطفیف ہے، اور اس کے لئے بھی ویل ہے، یوں یہ تعمیم ہو جائے گی، حاصل اس کا یہ نکلا کہ جو دوسروں سے تو اپنا حق پورا پورا وصول کریں اور دوسروں کو ان کا حق پورا پورا نہ دیں سب کے لئے بربادی کا اعلان کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص نماز اچھی طرح سے نہیں پڑھتا، وضو اچھی طرح سے نہیں کرتا، اس کے لیے بھی بعض آثار کے اندر تطفیف کا لفظ بولا گیا ہے،[1] کیونکہ وہ بھی اللہ کے حق کی ادائیگی ہے، نماز پڑھتے وقت آپ رُکوع اچھی طرح سے نہ کریں، اور اسی طرح سے سجدہ اچھی طرح سے نہ کریں، یا ذِکر اَذکار اچھی طرح سے ادا نہ کریں، تو گویا کہ آپ اللہ کا حق ادا کرنے کے اندر کمی کر رہے ہیں، جیسے کہ ایک روایت کے اندر نماز میں اسی قسم کے نقص کو چوری سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔[2] بہرحال اس میں تعمیم ہو گئی، حاصل اس کا یہ ہے کہ کامیاب وہی لوگ

(۱) موطأ امام مالک کے شروع میں باب جامع الوقوت میں ہے کہ ایک آدمی کی عصر کی جماعت فوت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے اسے فرمایا: طَفَّفْتَ۔

(۲) موطأ امام مالک، باب العمل فی جامع الصلاۃ / مشکوۃ ۱/ ۸۳ باب الرکوع، فصل ثالث۔ ولفظہ: اسوأ الناس سرقۃ الذی یسرق من صلاتہ۔ الخ

ہوں گے جو کہ دوسرے کا حق پورا پورا دیتے ہیں، اپنا حق لیتے ہیں، اور جو اپنا حق تو پورا پورا سختی سے وصول کریں لیکن دوسرے کے حق میں کمی کریں اور کوتاہی کریں ایسے لوگ کسی صورت میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور اُن کے لئے ویل ہے، وَیل: بربادی، خرابی، جس کے اندر سب کچھ ہی آ گیا جتنا بھی عذاب اور جتنی بھی سختی آخرت میں ہونے والی ہے۔

ناپ تول میں کمی سے رزق کم کیسے ہوتا ہے؟

اور حدیث شریف میں بھی سرورِ کائنات ﷺ نے اس عملِ تطفیف پر بہت کچھ بیان فرمایا، ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ جس قوم کے اندر کم ناپنے تولنے کا رواج پڑ جائے اللہ تعالیٰ اس کے رزق کے اندر کمی کر دیتے ہیں، رزق میں تنگی آ جاتی ہے،[1] لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید اس طرح سے ہم زیادہ کمائیں گے اور زیادہ کھائیں گے، لیکن سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنے والوں کے رزق میں کمی آ جاتی ہے۔ یہ دو باتیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زیادہ کما لیا اور اللہ کا رسول کہتا ہے کہ کمی آ گئی بسا اوقات یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اور یہی بات تھی جو قومِ شعیب علیہ السلام کی سمجھ میں نہیں آئی، وہ کہتے تھے کہ ہم تو کس طرح سے خسارے کی طرف جائیں کہ لوگوں کو پورا پورا دینے لگ جائیں، اور ہمیں اتنا نفع ہوتا ہے پھر ہمارا نفع کم ہو جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کا رزق وہی ہے جس سے وہ فائدہ اُٹھائے، اور جس سے وہ فائدہ نہ اُٹھائے وہ انسان کا رزق نہیں ہے، اور آج آپ دیکھتے ہیں کہ کمائے ہوئے مال سے جس کو اِنسان سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو کما لیا، جمع کر لیا، اس سے فائدہ اُٹھانے کی نوبت بہت کم آتی ہے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے رزق سے لوگوں کو محروم کر دیا ہے، بیماری ایسی لگا دی کہ گھر میں سب کچھ پڑا ہوا ہے لیکن کھانے کی اجازت نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس رزق بہت ہے لیکن کیا رزق ہے، وہ تو ایک بینک کا منیجر ہے جو سرمائے کو سنبھالے بیٹھا ہے، اور یہ سرمایہ پرایا ہے، یہ رزق تو اس کا ہے جو اس سے فائدہ اُٹھائے گا۔ کما لیتے ہیں، کمانے کے بعد پولیس کی نظر ہو گئی، کوئی مقدمہ ہو گیا، پولیس والے لے گئے، مقدمے کے اندر وکلاء کی فیسیں بھر دیں، بیمار ہو گئے ڈاکٹروں کو ادا کر دیا، اور اس قسم کی دوسری چیزیں جو اِنسان کے پاس رزق آتا ہے اور نکل جاتا ہے، فائدہ پہنچانے کی بجائے اُلٹا پریشانیوں کا باعث بن جاتا ہے، وہ اصل کے اعتبار سے بابرکت رزق نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے کمی کرنے کے مختلف طریقے ہیں، اور یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ سامنے رکھ دیا لیکن استعمال کرنے کی اجازت نہیں، اور آج زیادہ تر حال ایسے ہی ہے کہ جتنا انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ذات کے لئے بہت کم مفید ثابت ہوتا ہے، اکثر و بیشتر یہ فضولیات میں اُڑ جاتا ہے۔ تو بُرے اعمال کا نتیجہ اِس طرح سے دُنیا میں بھی سامنے آتا ہے اور آخرت میں بھی سامنے آئے گا۔ ''خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو کہ گھٹانے والے ہیں، جو جس وقت لوگوں سے اپنے لیے کیل کرتے ہیں تو پورا پورا کرتے ہیں، اور جب اُن کو کیل کر کے دیتے ہیں، ماپ کر دیتے ہیں، یا وزن کر کے دیتے ہیں تو گھٹاتے ہیں۔''

---

(۱) موطأ امام مالك. كتاب الجهاد باب ما جاء في الغلول / مشكوٰة ۲/۴۵۹، باب تغير الناس. ولا نقص قوم المكيال والميزان الا قطع عنهم الرزق.

اِنسان کے کردار پر عقیدۂ آخرت کا اثر

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ: یہ ان کے لئے تنبیہ ہے۔ ظَنَّ یَظُنُّ: خیال کرنا، گمان کرنا، یقین کرنے کے معنی میں بھی یہ آتا ہے، ''کیا ان کو اس بات کا خیال نہیں؟ وہ یہ سمجھتے نہیں؟ کہ یہ لوگ اُٹھائے جائیں گے ایک بڑے دن کے لئے جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے رَبّ العالمین کے سامنے'' کیا ان کو یہ دھیان نہیں ہے؟ یہ خیال نہیں ہے؟ اور بات بھی ایسے ہی ہے کہ اس بُرے عمل سے روکنے کے لئے سوائے عقیدۂ آخرت کے کوئی دُوسری چیز نہیں ہے، ورنہ لوگ اتنی چابک دستی کے ساتھ ڈنڈی مارتے ہیں کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس میں کمی کردی، ہاں! البتہ اگر ان کو یہ خیال ہوتا کہ ہم نے ایک دن اُٹھائے جانا ہے، ایک بڑے دن کے اندر اللہ کے سامنے ہماری پیشی ہوگی اور وہاں جاکے پورے کا پورا حساب ہوگا کہ کس کا حق ادا کیا اور کس کا حق ادا نہیں کیا؟ اگر یہ عقیدہ ہوتا تو وہ کبھی بھی یہ کام نہ کرتے، تو عقیدۂ آخرت ہے جو اِنسان کے کردار کو دُرست کرتا ہے، اور جس شخص کے دِل میں یہ خیال ہے کہ بس یہیں عیش اُڑالو جو اُڑانی ہے، صرف یہی زندگی ہے، مرنے کے بعد تو اُٹھنا ہی نہیں، کوئی حساب دینا ہی نہیں، تو وہ جو بھی چالاکی کرے کرسکتا ہے کرتا رہے گا، جب اُس کے دل میں یہ خیال ہی نہیں۔ تو اس لئے ان کو تنبیہ کی جارہی ہے جو ایسی کمی کرتے ہیں، ''کیا وہ سمجھتے نہیں؟ کیا اُن کو کوئی خیال نہیں ہے؟ کیا وہ گمان نہیں کرتے؟ کہ وہ اُٹھائے جائیں گے ایک بڑے دِن، جس دن کہ کھڑے ہوں گے لوگ رَبّ العالمین کے سامنے'' تو اگر ان کو یہ ظن ہوتا، اُن کو یہ گمان ہوتا، اُن کو یہ اندیشہ ہوتا تو کبھی اس قسم کی کمی نہ کرتے، تو ایسی حقوق تلفی انکارِ آخرت کی بنا پر ہی ہوتی ہے۔

بُرے لوگوں کا نامۂ اَعمال سجین میں ہے، ''سجین'' کا تعارف

كَلَّا: كَلَّا یہ ردع کے لئے آتا ہے، اگر ان کا یہ خیال ہے کہ یہ اُٹھائے نہیں جائیں گے تو یہ بات ہرگز دُرست نہیں، كَلَّا کے ساتھ ان کو ڈانٹ پڑگئی، اگر اُن کا یہ خیال ہے کہ اُٹھائے نہیں جائیں گے اور اسی طرح سے جو چاہیں کرتے رہیں ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں، تو ان کا یہ خیال دُرست نہیں ہے، كَلَّا: ہرگز ایسا نہیں، اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ: سجین: سجن کہتے ہیں قید کو، اور سجین یہ ایک مقام کا نام ہے، یوں سمجھئے کہ وہ ایک قسم کا قید خانہ ہی ہے، قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دفتر ہے جس کے اندر بُرے لوگوں کے نامۂ اَعمال محفوظ کیے جائیں گے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مقام ہے جس میں مرنے کے بعد بُرے لوگوں کی رُوحوں کو ٹھہرایا جاتا ہے، اور كِتٰبَ الْفُجَّارِ سے فاجروں کا نامۂ اَعمال مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ فاجروں کا نامۂ اَعمال البتہ سجین میں ہے، بُرے لوگوں کا نامۂ اَعمال سجین کے اندر محفوظ کردیا جائے گا، جس میں نہ کوئی کمی کا اندیشہ ہے نہ بیشی کا، جس طرح سے ایک چیز مرتب کرکے دفتر کے اندر محفوظ کردی جاتی ہے تاکہ جب مقدمہ پیش ہوگا، کیس آئے گا، تو اس وقت یہ مِسل نکال لی جائے گی، اسی طرح سے فاسقوں کا پورے کا پورا کردار مرتب کرکے سجین کے اندر رکھ دیا جاتا ہے نامۂ اَعمال کی شکل میں، ''بے شک فاجروں کا نامۂ اَعمال البتہ سجین میں ہے۔'' وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ: اور آپ کو کیا معلوم کہ سجین کیا چیز ہے؟ یہ ہول پیدا کرنے کے لئے ہے، كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ: وہ ایک نشان زدہ دفتر ہے، وہ دفتر ہے نشان زدہ، کتاب مکتوب کے معنی میں لکھا ہوا، تو گویا

کہ سجین ایک دفتر ہے جس کے اندر کافروں کے نامۂ اعمال کو درج کر دیا جاتا ہے، اسی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں وہ دفتر ہے وہیں ان اَرواحِ کُفّار اور اَرواحِ فجار کو مرنے کے بعد رکھا جاتا ہے۔ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ: نشان زندہ دفتر، نشان زدہ کتاب۔ کتاب: مکتوب، لکھی ہوئی چیز۔ مرقوم: نشان زدہ جس کے اُوپر مُہر کی ہوئی ہے۔ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ترجمہ یوں کیا ہے، وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ کہتے ہیں کہ سجین کے متعلق سوال کرنا مقصود نہیں، بلکہ یہ کتاب الفجار جس کا ذکر پہلے آیا تھا اسی کے متعلق یہ وضاحت ہے'' سجین میں رکھی ہوئی کیا چیز ہے آپ کو کیا معلوم'' مَا کتابُ سجین مضاف کو محذوف مان کر اُنہوں نے ترجمہ کیا ہے،'' سجین میں رکھی ہوئی کتاب کیا چیز ہے تمہیں کیا معلوم؟'' آگے جواب آ گیا کہ وہ ایک مہر شدہ کتاب ہے جو وہاں رکھ دی گئی ہے، اور جس کے اُوپر مہر ہو جائے تو اس میں کسی قسم کا تصرف یا کمی بیشی کا امکان نہیں ہوتا۔ تو یہ وضاحت اسی کتابِ فجار کی ہے، کتابِ فجار سجین میں رکھ دی گئی، اور آپ کو کیا معلوم کہ سجین میں رکھی ہوئی کتاب کیا چیز ہے؟ وہ کتاب مرقوم ہے جس کے اُوپر مُہر کر دی گئی، جس کے اُوپر نشان کر دیا گیا، محفوظ کر دی گئی، اب اس میں کوئی تصرف کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی، تو سجین کے اُوپر کتاب کا لفظ محذوف کر کے انہوں نے ترجمہ کیا ہے...... اور اگر محذوف نہ مانا جائے جس طرح سے کہ عام مترجمین نے کیا ہے تو پھر بھی بات صحیح ہے کہ آپ کو کیا معلوم کہ سجین کیا ہے؟ وہ سجین ایک نشان زدہ کتاب ہے جس کے اندر کُفّار کے نامۂ اعمال محفوظ کر دیے جاتے ہیں، نامۂ اعمال درج کر دیے جاتے ہیں۔

''یوم الدین'' کی تکذیب کون کرتا ہے؟

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: اُس دن مکذبین کے لئے ویل ہے، وَیل: وہی خرابی،'' جھٹلانے والوں کے لئے خرابی ہے'' يَّوْمَىِٕذٍ: یوم اِذْ کان کذا، جس دِن لوگ رَبّ العالمین کے لئے اُٹھائے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، جس دِن یہ واقعہ پیش آئے گا تو'' اس دِن مکذبین کے لئے بڑی خرابی ہوگی جو یوم الدین کی تکذیب کرتے ہیں'' اور اس کی تکذیب کی بنا پر وہ لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہیں، اور حقوق کی ادائیگی نہیں کرتے، مکذبین کے اندر یہ سارے آ جائیں گے، یہ فجار کا عنوان ہے، کیونکہ فسق وفجور کی اصل اسی تکذیب پر ہے، فسق وفجور اسی تکذیب کی بنا پر ہی ہوتا ہے۔'' خرابی ہے اس دِن جھٹلانے والوں کے لئے جو کہ جھٹلاتے ہیں بدلے کے دِن کو'' جو بدلے کے دِن کو جھٹلانے والے ہیں، دِین سے بدلہ مراد ہے، وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ: معتدی اِعتداء: حد سے بڑھنے والا، حد سے تجاوز کرنے والا، اثیم: کہتے ہیں گناہ گار کو، یہ دو لفظ بولے گئے کیونکہ لوگوں کی بدکرداری کے یہ دو شعبے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ آپ کے ذِمّے جو حقوق ہیں وہ آپ ادا نہ کریں، اس کو دبا جائیں، اس اعتبار سے آپ اثیم ہیں، اور ایک ہے کہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی کوشش کریں، دوسروں سے چھینیں، اس اعتبار سے معتدی ہیں، معتدی: دُوسروں پر ظلم کرنے والا، جو دُوسروں سے ان کے حقوق چھین لیتا ہے، اور اثیم: گناہ گار جو دُوسروں کے حق ادا نہیں کرتا، ''ہر معتدی اور اثیم یہ ہے یوم دِین کی تکذیب کرنے والا'' مطلب یہ ہے کہ کوئی اچھا آدمی سمجھ دار جس کے اندر عدل وانصاف کی صفت ہو وہ یوم دِین کی تکذیب نہیں کر سکتا، اس کی توصاف فطرت اس بات کو پکار پکار کر کہتی ہے کہ عدل اور انصاف ضروری ہے،

جس طرح سے انسانوں کے لئے ضروری ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس کے اوپر جزا اور سزا بھی مرتب کرے گا، آج جو لوگوں کے حقوق ادا نہیں کرتے ایک وقت ضرور آئے گا جب اللہ تعالیٰ انصاف کے ساتھ اُن کے حقوق ادا کرائیں گے، اگر ایسا دِن نہ آئے تو دُنیا کے اندر ظالم اور منصف یہ دونوں اپنی زندگی گزار کے ختم ہوجائیں گے، برابر ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کے عدل کا یہ تقاضا نہیں ہے، تو یوم دِین کی تکذیب وہی کرسکتا ہے جو معتدی ہے اور اثیم ہے، ہر حد سے تجاوز کرنے والا گنہگار تکذیب کرتا ہے یومِ دِین کی، ''نہیں تکذیب کرتا اُس یومِ دِین کی مگر ہر حد سے بڑھنے والا اور گنہگار'' یعنی حد سے بڑھنے والا اور گنہگار ہی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو یومِ دِین کی تکذیب کرے، ورنہ جو شخص دوسروں کے حقوق کی رعایت رکھنے والا ہے، عدل وانصاف اُس کی طبیعت میں موجود ہے، وہ تو یومِ دِین کا اعتقاد رکھے گا، وہ کہے گا کہ یقیناً اگر ہم نے اس قسم کی گڑبڑ کی تو اللہ تعالیٰ بدلہ دیں گے، اور آج ہم حقوق ادا کرتے ہیں اور دوسرے ہمارے حقوق ادا نہیں کرتے تو آخر ایک دِن آئے گا جب انصاف کے ساتھ اس کی تلافی کردی جائے گی، تو اُن کی تو فطرت کی آواز یہ ہوتی ہے کہ یومِ دِین کا عقیدہ رکھیں۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: عَلَيْهِ کی ضمیر مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ کی طرف لوٹ رہی ہے ''جب اس کے اُوپر پڑھی جاتی ہیں ہماری آیات، کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں'' اساطیر اُسطورۃ کی جمع، یہ بھی اُس کی ایک تکذیب کی بات ہوئی، نہ تو خود اپنی عقل کے ساتھ اور اپنی فطرت کی آواز کی بنا پر وہ یومِ دِین کا عقیدہ رکھتا ہے، اور نہ ہی رسولوں کے سمجھانے سے سمجھتا ہے، جب اس کے سامنے یہ آیات نقل کی جاتی ہیں جو کہ قیامت کا اِثبات کرنے والی ہیں، یا بدکرداری کے طور پر تباہ ہونے والی قوموں کے جب واقعات اس کو سنائے جاتے ہیں، جس کے ساتھ یہ عقیدہ صحیح ہونا چاہیے کہ جس طرح سے یہ بدکرداری دُنیا کے اندر عذاب کا باعث بنی آخرت میں بھی عذاب کا باعث بنے گی، تو یوں کہہ کے ٹال جاتا ہے کہ کیا ہے؟ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، پہلے بھی لوگ ایسی باتیں کیا کرتے تھے، کس نے مرنا کس نے جینا، جو کچھ ہے بس اسی دُنیا میں ہے، اس طرح سے کہہ کر اس بات کو اُڑا دیتا ہے۔ ''جب پڑھی جاتی ہیں اِس کے اُوپر ہماری آیات، کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔''

تکذیب کی اصل وجہ

كَلَّا: ہرگز ایسا نہیں، یعنی اگر وہ تکذیب کی بنیاد اس کو بناتا ہے کہ یہ قصے کہانیاں ہیں تو اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، جزا کے متعلق اگر اُس کا خیال ہے کہ یہ واقع نہیں ہوگی تو كَلَّا: ہرگز ایسا نہیں ہے، بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: بلکہ جم گئے ان کے قلوب پر وہ کام جو یہ کرتے ہیں، مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: جو کام یہ کرتے ہیں، اس سے اُن کے بُرے کام مراد ہیں جو اِعتداء اور اِثم کے تحت ذکر کئے گئے ہیں، کرتے کرتے اِن کے دِلوں کو زنگ لگ گی، جب ان کے دِلوں کو زنگ لگ گیا تو اب یہ کسی حقیقت کو سمجھنے پہ قادر ہی نہیں، دِل ان کے سیاہ ہوگئے ہیں، یہ وجہ ہے اِن کے انکار کی، ورنہ یہ نہیں کہ ان کے پاس کوئی مضبوط دلیل موجود ہے، یا اِثباتِ یومِ قیامت کے لئے کوئی مضبوط دلیل ان کے سامنے نہیں آئی، ایسی بات نہیں ہے، بہت مضبوط دلائل کے ساتھ اِثباتِ قیامت کردیا گیا، اور ان کے سامنے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بس یہی ایک بات ہے کہ انہوں نے اتنی بدکرداریاں اختیار کیں

کہ اب ان کے دِل کی اِستعداد ختم ہوگئی اور ان کے دِل کے اُوپر اُن اعمال کا زنگ چڑھ گیا، اور بُرائی کرتے کرتے جس وقت ایک آدمی بُرائی کا عادی ہوجاتا ہے تو وہی بُرائی اس کو اچھی نظر آنے لگ جاتی ہے، پھر ہزار اُس کی بُرائی سمجھائی جائے وہ سمجھ میں نہیں آتی، یہ علامت ہوتی ہے کہ اب اس کا قلب جو تھا وہ مسخ ہوگیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ابنِ آدم جس وقت کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دِل کے اُوپر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کرلے اور اپنے اس کیے کے اُوپر نادم ہوجائے تو اس کا دِل صاف کردیا جاتا ہے، اور اگر وہ دوبارہ پھر بُرائی کرتا ہے تو اور نکتہ لگ گیا، پھر بُرائی کرتا ہے تو اور سیاہی چڑھ گئی، حتیٰ کہ سارے کا سارا دِل سیاہ ہوجاتا ہے، پھر اس میں اچھائی بُرائی کی تمیز اُٹھ جاتی ہے، فرمایا کہ یہی ہے وہ ران جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے[1] کہ بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، ان کے دِلوں کے اُوپر جم گئی وہ چیز جو وہ کرتے ہیں، یہ ہے وجہ ان کی تکذیب کی، ورنہ یہ بات نہیں کہ ان کے سامنے کوئی دلیل نہیں آئی۔ كَلَّا سے ردع ہوگیا کہ ان کو تکذیب بالکل نہیں کرنی چاہیے، جیسے یہ کہتے ہیں کہ یومِ جزا نہیں آئے گا، ہرگز ایسی بات نہیں ہے، اِن کا یہ انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں، بلکہ جو کچھ یہ کررہے ہیں وہی ان کے دِلوں کے اُوپر بطورِ زنگ کے لگ گیا اور اس سے ان کی حق سمجھنے کی اِستعداد ختم ہوگئی۔

کافر دِیدارِ الٰہی سے محروم، جبکہ مؤمنین کو دِیدار نصیب ہوگا

كَلَّا: یہ پھر اسی طرح پہلے ردع کی تاکید ہے، ان کو ہرگز ایسا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ قیامت کا دن نہیں آئے گا، یا ان کو ان کے بُرے اعمال پر سزا نہیں ہوگی، ہرگز ایسا نہیں ہے، اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ: بے شک یہ لوگ اپنے رَبّ سے اُس دِن البتہ پردے میں رکھے جائیں گے، محجوب ہوں گے، حجاب میں رکھے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کا یہ جلوہ نہیں دیکھ سکیں گے، زیارت نہیں کرسکیں گے، جبکہ مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی اور سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت سے اِستدلال کیا ہے[2] کہ مؤمنین قیامت کے دِن اپنے رَبّ کو دیکھیں گے، وہ کہتے ہیں کہ اگر مؤمنین بھی پردے میں ہوں اور اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھیں تو پھر کافروں کے لئے یہ کون سی وعید ہے کہ ان کو پردے میں رکھا جائے گا اور یہ اللہ کو دیکھ نہیں سکیں گے، ''اللہ کو دیکھ نہیں سکیں گے'' یہ وعید کافروں کے لئے تبھی بن سکے گی جس وقت کہ ہم کہیں کہ مؤمنین حجاب میں نہیں ہوں گے، وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کریں گے، اللہ کی زیارت کریں گے، تو اسی سے مفہومِ مخالف کے طور پر یہ بات نکلتی ہے، فقہی مسائل میں مفہومِ مخالف حُجت نہیں، وعد و وعید کے اندر مفہومِ مخالف بالاتفاق حُجت ہے، جیسا کہ آپ کے سامنے ختم الدخان کے اندر ذکر کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ان کے اُوپر آسمان و زمین رویا نہیں، جب یہ فرعونی ڈوب گئے تو نہ زمین روئی نہ آسمان رویا، تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کے اُوپر زمین بھی روتی ہے آسمان بھی روتا ہے، جیسے حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ جب ایک مؤمن صالح مرتا ہے تو زمین کے جس جس حصے کے اُوپر وہ عبادت کیا کرتا

---

(۱) ترمذی ۲/۱۷۱، تفسیر سورۃ المطففین/مشکوٰۃ ۱/۲۰۴ باب الاستغفار، فصل ثانی۔

(۲) مشکوٰۃ ۲/۵۰۲ باب رؤیۃ اللہ، فصل ثالث/ نیز تفسیر بغوی، قرطبی، خازن، مظہری، وغیرہ۔

تھا وہ زمین بھی روتی ہے (درمنثور وغیرہ)، اور اسی طرح حدیث شریف میں آتا ہے کہ آسمان کا وہ دروازہ جہاں سے اس کے اعمال اُوپر جاتے تھے اور وہ دروازہ جہاں سے اس کا رزق اُترتا تھا، دونوں دروازے اس پر روتے ہیں جس وقت وہ مرتا ہے، اور اس مضمون کو بیان کرنے کے بعد حضور ﷺ نے اِستدلال اُسی آیت سے کیا ہے جو فرعونیوں کے بارے میں آئی ہوئی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد نہ آسمان رویا نہ زمین روئی،[1] تو وہاں سے بھی اِستدلال ایسے ہی ہے کہ اگر مؤمنین صالحین کے اُوپر زمین وآسمان نہیں روتے تو پھر فرعونیوں کے بارے میں یہ کہنے کی کیا گنجائش ہے کہ ان پر نہ زمین روئی نہ آسمان رویا، یہ ان کی مذمت تبھی تو بنے گی جب ہم یہ کہیں کہ مؤمنین صالحین پر زمین بھی روتی ہے اور آسمان بھی روتا ہے۔ وہی بات یہاں ہے کہ کافروں کو پردے میں رکھا جائے گا یہ علامت ہے اس بات کی کہ مؤمنین پردے میں نہیں ہوں گے، ورنہ مؤمنین بھی پردے میں ہوں اور کافر بھی پردے میں ہوں تو پھر یہ کافروں کے لئے کون سی مذمت کی بات ہے۔ جیسے لَا یُكَلِّمُهُمُ اللهُ (سورۂ آل عمران: ۷۷) اللہ تعالیٰ ان سے بولے گا نہیں، کلام نہیں کرے گا، تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ محبت اور شفقت سے باتیں کریں گے۔

دِیدارِ اِلٰہی سے محرومی کافروں کے لئے سزا کیسے ہے؟

اور اِس سے ایک یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، چاہے اس دُنیا کے اندر آکر اپنے غلط کردار کی بنا پر وہ اس صلاحیت کو ختم کردے اور قلب کے اندر یہ چیز محسوس نہ ہو، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہر انسان کو ہے، فطرت کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ اپنے خالق اور اپنے محسن کے ساتھ محبت نہ ہو تو اور کس کے ساتھ ہوگی؟ تو قیامت کے دِن جب یہ حجاب اُٹھ جائیں گے، یہ حقیقتیں انسان کے سامنے نمایاں ہوجائیں گی، خالق، مالک ہونا سمجھ میں آجائے گا، تو پھر بڑی تڑپ ہوگی اپنے خالق اور مالک کو ملنے کی، تو کافروں کا اللہ تعالیٰ سے پردے میں رکھا جانا یہ مستقل ایک سزا ہے، کہ اُن کے دِل میں تڑپ ہوگی کہ ہم اپنے خالق، مالک کو دیکھیں، اپنے محسن کی زیارت کریں، لیکن ان کو زیارت کا موقع نہیں دیا جائے گا، اور ان کے دِل کے اندر تڑپ ہوگی کہ ہم اپنے اللہ سے باتیں کریں لیکن اللہ تعالیٰ ان سے بات نہیں کرے گا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اُن کے دِل میں بھی اللہ کی محبت ہے، لیکن انہوں نے یہاں آکر اس کے اُوپر دُنیا کی گردوغبار چڑھا دی جس کی بنا پر اُس کا احساس نہیں رہا، اور قیامت کے دِن جس وقت یہ موانع اُٹھ جائیں گے تو پھر صحیح بات سامنے آجائے گی، تو ہر انسان اپنے دِل کے اندر تڑپ محسوس کرے گا اللہ کو دیکھنے کی، اللہ سے باتیں کرنے کی، لیکن بطورِ سزا کے کافروں کو اس بات سے محروم کردیا جائے گا۔ تو یہاں سے یہ اِستدلال بالکل صحیح ہے کہ مؤمنین اللہ کو دیکھیں گے اور کافر پردے میں رکھے جائیں گے، کیونکہ اگر مؤمن بھی پردے میں رکھے جائیں تو پھر کافروں کے لئے یہ کوئی مذمت نہیں بنتی۔ اِمام مالک رضی اللہ عنہ نے یہیں سے اِستدلال کیا ہے اللہ تعالیٰ کی رُؤیت کے بارے میں قیامت کے دِن مؤمنین کے لئے۔ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ: پھر یہ لوگ جہنم میں داخل ہونے والے ہوں گے، ثُمَّ

---

(۱) ترمذی ۲/۱۶۱، تفسیر سورۃ الدخان/ مشکوٰۃ ۱/۱۵۱، باب البکاء علی المیت، فصل ثانی۔ مَا مِنْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَلَهٗ بَابَانِ بَابٌ يَصْعَدُ مِنْهُ عَمَلُهٗ وَبَابٌ يَنْزِلُ مِنْهُ رِزْقُهٗ...الخ۔

يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ: پھر کہا جائے گا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے، ہم تمہیں بار بار سمجھاتے تھے اور تم جھٹلاتے تھے، آج دیکھ لو یہی وہ چیز ہے، تو جب جہنم کے اندر واقع ہوں گے بات اچھی طرح سے سامنے آجائے گی۔

نیک لوگوں کا نامۂ اَعمال علّیّین میں ہے، ''علّیّین'' کا تعارف

كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ: آخرت کے انکار کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو یہ ہوتا ہے کہ بُروں کو سزا نہیں ملے گی، دوسرا پہلو یہ ہے کہ نیکوکاروں کو جزا نہیں ملے گی، تو پہلے ردع اس بات پر تھا کہ بُرے لوگ یہ سمجھیں کہ سزا نہیں ہوگی، اور اَب ردع اس بات پر ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ نیکی کرنے والوں کو بھی آخرت میں کوئی بدلہ نہیں ملے گا، ایسی بات ہرگز نہیں ہے، نیکوں کو اچھا بدلہ ملے گا، قیامت ضرور آئے گی، جیسے یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں آئے گی اور نیکوں کی نیکی ضائع ہوجائے گی ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ: علّیّین سجّین کے مقابلے میں آگیا، یہ عُلُوّ سے لیا گیا ہے، علو: بلندی، عالی شان ہونا، یہاں بھی علّیّین اسی طرح سے ایک دفتر ہے جس میں مؤمنین صالحین کے نامۂ اَعمال رکھے جاتے ہیں، اور وہیں ایک مقام ہے کہ جہاں مرنے کے بعد ارواحِ مؤمنین کو ٹھہرایا جاتا ہے، اور آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سجّین یہ تحت الارض ہے زمین کے نیچے، اور علّیّین یہ فوق السماوات ہے اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے، اَرواح وہاں ٹھہرائی جاتی ہیں، لیکن وہاں ٹھہرانے کے باوجود جہاں ان کا جسد مدفون ہوتا ہے یعنی قبر، وہاں بھی ان کا تعلق قائم رہتا ہے، جس تعلق کی بنا پر ان کو اس برزخ کے اندر بھی جزا اور سزا کا احساس ہوتا ہے۔ إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ: بے شک نیکوں کا نامۂ اَعمال البتہ علّیّین میں ہے، وَمَا أَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ: آپ کو کیا معلوم کہ علیون کیا چیز ہے، یہ جمع سالم والا وزن ہے، عِلِّيِّيْنَ میں جری حالت آگئی، عِلِّيُّوْنَ یہ رفعی حالت آگئی، یہاں بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ دیسے ہی کیا ہے کتاب کے لفظ کے محذوف مان کر'' آپ کو کیا معلوم کہ علّیّین میں رکھی ہوئی کیا چیز ہے۔'' كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ: وہ نشان زدہ کتاب ہے، یعنی وہ کتاب ہے جس کے اُوپر نشان لگا دیا گیا، اس پر مُہر کردی گئی، تاکہ اس میں کوئی کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جاسکے، جو بھی کیا ہے اس کو محفوظ کردیا گیا۔ اور عام مترجمین نے اس طرح سے ترجمہ کیا ہے کہ آپ کو کیا معلوم علّیّین کیا چیز ہے؟ وہ ایک نشان زدہ کتاب ہے۔ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ: مشاہدہ کرتے ہیں اس کتابِ مرقوم کا مقربون، یا حاضر ہوں گے اس علّیّین میں مقربون، مقربون سے فرشتے بھی مراد ہوسکتے ہیں، وہ وہاں حاضر ہوتے ہیں، مؤمنین صالحین کا نامۂ اَعمال دیکھتے ہیں، يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ: حاضر ہوتے ہیں اُس علیون میں مقربون، یا، مشاہدہ کرتے ہیں اُس کتابِ مرقوم کا مقربون، اچھے لوگ، مقرب فرشتے، نیک لوگوں کے نامۂ اَعمال کو مقرب فرشتے دیکھتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں، ''ہٗ'' کی ضمیر کتابِ مرقوم کی طرف چلی گئی، اور اگر علیون اور کتابِ مرقوم کا مصداق ایک ہی ہو تو ''ہٗ'' ضمیر مفرد علیون کی طرف لوٹ سکتی ہے کتابِ مرقوم کی تاویل کے ساتھ، ''مشاہدہ کرتے ہیں اُس کا مقربون، یا، حاضر ہوتے ہیں وہاں مقربون۔''

نیک لوگوں کے لئے اِنعامات

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ: پیچھے کُفّار کے بارے میں آیا تھا إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ، اور یہاں آگیا کہ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ منعمہ

خوش حالی کو کہتے ہیں، اور ابرار یہ بار کی جمع ہے باوفا لوگ، احکام کو پورا کرنے والے، نیکی کرنے والے، یہ "بار" کا مصداق ہیں، "بَرّ" یا "بار" کی جمع ہے، "بے شک نیک لوگ البتہ خوش حالی میں ہیں" عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُونَ: ارائک اریکۃ کی جمع ہے، اریکہ تخت کو کہتے ہیں جو مزین ہو، گدے ودے ڈال کے، اس کے اُوپر کپڑے ڈال کے اُس کو مزین کردیا گیا ہو، تختوں کے اُوپر بیٹھے نظارہ کررہے ہوں گے، یَنْظُرُونَ: دیکھتے ہوں گے، کس چیز کو دیکھتے ہوں گے؟ جیسے باغ میں بیٹھا ہوا انسان اردگرد بہار دیکھتا ہے، پھلوں کو دیکھتا ہے، پھولوں کو دیکھتا ہے، رونق دیکھتا ہے، اس کی طبیعت میں خوشی آتی ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا بھی نظارہ کررہے ہوں گے، "تختوں کے اُوپر بیٹھے نظارہ کررہے ہوں گے۔" تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ: نعیم کا وہی معنی خوش حالی، نضرۃ کہتے ہیں تروتازگی کو، وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ یہ لفظ سورۂ قیامہ میں بھی آیا تھا، "پہچانے گا تو ان کے چہروں میں خوش حالی کی تروتازگی" پہچانے گا تو ان کے چہروں میں، یہ ایسے ہی ہے کہ دُنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے دِل کے اندر بشاشت ہو اور اچھے خیالات ہوں تو چہرہ بھی پُررونق نظر آتا ہے، یعنی ان کا خوش حالی کا اثر صرف یہ نہیں کہ دِل میں سرور ہوگا، بلکہ چہرے بھی پُررونق ہوں گے، اور چہروں پر بھی اُس سرور کی کیفیت کا آپ مشاہدہ کریں گے، یہ خطاب ہر کسی کو ہے، ہر دیکھنے والے کو: "پہچانے گا تو اُن کے چہروں میں خوش حالی کی تروتازگی" یعنی خوش حال ہوں گے، وہ خوش حالی اُن کے چہروں پر بھی نمایاں ہوگی۔ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ: خَتَمَ: مُہر لگانا، مختوم: مُہر لگائی ہوئی، رحیق کہتے ہیں صاف شفاف شراب کو، "پلائے جائیں گے وہ مُہر زدہ شراب سے" مُہر زدہ کا مطلب یہ ہوتا ہے یہ دُنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ شربت وغیرہ بوتل میں بند کرکے اُوپر کوئی مصالحہ لگاکے اچھی طرح سے اس کو بند کردیا جاتا ہے تاکہ باہر کا گردوغبار اور ہوا وغیرہ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے، عام طور پر رواج ہے کہ لاکھ لگا دیتے ہیں اور لاکھ لگانے کے ساتھ وہ مُہر زدہ ہوجاتی ہے، تو آخرت میں بھی اسی طرح سے وہ بوتلیں جو بھری ہوں گی وہ بھی مُہر زدہ ہوں گی، لیکن مُہر ان کے اُوپر کسی مٹی یا لاکھ کے ذریعے سے نہیں لگی ہوئی ہوگی خِتٰمُهٗ مِسْكٌ: اس کی مُہر کستوری ہوگی، کستوری کے ساتھ اُس کو بند کیا ہوا ہوگا، ختام، اس کا مُہر لگانا کستوری ہوگا، اس کی مُہر کستوری ہوگی، یعنی یہاں دُنیا میں جس طرح سے منہ وغیرہ بند کرنے کے لئے لاکھ استعمال ہوتی ہے یا کوئی اور چیز استعمال ہوتی ہے تو وہاں اس کی جگہ کستوری آئے گی۔ "پلائے جائیں گے وہ خالص شراب سے جو کہ مُہر لگائی ہوئی ہوگی اور اس کی مُہر کستوری ہوگی۔"

دُنیا کی بجائے آخرت کی نعمتوں کی طرف رغبت کرنی چاہیے

وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ: متنافسون یہ تنافس سے لیا گیا ہے، تنافس کا معنی ہوتا ہے ایک دوسرے کے مقابلے میں کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا، ایک چیز آپ کے سامنے آئی اور آپ میں سبقت ہوجاتی ہے، وہ کہتا ہے میں اس کو حاصل کروں، وہ کہتا ہے میں اس کو حاصل کروں، دُنیا کے اندر آپ صبح شام رات دن تنافس دیکھتے ہیں اَموالِ دُنیا کو حاصل کرنے کے لئے، مقابلہ لگا ہوا ہے، جس آدمی کو دیکھو کوشش کرتا ہے کہ میں دُوسرے کے مقابلے میں زیادہ حاصل کروں، تاجر بیٹھا ہے تو اس کا یہی جذبہ ہے، کاشت کار کھیتوں میں کام کررہا ہے تو اس کا یہی جذبہ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں میری فصل اچھی ہو، تو یہ

تنافس ہے دُنیا کے مال کے حاصل کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ چیز ہے جس کے بارے میں تمہارے اندر تنافس ہونا چاہیے، اور اس کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرو، ذٰلِكَ کا اشارہ اِس رحیق مختوم کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور نعیم کی طرف بھی ہوسکتا ہے، یہ خوش حالی جو آخرت میں آنے والی ہے اس کی طرف ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت کرنی چاہیے، یہ ہے حاصل کرنے کی چیز کہ اس کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرو، باقی! دُنیا کی نعمتیں یا دُنیا کا مال دولت تنافس کے قابل نہیں، یہاں تو اتنا سوچو جس کے ساتھ اپنا عافیت سے وقت گزرتا چلا جائے، اگر تم دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حاصل بھی کرلوگے تو یہ لاحاصل ہے، وجہ کیا ہے؟ وجہ تو وہی ہے کہ آپ نے تو اپنی ضرورتیں پوری کرنی ہیں، باقی جتنا زیادہ جمع کرلوگے چھوڑ کے چلے جاؤ گے، اُلٹا حساب کا وبال آپ کے سر پہ رہ جائے گا، تو دُنیا کے مال ودولت میں کبھی انسان اس طرح سے نہ سوچے کہ میں دُوسرے کے مقابلے میں زیادہ حاصل کروں، وہاں دیکھنی چاہئیں صرف اپنی ضروریات، اتنا حاصل کرنے کی کوشش کرو جس سے اپنی ضرورت پوری ہوتی چلی جائے، کوئی کتنا کما رہا ہے، کوئی کتنا کما رہا ہے، اس میں آپ غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں، بس آپ اپنی ضرورتوں کو سامنے رکھیں، یہاں (دُنیا میں) تنافس انسان کو بُرائی کی طرف لے جاتا ہے، جب دوسروں کے مقابلے میں آپ زیادہ کمانا چاہیں گے تو لازماً آپ غلط طریقے بھی اختیار کریں گے، اور زیادہ سے زیادہ اِس دُنیا کمانے میں کھپ جائیں گے جس سے اور کمالات حاصل کرنے کا آپ کو وقت نہیں ملے گا، ہاں! البتہ آخرت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ جو دائماً آپ کے لئے رہیں گی، ہر طرح سے سرور اور لذت کا باعث ہوں گی، کوئی ان میں کدورت نہیں ہوگی، تو یہ چیز ہے کہ جس کی طرف زیادہ سے زیادہ رغبت ایک دوسرے سے بڑھ کر کرنی چاہیے، "اس کو حاصل کرنے کے لئے چاہیے کہ رغبت کریں رغبت کرنے والے، تنافس کریں تنافس کرنے والے" یعنی ایک دوسرے سے بڑھ کر حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ: اور اس شراب کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی، مزاج: جس طرح سے دُنیا کے اندر کہتے ہیں کہ شرابی شراب پیتے وقت اس میں پانی یا کوئی دُوسری چیز ملاتے ہیں، تو وہاں اس میں جو ملاوٹ ہوگی وہ تسنیم سے ہوگی، عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ: وہ تسنیم ایک چشمہ ہے جس سے مقربون پئیں گے، مقربون کو وہاں خالص تسنیم سے پانی پینے کے لئے ملے گا، اور عام اَبرار کو شراب میں ملاوٹ کے طور پر ملے گا۔ عَيْنًا یہ منصوب ہوجائے گا یَعْنِیْ کے ساتھ، یہ تَسْنِيْمٍ کا بیان ہے، "یعنی وہ ایک چشمہ ہے جس سے کہ مقربون پیتے ہیں۔"

مشرکینِ مکہ کا اہلِ ایمان کے ساتھ تحقیرانہ رویہ اور پھر اس پر فخر

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ: بے شک وہ لوگ جو مجرم ہیں، اَجْرَمُوْا: جو جرم کرتے ہیں، مجرم لوگ، جو سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں، "بے شک مجرم لوگ مؤمنوں سے ہنسا کرتے تھے، مؤمنوں کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔" دُنیا کے اندر یہ دوگروہ جو ہوگئے، ایک مجرمین کا گروہ اور ایک مؤمنین کا، اور مکہ معظمہ میں جس وقت یہ دونوں گروہ نمایاں ہوئے تھے تو یہ واقعہ تھا کہ مشرک ہر وقت ان پہ پھبتیاں کستے، اُن کا استہزا کرتے، اور مختلف قسم کی باتیں اُن کے متعلق کرتے، ان کو دیکھتے تو مذاق

اُڑاتے، پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے یوں اشارہ کرتے کہ دیکھو! یہ کیسے پاگل لوگ ہیں، ایک شخص کے پیچھے لگ کر اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا، آخرت کی اُدھار پر دُنیا کی مصیبتیں مول لے لیں، اس قسم کی باتیں کرتے اور آنکھوں سے اشارے کر کر کے ان کی تحقیر کرتے۔ جیسے آج بھی بازاری لوگ جو آخرت سے غافل ہیں اہلِ مذہب کا یونہی مذاق اُڑاتے ہیں اور ان کے اُوپر یونہی پھبتیاں کستے ہیں، اسی طرح سے ہنستے ہیں، تو یہاں اَلَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کے اندر یہ سب لوگ داخل ہیں، ''بے شک وہ لوگ جو جرم کرتے ہیں، جنہوں نے جرم کیا وہ مؤمنین کے اُوپر ہنستے تھے، جب ان کے پاس سے گزرتے تھے تو آنکھوں سے اشارے کرتے تھے'' یہ اشارہ کرنا بطور تحقیر کے ہے، کہ دیکھو! یہ جارہے ہیں دیوانے قسم کے لوگ۔ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ: اور جب وہ مڑ کے جاتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف تو مڑتے ہیں باتیں بناتے ہوئے، یعنی صرف یہی نہیں کہ مجلس میں بیٹھ کے پھبتیاں کستے ہیں اور ان کا مذاق اُڑاتے ہیں ہنسی کرتے ہیں، گھروں میں جا کر گھروں میں بھی فخر کے طور پر یہی باتیں کرتے ہیں کہ آج ہم نے فلاں کو یوں ذلیل کیا، آج میں نے فلاں کا یوں مذاق اُڑایا، گھروں میں جا کر بھی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنے اس کردار کے اُوپر کوئی ندامت نہیں، اور بدتمیزی کے ساتھ وہی واقعات اپنے گھر والوں میں بیٹھ کے ذکر کرتے ہیں، اور اس کا پھر غلط اثر پڑتا ہے، جو شخص اپنے اہل وعیال میں جا کے بیٹھ کے نیکی کا تذکرہ کرتا ہے تو لاشعوری طور پر بچوں کے اندر بھی نیکی کا رُجحان پیدا ہوتا ہے، اور اس طرح سے ماحول آہستہ آہستہ سارے کا سارا نیک ہو جاتا ہے، اور جو اپنے ماحول میں جا کے بُری باتیں کرتے ہیں تو ان کے بچے، ان کے اہل وعیال بھی آہستہ آہستہ اس بُرائی سے متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں، تو جس راستے پر بڑا چل رہا ہو اسی پر چھوٹے بھی چلتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ نیکوں کا مذاق اُڑانا، پھبتیاں کسنا، ان کی ہنسی اور ان کے ساتھ اس قسم کا اِستہزا اور تحقیر کا معاملہ یہ لوگ کرتے ہیں، پھر گھر میں جا کر بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، جس کی بنا پر اُن کا خاندان، اُن کے اہل وعیال کا بھی ذہن یہی بنتا چلا جاتا ہے کہ واقعی ان کی ہنسی مذاق ہی اُڑانی چاہیے اور ان کی تحقیر ہی کرنی چاہیے، یہ کوئی قابلِ عزت لوگ نہیں ہیں، تو گھروں کے اندر بھی اسی قسم کے اثرات پھیلاتے ہیں، اپنے کیے پر ان کو ندامت نہیں ہوتی۔ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ: اور جب یہ مجرم لوگ ان مؤمنین کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بے شک یہ لوگ البتہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہ بھٹک گئے سیدھے راہ سے، اپنا آبائی طریقہ چھوڑ دیا، ایک آدمی کے پیچھے لگ گئے، آباؤ اجداد کو چھوڑ کر نیا مذہب اختیار کر لیا، دُنیا کی لذتیں چھوڑ دیں، اُدھار پر مصیبتیں سہہ رہے ہیں، یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں، یعنی اس قسم کا پروپیگنڈا کر کے دوسروں کو بھی اِن سے متاثر ہونے سے روکتے ہیں۔

جدید تہذیب سے متاثر طبقہ مشرکینِ مکہ کی ڈگر پر

اور اگر آپ دیکھیں گے، ابھی تو آپ کو یہ موقع نہیں ملا ہوگا، اگر آپ دیکھیں گے اُن لوگوں کو جو اس جدید تہذیب سے متاثر ہیں اور نقد کو ہی ہر معاملے میں ترجیح دیتے ہیں، آخرت کے چاہے عقیدۃً وہ قائل ہوں لیکن عمل سے یہ چیز ناشی نہیں ہے کہ یہ آخرت کے قائل ہیں، اُن کا عمل یہ نہیں بتاتا، اگر آپ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کے دیکھیں گے تو ان مذہبی لوگوں کو جو فقر وفاقہ کے

ساتھ سادگی کے ساتھ دین کا کام کر رہے ہیں، یا فکرِ آخرت کے تحت وہ بُرائی سے بچتے ہیں، کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے، کسی کی حق تلفی نہیں کرتے، تھوڑے پر گزارہ کرتے، ان کا بیٹھ کے مذاق اُڑاتے ہیں کہ عجیب قسم کے پاگل لوگ ہیں، ان کو نہ کمانا آتا ہے نہ کھانا آتا ہے، نہ ان کو کوئی راحت میسّر ہے، نہ ان کو کوئی سہولت میسّر ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس آخرت میں جائیں گے تو آخرت ہی ہمارے لیے ہے، بس اُسی کے اُوپر یہ رجھے بیٹھے ہیں، اس قسم کی پھبتیاں اب بھی لوگ مجلسوں میں بیٹھ کر کرتے ہیں، کہتے ہیں یہ تو غلط طریقہ ہے اِن کا، یہ کوئی طریقہ ہے کہ دُنیا کی مصیبتیں ایسے ہی سہتا رہے؟ انسان کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ دُنیا میں راحت سے گزارے، باقی آخرت جب آئے گی دیکھی جائے گی، پتا نہیں آتی بھی ہے یا نہیں آتی، اور اگر آ بھی گئی تو وہاں بھی ہم ہی خوش حال ہوں گے، جس طرح سے اللہ نے دُنیا میں ہمیں خوش حال کر رکھا ہے آخرت میں بھی ہم ہی خوش حال ہوں گے، اس قسم کی اُن کی باتیں قرآنِ کریم میں متعدّد آیات کے اندر نقل کی گئی ہیں۔ ''جب اِن کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بے شک یہ لوگ البتہ بھٹکے ہوئے ہیں۔'' وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مجرمین کے کردار پہ انکار ہے، کہ ہر وقت جو ہاتھ دھو کے ان نیک لوگوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کیا ان کو ان کے اوپر کوئی نگران بنا کے بھیجا گیا ہے؟ اگر یہ ان کے سمجھائے نہیں سمجھتے تو یہ اپنا کام کریں اور اُن کو اپنا کام کرنے دیں، ''نہیں بھیجے گئے یہ لوگ ان کے خلاف نگران بنا کر'' یعنی یہ کافر ہر وقت جو ہاتھ دھو کر مؤمنوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، مجرمین جو مؤمنین کا مذاق اُڑاتے ہیں، ان کو کوئی ان کے اوپر نگران بنا کے بھیجا گیا ہے؟ جو ہر وقت اُن کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اگر سمجھائے ہوئے نہیں سمجھتے تو ان کا راستہ چھوڑنا چاہیے، جو نیکی کرتا ہے اس کو نیکی کرنے دیں، روکنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں، ''نہیں بھیجے گئے یہ مجرم اِن مؤمنین کے اُوپر نگران بنا کر۔''

قیامت کے دِن مؤمن کُفّار پر ہنسیں گے

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ: اور آج یعنی قیامت کے دِن، جب یہ قیامت آ جائے گی معاملہ برعکس ہو جائے گا، ''آج مؤمن لوگ کافروں سے ہنسیں گے''، دیکھیں گے کہ جو دُنیا میں یہ ہمارا مذاق اُڑایا کرتے تھے، آج دیکھو ان کا حال کیسا ہے، عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ: تختوں پہ بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے، جس طرح سے خوش حالی کا نظارہ کریں گے اسی طرح سے اپنے دُشمنوں کے عذاب کا بھی نظارہ کریں گے، قرآنِ کریم کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنّتی لوگ جھانک جھانک کر جہنمیوں کو معذّب بھی دیکھیں گے، سورۂ صافات کے اندر بھی ایک دوست کی گفتگو دُوسرے دوست کے ساتھ نقل کی گئی تھی، ایک اچھے دوست کی گفتگو بُرے دوست کے ساتھ، اور اسی طرح سے سورۂ اَعراف میں بھی جنتیوں اور دوزخیوں کا آپس میں مکالمہ نقل کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت میں بیٹھے ہوئے کسی درجے میں اُن کو جہنّم کے حالات بھی نظر آئیں گے، اور وہاں پھر یہ اپنے دُشمنوں کو معذّب دیکھیں گے اور ان کی ہنسی اُڑائیں گے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: یہ هَلْ، قَدْ کے معنی میں ہے، جیسے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ کے اندر ذکر کیا تھا

کہ کبھی کبھی یہ قد کے معنی میں بھی ہوتا ہے، ”یہ پکی بات ہے کہ کافر بدلہ دے دیے گئے ان کاموں کا جو یہ کیا کرتے تھے“ یعنی قیامت کے دن یہ بات نمایاں ہوجائے گی کہ کافروں کو ان کے کیے کا بدلہ دے دیا گیا، ”بدلہ دے دیے گئے کافر اُن کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے۔“

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتھا ۲۵ | ۸۴ سُوْرَۃُ الاِنْشِقَاقِ مَکِّیَّۃٌ ۸۳ | رکوعھا ۱

سورۂ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۵ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾ وَ

جب آسمان پھٹ جائے گا ○ اور وہ اپنے رَبّ کی بات توجہ سے سُن لے گا، اور وہ اسی لائق ہے ○ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی ○ اور

اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ

جو کچھ اس میں ہے اس کو وہ باہر اُگل دے گی، اور خالی ہوجائے گی ○ اور اپنے رَبّ کی بات توجہ سے سنے گی اور وہ اسی لائق ہے ○ اے انسان! بے شک تُو

كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴿۷﴾

کوشش کرنے والا ہے اپنے رَبّ کی طرف خوب کوشش کرنا، پھر تُو اس سے ملنے والا ہے ○ جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اعمال اپنے دائیں ہاتھ میں ○

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۭ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ

پس عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا ○ اور وہ اپنے اہل وعیال کی طرف خوش خوش لوٹے گا ○ لیکن وہ شخص جو دے

اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۭ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ

دیا گیا اپنا نامۂ اعمال پشت کے پیچھے سے ○ تو عنقریب پکارے گا وہ ہلاکت کو ○ اور داخل ہوگا بھڑکنے والی آگ میں ○ بے شک وہ

كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۭ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۚ﴿۱۴﴾ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ

اپنے گھر والوں میں خوش تھا ○ بے شک اس کا گمان تھا کہ وہ ہرگز نہیں لوٹے گا ○ کیوں نہیں، بے شک اس کا رَبّ اس کو

بَصِيْرًا ﴿١٥﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿١٨﴾
دیکھنے والا ہے ﴿١٥﴾ میں قسم کھاتا ہوں شفق کی ﴿١٦﴾ اور رات کی اور اس چیز کی جس کو رات جمع کرتی ہے ﴿١٧﴾ اور چاند کی جس وقت کہ جمع ہو جائے ﴿١٨﴾
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ
البتہ ضرور سواری کرو گے تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر ﴿١٩﴾ ان لوگوں کو کیا ہو گیا کہ یہ مانتے نہیں ﴿٢٠﴾ اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے
لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿٢١﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿٢٣﴾
تو یہ جھکتے نہیں ﴿٢١﴾ بلکہ جنہوں نے کفر کیا وہ جھٹلاتے ہیں ﴿٢٢﴾ جس چیز کو یہ جمع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے ﴿٢٣﴾
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٤﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٢٥﴾
پس ان کو خبر دے دیجئے دردناک عذاب کی ﴿٢٤﴾ مگر وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا ﴿٢٥﴾

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۵ آیتیں ہیں۔ مضمون اس سورت کا وہی تذکیرِ آخرت ہے، اور انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تیری کوشش کا نتیجہ تیرے سامنے آنے والا ہے۔ جس طرح دو فریقوں کا ذکر پچھلی سورت میں تھا، اسی طرح سے دو فریقوں کا ذکر اس سورت میں ہے، اور ''مکی'' سورتوں میں خصوصیت کے ساتھ جو پہلے دور کی اُتری ہوئی سورتیں ہیں، اُن میں یہ مضمون سب میں مشترک ہے، اور بار بار یہ چیز آپ کے سامنے ذکر کی جا چکی۔

تفسیر

قیامت کے کچھ حالات

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ: اِنْشَقَّتْ یہ انشقاق سے ہے، انشقاق کا معنی پھٹنا، شَقَّ يَشُقُّ: پھاڑنا، اِنْشَقَّ: پھٹنا، جس وقت آسمان پھٹ جائے گا، وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ: اَذِنَ کا معنی کسی چیز کو کان لگا کے سننا، اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کا معنی ہے وہ اپنے رَبّ کے حکم کے لئے کان لگائے گا، وہ اپنے رَبّ کی بات سُن لے گا، وَحُقَّتْ: اور وہ اسی لائق ہے کہ اپنے رَبّ کی بات کو سنے۔ سماء کا لفظ مؤنث استعمال ہوا ہے، لیکن جب اس کا ترجمہ آسمان کے ساتھ کیا جائے گا، اور آسمان کا لفظ اُردو میں مذکر ہے، عربی میں مؤنث ہے، اس لئے اَذِنَتْ حُقَّتْ اِنْشَقَّتْ یہ مؤنث کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، اور ترجمے میں ہم اس کے لئے مذکر کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، ''جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رَبّ کی بات توجہ سے سُن لے گا اور اس کے لئے حق ہے، اُس کو حق دار بنایا گیا ہے اس بات کا، وہ لائق ہے

اِس بات کے کہ وہ اپنے رَبّ کی بات کو سنے اور مانے'' سننے سے یہاں ماننا ہی مراد ہے۔ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ: اور جس وقت زمین پھیلا دی جائے گی۔ مَدَّ یَمُدُّ: کھینچنا۔ زمین کھینچی جائے گی، پھیلا دی جائے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے کپڑا یا چمڑا، اس میں بل پڑے ہوئے ہوتے ہیں، کہیں سے اُونچا، کہیں سے نیچا، اور جب اس کو کھینچ لیا جائے تو اس کے بل سارے نکل جاتے ہیں، جس طرح کپڑے پر آپ استری کرتے ہیں تو کپڑا پھیل جاتا ہے، اسی طرح سے زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور اس کا نشیب، فراز، یہ گڑھے، اونچان، نیچان، جو کچھ ہے سب ٹھیک ہو جائے گی، اور یہ کفِ دست برابر ایک میدان بن جائے گا، اُونچ نیچ اس میں نہیں رہے گی، نہ کہیں اِس میں کھائی اور کھڈر ہے گی، نہ اِس میں کہیں اُونچے پہاڑ رہیں گے، بالکل ایک پدھرا (برابر) میدان بن جائے گا، ''جب زمین پھیلا دی جائے گی'' وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ: اور جو کچھ اس زمین میں موجود ہے اس کو وہ باہر ڈال دے گی، اَلْقَتْ یہ اِلقاء سے لیا گیا ہے، اِلقاء: ڈالنا، مَا فِيْهَا: جو کچھ اُس زمین میں ہے اُس کو وہ زمین ڈال دے گی، باہر اُگل دے گی، وَتَخَلَّتْ: اور خالی ہو جائے گی، مَا فِی الْاَرْض کے اندر تمام چیزیں آ گئیں، خزانے، دفائن، مُردہ چیزیں اور مُردوں کے اجزاء جو کچھ بھی زمین کے اندر ہے زمین ان کو اُگل دے گی، وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا: دُوسری جگہ قرآنِ کریم میں موجود ہے کہ جو بوجھ اس کے اندر پڑے ہوئے ہیں سب کچھ یہ نکال دے گی (سورہ زلزال)۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ: اور اپنے رَبّ کی بات کو توجہ سے سنے گی اور یہی لائق ہے اس کے کہ اپنے رَبّ کی بات کو سنے اور مانے'' حُقَّتْ کا یہی معنی ہے کہ اس کو اس لائق بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے رَبّ کی بات کو سنے اور مانے، سننے سے یہاں ماننا ہی مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم جس وقت آ جائے گا مجال نہیں کہ آسمان نہ مانے، اور اسی طرح سے جب اللہ کا حکم آ جائے گا تو زمین میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کو نہ سنے اور نہ مانے، اللہ کا حکم آتے ہی آسمان پھٹ جائے گا اور زمین اپنے اندر کی چیزیں اُگل کے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

جوابِ قسم محذوف ہے، جب یہ واقعات پیش آئیں گے اسی وقت انسان کے سامنے اس کے اعمال کی جزا اور سزا بھی آ جائے گی، انسان اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، یہ مفہوم ہے جس کو یہاں بیان کرنا مقصود ہے۔

اِنسان کا سفر کچھ اس طرح سے جاری ہے کہ یہ ٹھہر نہیں سکتا

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا: اے انسان! بے شک تو کوشش کرنے والا ہے اپنے رَبّ کی طرف خوب کوشش کرنا، فَمُلٰقِيْهِ: پھر تو اس کو ملنے والا ہے، لاقی یُلاقی مُلاقاۃ، مُلاقی: ملنے والا ''ہ'' ضمیر رَبّ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ پھر تو اس رَبّ سے ملنے والا ہے، اور ''ہ'' ضمیر اس کدح کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے یعنی تو اپنی کوشش کو ملنے والا ہے، ''پھر ملنے والا ہے وہ انسان اپنی کوشش کو'' جو کوشش کر رہا ہے وہ سامنے آ جائے گی، كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ: تو اپنے رَبّ کی طرف کوشش کرنے والا ہے، یعنی پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک انسان کی ایک کوشش جاری ہے، کوئی شخص بھی کام کاج سے فارغ نہیں، کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے، کوئی نہ کوئی کوشش کر رہا ہے، اچھی کر رہا ہے یا بُری کر رہا ہے، بے کار کوئی انسان نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ بے کار نہیں رہ سکتا، کوئی نہ کوئی کام کرتا ہی رہے گا، چاہے اچھا کرے چاہے بُرا کرے، فضول کرے یا مفید کرے، کرتا چلا

جاتا ہے، اور اس کی یہ منزل طے ہوتی چلی جارہی ہے، یہ ٹھہرا ہوا نہیں، جس طرح سے ابتدا میں یہ مٹی کے ذرّات تھا، بعد میں ان کو اکٹھا کر کے نطفے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا، یہ حالات اس کے اُوپر آتے چلے گئے، ماں کے بطن کی منزلیں اس نے طے کیں، پھر پیدا ہوا، پیدا ہونے کے بعد بچے سے بڑا بنا، بڑے سے آگے بوڑھا ہوا، آخر موت ہے، تو انسان کی ایک کوشش جاری ہے جس کوشش کے تحت یہ اس منزل کو طے کرتا چلا جارہا ہے، اسی بات کو آگے جا کے ذکر کیا جائے گا لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ، ایک حالت کے بعد دُوسری حالت کے اُوپر تم سواری کرتے چلے آرہے ہو، اور اسی طرح سے کرتے چلے جاؤ گے، آخر ایک منزل پہ پہنچ جاؤ گے، وہ منزل یہ ہے کہ پھر اسی رَبّ کے سامنے تمہاری پیشی ہو جائے گی۔ اگر انسان اس بات کو یاد رکھے کہ میرا سفر طے ہورہا ہے اور میں ایک مسافر کی طرح ہوں، اور ایسا مسافر ہوں کہ جو ٹھہرنا بھی چاہے تو ٹھہر نہیں سکتا، یعنی ایک ظاہری مسافر ہے، دُنیا کے اندر سفر کرتا ہے، تو اگر وہ کہیں ٹھہرنا چاہے اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے تو ٹھہر سکتا ہے، کئی دِن قیام کرسکتا ہے، لیکن انسان کا سفر کچھ اس طریقے سے جاری ہے کہ یہ ٹھہر نہیں سکتا، اس کا سفر تو وقت کے ساتھ ساتھ ہے، تم چاہو یا نہ چاہو موسم تم پر گزرتے چلے جائیں گے، دِن رات آتے چلے جائیں گے، اور آخر آپ کو اپنی منزل پر پہنچا دیں گے جو ظاہری دنیا کے اندر موت ہے، اور موت کے بعد پھر آپ قبر میں منتقل ہو جائیں گے، قبر عالمِ آخرت کے لئے ایسے ہی ہے جس طرح سے عالمِ دُنیا کے لئے ماں کا پیٹ تھا، ماں کے پیٹ میں کچھ وقت گزارا تو اس کے بعد آپ دُنیا میں آگئے، اور پھر قبر کے اندر کچھ وقت گزاریں گے تو پھر آپ کا اگلا جنم ہوگا کہ جس میں آپ آخرت میں چلے جائیں گے، اسی طرح سے منزلیں طے کرتے کرتے آپ اپنے رَبّ تک پہنچ جائیں گے یہی بات آپ کو یاد کرائی گئی ہے، کہ تم اپنا رُخ سیدھا رکھو، تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ ہم ایک سفر میں ہیں اور سفر کرتے چلے جارہے ہیں، اور ایسے طور پر کرتے چلے جارہے ہیں کہ ہم میں ٹھہرنے کی بھی قوت اور طاقت نہیں ہے، آخر ایک دِن ہم نے اپنے اللہ کے سامنے چلے جانا ہے، اور اسی طرح سے اس زندگی میں جو کوشش تم کرتے چلے جارہے ہو، جو حرکت تمہاری ہے، چاہے کسی اچھے کام کے لئے کررہے ہو، چاہے کسی بُرے کام کے لئے کررہے ہو، آخر یہ کوشش ایک دِن تمہارے سامنے آجائے گی، فَمُلٰقِيْهِ: پھر وہ انسان اپنی اس کوشش سے ملنے والا ہے، تو انسان یہ نہ سمجھے کہ میری کوشش، میری نقل و حرکت، میرے یہ کام، میری گفتار کردار، جو کچھ بھی ہے یہ ضائع ہو جائے گا، ضائع ہونے والا نہیں، ایک دِن سارے کا سارا لا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیا جائے گا کہ تُو نے یہ کیا ہے۔ اور اگر یہ بات انسان کو یاد رہ جائے تو اِنسان ایک محتاط زندگی گزارے گا، اور یہ سمجھے گا کہ مجھے ایسے طور پر وقت گزارنا چاہیے کہ میری منزل جو سامنے آنے والی ہے میرے لئے اچھی ہو، چنانچہ اسی کوشش کے نتیجے میں جو دو قسم کے حالات سامنے آئیں گے آگے اسی کی وضاحت کی جارہی ہے۔ ''اے انسان! بے شک تُو کوشش کرنے والا ہے اپنے رَبّ کی طرف کوشش کرنا'' فَمُلٰقِيْهِ: پھر تو اُس رَبّ سے ملنے والا ہے، یا: تُو اپنی کوشش سے ملاقات کرنے والا ہے، دونوں طرح سے معنی ٹھیک ہے۔

دائیں ہاتھ والوں کا انجام اور ''حسابِ یسیر'' کا مفہوم

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ: پھر کوشش کرتے ہوئے جس وقت آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے چلے جائیں گے، وہاں پھر دو

فریق بن جائیں گے، اَصحاب الیمین اور اَصحاب الشمال، بعضے لوگ ایسے ہوں گے کہ جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا، اور جن کے دائیں ہاتھ میں ان کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا یہ کامیابی کی علامت ہے، اُس سے حساب وکتاب بہت آسان لیا جائے گا، اس کا حساب یسیر ہوگا، اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف کامیاب ہو کے خوشی کے ساتھ واپس آئے گا، خوش ہنستا ہوا اپنے اہل وعیال اور اپنے متعلقین کی طرف آئے گا، ان کو بشارت سنانے کے لئے کہ میری نجات ہوگئی، دائیں طرف نامۂ اعمال مل گیا یہ کامیابی کی علامت ہے، اور اس کا حساب حسابِ یسیر ہوگا، آسان حساب، آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ذکر تو کردیں گے کہ تُو نے دُنیا میں یہ غلطی بھی کی تھی، تُو نے دُنیا میں یہ بھی کیا تھا، لیکن اس کے اُوپر گرفت نہیں کریں گے بلکہ معافی کا اعلان کردیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ عُذِّبَ'' یا: ''مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ'' او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام کہ جس شخص کا بھی محاسبہ ہوگیا، جس شخص سے حساب کتاب لے لیا گیا وہ عذاب سے بچ نہیں سکے گا، وہ عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس روایت کے اُوپر سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے اِشکال پیش کیا، کہ یا رسول اللہ! آپ تو کہتے ہیں کہ جو بھی حساب لے لیا جائے گا، جس سے بھی حساب لے لیا جائے گا وہ عذاب میں ڈال دیا جائے گا، وہ بچ نہیں سکتا، حالانکہ قرآنِ کریم میں آتا ہے فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بعض لوگوں کا حساب بہت آسان ہوگا جو میدانِ قیامت سے خوش خوش لوٹیں گے، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حساب بھی ہوگیا اور چھوٹ بھی گئے، اور آپ کہتے ہیں کہ جس کا حساب ہوگا پکڑا جائے گا، عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کے اس قول پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے سامنے ہی یہ اِشکال کردیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ! حسابِ یسیر تو محض عرض ہے،[1] عرضِ اعمال، کہ انسان کے سامنے اس کے اعمال پیش کردیے جائیں گے کہ تُو نے یہ کیا، یہ کیا، یہ کیا، باقی! آگے گرفت نہیں ہوگی، اور جس سے حقیقتاً حساب مانگ لیا گیا اور اس کے اُوپر مناقشہ شروع ہوگیا، گرفت شروع ہوگئی، روک ٹوک شروع ہوگئی، پوچھ گچھ شروع ہوگئی کہ تُو نے یہ کیوں کیا تھا؟ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں چھوٹے گا۔ تو حسابِ یسیر کا مفہوم معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ سرسری سا حساب لیں گے، سرسری سے حساب میں یہ بات ہے کہ اس کے سامنے ذکر کریں گے کہ دیکھ! تُو نے یہ غلطی کی تھی، یہ غلطی کی تھی۔ بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جتلاتے وقت بھی اس کو پردے میں لے لیا جائے گا تاکہ کسی کے سامنے شرمساری نہ ہو، مؤمن کو اللہ تعالیٰ اپنے پردے میں لے لیں گے، پردے میں لے کے اس کے سامنے اس کے اعمال ذکر کریں گے، تو مؤمن کے سامنے جب یہ بات آئے گی، بعد میں اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، اور اچھے انجام کی خبر لے کر یہ اپنے گھر والوں کی طرف خوشی خوشی سے لوٹے گا، اپنے متعلقین کو آکر بتائے گا کہ میری جان چھوٹ گئی، دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال آجانے کے بعد اُس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اب یہ اپنے گھر والوں کی طرف خوشی کے ساتھ لوٹے گا، اور جب یہ دُنیا میں تھا تو دُنیا میں اپنے گھر والوں کے اندر جب یہ رہتا تھا تو مشفقین میں سے تھا، ڈرنے والوں میں سے، ہر وقت خوف طاری رہتا تھا۔ اپنے گھر میں،

(۱) بخاری ص۲۱ باب من سمع شیئا فلم یفہمہ…الخ۔ نیز مشکوٰۃ ۲؍۴۸۳ باب الحساب کی پہلی حدیث۔

اہل وعیال میں، اپنی بیوی بچوں کے پاس اس نے غفلت کی اور بے فکری کی زندگی نہیں گزاری تھی، جیسا کہ سورۂ طور کے اندر یہ لفظ آیا تھا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ، خوشی خوشی جنت والے کہیں گے کہ آج تو اللہ نے ہمارے سامنے بڑا اچھا نتیجہ دکھادیا، جب ہم اپنے اہل وعیال میں ہوتے تھے ہم تو بہت ڈرنے والے ہوتے تھے، بڑا ڈر لگتا تھا، معلوم ہو گیا کہ دُنیوی زندگی کے اندر جو شخص اہل وعیال میں رہتا ہوا غفلت کی زندگی نہیں گزارتا، عیش وعشرت ہی اس کے سامنے نہیں ہوتا، بلکہ وہ ڈرتا ہوا محتاط زندگی گزارتا ہے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دِن اپنے اہل وعیال کی طرف خوشی خوشی لوٹے گا۔ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ: جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اَعمال اس کے دائیں ہاتھ میں، فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا: پس عنقریب اس سے ایک سرسری سا حساب لیا جائے گا، حسابِ یسیر اس سے لیا جائے گا، آسان حساب، اور آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ بس تذکرہ سا ہوجائے گا کہ تُو نے یہ غلطیاں کی تھیں، باقی اس کے اُوپر گرفت نہیں ہوگی، وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا: اور یہ شخص اپنے اہل وعیال کی طرف خوش خوش لوٹے گا، اچھے انجام کی خبرسُن کر خوشیاں مناتا ہوا آئے گا۔

بائیں ہاتھ والوں کا اَنجامِ بد اور اس کی وجہ

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ: لیکن وہ شخص جو دے دیا گیا اپنا نامۂ اَعمال پشت کے پیچھے سے، جن کو دوسری جگہ اصحاب الشمال کے ساتھ ذکر کیا کہ بائیں ہاتھ میں ان کا نامۂ اَعمال آئے گا۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ جو لوگ نیک ہیں، اچھے ہیں، ان کے سامنے ان کا نامۂ اَعمال فرشتے سامنے سے آکر اَدب سے پیش کریں گے اور یہ دائیں ہاتھ میں لے لیں گے، اور جو مجرم ہیں یہ میدان کے اندر آئیں گے تو یا تو ان کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے جس طرح سے مجرموں کے ہوتے ہیں، تو پیچھے سے آکر ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا، یا یہ بھی ان کی ایک تحقیر ہے کہ فرشتے ان کی شکل دیکھنا نہیں چاہیں گے اور پیچھے سے آ کے ان کے بائیں ہاتھ میں ان کا نامۂ اَعمال دے دیں گے، یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ یہ لوگ ناکام ہیں اور ان کا انجام بُرا ہے، جب ان کے بائیں ہاتھ میں یہ دے دیا جائے گا فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا: جب اُس کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ میں اصحابِ شمال میں سے ہوں، اور وہ اعمال اُس کے سامنے آگئے، اور جو کوشش اُس نے کی تھی اُس کے سامنے آگئی، تو وہ عنقریب ہلاکت کو پکارے گا، ثبور ہلاکت کو کہتے ہیں، ہلاکت کے پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کہے گا يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ہائے کاش! مجھے میرا نامۂ اَعمال نہ ملتا، يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (سورۂ حاقہ) ہائے کاش! کہ موت ہی میرا خاتمہ کردیتی، ایسا خاتمہ کردیتی کہ دوبارہ اُٹھنا نہ ہوتا، ہائے میں مرجاؤں، ہائے میں ہلاک ہوگیا، اس قسم کی باتیں انسان جیسے پریشانی میں کیا کرتا ہے تو يَدْعُوْا ثُبُوْرًا کا یہی معنی ہے، سورۂ فرقان میں بھی اس کا ذِکر آیا تھا، جہاں آیا تھا کہ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (آیت:۱۴) وہ بھی یہی بات تھی، ''عنقریب پکارے گا وہ ہلاکت کو'' وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا: اور داخل ہوگا بھڑکنے والی آگ میں۔ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا: یہ دُنیا کے اندر اپنے اہل وعیال میں خوش رہتا تھا، اس نے دُنیا میں زندگی جو گزاری تو بہت مسرور حالت میں گزاری، اس کو کبھی فکر ہی نہیں تھا کہ میں نے

اللہ کے سامنے جانا ہے اور جا کے کوئی حساب بھی دینا ہے، کوئی ڈر اور خوف اس کے اُوپر نہیں تھا، اپنے مال دولت میں اور اپنے اہل وعیال میں وہ خوش خوش رہتا تھا، فکر اُس کو تھا ہی کوئی نہیں، تو دُنیوی زندگی کے اندر جس نے اپنے اہل وعیال میں مسرّت کے ساتھ وقت گزارا، خوش عیشی میں مبتلا رہا، فکر کی زندگی نہیں گزاری، تو اس کا انجام یہ ہے کہ وہاں پھر موت کو پکارے گا، ہلاکت کو پکارے گا، جہنم میں جائے گا، آج اس کو خوشی نہیں ہوگی، نہ اُس کو نہ اس کے متعلقین کو، متعلقین کے پاس جا کر بھی خوشی کی بات نہیں کر سکے گا، اس نے اپنی خوشی دیکھ لی دُنیا کے اندر۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا: پس جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اعمال اپنے دائیں ہاتھ میں پھر وہ حساب لیا جائے گا آسان حساب، اور لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف مسرور، خوش ہو کر، (مسرور: خوش کیا ہوا، سَرَّ: خوش کرنا) اور جو شخص دے دیا گیا اپنا نامۂ اعمال اپنی پشت کے پیچھے سے، مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ، وہ شخص کہ دے دیا گیا اُس کو اُس کا نامۂ اعمال اس کی پشت کے پیچھے سے، فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا: پس وہ عنقریب ہلاکت کو پکارے گا، وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا: اور بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوگا، اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا: بے شک وہ اپنے گھر والوں میں خوش تھا، یعنی زندگی کے اندر اس نے خوشی کے ساتھ وقت گزار لیا، زندگی کے اندر اس نے کوئی فکر نہیں کی اور کوئی خوف نہیں رکھا تھا جس کا نتیجہ اس کے سامنے آج آ گیا، اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ: اور اہل وعیال میں جو خوشی کے ساتھ اور مسرّت کے ساتھ وقت گزارا، فکر نہیں رکھا، اس کی وجہ یہ تھی اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ: بے شک وہ سمجھتا تھا کہ وہ لوٹ کے اللہ کی طرف جانے والا نہیں، حارَ یحُوْرُ: لوٹنا، اِنَّهٗ ظَنَّ: بے شک اس کا گمان تھا، وہ سمجھتا تھا کہ وہ ہرگز نہیں لوٹے گا، بَلٰى: کیوں نہیں، اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا: بے شک اس کا رَبّ اس کو دیکھنے والا ہے، اس کی ہر ہر حرکت رَبّ کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ایک ایک چیز کو جانتے ہیں، جب ایک ایک چیز کو جانتے ہیں، علمی طور پر احاطہ کیے ہوئے ہیں، تو اس کے سارے کے سارے اعمال اس کے سامنے آئیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ دے گا، کوئی بات اُس کی مخفی نہیں۔

تین قسمیں اور ان کی جوابِ قسم کے ساتھ مناسبت

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ: یہ قسم آ گئی اور اس کے شروع میں "لا" ہے، یہ کئی دفعہ آپ کے سامنے ذکر کیا جا چکا کہ یہ لفظِ "لا" قسم کی نفی کے لئے نہیں ہوتا۔ پیچھے انکار ہے آخرت کا، وہ سمجھتا ہے کہ لوٹنا نہیں، تو اس کے اوپر فوراً انکار کر دیا گیا: لَا! یہ بات نہیں ہے، اُقْسِمُ: میں قسم کھاتا ہوں بِالشَّفَقِ: شفق کی، شفق اس سُرخی کو کہتے ہیں جو سورج کے غروب ہونے کے بعد آتی ہے، اور اس وقت تک کچھ نہ کچھ روشنی ہوتی ہے جس وقت تک شفق باقی رہے، اور شفق غائب ہوتی ہے تو پھر رات آگے تاریک ہو جاتی ہے، وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ: اور قسم ہے رات کی اور اس چیز کی جس کو رات جمع کرتی ہے، وَسَقَ: جمع کرنا، اس سے ساری مخلوق ہی مراد ہو گئی، کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ دن کے وقت ہر کوئی منتشر ہوتا ہے، اور جس وقت رات آ جاتی ہے تو سارے کے سارے اپنے مقام میں آ کے سمٹ

جاتے ہیں، کیڑے مکوڑے بھی ہیں، جانور پرندے جتنے بھی ہیں اکثر و بیشتر وہ اپنے اپنے مسکن میں آکے آرام کرتے ہیں، تو گویا کہ رات نے ان سب کو اکٹھا کرلیا ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ: اِتَّسَقَ یہ وَسَقَ سے باب افتعال ہے، واؤ کو تاء کر کے تاء میں ادغام کیا ہوا ہے، ''اور چاند کی جس وقت کہ جمع ہو جائے'' وَسَقَ: جمع کرنا، اِتَّسَقَ: جمع ہونا، جمع ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی روشنی کامل ہو گئی، جیسے کہ چودھویں رات میں ہوتی ہے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ: البتہ ضرور سواری کرو گے تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر، طبق سے حالت مراد ہے، ایک حالت سے دوسری حالت پر تم سواری کرتے چلے جاؤ گے، یہ ہے جوابِ قسم۔ اور قسم کے اندر جو چیزیں ذکر کی گئیں، وہ ایک تو شفق کا آنا ہے، رات کا طاری ہو جانا، اور مخلوق کا سمٹنا، چاند کا کامل ہونا، یہ چیزیں ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے ایک نمونہ دکھایا ہے، کہ دیکھو! حالات کس طرح سے بدلتے رہتے ہیں، روشنی ہوتی ہے روشنی کے بعد تاریکی آتی ہے، ایک وقت میں مخلوق پھیلتی ہے ایک وقت میں سمٹتی ہے، چاند کبھی بے نُور ہوتا ہے کبھی اس کا نُور کامل ہو جاتا ہے، یہ سب اِن مختلف حالات کی طرف اشارہ ہے، جس طرح سے کائنات کے اندر یہ مختلف حالات پیش آتے ہیں اے انسان! تیرے اُوپر بھی یہی مختلف حالات پیش آنے والے ہیں، ایک حالت کے بعد دوسری حالت کی طرف تم سواری کرتے چلے جاؤ گے، آخر اپنی منزل پہ پہنچ جاؤ گے...... انسان پر بھی اسی طرح سے حالات مختلف ہوتے ہیں، نطفے سے شروع ہو کے بڑھاپے تک، موت تک جس قسم کے حالات ہیں وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، مرنے کے بعد برزخ میں کس طرح سے آگے کو چلتا چلا جائے گا سواری کر کے اپنی منزل کی طرف، وہ احادیث میں اور قرآن میں واضح کر دیا گیا، اور آخر میدانِ قیامت میں پہنچ جائے گا، میدانِ قیامت میں سے ہوتا ہوا اس کا آخری ٹھکانا یا جنّت ہے یا جہنّم ہے، وہاں سے پھر آگے اِس نے کسی طرف منتقل نہیں ہونا، آخری منزل وہ ہے۔ ''البتہ ضرور سواری کرو گے تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر۔''

کافر قرآن سُن کر نہ ایمان لاتے ہیں، نہ جھکتے ہیں

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ: ان لوگوں کو کیا ہو گیا کہ یہ مانتے نہیں، یعنی اتنی واضح واضح باتیں ہیں اور اتنے تکرار کے ساتھ اور اتنی وضاحت کے ساتھ کی جا رہی ہیں، لیکن پھر بھی ان کو کیا ہو گیا کہ یہ ایمان نہیں لاتے، یہ تعجب کا اظہار ہے۔ (وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ) اور جب ان کے اُوپر قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ اس کے سامنے جھکتے نہیں، قرآنِ کریم کو مانتے نہیں، سجدہ: تواضع اختیار کرنا، کسی بات کے سامنے جھک جانا، اُس زمانے میں عرب میں، مصر میں، ان علاقوں کے اندر یہ ایک رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی بات کی عظمت کو محسوس کرتا تو اس کے سامنے سر جھکا دیتا تھا، ''سر جھکانے'' کا محاورہ تو ہمارے ہاں بھی ہے، ''فلاں شخص نے فلاں کی بات کے سامنے سر جھکا دیا'' ، ''فلاں کی عظمت کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو گیا'' ، یہ محاورہ تو اَب بھی ہے، لیکن اُس وقت واقعہ تھا کہ جب کسی کی صداقت کا اور کسی کی عظمت کا لوگ اعتراف کرتے تو سیدھے سجدے میں گر جاتے تھے، جس کا نمونہ آپ کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں گزرا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھ کر جادوگر تسلیم کر گئے کہ واقعی یہ اللہ کی

جانب سے ہے، یہ جادو نہیں ہے، تو انہوں نے اس بات کی حقیقت کو صداقت کو، عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے میدان میں سجدہ کر دیا تو یہاں بھی یہی بات کہی جارہی ہے کہ یہ قرآن اِن کو کیسے کیسے خطرات سے آگاہ کرتا ہے، اور انسان کے سامنے انسان کے اس سفر کی منزلیں کس طرح سے گنواتا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ اس کو سننے کے بعد اس کی عظمت کا اعتراف کرتے، لیکن یہ ایمان ہی نہیں لاتے، اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ اس کو تسلیم ہی نہیں کرتے، اس کی عظمت کا اعتراف ہی نہیں کرتے۔

مذکورہ آیت پرسجدۂ تلاوت

یہاں چونکہ لفظ ''سجدہ'' کا آگیا، اور روایات میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے ان آیات کی تلاوت کے بعد سجدہ کیا، اس لئے حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اِس آیت کے اُوپر بھی سجدہ واجب ہے جب تلاوت کی جائے، اگرچہ لفظی مفہوم یہ نہیں ہے کہ کافر واقعی سجدہ نہیں کرتے، بلکہ مطلقاً تسلیم کرنا اور اس کے سامنے جھک جانا مراد ہے، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کے عمل سے چونکہ اِس آیت کے اُوپر سجدہ کرنا ثابت ہے، اس لئے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اِس آیت پر سجدہ واجب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سجدہ نہیں ہے، باقی تینوں اِماموں کے نزدیک ہے۔ ''جب اِن پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ جھکتے نہیں، تواضع اختیار نہیں کرتے، اس کی عظمت کا اعتراف نہیں کرتے، بلکہ جنہوں نے کفر کیا وہ جھٹلاتے ہیں'' نہ ماننا تو اپنی جگہ رہا۔ ایک بات کو اِنسان تسلیم بھی نہیں کرتا اور تکذیب بھی نہیں کرتا ایک درجہ یہ بھی ہے، یہ صرف یہ نہیں کہ ایمان نہیں لاتے بلکہ یہ تو تکذیب کرتے ہیں۔

مکذبین کو تنبیہ

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ: يُوْعُوْنَ یہ لفظ اَوعٰی سے لیا گیا ہے، جَمَعَ فَاَوْعٰى قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ یہ لفظ آیا ہوا ہے (سورۂ معارج)، وِعاء برتن کو کہتے ہیں، یہ لفظ بھی سورۂ یوسف کے اندر آیا تھا: مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ (آیت:۷۶) گونی، برتن۔ اَوعٰی کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو برتن میں ڈال کے محفوظ کرلیا، جَمَعَ فَاَوْعٰى: جو مال کو جمع کرتا ہے پھر اُس کو بَرتن میں بھر بھر کے رکھتا ہے۔ تو یہاں مَا يُوْعُوْنَ کا معنی ہے جس چیز کو یہ ذخیرہ کر رہے ہیں، جس چیز کو یہ جمع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے، جس کے اندر اِن کا مال و دولت سمیٹنا بھی ہو گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ساری کوششیں مال و دولت جمع کرنے کے لئے خرچ ہو رہی ہیں اللہ کو یہ بھی معلوم ہے، اور جو کچھ یہ سمیٹ رہے ہیں، ان کا مال و دولت اکٹھا کرنا، اللہ سے یہ بھی مخفی نہیں۔ اسی طرح سے اعمال کے ذخیرے کی طرف بھی ان لفظوں میں اشارہ ہے کہ جس قسم کے اعمال جمع کرتے جارہے ہیں ذخیرہ بناتے جارہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: پس ان کو خبر دے دیجئے دردناک عذاب کی، اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: مگر وہ لوگ جو ایمان لے آئے، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور انہوں نے نیک عمل کیے، لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ: ان کے لئے اَجر ہے غیر ممنون، مَنَّ قَطَعَ کے معنی میں، غیر ممنون: غیر مقطوع، ایسا اجر جو کہیں ختم نہیں ہوگا، اِن لوگوں کے سامنے ایسا اجر آنے والا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

❁ ❁ ❁

آیاتھا ۲۲ ۸۵ سُوْرَۃُ الْبُرُوْجِ مَکِّیَّۃٌ ۲۷ رکوعھا ۱

سورۂ بُروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۲ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝۳

بُرجوں والے آسمان کی قسم! ۝ اور اس دِن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے! ۝ اور حاضر ہونے والے دِن کی قسم! اور اس دن کی قسم جس میں حاضری ہوتی ہے! ۝

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْ هُمْ عَلَیْهَا قُعُوْدٌ ۝۶ وَّهُمْ

برباد ہوگئے خندق والے ۝ یعنی ایندھن والی آگ والے ۝ جب کہ وہ اس خندق کے اُوپر بیٹھنے والے تھے ۝ اور

عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُهُوْدٌ ۝۷ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْمِنُوْا

جو کچھ وہ مؤمنین کے ساتھ کر رہے تھے اس کو دیکھنے والے تھے ۝ اور نہیں انتقام لیا انہوں نے مؤمنین سے مگر اس بات کا کہ وہ ایمان لے آئے

بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۝۸ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ

اللہ پر جو زبردست ہے تعریف کیا ہوا ہے ۝ جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اللہ ہر

شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا

چیز کو دیکھنے والا ہے ۝ بے شک وہ لوگ جنہوں نے سزائیں دیں مؤمن مردوں کو اور مؤمن عورتوں کو پھر انہوں نے توبہ نہیں کی

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ۝۱۰ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلنے والی آگ کا عذاب ہے ۝ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک

الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ ۝۱۱ اِنَّ

عمل کئے ان کے لئے باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ۝ بے شک

بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ ۝۱۲ اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ ۝۱۳ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝۱۴

تیرے رَب کی پکڑ بہت سخت ہے ۝ وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا ۝ وہ بخشنے والا ہے محبت کرنے والا ہے ۝

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾
عرش کا مالک ہے، عظمت والا ہے ﴿۱۵﴾ کرنے والا ہے اس کام کو جس کا وہ ارادہ کرلے ﴿۱۶﴾ کیا آپ کے پاس لشکروں کی بات آئی؟ ﴿۱۷﴾
فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ
یعنی فرعون اور ثمود کی بات ﴿۱۸﴾ بلکہ کافر لوگ تکذیب میں ہیں ﴿۱۹﴾ اللہ تعالیٰ ان کے پیچھے سے ان کو
مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾
گھیرنے والا ہے ﴿۲۰﴾ بلکہ یہ ایک بزرگ قرآن ہے ﴿۲۱﴾ لوحِ محفوظ میں ﴿۲۲﴾

سورت کا مضمون

سورۂ بروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۲ آیتیں ہیں۔ اس سورت میں زیادہ تر تنبیہ ان کافروں اور مشرکوں کو کی گئی ہے جو لوگوں کو ایمان لانے کی بنا پر تکلیفیں پہنچاتے تھے، ان کو ان کے بُرے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔

تفسیر

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ: بروج بُرج کی جمع ہے، برج قلعے کو کہتے ہیں، بڑے بڑے ستاروں کو کہتے ہیں، محلات کو کہتے ہیں، يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ قرآنِ کریم میں یہ لفظ آیا ہے (سورۂ نساء: ۷۸)، تمہیں موت پالے گی اگرچہ تم کتنے ہی مضبوط قلعوں میں اور محلات میں ہو۔ ''برجوں والا آسمان'' یعنی بڑے بڑے ستاروں والا، یا، آسمان میں بھی محلات اور قلعے ہیں جہاں فرشتے رہتے ہیں، اور شیاطین سے آسمان کی حفاظت کرتے ہوئے پہرہ دیتے ہیں، اور جب شیاطین اُوپر کو جانے لگتے ہیں تو ان کے اُوپر شہابِ ثاقب پھینکتے ہیں، سورۂ حجر کے اندر اس کی تفصیل آئی تھی، ''برجوں والے آسمان کی قسم''، وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ: اور یومِ موعود کی قسم، اس دن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے، اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔

''شاہد ومشہود'' سے کیا مُراد ہے؟

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ: شاهد: حاضر ہونے والا، مشهود: حاضر کیا گیا۔ روایات میں شاهد کا مصداق یوم جمعہ کو قرار دیا گیا ہے،[1] تو یومِ موعود سے قیامت کا دن مراد ہو گیا، اور شاهد سے جمعہ کا دن مراد ہے، اور مشہود سے یومِ عرفہ مراد ہے۔ جمعہ کے دن یوں سمجھئے کہ مخلوق اپنی اپنی جگہ موجود ہوتی ہے اور جمعہ کا دن وہیں آجاتا ہے اس لئے وہ تو شاهد ہے، اور یومِ عرفہ میں لوگ

---

(۱) ترمذی ۱۷۱/۲، تفسیر سورۃ البروج / مشکوۃ ۱۲۰/۱، باب الجمعۃ، فصل ثانی. اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ يَوْمُ الْقِيَامَةِ وَالْيَوْمُ الْمَشْهُوْدُ يَوْمُ عَرَفَةَ وَالشَّاهِدُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ.

میدانِ عرفہ میں اکٹھے ہوتے ہیں تو اس اعتبار سے وہ مشہود ہے، مشہود کا معنی ہو گیا ایسا دن جس میں حاضری ہوتی ہے، جس میں لوگ حاضر ہوتے ہیں، اور شاھد کا معنی جو خود حاضر ہوتا ہے، کیونکہ جمعہ ہر جگہ اسی طرح سے منایا جاتا ہے، اپنی اپنی جگہ لوگ موجود ہوتے ہیں اور دن آ گیا، اور وہیں وہیں وہ نماز ادا کر دی گئی، اور یوم عرفہ جو ہے اس میں عرفات کے اندر خصوصیت کے ساتھ اجتماع ہوتا ہے، اس لیے یومِ مشہود کا مصداق عرفہ کو بنا دیا گیا۔ تو یہ آسمان کی قسم آ گئی، اور آگے یہ تین دن ذکر کر دیے گئے قیامت، جمعہ اور عرفہ۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ: اُخدود کہتے ہیں خندق کو......! بعض تفسیروں میں یہاں بھی جوابِ قسم محذوف نکالا گیا ہے، ان قسموں کے بعد ذکر آ جائے گا کہ تم لوگ اپنے اعمال کا بدلہ ضرور دیے جاؤ گے۔

''مکی'' سورتوں میں اِثباتِ آخرت پر زیادہ زور کیوں؟

چونکہ ''مکی'' سورتوں میں زیادہ تر اِسی کا ہی ذکر ہے، اور سب سے پہلے یہی عقیدہ ہے جس کے اُوپر زور لگایا گیا، توحید کے ساتھ ساتھ زیادہ تر وضاحت جو کی گئی، زیادہ زور جو صرف کیا گیا وہ اِثباتِ آخرت پر ہے، بلکہ ان ''مکی'' سورتوں میں توحید کا ذکر اتنا وضاحت کے ساتھ نہیں آیا جتنا ذکر آخرت کا آ رہا ہے اور بعث بعد الموت کا ہے، وجہ اس کی وہی ہے کہ فکرِ آخرت اور جزا اور سزا کا تصور ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے حاصل ہو جانے کے بعد، اس عقیدے کے اپنا لینے کے بعد پھر آگے رُخ سیدھا ہو جاتا ہے، پھر باقی چیزوں کا تسلیم کرنا، کرنے کے کام کرنا اور چھوڑنے کے چھوڑنا سب آسان ہو جاتے ہیں، جو کام کرنے کے ہیں ان کا کرنا آسان ہو جاتا ہے، جو چھوڑنے کے ہیں اُن کا چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے، یہ اگلی باتیں سمجھنی بھی آسان اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی آسان۔ اور جس وقت تک فکرِ آخرت نہ ہو اور بعث بعد الموت کا عقیدہ نہ آئے اس وقت تک انسان ایک لا اُبالی پن میں مبتلا ہوتا ہے، لاپروائی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، اس کو کوئی فکر نہیں ہوتی کہ میرے سامنے میرا انجام اچھا یا بُرا آئے گا، تو پھر وہ کسی بات کو توجہ کے ساتھ نہ سنتا ہے نہ اپناتا ہے۔ تو ''مکی'' سورتوں میں سب سے زیادہ زور کلام اللہ کے اندر اثباتِ آخرت پر ہی لگایا گیا ہے، اتنی وضاحت کے ساتھ اِن سورتوں میں توحید کا تذکرہ نہیں آیا جتنی وضاحت کے ساتھ بار بار مختلف عنوانات کے تحت بعث بعد الموت کا ذکر آ رہا ہے۔

خلاصۂ آیات

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ: اُخدود خندق کو کہتے ہیں، کھائی اور کھڈ، اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ: خندق والے، قُتِلَ: برباد کیے گئے، ''برباد کیے گئے خندق والے''، النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ: یہ اُخدود سے بدل ہے، ''یعنی ایندھن والی آگ والے'' جنہوں نے آگ جلا رکھی تھی اور اس میں بہت ایندھن ڈالا ہوا تھا، اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ: جبکہ وہ اس خندق کے اُوپر بیٹھنے والے تھے، قعود قاعد کی جمع، وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ: اور وہ اُن کاموں پر جو وہ مؤمنین کے ساتھ کر رہے تھے شاھد تھے، جو معاملہ وہ مؤمنین کے ساتھ کر رہے تھے اس کا وہ مشاہدہ کرنے والے تھے، اس کو دیکھنے والے تھے، هُمْ شُهُوْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ، وہ شاہد تھے، مشاہدہ

کرنے والے تھے اُس کام کا جو وہ مؤمنین کے ساتھ کر رہے تھے۔ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ: نہیں انتقام لیا اُنہوں نے مؤمنین سے اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ: مگر اس بات کا کہ وہ ایمان لے آئے اللہ پر جو زبردست ہے تعریف کیا ہوا ہے، الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جس کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا گواہ ہے، ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا، ہر چیز کا نگہبان ہے۔

اَصحابُ الاخدود کا واقعہ

یہاں تک ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے، یہ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ، لفظی ترجمے سے آپ سمجھ گئے کہ یہ کوئی ایسے لوگ تھے جنہوں نے خندقیں کھودیں، اور بہت ایندھن ڈال کے آگ بھڑکائی، اور آگ بھڑکانے کے بعد مؤمنین کو اس آگ میں پھینکا اور ان کو جلایا، اور خود وہاں بیٹھ کے ان کے جلنے کا نظارہ کیا، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ اَصحاب الاخدود برباد ہو گئے، قُتِلَ: یہ برباد کر دیے گئے، یہ کسی واقعے کی طرف اشارہ ہے جو اس دُنیا کے اندر پیش آیا تھا کہ کافروں نے مؤمنوں کو زندہ جلایا، اور یہ واقعہ اُس وقت مشہور تھا، تاریخ کے اندر چلا آ رہا تھا، جس کی بنا پر قرآنِ کریم نے اشارہ کیا، سرورِ کائنات ﷺ نے اپنے اقوال میں اس کی وضاحت کر دی۔ حضور ﷺ سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور تھا، اور اس زمانے میں عیسائی جو تھے یہی برحق مذہب پر تھے، اور مختلف جگہوں میں ان کا مقابلہ مشرکین اور بت پرستوں سے ہوا، اور بت پرستوں نے جن کو اِقتدار حاصل تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لینے والے موحدین کو اسی طرح سے جلایا ہے اور سزا دی ہے، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں کیا گیا ہے۔ وہ اس وقت کے مؤمنین تھے، موحدین تھے، اور دینِ حق پر تھے، اور جب وہ توحید کا تذکرہ کرتے، لوگوں کو ایمان کی طرف بلاتے، تو جو لوگ ان کے کہنے پر ایمان لے آتے تو وقت کے صاحبِ اقتدار، قوت والے لوگ، جو بت پرست تھے، اِن کے ساتھ مذہبی دُشمنی کرتے ہوئے اِن کو انہوں نے زندہ جلایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے کسی بات کا انتقام نہیں لیا سوائے اس بات کے کہ وہ لوگ اللہ پر ایمان لائے، اللہ پر ایمان لانے کا انہوں نے یہ انتقام لیا۔ نَقَمُوا دو معنوں میں آتا ہے عیب لگانا اور انتقام لینا، ''نہیں عیب لگایا انہوں نے اُن مؤمنوں پر کوئی بھی سوائے اِس کے کہ وہ ایمان لے آئے تھے'' اُن کا قصور صرف یہی تھا، ''نہیں انتقام لیا انہوں نے اُن مؤمنین سے کسی بات کا مگر اس بات کا کہ وہ ایمان لے آئے تھے'' یعنی اِس ایمان لانے کی بنا پر ہی اِنہوں نے اُن کو یہ سزا دی، تو ایسے لوگ جو تھے یہ برباد کر دیے گئے۔ ایک واقعہ ''مسلم شریف'' کے اندر، ''ترمذی'' میں، اور ''مسند احمد'' میں مذکور ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے سنایا، اور ''کتاب التفسیر'' میں اِمام مسلم رحمہ اللہ نے اس واقعے کو لیا ہے جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اَصحابِ اُخدود سے وہی مراد ہیں، اور حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں اسی واقعے کو ذکر کیا ہے، اور ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی اس واقعے کو ذکر کیا ہے...... لیکن دُوسرے مفسرین رحمہم اللہ لکھتے ہیں کہ صرف یہ ایک واقعہ نہیں، ایسے واقعات متعدد پیش آئے ہیں کہ ظالموں نے، بت پرستوں نے، مشرکوں نے موحدوں کو اس طرح سے سزائیں دیں کہ ان کو زندہ آگ میں جلایا......

سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا، جس کا نام غالباً ''یوسف ذونواس'' لکھا ہے، یمن کے علاقے میں تھا، اور اس کے دربار میں ایک کاہن یا ایک ساحر تھا، جادوگر، یا کاہن...... کہانت اور سحر قریب قریب ہی ہوتے ہیں، دونوں کا تعلق ہی جنات کے ساتھ، اَرواحِ خبیثہ کے ساتھ ہوتا ہے، جس سے وہ مختلف قسم کی باتیں بتاتے ہیں یا مختلف قسم کے تصرفات دکھاتے ہیں...... وہ کاہن یا ساحر بوڑھا ہوگیا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ کوئی ہونہار سا بچہ میرے سپرد کرو، تاکہ اس کو میں اپنا یہ علم سکھادوں، اور میرے مرنے کے بعد یہ علم باقی رہے اور تُو اس سے فائدہ اُٹھاتا رہے، تو بادشاہ نے ایک ہونہار سا بچہ لے کر اس کے سپرد کردیا، اور بچے کو حکم دیا کہ وہ جایا کرے اور اس جادوگر کے پاس جاکر جادو سیکھا کرے، یا کاہن کے پاس جاکر کہانت سیکھے، وہ بچہ باقاعدگی کے ساتھ جانے لگ گیا۔ جہاں وہ کاہن یا ساحر رہتا تھا، ادھر جاتے ہوئے راستے کے اندر ایک راہب رہتا تھا، راہب کی کٹیا تھی، یہ درویش لوگ جس طرح سے آبادیوں سے باہر جنگلات میں اپنی کوئی کٹیا بنا کے رہتے تھے، اس طرح سے ایک راہب کی کٹیا تھی، وہ راہب اس زمانے کے اہلِ حق میں سے تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دِین پر تھا، وہ لڑکا جس وقت اس جادوگر کی طرف جاتا راستے میں اس راہب سے اس کی ملاقات ہوگئی، اس کے پاس بیٹھنے اُٹھنے لگ گیا، ذہین تھا، راہب کی باتیں سنیں وہ اس کے دِل پر اثر انداز ہوگئیں، اور وہ راہب کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا، اور دینِ عیسوی اس نے سیکھ لیا، اور اس دِین کے مطابق اس نے اپنے نظریات بنالیے اور اپنا عمل بنالیا۔ اب وہ جادوگر جو تھا جس وقت یہ بچہ وہاں دیر سے پہنچتا تو راہب نے اسے کہہ دیا تھا کہ تُو کوئی حیلہ بہانہ کردیا کر، تاکہ وہ تجھے شدت کے ساتھ روکے نہ، گھر والے پوچھیں کہ دیر سے کیوں آیا تو بھی کوئی عذر کردیا کر، تو وہ لڑکا اسی طرح سے کچھ عذر وغیرہ کرکے کام چلاتا رہا، نہ ساحر کو پتا چلا اور نہ گھر والوں کو پتا چلا کہ یہ لڑکا ایمان قبول کرچکا ہے اور اپنا آبائی دِین چھوڑ چکا ہے۔ ایک دِن وہ کہیں جارہا تھا تو راستے کے اُوپر کوئی درندہ موجود تھا اور اس درندے نے راستہ روک لیا تھا، اور لوگ جمع تھے اور گزرنے کے لئے راستہ نہیں تھا، شیر تھا یا کوئی اور درندہ تھا، یہ غلام (لڑکا) بھی پہنچ گیا، اس نے ایک کنکر اُٹھائی اور اُٹھا کے اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کی کہ یا اللہ! اگر راہب کا دِین سچا ہے تو یہ درندہ ہلاک ہوجائے، اور یہ کہہ کر کنکر جو پھینکی تو وہ درندہ ہلاک ہوگیا، یہ پہلی کرامت تھی جو اس بچے کی نمایاں ہوئی، اور ہوئی مجمع میں، اور لوگ اس سے متاثر ہوئے کہ اس کو تو کوئی عجیب علم آتا ہے۔ ایک اندھا آیا، اس نے آکر کہا کہ میرے لیے دُعا کر اللہ مجھے آنکھیں دے دے، وہ کہنے لگا کہ دُعا میں کروں گا، شفا اللہ دے گا، لیکن ضروری ہے کہ شفا دینے والے پر ایمان لاؤ، اندھا بھی مؤمن ہوگیا اور اس نے دُعا تو اُس کی آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ اس طرح سے چند ایک واقعات نمایاں ہوئے تو شہرت ہوگئی، اور لوگ اس کے معتقد ہوتے چلے گئے اِن کرامات کے نمایاں ہونے پر، آخر شکایت بادشاہ تک پہنچ گئی، بادشاہ نے اس کو پکڑوالیا، اور جب حالات پوچھے تو معلوم ہوا کہ جنگل میں کوئی راہب ہے جس نے اس کو یہ دِین سکھایا ہے اور یہ اپنے آبائی دِین سے تائب ہوگیا۔ بادشاہ نے اس راہب کو قتل کروادیا، پھر اس بچے کے متعلق کہا کہ اس کو لے جاؤ پہاڑ کی چوٹی پر، اور بلندی سے لے جاکر اس کو گراؤ، بادشاہ کے کارندے اس کو پکڑ کے لے گئے پہاڑ کی چوٹی پر، لیکن جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو اس بچے کی کرامت وہاں بھی نمایاں ہوئی کہ ایسے طور پر زلزلہ آیا کہ جو اس کو لے کر گئے تھے وہ تو

گر کر سارے کے سارے ہلاک ہوگئے اور یہ بچ گیا۔ پھر اس بادشاہ نے پکڑوایا اور لوگوں کو دیا کہ اس کو لے جا کے دریا میں ڈال آؤ، ڈبو آؤ، تو اس کو پکڑ کے لے گئے کشتی میں بٹھا کر، وہاں بھی ایسا واقعہ پیش آیا کہ جو لے کر گئے تھے وہ ڈوب گئے اور یہ بچہ بچ گیا۔ تو بادشاہ بہت پریشان ہوا کہ آخر اب میں اس کو کس طرح سے سمیٹوں، وہ لڑکا کہنے لگا کہ مجھے تُو نہیں مار سکے گا، ہاں! البتہ اگر تُو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو جو طریقہ میں بتاتا ہوں اس طریقے کے مطابق مجھے قتل کر، پھر میں قتل ہو جاؤں گا۔ بادشاہ نے وہ طریقہ پوچھا تو کہنے لگا کہ یوں کر کے مجھے سُولی پہ لٹکا دے، اور ''بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ'' کہہ کے میرے تیر مار، تو رَبّ کے نام پر میں شہید ہو جاؤں گا۔ چنانچہ یہی طریقہ اپنایا گیا، مخلوق اکٹھی ہوگئی، اور ان کے سامنے اسی طرح سے کیا گیا، اور جب اس بچے کے رَبّ کا نام لے کر تیر مارا گیا تو بچہ شہید ہو گیا۔ لیکن اب وہ بچہ شہید تو ہوا لیکن مخلوق یک دَم اس رَبِّ غلام کا کلمہ پڑھ کے مسلمان ہوگئی، کہ جس غلام کے رَبّ کا یہ حال ہے، جس طرح سے یہ نمایاں ہوا تو سارے کے سارے لوگ مسلمان ہوگئے، بادشاہ پریشان ہو گیا کہ جس مصیبت کو ٹالنے کے لئے اس بچے کو قتل کیا تھا وہ مصیبت تو زور دے کے آگئی، تب غصے میں آ کے اس نے پھر خندقیں کھدوائیں اور ان لوگوں کو ان خندقوں کے اندر ڈالا اور زندہ جلایا۔ یہ واقعہ ''مسلم شریف'' میں اور دُوسری کتابوں[1] کے اندر مذکور ہے ''کتاب التفسیر'' میں، تو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اَصحابُ الاخدود کا نمونہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح سے معاملہ کیا تھا، تو یہ واقعہ بھی اس کا مصداق ہو سکتا ہے، اور تاریخ میں اس قسم کے متعدّد واقعات پیش آئے ان کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

واقعہ ذِکر کرنے کا مقصد

اور یہ واقعہ سُنایا جا رہا ہے مشرکینِ مکہ کو، کہ آج تم ان مسلمانوں کے اُوپر ان کی زندگی کا قافیہ تنگ کیے ہوئے ہو، ان کا قافیۂ حیات تم نے تنگ کر رکھا ہے، تم جیسے بہت بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے ایسے ایسے ظلم ڈھائے تھے، بڑی بڑی قوتوں والے تھے، بڑے بڑے لشکروں والے تھے، لیکن آخر دُنیا کے اندر بھی وہ برباد ہوئے آخرت میں بھی برباد ہوئے۔ اگر اِن ایمان قبول کرنے والوں کو تم بھی اسی طرح سے ستاتے رہے......! اور کوئی ان کا قصور نہیں ہے جس کا تم انتقام لے رہے ہو، انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی کہ جس کا تم ان پر عیب لگا رہے ہو، ایک یہی بات ہے کہ یہ ایمان لے آئے، ایسے لوگوں پر پہلے بہت لوگوں نے مظالم کیے ہیں، لیکن نتیجہ انہی کے حق میں خراب نکلا......! تو اس واقعے کا ذِکر کر کے مشرکین کو بھی دھمکایا جا رہا ہے، اور ساتھ مسلمانوں کی جرأت بڑھائی جا رہی ہے کہ ایمان قبول کرنے پر اس قسم کی سختیاں دُنیا میں آیا کرتی ہیں، اور یہ امتحانات ایسے ہیں کہ ان میں ثابت قدم رہنا چاہیے، گھبرانا نہیں چاہیے، مسلمانوں کو یہ واقعہ سُنا کے ثابت قدم رکھا جا رہا ہے کہ پہلے مؤمنین کے ساتھ بھی ایسے ہوا تھا، اور انہوں نے اللہ کے راستے میں یہ سختیاں برداشت کیں، اس لئے مشرکینِ مکہ اگر تمہیں تکلیفیں پہنچاتے ہیں، تم پر سختی

(۱) مسلم جلد دوم کا تقریباً آخر باب قصۃ اصحاب الأخدود۔ ترمذی ۱۷۱/۲، تفسیر سورۃ البروج۔ مسند احمد ج ۶ ص ۱۷ عن صہیب، رقم ۲۳۹۳۱۔

کرتے ہیں، تو تمہیں اللہ کے نام پر ان سب تکلیفوں کو برداشت کرنا چاہیے، پچھلی اُمتوں کے واقعات کا سُنانا اس طرح سے تثبیتِ قلب کا باعث بھی بنتا ہے...... جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ سرورِ کائنات ﷺ کعبہ کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے اپنی چادر سرہانے رکھ کے، اتنے میں بعضے مسلمان آئے اور وہ مشرکوں کے ہاتھوں سے تکلیف اُٹھا کے آئے تھے، اور آ کے حضور ﷺ کے سامنے ذِکر کیا کہ یا رسول اللہ! دُعا کیجئے اللہ انہیں برباد کرے، تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہ کچھ تکلیفوں سے گھبرائے ہوئے ہیں، اس لئے اس قسم کی بات کر رہے ہیں، آپ ﷺ اُٹھ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ بس! اتنی سی بات سے گھبرا گئے ہو؟ پہلی اُمتوں کے اندر جو لوگ اِیمان لے آتے تھے کافر انہیں پکڑتے، پکڑنے کے بعد زمین میں گاڑ دیتے، اور بعد میں آری لیتے، اور ان کے سر کے اُوپر رکھ کے اس طرح سے ان کو چیر کے دو ٹکڑے کر دیا کرتے تھے، آریوں کے ساتھ لوگوں نے چِرجانا تو برداشت کیا، لیکن جو کلمۂ اِیمان انہوں نے پڑھ لیا تھا اس سے وہ باز نہیں آئے، اور اسی طرح سے بعضے بعضے مؤمنین کو کافر پکڑ لیتے تھے اور لوہے کے دندانے لے کر، کوئی دندانے دار چیز لے کر زندہ انسانوں کے اس طرح سے چمڑے نوچ لیتے تھے، ہڈیوں کے اُوپر سے یوں کر کے اُن کا گوشت اور چمڑے اُتار دیتے تھے، لوگوں نے یہ سختیاں بھی برداشت کی ہیں اور وہ ایمان سے باز نہیں آئے، اور تم ابھی گھبرا گئے ہو؟[1] تو اس قسم کے واقعات نقل کر کے اصل میں ہمت بڑھانی مقصود ہوتی ہے کہ جو اِیمان کی دولت تم نے حاصل کی ہے اِس اِیمان کی دولت کے لئے اِس قسم کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، کافر اور مشرک پریشان کیا کرتے ہیں، گھبرانے کی بات نہیں ہے، اچھا نتیجہ تمہارے سامنے ہی آئے گا۔ اُدھر اُن (مشرکین) کو تنبیہ کر دی کہ اس طرح کے ظلم پہلے لوگوں نے بھی کیے تھے اور ان کے حق میں ان کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا، اِدھر مؤمنین کو حوصلہ دلا دیا کہ ایمان کی دولت کی حفاظت کے لئے ایسی مصیبتیں اُٹھانی پڑا کرتی ہیں، اور تم اللہ کے نام پر بہادری کے ساتھ، صبر کے ساتھ، استقلال کے ساتھ ان مصیبتوں کو برداشت کرو، آخر نتیجہ تمہارے حق میں ہی اچھا ہوگا۔ تو اس کے دونوں پہلو ہیں، مؤمنین کو صبر کی تلقین ہے اور ان کو اِستقلال کا سبق دیا جا رہا ہے، اور مشرکین جو مؤمنین کو پریشان کرنے والے تھے ان کو اس واقعے کے ذریعے سے دھمکایا جا رہا ہے۔

''برباد ہو گئے خندق والے یعنی ایندھن والی آگ والے'' ایندھن کا لفظ اس لیے ذِکر کر دیا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ بہت کثرت کے ساتھ ایندھن ڈال کے آگ بھڑکائی گئی تھی، تاکہ جلدی وہ بجھے نہیں، ''جبکہ وہ اس کے اُوپر بیٹھنے والے تھے'' انتقام کرنے کے لئے اور اپنے سامنے یہ سزا دلوانے کے لئے، ''اور جو کچھ وہ مؤمنوں کے ساتھ کر رہے تھے اس کو دیکھنے والے تھے'' یعنی ایسے سنگدل تھے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے مؤمنین کو انہوں نے آگ میں جلوایا اور وہ متاثر نہیں ہوئے، ''نہیں عیب لگایا اُنہوں نے اُن مؤمنین پر، یا نہیں انتقام لیا اُن مؤمنین سے'' دونوں طرح ترجمہ میں نے آپ کے سامنے کیا، ''نہیں عیب لگایا اُنہوں نے اُن مؤمنین پر سوائے اس کے کہ وہ مؤمن ایمان لے آئے تھے اللہ پر جو عزیز ہے، حمید ہے، جو آسمان اور زمین کا

(۱) بخاری ۱/ ۵۴۳، باب مالقی النبی واصحابہ من المشرکین بمکۃ/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۵، باب علامات النبوۃ، فصل اوّل۔

مالک ہے، اور اللہ ہر چیز کے اُوپر نگہبان ہے" ہر کسی کا حال اُس کے سامنے ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تو تھا ہی اس قابل کہ اُس کے اُوپر ایمان لایا جائے، یہ ایمان لانا کوئی عیب نہیں تھا جس کی بنا ان کو سزا دی جاتی، اور انہوں نے سوائے اس کے اور کوئی قصور نہیں کیا تھا جس کی بنا پر یہ سزا دیے گئے، نہ اِن کے اُوپر کوئی اس کے علاوہ وہ عیب لگا سکے، نہ اس کے علاوہ کسی دُوسری چیز کا انتقام انہوں نے لیا، اور یہ چیز انتقام کے قابل ہے نہیں، اور یہ چیز کوئی عیب ہے نہیں، مطلب یہ ہے کہ بلا قصور ان کے اُوپر یہ ظلم کیا گیا۔ ''اللہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے'' اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

فریقین کا انجام اور ترغیبِ توبہ

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ: بے شک وہ لوگ جو کہ فتنے میں ڈالتے ہیں مؤمن مردوں کو اور مؤمن عورتوں کو، فتنے میں ڈالتے ہیں یعنی سزائیں دیتے ہیں، دِین سے پھسلانے کے لئے ان کو سزائیں دیتے ہیں۔ بے شک وہ لوگ جو کہ فتنے میں ڈالتے ہیں مؤمن مردوں کو اور مؤمن عورتوں کو، پھر انہوں نے توبہ نہیں کی اُن کے لئے جہنّم کا عذاب ہے، اور اُن کے لئے جلنے والی آگ کا عذاب ہے، یا، جلنے کا عذاب ہے، ایک ہی بات ہے۔ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا کے اندر گنجائش نکال دی کہ جو مؤمنین کو تکلیفیں پہنچا چکے ہیں اگر آج بھی توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ یہ قصور بھی معاف کردے گا، جس طرح باقی غلطیاں معاف کردے گا تو ایذائے مؤمنین کا قصور بھی معاف ہوجائے گا اگر توبہ کرلیں، یہ نہیں کہ مؤمنین کو سزائیں دینے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوگیا، ایسی بات نہیں، جہنّم میں وہ لوگ جائیں گے اور جلنے والی آگ کا عذاب وہ لوگ اُٹھائیں گے جو کہ تکلیفیں پہنچاتے رہے پھر توبہ نہیں کی، توبہ کرلیں تو یہ قصور بھی معاف ہوسکتا ہے۔ ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے فتنے میں ڈالا، جنہوں نے سزائیں دیں مؤمن مردوں کو اور عورتوں کو پھر انہوں نے توبہ نہیں کی ان کے لئے جہنّم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلنے والی آگ کا عذاب ہے'' عَذَابُ جَهَنَّمَ میں تعمیم ہوجائے گی اور جلنے والی آگ کے عذاب کا خاص طور پر ذکر ہوگیا، کیونکہ جہنّم میں صرف آگ کا عذاب ہی نہیں، سانپ، بچھو، اور متعدد قسم کے عذاب ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہ بشارت دے دی ان پٹنے والے مظلوموں کو، ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان کے لئے باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں'' ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اِس کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے دُنیا کے اندر اگر مصیبتیں آتی ہیں تو ان کو ہنسی خوشی سے برداشت کرو۔

صفاتِ اِلٰہی کا تذکرہ اور اس کا مقصد

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ: بے شک تیرے رَبّ کی پکڑ بہت سخت ہے، اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ: وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا، وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ: وہ بخشنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے، ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ: عرش کا مالک ہے عظمت والا ہے، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ: کرنے والا ہے اس کام کو جس کا وہ ارادہ کرلے، جو ارادہ کرلے وہ کر جاتا ہے، کوئی سامنے رُکاوٹ پیدا کرنے والا نہیں۔ تو یہ جو اللہ تعالیٰ کے یہاں افعال ذِکر کیے گئے ہیں اس کا تعلق بھی دونوں فریقوں کے ساتھ ہے، کافروں کو کہا جارہا ہے کہ تیرے رَبّ کی پکڑ بہت سخت ہے جب وہ پکڑے گا، اس لئے یہ ڈھیل جو دے رکھی ہے تو اس میں بھول نہ جانا، دھوکے میں نہ پڑ جائیو، یہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ڈھیل دی ہے، جب پکڑے گا تو بہت سخت پکڑے گا۔ اور ایسے ہی ابداء اور اعادہ کا ذکر کردیا کیونکہ جزا اور سزا کا تعلق اسی کے ساتھ ہی ہے، سزا اللہ تعالیٰ دے گا اور اس کے سزا دینے کا وقت یہی ہے کہ دوبارہ زندہ کرے گا، تو زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں، جیسے پہلی دفعہ پیدا کیا ایسے دوبارہ لوٹا لے گا۔ اور وہ غفور و دود بھی ہے، اس میں مؤمنین کے لئے بشارت ہے، بخشنے والا ہے محبت کرنے والا ہے۔ اور عرش عظیم کا مالک ہے، بادشاہت اس کو حاصل ہے۔ اور جو چاہے کر گزرتا ہے، وہاں سے پھر اس کو کوئی چھڑوا نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ جس کام کا ارادہ کرلے اس کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں پیدا کرسکتا، نیکوں کو اللہ اچھا بدلہ دینا چاہے کوئی رُکاوٹ نہیں پیدا کرسکے گا، بُروں کو سزا دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکے گا۔

گزشتہ قوموں کی تباہی کا ذِکر اور اس کا مقصد

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ: کیا آپ کے پاس لشکروں کی بات آئی؟ یہ بھی انہی کو دھمکانا مقصود ہے کہ آج تم اپنی پارٹی پر اور اپنے لشکر پر اگر نازاں ہو تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے پہلے بہت بہت لشکروں والے گزرے ہیں، اُن کا واقعہ بھی سُن لیا ہوگا، یہ خطاب عام ہے، ''کیا آپ کے پاس جنود کی بات آئی؟ آپ نے وہ بات سنی؟'' جنود جُند کی جمع ہے، جُند لشکر کو کہتے ہیں، فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ: یعنی فرعون اور ثمود کا قصہ سُنا؟ کیا آپ نے فرعون اور ثمود کا قصہ سُنا؟ چونکہ دُوسری سورتوں کے اندر یہ سُنایا جاچکا، صرف یاددہانی کرانی مقصود ہے، تو فرعون اور ثمود یہ کتنی کتنی قوتوں والے تھے، لشکروں والے تھے، عظمتوں والے تھے ظاہری طور پر دُنیا میں، مال ودولت والے تھے، جتھے والے تھے، تو مشرکینِ مکہ کوئی ان سے زائد تو نہیں ہیں، اگر انہوں نے یہ فرعون اور ثمود کا واقعہ سُن لیا ہے تو ان کو سمجھ جانا چاہیے کہ جیسے وہ لوگ حق کی مخالفت کرنے کی پاداش میں برباد کردیے گئے تو اِن کا انجام بھی یہی ہوگا، ''یعنی فرعون اور ثمود'' یہ جُنود سے بدل ہوجائے گا۔ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ: ان واقعات کو سننے کے بعد یہ کافر مانتے نہیں، بلکہ کافر لوگ تکذیب میں ہیں، جھٹلانے میں ہیں، پوری طرح سے مگن اور مست ہیں جھٹلانے میں، ''اللہ تعالیٰ ان کے پیچھے سے ان کو گھیرنے والا ہے''، وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىٕهِمْ مُّحِیْطٌ: اللہ تعالیٰ ان کو گھیرے میں لینے والا ہے ہر طرف سے، وَراء آگے پیچھے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ ان کو ان کے پیچھے سے گھیرنے والا ہے۔''

عظمتِ قرآن

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ: اور یہ کتاب جس میں یہ واقعات بیان کیے جارہے ہیں یہ بھی تکذیب کے قابل نہیں، نہ یہ کہانت ہے نہ شعر ہے، نہ شاعری ہے، نہ سحر ہے، جس طرح سے وہ کہتے تھے، ''بلکہ یہ ایک بزرگ قرآن ہے لوحِ محفوظ میں''، لوحِ محفوظ میں یہ مذکور ہے اور وہاں سے پوری حفاظت کے ساتھ اِس دُنیا میں اُتارا گیا، اور جس حفاظت کے ساتھ اُتارا گیا، جو اس کے لانے والے ہیں سب کا تذکرہ آپ کے سامنے کردیا گیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب محفوظ طریقے سے دُنیا میں آئی ہے، یہ جھٹلانے کے قابل نہیں بلکہ ایمان لانے کے قابل ہے، اور جو نتائج یہ ذِکر کررہی ہے یہ نتیجے لازماً سامنے آنے والے ہیں، کیونکہ یہ کوئی شاعری یا کوئی تخیلاتی بات نہیں ہے، جس طرح سے شاعر ایک تخیل قائم کرلیتے ہیں اور ایک واقعہ سا بنا لیتے ہیں، ایسی بات نہیں، یہ اللہ کی کتاب

ہے، بڑی عظمت والی کتاب ہے، لوحِ محفوظ میں ہے، اور پوری حفاظت کے ساتھ یہ دُنیا میں اُتاری گئی ہے، اس لئے جو حقائق اس کے اندر پیش کئے گئے ہیں وہ حرف بہ حرف ٹھیک ہیں، نقطہ بنقطہ صحیح ہیں، اور یہ نتیجے سامنے آ کے رہیں گے جن نتیجوں کی طرف اشارہ یہ کتاب کر رہی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتھا ۱۷ ۸۶ سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ ۳۶ رکوعھا ۱

سورۂ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۷ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳ اِنْ كُلُّ

قسم ہے آسمان کی اور رات کو آنے والے کی ۝ آپ کو کیا معلوم کہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ۝ چمکدار ستارہ ہے ۝ نہیں ہے کوئی

نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝۶

نفس مگر اس کے اُوپر نگران ہے ۝ چاہیے کہ غور کرے انسان، وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ ۝ پیدا کیا گیا وہ ایک اُچھلنے والے پانی سے ۝

يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝۷ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝۸ يَوْمَ

جو پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے ۝ بے شک وہ اللہ اس انسان کو لوٹانے پر البتہ قادر ہے ۝ جس دن

تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝۹ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝۱۰ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱ وَ

بھیدوں کو آزمایا جائے گا ۝ پھر انسان کے لئے نہ قوت ہوگی، نہ کوئی مددگار ہوگا ۝ قسم آسمان کی جو کہ مسلسل بارش والا ہے! ۝ اور

الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝۱۲ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝۱۳ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴ اِنَّهُمْ

قسم زمین کی جو کہ پھٹن والی ہے! ۝ بے شک یہ فیصلہ کن بات ہے ۝ اور یہ کوئی ٹھٹھا نہیں ہے ۝ بے شک یہ لوگ

يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝۱۵ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝۱۶ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷

تدبیریں کر رہے ہیں ۝ اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں ۝ مہلت دے دیجئے آپ کافروں کو، انہیں کچھ تھوڑی سی مہلت دے دیجئے ۝

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۷ آیتیں ہیں۔ مضمون اس میں بھی وہی ہے جو پچھلی سورت میں گزرا، آخرت کی یاددہانی ہے، اور اِنسان کے سامنے بعث بعد الموت کے مسئلے کو ذِکر کر کے اس کو اس کی مسئولیت کا احساس دلایا جارہا ہے، کہ تیرا ایک ایک عمل ایک ایک قول محفوظ ہے، اور وقت پر اللہ تعالیٰ اس کے اُوپر جزا یا سزا مرتب فرمائیں گے، اور بعث بعد الموت کے متعلق مشرکین جس قسم کے اِشکال کرتے تھے، بظاہر ان کو یہ بات بعید معلوم ہوتی تھی، تو مختلف سورتوں میں آپ کے سامنے انسان کی خلقت سے اس کے اُوپر اِستدلال کیا جارہا ہے، تو اس میں بھی وہی مضمون ہے، تو بارہا آپ کی خدمت میں ذِکر کیا جاچکا کہ اِبتدائی سورتوں میں زیادہ تر یہی مضمون ذِکر کیا گیا ہے۔

تفسیر

آسمان اور ستارے کی قسم!

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ: واؤ قسمیہ ہے، قسم ہے آسمان کی اور طارق کی، طارق: رات کو آنے والا، طَرَقَ یَطْرُقُ سے، ''اور رات کو آنے والے کی''، وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ: آپ کو کیا معلوم کہ طارق کیا ہے؟ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ: چمک دار ستارہ، چمکتا دمکتا ستارہ، یہ ہے طارق کا مصداق، تو گویا کہ اِس آیت میں ستارے کی قسم کھائی گئی ہے، قسم براہِ راست طارق کی کھائی گئی اور طارق کا مصداق بنایا گیا نجم ثاقب کو، تو قسم نجم ثاقب کی ہی ہوئی، چمکتے ہوئے ستارے کی۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے کہ سورۂ نجم کے اندر بھی گزرا تھا وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، وہاں بھی ستارے کی قسم تھی، اور لَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ سورۂ واقعہ کے اندر بھی اسی طرح سے ستاروں کا تذکرہ آیا تھا۔ تو آسمان اور ستارے دونوں کی یہاں قسم کھائی گئی ہے۔

جوابِ قسم

اور قسم کھا کر جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ: اِنْ نافیہ ہے، اور لَمَّا بمعنی اِلَّا، ''نہیں ہے کوئی نفس مگر اس کے اُوپر نگران ہے'' یعنی ہر نفس کے اُوپر نگران اور حافظ متعین ہے، کوئی نفس ایسا نہیں جس کے اُوپر نگران نہ ہو۔ اِن نافیہ، ''نہیں ہے کوئی نفس مگر اُس کے اُوپر نگرانی کرنے والا ہے'' یعنی ہر نفس کے اُوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حافظ اور نگران متعین ہے۔ حافظ: حفاظت کرنے والا، نگرانی کرنے والا، اِس کے دو مقصد ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کرنے والے فرشتے بھی انسان پر متعین ہیں جو اس کو مختلف قسم کی آفات اور مصیبتوں سے بچاتے ہیں، سورۂ رعد کے اندر بھی اِس کا ذِکر آیا تھا لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (آیت:۱۱) اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ اس دُنیا کے اندر چاروں طرف انسان کے دُشمن پھیلے ہوئے ہیں، کیڑے مکوڑے سے لے کر بڑی سے بڑی چیز اِنسان کی دُشمن ہے، یہ مچھر ہی ہے آپ سنتے رہتے ہیں کہ ایک مچھر نمرود کے دماغ میں گھس گیا تھا تو زندگی بھر کے لئے اس ایک ہی مچھر نے اس کے لئے جوتے

کھانے کا انتظام کر دیا، تو اب یہ کتنے ہی مچھر ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آپ کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور آپ ناک کے راستے سانس بھی لیتے ہیں لیکن کوئی مچھر آپ کے دماغ میں نہیں گھستا، اور اسی طرح سے یہ کیڑے مکوڑے زہریلی چیزیں، ان سب چیزوں سے حفاظت اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتے کرتے ہیں، ایسے ہی غیبی مخلوق جنات وغیرہ۔ ہاں! جہاں اللہ کی مشیت ہوتی ہے، کوئی تکلیف پہنچانے میں اللہ کی حکمت ہوتی ہے وہاں کچھ تھوڑی سی حفاظت اُٹھادی جاتی ہے، ورنہ عام طور پر فرشتوں کے ذریعے سے انسان کو محفوظ کیا ہوا ہے...... تو حافظ کا یہ معنی بھی ہے، اور حافظ سے حافظ الاعمال بھی مراد لے سکتے ہیں، وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ سورۂ انفطار کے اندر جس کا ذکر آیا تھا کہ تم پر نگرانی کرنے والے متعین ہیں جو کہ بہت شریف الطبع، لکھنے والے ہیں، جو تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں، تو یہاں حافظ سے اعمال کا نگران اور اعمال کے لکھنے والا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

قسم کی جوابِ قسم کے ساتھ مناسبت

اللہ تعالیٰ آسمان اور چمک دار ستاروں کو بطور شاہد کے پیش کرتا ہے، اس کی قدرت نمایاں ہے، آسمان اور ستارے، ستارے آسمان کے لئے حفاظت کا ذریعہ ہیں کیونکہ ستاروں کے اندر قلعے ہیں، جہاں فرشتے بیٹھے آسمان کی حفاظت کرتے ہیں، شیاطین اُوپر کو جاتے ہیں تو وہاں سے ان کو شہابِ ثاقب کے ذریعے سے رجم کیا جاتا ہے، تو ہوا ایک حفاظت کا سامان ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی محفوظ کیا ہوا ہے اس پر بھی اسی طرح سے نگران متعین ہیں، اور جیسے آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے، اور ہیں بھی وہ چمک دار، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ نظر نہیں آتے، دِن کے وقت وہ ستارے نظر نہیں آتے، جب رات کی تاریکی ہوتی ہے تو نظر آجاتے ہیں، تو آسمان کی طرف دیکھو، اس کے اُوپر بے شمار ستارے ہیں جو ایک وقت نظر آتے ہیں اور ایک وقت نظر نہیں آتے۔ اسی طرح سے آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کے اعمال اِس وقت اگرچہ نمایاں نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب کو محفوظ کیا ہوا ہے، ایک وقت آئے گا کہ سارے کے سارے آپ کے سامنے نمایاں ہو جائیں گے، چھپی ہوئی چیزیں ظاہر ہو جائیں گی ایک وقت ایسا آجائے گا، اس طرح سے اس قسم کی اس مضمون کے ساتھ مناسبت ہو جاتی ہے جو مضمون اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے، اور اس کے ذریعے سے انسان کو احساس دلایا جا رہا ہے کہ تو ہر وقت اللہ کی نگرانی میں ہے، اللہ کی نگرانی سے باہر نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی فوج تیرے پیچھے لگی ہوئی ہے، ہر وقت تجھے تاک رہی ہے، تیرا کوئی عمل مخفی نہیں، اور سب کچھ محفوظ ہو رہا ہے۔ اور جو شخص اپنے اندر یہ احساس پیدا کرلے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا ریکارڈ ہو رہا ہے اور یہ محفوظ کیا جا رہا ہے، اور ایک دِن یہ سارے کا سارا دفتر میرے سامنے کھول دیا جائے گا، یقیناً وہ لاپروائی چھوڑ دے گا اور سوچ سوچ کر قدم اُٹھائے گا اور سوچ سوچ کر بولے گا، اور یہی احساس دِلانا مقصود ہے کہ انسان لاپروائی کے ساتھ وقت نہ گزارے، بہت محتاط زندگی گزارے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک کام کی ذمہ داری محسوس کرتا ہوا وقت گزارے، جو منہ سے نکلے اس کی بھی اس کی ذمہ داری ہے اور اُس کا اُس کو حساب دینا پڑے گا، اور جو کام وہ کرتا ہے تو وہ بھی اس کی ذمہ داری ہے تو اس کا حساب بھی اُسے چکانا پڑے گا، اچھا کام کیا ہے تو بدلہ پائے گا، بُرا کام کیا ہے تو

سزا پائے گا، یہ احساس بیدار کیا جارہا ہے انسان کے اندر، اور جو شخص بھی اس احساس کو حاصل کرلے اور اس کے دل ودماغ کے اندر یہ خیال جاگزیں ہوجائے یہ بات جم جائے تو وہ ہر بات سے پہلے سوچے گا، ہر کام سے پہلے سوچے گا، اور کبھی بھی لاپروائی کے ساتھ اور غفلت کے ساتھ وہ کام نہیں کرے گا، اسی سے پھر آگے انسان کی زندگی کا رُخ سیدھا ہوجاتا ہے، اور پھر آگے جو بھی اَحکام دیے جائیں اُن کو قبول کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

اِثباتِ معاد کے لئے اِنسان کی اِبتدا کا ذِکر

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ: وہی! خلقت کی بات آگئی، کہ اگر تمہارے دِل میں یہ خیال آتا ہے کہ مرنے کے بعد کہاں اُٹھنا اور کہاں اعمال کی جزا سزا؟ تو اس کو سمجھانے کے لئے یہ بات کہی جارہی ہے کہ چاہیے کہ غور کرے انسان کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا، فَلْيَنْظُرْ اَمر کا صیغہ ہے، ''چاہیے کہ غور کرے انسان، وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔'' خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ: پیدا کیا گیا وہ ایک اُچھلنے والے پانی سے، دفق: اُچھلنے کو کہتے ہیں، ''ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا'' يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ: صُلب کہتے ہیں کمر کو، اور ترائب یہ تریبہ کی جمع ہے، یہ کہتے ہیں پسلی کو، ترائب: پسلیاں، ''جو پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے'' یہ پشت اور پسلیاں بدن کی دونوں طرفیں ہوگئیں، مطلب یہ ہے کہ وہ پانی انسان کے بدن سے ٹپکتا ہے، اور اس کی تیاری کے اندر چونکہ اعضائے رئیسہ کا دخل ہے، سب سے زیادہ دخل نطفے کی تیاری میں دماغ کا ہے، یہی وجہ ہے کہ جس وقت یہ مادّۂ منویہ زیادہ خارج ہو تو ضعفِ دماغ ہوجاتا ہے، اور دماغ کا تعلق حرام مغز کے ذریعے سے ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ہے، اور اس کا اثر پڑتا ہے آگے جاکے گردوں پہ، تو خصیتین سے اس کا تعلق ہوتا ہے، گردوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے، اور سینے کے اندر یہ اعضائے رئیسہ ہیں، جگر ہے، قلب ہے، یہ سارے کے سارے اعضا دخیل ہیں اس مادّۂ منویہ کے تیار کرنے میں، ان کے ذریعے سے مادّۂ منویہ تیار ہوتا ہے، اور ایک وقت پر اس کو ٹپکایا جاتا ہے، اور اس کے ٹپکانے کے بعد اِنسان کی بنیاد اُٹھائی جاتی ہے، تو ایک ایسا قطرہ جو اِنسان کے بدن سے ہی تیار ہوکے ٹپکا، اس سے انسان کی بنیاد اُٹھائی گئی، تو جو اللہ اس طرح سے پانی کے قطرے سے انسان کو بناسکتا ہے، تو مارنے کے بعد دوبارہ بنانا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔ تو انسان کی خلقت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے'' چاہیے کہ دیکھے انسان کہ کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ پیدا کیا گیا ٹپکنے والے پانی سے، جو نکلتا ہے صلب اور پسلیوں کے درمیان سے'' یعنی بدن سے ہی وہ نچڑتا ہے، بدن سے ہی تیار ہوتا ہے اور بدن سے ہی نکلتا ہے، کوئی ایسا نایاب جوہر نہیں ہے کہ جس کو دوبارہ حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل ہو، اِس کی تیاری بھی انسان کے بدن میں ہی ہوتی ہے۔ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ: بےشک وہ اللہ اِس انسان کے لوٹانے پر البتہ قدرت رکھنے والا ہے، جس نے اِبتداءً بنادیا وہ اس کے لوٹانے پر بھی قادر ہے، یہی بات مشرکین کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور یہی بار بار ان کو سمجھائی جارہی ہے۔ رَجْعٌ۔ رَجَعَ رُجُوْعًا اگر مصدر ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے لوٹنا، اور رَجَعَ رَجْعًا اگر ہو تو لوٹانا۔ یہاں رَجْعٌ ہے اور اِضافت اِس کی مفعول کی طرف ہے، ''بےشک وہ اللہ اِس انسان کے لوٹائے جانے پر البتہ قادر ہے، یا، اِس انسان کو لوٹانے پر قادر ہے۔''

قیامت کے دِن کے حالات

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ: سرائر سریرۃ کی جمع ہے، سریرۃ: چھپی ہوئی چیز، بھید۔ تُبْلیٰ یہ بَلَا یَبْلُو سے ہے آزمانا، ''جس دن کہ بھید آزمائیں جائیں گے''، یعنی چھپی ہوئی چیزوں کی بھی آزمائش کی جائے گی، ہر چیز کا کھوٹ نکل آئے گا، اور ہر چیز کا کھرا پن نمایاں ہوجائے گا، ''جس دِن کہ بھیدوں کو آزمایا جائے گا'' جن چیزوں کو انسان اپنے دِلوں میں چھپاتا ہے مخفی کرتا ہے سب کی آزمائش ہوجائے گی کہ ان میں سے کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط ہے؟ اور اس کا حاصل ترجمہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے کیا ہے کہ جس دِن ہر چیز کی قلعی کھل جائے گی، یہ اُردو محاورہ ہے، مطلب یہی ہے کہ ہر چیز کی قلعی کھل جائے گی، ہر چیز کی حقیقت نمایاں ہوجائے گی، ''جس دِن بھیدوں کو آزمایا جائے گا۔'' فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ: پھر انسان کے لئے نہ قوت ہوگی نہ کوئی مددگار رہوگا، یعنی اس کو خود بھی قوتِ مدافعت حاصل نہیں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو معاملہ اس کے ساتھ کیا جائے تو اپنے زور کے ساتھ انسان اس کو ٹال دے، اس کو خود بھی قوت حاصل نہیں ہوگی اور نہ اس کے لئے کوئی مددگار رہوگا جو اس کو اللہ کے عذاب سے بچالے، سرائر کے سامنے آجانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ اس کے اعمال کے مطابق ہوگا، اور جو معاملہ ہوگا انسان کو برداشت کرنا پڑے گا، نہ تو اس کے پاس خود قوت ہوگی کہ اس معاملے سے بچ جائے اس کو ٹال دے، قوتِ مدافعت اس کے پاس نہیں ہوگی، اور نہ اس کا کوئی مددگار رہوگا۔

قیامت کی خبر مذاق نہیں، حقیقت ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ: رَجع سے مسلسل ہونے والی، پے در پے ہونے والی بارش مراد ہے، ''آسمان کی قسم جو کہ مسلسل بارش والا ہے'' وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ: اور زمین کی قسم جو کہ پھٹن والی ہے، صَدْعٌ: پھٹنا، ذاتِ صدع سے مراد ہے نباتات والی، کیونکہ آسمان کی طرف سے بار بار بارش ہوتی ہے تو زمین پھولتی ہے پھٹتی ہے اور اس میں سے نباتات نکلتی ہیں، اور قرآنِ کریم میں بارہا آپ کے سامنے بارش کا اور زمین سے نباتات کے اُگنے کا ذِکر آیا، اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ بعث بعد الموت کے لئے مثال بناتے ہیں۔ ''قسم ہے آسمان کی جو کہ مسلسل بارش والا ہے، یا: پے در پے بارش والا ہے جو لوٹ لوٹ کے آتی ہے، ''اور قسم زمین کو جو کہ پھٹنے والی ہے'' یعنی نباتات والی ہے، کیونکہ نباتات کے ذریعے سے زمین پھٹتی ہے، آسمان کی طرف سے بارش ہوتی ہے زمین نباتات کے ساتھ پھٹتی ہے۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ: فصل: فیصلہ کُن، فاصل کے معنی میں ہے، ''بے شک یہ قرآن ایک فیصلہ کن بات ہے'' وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ: یہ کوئی ٹھٹھا مذاق نہیں ہے، اس کو یہ نہ سمجھو کہ یہ ایسے ہی ہنسی مخول کے طور پر کوئی بات کہی جارہی ہے، نہیں، یہ فیصلہ کن بات ہے...... یا اِنَّهٗ کی ضمیر خصوصیت کے ساتھ اِس خبر کی طرف لوٹا لیجئے جو انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے کے متعلق پیچھے ذکر کی گئی، کہ ہم جو کہتے ہیں کہ بھید آزمائے جائیں گے اور اِنسان گرفت میں آئے گا، بچ نہیں سکے گا، کوئی اس کا مددگار نہیں ہوگا، اللہ اس

کو دوبارہ زندہ کرے گا، اُس وقت یہ واقعات معاملات سارے کے سارے سامنے آئیں گے، یہ فیصلہ کن بات ہے، اٹل بات ہے، یہ کوئی ہزل یا ٹھٹھا نہیں ہے۔ اور نیک بخت وہی ہیں جو اس پر یقین کر لیں اور یقین کرنے کے بعد اس دِن کی تیاری کریں، اور اگر تم اس کو سمجھو گے کہ یہ مذاق ہے تو تمہارے مذاق سمجھنے سے یہ ٹل نہیں جائے گی، ہماری طرف سے یہ اٹل بات ہے کہ ایسا ہوگا، تو تمہاری نیک بختی یہی ہے کہ تم اس کے مطابق عقیدہ رکھو اور اس دِن کی تیاری کرو۔ ''بے شک یہ فیصلہ کن بات ہے، اور یہ کوئی ٹھٹھا نہیں ہے، ہزل نہیں ہے'' ہزل کا معنی ہوتا ہے کہ بات کی جائے اور اس کا مفہوم مقصود نہ ہو، جیسے آپ مذاق کیا کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کے لئے تسلی اور کفار کے لئے وعید

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا: بے شک یہ لوگ تدبیریں کرتے ہیں تدبیر کرنا۔ كَادَ كَيْدًا کا معنی ہوتا ہے خفیہ تدبیر کرنا کسی چیز کو شکست دینے کے لئے، ''یہ تدبیریں کر رہے ہیں'' وَّاَكِيْدُ كَيْدًا: اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں، یہ تدبیریں کر رہے ہیں حق کو مٹانے کے لئے شکست دینے کے لئے، اور میں تدبیر کرتا ہوں حق کو غالب کرنے کے لئے مضبوط کرنے کے لئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس وقت انسان کی تدبیر کے ساتھ اللہ کی تدبیر کا مقابلہ ہو تو انسان کی تدبیر اس کے مقابلے میں کیا چیز ہے۔ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا: یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی کی بات ہے، مَهِّلْ تَمْهِيْل سے ہے مہلت دے دینا، یہ لفظ مہلت سے ہی لیا گیا ہے، ''م ہ ل'' اس کا مادّہ ہے، ''مہلت دے دے کافروں کو'' یعنی آپ کے دِل میں اگر یہ خیال ہے کہ ان کا فیصلہ جلدی ہو جائے، میری حکمت کے تقاضے کے مطابق ان کو کچھ مہلت دی جا رہی ہے، اور آپ بھی یہی سمجھ لیجئے کہ ان کے لئے کچھ مہلت ہونی چاہیے، تا کہ جو سمجھنے والے ہیں سمجھ جائیں، اور جو سمجھنے والے نہیں ہیں ان کے اُوپر اِتمامِ حجّت ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مکر کے ساتھ، فریب کے ساتھ، تدبیر کر کے غلبہ حاصل کرنے والے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر اس طرح سے مضبوط ہوتی چلی جاری ہے کہ دِن بہ دِن یہ اس کے شکنجے میں کسے جا رہے ہیں، اس لیے آپ ان کافروں کو ڈھیل دے دیجئے۔ اَمْهِلْهُمْ: یہ اُسی کی تاکید ہے، رُوَيْدًا: یہ اِرْوَادًا کے معنی میں مصدر ہے اور یہ مفعول مطلق ہے اَمْهِلْ کا من غیر لفظہ، اس کا معنی بھی وہی ہے اَمْهِلْهُمْ اِمْهَالًا کافروں کو آپ کچھ مہلت دے دیجئے، اِنہیں کچھ تھوڑی سی مہلت دے دیجئے، یہ بطور تاکید کے ذِکر کیا جا رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ بھی اپنے دِل میں گنجائش رکھیے کہ کچھ دیر یہ اُچھل کود لیں اور جو کچھ یہ مکر و فریب کرنا چاہتے ہیں کر لیں، پھر جب اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے پھر چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، جیسے پچھلی سورت کے اندر ذِکر کیا گیا تھا وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ، یہی مضمون گویا کہ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۞ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا کے اندر مذکور ہے۔

***

آیاتھا ۱۹ ۸۷ سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ ۸ رکوعھا ۱

سورۂ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝۱ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳

اپنے عالی شان رَب کے نام کی پاکی بیان کیجئے ۝ جس نے کہ پیدا کیا پھر دُرست کیا ۝ اور جس نے کہ ایک اندازہ ٹھہرایا پھر راہنمائی کی ۝

وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝۵ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶ اِلَّا

اور جس نے کہ چارہ نکالا ۝ پھر اس کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا ۝ عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں ۝ مگر

مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸

جو اللہ چاہے، بے شک وہ ظاہر اور چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے ۝ اور ہم آپ کے لئے آسانی مہیا کر دیں گے آسان طریقے کے لئے ۝

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰ وَيَتَجَنَّبُهَا

پس آپ نصیحت کرتے رہیے اگر نصیحت نفع دے ۝ عنقریب نصیحت حاصل کرے گا وہ شخص جو ڈرتا ہے ۝ اور دُور رہے گا اس نصیحت سے

الْاَشْقَى ۝۱۱ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝۱۲ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝۱۳ قَدْ

بدبخت آدمی ۝ جو کہ بڑی آگ میں داخل ہوگا ۝ پھر نہ وہ مرے گا اس میں، اور نہ جیئے گا ۝ تحقیق

اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝۱۵ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَ

کامیاب ہوگیا وہ شخص جو پاک صاف ہوگیا ۝ اور اس نے اپنے رَبّ کا نام لیا پھر نماز پڑھی ۝ بلکہ تم ترجیح دیتے ہو دُنیوی زندگی کو ۝ اور

الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝۱۸ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝۱۹

آخرت بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی ہے ۝ بے شک یہ مضمون پہلے صحیفوں میں بھی ہے ۝ یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں ۝

تفسیر

سورۂ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۹ آیتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى: اپنے عالی شان رَبّ کے نام کی پاکی بیان کیجئے، رَبِّ اعلیٰ، اپنے عالی شان رَبّ کے نام کی پاکی بیان کیجئے، اب یہاں دیکھئے "سَبِّحِ" اَمر کا صیغہ آ گیا، تسبیح بیان کیجئے، تسبیح کا معنی ہوتا ہے پاکی بیان کرنا، یعنی اس بات کا اظہار کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نام میں کوئی عیب نہیں، جتنی بھی اس کی صفتیں ہیں سب نقص سے پاک ہیں، اور نام بول کر ذات ہی مراد ہے کہ اللہ کی ذات کو پاک قرار دو، اللہ کے متعلق عقیدہ نفی واثبات پر مشتمل ہے، اثبات تو یہ ہے کہ ہم ہر قسم کا کمال اللہ کے لئے ثابت کریں، اور نفی یہ ہے کہ ہر نقص اور عیب کی اللہ سے نفی کریں، تو جس وقت ہم سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلہِ کہہ دیتے ہیں، تو دونوں تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، کہ اللہ کی ذات تمام کمالات کے ساتھ موصوف ہے اور اس ذات میں کوئی کسی قسم کا نقص اور عیب نہیں پایا جاتا۔ یہاں آ گیا اَمر کا صیغہ، اور یہ آپ کی خدمت میں پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ایسے موقع پر حدیث شریف کے اندر اِن آیات کا کچھ جواب مذکور ہے، جس وقت یہ اَمر کا صیغہ آیا تو اس کے متصل ہی اس کے اُوپر عمل ہو جانا چاہیے،

پہلی آیت کی تلاوت کے وقت مستحب عمل

جب یہ آیت پڑھیں تو اس کے بعد کہہ لیں: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، میرا رَبّ جو عالی شان ہے وہ پاک ہے، تو "سَبِّحِ" پر اس کے ساتھ ہی عمل ہو گیا۔ جب یہ آیت اُتری تھی تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس آیت کو اپنے سجدے میں داخل کرلو۔[1] چنانچہ سُنّت ہے کہ سجدے کے اندر "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" پڑھا جائے، یہ ذِکر سجدے میں پڑھنے کے لئے حضور ﷺ نے اُسی وقت تلقین فرمایا جس وقت یہ آیت اُتری۔ اور سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ کا جو لفظ آیا تھا سورۂ واقعہ کے آخر میں، اس کے متعلق فرمایا تھا کہ اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ، اِس آیت کو تم اپنے رُکوع میں داخل کرلو (حوالہ مذکورہ)، یعنی اس کے اُوپر عمل رُکوع میں کیا کرو، تو "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" یہ اُس آیت کے اُوپر عمل ہے، اور "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" یہ اِس آیت کے اُوپر عمل ہے۔ تو تلاوت کرتے وقت بھی اِس اَمر کے صیغے کو پڑھنے کے بعد لب ولہجہ تبدیل کر کے، قرآنِ کریم کی تلاوت والا لب ولہجہ نہ ہو، لب ولہجہ تبدیل کر کے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" کہہ لینا چاہیے تاکہ اِس اَمر پر متصل ہی عمل ہو جائے۔ "اپنے عالی شان رَبّ کے نام کی پاکی بیان کیجئے" یہ خطاب بظاہر سرورِ کائنات ﷺ کو ہے اور مراد ہر کوئی ہے۔

تمام جان دار چیزوں میں اللہ کی قدرت کا نمونہ

الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى: وہ رَبِّ اعلیٰ جس نے کہ پیدا کیا، پھر دُرست کیا......! بنایا، بنانے کے بعد پھر اس کو ٹھیک بنایا، اعضا میں تناسب رکھا، صورت ٹھیک بنائی، سَوّٰی کا ذکر سورۂ انفطار میں بھی آیا تھا: الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ...... "جس نے کہ پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد دُرست کیا" وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى: اور جس نے کہ ایک اندازہ ٹھہرایا پھر راہنمائی کی۔ قَدَّرَ تَقْدِيْر: اندازہ ٹھہرانا۔ هَدٰى هِدَايَة: راہنمائی کرنا۔ یہاں خَلَقَ کا مفعول بھی مذکور نہیں ہے، اور قَدَّرَ اور هَدٰى کا مفعول بھی مذکور نہیں ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بنایا پورے اعتدال سے بنایا، ٹھیک کر کے بنایا، اور پھر اس

---

(۱) ابوداؤد ۱/۱۲۶ باب ما یقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ/ مشکوۃ ۱/۸۲ باب الرکوع، فصل ثانی۔

کے متعلق کسی غرض وغایت کا اندازہ لگایا کہ اس نے کیا کرنا ہے اور اس کو کیا کرنا چاہیے، اور پھر اس غرض وغایت کو حاصل کرنے کے لئے اللہ نے اس کی راہنمائی کی، سورج اور چاند بنائے تو ایک مقصد کے تحت، کہ یہ اس طرح چکر کاٹیں جن کے ساتھ دن رات بنتے چلے جائیں اور موسم بدلتے چلے جائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکوینی طور پر راہنمائی کی، وہ ویسے ہی چلتے ہیں اور وہی ان کے اُوپر فوائد مرتب ہوتے ہیں، حیوانات اللہ نے پیدا کیے تو حیوانات کی ضروریات کا بھی اندازہ فرمایا کہ یہ کیا کرے گا، کیا کھائے گا، اس کو کیا کرنا ہے، تو بغیر کسی اُستاذ کے سکھانے کے اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے تحت جانور وہی کھاتے ہیں جو کھانا ان کے لئے مقدر کیا ہے، اور وہی حرکتیں اور کام کرتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے مقدر کیے ہیں، اسی طرح سے انسان کے لئے اگر کچھ چیزیں مقدر کی ہیں تو انسان کو راہنمائی دی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ فطری تعلیم نہ ہوتی تو ساری دُنیا کے حکماء اکٹھے ہو جاتے، عقل مند اکٹھے ہو جاتے تو بچے کو دُودھ پینا نہ سکھا سکتے، اُسے کہتے کہ یوں پستان منہ میں لے، پھر اس کو اس طرح سے دبا، یوں ہونٹ ہلا، اس طرح سے دُودھ نکلے گا اور پھر تُو اس کو یوں نگلنا، تو کیا بچے کے پیدا ہونے کے بعد دُودھ پینا سکھا دینا یہ کسی کے بس میں بات تھی؟ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فطری طور پر ہدایت ہے کہ جو کام اس نے مقدر کیا ہے اس کے کرنے کے لئے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ راہنمائی بھی فرماتے ہیں۔ تو تقدیر اور ہدایت عام ہے، کہ پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے متعلق جو اندازہ ٹھہرایا اس کے کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی بھی کی ہے، تو ظاہراً باطناً اللہ تعالیٰ کی قدرت اس طرح سے نمایاں ہے۔

چارے میں قدرت کا نمونہ

وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی: مرعیٰ، رَعَا یرعیٰ چَرانے کو کہتے ہیں، مرعیٰ چَراگاہ کے معنی میں بھی ہے اور گھاس کے معنی میں بھی جس کو جانور چَرتے ہیں، مَرْعٰهَا کا لفظ سورۂ نازعات میں بھی آیا تھا، ''جس نے کہ چارے کو نکالا'' اس چیز کو پیدا کیا جو جانور کھاتے ہیں، ''جس نے نکالا چارہ''، فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی: غثاء کہتے ہیں کوڑا کرکٹ کو، غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ حدیث شریف میں لفظ آتا ہے،[1] کوڑا کرکٹ جس کو کہ سیلاب بہا کر لے جاتا ہے، پانی آتا ہے سیل کی شکل میں، تنکے وغیرہ اکٹھے ہو کر جھاگ کی شکل میں آجاتے ہیں، وہ سارے کا سارا غثاء کہلاتا ہے۔ اور اَحْوٰی یہ حَوِیَ حُوَّۃٌ سے ہے سیاہ ہونا۔ ''پھر کر دیا اُس کو سیاہ کوڑا کرکٹ'' یعنی ایک وقت میں وہ چارہ پیدا ہوتا ہے، کس طرح سے سرسبز شاداب ہوتا ہے، دُوسرے وقت میں وہ سوکھ جاتا ہے، سوکھنے کے بعد وہ سیاہ سا ہو جاتا ہے، کوڑا کرکٹ بن جاتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ اسی طرح سے انسان پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے بعد جوان ہوتا ہے اور پوری طرح سے اس کے اُوپر بھی شادابی آتی ہے، اور ایک وقت ہوتا ہے کہ بوڑھا ہو جاتا ہے، بوڑھا ہونے کے بعد مر جاتا ہے، مرنے کے بعد وہی ! ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، تو اس طرح سے نباتات کا پیدا ہونا، اپنی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنی اِنتہا کو پہنچ جانا، یہ نمونے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، تو اسی طرح سے انسان کو اپنے متعلق بھی سمجھنا چاہیے

(۱) ابوداؤد ۲ر ۲۳۴، باب فی تداعی الامم علی الاسلام/ مشکوۃ ۲ر ۴۵۹، باب تغیر الناس، فصل ثانی۔

کہ یہ بھی اللہ نے پیدا کیا اور اس کی طبعی ضروریات کی ہدایت اس کو طبعاً دی، اور جو اس کی رُوحانی ضروریات تھیں ان کی تعلیم اس کو رسولوں کی وساطت سے دی، تو جو شخص اس ہدایت کے مطابق چلتا ہوا اپنا وقت گزارے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو کامیابی کی طرف لے جائے گا جیسا کہ سورت کے آخر میں ذکر کیا جارہا ہے، اور جو اندھا دھند اپنا وقت گزارے گا اور سوچے گا ہی نہیں کہ میں پیدا کیوں ہوا تھا اور میرے متعلق کیا ضروریات لگائی گئی ہیں، کیا چیز میرے متعلق کی گئی ہے اور مجھے کہاں سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے، یوں جانوروں کی طرح وقت گزارتا ہے تو آخر اپنے اَنجام کو خراب کرلے گا۔" جس نے کہ چارہ نکالا، پھر اس کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنادیا۔"

قرآن کی حفاظت اللہ نے اپنے ذِمّے لے لی ہے

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى: جس طرح سے اللہ تعالیٰ تدریجاً یہ سارے کے سارے کام کرتے ہیں، ساری کی ساری حکمتیں اس کی مرتب ہوتی ہیں، "عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں" سَنُقْرِئُكَ: پڑھائیں گے ہم آپ کو یعنی وحی آپ پر اُتاریں گے، اور آپ کو اس کی قراءت کا مکلّف کریں گے، اس کی قراءت آپ کی زبان پر جاری کریں گے، اور آپ پر نسیان طاری نہیں ہوگا، بھولیں گے نہیں، اِس کی ذمہ داری ہماری ہے۔ جیسے سورۂ قیامہ کے اندر یہ مضمون گزر چکا۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: مگر جو اللہ چاہے، اللہ ہی بھلانا چاہے کسی بات کو تو بھول جائے گی، اور نسخ کا ایک یہ بھی طریقہ ہے، سورۂ بقرہ کے اندر آیا تھا مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا: جس آیت کو ہم منسوخ کردیں یا بھلادیں نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ: تو ہم اس سے اچھی لے آتے ہیں اَوْ مِثْلِهَا: یا اس جیسی لے آتے ہیں (آیت:۱۰۶)، تو نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ صراحتاً آیت اُتر آئے کہ اس حکم کو منسوخ کردیا گیا، اور کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ ایک حکم دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے تحت وہ دل ودماغ سے ویسے ہی بھلادیا، حضور ﷺ پر بھی نسیان طاری ہوگیا اور باقی لوگوں پر بھی، نسخ کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، تو یہاں یہی کہہ دیا گیا کہ ہاں اللہ ہی کسی چیز کو آپ کے دل دماغ سے نکالنا چاہے تو وہ نکل جائے گی، اور جس چیز کا باقی رکھنا اللہ کو مقصود ہوگا وہ آپ کبھی نہیں بھولیں گے، "عنقریب پڑھائیں گے ہم آپ کو پھر آپ بھولیں گے نہیں مگر جو اللہ چاہے۔" اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى: بےشک وہ اللہ جہر وَمَا يَخْفٰى کو جانتا ہے۔ جہر: ظاہر، نمایاں چیز۔ مَا يَخْفٰى: جو چھپی ہوئی ہے، "جو چیز چھپتی ہے اور جو چیز ظاہر ہے" یہ صرف قول کے ساتھ نہیں، قول فعل ہر چیز کے ساتھ لگتی ہے، اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے ظاہر چیزوں کو بھی اور مخفی چیزوں کو بھی، لہٰذا کسی چیز کا بھلایا جانا اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوگا تو وہ بھلائی جائے گی، اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے وہی ہر چیز کی حکمت کو جانتا ہے۔

تسلّیٔ رسول

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى: یسریٰ کہتے ہیں آسان چیز کو، یہ اَیسر کا مؤنث ہے، جیسے افضل کا مؤنث فضلیٰ آجاتا ہے، تو ایسر سے یسریٰ۔ یسریٰ سے طریقۂ یُسریٰ مراد ہے، آسان طریقہ، اور اس کا مصداق ہے اَحکامِ شریعت، نُيَسِّرُ تیسیر سے ہے، "ہم آپ کو آسان کردیں گے، ہم آپ کے لئے آسانی مہیا کردیں گے آسان طریقے کے لئے" یہ شریعت جو کہ یسریٰ کا مصداق ہے اس پر عمل کرنا ہم آپ کے لئے آسان کردیں گے، دن بدن آسانی ہوتی چلی جائے گی، یہ جو رُکاوٹیں پیش آرہی ہیں، دِقتیں پیش

آرہی ہیں، سب دُور ہوجائیں گی، اِس یسریٰ کے لئے آپ کو تیسیر کردی جائے گی، آپ کے لئے آسانی کردی جائے گی، اس میں بھی گویا کہ حضور ﷺ کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے اور تدریجاً کامیابی کی طرف۔

نصیحت سے نفع کون اُٹھاتے ہیں؟

فَذَكِّرْ: پس آپ نصیحت کرتے رہیے، اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى: اگر نصیحت کرنا نفع دے، اور نفع تو یہ دیتا ہی ہے اِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ ذاریات:۵۵) اس لئے آپ اپنی طرف سے نصیحت کرتے رہیں، اگر نصیحت نفع دے یہ تعلیق کردی اور یہ شرط یقیناً موجود ہے کہ جب نصیحت کی جائے گی تو فائدہ ہوتا ہی ہے، تو آپ کرتے رہیں۔ انذار اور تبلیغ یہ کافروں کو ہوتی ہے، یعنی حکم کا پہنچا دینا، ڈرا دینا، وہ مانیں یا نہ مانیں، متأثر ہوں یا نہ ہوں، یہ منصبِ رسالت ہے کہ اللہ کا نبی انذار بھی کرتا رہے تبلیغ بھی کرتا رہے، اور وعظ و تذکیر اکثر و بیشتر مؤمنین کو ہوتی ہے اور وہ فائدہ اُٹھاتے ہی ہیں اِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ، اور کافروں کے سامنے بھی جس وقت بار بار دل کو نرم کرنے والے مضمون بیان کیے جائیں گے تو بسا اوقات وہ بھی فائدہ اُٹھا لیتے ہیں، ''نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دے۔'' سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى: عنقریب نصیحت حاصل کرے گا وہ شخص جو ڈرتا ہے، جس کے دِل میں خوف اور خشیت ہے اللہ کی ذات سے، آخرت کا دِن کا، وہ ضرور نصیحت حاصل کرلے گا، وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى: اور اس نصیحت سے دُور رہے گا بدبخت آدمی، بدنصیب آدمی۔ جس کے دِل میں خوف و خشیت ہوگی، اور خوف و خشیت رکھنے والے ہی حقیقت کے اعتبار سے کامیاب ہیں، بہت دفعہ یہ مضمون ذِکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اللہ تعالیٰ کی خشیت جو اِنسان کے قلب میں ہوتی ہے حقیقت کے اعتبار سے سعادت کا سرمایہ یہی ہے، خوفِ اِلٰہی ہے جو اِنسان کو معاصی سے بچاتا ہے، نیکی کی ترغیب دیتا ہے، بُرے کاموں سے بچاتا ہے، بھلے کاموں کی طرف انسان کی رغبت ہوتی ہے، تو خوف و خشیت قلب میں ہو تو وہ شخص نصیحت قبول کرلے گا، اور اگر کوئی بدنصیب ہے بدبخت ہے تو اس نصیحت سے دُور رہے گا، وہ نصیحت کو قبول نہیں کرے گا، آپ اپنی طرف سے کرتے چلے جائیے، آگے لوگوں کی دونوں قسمیں بنتی چلی جائیں گی، خوف و خشیت والے اس سے نفع اُٹھائیں گے، اور جو بدبخت اور شقاوت والے ہیں وہ اس نصیحت سے دُور رہیں گے، يَتَجَنَّبُهَا: دُور رہے گا اس نصیحت سے الْاَشْقَى: بدبخت آدمی، الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى: جو کہ بڑی آگ میں داخل ہوگا، تو اشقی يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى، جو بدبخت آدمی ہے نصیحت سے دُور رہنے والا وہ بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

جہنّم میں موت کی نفی حقیقتاً اور زِندگی کی نفی مجازاً ہے

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى: پھر نہ وہ مرے گا نہ جیے گا، مرے گا تو اس لئے نہیں کہ واقعۃً موت نہیں آئے گی، حدیث شریف میں آتا ہے قیامت کے میدان میں جس وقت نیک و بد دونوں علیحدہ علیحدہ ہوجائیں گے، جہنّمی جہنّم میں چلے جائیں گے، جنّتی جنّت میں چلے جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ اس موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں موجود کریں گے، مینڈھا یعنی یہ بھیڑ، اس کی شکل میں اس کو موجود کریں گے، اور اہلِ جنّت کو اور اہلِ دوزخ کو دِکھائیں گے اور پہچوائیں گے کہ یہ موت ہے، اور ان کو دِکھانے کے بعد پھر جنّت اور دوزخ کے درمیان میں اس موت کو ذبح کردیا جائے گا، یعنی اس موت پر موت طاری کرکے اس کو بالکل فناء

کر دیا جائے گا، اور اعلان کر دیا جائے گا ''یَا اَھْلَ النَّارِ لَا مَوْتَ. یَا اَھْلَ الْجَنَّةِ لَا مَوْتَ ''(۱) اے جہنمیو! آج کے بعد موت ختم، اور اے جنتیو! آج کے بعد موت ختم، تو اہلِ نار تو اس اعلان سے اتنے غم زدہ ہوں گے کہ اگر غم کی بنا پر کسی کو موت آنی ہوتی تو وہ مرجاتے، اگر غم کی بنا پر کسی کے لئے موت ہوتی تو وہ مرجاتے اتنے غم زدہ ہوں گے، کیونکہ مصیبت جس وقت ہر طرف سے گھیر لے اور چھوٹنے کا کوئی طریقہ سامنے نہ رہے تو ہم اپنی زندگی کے اندر یہ سوچ لیتے ہیں کہ چلو مریں گے تو جان چھوٹ جائے گی، اور جس وقت یہ تصور بھی ختم کر دیا کہ موت ہی نہیں آئے گی تو چاروں طرف سے مایوسی ہی مایوسی ہے، دُنیا میں مصیبتوں سے چھوٹنے کا ایک طریقہ موت بھی ہے، اس لیے تو بسا اوقات انسان اپنے لیے غلط فیصلہ کر لیتا ہے کہ کسی مصیبت میں گھبرا تو خودکشی کر لی، وہ سمجھتا ہے کہ جب میں اپنے آپ کو ماردوں گا مصیبت سے چھوٹ جاؤں گا، یہ خودکشی جو کیا کرتے ہیں پریشان ہو کر، وہ خودکشی اس لیے کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ موت پریشانیوں کا علاج ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ مرنے کے بعد وہ اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں، جیسے اُردو شاعر (ذوق) کہتا ہے:

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔۔۔ اگر مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا کہ مرنے کے بعد پھر کس کس مصیبت میں مبتلا ہوئے لیکن انسان سوچتا تو یہی ہے کہ موت پریشانیوں کا علاج ہے، اور جب یہ اعلان ہو گیا کہ موت بھی نہیں آئے گی تو پریشانیوں کے چھوٹنے کی آخری توقع بھی ختم ہوگئی۔ اور جنتیوں کی خوشی کی اِنتہا نہیں رہے گی، اور اگر کوئی شخص خوشی کی انتہا کی بنا پر مر سکتا تو اس دِن اہلِ جنّت خوشی سے مرجاتے، اتنی خوشی ان کو ہوگی، اس لیے کہ دُنیا کے اندر اگر اِنسان کو کوئی خوف وخطرہ نہ ہو اپنی عیش کے مکدّر ہونے کے لئے......! ایک انسان ہر طرح سے خوش حال ہے، ہر قسم کے دُشمن سے مامون ہے، اس کو یہ کوئی خطرہ نہیں کہ مجھے کوئی جانی مالی نقصان پہنچا سکتا ہے، لیکن جب کبھی اس کو موت کا تصور آتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور مرنے کے ساتھ میرے یہ باغ بہار محلات سب چھوٹ جائیں گے، اور میری یہ عیش وعشرت ختم ہو جائے گی، تو یہ موت کا تصور اِنسان کے عیش کو منغّص کر دیتا ہے، اس لیے تو اس کو ہاذمِ لذات کہا گیا ہے، لذتوں کو ختم کرنے والی چیز، موت کے تصور کے ساتھ انسان کی عیش خراب ہو جاتی ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ مر جاؤں گا اور یہ ساری چیزیں چھوٹ جائیں گی۔ تو جنتیوں کو اس آخری آخری خطرے سے بھی مامون کر دیا جائے گا کہ اور تو کوئی صورت ہے ہی نہیں کہ جو تم سے نعمتیں چھین لے، اور یہ ایک خطرہ ہوتا ہے انسان کی زندگی میں کہ مر جائیں گے، یہ عیش ختم ہو جائے گی، تمہیں موت بھی نہیں آئے گی، اس لیے تمہاری یہ عیش دائمی ہے۔ تو لَا یَمُوْتُ تو اپنی حقیقت پر ہوا کہ مرے گا نہیں، یہ ''اشقیٰ'' جو نارِ کبریٰ میں داخل ہو گیا یہ مرے گا نہیں، یہ تو اپنی حقیقت پہ ہے کہ موت نہیں آئے گی۔ لَا یَحْیٰی: نہ زندہ ہی ہوگا، نہ زِندہ ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام کی زندگی بھی حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ جس زندگی میں نہ کوئی آرام ہو، نہ راحت ہو، نہ سکون ہو، نہ چین ہو، انسان کہتا ہے یہ تو موت سے بدتر ہے، ایسی زندگی کا کیا فائدہ، اس لیے مجازاً اس کو کہہ دیا لَا یَحْیٰی، اس کا شمار زندوں میں بھی نہیں ہوگا، کیونکہ زندوں والی کوئی

(۱) بخاری ۹۶۹/۲ باب یدخل الجنة سبعون الفا.

راحت، کوئی چین، کوئی سکون، کوئی امن عافیت اس کو حاصل نہیں ہوگی، تو نہ مرے گا نہ جیے گا، مرے گا تو واقعۃً نہیں، جیے گا اس لیے نہیں کہ جینے والی کوئی بات ہی نہیں ہوگی، تو ایسی زندگی موت سے بدتر زندگی ہے، اس زندگی کو کیا زندگی کہیں۔ تو یہ خطرناک انجام ہے اس شخص کا جو کہ نصیحت سے دُوری حاصل کرتا ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی نصیحت کو سُن کر اس سے متاثر نہیں ہوتا، تو اب اس سے زیادہ ''اشقیٰ'' اور کون ہوسکتا ہے؟ اس سے زیادہ بڑا بدبخت کون ہوگا جو بڑی آگ میں داخل ہوگا، اور اس کے بعد نہ مرنا، نہ جینا، تو یہ اس کی بدبختی کی اِنتہا ہے۔

کامیاب کون؟

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى: تحقیق کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے آپ کو پاک صاف کرلیا، مَنْ تَزَكّٰى: جو ستھرا ہوگیا، پاک صاف ہوگیا، ظاہری پاکی اور طہارت بھی حاصل کرلی، باطنی پاکی اور طہارت بھی حاصل کرلی، وہ کامیاب ہوگیا، وہ مراد پاگیا، ''فلاح پاگیا وہ شخص جو پاک صاف ہوگیا'' وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى: اور اس نے اپنے رَبّ کا نام لیا پھر نماز پڑھی، ظاہری طہارت حاصل کی، کپڑے پاک کیے، بدن پاک کیا، دل دماغ کے خیالات پاک کیے، عقیدوں کی گندگی دور کی، اور اس کے بعد پھر اللہ کا نام لیتا ہے، تکبیرِ تحریمہ کہتا ہے، پھر نماز پڑھتا ہے، یہ لوگ کامیاب ہیں جو اس طرح سے صاف ستھرے رہتے ہیں۔

دو فقہی مسائل کا اِستنباط

فقہ کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا کہ اِسی سے اِستدلال کر کے فقہائے اَحناف رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ نماز کی اِبتدا کے لئے ذِکر اسمِ رَبّ کافی ہے، ''اللہ اکبر'' ضروری نہیں یعنی فرض کے درجے میں نہیں ہے، تو تکبیرِ تحریمہ میں اگر کوئی ''اللہ اکبر'' کی بجائے کوئی اور لفظ بول لے، ''الرَّحمٰنُ اعظم، الرَّحمٰنُ اَجَلُّ، الرَّبُّ اَعْلٰی'' کچھ اس قسم کا لفظ بول لے تو اَحناف کے نزدیک نماز کی اِبتدا دُرست ہے، لیکن چونکہ ''اللہ اکبر'' کہنا یہ سُنّتِ دائمہ ہے اس لیے یہ مؤکدہ ہے اس کو چھوڑنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص چھوڑ دے گا نماز اس کی ہوجاتی ہے اگر کوئی اللہ کا دُوسرا نام لے لے اور اس کے اس کی کوئی دُوسری صفت لگا لے جو کہ ذِکر پر مشتمل ہے۔ اور اسی طرح سے آپ فقہ میں مسئلہ پڑھا کرتے ہیں اور حدیث شریف کے درس میں بھی، کہ تکبیرِ تحریمہ ہمارے ہاں رُکن نہیں، بلکہ شرط ہے، یعنی خارجِ صلاۃ ہے، داخلِ صلاۃ نہیں ہے، اُس کا اِستدلال بھی یہیں سے کرتے ہیں کہ چونکہ فَصَلّٰى میں فاء آگئی، فاء تعقیب بلامہلت پر دلالت کرتی ہے، تو ذِکرِ اسمِ رَبّ ہے تو نماز سے خارج لیکن نماز کے متصل ہے، اس کے بعد پھر نماز شروع ہوتی ہے، ''جس نے اپنے رَبّ کا نام ذِکر کیا پھر نماز پڑھی۔''

بدبختی کی اصل بنیاد دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہے

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا: یہ خرابی کی اصل وجہ بتادی کہ یہ لوگ جو بدبختی کی طرف جاتے ہیں نصیحت قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ نہیں کہ یہ عقلاً کوئی مفید صورت تجویز کیے بیٹھے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل ہے، یا ان کو کسی طرح سے دلائل

سے یہ بات سمجھ میں آئی ہوئی ہے، ''بلکہ تم ترجیح دیتے ہو دُنیوی زندگی کو اور آخرت بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی ہے'' تو یہ ایثار جو ہے دُنیوی زندگی کا آخرت کے مقابلے میں تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے، کہ دُنیا اور آخرت کا مقابلہ آتا ہے، اور انسان دُنیوی زندگی کو ترجیح دیتا ہے، نقد لذت پہ مرتا ہے، بعد میں آنے والے عذاب سے ڈرتا نہیں، اور نقد تکلیف اُٹھانے سے بھاگتا ہے، اور بعد میں جو نفع حاصل ہونے والا ہے اس اُمید پر انسان کام نہیں کرتا، یہ بنیاد ہے انسان کی خرابی کی اور انسان کی گمراہی کی، کہ دُنیوی زندگی کو یہ ترجیح دیتا ہے۔

ہر نقد اُدھار کے مقابلے میں افضل نہیں ہوتا

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ نقد اُدھار کے مقابلے میں افضل ہی ہوتا ہے، نقد کو اُدھار کے مقابلے میں لوگ ترجیح دیتے ہیں، لیکن یہ اُصول کلّی نہیں، اگر یہ اُصول کلّی ہوتا کہ ہمیشہ نقد اُدھار کے مقابلے میں افضل ہے تو کاشتکار گھر میں پڑی ہوئی گندم اُٹھا کر مٹی میں کیوں لے جا کے ملاتا ہے جبکہ یہ تو نقد حاصل ہے، اور یہ ملاتا ہے اُدھار کی توقع پر کہ جب یہ ڈالیں گے تو چھ مہینے کے بعد بھی ایک بوری بیس بوریاں بن کر واپس آجائے گی، معلوم ہو گیا کہ جو طریقہ متعین ہو کہ تھوڑا دینے کے بعد زیادہ آتا ہے وہاں لوگ اُدھار کو ترجیح دیتے ہیں وہاں نقد پر نہیں مرا کرتے، اور ایسے وقت میں نقد کو ترجیح دینے والے خسارے میں رہ جاتے ہیں۔ تو آخرت کا معاملہ اسی طرح سے ہے کہ یہاں دُنیا کے اندر تھوڑا کرو تو آخرت میں زیادہ پاؤ، یہاں ایک پیسہ خرچ کرو وہاں اللہ کے دربار میں جا کے سات سو کا ثواب لے لو، بلکہ لاالی النہایہ جہاں تک بھی اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ کتنا بڑھے گا، کوئی پتا نہیں اس کی اِنتہا کیا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے لاالی النہایہ بڑھا دیں گے، تو اس قسم کا اُدھار جس کے متعلق یقین ہو کہ یہ ملنے والا ہے اور اس نقد کے مقابلے میں لاکھوں گنا ہو کے زیادہ ملنے والا ہے تو ساری دُنیا کا اِتفاق ہے کہ ایسے اُدھار پر انسان مرتا ہے نقد کو چھوڑتا ہے، لیکن یہ دُنیوی لذتیں انسان کو کچھ اس قسم کی مرغوب ہیں کہ یہ اس کا نتیجہ نہیں سوچتا، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی زہریلا حلوہ کھائے، کھاتے وقت تو لذت محسوس کرتا ہے، لیکن چند منٹوں کے بعد جب انتڑیاں کٹنے لگ جائیں گی پھر اس کو پتا چلے گا کہ اس لذیذ حلوہ نے کیا نقصان پہنچایا۔ یہ گناہ کی زندگی، بُرائی کی زندگی، بداعمالی کی زندگی ایسے ہی ہے جیسے زہریلا حلوہ، کہ وقتی طور پر تو اس میں بڑا لطف ہے، بڑی لذت ہے، لیکن چند منٹوں کے بعد، چند گھنٹوں کے بعد، چند ساعتوں کے بعد...... کیونکہ کوئی متعین تو ہے نہیں کب جان نکل جاتی ہے، ایک منٹ کے بعد بھی نکل سکتی ہے...... اس کے بعد یہی گناہ جس وقت مصیبتیں بن کر مسلط ہوں گے تب انسان کو پتا چلے گا کہ میں نے عارضی سی لذت اُٹھا کے اپنا کتنا نقصان کر لیا۔ اور یہ محنت، مشقت والی زندگی، اللہ کے نام پر جو محنت اور مشقت اُٹھائی جاتی ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کاشتکار کی زندگی، کہ ایک وقت میں گرمی برداشت کر کے، ہل جوت کے، پانی لگا کے بیج ڈال دیا جاتا ہے، بظاہر انسان اس وقت خالی ہاتھ ہو جاتا ہے بیج ڈالنے کے بعد، اس کے پہلے کچھ نہیں رہا، لیکن اللہ تعالیٰ کے دستور کے مطابق دوسرے وقت یہی ڈالا ہوا بیج جب اُگ کر سامنے آتا ہے تو کوٹھیاں بھر جاتی ہیں، تو یہی حساب یہاں ہے، تو دُنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دینا اصل بنیاد خرابی کی یہی ہے۔ ''بلکہ ترجیح دیتے ہو تم دُنیوی زندگی کو۔''

دُنیا کی کوئی نعمت کدورت سے خالی نہیں

وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی: اور آخرت بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی ہے، اس میں دو باتیں بتادیں، ایک تو فی حد ذاتہٖ دُنیا کے مقابلے میں آخرت بہتر ہے، اس کو آپ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ دُنیا میں کوئی نعمت کدورت سے خالی نہیں ہے، اگر ایک نعمت آپ کو حاصل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ دس مصیبتیں لگی ہوئی ہوتی ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ پھول کے ساتھ کانٹا، ایک نعمت اگر انسان کو حاصل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ کئی ساری ساتھ مصیبتیں بھی آتی ہیں، ذمہ داریاں بھی آتی ہیں جن کو نبھانے کے لئے انسان کو مشقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ روٹی آپ کھاتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک لذت پوری کرلی، لیکن اس لذت کے نتیجے میں جو کچھ آگے سزا بھگتنی پڑتی ہے کئی گھنٹے تک وہ بھی تو آپ کو معلوم ہے، پیٹ میں جو بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے، کبھی پیٹ میں درد ہوگیا، کبھی دست لگ گئے، کبھی پیچش لگ گئے، اور نہیں تو آرام کا بستر چھوڑ کے، خوشبودار اور بہترین آرام کے کمرے چھوڑ کے بیت الخلا میں جاکر جو گھنٹہ بھر بیٹھنا پڑتا ہے یہ اس نعمت کے ساتھ کدورت کا پہلو ہے، تو کیا دُنیا میں آپ ایسا کرسکتے ہیں کہ کھاتے رہیں اور ہگنے نہ جائیں؟ اگر صاف ستھری جگہ بیٹھ کے آپ کھائیں گے تو اس کے ساتھ ساتھ آپ کو گندی جگہ میں جاکر کچھ سونگھنا بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح سے باقی نعمتیں لے لیجئے، کہ جب بھی وہ آتی ہیں تو ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی کدورت ضرور لگی ہوئی ہوتی ہے، دُنیا میں انسان لذیذ ترین چیز سمجھتا ہے بیوی کو، شادی ہوتی ہے تو آپ بڑی خوشی کرتے ہیں، شادی کا معنی ہی خوشی ہے، کتنی تمناؤں کے بعد انسان اس کو حاصل کرتا ہے، لیکن اب اس کے آنے کے بعد جس قسم کی ذمہ داریاں انسان کے اُوپر عائد ہوتی ہیں اور آگے گھر کو آباد کرنے کے لیے جتنی مشقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں اور اس بیوی کے جس قسم کے ناز نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں وہ سب اس نعمت کے ساتھ کدورت کا پہلو ہے۔ ایسے ہی جس نعمت کو بھی آپ دیکھیں گے اس کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی مصیبت کا پہلو ضرور لگا ہوا ہے، اس لیے دُنیا کی کوئی نعمت کدورت سے خالی نہیں، لیکن آخرت! اُس میں کدورت کا نام ونشان نہیں، کوئی نعمت کوئی کسی قسم کی مشقت اور مصیبت کا باعث نہیں بنے گی، دُنیا میں مال آتا ہے تو کتنی دشمنیاں ساتھ لاتا ہے، کتنی پریشانیاں ساتھ لاتا ہے، بسااوقات مال آتا ہے اور جان لے کر چلا جاتا ہے، یہ جو ڈاکے پڑتے ہیں، لوگ مالک کے گولی مارتے ہیں، مال اُٹھا کے لے جاتے ہیں، یہ مال آیا تھا، جان لے کے چلا گیا۔ تو اِس کے آنے کے ساتھ کتنی پریشانیاں آئیں، بہرحال یہ تو چند ایک مثالیں آپ کے سامنے دے رہا ہوں، کوئی زیادہ تفصیل کرنی تو مقصود نہیں ہے، بس! اتنی بات آپ سمجھ لیجئے کہ دُنیا میں جو نعمت بھی ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی کدورت کا پہلو ضرور ہے۔

آخرت میں خیر ہی خیر کا پہلو ہے

آخرت کی نعمتوں میں کوئی کدورت نہیں ہوگی، وہ خالص راحت ہی راحت ہوں گی اور خیر ہی خیر ہوں گی، بھلائی ہی بھلائی ہوں گی، کوئی ان کے اندر آزمائش کا پہلو نہیں، کوئی ان کے اندر ذمہ داری کا پہلو نہیں، کوئی ان کا نتیجہ خطرناک نکلنے والا نہیں، حتّٰی کہ آپ کھاتے چلے جائیں گے لیکن آپ کو پیشاب پاخانے کی نوبت نہیں آئے گی، کھاتے چلے جائیں گے لیکن آپ کا ناک

نہیں نکلے گا اور آپ کو تھوکنے تک کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، تو یہ کدورتیں جو دُنیا کے کھانے پینے کے ساتھ لگی ہوئی ہیں آخرت میں نہیں ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! پھر یہ کھایا پیا کدھر جائے گا؟ جو آپ کہتے ہیں کہ "لَا یَبُوْلُوْنَ وَلَا یَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا یَمْتَخِطُوْنَ"، "وَلَا یَبْصُقُوْنَ" یہ لفظ حدیث میں آتے ہیں، کھائیں گے، لیکن نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے، نہ تھوکیں گے، نہ ناک صاف کریں گے، ناک کا فضلہ بھی نہیں آئے گا، تو صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! پھر وہ کھایا پیا کہاں جائے گا؟ جو ہم کھاتے چلے جائیں گے آخر وہ کہاں جائے گا؟ فرمایا کہ خوشبودار سا پسینہ آجایا کرے گا، یا خوشبودار سی ڈکار آجایا کرے گی، بس طبیعت صاف ہوجایا کرے گی،[1] تو اتنا صاف ستھرا معاملہ ہوگا، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ آپ کو بیویاں یاد دلاتا ہے تو ان کے ساتھ مُطَهَّرَةٌ کی صفت ساتھ لگاتا ہے، اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: صاف ستھری، رُوحانیت کے اعتبار سے بھی، جسمانیت کے اعتبار سے بھی، کوئی اس قسم کی چیز ان میں نہیں ہوگی جو باعثِ نفرت ہو یا باعثِ تکلیف ہو۔ تو آخرت میں خیر ہی خیر کا پہلو ہے، اس میں کوئی شر کا پہلو نہیں، جبکہ دُنیا کے اندر خیر اگر ہو تو ساتھ ساتھ شر کا پہلو بھی ہے۔

فانی کے مقابلے میں باقی کو برباد کردینا عقل کا تقاضا نہیں!

اور پھر سب سے بڑی خوبی آخرت میں اَبْقٰی، کہ دُنیا فانی ہے آخرت اَبْقٰی ہے، اور فانی اور اَبْقٰی ان دونوں کا مقابلہ اگر آپ کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ فانی قابلِ ترک ہے اور اَبْقٰی حاصل کرنے کے قابل ہے۔ ایک آدمی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ دو مکان ہیں، ایک بہت عالی شان محل اور کوٹھی ہے جس میں دُنیا کی ہر عیش وعشرت کا سامان ہے جتنا بھی آپ سوچ سکتے ہیں، بہت بڑا کھلا محل ہے اور دُنیا کی عیش وعشرت اس میں پوری کی پوری مہیا ہے، جو کچھ ہونا چاہیے اس میں ہے، پانی کا انتظام ہے، ہوا کا انتظام ہے، پلنگوں کا انتظام ہے، سب کچھ ہے، جو کوئی دُنیوی ضرورتیں ہوتی ہیں، اور دُوسری طرف ایک کچا مکان ہے جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح سے مہیا نہیں ہیں، یہ دو مکان آپ کو دکھا دیے گئے، کہ آپ ان دونوں میں سے ایک کو منتخب کرلیں کہ آپ کون سا پسند کرتے ہیں، جو آپ پسند کریں گے ہم آپ کو دے دیں گے، لیکن ساتھ ایک ہماری شرط ہے کہ اگر آپ اس کوٹھی کو اور محل کو پسند کریں گے تو ایک مہینے کے بعد یہ آپ کو خالی کرنا پڑے گا، پھر ہم ذمہ دار نہیں ہیں کہ آپ کہاں رہیں کہاں نہ رہیں، اور اگر یہ کچا مکان آپ پسند کرلیں تو زندگی بھر کے لئے آپ کا ہے، ہم آپ کو نہیں نکالیں گے۔ یہ دو باتیں اگر کسی کے سامنے رکھ دی جائیں تو کیا کوئی جاہل اس کوٹھی کو پسند کرے گا اس کچے مکان کے مقابلے میں؟ وہ کہے گا کہ اگر ایک مہینہ یہاں بیٹھ کر ایئر کنڈیشن میں مزے لے لیے تو مہینے کے بعد پھر دُھوپ تاپنی پڑے گی، درختوں کے نیچے وقت گزارنا پڑے گا، کہاں سامان رکھیں گے؟ دھکے کھاتے پھریں گے، بھئی! اس کے مقابلے میں کچا مکان ہی ٹھیک ہے، کم از کم رہے گا تو اپنے پاس، جائے گا تو کہیں نہیں، کیا یہ عقل کا فیصلہ نہیں ہوگا؟ اور اگر کوئی جاہل دُوسری شق اختیار کرلے تو جس دِن دھکے دے کر اس کو کوٹھی سے نکالیں گے اور کوٹھی خالی کروائیں گے اس دِن سارے ہی کہیں گے کہ دیکھو مزہ کوٹھی میں رہنے کا، اور پھر وہ ہاتھ کاٹے گا، کہے گا جھونپڑیوں والے اچھے رہے جنہوں

---

(۱) مشکوۃ ۲/۴۹۶ باب صفۃ الجنۃ، فصل اوّل/مسلم ۲/۳۷۹، کتاب الجنۃ/نوٹ:- لا یبصقون کا لفظ بخاری ۱/۴۶۰ پر ہیں۔

نے اپنی مستقل جگہ لے لی، کم از کم ان کو کوئی نکالنے تو نہیں آرہا۔ بس اسی طرح سے ہی سمجھ لیجئے، کہ دُنیا تو فانی ہے، چاہے یہ کتنی ہی لذیذ اور خوشنما کیوں نہ ہو اس کا یہ عیب جو ہے کہ ایک دِن چھوٹ جائے گی اس عیب کا کوئی جواب نہیں ہے، اور آخرت میں اور خوبیاں تو ہیں ہی، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ باقی رہنے والی ہے فانی نہیں ہے۔ تو جہاں فانی اور باقی کا مقابلہ آجائے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ باقی کو ترجیح دی جائے، تو یہی کہا جارہا ہے کہ تم تو دُنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے، ترجیح اس کو دینی چاہیے جو کہ خیر وابقیٰ ہے، جہاں بھی دُنیا اور آخرت کا مقابلہ آجائے وہی پہلو اختیار کرو جس میں آخرت کا فائدہ ہو، اگر دُنیا کی زیب وزینت اختیار کرو گے دو دِن رہے گی، چار دِن رہے گی، سال رہے گی، دس سال رہے گی، آج پچاس ساٹھ سے آگے تو معاملہ بڑھتا ہی نہیں ہے، شاذ و نادر ہی کوئی ہوگا جو کہ سو سال تک پہنچ جائے، چلو سو تک پہنچ جائے، ڈیڑھ سو تک پہنچ جائے، آخر وہ جائے گا ہی، یہ باقی رہنے والی چیز تو نہیں ہے، تو پھر ایسی فانی چیز کے لئے باقی چیز کو برباد کردینا یہ کوئی عقل کا تقاضا نہیں ہے۔ تو جو بنیادی خرابی تھی اس کی نشاندہی کردی گئی، کہ یہ دُنیوی زندگی کو جو ترجیح دینے کی مرض ہے یہ ساری کی ساری خرابی کی بنیاد ہے، اور یہی غلطی ہے، آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

مذکورہ مضامین کی تائید کُتبِ سابقہ سے

اور یہ مضمون اتنا صحیح اور اتنا پختہ ہے جو قرآنِ کریم کے اندر ذکر کیا جارہا ہے، یہ صرف قرآنِ کریم کی بات نہیں اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی: پہلی کتابوں میں بھی یہی مضمون موجود ہے کہ آخرت خیر وابقیٰ ہے اور دُنیا قابلِ ترجیح نہیں، اور نیک بخت نصیحت مانا کرتے ہیں، بدبخت جو نصیحت سے دُور رہتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے، اور پھر نہ مریں گے نہ جئیں گے، اور کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صاف ستھرے رہو، اللہ کا نام لو اور نماز پڑھو، یہ مضمون پہلی کتابوں کے اندر بھی بیان کیا گیا ہے، یہ صرف قرآنِ کریم میں نہیں بلکہ پہلی کتابوں میں بھی یہ مضمون موجود ہے، پہلی کتابوں سے مراد صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی: ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں، یہ الصُّحُفِ الْاُوْلٰی سے بدل ہے، تو حضرت ابراہیم کے صحیفوں میں...... !صحیفہ کہتے ہیں کتابچے کو، جس طرح سے پمفلٹ ہوتا ہے جیسے مفسرین نے لکھا کہ اس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اُترے تھے اگرچہ وہ کوئی مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھے، مشہور یہی چار کتابیں ہیں، توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی، اور اس کے علاوہ بھی صحیفوں کی شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کچھ چیزیں اُتری ہوں گی۔ تو موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں یہ مضمون موجود ہے جو پیچھے قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا، تو گویا کہ یہ مضمون بہت صحیح اور بہت پختہ ہے، اور مسلسل انبیاء علیہم السلام اس کو بیان کرتے چلے آرہے ہیں، تو جو شخص اس کو سن کے یہ سبق حاصل کرلے کہ آخرت قابلِ ترجیح ہے، دُنیا قابلِ ترجیح نہیں، تو ایسا شخص ہی پاکی حاصل کرے گا، ایسا شخص ہی اللہ کو یاد کرے گا، یہی نیک بخت ہے جو نصیحت سے متاثر ہوگا، اور جو اس بات کو قبول نہیں کرتا وہ بدبخت ہے، جو دُنیا کی چند روزہ بہار اگر اختیار کر بھی لے گا تو آخر مصیبت میں مبتلا ہوگا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

آیاتھا ۲۶ ۸۸ سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ ۶۸ رکوعھا ۱

سورۂ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۶ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ

کیا آپ کے پاس ڈھانپنے والی کی بات آئی؟ ۝۱ بعضے چہرے اس دن دبنے والے ہوں گے ۝۲ محنت کرنے والے ہوں گے

نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ

تھکے ہوئے ہوں گے ۝۳ داخل ہوں گے گرم آگ میں ۝۴ پلائے جائیں گے وہ انتہائی گرم چشمے سے ۝۵ نہیں ہوگا اُن کے لئے طعام

اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۷ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝۸

مگر ضریع سے ۝۶ وہ (ضریع) نہ تو موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے فائدہ دے گی ۝۷ بعضے چہرے اس دن خوش حال ہوں گے ۝۸

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝۹ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝۱۱ فِيْهَا

اپنی کوشش کی وجہ سے خوش ہوں گے ۝۹ عالی شان باغ میں ہوں گے ۝۱۰ نہیں سنیں گے اس باغ کے اندر کوئی بیہودہ بات ۝۱۱ اس باغ

عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝۱۳ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝۱۴ وَّنَمَارِقُ

میں جاری چشمہ ہوگا ۝۱۲ اس باغ میں اُونچے اُونچے تخت ہوں گے ۝۱۳ اور آبخورے رکھے ہوئے ہوں گے ۝۱۴ اور تکیے

مَصْفُوْفَةٌ ۝۱۵ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝۱۶ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝۱۷

قطاروں میں رکھے ہوئے ہوں گے ۝۱۵ اور قالین بچھے ہوئے ہوں گے ۝۱۶ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اُونٹ کی طرف کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا ۝۱۷

وَاِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝۱۸ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝۱۹ وَ

اور (کیا یہ دیکھتے نہیں؟) آسمان کی طرف کہ اس کو کیسے اُونچا کیا گیا ۝۱۸ اور (کیا یہ دیکھتے نہیں؟) پہاڑوں کی طرف کہ وہ کیسے گاڑ دیے گئے؟ ۝۱۹ اور

اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝۲۰ فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝۲۱ لَسْتَ

(کیا یہ دیکھتے نہیں؟) زمین کی طرف کہ وہ کیسے بچھادی گئی؟ ۝۲۰ پس آپ نصیحت کرتے رہیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں ۝۲۱ آپ

عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾

ان کے اُوپر مسلط نہیں ہیں ﴿۲۲﴾ ہاں! جو شخص پیٹھ پھیرے گا اور کُفر کرے گا ﴿۲۳﴾ تو اللہ تعالیٰ اس کو بہت بڑا عذاب دے گا ﴿۲۴﴾

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾

بے شک ان کا لوٹنا ہماری طرف ہی ہے ﴿۲۵﴾ پھر ان کا حساب بھی ہمارے ہی ذمے ہے ﴿۲۶﴾

ماقبل سے ربط اور سورۂ غاشیہ کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۶ آیتیں ہیں۔ سورت کا نام پہلی آیت سے ہی ماخوذ ہے هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ، اور یہ آپ کی خدمت میں بارہا ذکر کیا جاچکا کہ یہ ''مکی'' سورتیں خاص طور پر جو ابتدائی دور میں اُتری ہیں ان میں زیادہ زور دیا گیا ہے اِثباتِ آخرت پر، پچھلی سورت میں بھی آپ کے سامنے دوگروہوں کا ذکر آیا تھا، ایک فلاح پانے والوں کا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، اور اسی طرح سے ذکر آیا تھا اشقیٰ کا جو کہ نصیحت قبول نہیں کرتا، ایک کامیاب ہوگا اور دُوسرا آخرت میں برباد ہوگا، مختلف انداز کے ساتھ یہی مضمون سمجھایا جارہا ہے کہ انسان مکلّف ہے، اس کو عبث پیدا نہیں کیا گیا، پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے اس کو فضول نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اس کے اعمال کی نگرانی کی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں مرنے کے بعد جس وقت دوبارہ اُٹھیں گے دوگروہ بن جائیں گے، ایک گروہ اللہ کی رحمت حاصل کرے گا، دُوسرا عذاب میں جائے گا، اس بات کو بار بار دہرایا جارہا ہے اور مختلف انداز کے ساتھ، کیونکہ یہی ایک چیز ہے کہ اگر کسی شخص کی سمجھ میں آجائے اور وہ اس عقیدے کو اپنا لے تو پھر باقی تمام حقائق کا قبول کرنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے، اور جب تک انسان یہی سمجھتا رہے کہ زندگی صرف یہی دُنیوی زندگی ہے، اور اس میں جو عیش بہار کر سکتے ہو کرلو، جو لذت اُٹھا سکتے ہو اُٹھالو، ایسا شخص ہر لحاظ سے بے عمل ہوگا، بدعمل ہوگا، اور اپنے کردار کے لحاظ سے ظالم ہوگا، کبھی وہ راہِ راست پر آنہیں سکتا۔ تو سب سے پہلے آخرت کے عقیدے کی تلقین کی گئی، تو یہ جو آپ کے سامنے سورتیں آرہی ہیں اِن میں بھی یہی مضمون ہے۔ پچھلی سورت میں یہ بھی آیا تھا فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى، اگلی سورت میں ذکر کیا جائے گا کہ آپ کا کام نصیحت کرنا ہی ہے، باقی! اگر کوئی نہ مانے تو اس کو آپ مجبور نہیں کر سکتے، نہ ہم نے آپ کو ان کے اُوپر مسلط کر کے بھیجا ہے، کوئی مان لے گا تو ٹھیک ہے، نہیں مانے گا تو ہم اس سے نمٹ لیں گے۔

تفسیر

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ: غاشیہ: ڈھانپنے والی، کیا آپ کے پاس غاشیہ کی بات آئی؟ ڈھانپنے والی کی بات آپ کے سامنے آئی؟ یعنی ایک ایسی آفت جو کہ سب پر طاری ہوجائے گی اور سب کو ڈھانپ لے گی، تو غاشیہ یہ بھی قیامت کے ناموں سے ایک نام ہے، کہیں اس کو طامۃ الکبریٰ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہیں اس کو صاخہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہیں اس کو قارعۃ کے

ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہیں حاقہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہیں اس کو واقعہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، اسی طرح سے یہاں اس کو غاشیہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ڈھانپ لینے والی، ایسی آفت جو سب پہ طاری ہو جائے گی، سب کو اپنے احاطے میں لے لے گی، ''کیا آپ کے پاس اس کی بات آئی؟'' یعنی وہ بات سننے کے قابل ہے، قبول کرنے کے قابل ہے، غور کرنے کے قابل ہے، آپ نے سنا؟ یہ اِستفہام تقریری ہوتا ہے۔

اللہ کے اَحکام کے سامنے اکڑنے والوں کا اَنجام

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ ۙ عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ...... وُجُوۡہٌ: کچھ چہرے، یَوۡمَئِذٍ: جس دِن کہ وہ غاشیہ آجائے گی، غاشیہ واقع ہو جائے گی، یومَ اِذ کانَ کذا، ''کچھ چہرے جس دِن کہ وہ قیامت آجائے گی'' خَاشِعَۃٌ: جھکنے والے ہوں گے، دبنے والے ہوں گے، عَامِلَۃٌ: محنت اُٹھانے والے ہوں گے نَّاصِبَۃٌ: تھکے ہوئے ہوں گے، یعنی بعضے چہروں کے اُوپر یہ کیفیت طاری ہوگی۔ اصل میں انسان کے دل میں جو جذبات ہوتے ہیں سب سے زیادہ وہ چہرے پر ہی نمایاں ہوتے ہیں، ایسے لوگ جن کے سامنے اچھا مستقبل نہیں ہوگا، دُنیا کے اندر انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو نہیں مانا، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے سامنے اکڑتے رہے، انبیاء ﷤ اور علماء کے سامنے گردنیں اُٹھاتے رہے، آج وہ جھکے ہوئے ہوں گے، ان کے اندر خشوع ہوگا، خضوع ہوگا، دبے ہوئے ہوں گے، جھکنے والے ہوں گے۔ بخلاف اس کے کہ جنہوں نے دُنیا کے اندر خشوع اختیار کیا، اللہ کے اَحکام کے سامنے دَب گئے، جھک گئے، انبیاء ﷤ کے سامنے تواضع اختیار کی، وہ اس دِن خوش حال ہوں گے جیسے آگے آرہا ہے، جنہوں نے دُنیا میں تکبّر کیا تھا تو آج ان کی آنکھ نیچی ہوگی۔ عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ کا مطلب یہ ہوگا کہ بہت محنت اُٹھانے والے ہوں گے، تھکے ہارے ہوں گے، جس طرح سے ایک آدمی نے کام کیا ہو، اور کام کرنے کے بعد کوئی اچھا نتیجہ سامنے آنے والا نہ ہو، تو پھر اس کے اُوپر بہت تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں، اسی طرح سے یہ آخرت میں مشقت اُٹھانے والے ہوں گے، تھکے ماندے ہوں گے، یہ بات بھی صحیح ہے، دُنیا کے اندر انہوں نے جو محنت کی تھی اس محنت کی بنا پر تھکے ہوئے ہوں گے، درماندہ ہوں گے، ایسے معلوم ہوگا کہ جیسے کام کر کے یہ تھک گئے ہیں، کمر ان کی ٹوٹ گئی، اور کوئی حوصلہ افزائی کی بات ان کے سامنے نہیں ہے، عَامِلَۃٌ: محنت کرنے والا، محنت کر کے تھکنے والا، نَّاصِبَۃٌ کا معنی بھی مشقت میں پڑنے والا، ''بعضے چہرے اُس دِن دبنے والے ہوں گے، جھکنے والے ہوں گے، محنت کرنے والے ہوں گے، مشقت اُٹھانے والے ہوں گے۔'' تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَۃً: داخل ہوں گے گرم آگ میں، حامیہ کے معنی گرم، نار: آگ، تَصۡلٰی کی ضمیر وجوہ کی طرف لوٹ گئی، ''وہ چہرے گرم آگ میں داخل ہونے والے ہوں گے، داخل ہوں گے وہ گرم آگ میں''، آگ ہمیشہ گرم ہی ہوتی ہے، اس کے ساتھ حامیہ کا لفظ اس لئے بڑھا دیا تا کہ دُنیا کے مقابلے میں اس کی گرمی زیادہ نمایاں ہو جائے۔ دُنیا کی آگ کبھی مدہم ہو جاتی ہے، اور کبھی پانی ڈالنے کے ساتھ وہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے بجھ جاتی ہے، لیکن آخرت کی آگ نہ کبھی مدہم ہوگی، نہ اس کی سوزش میں اور اس کی گرمی میں کسی قسم کی کمی آئے گی، اس لئے حامیہ کی صفت ذِکر کر دی

گئی اس کی گرمی کی انتہا بیان کرنے کے لئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جہنم کی آگ اس دُنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ تیز ہے،[1] یعنی جتنی حرارت یہاں ہے آگ میں اس سے ستر گنا زیادہ تیز ہے جہنم کی آگ۔

جہنم کا پانی

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ: پلائے جائیں گے وہ چہرے، تُسْقٰى کی ضمیر بھی وجوہ کی طرف ہے، پلائے جائیں گے وہ چہرے گرم چشمے سے، اٰنِيَةٍ کا معنی بھی ہے گرمی کی انتہا کو پہنچنے والا، یعنی جب وہ آگ میں ڈالے جائیں گے، آگ میں ڈالے جانے کے بعد ان کو پیاس لگے گی، پھر وہ پانی مانگیں گے، تو پانی جو ان کو پینے کے لئے دیا جائے گا وہ حمیم ہوگا، گرم پانی، جوش مارتا ہوا، اُبلتا ہوا، جس کے متعلق آپ کے سامنے بہت سی آیات میں ذِکر کیا گیا، یَشْوِی الْوُجُوْهَ (سورۂ کہف:۲۹) چہروں کو بھون دے گا، چہرے کے قریب کیا جائے گا تو اس کی سوزش کے ساتھ چہرے جل جائیں گے، اور اگر اس کو پیا جائے گا تو اندر جا کے وہ انتڑیوں کو کاٹ دے گا، یہ وضاحت اِس کی آپ کے سامنے بہت ساری آیات میں آچکی ہے، اور جب پیاس لگی ہوئی ہو اور پیاس لگنے پر پانی انسان کو نہ ملے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس میں کتنی شدت ہوتی ہے اور کتنی انسان کو تکلیف ہوتی ہے، تو یہاں پانی جو دیا جائے گا وہ انتہائی گرم ہوگا جو سوزش میں اضافہ کرے گا، کسی قسم کے سکون کا باعث نہیں ہوگا۔

جہنم کا کھانا

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ..... ضریع یہ کانٹے دار جھاڑی ہوتی ہے زمین کے اُوپر پھیلی ہوئی، عرب کے علاقے میں موجود تھی، زہریلی، تکلیف دِہ، جس کو کوئی جانور بھی نہیں کھاتا (جلالین)۔ ''اُن کے لئے کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوگی سوائے ضریع کے، نہیں ہوگا اُن کے لئے طعام مگر ضریع سے'' یہ حصرِ اضافی ہے، یعنی لذیذ چیز کوئی نہیں دی جائے گی، اور ''ضریع'' جیسی چیز ان کو دی جائے گی، چنانچہ دُوسری جگہ زَقُّوم کا ذِکر بھی آیا ہے اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ (سورۂ دُخان: ۴۳) اور اسی طرح سے غِسلین کا ذِکر بھی آیا ہے کہ ان کے لئے کوئی کھانے کی چیز نہیں ہوگی سوائے غِسلین کے (سورۂ حاقّہ: ۳۶)، یہ تکلیف دِہ چیزیں تو انہیں ملیں گی، اور ایسی چیز جو ان کے لئے باعثِ راحت ہو، یا باعثِ لذت ہو، یا باعثِ قوت ہو وہ نہیں ملے گی، یہاں حصرِ اضافی ہے، لذیذ کھانے مفید کھانوں کے مقابلے میں یہ حصر کیا جا رہا ہے کہ کوئی چیز ان کو کھانے نہیں دی جائے گی سوائے ضریع کے، یا ضریع جیسی دُوسری چیز کے، بہرحال کوئی لذیذ چیز نہیں ملے گی۔ اب کھانا جو ہم دُنیا کے اندر کھاتے ہیں اس میں تین چیزیں پیش نظر ہوتی ہیں: ۱۔ کسی درجے میں لذت، کہ کھانے میں لطف آئے، تلذذ کے لئے بھی کھایا جاتا ہے۔ ۲۔ اور پھر اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ بدن کے لئے قوت مہیا کرے، قوت کے لئے بھی کھایا جاتا ہے۔ ۳۔ اور بھوک کی تکلیف دفع کرنے کے لئے بھی کھایا جاتا ہے، انسان بھوکا ہوتا ہے تو بھوک کی تکلیف کا اُسے احساس ہوتا ہے، اُس بھوک کی تکلیف کو دُور کرنے کے لئے بھی ہم کھانا کھاتے ہیں۔ اس لیے بھی کھاتے ہیں کہ بدن کو قوت حاصل ہو، اور کچھ اُس میں تلذذ بھی پیش نظر ہوتا ہے، تو جہنم میں جو ان کو کھانے کے لئے دیا

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۶۲ باب صفۃ النار/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۲ باب صفۃ النار کی پہلی حدیث۔

جائے گا، ضریع، یاز قوم، یا غسلین، اس میں تینوں فائدے نہیں ہوں گے، لذت نہیں ہوگی وہ تو اس کے نام سے ہی ظاہر ہے، کہ ایسی کانٹے دار زہریلی جھاڑیاں جن کو جانور بھی نہیں کھاتے جب جہنمیوں کو یہ کھانے کے لئے دی جائے گی تو اس میں کیا لذت ہوگی؟ لذت کی نفی تو اس کے نام سے ہوگئی، اور باقی دو فائدے جو ہیں اُن کی نفی آگے آ گئی لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ: وہ ضریع نہ تو انہیں موٹا کرے گی اور نہ ان کو بھوک سے فائدہ دے گی، بدن کے لئے موٹاپے کا باعث بھی نہیں ہوگی کہ بدن کو کوئی قوت مہیا کرے، ایسا بھی نہیں، اور بھوک سے فائدہ بھی نہیں دے گی، کھانے کے ساتھ اُن کی اور بے چینی بڑھے گی، بے چینی دُور نہیں ہوگی۔ یہ تو ایک فریق کا ذکر ہوا کہ بعضے چہرے اس طرح سے ہو جائیں گے۔

دُنیا میں اللہ کی خاطر محنت کرنے والوں کا انجام

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ: ناعمہ: خوش حال، بعضے چہرے اس دِن خوش حال ہوں گے لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ: اور اپنی کوشش پر خوش ہونے والے ہوں گے، دُنیا کے اندر جو انہوں نے کوشش کی تھی محنت کی تھی، جس کے نتیجے میں کافروں کے سامنے تو سوائے تھکاوٹ اور مشقت کے کچھ نہ آیا، اُن کے پلے تو مشقت ہی پڑی، لیکن یہ اپنی کوشش پر خوش ہونے والے ہوں گے، کہ جو کوشش انہوں نے کی آج اس کا نتیجہ اچھا سامنے آرہا ہے، جیسے ایک شخص محنت کرتا ہے، محنت کرنے کے بعد اچھا نتیجہ سامنے آتا ہے تو اپنی محنت پہ وہ خوش ہوتا ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی، لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ: اپنی کوشش کے لئے وہ خوش ہونے والے ہوں گے۔ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ: عالیہ عُلو سے لیا گیا ہے، عالی شان باغ ہوں گے، لَّا تَسْمَعُ فِیْهَا لَاغِیَةً: نہیں سنیں گے اُس باغ کے اندر کوئی لغو بیہودہ بات، انسان کو اچھا ماحول میسر آجائے جس میں اچھی اچھی باتیں سامنے آئیں تو یہ بہت بڑی راحت ہوتی ہے، خود انسان اچھا ہو لیکن اردگرد ماحول اچھا نہ ہو، ہر وقت خرافات، بکواس، گالی گلوچ کی باتیں کانوں میں آتی رہیں تو یہ رُوحانی طور پر باعث اذیت ہوتی ہیں، جنت کا ماحول ہوگا کہ وہاں نہ کوئی کسی سے لڑے گا، نہ کسی سے گالی گلوچ کرے گا، کوئی بے ہودہ بات سننے میں نہیں آئے گی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ خود خوش حال ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بڑا خوشگوار ہوگا۔ فِیْهَا عَیْنٌ جَارِیَةٌ: اس باغ میں جاری چشمہ ہوگا، یہ جنس کے طور پر مذکور ہے، ایک نہیں بہت چشمے ہوں گے، فِیْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ: اُس باغ میں سُرر مرفوعہ ہوں گے، سرر سریر کی جمع، تخت، مرفوعہ: اُونچے اُونچے، تو اُونچے اُونچے تخت ہوں گے جن کے اُوپر وہ بیٹھیں گے، وَّاَکْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ: اکواب یہ کُوب کی جمع ہے، کُوب یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے آج ہم ''کپ'' کہتے ہیں، پانی پینے کا برتن، گلاس، ''اور آب خورے رکھے ہوئے ہوں گے''...... وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ: کچھ چہرے اُس دِن خوش حال ہوں گے، تر و تازہ ہوں گے، لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ: اور اپنی کوشش کے لئے خوش ہوں گے، اپنی کوشش کی وجہ سے خوش ہوں گے، جو کوشش انہوں نے دُنیا میں کی تھی آج اس کا نتیجہ اچھا سامنے آرہا ہے تو اُن کے لئے خوشی کا باعث ہوگا، ''عالی شان باغ میں ہوں گے، اُس باغ میں کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے، اُس باغ میں جاری چشمہ ہوگا، اور اُس باغ میں اُونچے اُونچے تخت ہوں گے'' چارپائیاں، سریر! ''اُونچے اُونچے تخت ہوں گے اور آبخورے رکھے ہوئے ہوں گے'' جس طرح سے کوئی معزز مجلس ہوتی ہے تو وہاں بیٹھنے والوں کو جب پانی کی ضرورت پیش آئے تو پانی فوراً پیش کر دیا

جائے، کوئی اور ضرورت پیش آئے تو اُس کو پورا کر دیا جائے، تو جیسے مجلس میں سامان ہوتا ہے تو اس قسم کے سامان کی نشان دہی ہے۔ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ: نمارق نُمْرُقَةٌ کی جمع ہے، نمرقہ: گدا، تکیہ جس کے ساتھ انسان ٹیک لگا کے بیٹھتا ہے، مَصْفُوْفَةٌ: قطاروں میں رکھے ہوئے ہوں گے، گدے تکیے قطاروں میں رکھے ہوئے ہوں گے، وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ: بَثٌّ پھیلانے کو کہتے ہیں، بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ قرآنِ کریم کے اندر یہ لفظ آیا تھا (سورۂ بقرہ: ۱۶۴، سورۂ لقمان: ۱۰)، كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ آگے بھی لفظ آ رہا ہے (سورۂ قارعہ) پراگندہ پتنگے، یہ جو چراغوں کے اُوپر آیا کرتے ہیں، فَراش پتنگوں کو کہتے ہیں۔ زَرَابِيُّ یہ زَرْبِيَّة یا زِرْبِيَّة کی جمع، یہ قالین کو کہتے ہیں، ''اور قالین بچھے ہوئے ہوں گے'' مبثوثہ اسم مفعول کا صیغہ آ گیا۔ اب دیکھیں دُنیا کے اندر اچھی سے اچھی مجلس کا آپ یہی نمونہ دیکھ سکتے ہیں، بیٹھنے کے لئے تخت بچھے ہوئے ہیں، قالین ان کے اُوپر ڈالے ہوئے ہیں، گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں، اور عیش وعشرت کا دُوسرا سامان موجود ہے، جنتیوں کی مجلس ایسی ہی ہوگی۔ یہ دو فریقوں کا ذِکر آ گیا، تو ان دونوں کے اندر یہ بات واضح کر دی گئی کہ جب غاشیہ آ جائے گی تو اس طرح سے انسان دو طبقوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

اِثباتِ معاد کے لئے اللہ کی قدرت واِحسان کی نشانیاں

جب یہ قیامت کا مضمون ذِکر کیا جاتا ہے، اکثر وبیشتر مشرکین کی طرف سے جو اِشکال آتا تھا تو وہ بار ہا آپ کے سامنے آ چکا، وہ کہتے تھے یہ ہو کیسے سکتا ہے کہ مرنے کے بعد اِنسان دوبارہ زندہ کر دیا جائے، اور ہڈیاں بوسیدہ ہو جانے کے بعد اس میں دوبارہ جان کون ڈال سکتا ہے؟ تو ان کے دل ودماغ کے اندر یہ خیالات اُبھرتے تھے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ پھر اپنی قدرت کی طرف متوجہ کیا کرتے ہیں، تو یہاں بھی وہی بات ہے، آگے جن چیزوں کا ذِکر کیا جا رہا ہے اُن میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے اور قدرت نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا احسان بھی نمایاں ہے، کہ انسان ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، قدرت نمایاں ہونے کے طور پر تو اللہ کی توحید پر بھی اِستدلال کرنا چاہیے کہ وحدہٗ لاشریک ہے جس نے ایسی ایسی چیزیں پیدا کر دیں، اور وہ ہر طرح سے قادر اور توانا ہے، قوت رکھنے والا ہے، اس لئے مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ اور ایسے ہی اس پہلو پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ جس اللہ نے ہمارے لئے ایسے ایسے سامان کیے ہماری راحت کے، ہمارے آرام کے، اور ایسی ایسی چیزیں پیدا کیں کہ جن سے ہم فوائد اُٹھاتے ہیں، اس نے ہمیں پیدا کرنے کے بعد بالکل بے کار نہیں چھوڑ دیا، بے لگام نہیں چھوڑ دیا، بلکہ جو کھلاتا ہے وہ ایک دِن پوچھے گا بھی کہ اِن نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے بعد تم نے میرے اَحکام پر عمل کیا تھا یا نہیں؟ اس طرح سے جزا اور سزا کی طرف بھی اِن چیزوں سے ذہن متوجہ ہوتا ہے، کہ جو اللہ پیدا کرنے والا ہے، پالنے والا ہے، ایسی ضروریات پوری کرنے والا ہے، وہ آخر ضرور پوچھے گا کہ تم نے ان اِنعامات کے شکریے میں کیا کیا تھا اور کیا نہیں کیا تھا، تو جزا وسزا کے مضمون کی طرف بھی ان باتوں سے اشارہ ہو جاتا ہے۔

اُونٹ میں قدرت واِحسان کی نشانیاں

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ: کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اُونٹ کی طرف کیسے پیدا کیا گیا؟ اُونٹ کی طرف نہیں دیکھتے؟

یہ اُونٹ ایک ایسا جانور ہے جو ہر وقت اہلِ عرب کے استعمال میں رہتا تھا، بلکہ ان کی زندگی کا ایک حصہ تھا، بڑے بڑے لمبے لمبے سفر وہ اُونٹوں پر ہی کرتے تھے، اور اسی پر ہی وہ سامانِ تجارت لاد کے لے جاتے تھے، اس لیے اس کو ''سفینۂ بَرّ'' کہتے ہیں، جنگل کی کشتی، یہ ریگستان کا جہاز ہے، سامان اِسی کے اوپر لاد کے لے جاتے تھے۔ اور اتنی مشقت اُٹھانے والا جانور کہ پانی ایک دفعہ پلا دو تو آٹھ دِن تک ضرورت نہیں، پانی کا ذخیرہ اپنے اندر کر لیتا ہے، اور مختلف قسم کے پتّے اور جھاڑیاں کھا کے گزارا کر لیتا ہے۔ اتنا عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اِنسان کا اتنا فرماں بردار کہ ایک بچے کے ہاتھ میں اس کی نکیل دے دو تو قطار کی قطار کو ایک بچہ ہی لے کے چل دیتا ہے۔ اس کے بدن کی ساخت......! کہ اس کو بٹھا کر اس کے اُوپر بوجھ لاد دو تو کس طرح سے وہ اس کو لے کر کھڑا ہو جاتا ہے، جانوروں میں سے ایک یہی جانور ہے کہ جس کو بٹھا کر اس کے اُوپر اگر بوجھ لاد دیا جائے تو بوجھ اُٹھا کے کھڑا ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اِس کی ساخت کیسی بنائی، پھر سوار ہونے کے لئے آپ کو سیڑھی نہیں لگانی پڑتی، اس کو بٹھا کے اس کے اُوپر سوار ہو جائیں۔ تو یہ ساری کی ساری چیزیں......! پھر کھانے کے کام آتا ہے، اس کا چمڑا کام آتا ہے، اس کے بال کام آتے ہیں، اس کی ہڈیاں کام آتی ہیں، اور اس کا دُودھ لوگ پیتے ہیں۔ تو عرب کی معیشت کے اندر اُونٹ کو ایک بہت مرکزی حیثیت حاصل تھی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اِسی کو غور سے دیکھ لیں تو تمہیں قدرت بھی سمجھ میں آجائے اور اِحسان بھی تمہارے سامنے نمایاں ہو جائے، کہ ایسے قادر کے لئے جس نے تمہارے لئے اُونٹ جیسا جانور بنا دیا جس کے مختلف پہلو تمہارے سامنے ہیں، تو کیا وہ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ یا ایسا محسن، ایسا مربی جس نے تمہاری ضرورت کے لئے ایسے ایسے جانور پیدا کر کے تمہارے ماتحت کر دیے تو کیا وہ تم سے پوچھے گا ہی نہیں کہ اِن نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟

وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ: اُونٹ سامنے ہے، ذرا نظر اُوپر اُٹھاؤ تو آسمان کی طرف نظر چلی جاتی ہے، ''کیا یہ دیکھتے نہیں کہ آسمان کو کیسے اُونچا کیا گیا'' یہ نشانی تو بہت دفعہ آپ کے سامنے واضح کی جا چکی۔

پہاڑوں میں قدرت و اِحسان کی نشانیاں

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ: دائیں بائیں جھانکو تو پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں، عرب کے اندر پہاڑوں کا سلسلہ بھی ایسے ہی ہے، سفر پر جا رہے ہوں تو دائیں بائیں سب پہاڑ ہیں، ''یہ دیکھتے نہیں؟ پہاڑوں کی طرف کہ کیسے وہ گاڑ دیے گئے؟ کیسے کھڑے کر دیے گئے؟'' اور پہاڑ اِنسان کے لئے یہ بھی ایک......! اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی بھی ہیں اور ان میں احسان کا پہلو بھی ہے، کتنی آیات کے اندر یہ واضح کیا گیا کہ انسان کے لئے یہ بایں معنی مفید ہیں کہ ان کے آنے کے ساتھ زمین کا تزلزل رک گیا، ورنہ یہ ہچکولے لیتی اور کسی ایک طرف کو پلٹا کھا جاتی تو ساری کی ساری آبادی کو سمندر میں پھینک دیتی، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے اس تزلزل کو، اس کی اِس ناہموار حرکت کو پہاڑوں کے ذریعے سے کنٹرول کیا۔ پھر پہاڑوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی دولتیں محفوظ کیں، اور انہی پہاڑوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کا نظم قائم کیا، یہ پہاڑ ہوا کے لئے کہیں رُکاوٹ بنتے ہیں، کسی جگہ ہوا کے لئے تیزی کا باعث بنتے ہیں، بارشوں کے اندر ان کا اچھا خاصا دخل ہے، پانی کا ذخیرہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں

کے اندر کیا، اور پانی کو ان کی چوٹیوں کے اُوپر کس طرح سے برف کی شکل میں محفوظ کر دیا، اور بھی ہزاروں پہلو ان کے اندر احسان کے اور اللہ کی قدرت کے ہیں، غور کرنے والوں کے لئے بہت ساری چیزیں موجود ہیں۔ تو یہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے؟ کیسے گاڑے گئے، کیسے کھڑے کیے گئے، نصب کر دیے گئے۔

زمین میں قدرت و احسان کی نشانیاں

وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ: اور یہ زمین کی طرف نہیں دیکھتے؟ کہ وہ کیسے بچھادی گئی۔ زمین کی نشانیوں کی طرف بھی بہت دفعہ متوجہ کیا گیا، سُطِحَتْ! یہ مسطح ہے، یہ بچھادی گئی، یعنی اگرچہ زمین آج کی تحقیق کے مطابق گول ہے، بیضوی شکل کی، جس طرح سے انڈا ہوتا ہے، لیکن ہمیں دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتا ہے جس طرح سے بچھائی ہوئی ہے، ہماری نظر جس طرح سے پھیلتی جاتی ہے، ایک میدانی علاقہ ہی معلوم ہوتا ہے، جس طرح سے مسطح میدان ہوا کرتا ہے۔ اس میں انسان کے لئے مختلف پہلو ہیں انعام کے بھی، قدرت تو ہے ہی اللہ تعالیٰ کی جس طرح سے نمایاں ہے، نہ یہ اتنی سخت کہ انسان کے لئے رہنا مشکل ہو جائے، نہ اتنی نرم کہ انسان اس کے اندر دھنس جائے۔ پھر یہ زمین کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ایک خزانہ ہے جو آپ کے پاؤں کے تلے ہے، آپ کی تمام ضروریات اسی میں سے نکلتی جاتی ہیں اور آپ اسی سے اپنی تمام ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اسی انسان کو مٹی سے ہی اُبھارتا ہے، مٹی میں لوٹا دیتا ہے، یہ زمین تمہارے سامنے ہے، ایک وقت آئے گا تو پھر اسی میں سے انسانوں کو اُٹھا کے کھڑا کر دے گا: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (سورۂ طٰہٰ:۵۵)۔ تو زمین تمہارے سامنے پھیلی ہوئی کس طرح سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی یاددہانی کرتی ہے اور کس طرح سے اللہ تعالیٰ کے اِنعام یاددلاتی ہے، تو ان چیزوں کی طرف یہ لوگ دیکھتے نہیں؟ اگر دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل بھی ہو جائیں، اور یہ بات بھی ان کے سامنے آجائے کہ ایسا قادر و توانا انسان کو دوبارہ پیدا بھی کر سکتا ہے، یہ نہیں کہ ایک دفعہ بنانے کے بعد پھر اس کی قدرت چھن گئی، مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ اور پھر جب اس قسم کے انتظامات اُس نے کیے ہیں تو اِنسان کو پھر اس نے فضول پیدا نہیں کیا، وہ انسان سے محاسبہ بھی کرے گا، اِن آیات سے دونوں باتیں واضح ہوتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذِمّے صرف نصیحت ہے

فَذَكِّرْ: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کرتے رہیے، اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ: آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں، آپ کا منصب نصیحت کرنا ہے، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ: آپ اِن کے اُوپر مسلط نہیں ہیں، مصیطر کہتے ہیں جس کو کسی کے اُوپر مسلط کر دیا گیا ہو، ذمہ دار ٹھہرا دیا گیا ہو، کہ یہ کام تُو نے کرنا ہے یا کروانا ہے، یہ مقصد نہیں ہے، آپ مصیطر نہیں ہیں، ان کے اُوپر مسلط نہیں، کہ آپ سے پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ یا انہوں نے نصیحت کیوں نہیں قبول کی؟ یہ آپ کے ذِمّے نہیں ہے، آپ اِن کو مجبور کرنے والے، اِن کے اُوپر مسلط نہیں کیے گئے۔ ''نہیں ہیں آپ اِن کے اُوپر مسلط کیے ہوئے، داروغہ، منتظم، سنبھالنے والے'' یہ آپ کا منصب نہیں ہے۔

نصیحت سے اعراض کرنے والا اپنا انجام خود بھگتے گا

آپ ﷺ نصیحت کریں، جو قبول کرتا ہے ٹھیک ہے، اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ: اِلَّا مستثنیٰ منقطع، ہاں! جو شخص پیٹھ پھیرے گا اور کفر کرے گا، فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ: پھر اللہ تعالیٰ اسے عذابِ اکبر دے گا، بہت بڑا عذاب دے گا، عذابِ اکبر یہ عذابِ ادنیٰ کے مقابلے میں ہے جس کا ذکر آپ کے سامنے الٓمّٓ السجدۃ میں آیا تھا وَلَنُذِیْقَنَّھُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَکْبَرِ (آیت:۲۱) یعنی دُنیا کے اندر کوئی شخص کتنی ہی تکلیفیں اُٹھالے، کتنی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو، یہ آخرت کے عذاب کے مقابلے میں عذابِ ادنیٰ ہے، اور آخرت کا عذاب اِس کے مقابلے میں بہت بڑا ہے، جس کی تفصیل اگلی سورت میں بھی آپ کے سامنے آرہی ہے۔ اور اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ اس میں ایک پہلو ذکر کر دیا گیا، دُوسرا پہلو خود نمایاں ہے، کہ آپ نصیحت کیجئے، آپ نصیحت کرنے والے ہیں، آپ ان کے اُوپر کوئی داروغہ بنا کے مسلط نہیں کیے گئے، جو شخص قبول کرے گا فائدہ اُٹھائے گا، ہاں! جو شخص قبول نہیں کرے گا، کفر کرے گا، پیٹھ پھیرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو عذابِ اکبر دے گا۔ اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ: ایاب لوٹنے کو کہتے ہیں، بے شک اِن کا لوٹنا ہماری طرف ہی ہے، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ: پھر ان کا حساب بھی ہمارے ہی ذِمّے ہے، لوٹ پوٹ کے انہوں نے ہماری طرف ہی آنا ہے، اور پھر ان کا محاسبہ بھی ہم ہی کریں گے، یعنی کسی اور طرف نہیں جاسکتے، کہیں بھاگیں، کوئی تدبیر کریں، جس کو ہمارے ہاں کہا کرتے ہیں کہ پانی نے آخر انہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے، وہی بات ہے کہ جدھر چاہیں یہ ہاتھ پاؤں ماریں لوٹ پوٹ کے آنا انہوں نے ہمارے پاس ہے، کوئی دوسری جگہ ہے ہی نہیں، کہاں چلے جائیں گے، اور پھر ان کا محاسبہ بھی ہمارے ذِمّے ہے۔ یہ بات ان کو یاددلائی جارہی ہے تاکہ وہ سوچیں اور اپنے اعمال کا جائزہ لیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں کیا نہیں کر رہے۔

آیاتہا ۳۰ ۸۹ سُوْرَۃُ الْفَجْرِ مَکِّیَّۃٌ ۱۰ رکوعہا ۱
سورۂ فجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۰ آیتیں ہیں
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالْفَجْرِ ۝۱ وَلَیَالٍ عَشْرٍ ۝۲ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝۳ وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ ۝۴ ھَلْ فِیْ ذٰلِکَ
فجر کی قسم! ۝ اور دس راتوں کی قسم! ۝ اور جفت اور طاق کی قسم! ۝ اور رات کی قسم جب وہ جانے لگے! ۝ کیا اس میں
قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ ۝۵ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۝۶ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝۷
عقل والے کے لئے کافی قسم ہے؟ ۝ کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ کیا کیا تیرے رَبّ نے عاد کے ساتھ؟ ۝ یعنی اِرم کے ساتھ جو ستونوں والے تھے ۝

الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ﴿٨﴾ وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٩﴾

جن کی مثل شہروں میں پیدا نہیں کی گئی ﴿٨﴾ اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراشے تھے پتھر وادی القریٰ میں ﴿٩﴾

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾

اور فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا ﴿١٠﴾ (یہ وہ لوگ ہیں) جنہوں نے سرکشی اختیار کی شہروں میں ﴿١١﴾ پھر ان شہروں میں انہوں نے فساد بہت زیادہ کیا ﴿١٢﴾

فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا

پس برسا دیا ان پر تیرے رب نے عذاب کا کوڑا ﴿١٣﴾ بے شک تیرا رب البتہ گھات میں ہے ﴿١٤﴾ انسان، جب

مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾

آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو اس کا رب پھر اس کو عزت دے دیتا ہے اور اسے خوش حال کر دیتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی ﴿١٥﴾

وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ ﴿١٦﴾

اور جس وقت اللہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے پھر اس کے اُوپر اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے بے عزت کر دیا ﴿١٦﴾

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ﴿١٨﴾ وَتَاْكُلُوْنَ

ہرگز یہ بات نہیں! بلکہ نہیں اِکرام کرتے تم یتیم کا ﴿١٧﴾ اور نہیں برانگیختہ کرتے ایک دُوسرے کو مسکین کے کھانے پر ﴿١٨﴾ اور کھا جاتے ہو تم

التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾ كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا

ورثے کا مال کھانا اکٹھا کر کے ﴿١٩﴾ اور تم مال کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے ہو ﴿٢٠﴾ ہرگز نہیں! جس وقت کہ کوٹا جائے گا زمین کو خوب اچھی طرح

دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِایْٓءَ یَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ یَوْمَىِٕذٍ

سے کوٹنا ﴿٢١﴾ اور آجائے گا تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار ﴿٢٢﴾ اور لایا جائے گا اس دن جہنم کو، جس دن ایسا ہوگا

یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّكْرٰی ﴿٢٣﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ

انسان نصیحت حاصل کرے گا، اور کیونکر ہوگا اس کے لئے نصیحت حاصل کرنا؟ ﴿٢٣﴾ کہے گا کہ ہائے کاش! میں کوئی چیز آگے بھیج دیتا

لِحَیَاتِیْ ﴿٢٤﴾ فَیَوْمَىِٕذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ

اپنی اس اُخروی حیات کے لئے ﴿٢٤﴾ پھر اُس دن نہیں عذاب دے گا اللہ کے عذاب کی طرح کوئی بھی ﴿٢٥﴾ اور نہیں باندھے گا اس کے باندھنے

اَحَدٌ ﴿٢٦﴾ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾
کی طرح کوئی بھی ﴿٢٦﴾ اے نفسِ مطمئنہ! ﴿٢٧﴾ لوٹ تُو اپنے رَبّ کی طرف اس حال میں کہ تُو بھی راضی اور تیرے پر تیرا رَبّ بھی راضی ﴿٢٨﴾
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾
داخل ہوجا تُو میرے بندوں میں ﴿٢٩﴾ اور داخل ہوجا تُو میری جنّت میں ﴿٣٠﴾

ماقبل سے ربط اور سورۂ فجر کا مضمون

سورۂ فجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۰ آیتیں ہیں۔ اس میں بھی ایسے ہی مضمون ہے جیسے پچھلی سورت کے اندر گزرا، پچھلی سورت میں قدرت کے آثار دِکھائے گئے تھے، اُونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین کو ذِکر کر کے، اور یہاں گزشتہ تاریخ کی طرف متوجہ کیا ہوا ہے کہ پچھلی اُمتوں کی تاریخ پڑھ لو، تمہیں پتا چلے کہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرنے والوں کا آخر انجام کیا ہوا؟ اور انسان کے اس ذہن کی اصلاح کی جارہی ہے کہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اِس دُنیا کو مقصود نہ بنالو، جس طرح سے مادّہ پرست انسانوں کا کام ہے، کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں کامیابی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال کما لیا جائے، اور جس کو مال مل جاتا ہے، رِزق کی وسعت حاصل ہوجاتی ہے، وہ اکڑتا ہے، اِتراتا ہے، وہ کہتا ہے اللہ نے میری عزّت بڑھادی، مال کے حاصل ہوجانے کو وہ عزّت سمجھتا ہے، اور اگر کسی وجہ سے اس کے رِزق میں تنگی آجاتی ہے تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں تو ذلیل ہوگیا، اللہ نے مجھے ذلیل کردیا، گویا کہ انسان کے ذہن میں کامیابی کا تصور یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرلے، اور جو شخص زیادہ سے زیادہ مال حاصل نہ کرسکے وہ اپنے آپ کو ناکام سمجھتا ہے، تو مال کا حاصل ہونا باعثِ عزّت، مال کا حاصل نہ ہونا باعثِ ذِلّت، یہ جو عام طور پر دُنیاداروں کی ذہنیت ہے اِس کے اُوپر اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں انکار فرمایا ہے، عزّت وذِلّت کا مدار مال کی قلت وکثرت پر نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ آزمائش کے لئے دیتے ہیں، اگر کسی کو زیادہ دیتے ہیں تو اس کے شکر کی آزمائش مقصود ہے، اور اگر کسی کے رِزق کو تنگ کردیتے ہیں تو اس کے صبر کی آزمائش مقصود ہے، رِزق کی تنگی اور رِزق کی وسعت یہ ایک آزمائشی دور ہے، اس کا ذِلّت وعزّت کے ساتھ کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں، اس لئے کوئی مال دار اکڑے نہیں، اور کوئی رِزق کی تنگی والا غریب مسکین یہ نہ محسوس کرے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میری کوئی قدر نہیں ہے، یہ تو سب آزمائشی دور ہے، کسی کو اللہ تعالیٰ کسی طرح سے آزماتے ہیں کسی کو کسی طرح سے آزماتے ہیں۔ آخرت کی کامیابی اچھے کردار پر ہوگی، اچھے اخلاق پر ہوگی، اچھے عقیدے پر ہوگی، مال داری اور ناداری یہ آخرت کے نتیجے پر کوئی کسی قسم کا اثر نہیں ڈالے گی، ایک مال دار آدمی اللہ کا شکر گزار، آخرت میں کامیاب ہوگا، مال دار آدمی اللہ کا ناشکرا، آخرت میں پکڑا جائے گا، اسی طرح سے فقیر آدمی جو صابر ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاں عزّت پائے گا، اور جو فقیر محتاج ہوجانے کے بعد اللہ کا شکوہ کرتا ہے، شکایت کرتا ہے اور اس قسم کے خیالات میں مبتلا ہے کہ کچھ نہیں، اللہ نے مجھے پیدا کردیا، کھانے کے لئے کچھ دیا نہیں، مجھے ذلیل کردیا، اس قسم کے اگر خیالات اس کے ہوں گے تو یہی فقیر آخرت میں پٹ جائے گا۔ تو آخرت کی

عزّت اور ذلّت کا مدار صبر وشکر کے طور پر تو سامنے آئے گا، کہ شاکر صابر جو ہوگا اس کا انجام اچھا ہوگا، اور جو ناشکرا ہے، یا نا قدرا ہے، یا اللہ کا شکوہ شکایت کرنے والا ہے، اس کا انجام بُرا ہوگا، مال کی قلت اور کثرت آخرت کے نتیجے پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہے، تو اِس سورت میں یہ بات واضح کی جارہی ہے۔ اور آگے پھر وہی دو گروہوں کی وضاحت ہے، ایک جہنّم میں جانے والے اور ایک اللہ کی رضا کی طرف جانے والے، مضمون وہی ہے دُوسرے انداز سے اِس کو لوٹا دیا گیا ہے۔

تفسیر

وَالْفَجْرِ: فجر کی قسم، وَلَيَالٍ عَشْرٍ: اور دس راتوں کی قسم، وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ: اور جفت اور طاق کی قسم، وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ: اور رات کی قسم جس وقت کہ وہ چلے، جب وہ جانے لگے، سَرٰی يَسْرِیْ: چلنا، جس وقت کہ چلے۔ یہ پانچ قسمیں آگئیں فجر، لیالِ عشر، فجر کی قسم، دس راتوں کی قسم، جفت اور طاق کی قسم، اور رات کی قسم جس وقت کہ وہ جانے لگے۔ ''فجر'' سے مراد تو یہی فجر کا وقت ہے، جب رات گزرتی ہے دِن آنے لگتا ہے روشنی پھوٹتی ہے تو اس کو ''فجر'' کہتے ہیں، تو یہاں وَالْفَجْرِ سے وہی مراد ہے۔

''لیالِ عشر'' کا مصداق

اور ''لیالِ عشر'' سے کون سی دس راتیں مراد ہیں؟ اس میں زیادہ راجح قول تو یہی ہے کہ ذی الحج کی اِبتدائی دس راتیں ہیں، کیونکہ یہ بھی بہت فضیلت والی ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان راتوں کے اندر عبادت کرنا لیلۃ القدر کے اندر عبادت کرنے کے برابر ہے، اور ان دس دنوں میں ایک ایک دِن کے روزے کو سال سال کے روزے کے برابر ٹھہرایا گیا ہے،[1] بڑی فضیلت والی راتیں ہیں ذی الحج کی اِبتدائی دس راتیں۔ اور دُوسرا قول اس میں یہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ دس راتوں سے مراد ہے ہر مہینے کی دس راتیں ابتدائی اور آخری، چونکہ اللہ تعالیٰ یہاں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز میرے کنٹرول میں ہے، کس طرح سے رات کی تاریکی پھیلتی ہے؟ پھر کیسے وہ رات جانے لگتی ہے تو روشنی نمودار ہوتی ہے، اور کس طرح سے مہینے کی مختلف راتوں میں مختلف قسم کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں؟ مہینے کی اِبتدائی دس راتیں، اِن کا ابتدائی حصہ روشن ہوتا ہے اور پچھلا تاریک، اور پچھلی دس راتیں اِن کا پچھلا حصہ روشن ہوتا ہے اور اِبتدائی تاریک، اور درمیان والی دس راتیں جو ہیں ان میں روشنی کی کیفیت اور ہوتی ہے، وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ یہ لفظ جس طرح سے آئے تھے (سورۂ مدثر) کہ رات جب جانے لگے، تو وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کے اندر اس معنی کی طرف اشارہ ہوجائے گا، اِن سب اوقات کو ذِکر کرکے بتایا یہ جارہا ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اندر کیسا نظم رکھا ہے، رات کی تاریکی وقت پہ پھیلتی ہے، کس طرح سے پھر پو پھٹتی ہے اور روشنی آتی ہے، اور مختلف راتوں میں کس قسم کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، رات کا آنا اور جانا اس کے اُوپر توجہ کرو تو تمہیں پتا چلے گا کہ اللہ کی قدرتیں کیسی ہیں، پھر تمہارے سامنے یہ بات آجائے گی کہ جزا وسزا ضرور واقع ہوگی، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے باقی کائنات کو منظم کیا ہے، انسان کو مہمل نہیں چھوڑا، انسان کی زندگی پر بھی اسی طرح سے کنٹرول ہے، یوں یہ شہادت ہوجائے گی اِن قسموں کی اُس مضمون کے متعلق جو آگے بیان کیا جارہا ہے۔

---

(۱) ترمذی ۱/۱۵۸، ابواب الصوم، باب ما جاء فی العمل فی ایام العشر/ مشکوٰۃ ۱/۱۲۸، باب الاضحیۃ، فصل ثانی۔

''جفت''اور''طاق'' کا مصداق

اور شفع و وتر، جفت اور طاق......! ساری کائنات اس میں تقسیم ہے، کوئی چیز جوڑا ہے، کوئی تنہا ہے، ''جفت'' کہتے ہیں جو دو پہ تقسیم ہو جائے، اور ''طاق'' کہتے ہیں جو دو پہ تقسیم نہ ہو، تو اس سے عام جفت و طاق بھی مراد ہو سکتے ہیں، جوڑا اور ایک چیز منفرد، ہر چیز یا جفت ہے یا طاق ہے (عام تفاسیر)...... اور اس سے مہینے کی راتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ راتیں جفت بھی ہوتی ہیں طاق بھی ہوتی ہیں، کسی مہینے کی راتیں جفت ہیں کہ تیس رات کا مہینہ ہو گیا، کسی مہینے کی راتیں طاق ہیں کہ اُنتیس کا ہو گیا، اور اس میں بھی اللہ کی قدرت اس طرح سے نمایاں ہے کہ اُنتیس کا مہینہ اگر بنانا مقصود ہے تو تم زور لگا لو وہ تیس کا نہیں بن سکتا، اور اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی مہینہ تیس کا بنایا ہے تو تم زور لگا لو ایک دِن پہلے چاند دیکھ کے تم اس کو اُنتیس کا نہیں بنا سکتے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی کس طرح سے قدرت ہے کہ اس نے یہ نظام کیسے قائم کیا ہوا ہے، اوقات کے اُوپر کنٹرول اللہ تعالیٰ کا یہاں نمایاں ہے جس طرح سے باقی چیزوں کے اُوپر بھی اللہ کا کنٹرول باقی آیات کے اندر ذِکر کیا گیا ہے...... یہ سب چیزیں اس بات پہ شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنانے کے بعد اِس کو بھی ایسے نہیں چھوڑ دیا، بلکہ نظم اسی کا ہے، اور وہی انسان کو پیدا کرنے کے بعد مکلّف کرتا ہے اور اس کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے، اور انسان بھی اللہ تعالیٰ کے نظم اور ضبط میں ہے، اور اس کے اعمال پر بھی اسی طرح سے جزا اور سزا ہو گی، اس کو مہمل نہیں پیدا کیا گیا، اِن قسموں کی شہادت کے ساتھ اس مضمون کو واضح کیا جا رہا ہے...... تو شفع و وتر سے مراد ہو گیا جفت اور طاق، عام جفت اور طاق مراد لے لیے جائیں، یا جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شفع سے مراد ہے دس ذی الحجہ کا دِن، وہ شفع ہے، کیونکہ دس دو پہ تقسیم ہو جاتے ہیں، اور وتر سے مراد ہے نو ذی الحج جو کہ عرفہ کا دِن ہے،[1] یہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور ہر مہینے کی راتیں بھی مراد ہو سکتی ہین کہ کوئی تیس ہوتی ہیں جفت ہوتی ہیں، کوئی طاق ہوتی ہیں اُنتیس ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح سے باقی ساری دُنیا پر بھی اس کو محیط کر سکتے ہیں کہ ہر چیز یا جفت ہے یا طاق، اللہ تعالیٰ نے اِس کے اندر مختلف قسم کی حکمتیں رکھی ہیں۔

''وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ'' میں ''لیل'' کا مصداق

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ: یہ عام رات مراد ہو گئی، جس وقت کہ جانے لگے، اِذَا يَسْرِ: جب وہ جانے لگے، اور ایک ترجمہ اس میں اور بھی کیا گیا ہے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے حاشیے میں شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے، اِذَا يَسْرِ فِيْهِ سَارٍ، قسم ہے رات کی جس وقت کہ اس رات میں کوئی چلنے والا چلے، کہتے ہیں کہ اس سے لیلۃ المعراج کی رات کی طرف اشارہ ہے جس میں حضور ﷺ چل کے اللہ تعالیٰ کی طرف گئے تھے، اور اس کے اُوپر جو حالات مرتب ہوئے تھے آپ کے سامنے پندرہویں پارے کی ابتدا میں آ چکے ہیں، تو پھر ''لیل'' سے لیلۃ المعراج مراد ہو جائے گی اور تاویل اِس میں یہ ہو جائے گی اِذَا يَسْرِ فِيْهِ سَارٍ، قسم ہے رات کی جس وقت کہ اُس رات میں کوئی چلنے والا چلے، اور اس سے اشارہ ہو جائے گا اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا کے مضمون کی طرف جو آپ کے سامنے گزرا، تو پھر ''لیل'' سے لیلۃ المعراج بھی مراد ہو سکتی ہے۔

---

(۱) سنن نسائی کبریٰ، رقم: ۴۱۰۱، ۱۱۶۷۱، ۱۱۶۷۲، ولفظ الحدیث: أن رسول اللہ ﷺ... قال: عشر النحر والوتر یوم عرفة والشفع یوم النحر.

جوابِ قسم اور اس کی قسموں کے ساتھ مناسبت

بہرحال یہ قسمیں کھا کے جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہاں محذوف ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ یہ سب چیزیں گواہ ہیں اور یہ سارا نظم اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا کو کسی حکمت کے تحت بنایا ہے، اور اس حکمت کے تحت ہی انسان کے اعمال کا نتیجہ اُس کے سامنے آئے گا، انسان کو مہمل نہیں چھوڑا، جیسے ساری کائنات منظم ہے تو اس کائنات سے فائدہ اُٹھانے والا انسان یہ بھی مہمل چھوڑا ہوا نہیں ہے، اس کے اعمال پر جزا سزا مرتب ہوگی۔ یہ مضمون ہے جس کو یہاں مؤکد کر کے ذِکر کرنا مقصود ہے۔

''قسم'' کی عظمت

''قسم'' کی عظمت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ لفظ بول دیے هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ: یہ استفہامِ تقریری ہے، کیا اِس مذکور میں عقل والے کے لئے کافی قسم ہے؟ حِجر کہتے ہیں عقل کو، یہ پیچھے جو ذِکر کیا گیا ہے کیا اِس میں عقل والے کے لئے کافی قسم ہے؟ یعنی یقیناً ہے، اگر سمجھنا چاہے تو یہ قسمیں کافی ہیں جو اُٹھا کے بات کہی جا رہی ہے، سمجھ دار کے لئے عقل مند آدمی کے لئے یہ کافی ہے۔ ایسے ہی لفظ آپ کے سامنے آئے تھے سورۂ واقعہ کے تیسرے رُکوع میں بھی فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۞ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ: اگر تم جانو تو یہ بہت بڑی قسم ہے جو اُٹھائی جا رہی ہے، تو اسی طرح سے یہاں اشارہ ہو گیا کہ عقل مند کے لئے اِس مذکور میں کافی قسم ہے، اس سے زائد اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں، عقل والا آدمی اتنی باتوں سے سمجھ سکتا ہے، حِجر عقل کو کہتے ہیں۔

اِثباتِ قدرت کے لئے تاریخِ عالَم کا ذِکر

پچھلی سورت میں جس طرح سے آثارِ قدرت کو نمایاں کیا گیا تھا اُونٹ، پہاڑ، زمین اور آسمان کو ذِکر کر کے، اب آگے تاریخِ عالَم کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے، کہ آپ اگر اس بات کو سمجھنا چاہیں کہ انسان بھی اللہ کے کنٹرول میں ہے جس طرح سے یہ اوقات اللہ کے کنٹرول میں ہیں تو پچھلی تاریخ اُٹھا کے دیکھو، کہ ایسی ایسی سرکش قومیں پیدا ہوئیں، بڑی بڑی قوت والی، بڑے بڑے دعوے کرنے والی، لیکن جب وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ہی جھٹکے کے ساتھ دُنیا سے ملیامیٹ کر دیا، ان کا نام ونشان باقی نہیں چھوڑا، اس سے بھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قوموں کا آنا جانا یہ بھی کسی نظم کے تحت ہے، اور اِنسانوں کے اُوپر اللہ نے اس طرح سے کنٹرول کر رکھا ہے کہ جب کسی کو بڑھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے بڑھانا مشکل نہیں، اور اگر کسی کو مٹانا چاہتا ہے تو اس کے لئے مٹانا مشکل نہیں، کسی کو سمندر کی لہر کی نذر کر دیا، کسی کو ہوا کے جھونکوں سے اُڑا دیا، اور کوئی زمین کے زلزلے کے ساتھ بے نام ونشان ہو گئے، یہ تاریخ کے اندر پچھلی قوموں کے واقعات لکھے ہوئے ہیں جن کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔

''عادِ اُولیٰ'' اور ''عادِ اُخریٰ''

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ: کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رَبّ نے عاد کے ساتھ کیا کیا، یہ اشارے ہیں، باقی! واقعات

کی تفصیل آپ کے سامنے گزر گئی، اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ: اِرم یہ عاد سے بدل ہے، یعنی عاد سے مراد اِرم، ''عادؔ'' دو ہوئے ہیں، ایک عَادًا الْاُوْلٰی کے ساتھ قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا ہے اور ایک عادِ اُخریٰ بھی ہے، تو عادِ اِرم کہہ کر عادِ اُولیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ ''عادؔ'' اصل کے اعتبار سے تو ایک شخص کا نام ہے، اور نُوح علیہ السلام کے قریب زمانے میں یہ قوم ہوئی ہے، ان کا نسب نامہ جو ''بیان القرآن'' میں لکھا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے: ''عاد بن عاص بن ارم بن سام بن نُوح'' یعنی یہ اتنی سی پشتیں ہیں، عاد، اور اس کا باپ جو تھا عاص، اور اس کا باپ اِرم، اور اس کا باپ سام، اور سام نُوح علیہ السلام کا بیٹا ہے، پانچویں نمبر پر گویا کہ نُوح علیہ السلام آ جاتے ہیں۔ اور اِرم کا ہی دُوسرا بیٹا ہے ''عابر''، عابر کا بیٹا تھا ثمود، تو ثمود اور عاد یہ اِرم پہ جا کے اکٹھے ہو جاتے ہیں، ان کا جَدّ ایک ہے، تو عاد کی اولاد میں سے جو قبیلہ پھیلا اس کو ''قومِ عاد'' کے ساتھ قرآنِ کریم نے ذِکر کیا ہے، اور ثمود کی اولاد میں جو پھیلے ہیں وہ ''قومِ ثمود'' کہلائی، دونوں کے واقعے کو قرآنِ کریم کے اندر ذِکر کیا گیا ہے۔ تو عاد چونکہ اِرم کے قریب ہے، اس لئے اس کو ''عادِ اِرم'' کے ساتھ تعبیر کر دیا یہ بتانے کے لئے کہ ایک ''عادِ اُخریٰ'' بھی ہے، یہ اشارہ جو کیا جا رہا ہے تو یہ ''عادِ اُولیٰ'' کے واقعے کی طرف کیا جا رہا ہے جن کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا، اور ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا، مفصل واقعات آپ کے سامنے دوسری سورتوں میں گزر چکے ہیں۔

قومِ عاد کا انجام، اور ''ذَاتِ الْعِمَادِ'' کے دو مفہوم

''کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رَبّ نے عادِ اِرم کے ساتھ کیا کیا'' اِرم یہ عاد سے بدل ہے، ذَاتِ الْعِمَادِ: ایسے عاد جو کہ ستونوں والے تھے، عِماد کہتے ہیں ستونوں کو، ستونوں والے تھے اس سے دو معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ''بیان القرآن'' میں تو یہ بات لی گئی کہ اُن کے قد و قامت کی طرف اشارہ ہے کہ اتنے مضبوط اور اتنے اُونچے قدوں کے تھے جس طرح سے ستون کھڑے ہوتے ہیں، اور قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے بدنی ڈیل وڈول کے اعتبار سے باقی لوگوں سے ممتاز تھے، ایک جگہ لفظ آیا ہے كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (سورۂ حاقہ) کہ جب آندھی نے ان کو اُٹھا اُٹھا کے پھینکا تو زمین پر پڑے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جس طرح سے کھجور کے کھوکھلے تنے، اُس سے بھی ان کے قدوں کی طرف اشارہ ہے، اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ فصلت: ۱۵) یہ بھی انہی کا نعرہ تھا، کہ ہم سے زیادہ زور آور بھی دُنیا میں کوئی ہے، بڑے قد قامت والے تھے، بڑے ڈیل وڈول والے تھے، جس طرح سے آج آپ دیکھ لیں کہ ایک ہی مُلک میں، پاکستان میں، مختلف علاقوں میں، مختلف قومیں، مختلف قد و قامت کی ہیں، بعض علاقوں کے لوگ چھوٹے چھوٹے قد کے ہیں، بعض علاقوں کے لوگ لمبے لمبے قد کے ہوتے ہیں، کسی علاقے کے لوگ کچھ موٹائی کی طرف مائل ہوتے ہیں، کسی علاقے کے پتلے پتلے ہوتے ہیں، اسی طرح سے قومِ عاد کے قد کچھ لمبے تھے اور بڑے مضبوط قسم کے لوگ تھے جس کی بنا پر وہ اس تکبر میں مبتلا ہو گئے کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ہم سے زیادہ زور آور بھی کوئی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے۔ چنانچہ یہ قوم جو تھی آپ کو معلوم ہے کہ ہوا کے ساتھ تباہ کی گئی تھی، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہی اُڑا دیے، اتنے بڑے بڑے مضبوط اور اتنے بڑے بڑے

دعووں والے اللہ کی ہوا کا مقابلہ نہیں کر سکے...... اور یا دُوسرا اشارہ ہے ان کی عمارات کی طرف، کہ یہ پہلی قوم ہے جنہوں نے ستون کھڑے کر کے اُونچی اُونچی عمارتیں بنائیں، تعمیرات کے اندر اس قوم نے بہت ترقّی کی تھی، توذَاتِ الْعِمَادِ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے، ستونوں والے یعنی جن کے ایسے محلات تھے جو ستونوں پہ کھڑے تھے، اور یہ پہلی قوم ہے جنہوں نے ستونوں کے اُوپر عمارت کا آغاز کیا تھا، مضبوط مضبوط محلات بنانے والے، بڑے بڑے ستون کھڑے کر کے عمارتیں اُونچی اُونچی بنانے والے، تو نے دیکھا نہیں؟ کہ تیرے رَبّ نے اُن کے ساتھ کیا کیا۔ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ: ایسا عاد (چونکہ اس سے قوم قبیلہ مراد ہے اس لئے الَّتِیْ اس کی صفت مؤنث آئی) کہ جن کی مثل شہروں میں پیدا نہیں کی گئی، یعنی اپنے اس زمانے میں اس جیسی ترقّی یافتہ قوم اور اس جیسی قوت والی قوم، سمجھ دار، متمدّن قوم دُوسری کوئی نہیں تھی۔ ''شہروں میں ان جیسی مثل پیدا ہی نہیں کی گئی۔''

قومِ ثمود کا ذِکر

وَثَمُوْدَ: اور کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رَبّ نے کیا کیا ثمود کے ساتھ، الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ: واد سے وادِی القریٰ مراد ہے، یہ اُن کے رہنے کی جگہ ہے، ''جنہوں نے تراشے تھے پتھر وادی القریٰ میں'' جو وادی القریٰ میں رہتے تھے اور وہاں پتھر تراش کر کر کے مکان بناتے تھے، ان کے مکانات کا ذِکر بھی قرآنِ کریم میں بہت جگہ آیا ہے، میں نے عرض کیا تھا ایک جگہ غالباً سورۂ شعراء میں، کہ مودودی صاحب نے ان کی عمارات کے فوٹو بھی دیے ہیں جو آج تک ان کے نشانات قائم ہیں، سعودی عرب کے علاقے میں۔ ''جنہوں نے پتھر تراشے تھے وادی القریٰ میں'' وادی القریٰ جگہ کا نام ہے، جنہوں نے وادی میں پتھر تراشے تھے یعنی پتھر تراش کر کر کے مکان بنائے تھے۔

''ذِی الْاَوْتَادِ'' کے دو مفہوم

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ: اور تُو نے نہیں دیکھا؟ کہ تیرے رَبّ نے کیا کیا فرعون کے ساتھ، ایسا فرعون جو کہ میخوں والا تھا، اوتاد: وَتَد کی جمع ہے، وَتَد: میخ کو کہتے ہیں، ''میخوں والے فرعون کے ساتھ کیا کیا؟'' میخوں سے کیا مراد ہے؟ کہتے ہیں کہ یہ اس کے لشکروں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، کہ جہاں وہ جاتا تھا جس میدان میں جا کے ٹھہرتا تھا تو خیمے لگانے کے لئے کیلے ہی کے لئے جو ٹھونکے پڑتے تو ایسے ہوتا تھا جیسے میخیں ہی میخیں گڑ گئیں، تو فوجوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، ذِی الْاَوْتَادِ: بڑے کیلوں والا تھا، اُس نے کیلے ٹھونک رکھے تھے، کثرت کے ساتھ اُس کی فوجیں تھیں اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے گا...... یا دُوسری بات مفسرین نقل کرتے ہیں کہ اس کی عادت تھی کہ جب کسی کو سزا دیتا تھا تو کیلے ٹھونک کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا، باندھنے کے بعد اس کو سزا دیتا، یا اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونک دیتا تھا، چومیخا کر دیتا، تو جس کی بنا پر وہ فِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ہی مشہور کیا گیا تھا، میخوں والا فرعون، اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ بہرحال اس کی شان و شوکت نمایاں ہے، چاہے فوجوں کی کثرت کے ساتھ، چاہے اس کے غلبے اور تسلط کے ساتھ، کہ اپنے مخالفین کے ساتھ وہ یہ معاملہ کیا کرتا تھا، اتنے بڑے بڑے جابر اور سرکش، تُو نے دیکھا نہیں؟ کہ تیرے رَبّ نے ان کا کیا حال کر دیا، تو اب تم کس طرح سے سمجھتے ہو کہ جو روِیہ بھی اختیار کر لو تمہیں

پوچھنے والا کوئی نہیں؟ اگر پچھلی تاریخ کی طرف تم دیکھو تو تمہیں پتا چلے کہ قوموں کی بربادی کس طرح سے آتی ہے جس وقت وہ آخرت کا انکار کر کے دُنیا کے اندر سرکش ہوجاتے ہیں، یہ تاریخ کی طرف متوجہ کر کے اُن کو متاثر کیا جارہا ہے۔ فِرْعَوْنَ اس کا عطف بھی عاد کے اُوپر ہے، "کیا تُو نے دیکھا نہیں؟ کہ کیا کیا تیرے رَبّ نے فرعون کے ساتھ، ایسا فرعون جو میخوں والا تھا۔"

مذکورہ قومیں عذاب میں مبتلا کیوں ہوئیں؟

الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ: یہ سب کے ساتھ لگ گیا، یہ سارے وہ لوگ ہیں جنہوں نے شہروں میں سرکشی اختیار کی تھی، طغیان اختیار کیا تھا، یہ متواضع نہیں تھے، اللہ کی بات کے سامنے سر جھکانے والے نہیں تھے، یہ باغی طاغی تھے، "جنہوں نے سرکشی اختیار کی شہروں میں"۔ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ: پھر ان شہروں کے اندر بہت فساد مچایا، فساد دونوں طرح سے ہی ہے، حقوق اللہ بھی تلف کئے، حقوق العباد بھی تلف کیے، لوگوں پر بھی ظلم کیا اور اللہ کی بات بھی نہیں مانی، "شہروں میں انہوں نے فساد بہت زیادہ کیا"۔ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ: پس برسا دیا اُن پر تیرے رَبّ نے عذاب کا کوڑا، صَبّ ڈالنے کو کہتے ہیں، یہاں صَبّ سے برسانا مراد ہے، "تیرے رَبّ نے اُن کے اُوپر عذاب کا کوڑا برسایا"، جب عذاب کا ڈنڈا ان کے اُوپر برسا تو پھر ان کا نام ونشان بھی نہیں رہا، چاہے اپنے وقت میں کتنے ذی شان تھے، اپنے وقت میں کتنے بڑے لوگ تھے، لیکن جب عذاب کا ڈنڈا سر کے اُوپر آیا تو بے نام ونشان ہوگئے، ثمود زلزلے کے ساتھ تباہ ہوئے تھے، عاد آندھی کے ساتھ تباہ ہوئے تھے، اور فرعون آپ کو معلوم ہے کہ یہ دریا میں ڈوبا تھا، اِس کو پانی کے طوفان کے ساتھ غرق کردیا گیا تھا۔

سرکش کے لئے یہی کائنات بجائے فائدے کے عذاب کا ذریعہ بن جاتی ہے

تو اللہ تعالیٰ کی کائنات میں رہتا ہوا انسان سرکشی کس طرح اختیار کرسکتا ہے؟ نہ یہ اللہ کی ہوا کا مقابلہ کرسکے، نہ یہ اللہ کے پانی کا مقابلہ کرسکے، اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی ایک مخلوق کو انسان کے پیچھے لگادے تو انسان میں ہمت نہیں ہے اس کا مقابلہ کرنے کی، جن چیزوں سے یہ فائدہ اُٹھاتا ہے، جن نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، وہی نعمتیں اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہیں، آج دیکھیے کیسی کیسی سواریاں ہیں جن کے اُوپر آپ سوار ہوتے ہیں اور ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا اشارہ ہوتا ہے تو ایک ہی منٹ میں یہی سواری آپ کو اپاہج کر کے رکھ دیتی ہے، کسی حادثے کا شکار ہوگئے تو دونوں ٹانگوں سے محروم ہوگئے، کسی حادثہ کا شکار ہوگیا اور ایک ہی منٹ کے اندر اس دُنیا سے پار ہوگیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہروقت انسان کے اُوپر محیط ہے، جن چیزوں سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے جب انسان اللہ کا باغی اور سرکش ہوجائے تو انہی چیزوں کو اللہ تعالیٰ مسلط کر کے انسان کے لئے بربادی کردیتے ہیں، صبح شام رات دن یہ واقعات آپ کے سامنے ہیں۔

اللہ کی نگاہ سے کوئی بھی مخفی نہیں

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ: یہ حاصل بات ہوئی، بے شک تیرا رَبّ البتہ گھات میں ہے، مرصاد کہتے ہیں مورچے کو، ایسے

ٹھکانے کو کہ جہاں چھپ کے کوئی انسان دُوسرے کی نگرانی کرتا ہے کہ یہ کون گزر رہا ہے؟ کدھر کو جا رہا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ جسے نگران دِیدبان کہتے ہیں، جہاں بیٹھا ہوا انسان دوسرے کی نگرانی کیا کرتا ہے، اس کو کہتے ہیں مرصاد۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ: تیرا رب گھات میں ہے، کیا مطلب؟ کہ اس طرح سے سمجھو کہ تمہارا کوئی عمل کردار مخفی نہیں، ہر وقت اللہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو، جس وقت تمہاری سرکشی کسی حد تک پہنچے گی اللہ تعالیٰ ایک ہی دفعہ گردن مروڑ دے گا، تم اللہ کی نگاہ سے مخفی نہیں ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے۔نعوذ باللہ۔غافل نہیں ہے، کہ تم چھپے ہوئے ہو اور اللہ کے سامنے نہیں، نہیں، اللہ ہر وقت تمہارے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔

مال کی قلت و کثرت کو عزّت و ذِلّت کا معیار سمجھنا بڑی غلطی ہے!

اب آگے انسان کا وہ حال...... ! کہ اس نے کامیابی اور ناکامی کے لئے کیسا غلط معیار تلاش کر رکھا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا میں اگر مال مل جائے تو عزّت ہے اور یہی بڑائی ہے، اور اگر مال نہیں ملتا تو دُنیا میں ذِلّت ہے اور یہی انسان کی اللہ کے نزدیک ذلیل ہونے کی علامت ہے، یہ معیار بالکل غلط ہے! اللہ کے ہاں عزّت اور ذِلّت کا مدار مال کی قلت اور کثرت پہ نہیں ہے، اللہ اگر کسی کو مال دیتا ہے تو وہ بھی آزمائش، اور اگر نہیں دیتا اور تنگی میں ڈالتا ہے تو وہ بھی آزمائش، جو اِس آزمائش کو سمجھ جاتے ہیں اور اِس کا حق ادا کرتے ہیں وہ نفسِ مطمئنہ کا مصداق ہیں، جن کو ہر طرح کے تصرف کے اُوپر اطمینان ہے، کہ اللہ اگر مال دے دے تو بھی ان کو اطمینان ہے، اور اگر اللہ کی حکمت کے تحت وہ کسی فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو بھی وہ مطمئن رہتے ہیں، ایسے نفسِ مطمئنہ کا انجام آخر میں ذِکر کیا جائے گا۔ اور جو مال کی محبت کے اندر مبتلا ہو گئے، مال حاصل کرنے کے لئے مال سمیٹنے کے لئے لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہیں، مسکینوں کا حق مارتے ہیں، یتیموں کا حق مارتے ہیں، کسی مورث کے مرجانے کے بعد وارثوں کا حق نہیں دیتے، جس کا زور چلتا ہے ساری میراث خود سمیٹ لیتا ہے، جس قسم کی غلطیاں وہ اہلِ عرب کیا کرتے تھے، ان کا بُرا اَنجام ان کو دِکھایا جا رہا ہے۔ تو مال کی محبت کے اندر مبتلا ہو کے مال سمیٹنے کے لئے ظلم و ستم کا اِرتکاب کرنا، غریب مسکینوں کے اُوپر رحم نہ کرنا، یہ آخرت میں عذاب میں ڈال دے گا۔ اس لئے ہر وقت اس پہلو کو سامنے رکھو کہ مال کی تقسیم ایک آزمائشی دور ہے، مال کی قلت و کثرت کے اوپر عزّت اور ذِلّت کا مدار نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے جس میں انسان مبتلا ہوتا ہے تو پھر آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، دُنیا سمیٹنے میں لگ جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ کمانے میں لگ جاتا ہے، جب اس کے ذہن میں یہ آ جائے کہ زیادہ مال کما لینا ہی کامیابی ہے، تو اس کا سارے کا سارا رُخ مال کمانے کی طرف ہو جائے گا۔ اور جب یہ بات آ گئی کہ یہ تو ایک ابتلائی دور ہے، قلت و کثرت اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت دیتے ہیں، اگر کسی کو زیادہ دے دیں تو وہ بھی ایک آزمائش ہے، قلیل دے دیں تو وہ بھی ایک آزمائش ہے، وقت ہر کسی کا گزر جانا ہے، قلیل المال کا بھی گزر جانا ہے، کثیر المال کا بھی گزر جانا ہے، دیکھنا تو یہ چاہیے کہ مال ملنے کی صورت میں تم نے کیا کیا؟ اور مال نہ ملنے کی صورت میں تم نے کیا کیا؟ اس نتیجے کے اوپر نظر رکھو۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ: انسان، جس وقت اس کا رَبّ اس کو آزمائش میں ڈال دے، یہ اِبتلا کا ذِکر پہلے کر دیا، "جب آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو اُس کا رَبّ" فَاَكْرَمَهٗ: پھر اس کو عزّت دے دیتا ہے، وَنَعَّمَهٗ: اور اسے خوش حال کر دیتا ہے، فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ: تو پھر اِنسان یہ کہتا ہے کہ میرے رَبّ

نے مجھے عزّت دی، وَاَمَّآ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ: اور جس وقت اللہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے پھر اس کے اُوپر اس کا رزق تنگ کردیتا ہے، معلوم ہوگیا کہ پیچھے اَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ یہ رزق کی کشادگی کی طرف اشارہ ہے، فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ: پھر اُس کے اُوپر اس کا رزق تنگ کردیتا ہے آزمائش کے لئے، فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ: تو پھر یہ کہتا ہے کہ میرے رَبّ نے مجھے بےعزّت کردیا، گویا کہ اس کے نزدیک عزّت اور بےعزّتی کا مدار مال کی قلت اور کثرت ہے۔ كَلَّا: ہرگز یہ بات نہیں، نہ مال کا زیادہ دے دینا اور خوش حال کرنا اللہ کے نزدیک عزّت ہے، اور نہ تنگی میں ڈال دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اہانت ہے، بلکہ یہ تو سارے کا سارا آزمائشی دور ہے جیسے کہ ابۡتَلٰىهُ کے لفظ کے اندر ذِکر کردیا گیا۔

حُبِّ مال کی بنا پر کُفّار میں موجود عملی خرابیاں

بَلۡ لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ: بَل یہ اِضراب ہے، یعنی تم اس چیز کو اِبتلا سمجھ کے اس کا حق ادا نہیں کرتے، بلکہ یہ یہ خرابیاں ہیں جو تمہارے اندر پائی جاتی ہیں حُبِ مال کی بنا پر، ''بلکہ تم نہیں عزّت کرتے یتیم کی، یتیم کا اِکرام نہیں کرتے'' جس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو یتیم کا اِکرام کرے، ''اِکرام'' کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ یتیم کو صرف روٹی دے دینا کافی نہیں، بلکہ ایسے طور پر اس کے ساتھ معاملہ کرو جس میں وہ اپنی عزّت محسوس کرے، کسی کی تحقیر کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے اگر اس کے سامنے کھانے کی چیز رکھ بھی دی جائے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، یتیم کو کھلاؤ، اس کی سرپرستی کرو، لیکن ساتھ ساتھ معاشرے میں اس کو عزّت کا مقام دو، اس کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے، تو جو یتیم کا اِکرام کرتے ہیں، ان کی عزّت کرتے ہیں، ان کا اِحترام کرتے ہیں، معاشرے کے اندر ان کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ ہیں اچھے لوگ، اور ان مادّہ پرست لوگوں کا یہ عیب ذِکر کیا جارہا ہے کہ یہ یتیم کا اِکرام نہیں کرتے، اس کے ساتھ کوئی عزّت کا معاملہ نہیں کرتے، بلکہ اہانت کرتے ہیں ظلم کرتے ہیں۔ وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ: بلکہ نہیں اِکرام کرتے تم یتیم کا، اور نہیں برانگیختہ کرتے ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر، نہیں برانگیختہ کرتے، حَضَّ يَحُضُّ: برانگیختہ کرنا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ مسکین کو صرف کھانا دے دینا کافی نہیں، بلکہ انسان کو چاہیے کہ دُوسروں کو بھی ترغیب دیتا رہے کہ مسکین کو کھانے کے لئے دیں، اپنے عمل سے بھی اور اپنے قول سے بھی ترغیب دے، عمل یہ کہ جس وقت خود کھلائے گا تو دُوسروں کو بھی دیکھ کے خیال آئے گا، اور زبانی طور پر بھی کہنا چاہیے کہ مساکین کو کھانا کھلاؤ، اور جو مال کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں وہ کبھی کسی مسکین کو کھانا دینے کے لئے تیار نہیں، ''نہیں برانگیختہ کرتے ہو تم ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر۔'' وَتَاۡكُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَكۡلًا لَّمًّا: تُراث یہ اصل میں ''وُراث'' تھا، واؤ کو تاء سے بدل دیا، اس سے ورثہ مراد ہے، ''اور کھا جاتے ہو تم ورثہ'' اَكۡلًا لَّمًّا: سارا ہی اکٹھا کرکے، لَمّ جمع کرنے کو کہتے ہیں، وراثت کا مال سارا ہی سمیٹ کے کھا جاتے ہو، اصل مستحقین کو نہیں دیتے، جیسے کوئی مرگیا اور اس کے یتیم چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، تو جو اُن کا متولّی ہوتا وہی سارا سمیٹ لے جاتا، یا جو بڑے بالغ ہوتے وہی لے لیتے، چھوٹوں کا حق نہ رکھتے، چھوٹوں کو اُن کا حق ادا نہ کرتے، یہ بھی ایک عیب تھا، اور یہ بھی سارے کا سارا حُبِ مال سے ہی ناشی ہے، کہ جب مال کی محبت ہوگی تو انسان مال زیادہ سے زیادہ سمیٹے گا،

دوسرے کا حق ادا کرے گا نہیں، مال حاصل ہو جانے کے بعد غریب مسکینوں پہ خرچ بھی نہیں کرے گا، "اور کھا جاتے ہو تم ورثے کا مال کھانا اکٹھا کر کے" یعنی سارے کا سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا: جَمًّا: کَثِیْرًا کے معنی میں ہے، اور تم مال کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے ہو۔

قیامت کے دِن کا منظر

كَلَّا: اِس کے ساتھ ردع کی جارہی ہے کہ تمہارے یہ اعمال اچھے نہیں، ان کا کوئی اچھا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ان کے اُوپر کوئی سزا مرتب ہونے والی نہیں تو تمہارا یہ خیال غلط ہے، تو كَلَّا کے ساتھ ردع کر دی گئی۔ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا: دُوسرا مصدر تاکید کے لئے ہے، جس وقت کہ کوٹا جائے گا زمین کو خوب اچھی طرح سے کوٹنا، کوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کوٹ کے برابر کر دیا جائے گا، اُونچ نیچ ساری ختم ہو جائے گی، جس طرح سے کوئی جگہ اُونچی ہو نیچی ہو پھر اس کو کوٹ کے برابر کر دیا جائے، میدانِ قیامت میں اسی طرح سے میدان جو ہوگا وہ سارا صاف ستھرا کف دست ہوگا، اس میں کوئی اُونچ نیچ نہیں ہوگی۔ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا: اور آجائے گا تیرا رَبّ اور فرشتے قطار در قطار، فرشتے قطار در قطار آجائیں گے، اور تیرا رَبّ بھی آئے گا، اللہ کا آنا کس طرح سے ہوگا؟ اور فرشتے قطار در قطار کس طرح سے آئیں گے؟ جب اس کا مشاہدہ ہوگا تو یہ بات سمجھ میں آئے گی، دُنیا میں رہتے ہوئے ہم اس کی پوری تمثیل نہیں بیان کر سکتے۔ وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ: جِایْٓءَ فعل مجہول آ گیا، اور لایا جائے گا اُس دِن جہنم کو، جہنم کھینچ کے سامنے نمایاں کر دی جائے گی۔

قیامت کے دِن کافر کی بے فائدہ حسرت اور پچھتاوا

یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ...... یَوْمَئِذٍ: یومَ اِذ کانَ کذا، "جس وقت یہ واقعات پیش آئیں گے اس وقت انسان نصیحت حاصل کرے گا اور کیونکر ہوگا اُس کے لئے نصیحت حاصل کرنا" اُس وقت نصیحت حاصل کرے گا، اس کو سب کچھ یاد آجائے گا جس کو یہ بھولا ہوا تھا، لیکن کیا فائدہ؟ اب نصیحت حاصل کرنے کا کون سا موقع رہ گیا؟ یعنی پیچھے جو کہا گیا تھا کہ اگر نصیحت نفع دے تو نصیحت کرتے رہیے، پھر کہا گیا کہ آپ کا کام نصیحت کرنا ہی ہے، آپ لوگوں پہ مسلط نہیں کیے گئے کہ زبردستی منالیں، آج اگر یہ نہیں مانتے تو قیامت کے دِن پھر اِن کو سب کچھ یاد آئے گا لیکن اُس وقت پھر نصیحت حاصل کرنے کا، یاد کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ اس میں یہ ترغیب دی جارہی ہے کہ آج موقع ہے کہ نصیحت حاصل کرو، ورنہ پھر بعد میں پچھتاؤ گے، پھر یاد کرنے کا اور نصیحت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں، "جس دِن ایسا ہوگا" یومَ اِذ کانَ کذا، "انسان نصیحت حاصل کرے گا اور کیونکر ہوگا اُس کے لئے نصیحت حاصل کرنا"۔ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ: کہے گا انسان ہائے کاش!، یٰلَیْتَنِیْ یہ تمنا ہے، قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ: حیات سے کون سی حیات مراد ہے؟ دونوں طرح سے اس کا معنی کیا جا سکتا ہے، اگر اس حیات سے دُنیوی زندگی مراد لیں تو لام وقت کے لئے ہو گیا، "کہے گا کہ ہائے کاش! میں اپنی دُنیوی زندگی کے وقت اس آخرت کے لئے کچھ آگے بھیج دیتا، دُنیوی زندگی کے وقت جس وقت میں دُنیا میں زندہ تھا اور عمل کا موقع تھا اس وقت میں آخرت کے لئے کچھ آگے بھیج دیتا کیا ہی اچھا ہوتا، پھر انسان یوں حسرت اور

افسوس کرے گا۔ اور اگر حیات سے مراد آخرت کی حیات لے لیں تو پھر معنی یہ ہو جائے گا" کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اس اُخروی حیات کے لئے کوئی چیز آگے بھیج دیتا، آخرت کی زندگی کے لئے میں کوئی چیز آگے بھیج دیتا کیا ہی اچھا ہوتا" پھر یہ حسرت اور افسوس ہوگا۔

اللہ کی گرفت اور عذاب تصور سے بھی بالا ہوگا!

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ: پھر جس دن کہ ایسا ہوگا کوئی شخص بھی اللہ کے عذاب کی طرح عذاب نہیں دے گا، نہیں عذاب دے گا کوئی بھی اللہ کا عذاب، یعنی اللہ تعالیٰ ایسی سزا دے گا کہ کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی کسی دُوسرے کو ایسی سزا دے سکتا ہے، اللہ کے عذاب کا یہ حال ہوگا۔ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ: اور نہیں باندھے گا اس کے باندھنے کی طرح کوئی بھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اس طرح جکڑے گا کہ کوئی دُوسرا انسان جکڑ ہی نہیں سکتا، اللہ کے جکڑنے کی طرح کوئی جکڑ نہیں سکتا اور اللہ کے عذاب دینے کی طرح کوئی عذاب نہیں دے سکتا، دیکھو! اس کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر دوں، باتیں تو بہت دفعہ آپ کے سامنے واضح ہوگئیں، دُنیا میں اگر اِنسان کوئی سزا دے سکتا ہے تو صرف اس کے بدن کو پیٹ سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا، اس کے دِل پر اس کا کنٹرول نہیں، اس کے دماغ پر اس کا کنٹرول نہیں، پھر آخر کیا اِنتہا ہے اُس کی سزا کی، موت آجائے گی تو ختم ہو جائے گا، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب صرف بدن پر نہیں ہوگا، انسان کی رُوح کے لئے بھی ہوگا، انسان کے قلب کے لئے بھی ہوگا، نہ رُوح کو چین ہوگا، نہ قلب کو چین ہوگا۔ اور اِنسان اگر دُوسرے کو جکڑتا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ سکتا ہے، خیالات پر کنٹرول نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ جب جکڑتا ہے تو خیال کو بھی جکڑ دیتا ہے، اور خیال کا جکڑنا یہ ایک بہت بڑا عذاب ہے، اگر آپ کسی تکلیف میں مبتلا ہوں لیکن آپ سوچنا شروع کر دیں کہ اس کے بعد مجھے یہ راحت ہوگی، یا کسی دوسری بات کی طرف آپ کا دھیان چلا جائے، تو دوسری بات کی طرف دھیان جانے کے ساتھ تکلیف کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اگر آپ سوچنا شروع کر دیں کسی دوسری چیز کو، اور اگر آپ کے خیال کو بھی آپ کی تکلیف پر ہی بند کر دیا جائے کہ سوائے آپ اپنی تکلیف کے کوئی چیز سوچیں ہی نہ، تو تکلیف دوگنی ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے جو کہا کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص بیمار ہو یا تکلیف میں ہو تو اس کے پاس بیٹھ کے اس کو اور باتوں میں لگاؤ تاکہ اس کا اپنی بیماری کی طرف دھیان ہی نہ جائے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بیماری کی طرف دھیان کا جانا اور بیٹھ کے یہ سوچتے رہنا کہ میں بیمار ہوں، مجھے یہ تکلیف ہے، میرے یہ درد ہو رہا ہے، اس کے ساتھ انسان کی تکلیف میں اضافہ ہوتا ہے، اور جب اس کو اور باتوں میں لگا لیا جائے، اِدھر اُدھر کی باتوں میں جب اُس کا خیال بٹ جائے گا، اپنی تکلیف کی طرف دھیان نہیں رہے گا، تو تکلیف اَہون (ہلکی) ہو جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ انسان کے خیال کو بھی پابند کر دے گا کہ خیالاتی طور پر بھی انسان اپنے لیے کوئی راحت سوچ نہیں سکے گا، بلکہ اپنی تکلیف کی طرف متوجہ ہوگا جس سے اس کو تکلیف کا احساس اور زیادہ بڑھ جائے گا، "نہیں عذاب دے گا اس کے عذاب کی طرح کوئی بھی اور نہیں جکڑے گا، باندھے گا اس کے باندھنے کی طرح کوئی بھی۔"

نفسِ مطمئنہ کا اِعزاز

یہ تو انجام ہوا ان لوگوں کا جنہوں نے دُنیا کے اندر نصیحت حاصل نہیں کی اور دُنیا کی محبت میں مبتلا ہو کے اس قسم کے ظلم

کا اور حق تلفی کا ارتکاب کرتے رہے، اگلے جملے کے اندر دُوسرے فریق کا انجام واضح کر دیا ''اے نفسِ مطمئنہ!'' نفسِ مطمئنہ: ایسا نفس جو کہ قرار پکڑنے والا ہے، نیکی پر قرار پکڑنے والا ہے۔ یاد ہوگا! پہلے نفس کی تین قسمیں آپ کے سامنے ذکر کی گئی تھیں سورۂ قیامہ کی ابتدا میں، نفسِ اَمّارہ، نفسِ لوّامہ، نفسِ مطمئنہ۔ نفسِ مطمئنہ وہ ہوتا ہے جو اللہ کی اطاعت پر سکون پاتا ہے اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اور اُس کو اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی سکون حاصل ہوتا ہے، بُرائی کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں جاتی، اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں، ''اے نفسِ مطمئنہ! اے اطمینان والی جان!''...... یا یہاں ماقبل کے اعتبار سے مطمئنہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ جو فقر کی حالت میں بھی مطمئن ہے اور مال داری کی حالت میں بھی مطمئن ہے، اگر وہ مال دار ہے تو بھی اپنی جگہ اللہ کے فیصلے پر مطمئن ہے اور اُس کو بھی اللہ کے شکر کا ذریعہ بناتا ہے اور مخلوق پر احسان کرتا ہے، اللہ کی عبادت کرتا ہے، اس کو اطمینان حاصل ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مال حاصل ہو گیا تو کہیں زائل نہ ہو جائے، جس طرح سے مال دار ہر وقت پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں، نہیں، وہ ہر حال میں مطمئن ہے، جو اللہ کی طرف سے تصرف ہو جائے، اور اگر اللہ فقر و فاقہ میں مبتلا کر دے تو بھی وہ یہ سوچ کر مطمئن ہے کہ اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ تو ایسی جان جو ہر حال میں اللہ کے اَحکام پر مطمئن ہے، اللہ کے تصرف کے اُوپر اس کو سکون حاصل ہے، اسے کہا جائے گا: اِرْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً: لوٹ تُو...... نفس چونکہ مؤنث ہے اس لیے مطمئنہ صفت مؤنث آئی اور اِرْجِعِیْ مؤنث کا صیغہ آیا...... لوٹ تُو اپنے رَبّ کی طرف اس حال میں کہ تُو بھی راضی اور تیرے پر تیرا رَبّ بھی راضی، رَاضِیَةً: تُو خوش، مَّرْضِیَّةً: تیرے اُوپر رضا، تیرے متعلق اللہ بھی راضی، راضی مرضی ہو کر اللہ کی طرف لوٹ، فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ: پس تُو داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

دُنیا میں صالحین کی رفاقت کا فائدہ

تو ''میرے بندوں میں داخل ہو جا'' یہ مستقل نعمت ہے، اس لئے انبیاء ﷩ کی دُعائیں بھی آپ کے سامنے ذکر کی گئی ہیں اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (سورۂ یوسف:۱۰۱، سورۂ شعراء:۸۳)، اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ (سورۂ نمل:۱۹)، تو نیک بندوں میں شامل ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان ہے، تو میرے نیک بندوں میں شامل ہو کے میری جنت میں چلا جا۔ اب دُنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی جنتی لوگوں کی نشانی آپ کے سامنے آ گئی کہ جس کا دُنیا میں اِلحاق بالصالحین ہے اسی کے متعلق توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی اس کو جنت میں لے جائیں گے، یہ اِس سے اشارہ نکلتا ہے، اگر آپ جنت میں جانا چاہتے ہیں تو دُنیا کے اندر جنتیوں کی رفاقت اختیار کرنے کی کوشش کرو، اللہ کے بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کرو، نیک لوگوں کی خدمت میں بیٹھو، ان کی صحبت اختیار کرو، خود نیک بننے کی کوشش کرو، جب تمہارا شمار صالحین میں ہو جائے گا تو صالحین کو جس وقت حکم ہوگا جنت میں داخل ہونے کا تو آپ کو بھی ساتھ ہی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں داخل ہو جا تُو میرے بندوں میں اور داخل ہو جا تُو میری جنت میں، یہ انجام واضح کر دیا گیا اچھے لوگوں کا، اور پیچھے انجام تھا بُرے لوگوں کا، یہی مضمون مسلسل آپ کے سامنے کئی سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

آیاتھا ۲۰ ۹۰ سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ ۳۵ رکوعھا ۱

سورۂ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۰ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳

نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی! ۝ اور آپ بسنے والے ہیں اس شہر میں ۝ اور قسم کھاتا ہوں میں والد کی! اور اس چیز کی جس کو اس نے جنا! ۝

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝۴ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ۝۵ یَقُوْلُ

یہ پکی بات ہے کہ انسان کو ہم نے مشقت میں پیدا کیا ۝ کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہرگز نہیں قادر اس کے اُوپر کوئی بھی؟ ۝ کہتا ہے

اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝۷ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ ۝۸

کہ میں نے بہت کثیر مال خرچ کر دیا ۝ کیا وہ سمجھتا ہے کہ نہیں دیکھا اُس کو کسی نے؟ ۝ کیا نہیں بنائیں ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں ۝

وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ ۝۹ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ۝۱۰ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝۱۱ وَمَآ

اور زبان اور دو ہونٹ ۝ اور ہم نے اس کی راہنمائی کی دو راستوں کی طرف ۝ پس نہ عبور کیا اس نے گھاٹی کو ۝ آپ کو کیا

اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝۱۲ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝۱۳ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝۱۴ یَّتِیْمًا

معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ ۝ وہ گھاٹی ہے گردن کا چھڑانا ۝ یا کھانا کھلانا بھوک والے دن میں ۝ کسی یتیم کو

ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝۱۶ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا

جو کہ رشتہ دار ہے ۝ یا کسی مسکین کو جو کہ مٹی والا ہے ۝ پھر ہو ان لوگوں میں سے جو ایمان لاتے ہیں اور ایک دُوسرے کو وصیت کرتے ہیں

بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝۱۷ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ۝۱۸ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا

صبر کی اور ایک دُوسرے کو وصیت کرتے ہیں رحم کرنے کی ۝ یہ ہیں دائیں طرف والے ۝ اور جو ہماری آیات کا انکار

بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ ۝۱۹ عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝۲۰

کرتے ہیں وہ بائیں طرف والے ہیں ۝ ان کے اُوپر آگ ہوگی بند کی ہوئی ۝

ماقبل سے ربط اور سورۂ بلد کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۰ آیتیں ہیں۔ مضمون اِس سورت کا پچھلی سورتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے، اِس میں بھی انسان کے مکلف ہونے کا ذکر ہے، اور اس بات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہے، اس کا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں، آگے انسان نتیجے کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں، بعضے ایمان اور عملِ صالح کو اپناتے ہیں ان کا انجام بھی اچھا ہوگا، اور بعضے کُفر کو اور کُفریات کو اَپناتے ہیں تو ان کا انجام بھی بُرا ہوگا، ''مکی'' سورتوں میں یہی مضمون مختلف عنوان کے ساتھ آپ کے سامنے واضح کیا جارہا ہے۔

تفسیر

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ: اُقْسِمُ کے شروع میں جو لَاَ آتا ہے آپ کے سامنے کافی دفعہ اس کی وضاحت ہوگئی کہ یہ اُقْسِمُ کی نفی نہیں کرتا، بلکہ یا تو اس کو زائد قرار دیا جاتا ہے، اور یا اُس گفتگو پر انکار ہوتا ہے جو مخالفین کی طرف سے سامنے آتی ہے۔ ترجمہ یوں ہی کیا جائے گا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ: میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں، لَاَ زائدہ ہوگیا۔ اور اگر لا کا معنی کرنا ہی ہو تو پھر وہی مفہوم واضح کرنا پڑے گا کہ مشرکین جو کہتے ہیں کہ انسان کے اعمال کے ساتھ جزا سزا کا تعلق نہیں، لَاَ: یہ بات نہیں ہے، اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ: میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں، اِس سے پھر آگے دُوسری بات شروع ہوجائے گی، یعنی اپنے مخاطب کی بات پر انکار ہوگیا لَاَ کے ذریعے سے، اور آگے نئی بات شروع ہوگئی، ''نہیں نہیں، بات اس طرح سے نہیں، نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اِس شہر کی'' تو نہیں کے ساتھ نفی کرنی مقصود ہے اُس گفتگو کی جو مشرکین کرتے تھے، اور جس کی قرآنِ کریم تردید کرتا ہے اور اس کو غلط قرار دیتا ہے، اور وہ گفتگو زیادہ تر جزا اور سزا کے متعلق ہی ہوتی تھی، تو مشرک جو کہتے ہیں کہ جزا وسزا نہیں ہے، انسان کے اعمال کے اُوپر آخرت میں کچھ مرتّب ہونے والا نہیں، یہ بات غلط ہے، ایسے نہیں ہے، قسم کھاتا ہوں میں اِس شہر کی، وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ: اور آپ حِل ہیں اس شہر میں، وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ: اور قسم کھاتا ہوں میں والد کی اور اُس چیز کی جس کو اُس نے جَنا، یعنی اولاد۔ هٰذا البلد: اِس بلد سے مکہ معظمہ مراد ہے، البلد الأمین کے ساتھ آگے والتین کے اندر بھی اس کا ذکر آئے گا وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ، تو بلدِ امین سے وہی! مکہ معظمہ مراد ہے، یہاں الْبَلَدِ سے بھی وہی شہر مراد ہے، ''میں اِس شہر کی قسم کھاتا ہوں!''

''حِلٌّ'' کے تین مفہوم

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ: اور آپ حِل ہیں اس شہر میں۔ حِلٌّ ...... اَحَلَّ یَحِلُّ: حلال ہونا، اور حَلَّ یَحُلُّ حُلُول: اُترنا اور نازل ہونا، دو معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا کرتا ہے...... اگر تو اس کو حلول سے لیں اُترنے اور نازل ہونے کے معنی میں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ اِس شہر میں نازل ہونے والے ہیں، آپ اس شہر میں اُترنے والے ہیں، رہنے والے ہیں، بسنے والے ہیں، تو یہ اُس شہر کے شرف کی طرف اشارہ ہوجائے گا کہ میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اس حال میں کہ آپ اس شہر کے اندر بسنے والے ہیں،

اور اَنْتَ کا خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے......اور اگر یہ حَلَّ یَحِلُّ سے لیا جائے، آپ اِس شہر میں حِل ہیں، تو حِل کا معنی حلال، پھر اس کے دو مفہوم ہیں کہ یہ شہر جو مشرکینِ مکہ کے نزدیک بھی، جہلاء کے نزدیک بھی، بلدِ اَمین ہے اور حرم ہے، جس میں یہ کسی شخص کو تکلیف نہیں پہنچاتے، حتیٰ کہ کسی جانور کو بھی تکلیف نہیں پہنچاتے، اور شرعاً بھی تکلیف پہنچانا جائز نہیں اللہ کے اَحکام کے تحت، اور اِس بات کو جاہلیت سے یہ مانتے چلے آرہے ہیں، تو یہ عجیب بات ہے کہ آپ اس شہر میں حلال سمجھے جارہے ہیں، اور آپ کی عزت آپ کی جان مال محفوظ نہیں ہے، ہر طرف سے آپ کو تکلیف پہنچائی جاری ہے، ''آپ حلال ہیں اس شہر میں'' یعنی آپ کی حُرمت محفوظ نہیں، آپ کا اِس شہر میں اِحترام نہیں، یہ ہر وقت آپ کی عزت اور آپ کی جان کے درپے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے نزدیک بھی یہ شہر حرام ہے، یہ بلد الحرام کہلاتا ہے، اور اس کی حُرمت کے یہ بھی قائل ہیں، اور اس کی حُرمت کا مطلب یہی ہے کہ اس شہر کے اندر کسی رہنے والے کو تکلیف نہیں دی جاسکتی، حتیٰ کہ اس کی حدود میں آنے والے کسی جنگلی جانور کو بھی ستایا نہیں جاسکتا، لیکن آپ کو یہ حلال سمجھتے ہیں، آپ کی جان، مال، عزت کے ساتھ یہ تعرض کرتے ہیں، اگر حِل حلال سے لے لیا جائے تو پھر اِس کا مفہوم یہ ہے......اور دُوسرا مطلب اِس کا یہ بھی ذِکر کیا گیا ہے، آپ حل ہیں یعنی آپ پر سے حُرمت اُٹھنے والی ہے، اِس شہر کی حُرمت آپ پر اُٹھادی جائے گی، آپ کے لئے اس شہر کے اندر لڑنا حلال کردیا جائے گا، اس لئے عام طور پر مترجمین نے ترجمہ یہی کیا ہے کہ: اَنْتَ یَحِلُّ لَكَ الْقِتَالُ فِیْ هٰذَا الْبَلَدِ: آپ کے لئے اس شہر کے اندر لڑنا حلال ہوجائے گا، تو یہ پیش گوئی ہوگئی کہ اگرچہ یہ شہر حُرمت والا ہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ آپ کے لئے اس شہر میں لڑنا حلال ہوجائے گا، آج آپ مظلوم ہیں، مقہور ہیں، اور مشرک آپ کے اُوپر غالب آتے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب آپ اس شہر کے اندر فاتحانہ داخل ہوں گے۔ یہ مفہوم بھی ذِکر کیا گیا ہے۔

اور والد: جننے والا، باپ، اِس سے آدم علیہ السلام مراد ہیں۔ اور مَا وَلَدَ سے ساری اولاد مراد ہے۔

اِنسان اِبتدا تا آخر مشقت ہی مشقت میں ہے

آگے جو مضمون ذِکر کیا جارہا ہے قسم اُٹھا کر، وہ یہ ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ: یہ پکی بات ہے، لَقَدْ تاکید کے لئے آیا کرتا ہے، یہ پکی بات ہے کہ انسان کو ہم نے مشقت میں پیدا کیا، کبد: مشقت کو کہتے ہیں، انسان کو ہم نے مشقت میں پیدا کیا، اس کی زندگی اِبتدا سے لے کر آخر تک مشقت ہی مشقت ہے، ماں کے بطن میں یہ مختلف مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے، پیدا ہونے کے وقت مختلف تکلیفیں جھیلتا ہے، بچپن میں اس کے اُوپر مختلف حادثات آتے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد آئے دن حوادثات کا شکار رہتا ہے، کبھی پیٹ خراب ہوگیا اور کبھی کوئی اور گڑبڑ ہوگئی، پھر دانت نکلنے کا وقت آتا ہے تو کتنی مصیبت اُٹھاتا ہے، پھر جب چلنے پھرنے لگتا ہے تو کہیں گرا، کہیں ٹھوکر کھائی، اور اس کے بعد زندگی میں کمانے کھانے کے لئے اس کو کتنی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اُوپر کتنے واقعات آتے ہیں، کبھی بیمار ہوگیا، کبھی مالی نقصان ہوگیا، حتیٰ کہ زندگی جو گزرتی جارہی ہے تو ساری مشقت ہی مشقت ہے، انسان کو دُنیا کے اندر راحت، آرام اور چین مکمل طریقے سے نہیں، ہم نے انسان کو پیدا ہی ایسے طور پہ کیا ہے، یہ ہے مضمون جو کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ کے الفاظ میں ذِکر کیا گیا۔

قسم کی جوابِ قسم کے ساتھ مناسبت

اور یہ بات آپ پہ مخفی نہیں چونکہ بارہا اس کو ذکر کیا جا چکا، کہ قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ جس چیز کی قسم اُٹھایا کرتے ہیں اکثر وبیشتر اس کو مابعد والے مضمون کے لئے بطورِ شاہد کے ذِکر کیا جاتا ہے کہ یہ چیز گواہ ہے، یہ شہر گواہ ہے، آپ گواہ ہیں اور والد اور اولاد یہ ساری کی ساری گواہ ہے کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ شہر گواہ کس طرح ہے؟ اس سے اس شہر کی تاریخ کی طرف اشارہ کر دیا گیا، کہ یہ سنگلاخ وادی ہے، غیر ذی زرع وادی ہے، جس میں اُگتا کچھ نہیں، نہ پانی تھا، نہ گھاس کا تنکا، ایسے وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو لا کے یہاں آباد کیا، نہایت مشقت کے حالات تھے، بہت دُشواریاں تھیں اُس وقت زندگی گزارنے میں۔ اور پھر آپ تو خود مشقت کا شکار تھے ہی، کہ اس شہر میں آپ بسنے والے ہیں، اس لئے آپ شہر کے حالات کو جانتے ہیں، آپ کے سامنے تاریخ واضح ہے، اپنے خاندان کی تاریخ واضح ہے کہ کیسے مشقت کے ساتھ یہ آ کے آباد ہوئے تھے، اور کتنی دقتوں کے ساتھ یہ خاندان پھلا اور پھولا۔ اور آپ حلال سمجھے ہوئے ہیں تو اس لئے آپ پر تو جو مشقتیں آ رہی ہیں وہ خود موجود ہی ہیں، اور ایک وقت آنے والا ہے جب آپ کے لئے لڑنا حلال کر دیا جائے گا وہ بھی ایک قسم کی مشقت ہی ہوگی جو آپ بھی اُٹھائیں گے اور شہر والوں پر بھی پڑے گی، اور آدم علیہ السلام سے لے کر آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اس بات پر شاہد ہے کہ دُنیا کے اندر مکمل راحت اور چین کسی کو نہیں، بلکہ جب دیکھو کسی نہ کسی مشکل کے اندر انسان پھنسا ہوا ہے، تو انسان کو پیدا ہی ہم نے مشقت میں کیا ہے، یہ مشقت اُٹھاتا ہوا ہی اپنی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن اس مشقت کے نتیجے میں آخر کسی کی مشقت اس کے لئے اچھے انجام کو سامنے لائے گی، اور کوئی مشقت اُٹھائے گا لیکن اس کے لئے انجام بُرا سامنے آئے گا۔

ہر انسان روزانہ اپنے آپ کو بیچتا ہے

جیسے حدیث شریف میں آتا ہے "كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوبِقُهَا" او کما قال علیه الصلوة والسلام[1] ہر انسان صبح کرتا ہے تو اپنے نفس کی بیع کرتا ہے اپنے آپ کو بیچتا ہے، بیچنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی صلاحیتیں صَرف کر کے کچھ نہ کچھ لیتا ہے، وقت اپنا صَرف کرتا ہے، بدن کی قوت اپنی صَرف کرتا ہے، آنکھ کی بینائی کو اِستعمال کرتا ہے، ہاتھوں کی قوت کو صَرف کرتا ہے، کسی نہ کسی کام میں لگتا ہے، اپنا وقت دے رہا ہے، اپنی صلاحیتیں صَرف کر رہا ہے، اور کوئی نہ کوئی چیز آگے سے لے رہا ہے، اُس آگے سے لینے والی چیز کے نتیجے میں یا تو یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں گرا رہا ہے، کہ بدنی قوتیں صَرف کیں، وقت لگایا، نتیجۃً گناہ کمایا، تو بربادی کی طرف اپنے آپ کو لے گیا، تو اس نے بیع ایسے طور پر کی کہ اپنی صلاحیتیں صَرف کر کے نقصان اُٹھالیا۔ مُعْتِقُهَا یا اس کو آزاد کرانے والا ہے، کہ اپنی صلاحیتیں صرف کر کے اس کو اللہ کے عذاب سے نجات دلوائی اور اپنے آپ کو

---

(۱) مسلم ۱/ ۱۱۸، کتاب الطهارة کی پہلی حدیث/ مشکوٰة ۱/ ۳۸، کتاب الطهارة کی پہلی حدیث۔

آزاد کروالیا، تو ہر انسان کی کوشش ایک بیع ہے جس میں اپنے آپ کو کھپاتا ہے، کھپانے کے بعد یا ہلاکت خریدتا ہے یا نجات خریدتا ہے۔ انسان کا کوئی وقت خالی نہیں جارہا، محنت کر رہا ہے، اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (سورۂ انشقاق) کے اندر جس طرح سے یہ مضمون ذکر کیا گیا تھا۔

ہر انسان کسی حاکم کے سامنے محکوم ومجبور ہے

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ: جب اس کے سامنے ہے کہ اس کو پیدا کیا گیا ہے، اور اس کی زندگی اس طرح سے ہے کہ اگر یہ چاہے بھی تو مکمل آرام دُنیا میں حاصل نہیں کر سکتا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ کوئی حاکم قادر اس کے اُوپر مسلط ہے، اور وہ جس طرح سے اس کو رکھنا چاہے اسی طرح سے یہ رہ سکتا ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ مجھے دُنیا کے اندر مکمل چین نصیب ہوجائے، میں کسی حادثے کا شکار نہ ہوں، مجھے کوئی غم اور فکر نہ ہو، لیکن آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں رہتے ہوئے کوئی انسان اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ انسان کسی حاکم کے سامنے محکوم ہے، مقہور ہے، مجبور ہے، وہ اپنی زندگی اپنے چاہے ہوئے اُصول کے مطابق نہیں گزار سکتا، اِس سے اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ جو میرا مالک ہے، خالق ہے، اس کے بھی میرے اُوپر کچھ حقوق ہیں، میں محنت اور مشقت اُٹھاؤں تو اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے اُٹھاؤں۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ: کیا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی اِس کے اُوپر کوئی قادر نہیں؟ اس کے اُوپر کسی کا بس نہیں چلتا؟ یہ یوں آزاد ہو کے زندگی گزار رہا ہے؟ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اُوپر کوئی زور والا موجود نہیں ہے؟ کوئی زور آور نہیں ہے اس کے اُوپر؟ ''کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہرگز نہیں قادر اس کے اُوپر کوئی بھی؟'' یعنی اپنے آپ کو اس نے یوں آزاد سمجھ لیا؟ کہ اپنے اُوپر یہ کسی کو سمجھتا ہی نہیں۔

اِنسان کا مالی جرم

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا: کہتا ہے کہ میں نے بہت کثیر مال ہلاک کردیا، خرچ کر دیا، لُبَدًا كثيرًا کے معنی میں ہے، مالًا كثيرًا۔ تَلَبَّدَ الشَّيْءُ: اِجْتَمَعَ، اکٹھے ہونے کے معنی میں آیا کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال دیا، اب یہ مال کو اسلام کے خلاف، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، دھڑا دھڑ خرچ کرتا ہے، اور پھر فخر کرتا ہے کہ دیکھو میں نے کتنا مال خرچ کر دیا۔ یا رُسوم میں، اپنی شہوات کے پورا کرنے میں، اور بُرے کاموں کے اندر خرچ کرتا ہے، اور اس جرم کے باوجود پھر فخر کرتا ہے کہ کہتا ہے میں نے بہت کثیر مال خرچ کر دیا۔ تو مالیات کے طور پر انسان کا جرم جو ہے اس کو نمایاں کیا جارہا ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے مال کو غلط راستوں میں خرچ بھی کرتے ہیں اور پھر فخر بھی کرتے ہیں، اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ: وہ جیسی ڈینگیں مارتا ہے کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کوئی دیکھ نہیں رہا؟ وہ کوئی اپنے خالق مالک سے مخفی ہے؟ اَيَحْسَبُ: کیا وہ سمجھتا ہے اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ: کہ نہیں دیکھا اس کو کسی نے، وہ اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہے؟ جیسے پیچھے آیا تھا اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (سورۂ فجر) تیرا رَبّ تو گھات میں ہے، ایک ایک نقل وحرکت انسان کی دیکھ رہا ہے، اس کا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں۔

آنکھوں میں اللہ کی قدرت واِحسان کے پہلو

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ: یہ وہی! احسانات آ گئے، جس میں قدرت بھی ہے، احسان بھی ہے، جیسے سورۂ غاشیہ میں اُونٹ وغیرہ کا ذِکر کیا گیا تھا، زمین کا، آسمان کا، پہاڑوں کا، جس میں قدرت اور اِحسان دونوں تھے، اور اسی طرح سے پچھلی سورتوں کے اندر بھی مختلف چیزوں کی طرف متوجہ کیا گیا تھا، تو یہاں بھی قدرت اور اِحسان دونوں نمایاں کئے جا رہے ہیں، اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ: کیا ہم نے اِس کے لئے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟ اگر یہ غور کرتا تو دیکھتا کہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں، اب اس بات کی تفصیل آپ کے سامنے کیا کی جائے کہ آنکھ میں اللہ کی قدرت کتنی نمایاں ہے اور آنکھ انسان کے لئے کتنی بڑی نعمت ہے، اور جب آنکھ نہ رہے تو پھر اس نعمت کا احساس ہوتا ہے، اور آنکھ میں قدرت کتنی نمایاں ہے وہ آپ دیکھ لیں کیسے اللہ تعالیٰ نے اس کو بنایا، کیسے اس کے اندر بینائی رکھی، کس طرح سے یہ کھلتی ہے اور بند ہوتی ہے، کیسے اس کے لئے حفاظت کا سامان اللہ نے بنایا، انسان کی زندگی کے اندر کتنی اہم چیز ہے، تو جس نے تمہیں آنکھیں دے کر بینا کر دیا کیا تمہیں بینائی دینے والا خود تمہیں نہیں دیکھ رہا؟ تم اس بات کو سوچ نہیں رہے؟ اس سے اللہ کی قدرت کو بھی سمجھو اور اللہ کے اِنعام کو بھی دیکھو۔

زبان اور ہونٹوں میں قدرت واِحسان کے پہلو

وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ: اور کیا نہیں بنائی ہم نے اس کے لئے زبان اور دو ہونٹ؟ زبان میں اللہ کی کتنی قدرت نمایاں ہے کہ ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، لیکن دیکھو اس میں اللہ نے کتنی صلاحیت رکھی، تیز سے تیز ٹائپ کرنے والی مشین حروف اتنی جلدی ٹائپ نہیں کر سکتی جتنی جلدی حروف زبان سے خارج ہوتے ہیں، اور ایسے طور پر خارج ہوتے ہیں کہ انسان کے عقل اور اِرادے کو بھی اُس کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے، یعنی اگر آپ یہ سوچنا چاہیں کہ اب میں ''سین'' بول رہا ہوں، پھر یہ ''عین'' بول رہا ہوں، پھر یہ ''تاء'' بول رہا ہوں، ''طاء'' بول رہا ہوں، تو آپ ایک لفظ بھی نہیں ادا کر سکتے۔ اس طور پر آپ بولتے چلے جا رہے ہیں جیسے بِلا سوچے سمجھے حروف کی ترکیب ہوتی چلی جا رہی ہے، اور ایک لفظ ایک مخرج سے نکلتا ہے، دُوسرا لفظ دُوسرے مخرج سے، اور کتنی جلدی یہ بدلتی ہے کہ یہاں لگی وہاں لگی، کرتے کراتے تسلسل کے ساتھ اپنے مخارج تبدیل کرتی چلی جا رہی ہے اور حروف بناتی چلی جا رہی ہے جس سے انسان اظہار مافی الضمیر کرتا ہے۔ ساری زندگی استعمال کرتے رہیں یہ گھستی نہیں، اور کتنی دیر تک آپ بولتے رہیں، تو یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا اِنعام ہے۔ پھر اس میں ذائقے کی قوت رکھی، چکھنا اور ذائقہ معلوم کرنا سب زبان کا کام ہے، تو اگر زندگی میں انسان سے ایک زبان ہی چھین لی جائے تو بتائیے اُس کی زندگی کے اندر کیا مزہ باقی رہ گیا، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی ہے اور قدرت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا اِنعام بھی ہے۔

اور پھر زبان کے ساتھ یہ دو ہونٹ، آپ جانتے ہیں کہ بولنے کے اندر جس طرح سے زبان کا دخل ہے اسی طرح سے ہونٹوں کا بھی دخل ہے، اگر آپ دونوں ہونٹوں کو کھلا رکھیں تو آپ حروف ادا نہیں کر سکتے، اندر سے صرف ایک ہوا آتی ہے، یہ جس وقت آپ بولتے ہیں تو پھیپھڑے کی طرف سے صرف ایک ہوا آتی ہے، ہوا آ کے ٹکرا کے زبان اور ہونٹوں کو حرکت دینے کے ساتھ

اس میں حروف پیدا ہوتے ہیں، اگر آپ زبان کو بھی حرکت نہ دیں اور ہونٹ بھی کھلے رکھیں اور پیچھے سے زور لگا کے آواز نکالیں تو جس طرح سے بھینس یا بیل ہاہا کرتا ہے بس یہی کیفیت ہوگی کوئی حرف سامنے نہیں آئے گا، اس لئے یہ حروف آپ کے اندر سے نہیں آرہے، اندر سے صرف ایک ہوا آتی ہے اور وہ منہ کے ساتھ ٹکرا کے ایک آواز پیدا ہوتی ہے، اور زبان کے مختلف انداز میں حرکت کرنے کے ساتھ یہ حروف بنتے ہیں، اور ان حروف کے بنانے میں ساتھ یہ ہونٹ بھی شریک ہیں، تو ہونٹ حرکت کرتے ہیں زبان حرکت کرتی ہے تو حروف بنتے ہیں، تو کیسی اللہ کی قدرت اس میں نمایاں ہے۔ پھر کیسے لچک دار ان کو بنایا، ان میں کسی قسم کی سختی نہیں، کھانے پینے کے اندر یہ آپ کے معاون ہیں، چیز کے چوسنے کے اندر یہ آپ کے معاون ہیں، اگر یہ ہونٹ نہ ہوتے تو آپ پانی پینے لگتے تو آدھا اندر کو جایا کرتا اور آدھا باہر کو آیا کرتا۔ اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے کیا لطف رکھا ہے، محبت کے ساتھ آپ بعض چیزوں کو بوسہ دیتے ہیں چومتے ہیں، تو اس کے اندر کتنا لطف اور کتنی لذت اللہ نے رکھی ہے۔ یہ چمڑے کی بنی ہوئی، ماس کی بنی ہوئی چیز، اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا کیا قدرت نمایاں ہے، اور انسان کی زندگی کے اندر یہ ہونٹ کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں، اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے، اور قدرت کے نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا اِس میں احسان کا پہلو بھی ہے۔ ’’تو کیا ہم نے اس کے لئے زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے؟‘‘

اِنسان پر ظاہری اِنعامات کے ساتھ باطنی اِنعامات

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ: اور ہم نے اس کی راہنمائی کی دوراستوں کی طرف، نجد کہتے ہیں پہاڑی وسیع راستے کو، کھلا راستہ جو اُوپر کی طرف چڑھتا ہوا چلا جاتا ہے، واضح راستہ مراد ہے، ’’ہم نے اس کو دوراستوں کی راہنمائی کی‘‘ دوراستوں کی راہنمائی سے مراد یہ ہے کہ جس طرح سے ظاہری انعام اللہ نے انسان کے اُوپر کیا ہے، یہ زبان، یہ ہونٹ، یہ آنکھیں، تو اسی طرح سے باطنی اِنعام اللہ نے کیا کہ باطنی بصیرت رکھی، جس بصیرت کے ساتھ اس کے سامنے خیر اور شر دونوں راستے واضح ہیں، اگر اس کے اندر صرف بُرائی کا ہی اِدراک ہوتا تو پھر کوئی طاقت اس کو نیکی کی طرف نہ لے جاسکتی، اور اگر اِس میں صرف نیکی کا ہی اِدراک ہوتا فرشتوں کی طرح تو اس کے لئے یہ کوئی کامیابی کی صورت نہ ہوتی، نہ مشقت ہوتی نہ کوئی اِنعام ملتا، امتحان کی صورت پیدا نہ ہوتی، یہ اللہ نے کمال کیا ہے کہ انسان کے اندر دونوں صلاحیتیں رکھیں، کہ اس کے لئے خیر کا راستہ بھی واضح کردیا، شر کا راستہ بھی واضح کردیا، اب اگر یہ باطنی آنکھیں کھولے اور باطنی آنکھیں کھول کے خیر کو خیر سمجھے اور شر کو شر سمجھے، خیر کو اختیار کرے، شر سے بچے، تو اس کی کامیابی ہے، اور اگر یہ باطنی آنکھیں بند کرلے، خیر وشر کی تمیز چھوڑ دے، تو اسی طرح سے ٹھوکریں کھاتا ہوا ہلاکت کے کسی گڑھے میں جا گرے گا۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے باہر کی دو آنکھیں آپ کو دی ہیں، آپ ان کو کھول کے چلیں تو آپ خطرات کو محسوس کرتے چلے جائیں گے، ٹھوکروں سے بچتے چلے جائیں گے، کھائی کھڈ سے بچتے ہوئے، گڑھوں سے بچتے ہوئے چلیں گے، کہیں گریں گے نہیں، ٹھوکر نہیں کھائیں گے، نقصان نہیں اُٹھائیں گے، اور اگر آپ ان دونوں آنکھوں کو بند کرکے چلیں گے، تو کہیں نہ کہیں گڑھے میں گریں گے، ٹھوکر کھائیں گے، نقصان اُٹھائیں گے۔ تو باطنی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے جو رکھی ہے یعنی بصیرت، وہ

ایسے ہی ہے جیسے ظاہر میں دو آنکھیں رکھی ہیں۔ تو باطن میں اللہ نے یہ بصیرت رکھ دی جس کے ساتھ اس کے سامنے دونوں راستے واضح ہیں۔ اب انسان کو چاہیے کہ ظاہری آنکھوں سے بھی کام لے اور باطنی آنکھوں سے بھی کام لے هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ، یہی ہے اس کا صحیح مفہوم، کہ ظاہری اِنعام کے ساتھ یہ باطنی اِنعام ذکر کر دیا...... اور بعض حضرات نے اس کو بھی ظاہری اِنعام کے ساتھ ہی لگایا ہے، هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ اس سے اشارہ اس بات کی طرف نکالا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کے بعد اس کو دو راستوں کی راہنمائی کی، یعنی اس کی غذا کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو نہریں جاری کر دیں اس کی ماں کے سینے میں، اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی اس کو راہنمائی کر دی کہ اس طرح سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ انسان کو پیدا کرتا ہے، پیدا کرنے کے بعد ابھی انسان کے اندر کمانے کھانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی، یہ اپنی محنت کے ساتھ کما کر کھا نہیں سکتا، تو اُس پیدا کرنے والے نے اس کا رزق پہلے ہی مقدر کر دیا کہ اس کے لئے دُودھ کی نہریں جاری کر دیں، تو جو ماں کے پیٹ میں تمہیں پالتا رہا، غذا دیتا رہا، ماں کے بطن سے نکالنے کے بعد بغیر تمہاری کوشش کے، بغیر تمہاری محنت، مشقت کے تمہارے لیے دُودھ کی نہریں جاری کر دیں، جس طرح سے تم بڑے ہوتے جا رہے ویسے تمہاری صلاحیتیں بڑھا کر تمہارے لیے رِزق کی فراوانی کرتا چلا جا رہا ہے، تو تم اس محسن کی کیوں مخالفت کرتے ہو اور اس کی ناشکری کیوں کرتے ہو؟ اس کی قدرت اور اِحسان کو پہچانتے ہوئے اس پر اِیمان کیوں نہیں لاتے؟ اس طرح سے انسان کے لئے اِن آیات کے اندر یہ پہلو ہے جس سے اللہ کی قدرت بھی سمجھ میں آتی ہے اور اس کا احسان سامنے آنے کے ساتھ اطاعت کی ترغیب بھی ہوتی ہے۔

اَحکامِ شریعت کو گھاٹی کے ساتھ تعبیر کیوں کیا؟

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ: یہ آگے شکوہ ہے اللہ کی طرف سے انسان کا جو اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی رعایت نہیں رکھتا۔ اقْتَحَمَ: اِقْتِحام: کسی چیز میں گھس جانا، مشقت کے ساتھ کسی چیز کو طے کرنا، الدُّخُولُ بِسُرعَةٍ اقتحام کا معنی ہوتا ہے۔ اور عقبة کہتے ہیں گھاٹی کو، عقبہ سے یہاں مراد ہیں اَحکامِ شریعت، اللہ تعالیٰ کے اَحکام، ''پس یہ شخص نہ گزرا گھاٹی سے'' گھاٹی کو عبور کرنے کی اِس نے مشقت نہیں اُٹھائی، گھاٹی سے مراد اَحکامِ شریعت، اُن کو گھاٹی کے ساتھ تعبیر اس لئے کیا کہ انسان کی طبیعت اور فطرت کے تحت اَحکامِ شریعت اکثر و بیشتر اس کی خواہشِ نفس کے خلاف ہیں، تو ان اَحکام کا پورا کرنا اسی طرح سے ہے جس طرح سے ظاہری طور پر کسی شخص کو کوئی چڑھائی چڑھنی پڑ جائے، اور گناہ وغیرہ کرنا چونکہ انسان کے نفس کا اپنا میلان ہے تو اگر ادھر انسان جانا چاہے تو اس طرح سے جاتا ہے جیسے بلندی سے لڑھکتا ہوا آئے، آپ جانتے ہیں کہ بلندی سے اپنے آپ کو یوں گرا دیا جائے تو لڑھکتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ اِنسان نیچے کو آتا ہے، تو میلانِ نفس کے تحت انسان کا گناہوں کی طرف جانا تو ایسے ہے جیسے بلندی سے پستی کی طرف آ رہا ہو، اور نیکی کرنا اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کا ماننا خواہشاتِ نفس کے خلاف ہونے کی بنا پر ایسے ہے جس طرح سے انسان کسی گھاٹی کو عبور کر رہا ہو۔ ایک دِن آپ کی خدمت میں میں نے وہ روایت پیش کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت جنت کو پیدا کیا تو جبریل علیہ السلام کو کہا کہ جاؤ، جا کے جنت کی سیر کرو اور دیکھو وہ کیسی ہے؟ جبریل علیہ السلام گئے، جا کے جنت کو دیکھا، اور ان نعمتوں کو

دیکھا جو جنّت میں اللہ نے تیار کی تھیں، تو آ کے کہتے ہیں کہ یا اللہ! وہ تو ایسی چیز ہے کہ جو سنے گا اس میں جانے کی کوشش کرے گا، سارے اِدھر بھاگ جائیں گے، کوئی بھی باہر نہیں رہے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے اردگرد مکارہ کی باڑ کر دی، مکارِہ: نفس کی ناگواریاں، اور پھر اسے کہا کہ اب دیکھ کے آؤ، تو جب جبریل علیہ السلام نے جا کے دیکھا تو کہنے لگے کہ اب تو یہ ڈر ہے کہ کوئی بھی نہیں آ سکے گا اِدھر، کون اتنی مشقتیں برداشت کرے گا، کون طبیعت کی ناگواریاں برداشت کرتا ہوا اس کو عبور کر کے جنّت کی طرف آئے گا۔ اور جب جہنّم کو پیدا کیا تو جہنّم کو دیکھ کر جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ تو ایسی ڈراؤنی اور ایسی ہولناک چیز ہے کہ جو بھی سنے گا اس سے بچنے کی کوشش کرے گا، اِدھر تو کوئی بھی نہیں آئے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے اردگرد باڑ کر دی شہوات کی، دل چاہی چیزوں کی، کہ جو لوگ اپنی شہوات پہ چلیں گے، اپنی دل چاہی چیزوں میں پڑیں گے، اپنی شہوتوں کی اتباع کریں گے تو وہ جہنّم کا سفر طے کرتے ہوئے جا رہے ہیں، تو جبریل علیہ السلام نے دیکھ کر کہا تھا کہ یا اللہ! اب تو اندیشہ ہے کہ کوئی انسان بھی نہیں بچے گا، سارے اِدھر ہی آئیں گے۔[1] تو اصل بات یہی ہے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے انسان کے نفس کا میلان چونکہ معاصی کی طرف ہے تو معصیت بظاہر اس کے لئے آسان ہے، کیونکہ یہ ہے بلندی سے پستی کی طرف لڑھکنے والی بات، اور نیکیاں چونکہ اس کی خواہشاتِ نفس کے خلاف ہیں، ان کے کرنے میں دُشواری ہے، یہ ایسے ہے جیسے کہ گھاٹی پر چڑھے۔ تو یہاں مقصود ہے مشقّت اُٹھانا، گھاٹی پر چڑھنا، گھاٹی پر چڑھو گے تو بلندی کی طرف جاؤ گے، اللہ تعالیٰ پھر آپ کو درجاتِ عالیہ دے دیں گے، اور اگر نفس کے پیچھے لگ کے معاصی کی طرف جاؤ گے تو ایسے ہے جیسے بلندی سے نیچے کو گر جاؤ گے، آخر ہلاکت کے گڑھے میں جا گرو گے۔ ''پس نہ عبور کیا اس نے گھاٹی کو۔''

گھاٹی عبور کرنے کے لئے کون سے کام ہیں؟ اور ایسے لوگوں کا اَنجام کیا ہے؟

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ: آپ کو کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ جس کے عبور کرنے کے لئے انسان کو کہا جا رہا ہے، جس کے عبور نہ کرنے پر انسان کی شکایت کی جا رہی ہے، فَكُّ رَقَبَةٍ: وہ گھاٹی ہے گردن کا چھڑانا، رَقبہ کہتے ہیں گردن کو، فك کا معنی چھڑانا، یعنی غلاموں کو آزاد کرانا، یہ ہے وہ گھاٹی جس کو عبور کرنا چاہیے انسان کو، یہ نیکی کے کام ہیں، اور گردن کے چھڑانے میں جس طرح سے غلام کی آزادی آتی ہے اسی طرح سے قرض خواہ کے قرض کی ادائیگی بھی آتی ہے، کیونکہ جب گردن پہ قرض چڑھا ہوا ہوتا ہے تو وہ بھی ایسے ہے جیسے گردن سے پکڑا ہوا انسان، اور اس کا قرض ادا کر دیا جائے یا اس کا قرض معاف کر دیا جائے یہ بھی فَكُّ رَقَبَةٍ میں داخل ہے، ''گردان کا چھڑانا'' اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ: یا کھانا کھلانا بھوک والے دن میں، مسغبہ بھوک کو کہتے ہیں، ذی مسغبۃ: بھوک والا دن، یعنی کوئی مالی تنگی آ گئی، عام طور پر لوگ بھوک میں مبتلا ہیں، ایسے وقت میں کھانا کھلانا یہ بھی وہ گھاٹی ہے جو انسان کو عبور کرنی چاہیے، ''بھوک والے دن میں کھانا کھلانا'' يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ: کسی یتیم کو جو کہ رشتہ دار ہے، جو قرابت والا ہے،

---

(۱) ترمذی ۲/ ۸۳، باب ما جاء حفت الجنة بالمكارہ الخ/ ابوداؤد ۲/ ۲۹۶، كتاب السنة، باب فی خلق الجنة والنار/ مشكوٰة ۲/ ۵۰۵، باب خلق الجنة والنار فصل ثانی۔

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ: یا کسی مسکین کو جو کہ مٹی والا ہے، متربۃ: مٹی آلود ہونا۔ "کسی یتیم کو جو کہ قرابت والا ہے" قرابت والے یتیم کو، اپنے رشتے داروں میں سے کوئی یتیم ہے اس کو کھانا کھلانا بھوک والے دن میں، یا خاک نشین خاک آلود مسکین کو جو اپنی مسکنت کی وجہ سے مٹی میں ملا ہوا ہے، ایسے شخص کو کھانا کھلانا بھوک کے دنوں میں یہ وہ گھاٹی ہے جو انسان کو عبور کرنی چاہیے، جو غلط کاموں میں مال خرچ کر کے فخر کرتے ہیں یہ تو وہی شہوات کی اتباع میں نیچے کو لڑھکتے چلے جا رہے ہیں اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا میں جس طرح سے اشارہ آیا تھا، کہ اللہ نے مال دیا، اُس کو فخر کے طور پر خرچ کرتے ہیں بیاہوں پر، شادیوں پر، مقابلے بازی میں، جوابازی میں، دعوتوں میں، شان و شوکت نمایاں کرنے کے لئے، وہ بات فخر کی نہیں، ایسا کرنا غافل لوگوں کا کام ہے، کرنے کے یہ کام ہیں کہ اس مال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لوگوں کی گردنیں چھڑاؤ، غلاموں کو آزاد کرواؤ، مقروضوں کے قرض ادا کرو، اور یتیموں کو خاص طور پر وہ یتیم جو اپنے رشتہ داروں میں ہیں یا مسکین لوگ جو بالکل اپنی مسکنت کی بنا پر خاک میں مل گئے، ان لوگوں کو بھوک کے دنوں میں کھانا کھلاؤ، یہ ہیں کرنے کے کام، جو ان کو عبور کرے گا وہ گویا کہ گھاٹی عبور کرتا ہوا بلندی کی طرف جا رہا ہے۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ یہ آگے ترقی ہے، پھر ہو ان لوگوں میں سے جو ایمان لاتے ہیں اور ایک دوسرے کو وصیت کرتے ہیں صبر کی اور ایک دوسرے کو وصیت کرتے ہیں رحم کرنے کی، یعنی فَكُّ رَقَبَةٍ بھی ہونا چاہیے، اِطعام کھانا کھلانا بھی ہونا چاہیے، یتیموں اور مسکینوں کے اُوپر شفقت بھی ہو، اور پھر ساتھ ساتھ ایمان بھی ہو، اور ایمان لانے کے بعد پھر ایک دوسرے کو تلقین بھی ہو صبر کی اور رحم کی، صبر کا مفہوم عام ہو گیا کہ ایک دُوسرے کو دین کے لئے مشقت برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرو، صبر کا مفہوم عام ہے، مصیبتیں سہنا، نیکیاں کرنے کے لئے جو مشقت ہے اس کو برداشت کرنا، بُرائیاں چھوڑنے کے لئے جو تکلیف ہے اس کو سہنا، یہ سب صبر میں داخل ہے، اور ایک دوسرے کو نصیحت کریں رحم کرنے کی، ظلم سے روکیں، مخلوق کی طرف یہ توجہ دلائیں، ایک دوسرے کے اُوپر رحم کریں، شفقت کریں، یہ کام ہیں جو انسان کے کرنے کے ہیں۔ ثُمَّ كَانَ: پھر ہو وہ شخص ان لوگوں میں سے، لفظی ترجمہ یوں بنتا ہے، تو اصل میں اس کا عطف ہو جائے گا فَكُّ رَقَبَةٍ پر مصدر کی تاویل میں ہو کر، گویا کہ گردن کا چھڑانا، کھانا کھلانا، ایمان لانا، اور صبر اور مرحمہ کی آپس میں وصیت کرنا یہ ہے عقبہ جس کو عبور کرنا چاہیے، جس کے عبور نہ کرنے کی بنا پر اللہ تعالیٰ انسان کی شکایت کرتے ہیں۔ ایمان لاؤ، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، ایک دوسرے کو رحم کرنے کا سبق پڑھاؤ، اور پھر اسی طرح سے گردنیں چھڑاؤ، مسکینوں یتیموں کو کھانا کھلاؤ، اُن کے اوپر رحم کرو، انسان ایسا نہیں کرتا، اس کی شکایت ہے، باوجود اس بات کے کہ اللہ نے مالی وسعت دی ہے تو اس مال کو فخر و ریا کے طور پر تو خرچ کرتے ہیں، ان اچھے کاموں میں خرچ نہیں کرتے۔ تو جو ایسا کریں گے، گردن چھڑائیں گے، کھانا کھلائیں گے، پھر ایمان لانے والوں میں سے ہوں گے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ: یہ ہیں دائیں طرف والے، یہ وہی دو گروہوں کی نشاندہی ہو گئی، میمنہ: دائیں طرف، اصحاب المیمنہ: دائیں طرف والے، اصحاب الیمین اصحاب الشمال یہ دو گروہ سورۂ واقعہ میں ذکر کیے گئے تھے اور بعد والی تمام سورتوں کے اندر انہی دو گروہوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔

منکرین کا انجام

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا: اور جو ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، ایمان نہیں لاتے، جب ایمان نہیں تو کوئی خیر خیر ہی نہیں، کفر جس وقت آگیا تو اللہ کے ہاں کسی نیکی کی کوئی قدر ہی نہیں، ''جو ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں'' هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ: وہ بائیں طرف والے ہیں، بائیں طرف والے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا نامہ اعمال ان کو بائیں طرف ملے گا، عرش الٰہی کے بائیں جانب کھڑے ہوں گے، حتیٰ کہ بائیں جانب سے ان کو جہنم میں پہنچا دیا جائے گا، ''یہ بائیں طرف والے ہیں'' عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ: ان کے اُوپر آگ ہوگی بند کی ہوئی، مُّؤْصَدَةٌ، اصدَ الباب: دروازہ بند کرنا، مُؤصدة: بند کی ہوئی، بند کی ہوئی کا مطلب یہ ہوتا ہے، یہ آپ نے دیکھا ہوگا تنور کے اندر آگ جلا کے اگر اس کا منہ کھلا چھوڑ دیا جائے تو اس میں تیزی نہیں آتی، یہی وجہ ہے کہ جب تنور کو زیادہ تپانا اور گرم کرنا ہوتا ہے تو اُوپر سے اس کا منہ بند کر دیتے ہیں، اور حرارت ساری کی ساری اندر رہ جاتی ہے، جب وہ حرارت ساری کی ساری اندر رہ جاتی ہے تو تیزی آجاتی ہے، تو نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ کا یہ معنی ہوگا کہ وہ نار، وہ آگ ان کے اُوپر بند کی ہوئی ہوگی، اس کی حرارت باہر نکل کے پھیلے گی نہیں، بلکہ ساری کی ساری اندر ہی ہوگی، جس میں انتہائی درجے کی تیزی ہوگی۔ یہ دونوں گروہوں کا آخری انجام آگیا۔

اٰیاتها ۱۵ ۹۱ سُوْرَۃُ الشَّمْسِ مَکِّیَّۃٌ ۲۶ رکوعها ۱
سورۂ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۵ آیتیں ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے
وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝۳
قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی! ۝ اور چاند کی جس وقت وہ اُس سورج کے پیچھے آئے! ۝ اور قسم دن کی جس وقت وہ دن اس سورج کو روشن کر دے! ۝
وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝۶
اور رات کی جس وقت کہ رات اُس سورج کو ڈھانپ لے! ۝ اور قسم آسمان کی اور اس کی جس نے اس کو بنایا! ۝ اور قسم زمین کی اور اس کی جس نے اس کو بچھایا! ۝
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ
اور قسم نفس کی اور اس کی جس نے اس کو دُرست کیا! ۝ پھر الہام کیا اس نفس کو اس کے فجور کا اور اس کے تقویٰ کا ۝ کامیاب ہو گیا وہ شخص

زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝

جس نے اپنے نفس کو صاف ستھرا کرلیا ۝ اور نامراد ہوگیا وہ شخص جس نے اس نفس کو مٹی میں ملا دیا ۝ جھٹلایا ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب سے ۝

اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ

جبکہ اُٹھا ان میں سے ایک بہت بدبخت ۝ کہا ان کو اللہ کے رسول نے کہ خیال کرو تم اللہ کی اُونٹنی کا اور اس کے پانی پینے کا ۝ قوم نے اس رسول کی تکذیب کی

فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝

پھر انہوں نے اُس اونٹنی کی کھونچیں کاٹ دیں، پس ہلاکت ڈال دی ان کے اُوپر ان کے رَبّ نے ان کے گناہ کی وجہ سے، پھر اس دَمدمہ (ہلاکت) کو اللہ نے سب کے لئے برابر کردیا ۝ اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا ۝

تفسیر

مختلف متضاد چیزوں کی قسمیں اوران کا مقصد

سورۂ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۵ آیتیں ہیں۔ مضمون اس میں بھی وہی ہے، انداز دُوسرا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا: قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اِضْحیٰ روشنی کو کہتے ہیں، وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا: اور چاند کی جس وقت وہ چانداس سورج کے پیچھے آئے تَلَا يَتْلُوْ پیچھے آنے کے معنی میں، ''جس وقت وہ چاند اُس کے پیچھے آئے'' کیونکہ چانداسی وقت ہی نمایاں ہوا کرتا ہے جب سورج غروب ہوجاتا ہے، وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا: اور قسم دِن کی جس وقت وہ دِن اُس سورج کو روشن کردے، یہ اِسنادِ مجازی ہے وقت کے لحاظ سے، کیونکہ سورج نمایاں ہوتا ہے دِن میں، وقت کے لحاظ سے نسبت اُس کی طرف کردی، ''اور دِن کی جس وقت وہ سورج کو روشن کردے'' وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا: اور رات کی جس وقت کہ رات اُس سورج کو ڈھانپ لے، کیونکہ رات کے وقت میں سورج چھپ جاتا ہے، وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا: اور آسمان کی، وَمَا بَنٰىهَا: مَا کے بارے میں یہاں مفسرین کے دوقول ہیں، مَا مصدریہ ہے یا مَا موصولہ، اگر مَا مصدریہ ہوتو پھر معنی یہ ہوگا قسم ہے آسمان کی اور اُس کے بنانے کی، یعنی اللہ تعالیٰ اس کے بنانے کو، یہ جو بنا ہوا آسمان ہے اس کو شہادت میں پیش کرتے ہیں، اور اگر مَا موصولہ ہوگا تو ''قسم آسمان کی اور اُس کی جس نے اس کو بنایا'' یعنی اللہ کی ذات کی، وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا: اور قسم زمین کی اور اس کو بچھانے کی، یہ مَا مصدریہ کا ترجمہ ہے، اور اس کی جس نے اس کو بچھایا، یہ مَا موصولہ کے ساتھ ترجمہ ہے، وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا: اور قسم نفس کی اور اس کو دُرست کرنے کی، یا، اس کی جس نے اس کو دُرست کیا۔ سَوّٰى تَسْوِيَةً، تسویہ کا ذکر بھی اسی پارے میں آپ کے سامنے آیا اَلَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ (سورۂ انفطار)، تسویہ: برابر کرنا، اس کی نوک پلک سنوارنا، اس کے مزاج میں اعتدال کا پیدا کرنا، وہ سب اس میں داخل ہے۔ ''نفس کی اور اس کے تسویہ کی، اس کے برابر کرنے کی، اس میں اعتدال پیدا کرنے کی، اس کو سنوارنے کی، یا، اُس نے جس نے اس کو سنوارا'' فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا: پھر

الہام کیا اس نفس کو اُس کے فجور کا اور اس کے تقویٰ کا، فجور و تقویٰ دونوں کا الہام کر دیا، اَلْھَمَ دِل میں بات ڈالنے کو کہتے ہیں، نفس کو پیدا کیا، ظاہری طور پر بھی اس کو دُرست کیا، اس کے نوک پلک سنوارے، اور باطنی استعداد بھی اس کی کامل کی کہ اس کو تقویٰ اور فجور دونوں کی سمجھ دے دی، جیسے پچھلی سورت میں ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ کے اندر ذِکر کیا، تو اُس اللہ تعالیٰ نے اِس دِل کے اندر اِلہام تقویٰ کا بھی کیا ہے، فجور کا بھی کیا ہے، گویا کہ فطری طور پر اِنسان خیر اور شر کو سمجھتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ فسق و فجور ہے اور یہ اچھی بات ہے، فطری صلاحیت کے طور پر بھی انسان امتیاز کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے ذریعے سے اور اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھی اس کی زیادہ وضاحت فرما دیتے ہیں کہ یہ فسق و فجور ہے اور یہ تقویٰ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر صلاحیتیں دونوں رکھی ہیں، دِل کے اندر باتیں دونوں ڈال دی ہیں، فطرت کے طور پر بھی فجور اور تقویٰ انسان کے سامنے نمایاں ہے، اس میں صلاحیت ہے خیر اور شر کو پہچاننے کی، اللہ اپنی کتاب اور رسولوں کے ذریعے سے اسی کی وضاحت فرما دیتے ہیں۔ یہ وَمَاسَوّٰھَا کا ایک پہلو ذِکر کر دیا گیا کہ تسویہ میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ نے باطنی طور پر اِس کی صلاحیت کامل کی، کہ اِس کے اندر فجور اور تقویٰ دونوں کا اِلہام کیا۔

ان قسموں کے اندر کیا بات واضح کی گئی؟ یہاں دیکھو! متضاد چیزوں کا ذِکر ہے، چاند اور اس کے ساتھ سورج آ گیا، چاند اور سورج دونوں آپس میں مختلف ہیں، دونوں کے اوقات مختلف ہیں، دونوں کے حالات مختلف ہیں، دونوں کے آثار مختلف ہیں، سورج جب آتا ہے تو کتنی تیز روشنی اور کتنی گرمی لے کر آتا ہے، تو اس وقت کے آثار اور ہیں، اور چاند جب آتا ہے تو اس کی چمک کیسی ہوتی ہے، اس کے آثار کس قسم کے ہوتے ہیں، دُنیا پر بھی مختلف واقع ہوتے ہیں سورج کے ساتھ فصلیں پکتی ہیں پھر چاند کے ساتھ ان میں ذائقے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی رنگتیں بنتی ہیں، جو بھی آثار ہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں رکھی ہیں۔ دِن اور اس کے مقابلے میں رات کا ذِکر آ گیا۔ اور آسمان اور اس کے بنانے کا ذِکر آیا تو زمین اور اس کے بچھانے کا ذِکر آ گیا، یہ بھی آپس میں متقابل ہیں۔ یہ متضاد چیزیں اور متقابل چیزیں اللہ نے ذِکر کیں، اِن سب کے آثار مختلف ہیں، اِن سب کے حالات مختلف ہیں۔ اسی طرح سے انسان کو جو اللہ نے بنایا ہے تو اس میں بھی فجور اور تقویٰ دو متضاد چیزوں کا الہام کیا ہے، تو جیسے ان متضاد چیزوں پر اللہ کا کنٹرول ہے اور وہ اپنے آثار نمایاں کرتی ہیں اسی طرح سے فجور اور تقویٰ یہ بھی اپنے آثار نمایاں کریں گے، یہ دو متضاد چیزیں اللہ نے انسان کے اندر پیدا کر دیں، جس طرح سے ساری کائنات ہی متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے، اور ان کا نظم اللہ نے قائم فرمایا، اور ان کے مختلف آثار ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح سے انسان کے اندر بھی دو متضاد چیزوں کا الہام اللہ نے کیا ہے، فسق و فجور کا اِلہام بھی کیا ہے، تقویٰ طہارت کا الہام بھی کیا ہے، تو اس کے آثار بھی مختلف ہیں، جب آثار مختلف ہیں تو آخر جس وقت نتیجہ سامنے آئے گا تو نتیجے مختلف ہوں گے، اگر کوئی شخص فجور کو پہچانتا ہوا اس کو اِختیار کرتا ہے تو یہ ہلاکت کی طرف گیا، تقوے کو پہچانتا ہوا اِختیار کرتا ہے تو کامیابی کی طرف گیا، تو متضاد چیزیں پیدا کرنے کے بعد اللہ نے ان کے نتائج بھی مختلف رکھے ہیں، تو اِنسان بھی فسق و فجور اور تقویٰ اِن دونوں راہوں کی سمجھ رکھتا ہے، اور ان دونوں راہوں میں سے جس راہ کو اختیار کرے گا ویسا نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا، جیسے کہ آگے ذِکر کر دیا گیا۔

کامیاب کون اور ناکام کون؟

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا: کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو صاف ستھرا کرلیا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا: اور نامراد ہوگیا وہ شخص جس نے اس کو مٹی میں ملادیا۔ دَسّٰی یہ اصل میں دَسَّسَ ہے، دوسرے سین کو الف کے ساتھ بدلا ہوا ہے، دَسٌّ یَدُسُّ: زمین میں دبادینا، چھپادینا، یہ لفظ سورۂ نحل کے اندر آیا تھا اَیُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ (آیت:۵۹)، اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ: یا اس کو زمین میں دھنسا دے، وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِیْمٌ ﴿۵۸﴾ یَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَیُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ: جب ان میں سے کسی کو خبر دی جاتی ہے لڑکی کے پیدا ہونے کی، تو سارا دن اس کا منہ سیاہ رہتا ہے اور وہ گھٹنے والا ہوتا ہے، قوم سے چھپتا پھرتا ہے، اس چیز کی عار سے جس کی اس کو خبر دے دی گئی، دل میں سوچتا ہے کہ کیا اس کو ذلت پر روکے رکھے یا اس کو مٹی میں دھنسا دے؟ تو دَسٌّ زمین میں دفن کرنے اور دھنسانے کے معنی میں آتا ہے، تو وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا: جس نے نفس کو مٹی میں دھنسا دیا یعنی ذلت میں ڈال دیا وہ نامراد ہوگیا، اور اپنے آپ کو گناہوں میں مبتلا کرنا فجور کی طرف لے جانا یہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو مٹی میں دھنسا دے، اور جو اس کو صاف ستھرا رکھے وہ کامیابی کی طرف چلا گیا۔ تو بعض حضرات نے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا کو جوابِ قسم بنایا ہے، کہ یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جس کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ ان دو مختلف چیزوں کے دو مختلف آثار ہوں گے، جو اپنے نفس کو صاف ستھرا رکھے تقویٰ کی طرف لے جائے وہ تو کامیاب ہوگیا، اور جس شخص نے تقوے کی راہ چھوڑی فجور کا راستہ اختیار کرلیا تو یہ سب چیزیں اس بات کے اُوپر گواہ ہیں کہ اس کا نتیجہ ایسا نکلے گا کہ اس نے اپنے آپ کو ذلیل کرلیا" نامراد ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو دھنسا دیا، مٹی میں دبادیا" جوابِ قسم کے طور پر یہ بات کہی جارہی ہے...... اور ایک رائے مفسرین ﷭ کی یہ بھی ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا یہ پچھلے مضمون کے ساتھ ہی لگتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے فجور اور تقویٰ کا الہام کیا، اور اس کے نتیجے میں جس نے اِس نفس کو صاف ستھرا کرلیا کامیاب ہوگیا اور جس نے اس کو مٹی میں دھنسا دیا نامراد ہوگیا، یہ جوابِ قسم نہیں، جوابِ قسم یہاں محذوف ہے اور وہ اگلی آیات سے سمجھ میں آتا ہے، کہ یہ سب چیزیں اس بات پہ گواہ ہیں اور انسان کی مختلف کیفیات بھی اس بات کے اوپر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ سرکشی کی سزا ضرور دیتا ہے اور سرکش بندوں کو اللہ برداشت نہیں کرتا، جو بھی سرکشی اختیار کرے گا اللہ اسے برباد کردے گا، جس طرح سے اگلا مضمون اس کے اُوپر شہادت ہے۔

قومِ ثمود کی سرکشی اور اس کا انجام

اگلا مضمون ذکر کیا جارہا ہے كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا، گویا کہ نامراد رہنے والوں کی ایک مثال دی جارہی ہے، "جھٹلایا ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب سے" طَغْوٰی طغیان کے معنی میں ہے، اپنی سرکشی کے سبب سے جھٹلایا، کس کو جھٹلایا؟ یہ واقعہ آپ کے سامنے مفصل آچکا، ثمود کی طرف پیغمبر آئے تھے صالح علیہ السلام، تو صالح علیہ السلام کو جھٹلایا، ان کے لائے ہوئے دین کو جھٹلایا، اور جھٹلایا کسی

دلیل کی بناپر نہیں، محض سرکشی کی بنا پر، کہ تواضع نہیں اختیار کی، جھکے نہیں، بلکہ سرکش ہو گئے، ''جھٹلایا ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر'' اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰىهَا: جب کہ اُن میں سے ایک بد بخت انسان اُٹھا تھا، اِنْبَعَثَ: اُٹھنا، اُٹھا اُن میں سے ایک بد بخت انسان، اس بد بخت کا مصداق وہ شخص ہے جس نے کہ اُونٹنی کو قتل کیا تھا، کوچیں کاٹی تھیں، اشقٰی: بہت بد بخت، وہ چونکہ ساری قوم کا نمائندہ تھا اور نمائندہ ہونے کے طور پر اس نے اُونٹنی کو ہلاک کیا تھا تو ساری قوم کے لئے بربادی کا باعث بن گیا، ''جبکہ اُٹھا اُن میں سے ایک بہت بدبخت'' فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا: کہا ان کو اللہ کے رسول نے کہ خیال کرو تم اللہ کی اُونٹنی کا اور اس کے پانی پینے کا، سُقیٰ: سیرابی، سَقٰی یَسْقِی: پانی پلانا۔ آپ کے سامنے مفصل واقعہ آچکا کہ ثمود نے جب صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا تھا تو معجزے کے طور پر ایک اُونٹنی ان کے سامنے نمایاں کردی گئی تھی، اور یہ کہہ دیا گیا تھا کہ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ: اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (سورۂ اعراف: ۷۳) ورنہ تمہیں کوئی دردناک عذاب پکڑ لے گا، یہی رسول کی طرف سے یاددہانی کرائی جارہی ہے، جب رسول کو پتا چلا کہ یہ لوگ اُونٹنی کے درپے ہوں گے اور اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں، فرمایا اس کا خیال کرو، اس سے بچو، اس کو چھیڑنا نہ، نہ اس کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ اس کے پانی پینے کے راستے میں رُکاوٹ ڈالو، کیونکہ وہ پانی تقسیم کردیا گیا تھا کہ ایک دِن وہ اُونٹنی پیتی تھی اور دُوسرے دِن ان کے جانور پیتے تھے، اور قوم اس بات کو برداشت نہیں کررہی تھی کہ ایک اُونٹنی اس طرح سے آزاد پھرے، اور اس طرح سے پانی میں سے حصہ لے، تو انہوں نے ارادہ کرلیا کہ اب اس کو ہلاک ہی کردیا جائے، تو ایسے وقت میں اللہ کے رسول نے تنبیہ کی کہ یہ اللہ کا ایک نشان ہے، اگر اس کے اُوپر تم نے ہاتھ بڑھایا تو برباد ہو جاؤ گے۔ واقعہ مفصلاً آپ کے سامنے مختلف سورتوں میں گزر چکا ہے، نَاقَةَ اللّٰهِ یہ منصوب فعل محذوف کی وجہ سے، ''خیال کرو تم اُونٹنی کا، بچو تم اس اُونٹنی سے اور اس کی سیرابی سے، اس کے پانی پینے سے'' یعنی اس کے پانی پینے میں بھی رُکاوٹ نہ ڈالو اور اس اُونٹنی کو بھی کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ فَكَذَّبُوْهُ: قوم نے اس صالح علیہ السلام کو جھوٹا بتلایا، تکذیب کی، کہ تم غلط کہتے ہو کہ اس اُونٹنی کو چھیڑنے کی بنا پر اللہ کا عذاب آجائے گا فَعَقَرُوْهَا: پھر انہوں نے اس اُونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں، اس کے اُوپر دست درازی کرلی، فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا: دَمْدَمَ، دَمَّ مجرد ہے، اور دَمْدَمَ بَعْثَرَ کی طرح ہے، دَمَّ طَحَنَ کے معنی میں آتا ہے کسی کو پیس ڈالنا، ''ہلاکت ڈال دی ان کے اُوپر ان کے ربّ نے ان کے گناہ کی وجہ سے'' مسلسل عذاب ڈال دیا، ایسا ڈال دیا کہ جس میں ان کا نام ونشان مٹادیا، پیس کے رکھ دیا، ''ہلاکت ڈال دی ان کے اُوپر ان کے ربّ نے اُن کے گناہ کے سبب سے'' فَسَوّٰىهَا: پھر اس دمدمۃ کو اللہ نے سب کے لئے برابر کردیا، ساری کی ساری قوم اُس لپیٹ میں آگئی، صرف اس اُونٹنی کے قتل کرنے والے پر نہیں آیا، بلکہ اس عذاب کو ان سب کے لئے برابر کردیا۔

اللہ تعالیٰ کو کسی کا کوئی ڈر نہیں!

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا: یہ اللہ تعالیٰ کا استغناء ہے، دُنیا میں کوئی حاکم ہو، کتنا ہی جابر ہو، کتنا ہی ذِی اقتدار ہو، وہ جب بھی کسی

قوم کو سزا دیتا ہے یا اس کے خلاف کوئی کارروائی کرتا ہے تو اندر سے ڈرتا بھی ہے کہ کہیں ملک میں میرے خلاف کوئی بغاوت نہ ہو جائے، اور وہ کوئی زور پکڑ کے میرے سامنے اکڑ نہ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ ہلاکت کے انجام سے نہیں ڈرتا، کہ اگر کسی قوم کے اوپر ہلاکت ڈالتا ہے (ھا ضمیر دمدمة کی طرف لوٹ جائے گی) اس دمدمہ کے انجام سے اللہ نہیں ڈرتا، اگر کسی قوم کے اوپر ہلاکت ڈالنا چاہے تو ہلاکت ڈالتا ہے اور اس کو کوئی خوف نہیں ہوتا کہ میرے مقابلے میں کوئی آجائے گا، انتقام لینے کے لئے کھڑا ہو جائے گا، ایسی بات نہیں ہے، وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا: اللہ تعالیٰ اُس ہلاکت کے انجام سے خوف نہیں کھاتا، جس طرح سے دُنیا کے حاکم خوف کھاتے ہیں کہ اگر کسی کو سزا دی تو ایسا نہ ہو کہ اس کے معاون، اس کے مددگار، اس کے حامی کھڑے ہو جائیں اور ملک کے اندر کوئی بغاوت برپا کر دیں، اللہ تعالیٰ کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

آیاتها ۲۱ ۹۲ سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ ۹ رکوعها ۱
سورۂ لیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۱ آیتیں ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے
وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝۱ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝۳
قسم ہے رات کی جب کہ وہ ڈھانپ لے! ۝ اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو جائے! ۝ اور مذکر اور مؤنث کو پیدا کرنے کی! ۝
اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝۴ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶
بے شک تمہاری کوششیں البتہ جدا جدا ہیں ۝ جو اللہ کے راستے میں دیتا ہے اور بچ بچ کر چلتا ہے ۝ اور اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے ۝
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹
تو ہم آسان حالت کے لئے اس کو آسانی پیدا کر دیں گے ۝ اور جو شخص بخل کرتا ہے اور لاپروائی سے وقت گزارتا ہے ۝ اور اچھی باتوں کی تکذیب کرتا ہے ۝
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۝۱۱ اِنَّ عَلَيْنَا
تو ہم اس کو تنگ حالت کے لئے آسانی کر دیں گے ۝ نہیں نفع دے گا اس کو اس کا مال جس وقت وہ برباد ہوگا ۝ بے شک ہمارے ذمے

لَلۡهُدٰىۖ ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾ لَا

ہے البتہ راہنمائی ⊙ بے شک آخرت اور دُنیا ہمارے لئے ہی ہے ⊙ پس میں نے تمہیں ڈرادیا جوش مارتی ہوئی آگ سے ⊙ نہیں

يَصۡلٰٮهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِىۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا

داخل ہوگا اس آگ میں مگر بدبخت ⊙ جس نے تکذیب کی اور اِعراض کرگیا ⊙ اور عنقریب دُور رکھا جائے گا اُس جہنم سے

الۡاَتۡقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِىۡ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ

اس کو جو زیادہ متقی ہے ⊙ جو دیتا ہے اپنا مال اس حال میں کہ وہ صفائی حاصل کرتا ہے ⊙ نہیں ہے اس کے لئے کسی کے پاس کوئی احسان

تُجۡزٰٓى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰى ﴿۲۰﴾ وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰى ﴿۲۱﴾

جو بدلہ دیا جائے ⊙ مگر اپنے ربِّ اعلیٰ کی جزا چاہنے کے لئے ⊙ اور وہ عنقریب خوش ہوجائے گا ⊙

تفسیر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ سورۂ لیل مکہ میں نازل ہوئی اوراس کی ۲۱ آیتیں ہیں۔ مضمون اس میں بھی وہی ہے۔
وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى: قسم ہے رات کی جس وقت کہ وہ ڈھانپ لے یعنی سورج کو! جس طرح سے پیچھے آیا تھا وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰهَا، ''قسم ہے رات کی جس وقت وہ ڈھانپ لے!'' یعنی ساری چیزوں کو ڈھانپ لے، ہر چیز کو چھپالے، رات کی یہ خاصیت ہے کہ تاریکی میں ہر چیز کو چھپالیتی ہے۔ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى: اور قسم ہے دِن کی جس وقت کہ وہ روشن ہوجائے۔ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى: یہ 'مَا'' مصدر یہ ہوجائے گا تو اس کا معنی ہوجائے گا ''اور قسم مذکر اور مؤنث کو پیدا کرنے کی!''، ''قسم رات کی جبکہ وہ ڈھانپ لے! اور دِن کی جبکہ وہ روشن ہوجائے! اور مذکر اور مؤنث کو پیدا کرنے کی!'' اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى: یہ جوابِ قسم ہے کہ جیسے اللہ کی کائنات کے اندر یہ مختلف چیزیں ہیں، دِن اور رات، مذکر اور مؤنث، اسی طرح سے تمہاری کوششیں بھی مختلف ہیں، سعی مصدر ہے مساعی کے معنی میں، تمہارے کیے ہوئے کام البتہ مختلف ہیں، تمہاری کوششیں مختلف ہیں، شتّٰی شتیت کی جمع ہے۔

جنت کا راستہ کس کے لئے آسان ہوجاتا ہے؟

اب ان مختلف کوششوں کا آگے نقشہ ہے، فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى وَاتَّقٰى: جو اللہ کے راستے میں دیتا ہے، وَاتَّقٰى: اور بچ بچ کے چلتا ہے اللہ سے ڈرتا ہوا، تقویٰ اختیار کرتا ہے، یہاں اتّقٰی استغنٰی کے مقابلے میں ہے، اسۡتَغۡنٰى: لاپروا ہوکر چلتا ہے، پروانہیں کرتا، تو اتّقٰی کا معنی ہوگیا کہ جو بچ بچ کے چلتا ہے، بہت فکر کے ساتھ چلتا ہے، ''وہ اللہ کے راستے میں دیتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے''، وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰى: اور اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے، حسنیٰ کا مصداق تمام اَحکامِ شرعیہ ہوگئے، اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی

ایمان لاتا ہے، کلمہ حسنیٰ ہوگیا ''لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ'' اور اس کے ساتھ جتنے بھی نیکی کے کام ہیں سب ''حسنیٰ'' میں داخل ہیں، اُن پر ایمان لاتا ہے، تصدیق کرتا ہے، تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ کے راستے میں دیتا ہے، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى: یسریٰ آسان چیز کو کہتے ہیں، اس سے مراد جنّت ہے، ہم آسان چیز کے لئے اس کو تیسیر کردیں گے، اس کے لئے آسانی پیدا کردیں گے، جنّت کے لئے اس کو آسانی پیدا کردیں گے یعنی جنّت والے افعال اس کے لئے دِن بدن آسان ہوتے چلے جائیں گے۔

جس کی کام کی عادت پڑ جائے وہ آسان ہوجاتا ہے

یہ بات بھی آپ کے سامنے کئی دفعہ آچکی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت ایسی بنائی ہے کہ جدھر کو یہ رُخ کرنے دِن بہ دِن اس میں آسانی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، ایک آدمی نماز پڑھنے کا عادی ہوجائے تقویٰ اختیار کرلے، روزہ رکھنے کا عادی ہوجائے، تو اس کو نماز چھوڑنی مشکل ہے، پڑھنی آسان ہے، مسجد کے اندر بیٹھنا آسان ہے اور مسجد سے دُور رہنا مشکل ہے۔ اور یہ دُوسرا راستہ جو ہے اس میں بُرائی آسان ہوجاتی ہے، ان کے لئے سینما میں تین گھنٹے گزارنے تو بہت آسان ہیں، بڑی لذت کے ساتھ گزاریں گے، پندرہ منٹ مسجد میں بٹھا دیا جائے تو ایسے ہوگا جیسے جیل میں ڈال دیے گئے، ناول تو گھنٹوں پڑھتے رہیں گے لیکن انہیں کہو کہ پانچ منٹ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرلیں تو ممکن ہی نہیں، وہ ان کو اتنا مشکل کام نظر آتا ہے کہ ہوتا ہی نہیں، اور فلموں، ناول دے دو تو سارا دِن اُسی میں گزار دیں گے، تاش کھیلنے کے لئے بیٹھے رہیں گے، جوا کھیلنے کے لئے بیٹھے رہیں گے۔ اور اسی طرح سے مال خرچ کرنے کے لئے، کتوں پر خرچ کریں گے، ریچھوں کی لڑائیوں پر خرچ کریں گے، فسادات پر خرچ کریں گے، کنجریوں کو دے دیں گے، مراثیوں کو دے دیں گے، لیکن ان سے کہو کہ کسی مسجد کو دے دو، مدرسے کو دے دو، تو ان کو اتنا مشکل کام نظر آئے گا ایسا ہوگا جیسے سر کے اُوپر کوئی پہاڑ گر گیا۔ اور اگر کوئی نیکی کی عادت ڈالتا ہے تو اس کو نیکی میں خرچ کرنا آسان ہے، غلط کام میں اُس کا ایک آنہ خرچ کروانا چاہو تو اس کی جان نکلتی ہے۔ یہ انسان کی طبیعت اپنی طبیعت کے تحت نیکی کا عادی ہوجائے تو نیکی آسان ہوتی چلی جائے گی، جنّت کا راستہ آسان ہے، اور بُرائی کا طرف چل پڑے تو بُرائی کا راستہ آسان ہے، یہ وہی! اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، اور هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ جس طرح سے مضمون چلا آرہا ہے، یہ بھی وہی بات ہے۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى: اچھی باتوں کی تصدیق کرے، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى: تو ہم یسریٰ کے لئے اس کو آسانی پیدا کردیں گے، آسان حالت کے لئے اُس کو آسانی پیدا کردیں گے۔ اس کا مصداق جنّت ہے، اور جنّت کا راستہ چونکہ احکامِ شرعیہ ہیں تو یسریٰ کا مصداق یہ بھی بن سکتے ہیں۔

جہنّم کا راستہ کس کے لئے آسان ہوجاتا ہے؟

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ: اور جو شخص بخل کرتا ہے، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، وَاسْتَغْنٰى: اور لاپروائی سے وقت گزارتا ہے، تقویٰ اختیار نہیں کرتا، وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى: اور اچھی بات کی تکذیب کرتا ہے، نیکیوں کی تصدیق نہیں کرتا، یا کلمہ حسنیٰ کی تصدیق نہیں کرتا، تکذیب کرتا ہے، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى: ہم عُسریٰ کے لئے اس کو آسانی کردیں گے، عسریٰ: تنگی، اِس کا اعلیٰ مصداق جہنّم ہے، اور اس کی طرف لے جانے والے اعمالِ قبیحہ، افعالِ بد جو جہنّم کی طرف لے جانے والے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے یہ عُسریٰ ہیں انسان

کی طبیعت کی طرف دیکھتے ہوئے، لیکن اگر کوئی شخص اُدھر کو چلنا شروع کردے تو اللہ کی طرف سے اس میں بھی تیسیر ہوجاتی ہے، راستہ بڑی آسانی کے ساتھ کٹتا چلا جاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ سورۂ اللیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۲۱ آیتیں ہیں۔ اِبتدائی چند آیتوں کا مطلب اور ترجمہ آپ کے سامنے گزر گیا، صرف ترجمہ دوبارہ دیکھ لیجئے، وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی: قسم ہے رات کی جبکہ وہ ڈھانپ لے! ہر چیز پہ طاری ہوجائے، وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی: اور قسم ہے دِن کی جس وقت کہ وہ روشن ہوجائے! وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی: مَا مصدریہ، اور قسم ہے ذکر اور مؤنث کو پیدا کرنے کی، اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی: بے شک تمہاری کوشش البتہ جدا جدا ہے، سعی مصدر ہے اور اس سے مراد ہوجائیں گی مساعی، ''تمہاری کوششیں علیحدہ علیحدہ ہیں''، اور جو چیزیں پہلے بطورِ قسم کے ذِکر کی گئی ہیں وہ متضاد ہیں، دِن اور رات کا آپس میں تقابل ہے، روشنی اور تاریکی کا تقابل ہے، مذکر اور مؤنث کا تقابل ہے، تو ان کو ذِکر کیا جارہا ہے اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ متضاد متقابل چیزیں پیدا کیں، دونوں کے آثار مختلف ہیں اور اسی طرح سے دونوں کے نتائج مختلف ہیں، تو جس طرح سے یہ چیزیں متقابل ہیں اور دونوں کے آثار علیحدہ علیحدہ ہیں اسی طرح سے تمہاری کوششیں بھی مختلف ہیں، تمہارے کردار کے رُخ بھی علیحدہ علیحدہ ہیں، تو اُن کے اُوپر آثار بھی علیحدہ علیحدہ مرتب ہوں گے، جس کی تفصیل آگے ذِکر کردی کہ دو قسم کے لوگ ہیں، بعضے تو ایسے ہیں جو اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اور بچ بچ کے چلتے ہیں، احتیاط کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، یہاں اتَّقٰی اسۡتَغۡنٰی کے مقابلے میں آیا ہے، آگے اسۡتَغۡنٰی کا لفظ آرہا ہے، اسۡتَغۡنٰی: لاپروائی برتنا، بے فکری کے ساتھ چلنا، تو اتَّقٰی کا معنی ہوجائے گا فکر کرکے چلنا، بچ بچ کے چلنا، ''جو اللہ کے راستے میں دیتا ہے اور بچ بچ کے چلتا ہے، وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی: اور کلمۂ حسنیٰ کی تصدیق کرتا ہے، کلمۂ حسنیٰ کا مصداق ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ''، اور ہر اچھی بات جو بھی اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے واضح کی جارہی ہے اس کی تصدیق کرتا ہے، اُسے سچ بتلاتا ہے، اُس کی سچائی پر یقین رکھتا ہے، فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلۡیُسۡرٰی: ہم عنقریب اُس کے لئے تیسیر کریں گے یسریٰ کے واسطے، یسریٰ کا اصل مصداق تو جنت ہے، کیونکہ یسریٰ کہتے ہیں آسان حالت کو، جنت کے لئے ہم اس کے واسطے تیسیر کردیں گے، اور جنت میں جانے کے لئے دُنیا کے اندر نیک اعمال ہیں، تو وہ بھی یسریٰ کا مصداق بن جائیں گے، ''ہم نیک اعمال کے لئے اُسے تیسیر کردیں گے، آسانی پیدا کردیں گے'' یعنی اس کردار کے نتیجے میں جو اِس نے اپنایا کہ اللہ کا شکر اَدا کرتے ہوئے مال اللہ کے راستے میں دیتا ہے، اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، ہر معاملے میں اِحتیاط کے ساتھ چلتا ہے، بچ بچ کر چلتا ہے، اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے، تو ہم نیکی دِن بدن اس کے لئے آسان کرتے چلے جائیں گے، جس کے نتیجے میں وہ بہت آسان منزل پر پہنچ جائے گا جس کو جنت کہتے ہیں۔ تفصیل کچھ کل بھی آپ کی خدمت میں عرض کردی تھی۔ اور اس کے مقابل......! ''اور جو شخص بخل کرتا ہے'' اللہ کے دیے ہوئے مال کو اللہ کے اَحکام کے مطابق خرچ نہیں کرتا، چاہے فضولیات میں خرچ کرتا ہو، رُسومِ قبیحہ کے اندر خرچ کرتا ہو، فخر و ریا کے طور پر خرچ کرتا ہو، وہ دِینی معاملات میں بخیل ہی ہوتا ہے، جیسے آپ کی خدمت میں تفصیل عرض کی تھی کہ فضول خرچ آدمی ہمیشہ دِینی معاملات میں بخیل ہوگا، اُس کی کمائی کتوں پر

تو خرچ ہوگی، ریچھ اور بندروں کے تماشے دیکھتا ہوا تو خرچ کر دے گا، کنجریوں پر، بھانڈوں پر، مراثیوں پر تو اس کی رقم جائے گی، تھانوں میں جائے گی، وکیلوں کے پاس جائے گی، لیکن اللہ کے نام پر پیسہ خرچ کرنا اُس کے لئے بہت بھاری ہوتا ہے۔ یہ اُسی طرح بُرے کردار کے اختیار کرنے کا نتیجہ ہے کہ آہستہ آہستہ اس کے لئے بُرائی آسان ہوگی اور نیکی مشکل ہوگی، وَاسْتَغْنٰی: لاپروائی سے وقت گزارتا ہے، وَاسْتَغْنٰی: لاپرواہو گیا، ''جس نے بخل کیا اور لاپرواہو گیا'' فکر نہیں کرتا کسی معاملے میں، سوچ سوچ کر نہیں چلتا، اللہ سے ڈرتا نہیں، بے پرواہے، ''اور اچھی بات کی تکذیب کرتا ہے'' جو اچھی بات بھی اُس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اس کی وہ تصدیق ہی نہیں کرتا، جھٹلاتا ہے، ہر اچھائی کو جھٹلاتا ہے، کلمہ حسنیٰ کی تکذیب کرتا ہے، ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ'' نہیں پڑھتا، ''ہم اُس کو عُسریٰ کے لئے آسانی کر دیں گے'' عسریٰ: تنگ حالت، جس کا اصل مصداق تو جہنم ہے، اور جہنم کی طرف لے جانے والے اعمالِ قبیحہ یہ بھی عسریٰ کا مصداق ہیں، کیونکہ انسانی فطرت اصل کے اعتبار سے اُن اعمال میں گرانی محسوس کرتی ہے، لیکن جب انسان ایک بُرائی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو آئے دِن اُس کے لئے یہ بُرائیاں آسان ہو جاتی ہیں، اور آہستہ آہستہ انسان اُن بُرائیوں کو کرتا ہوا، اِس راستے کو طے کرتا ہوا اُس تنگ منزل تک پہنچ جائے گا جس کو جہنم کہتے ہیں..... تو یہ مساعی تمہاری مختلف ہیں اور اس کے مختلف نتیجے سامنے آ جائیں گے، علیحدہ علیحدہ کوششیں، علیحدہ علیحدہ نتیجے۔

مال بھروسے کے قابل چیز نہیں ہے

وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی: اِذَا تَرَدّٰی: جس وقت انسان برباد ہوگا، گرے گا، تَرَدّٰی: گرنا، ہلاک ہونا، ''جس وقت انسان برباد ہوگا اُس کا مال اُس کو کوئی نفع نہیں دے گا'' مَا اگر نفی کا بنالیا جائے، تو ''نہیں نفع دے گا اس سے اس کا مال جس وقت کہ وہ برباد ہوگا۔'' ویسے مترجمین نے ترجمہ مَا اِستفہامیہ کے ساتھ بھی کیا ہے، حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، ''کیا نفع دے گا اس کو اس کا مال جب وہ برباد ہو جائے گا'' انسان جس وقت بربادی کی طرف چلا جائے گا، ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا، جہنم میں چلا جائے گا، تو یہ مال جس کی بنا پر یہ اِتراتا ہے، اکڑتا ہے، یہ اِس کے کس کام آئے گا؟ بلکہ اُلٹا اس کے لئے وَبال بنے گا۔ اور عقل مند انسان اگر سوچے تو دُنیا میں بھی یہ نقشہ اس کے سامنے آتا ہے، مال ایک وہم کے درجے کی چیز ہے جس پر انسان اِعتماد کر کے اکڑتا ہے، ورنہ دُنیا میں بھی اگر اِنسان اللہ کی گرفت میں آ جائے تو مال اس کے کچھ کام نہیں آتا، کوئی بیماری لگ جاتی ہے، ساری دُنیا کے ڈاکٹر اکٹھے کر لو، سونے کے ڈھیر اپنے اُوپر خرچ کر لو، لیکن جو گرفت اللہ کی آئی ہوئی ہے وہ مال کے ذریعے سے نہیں جاتی، اللہ تعالیٰ کسی حادثے کے اندر تمہاری ٹانگ لے لیتا ہے، آنکھ لے لیتا ہے، بازو لے لیتا ہے، کسی مصیبت کے اندر تمہیں مبتلا کر دیتا ہے، تم لاکھوں کروڑوں روپے کے جواہرات رکھتے ہو اور ان کو خرچ کرتے ہو، لیکن اللہ کی گرفت جو تم پر آئی ہے یہ مال اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ تو ایسی چیز کے اُوپر اِعتماد کر کے اللہ کی مخالفت کرنا، اللہ کے مقابلے میں لاپروائی برتنا، اکڑنا، یہ کون سی عقل مندی ہے۔ جب انسان بربادی کی طرف جاتا ہے، ہلاکت کے گڑھے میں گرتا ہے، تو یہ مال کچھ کام نہیں آتا۔ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْہُدٰی: بے شک ہمارے

ذِمّے ہے البتہ راہنمائی، ہدایت، راہنمائی ہمارے ذِمّے ہے اور وہ ہم اپنی کتابوں کے ذریعے سے اور اپنے رسولوں کے ذریعے سے کررہے ہیں، ہم نے اپنے ذِمّے راہنمائی لے رکھی ہے، اور وہ راہنمائی ہماری طرف سے ہوگئی۔

دُنیا وآخرت پرحکومت اللہ کی ہے

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى: بے شک آخرت اور اُولیٰ ہمارے لئے ہی ہے، اُولیٰ سے دُنیا مراد ہے، آخرۃ سے آخرت مراد ہے، دُنیا اور آخرت ہمارے لیے ہی ہے، دُنیا میں بھی حکومت ہماری، آخرت میں بھی حکومت ہماری، ہمارے قاعدے اور ضابطے کے مطابق ہی دُنیا میں فیصلے ہوتے ہیں، اور ہماری حکمت اور عدل کے مطابق ہی آخرت میں فیصلے ہوں گے، نہ کوئی شخص اپنی اِستعداد کے ساتھ اور اپنے اِستحقاق کے طور پر دُنیا میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے، اور نہ ہی کوئی شخص کسی خاندان کے وسیلے سے، کسی جھوٹی سفارش سے، کسی اور سہارے سے آخرت میں کامیاب ہوسکے گا، دونوں جگہ ہی ہماری حکمت، ہمارا علم، ہمارا عدل کارگر ہے، دُنیا میں بھی ہمارے اُسی طرح سے فیصلے ہوتے ہیں، آخرت میں بھی ایسے ہی فیصلے ہوں گے، دُنیا اور آخرت دونوں پہ حکومت ہماری ہے۔

جہنّم میں بڑا بد بخت ہی داخل ہوگا

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى: تَلَظّٰى: جوش مارتی ہوئی، بھڑکتی ہوئی، یہ نار کی صفت ہے، كَلَّا ۗ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى یہ لظی کا لفظ آپ کے سامنے سورۂ معارج میں آیا تھا، فَاَنْذَرْتُكُمْ: پس میں نے تمہیں ڈرادیا، نَارًا تَلَظّٰى: جوش مارتی ہوئی آگ سے، بھڑکتی ہوئی آگ سے میں نے تمہیں ڈرادیا، اب اُس سے بچنا نہ بچنا تمہارا کام ہے، ہم نے اِنذار پوری طرح سے کردیا ہے۔ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى: اب وہی دونوں گروہوں کا انجام سامنے آگیا جس طرح سے پچھلی سورتوں میں مضمون چلا آرہا ہے، اور ''مکی'' سورتوں میں زور اِسی مضمون پر ہی ہے، اثباتِ جزاوسزا، ''نہیں داخل ہوگا اُس بھڑکتی ہوئی آگ میں مگر بدبخت'' جیسے پیچھے سورۂ اعلیٰ کے اندر آیا تھا: وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى، تو وہی ''نارِ کبریٰ'' یہاں ''نَارًا تَلَظّٰى'' کا مصداق ہے، اور وہی نصیحت سے بچنے والا ''اشقی'' جو ہے وہی اس میں داخل ہوگا، جو نصیحت سے اِجتناب اختیار کرتا ہے، تجنب اختیار کرتا ہے، دُور ہٹتا ہے، نصیحت قبول نہیں کرتا، ہماری راہنمائی سے فائدہ نہیں اُٹھاتا، یہی ''اشقی'' ہے جو کہ جہنّم کے اندر جائے گا۔

ایک اِشکال کا جواب

بظاہر آپ دیکھ رہے ہیں کہ ''اشقی'' یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے، جس کا معنی ہے بہت زیادہ بدبخت، سب سے زیادہ بدبخت اس جہنّم میں جائے گا، تو اس سے اس بات کی طرف اشارہ نہیں نکلتا کہ جو کم درجے کا بدبخت ہے وہ جہنّم میں نہیں جائے گا، نہیں! اصل بات یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں جو بالمشافہ آپ کی بات سنتا تھا اور نصیحت قبول نہیں کرتا تھا، وہ ہے ہی سب سے بڑا بدبخت، اس اعتبار سے اس کو ''اشقی'' کہا جارہا ہے کہ ایسے وقت میں بھی جو نصیحت حاصل نہ کرے اس سے بڑھ کر کون بدبخت ہوگا، تو اس کا مصداق ہر کافر ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کی نصیحت کو قبول نہیں کرتا۔ باقی اَشقی جو گناہ گار ہوتا ہے، مؤمن گناہگار، اس

کے لئے دُوسری آیات میں مذکور ہے کہ اس کو بھی سزا ہو سکتی ہے، ضروری نہیں، اللہ اپنی رحمت کے ساتھ معاف کردیں ایسا بھی ہوگا، اور اگر سزا دینا چاہیں تو ایسا بھی ہوگا، لیکن کچھ دیر سزا پانے کے بعد آخر کار اس کی نجات ہو جائے گی جس کا ایمان صحیح ہے لیکن عمل کے اعتبار سے اس میں کچھ شقاوت اور بدبختی آ گئی تھی۔ اس لئے یہاں لَا یَصْلٰىهَآ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دائماً اس میں داخل صرف ''اشقیٰ'' ہی ہوگا جس کا مصداق کافر ہے، اور شقی اگر جائے گا تو کُفر کے شبہ کی بنا پر جائے گا، کیونکہ ہر معصیت کُفر کا ایک شعبہ ہے، تو یہ مؤمن فاسق فاجر عمل کے اعتبار سے مشابہ ہو جاتا ہے کافر کے، اس شبہ اور مشابہت کی بنا پر اس کو جہنّم میں بھیجیں گے، لیکن یہ جانا عارضی طور پر ہوگا، دائماً نہیں، جہنّم اصل ٹھکانا کافروں کا ہی ہے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (سورۂ بقرہ: ۲۴) جس طرح سے قرآنِ کریم میں ذِکر کیا گیا۔ تو ''اشقیٰ'' سے ہر کافر مراد ہے جس طرح سے آگے لفظ آ گیا: الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى: اشقیٰ وہ ہے کہ جس نے تکذیب کی (جس طرح سے پیچھے كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى آیا تھا) جس نے تکذیب کی، جس نے جھٹلایا، وَتَوَلّٰى: اور پیٹھ پھیری، توجہ نہیں کی، اِعراض کر گیا۔

بڑا متقی جہنّم سے دُور رہے گا

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى: یہاں سَيُجَنَّبُهَا کی ضمیر نَارًا تَلَظّٰى کی طرف لوٹ رہی ہے، اور عنقریب دُور رکھا جائے گا اُس جہنّم سے الْاَتْقَى: جو زیادہ متقی ہے، پرہیزگار، اس سے مؤمنِ صالح مراد ہے، حضور ﷺ کے زمانے میں جس نے کلمہ پڑھا تقویٰ اختیار کیا وہ اتقیٰ کا ہی مصداق ہے، اعلیٰ درجے کا متقی، لیکن اس میں یہ اشارہ نہیں کہ جو کم درجے کا متقی ہے وہ جنّت میں نہیں جائے گا، یہ اشقیٰ کے مقابلے کے طور پر اتقیٰ ذِکر کیا گیا ہے، باقی جیسا جیسا کوئی نیک ہوگا اسی اعتبار سے جنّت میں جائے گا، جس طرح سے دُوسری آیات کے اندر تفصیل موجود ہے۔ جیسے حضور ﷺ کے زمانے میں کُفر کرنے والا اشقیٰ ہے، اسی طرح سے حضور ﷺ کے زمانے میں ایمان لانے والا باقی متقیوں کے مقابلے میں اتقیٰ ہے، تو یہاں ذِکر اُن مؤمنین کا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى: دُور رکھا جائے گا اُس نَارًا تَلَظّٰى سے، اُس جوش مارنے والی آگ سے اتقیٰ کو۔

بڑا متقی کون ہے؟

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى: جو کہ دیتا ہے اپنا مال اس حال میں کہ وہ صفائی حاصل کرتا ہے، ظاہراً باطناً پاک صاف ہونے کے لئے وہ اپنا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى کے تحت جس طرح سے ذِکر کیا گیا تھا۔ يَتَزَكّٰى سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس میں ریا نہیں ہوتی، نمود نہیں ہوتی، دِکھلاوا نہیں ہوتا، اس قسم کی قباحتیں اُس کے خرچ کرنے میں نہیں ہوتیں، وہ خرچ کرتا ہے تو محض اس لئے خرچ کرتا ہے تا کہ اِس خرچ کرنے کے ذریعے سے اللہ اس کے گناہ معاف کرے، اور اس کا مال بھی پاک ہو جائے اور ظاہراً باطناً یہ انسان بھی پاک ہو جائے، اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنا بہت زیادہ طہارت کا ذریعہ بنتا ہے انسان کی رُوحانیت کے لئے بھی، جس طرح سے بدنی عبادت کے ساتھ رُوح جلاء پکڑتی ہے، مالی عبادت کے ساتھ بھی اسی طرح سے ہے، ''پاک صاف ہونے کے لئے وہ اپنا مال دیتا ہے۔'' وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى: یہ اسی کے اخلاص کا بیان ہے،

نہیں ہے اس کے لئے کسی کے پاس کوئی احسان جو بدلہ دیا جائے، لفظی ترجمہ...... نہیں ہے کسی شخص کے لئے اُس اتقٰی کے پاس (عِنْدَہٗ کی ضمیر اتقٰی کی طرف لوٹ گئی) نہیں ہے کسی شخص کے لئے اُس اتقٰی کے نزدیک کوئی احسان جو بدلہ دیا جائے۔ اس کا مفہوم دو طرح سے واضح کیا گیا ہے، ایک مطلب تو اِس کا یہ ہے کہ ایک شخص کسی دُوسرے شخص پہ احسان کرتا ہے، مثلاً میرے پر کسی نے احسان کیا تو میں اس کے احسان کا بدلہ دیتا ہوا مال اس کے اُوپر خرچ کروں، یہ بھی ایک خوبی کی بات ہے، یہ کوئی عیب نہیں کہ احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ دیا جائے، هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (سورۂ رحمٰن) یہ بھی خوبی ہے، کسی نے میرے پہ احسان کیا، مقابلے میں نے اُس کے احسان کا بدلہ دیتے ہوئے اُس پہ مال خرچ کر دیا، تو احسان کے بدلے کی نیت کے ساتھ خرچ کرنا یہ بھی خوبی ہے، لیکن اس سے بڑھ کر خوبی یہ ہے کہ میرے پر کسی کا احسان نہیں ہے جس کا میں بدلہ دوں، بلکہ از خود ابتداءً دوسرے پر احسان کروں، اور جو مال اِس انداز سے خرچ کیا جائے آپ جانتے ہیں کہ اس کا مرتبہ بہت اعلیٰ ہے، احسان کے بدلے کے طور پر احسان کیا جائے یہ بھی اچھی بات، لیکن ابتداءً کسی کے اُوپر احسان کیا جائے، کسی احسان کا بدلہ دینا مقصود نہ ہو، یہ بہت اعلیٰ ہے، تو یہاں اتقٰی کی صفت یہی ذکر کی جارہی ہے کہ کسی نے اس پر احسان نہیں کیا ہوا تھا جس کا بدلہ دیا جارہا ہے، بلکہ وہ ابتداءً لوگوں کی خدمت کرتا ہے محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے، ظاہراً باطناً طہارۃ اور زکوٰۃ حاصل کرنے کے لئے، کسی احسان کے بدلے کے طور پر نہیں، اگرچہ احسان کا بدلہ دینا یہ بھی ایک خوبی ہے لیکن یہ خوبی اُس سے بڑھ کے ہے کہ کسی نے اُس پہ احسان نہیں کیا جس کے بدلے کے طور پر یہ مال خرچ کرے بلکہ یہ ابتداءً اُس کو مال دیتا ہے از خود (عام تفاسیر)۔......دُوسرا مطلب اِس کا یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ دینے والا اس نیت کے ساتھ دیتا ہے کہ دُوسرے پر احسان کر کے اس کی طرف سے بدلہ نہیں چاہتا، جس اتقٰی کا یہاں ذکر ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں اپنا مال دیتا ہے تو اس کا مال دینے کا انداز یہ ہے کہ وہ کسی پہ احسان نہیں کر رہا کہ جس کا بدلہ دیا جائے، یعنی وہ اس نیت سے بھی خالی ہوتا ہے کہ جس پر میں احسان کر رہا ہوں کل کو یہ مجھے بدلہ دے، اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا یہ لفظ سورۂ دہر میں آپ کے سامنے آئے تھے، ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں، نہ ہم تمہاری طرف سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری چاہتے ہیں، تو یہاں بھی اتقٰی کی صفت یہ ہوگئی کہ وہ اللہ کے راستے میں مال دیتا ہے لیکن ایسے طور پر دیتا ہے کہ کسی کے لئے اُس کے نزدیک کوئی احسان نہیں جو بدلہ دیا جائے، یعنی اُس کے جذبے میں یہ بات نہیں کہ میں کسی پہ احسان کر رہا ہوں اور کل کو اس کا بدلہ دیا جائے گا، اس چیز سے بھی وہ مستغنی ہو کر احسان کرتا ہے، دوسروں کو دیتا ہے اور اس کی نیت میں یہ چیز باقی نہیں ہوتی کہ کل کو اس احسان کا بدلہ ملے گا۔ دونوں طرح سے ان الفاظ کا مطلب واضح کیا گیا ہے۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى: کسی احسان کے بدلے کے طور پر خرچ نہیں کرتا، یا، یہ احسان کا بدلہ لینے کے لئے خرچ نہیں کرتا، ہاں! صرف اللہ کی رضا چاہنے کے لئے خرچ کرتا ہے، ''نہیں خرچ کرتا وہ کسی احسان کے بدلے کے طور پر (یہ مفہوم ہے پچھلی آیت کا) نہیں خرچ کرتا وہ کسی اور مقصد کے لئے سوائے اللہ جو ربِّ اعلیٰ ہے اُس کی رضا چاہنے کے اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہے، ابتغاء:

چاہنا، "مگر اپنے ربِّ اعلیٰ کی جزا چاہنے کے لئے" لفظی ترجمہ اس طرح سے ہوگیا۔ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى: تو ایسا اتقیٰ عنقریب خوش ہوجائے گا، یعنی اللہ کی طرف سے اس کو ایسی جزا ملے گی کہ وہ خوش ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ اُسے اتنا دیں گے کہ وہ خوش ہوجائے گا۔

مذکورہ آیات کا اوّل مصداق صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہیں

اب ظاہری طور پر اِس آیت کے الفاظ تو عام ہیں، ہر اتقیٰ کو شامل ہیں جو بھی اس کردار کو اپنائے، لیکن تقریباً تقریباً تمام تفاسیر اس بات کے اُوپر متفق ہیں کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں اُتری تھیں، جب وہ مظلوم غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرتے تھے، بلال رضی اللہ عنہ کو خریدا اور اس قسم کے اور بھی کئی تھے جن کو خرید خرید کر انہوں نے آزاد کیا، ان کے والد نے ردکا بھی کہ آپ ایسی کمزور کمزور مخلوق کو خریدتے ہیں، کمزور لوگوں کو خریدتے ہیں، اگر آپ نے خریدنے ہی ہیں تو کسی قوی کو، طاقتور کو، مضبوط کو خریدو، جو کل کو آپ کا معاون بھی بنے، تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اللہ کی رضا کے لئے کرتا ہوں، مجھے اِن کی طرف سے نہ کسی تعاون کی طمع ہے اور نہ میں ان کو اپنا مددگار بنانے کے لئے خریدتا ہوں۔ تو ان آیات میں صراحتاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اتقیٰ قرار دے کے ان کے اِس کردار کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ محض تزکّی کے لئے، اپنے آپ کو صاف ستھرا کرنے کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اور کسی پہ احسان کرنا مقصود نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جائے، نہ اس پہ کسی کا احسان ہے کہ جس کا وہ بدلہ دے رہا ہو، نہ وہ کسی پر ایسے طور پر اِحسان کر رہا ہے کہ کل کو بدلے کی امید رکھے، جو کچھ وہ کر رہے ہیں اپنے رَبِّ اعلیٰ کی رضا چاہنے کے لئے کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں ایسی ہی جزا دیں گے جس پر وہ خوش ہوجائیں گے، تو اس کا مصداق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا، اور الفاظ کے عموم کے ساتھ باقی حضرات بھی اس میں شامل ہوجائیں گے، گویا کہ نزول کے وقت اس کا مصداقِ اعلیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور الفاظ عام ہیں اس لیے جو شخص بھی یہ کردار اپنائے گا درجہ بدرجہ اس کا مصداق بنتا چلا جائے گا۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مضمون آیات کا عام ہے لیکن روایاتِ کثیرہ شاہد ہیں کہ ان آخری آیات کا نزول سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں ہوا، اور یہ بہت بڑی دلیل ان کی فضیلت و برتری کی ہے، زہے نصیب اس بندے کے جس کے اتقیٰ ہونے کی تصدیق آسمان سے ہو، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ (سورۂ حجرات: ۱۳) اور خود حضرتِ حق سے اس کو وَلَسَوْفَ يَرْضٰى کی بشارت سنائی جائے، فی الحقیقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں وَلَسَوْفَ يَرْضٰى کی بشارت ایک انعکاس ہے اُس بشارتِ عظمیٰ کا جو آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں آرہی ہے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى" (تفسیر عثمانی) جیسے یہ پیش گوئی اور بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کی جارہی ہے تو گویا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی بشارت سنادی۔

***

آیاتھا ۱۱ ۹۳ سُوْرَۃُ الضُّحٰی مَکِّیَّۃٌ ۱۱ رکوعھا ۱

سورۂ ضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۱ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰی ۙ﴿۱﴾ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ﴿۳﴾ وَلَلْاٰخِرَۃُ

قسم ہے دن کی روشنی کی !﴿۱﴾ اور قسم ہے رات کی جس وقت کہ وہ سکون پکڑ لے !﴿۲﴾ تیرے رَبّ نے تجھے چھوڑا نہیں، اور نہ وہ ناراض ہوا﴿۳﴾ اور البتہ آخرت

خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ؕ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ؕ﴿۵﴾ اَلَمْ یَجِدْکَ

بہتر ہے آپ کے لئے دُنیا کے مقابلے میں﴿۴﴾ اور عنقریب آپ کا رَبّ آپ کو دے گا تو پھر آپ خوش ہو جائیں گے﴿۵﴾ کیا تیرے رَبّ نے تجھے

یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۪﴿۶﴾ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ۪﴿۷﴾ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ؕ﴿۸﴾ فَاَمَّا

یتیم نہیں پایا، پھر ٹھکانا دیا﴿۶﴾ اور اس نے تجھے ناواقف پایا پھر واقف کر دیا﴿۷﴾ اور اس نے تجھے محتاج پایا پھر غنی کر دیا﴿۸﴾ پس

الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ ؕ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾

آپ بھی یتیم پر قہر نہ کیجئے﴿۹﴾ اور سائل کو نہ جھڑکیے﴿۱۰﴾ اور اپنے رَبّ کے احسان کو بیان کرتے رہیے﴿۱۱﴾

سورۂ ضحیٰ کا مضمون اور شانِ نزول

سورۂ ضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۱ آیتیں ہیں۔ اس سورت میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا مضمون ہے۔ آپ ﷺ نے جس وقت تبلیغ شروع کی، وحی کا نزول آپ پر ہوا، تو قوم ساری کی ساری مخالف تھی، قوم کی طرف سے بڑی مشکلات اور بڑی مشقتوں کا سامنا تھا، تکلیفیں آپ کو پہنچائی جا رہی تھیں، تو ایسے وقت میں حضور ﷺ کے اُوپر جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس سے آپ کو کچھ سہارا ہوتا تھا، گاہے گاہے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت وحی کے نزول میں کچھ دیر ہو جاتی تو اس میں پھر حضور ﷺ بہت پریشان ہو جاتے تھے، اور رہ رہ کے آپ کو خیال آتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری طرف سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ روک لیا ہو، اللہ تعالیٰ کی کوئی ناراضگی نہ ہو گئی ہو، یہ تصور حضور ﷺ کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ چنانچہ روایات کے اندر آتا ہے کہ جب پہلی وحی نازل ہوئی تھی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، اُس کے بعد پھر تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا (فتح الباری)، اس دور میں رسول اللہ ﷺ کو اتنی پریشانی تھی، اتنا آپ گھبراتے تھے اس وحی کے آنے کے بعد اس کے

منقطع ہونے سے کہ یہ کیوں منقطع ہوگئی، آتی کیوں نہیں، چاہت دِل میں پیدا ہوگئی، کبھی کوئی خیال آتا، کبھی کوئی خیال آتا، بے چینی اس حد تک بڑھ جاتی، ''بخاری شریف'' میں آتا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنے آپ کو ہلاک ہی کردوں، اس بے چینی سے چھوٹنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں، پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے تاکہ اپنے آپ کو گرادیں، لیکن فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ آواز دیتا ''اِنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ حَقًّا'' تو پھر حضور ﷺ کو کچھ سکون آجاتا۔[1] تو تین سال کے بعد پھر یہ وحی کا سلسلہ شروع ہوا، تو مختلف حکمتوں کے تحت تب بھی وہ کئی کئی دِن تک کردیتی تھی، وحی نہیں آتی تھی، اس وقت بھی حضور ﷺ کو کچھ ایسی ہی بے چینی ہوتی، معلوم یوں ہوتا ہے کہ کوئی ایسے ہی واقعہ پیش آیا تھا جس کی بنا پر بعض کافروں نے بھی طعنہ دیا کہ اب ان کے رَبّ نے ان کو چھوڑ دیا، رَبّ ان پہ ناراض ہوگیا جس کی بنا پر اب ان پر وحی نہیں آتی۔[2] یا بعض آثار اس قسم کے بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تہجد کے وقت اُٹھا کرتے تھے، قرآنِ کریم پڑھا کرتے تھے، اور کبھی طبیعت خراب ہوگئی، دو تین دِن نہ اُٹھ سکے، آپ کے پڑوس میں ابولہب کا مکان تھا، ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل جو بہت بدترین قسم کی آپ کی دُشمن تھی جس کا ذِکر سورۂ تبت میں آئے گا، وہ کہنے لگی کہ اِس کے شیطان نے اب اِس کو چھوڑ دیا ہے، پہلے آکر اِس کو وقت پہ اُٹھاتا تھا اور اب نہیں اُٹھاتا۔[3] اس قسم کے طعنے مشرکین کی طرف سے علیحدہ تھے اور باقی اِیذائیں علیحدہ تھیں جس سے حضور ﷺ کو بہت پریشانی ہوتی تھی۔ اِس سورت میں سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی دی گئی ہے کہ اگر وحی کا سلسلہ کچھ دِن کے لئے رُک جائے تو یہ کوئی ناراضگی کی علامت نہیں ہے، نہ آپ کے رَبّ نے آپ کو چھوڑا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت جس طرح سے دِن روشن ہے، رات تاریک ہے، اور کبھی روشنی آتی ہے، کبھی تاریکی ہوتی ہے، روشنی میں گرمی اور حرکت ہوتی ہے اور رات کی تاریکی میں سکون اور اطمینان ہوتا ہے، یہ دو چیزیں متقابل ہیں، اور ان دونوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی حکمت کارفرما ہے، یہ نہیں کہ دِن کی روشنی تو اللہ کی رضا کی علامت ہے اور رات کی تاریکی کوئی اللہ کی ناراضگی کی علامت ہے، نہیں! انسان کی تربیت کے لئے اور انسان کی راحت و آرام کے لئے دونوں باتیں ہی ضروری ہیں کہ کبھی روشنی ہو، کبھی تاریکی ہو، روشنی اور گرمی میں انسان کام کاج کے لئے ہوشیار ہوجاتا ہے، چست ہوجاتا ہے، رات کے سکون میں وہ آرام کرتا ہے اس کی تھکاوٹ دُور ہوتی ہے، تو جس طرح سے اِس بدنی زندگی کے اندر روشنی اور تاریکی اللہ کی حکمت کے تحت آتی جاتی رہتی ہے اسی طرح سے رُوحانی تربیت کے لئے بھی اللہ کی طرف سے یہ مختلف حالات ہوتے ہیں، جب حکمت ہوئی وحی کا نزول ہوگیا، اور جب اللہ کی حکمت ہوئی تو وحی کا نزول تھوڑے دنوں کے لئے بند ہوگیا، کیونکہ وحی کے اندر جو ثقل ہے جس قسم کی ذمہ داریاں ہیں اگر مسلسل آتی رہتی تو ہوسکتا ہے حضور ﷺ کی طبیعت

---

(۱) بخاری ج۲ ص ۱۰۳۴ باب اول ما بدئ بہ رسول اللہ من الوحی/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۲ باب المبعث، فصل اوّل۔

(۲) مسلم ۲/ ۱۰۹ باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین۔

(۳) بخاری ۲/ ۷۳۸، تفسیر سورۃ الضحٰی/ مسلم ۲/ ۱۰۹، باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین/ نوٹ:- کتب احادیث میں عورت کے نام کی صراحت نہیں ہے، تفاسیر میں ہے۔

اس کو برداشت نہ کرسکتی، آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ تربیت کی گئی اُس وحی کے برداشت کرنے کی، جیسے کہ سورۂ اِقرأ کے اندر اس بات کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے گا، تو یہ اللہ کی حکمت کے تحت ہے۔ باقی! اللہ آپ پر ناراض کیسے ہو، آپ کو چھوڑ کس طرح سے دے، کس طرح سے بچپن سے آپ کے اُوپر عنایات ہیں، آپ یتیم پیدا ہوئے اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے آپ کی پرورش کا انتظام کیا، آپ عائل تھے، محتاج تھے، کس طرح سے اللہ نے آپ کو غنی کردیا، اور کس طرح سے آپ ناواقفیت کی کیفیت میں بےچین تھے کہ اللہ نے آپ کی راہنمائی کردی، ان چیزوں کو اگر آپ یاد کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بچپن سے کس طرح آپ پر عنایات چلی آرہی ہیں، اِن چیزوں کو اگر آپ سوچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ نہ ناراض ہے نہ چھوڑا ہے، بلکہ حکمت کے تحت کبھی کبھی وقفہ آجاتا ہے۔ اِن چیزوں کو ذکر کر کے پھر آگے کچھ ہدایات دی جارہی ہیں، یتیم کے بارے میں، سائل کے بارے میں، اور اس نعمت کے شکریہ کی ترغیب دی جارہی ہے۔ یہ مضمون ہے جو اس سورت میں آپ کے سامنے آرہا ہے۔

تفسیر

قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت

وَالضُّحٰی، وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰی: ضحیٰ اصل کے اعتبار سے تو چاشت کا وقت ہوتا ہے جب سورج چڑھنے کے بعد اتنا اُونچا ہوجائے کہ ریت گرم ہوجائے، جیسے کہ غروب کی طرف جاتے ہوئے عصر کے وقت سورج اُونچا ہوتا ہے، ضحیٰ چاشت کا وقت ہے، مثلاً آج کل اگر مثال کے طور پر ساڑھے چھ بجے سورج نکلتا ہے تو آٹھ نو بجے دُھوپ میں اتنی تیزی آجاتی ہے کہ ریت گرم ہوجاتی ہے، صلوٰۃ ضحیٰ اُسی وقت ہی پڑھی جاتی ہے اور اس کی فضیلت ہے، حدیث شریف میں آتا ہے ''صَلَاۃُ الْاَوَّابِيْنَ حِيْنَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ ''(۱) اَوّابین کی نماز، اللہ کی طرف رُجوع کرنے والوں کی نماز اُس وقت ہوتی ہے جب اُونٹ کے بچوں کے پاؤں جلنے لگ جائیں، یعنی ریت اتنی گرم ہوجائے کہ اُونٹ کے بچوں کے پاؤں جلنے لگ جائیں، یہی وقت ہوتا ہے ضحیٰ کا، اِسی وقت ہی نماز کی فضیلت ہے جو حدیث شریف میں آتی ہے۔ اس سے دِن کی روشنی مراد ہوگئی، ضحیٰ: چاشت کا وقت، مراد دِن ہے جیسا کہ تقابل میں رات کو ذکر کیا جارہا ہے، ''قسم ہے دِن کی روشنی کی، یا چاشت کے وقت کی، یا دِن کی'' جس طرح سے کہہ لیں، وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰی: سَجٰی سَكَنَ کے معنی میں ہے، اور قسم ہے رات کی جس وقت کہ وہ سکون پکڑ لے، سکون پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تاریکی اپنے عروج پہ چلی جائے جیسے نصف شب میں ہوتا ہے، اور اُس وقت ہر چیز ساکن ہوجاتی ہے تو اس طرح سے ہے گویا کہ رات ہی ساکن ہوگئی۔ یہ دو چیزیں ذکر کردی گئیں، روشنی اور رات کی تاریکی، دِن میں وہ وقت ذِکر کیا گیا ہے کہ جس میں نقل وحرکت عام ہوجاتی ہے، یہ وقت ہوتا ہے کہ جس میں ہر شخص اپنے کام کے لئے متحرک ہوجاتا ہے، اور رات میں وہ وقت ذکر کیا گیا ہے کہ جس میں مکمل سکون ہوجاتا ہے جس طرح سے نصف شب کا وقت ہوگیا، یہ دونوں باتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ مختلف حالات جو آتے ہیں یہ

---

(۱) مسلم ۱/۲۵۷ باب صلاۃ الأوابین/مشکوۃ ۱/۱۱۶ باب صلاۃ الضحیٰ، فصل اول۔

اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی علامت نہیں ہوتے، نہ اللہ تعالیٰ کے اعراض کر جانے کی علامت ہیں، بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، جس طرح سے اس دُنیوی زندگی میں، مادی زندگی میں دِن اور رات کا آنا دونوں میں اللہ کا احسان ہے، دونوں میں سے کوئی ناراضگی کی علامت نہیں ہے، اسی طرح سے آپ پر بھی کبھی کوئی سختی آگئی، کبھی کوئی نرمی آگئی، کبھی وحی کا نزول ہوا، کبھی وحی بند ہوگئی، کبھی صحت ہے، کبھی بیماری ہے، یہ سب کچھ رُوحانی تربیت کے لئے ہو رہا ہے، ان میں سے کوئی بات بھی اللہ کی ناراضگی کی علامت نہیں ہے۔

مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ: تیرے رَبّ نے تجھے چھوڑا نہیں، وَمَاقَلٰی: اور نہ وہ رَبّ ناراض ہوا، بیزار ہوا، قَلٰی یَقْلِیْ، اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ لفظ یہی آیا ہوا ہے، (سورۂ شعراء: ۱۶۸) میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں، یہ حضرت لُوط نے اپنی قوم سے کہا تھا۔ تو نہ وہ تجھ سے ناراض ہوا، بیزار ہوا، کوئی بات بھی نہیں، یہ کافر مشرک اگر چند دِن وحی رُکنے کی بنا پر یا آپ کے رات کو نہ اُٹھنے کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ اللہ نے تجھے چھوڑ دیا یا اللہ تجھ سے ناراض ہوگیا، یا اگر آپ کے دِل میں کسی درجے میں بھی وسوسہ آتا ہے کہ شاید میری کسی کوتاہی کی بنا پر یا کسی کمی کی بنا پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگیا جو وحی نہیں آرہی، اگر وسوسہ آتا ہے (اس قسم کا وسوسہ آسکتا ہے قلب میں) تو اس کو دُور ہو جانا چاہیے۔ ''نہ تیرے رَبّ نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی تیرا رَبّ تجھ سے بیزار ہوا۔''

''وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى'' کے دو مفہوم

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى: یہ اُن حالات میں ایک ایسی عظیم پیش گوئی کردی گئی، آخرت اور اُولیٰ یہ دو لفظ یہاں آئے ہیں، ان کے دو مفہوم ہیں، اُولیٰ سے اگر دُنیا مراد لے لی جائے اور آخرت سے وہی آخرت مراد لی جائے جو مرنے کے بعد آئے گی تو اس میں یہ بتایا گیا کہ آخرت آپ کے لئے دُنیا کے مقابلے میں بہتر ہے (عام تفاسیر)، یہ سختیاں، یہ دُشواریاں، یہ مشقتیں، جو کچھ بھی ہیں دُنیا میں ہیں، اور آخرت میں جس وقت آپ جائیں گے، مرنے کے بعد اگلی زندگی جو شروع ہوگی وہ بہت بہتر ہوگی آپ کے لئے، اس میں تسلی کا پہلو آگیا۔ اور اگر آخرت اور اُولیٰ کو اپنے لغوی مفہوم میں لے لیا جائے تو ترجمہ بہترین ہو جاتا ہے اور عین موقع محل کے مطابق ہے، اُولیٰ سے مراد پہلی حالت جو اس وقت آپ پہ موجود ہے یا جو گزر گئی، آخرت سے مراد پچھلی حالت جو آنے والی ہے (مظہری)، یہ حضور ﷺ کے روبہ ترقی ہونے کی طرف اشارہ ہے، ہر پیچھے آنے والی حالت آپ کی پہلی حالت سے اچھی ہوگی، یعنی یوں نہ سمجھئے کہ اِن کی مخالفتوں کی بنا پر آپ پر زوال آجائے گا، قوم کی دُشواریاں آپ کو پیچھے دھکیل دیں گی، آپ کا نام ونشان مٹ جائے گا جس طرح سے مشرک کوشش کرتے ہیں، ایسی بات نہیں، ہم آپ کو پیش گوئی کے طور پر بتاتے ہیں کہ ہر آنے والی پچھلی حالت جو آرہی ہے وہ گزری ہوئی حالت اور موجودہ حالت کے مقابلے میں اچھی ہوگی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ حضور ﷺ پر جو دِن آتا چلا گیا آپ کے لئے پہلے کے مقابلے میں بہتر سے بہتر ہی تھا، دِین بھی پھیلا، لوگ مسلمان بھی ہوئے، دُنیا کے اندر عزت اور وجاہت بھی حاصل ہوئی، حتیٰ زندگی کے اختتام میں پورے کے پورے مُلک کے اُوپر آپ کو حکومت حاصل ہوگئی تھی اور سارا مُلک آپ کے زیرِ نگین ہوگیا تھا، اور یہ جب سے عرب آباد ہوا تھا شاید پہلا موقع تھا کہ یہ علاقہ کسی ایک حاکم کی حکومت کے تحت آیا ہو، ورنہ وہاں قبائلی نظام تھا ہر کوئی قبیلہ اپنی اپنی حکومت بنائے پھرتا تھا، اس طرح سے پچھلی حالت حضور ﷺ کے لئے اس پہلی

حالت کے مقابلے میں بہت اچھی ثابت ہوئی۔ یہ پیش گوئی اُن حالات میں کی گئی جب بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ٹمٹماتا چراغ ہے، اور اس کو بجھانے کے لئے ہر طرف سے مخالفتوں کے طوفان اُٹھے ہوئے ہیں، پتا نہیں یہ کب بجھ جائے، کب قتل کر دیا جائے، کب اس آواز کو دبا دیا جائے، اِن حالات میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، پیچھے آنے والی ہر حالت موجودہ حالت کے مقابلے میں اچھی ہوگی، اور یہ پیش گوئی بالکل کھلے طور پر سامنے آ گئی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو دُنیا وآخرت میں اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى: اور عنقریب آپ کا رَبّ آپ کو دے گا تو پھر آپ خوش ہو جائیں گے، یعنی اِس وقت اگرچہ آپ پر مصیبتیں ہیں، تکلیفیں ہیں، مخالفتیں ہیں، لیکن آنے والے وقت میں اللہ تعالیٰ آپ کو ایسے حالات دے گا، ایسی نعمتوں سے نوازے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کی خوشی اس دُنیا کے اندر یہ تھی کہ دِین پھیل جائے، لوگ کُفر وشرک کو چھوڑ دیں اور آپ کا کلمہ پڑھ لیں، اس میں یہ پیش گوئی بھی ہے کہ یہ بھی آپ کو دے دی جائے گی اور آپ خوش ہو جائیں گے، اور اسی طرح سے آخرت میں اللہ تعالیٰ اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیت اُتری تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تو اس وقت تک خوش نہیں ہوں گا جس وقت تک میرا ایک اُمتی بھی جہنم میں ہوگا، اور اللہ نے وعدہ کرلیا ہے خوش کرنے کا، تو جس سے یہ اُمید لگتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضور ﷺ سفارش کر کے ساری اُمت کو چھڑا لیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ کو خوش کریں گے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت تک خوش ہوں گا نہیں جب تک میری اُمت کا ایک ایک فرد جنت میں نہ چلا جائے اور جہنم سے نہ نکل جائے، تو اس میں اُمتِ مسلمہ کے لئے بھی ایک بہت بڑی بشارت ہے اور بہت خوشی کی بات ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی کرلیا کہ یہ محنتیں مشقتیں ختم ہو جائیں گی، اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی ایسی نعمتیں رُوحانی جسمانی ظاہری باطنی دے گا دُنیا اور آخرت میں کہ آپ ﷺ بالکل خوش ہو جائیں گے۔

سَرورِ کائنات ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے چند اِحسانات کا ذِکر

آگے اُن اِنعامات کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر تو اللہ کی توجہ اِبتدا سے ہے، جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوبیت ڈالی، اور اس محبوبیت کے نتیجے میں فرعون جیسا دُشمن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مربی بن گیا، اور شاہی محلات میں اللہ تعالیٰ نے پرورش کروادی، اور جب موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جا رہا تھا فرعون کی طرف، سورۂ طٰہٰ کے اندر واقعہ مفصل آیا تھا، تو وہاں موسیٰ علیہ السلام نے کچھ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ یا اللہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں وہاں جاؤں اور وہ میری بات نہ سنے یا مجھے قتل کر دے، یہ اندیشہ مختلف آیات کے اندر ظاہر کیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی بھیجتے وقت اپنے پہلے احسان یاد دلائے تھے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى (سورۂ طٰہٰ: ۳۷) ہم تیرے پہ پہلے بھی ایسے احسان کر چکے ہیں، دیکھو! کس طرح سے تیری حفاظت کی جب تیری ماں نے اُٹھا کے دریا میں ڈال دیا تھا، پھر دُشمن نے پکڑ لیا تھا، تو ہم نے تیری کیسے حفاظت کی؟ تو جیسے بچپن میں ہم نے آپ کو خطرات سے نکالا اور ہلاکت سے بچایا اب اگر ہم اسی دُشمن کے پاس آپ کو بھیج رہے ہیں تو اب بھی ہم ہی حفاظت کریں

گے۔تو پچھلا احسان یاد دلا کے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا حوصلہ بڑھایا تھا فرعون کی طرف بھیجتے وقت، تو یہاں اسی طرح سے حضور ﷺ کو بھی پچھلے اِحسانات یاد دلائے جارہے ہیں۔

بچپن میں حضور ﷺ پر اِحسانات ِ اِلٰہی

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى: کیا تیرے رَبّ نے تجھے یتیم نہیں پایا؟ پھر ٹھکانا دیا۔اس میں آپ کے بچپن کی زندگی کی طرف آپ کو متوجہ کردیا گیا، تاریخ کی کتابوں میں آپ پڑھتے ہیں، سیرت کی کتابوں میں آپ نے مطالعہ کیا، کہ حضور ﷺ ابھی بطنِ مادر میں تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا تھا، آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ، سترہ یا اٹھارہ سال عمر تھی اُن کی جب ان کا انتقال ہوگیا، شادی ہونے کے بعد یہ پہلے ہی تو بچے تھے، اور یہ بھی ابھی ماں کے پیٹ میں تھے، پیدا نہیں ہوئے تھے، سفر پر گئے تھے، سفر میں جاتے ہوئے مدینہ منورہ میں ٹھہرے تھے، چونکہ وہاں رشتہ درایاں تھیں، وہیں انتقال ہوگیا، تو حضور ﷺ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے تو یتیم پہلے ہی ہوگئے۔ پیدا ہونے کے بعد پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ٹھکانا یہ دیا کہ دادے کو سرپرست بنادیا، ماں مہربان تھی، چھ سال تک ماں کی شفقت بھی رہی، اور دادے کا تعاون بھی رہا۔ چھ سال کی عمر تھی جب ماں بھی فوت ہوگئی، دونوں طرف سے ہی آپ ایک قسم کے یتیم ہوگئے۔ پھر دادے کو اللہ نے مہربان کردیا، آٹھ نو سال کی عمر تک دادا رہا، پھر چچے کو اللہ نے مہربان کردیا ابوطالب کو، اور اُبوطالب نے اولاد کی طرح پالا حتّٰی کہ جب حضور ﷺ نے نبوّت کا اظہار کیا اور سارے کے سارے مشرکین مقابلے میں آگئے تو یہ ابوطالب ہی تھے جو آپ کو سہارا دیتے تھے، نبوّت کے تقریباً اِبتدائی دس سال تک ابوطالب حضور ﷺ کے سرپرست رہے اور بعد میں ان کا انتقال ہوا، ابوطالب نے ہی آپ ﷺ کی شادی کی، پوری سرپرستی کی، اولاد کی طرح پالا، اب یہ چیز کوئی عجیب نہیں ہے کہ دادا سرپرست ہو، ماں شفقت کرے، چچا پالے، آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں، کیونکہ دادے کو تو پوتے پر شفقت ہوتی ہی ہے، چچے کو بھی بھتیجے سے محبت ہوتی ہی ہے، لیکن جس معاشرے میں رسول اللہ ﷺ کی تربیت اِن سے کروائی گئی اس معاشرے کی طرف دیکھتے ہوئے واقعی یہ اللہ کا بہت بڑا کرم تھا، اس معاشرے کی کیا کیفیت تھی، سورۂ فجر کے اندر آپ کے سامنے لفظ آیا تھا کہ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عام عادت تھی کہ لوگ یتیم کو ذلیل سمجھتے تھے، یتیم کا اِکرام نہیں کرتے تھے، اس کو کوئی عزّت کا مقام نہیں دیتے تھے، اور ایک لفظ آپ کے سامنے آئندہ سورتوں میں آنے والا ہے فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (سورۂ ماعون) یہی وہ شخص ہے جو کہ یتیم کو دھکے دیتا ہے، تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس معاشرے میں یتیم کو دھکے ہی پڑتے تھے، اور یتیم کو بے سہارا سمجھ کر ہر کوئی شخص اس کے حقوق سلب کرلیتا تھا، اور اس کی جائیداد اور دُوسری سب چیزیں جو تھیں وہ ہتھیا لیتا تھا، ایسے معاشرے میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی محبوبانہ تربیت کا انتظام کیا، کہ چچے نے بھی محبوب بنا کے رکھا، اس سے پہلے دادے نے محبوب بنا کے رکھا، حضور ﷺ کا اِکرام پورا پورا ہوا، کوئی ظاہری بات اس قسم کی نہیں آئی جس کو ہم کہہ سکیں کہ اُس معاشرے میں حضور ﷺ کی تذلیل کی گئی، یا تحقیر کی گئی، یا آپ کا اِکرام نہیں ہوا، یا کسی نے دھکے دیے، ایسی بات نہیں۔تو یہ اللہ کا بہت بڑا احسان تھا، دیکھو بچپن سے محبوبیت دے کر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے

کیسا ٹھکانا مہیا کیا، تو معلوم ہوتا ہے کہ تیری طرف تو اللہ تعالیٰ کی توجہ بچپن سے ہے، تو آپ کیسے سمجھتے ہیں کہ اب اس مقام پر پہنچا کے اللہ نے تجھے چھوڑ دیا۔

حضور ﷺ پر اللہ کے باطنی اِحسانات

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى: اس لفظ کو دیکھ لیجئے ''پایا تیرے رَبّ نے تجھ کو ضال پھر تجھے ہدایت دی، پھر تیری راہنمائی کی۔'' ضَآلًّا یہ ضَلَّ یَضِلُّ ضَلَالَۃً سے لیا گیا ہے، ضلالۃ کا ترجمہ عام طور پر کر دیا جاتا ہے گمراہی کے ساتھ، راہ گم کر لینا، گمراہ کو کہتے ہیں ضال، جو راہ کو گم کر بیٹھا ہو، ہماری زبان میں ضال کا لفظ، گمراہ کا لفظ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو دینی طور پر بے راہ ہو گیا ہو، اس کو کہتے ہیں یہ گمراہ ہو گیا، یہ معنی یہاں حضور ﷺ پر صادق نہیں آتا، نہ عربی میں یہ لفظ اس مفہوم کے ساتھ خاص ہے، یہ مفہوم بھی اس کا ہے کہ گمراہ کو کہتے ہیں، مَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ، جس کو اللہ گمراہ کر دے اس کی کوئی راہنمائی کرنے والا نہیں، تو یہ مفہوم بھی اس کا ہے، لیکن صرف یہ مفہوم نہیں، اور مفہوم بھی اس کے عربی میں آتے ہیں، اور یہ مفہوم سرورِ کائنات ﷺ پر صادق نہیں آتا کیونکہ آپ ﷺ دینی طور پر کسی وقت بھی گمراہ نہیں رہے۔ نعوذ باللہ۔ کہ آپ بُت پرستی میں لگ گئے ہوں، رُسومِ شرکیہ کو آپ نے اپنایا ہو، مشرکوں کی طرح جوئے اور شراب کے رسیا ہو گئے ہوں، یہ بالکل کوئی وقت بھی حضور ﷺ پر نہیں آیا، آپ ﷺ کی زندگی باوجود اس بات کے کہ اُس وقت کوئی علمی ماحول نہیں یا کوئی ایسی بات نہیں تھی اتنی صاف ستھری ہے کہ سورۂ یونس میں آپ کے سامنے گزرا کہ آپ نے اپنی اِس زندگی کو لوگوں کے سامنے بطور چیلنج کے پیش کیا ہے لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ (آیت: ۱۶) اس سے قبل میں تمہارے اندر بڑی عمر گزار چکا ہوں، تم میری زندگی کے کسی دِن کے اُوپر، کسی وقت کے اُوپر کوئی اُنگلی تو رکھو کہ جس دِن، یا جس وقت میں نے کوئی غلطی کی ہو، اور تم کہہ سکو کہ آج اللہ کے پیغمبر بن گئے ہو؟ کل تم یہ کرتے تھے، میں تمہارے اندر ایک عمر گزار چکا ہوں اور کافی سال تمہارے اندر رہ چکا ہوں، تو جو شخص اس طرح سے مخالف ماحول میں کھڑا ہو کے اپنی عمر کو بطور آزمائش کے پیش کرتا ہے کہ لو! میری پچھلی زندگی دیکھو، اور میری پچھلی زندگی دیکھ کے تم بتاؤ کیا مجھے کسی زمانے میں جھوٹ بولنے کی عادت رہی ہے؟ میرے دِل کے اندر کوئی دُنیا کی طمع رہی ہے؟ میں کوئی ایسا غلط کار تھا؟ جو تمہیں تعجب ہے کہ آج یک دَم یہ اللہ کا رسول کیسے بن گیا۔ اس لئے دِینی طور پر گمراہی کا کوئی تصور سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں نہیں کیا جاسکتا، کہ ہم یہ کہیں کہ آپ گمراہ تھے اللہ نے آپ کو ہدایت دے دی۔ اس لیے ضَلَّ یَضِلُّ کا معنی جس طرح سے دِینی طور پر بھٹک جانا ہے اسی طرح سے راستہ گم کر لینا، بے خبر ہونا، یہ بھی اس کا مفہوم آتا ہے، جس طرح ایک آدمی ایک چوراہے پر کھڑا ہو، حیران ہے پریشان ہے کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں، تو اس کے متعلق بھی بولا جاتا ہے ضَلَّ الطَّرِیْقَ کہ یہ راستے سے بھٹکا ہوا ہے، راستہ اس کو معلوم نہیں، یہ حسی طور پر جس طرح سے ہوتا ہے، یہاں اصل مفہوم یہی ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کی فطرتِ صحیحہ تقاضا کرتی تھی، اُبھرتی تھی کہ میں اپنے خالق مالک کو اچھی طرح سے پہچانوں اور اس کی عبادت کروں، اور زندگی اس کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق گزاروں، لیکن حضور ﷺ کے سامنے کوئی روشنی نہیں تھی کہ جس سے یہ تفصیلات حضور ﷺ معلوم کر لیں، طبیعت میں ایک لگن تھی، بُت پرستی سے نفرت تھی،

مشرکانہ طور طریق سے دُوری تھی، اُس کو حضور ﷺ اِختیار نہیں کر سکتے تھے، لیکن پھر کریں کیا؟ ان چیزوں کو فطرت قبول نہیں کرتی، اور جدھر کو فطرت جاتی ہے اس کی آگے تفصیلات نہیں ہیں، تو یہ پریشانی تھی جس کے نتیجے میں حضور ﷺ اکثر کھوئے کھوئے رہتے تھے، غاروں میں جا کے وقت گزارتے، تنہائیوں میں رہتے، انہی چیزوں کو سوچتے ہوئے کہ کیا کروں، جو کچھ دُنیا میں طریقہ چلا ہوا ہے یہ تو غلط ہے، یہ تو قبول کرنے کا ہے نہیں، اب صحیح طریقہ زندگی گزارنے کا کیا ہے؟ اپنے خالق، مالک کو کس طرح پہچانا جائے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کی صفات کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کی عبادت کس طرح سے ہو؟ یہ فکر تھا حضور ﷺ کو جو ہر وقت علیحدہ علیحدہ رہتے، پھر غاروں میں وقت گزارنے لگ گئے، یہی فکر طاری رہتا تھا، اِسی فکر کی کیفیت کو اور اِسی سراسیمی کو ضلالت کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہ آپ ناواقف تھے، آپ کے سامنے کوئی معلومات نہیں تھیں، واقفیت نہیں تھی، کتنا اللہ نے احسان کیا کہ تمہیں راہنمائی دے دی اور سارے کے سارے طریقے تمہارے سامنے واضح کر دیے۔ اس لئے اِس کا صحیح ترجمہ ہوگا کہ کیا تیرے رَبّ نے تجھے ناواقف نہیں پایا کہ پھر واقف کر دیا، یہ جو ناواقفی کی کیفیت ہے جس کو دُوسری جگہ قرآنِ کریم میں ذِکر کیا گیا مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (سورۂ شوریٰ: ۵۲) تجھے پتا ہی نہیں تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے اور کتاب کیا ہوتی ہے، تو یہ جو خالی الذہن آدمی کسی طلب کے اندر پریشان سا ہوتا ہے، وہ جاننا چاہتا ہے کسی چیز کو، لیکن جاننے کا ذریعہ کوئی نہیں، یہ کیفیت جو ہے اس کو یہاں ضَآلًّا سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ آپ کو ایسا ناواقف پریشان پایا کہ آپ کوئی راستہ معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی سراغ نہیں لگتا تھا، فَهَدٰى: پھر اللہ نے تیری راہنمائی کی، تیرے سامنے راستہ واضح کر دیا۔

اللہ نے آپ کو ظاہراً اور باطناً غنی کر دیا

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى: اور آپ کو اللہ نے محتاج پایا، تیرے رَبّ تجھے محتاج پایا پھر تجھے غنی کر دیا۔ احتیاج ظاہری بھی تھا کہ والد کوئی جائیداد چھوڑ کے نہیں گئے تھے، آپ کوئی سرمایہ دار گھرانے کے نہیں تھے، اللہ نے آپ کو غنی کر دیا، پہلے دادے چچے کی سرپرستی رہی، اور پھر اس کے بعد خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جو کہ مکہ معظمہ کی ایک مال دار عورت تھی اس کے آپ معاون ہو گئے، اس کا مال تجارت پہ لے جانے لگ گئے، اس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاش کی وسعت کی، پھر اس عورت نے آپ سے شادی کر کے اپنا پورا مال ومتاع جتنا تھا آپ کے سپرد کر دیا، یہ ظاہری طور پر بڑا غنا حاصل ہو گیا، لیکن باطنی غنا بھی اسی طرح سے ہے، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دِل میں جو غنا ڈالا باطنی دولت کے ساتھ اس کا تو کوئی کیا ہی اندازہ کر سکتا ہے، تو یہ دونوں قسم کے غنا اس سے مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ اصل غنا غنائے قلب ہے۔ جیسے فارسی میں آتا ہے:

تونگری بدل است نہ بمال بزرگی بعقل است نہ بسال

اصل کے اعتبار سے غنا قلب کا غنا ہے۔ تو ایک احتیاج تھا ظاہری طور پر کہ مال اسباب نہیں تھے، علم وحکمت بظاہر آپ کو حاصل نہیں تھی، تو اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت کے خزانے دے کر باطنی طور پر غنی کر دیا، اور ظاہری رزق کے اسباب دے کر ظاہری طور پر آپ کو غنی کر دیا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ایسے اِنعامات ہیں جو اِبتدا میں آپ پر ہوئے، ان کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنے

مہربان ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے اُوپر، کتنی توجہ ہے ابتدا سے، تو اس کے متعلق آپ ﷺ کے دل میں یہ وسوسہ کیوں آتا ہے یا دُوسرے کو یہ کہنے کا کیسے حق پہنچتا ہے کہ ان کے رَبّ نے چھوڑ دیا یا ناراض ہوگیا۔

سَرورِکائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین اَحکام

اس کے بعد اب یہ اَحکام دیے جارہے ہیں: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ: پس آپ بھی یتیم پر قہر نہ کیجئے، قہر کا معنی ہوتا ہے کسی کو دبا دینا زور ڈال کے، کوئی یتیم آپ کے سامنے آجائے تو آپ کمزور سمجھ کے اس کے حقوق غصب نہ کریں، اس کے اُوپر کوئی کسی قسم کی زیادتی نہ کریں، بلکہ جس طرح سے آپ یتیم تھے اور اللہ کی عنایات آپ پر رہیں، اس کے شکریے کے طور پر آپ بھی یتیم کی سرپرستی کریں، ''پس یتیم پس آپ اس کے اُوپر قہر نہ کریں'' اس کو دبائیں نہ، کمزور سمجھ کر اس کے اُوپر زور نہ ڈالیں، اس کو مغلوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ: اور کوئی سوال کرنے والا آپ کے پاس آجائے، چاہے وہ ظاہری مال کے متعلق سوال کرے، چاہے کسی باطنی دولت کے متعلق سوال کرے، تو آپ اس کو جھڑکیں نہیں بلکہ اس پر شفقت کریں، دینے کے لئے ہے تو دے دو، نہیں تو نرم بات کہہ کے ٹال دو، سائل کو جھڑکنا ٹھیک نہیں ہے، ''آپ اُس کو نہ جھڑکیے''، اللہ تعالیٰ نے جس طرح سے آپ کو غنا دیا، آپ محتاج تھے، تو اسی طرح سے کوئی محتاج آپ کے سامنے آجائے، چاہے وہ ظاہری دولت کا محتاج ہو چاہے باطنی دولت کا محتاج ہو، آپ سے کوئی آکر پوچھے، باطنی دولت کا محتاج تو علم وحکمت کے متعلق سوال کرتا ہے، بسا اوقات سوال کرنے والا بڑا کج سا آدمی ہوتا ہے، وہ بڑے ٹیڑھے سوال کرتا ہے، تو آپ گھبرائیں نہیں، نرمی کے ساتھ جواب دیں، جھڑکنے کی کوشش نہ کریں، لَا تَنْهَرْ: مت جھڑکیے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ: اور اپنے رَبّ کے احسان کو بیان کرتے رہیے، یہ بھی شکرگزاری کا ایک طریقہ ہے کہ جو احسان آپ پر آپ کے رَبّ نے کیا ہے اس کی تحدیث کیجئے، اس کو بیان کیجئے، شکرگزاری کا ایک یہ بھی طریقہ ہے خیال کرلیجئے...... اللہ تعالیٰ کا جو احسان انسان پر ہو اس کو زبان پر بھی لانا چاہیے کہ اللہ کا شکر ہے اس نے ہمیں یہ نعمت دی، یوں فخر کے طور پر کہنا کہ میں ایسا ہوں، یہ تو بری بات ہے، میرے پاس بڑا مال ہے، یہ تو بہت بری بات ہے۔ اللہ کے شکر کے طور پر، تحدیث بالنعمت کے طور پر کہنا کہ اللہ کا شکر ہے اس نے کھانے کے لئے بہت دے رکھا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے پہننے کے لئے کپڑا بہت دے رکھا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے صحت دے رکھی ہے، اللہ نے عزت دی، اللہ نے علم دیا ہے، اللہ نے یہ کیا۔ تو تحدیث بالنعمت کے طور پر اللہ کے احسانات کا تذکرہ کرنا یہ بھی شکر کا شعبہ ہے، بعینہٖ اسی طرح سے اگر کسی انسان کا انسان پر احسان ہو تو حدیث شریف کے اندر ذکر کیا گیا ہے کہ اُس کا تذکرہ کرنا یہ بھی شکرگزاری کا شعبہ ہے، آپ پر کسی نے احسان کیا ہے، ''مَنْ کَتَمَ فَقَدْ کَفَرَ''(۱) اگر کوئی شخص دُوسرے کے احسان کو چھپاتا ہے، پتا نہیں چلنے دیتا کہ میرے اُوپر کسی نے احسان کیا ہے تو یہ ناشکری ہے، یہ شکرگزاری نہیں ہے، ہاں! البتہ کسی نے آپ پر احسان کیا تو اس کا اظہار کیجئے، اپنے ساتھیوں میں، اپنے دوستوں میں، اپنے ماحول میں ذکر کیجئے کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ اچھا سلوک کیا ہے، یہ بھی شکرگزاری کا ایک طریقہ ہے۔ احسان کرنے

(۱) ترمذی ۲/ ۲۳ باب ما جاء فی المتشبع بما لم یعطہ / مشکوۃ ۱/ ۲۶۱ باب العطایا سے اگلا باب، فصل ثانی۔

والے کو تو چھپانا چاہیے، وہ لوگوں کو نہ بتائے کہ میں نے احسان کیا ہے، لیکن جس پر احسان کیا گیا ہے اس کا اظہار یہ شکر کا شعبہ ہے، اور اپنے محسن کی لوگوں کے سامنے تعریف کرنا اور اس کے احسان کا اظہار کرنا یہ ہے شکر، اور اس کا کتمان کرنا انکار کرنا چھپانا کہ کسی کو پتا نہ چلے یہ ہے ناشکری، اس لئے محسن کی تعریف مطلوب ہے، یہ بھی تحدیث بالنعمت کے اندر داخل ہے، شکر گزاری کا ایک شعبہ ہے، "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ"(۱) اس کا معنی بھی یہی ہے، کہ جو انسانوں کا شکر گزار نہیں جن انسانوں کی وساطت سے اس کو اللہ کی نعمت حاصل ہوئی ہے، وہ براہِ راست اللہ کا شکر گزار کبھی بھی نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اللہ کی نعمت جن واسطوں کے ساتھ آپ کو حاصل ہوئی ہے آپ ان واسطوں کے بھی شکر گزار رہیے، وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ: اپنے رَبّ کے احسان کو بیان کرتا رہا کر، اس کو بیان کیا کر، بتایا کر، تحدیث: بیان کرنا، یہ ہے ان آیات کا مفہوم۔

مذکورہ تین اَحکام کی تین اِنعامات کے ساتھ مناسبت اور "حدیث" کی وجہِ تسمیہ

اب آپ دیکھیے کہ یہاں تین حکم دیے گئے ہیں، اَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ...... اَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ اس کی مناسبت تو بالکل واضح ہے اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى کے ساتھ ہے، اور وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ اس کی مناسبت وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى کے ساتھ ہے لف ونشر غیر مرتب کے طور پر، اگر یہاں غنا سے غنائے مال مراد لیا جائے اور سائل سے وہی مال مانگنے والا مراد لیا جائے تو اِس کی مناسبت اس جملے کے ساتھ واضح ہے، اور وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ یہ جڑ جائے گا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے ساتھ، کہ آپ کو ناواقف پایا پھر اللہ نے آپ کو واقفیت دی، آپ کی ناواقفیت تھی دِینی معاملات میں، کہ اللہ کی صفات کیا ہیں، صفات کے تقاضے کیا ہیں، اللہ کو راضی کرنے کے طریقے کیا ہیں، کن باتوں سے اللہ ناراض ہوتا ہے، یہ تھی آپ کی ناواقفیت جس سے آپ پریشان تھے، اور هَدٰى کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ سب کچھ آپ کو بتادیا، اپنی ذات کا تعارف کرایا، صفات کا تعارف کرایا، صفات کے تقاضے بتائے، اپنے اَحکام نمایاں کیے، مرضیات بتائیں، منکرات بتائیں، جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ چیزیں ہیں وہ بتائیں، تو اس طرح سے حضور ﷺ کو اللہ نے واقف کردیا، جس کو ہم تعبیر کریں گے اس بات کے ساتھ کہ علمِ دِین اللہ نے جو دِیا ہدایت کا مصداق یہ ہے، اور ضلالت کا مطلب یہ ہے کہ ناواقفیت تھی، دِین کی تفصیل آپ کے سامنے نہیں تھی مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (سورۂ شوریٰ: ۵۲)، تجھے پتا ہی نہیں تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہوتا ہے، تو ہدایت جو اللہ کی طرف سے آئی وہ دِینی معلومات ہیں، اور وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ: اِس نعمتِ رَبّ سے مراد بھی یہی دِینی معلومات ہیں جو حضور ﷺ کو دی گئیں، یہاں نعمتِ رَبّ کا مصداق خصوصیت کے ساتھ ان دِینی معلومات کو قرار دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی تھیں، جس سے آپ کی ناواقفیت والی پریشانی ختم ہوئی، اِس دِینی نعمت کو، اِس ہدایت کو، اِن دِینی معلومات کو پھیلانے کے لئے فَحَدِّثْ کا اَمر ہے، کہ ان کو آپ بیان کیجئے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی زبان سے جتنی دِین کی تفصیل کی ہے، عبادت کرنے کے طریقے بتائے، نماز کے، روزے کے، زکوۃ کے، حج کے، اور باقی جتنے بھی طریقے بتائے ہیں وہ سب اُس ہدایت کی تفصیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ

(۱) ترمذی ۱۷/۲ باب ما جاء فی الشکر۔ مشکوٰۃ ۲۶۱/۱ باب العطایا سے اگلا باب، فصل اول۔

کو دی تھی، اس لئے حضور ﷺ کی بیان کردہ چیزوں کو لفظ ''حدیث'' سے تعبیر کیا جاتا ہے چونکہ یہاں اَمر کا صیغہ فَحَدِّثْ آیا ہوا ہے، تو حضور ﷺ کے اقوال کو ''حدیث'' کیوں کہتے ہیں؟ اُس کی ایک وجہ مناسبت یہ بھی ہے، کہ ''حدیث'' اصل میں اسی نعمتِ رَبّ کی تفصیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی تھی، تو اُسی کی تفصیل اور اس کے بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے لفظ فَحَدِّثْ استعمال کیا، اس فَحَدِّثْ کی وجہ سے آپ کی بیان کردہ باتیں ''حدیث'' کہلاتی ہیں، ایک مناسبت لفظ ''حدیث'' کی حضور ﷺ کے اقوال کے ساتھ یہ بھی بتائی گئی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

آیاتھا ۸ — ۹۴ سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ ۱۲ — رکوعہا ۱

سورۂ اِنشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳

کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟ ۝۱ اور ہم نے اُتار دیا آپ سے آپ کا بوجھ ۝ جس نے آپ کی کمر توڑ دی تھی ۝

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶

اور اُونچا کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذِکر کو ۝ پس بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۝ بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۝

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝۷ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸

پھر جس وقت آپ فارغ ہو جائیں تو آپ مشقت اُٹھائیں ۝ اور اپنے رَبّ کی طرف ہی رغبت کریں ۝

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ انشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں۔ پچھلی سورت سورۂ والضحیٰ میں سرورِ کائنات ﷺ پر کچھ احسانات ذکر کیے گئے تھے، اور کچھ آپ کے حال کے متعلق پیش گوئی کی گئی تھی، اور کچھ اَحکام دیے گئے تھے، اور یہ سورت بالکل اُس سے ملتی جلتی ہے، اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ پر احسان کو نمایاں کیا ہے اور ساتھ ایک پیش گوئی ہے اور ایک حکم بھی دیا ہے۔

خلاصۂ آیات

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ: کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟ اِستفہام کے ساتھ یہ چیز ذکر کی جارہی ہے کہ کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ: اور آپ سے آپ کا بوجھ گرا نہیں دیا؟ مفہوم کے اعتبار سے اگر اس وَضَعْنَا کو اِستفہام کے نیچے لائیں تو پھر اسی طرح سے ترجمہ کیا جائے گا جیسے میں نے کیا ہے، یہ مفہوم کے اعتبار سے ہے، ورنہ لفظی طور پر وَضَعْنَا چونکہ صیغہ مثبت کا آگیا تو ترجمہ یوں ہوگا "اور ہم نے اُتار دیا آپ سے آپ کا بوجھ"۔ اور پیچھے اَلَمْ نَشْرَحْ میں اِستفہام وہ بھی تقریر کے لئے ہی ہے، تو جس سے مطلب دونوں جملوں کا متناسب یوں نکلے گا کہ ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کھول دیا اور آپ سے آپ کا بوجھ گرا دیا۔ اور اگر یوں ادا کرنا چاہیں کہ کیا ہم نے آپ کا سینہ آپ کے لئے نہیں کھول دیا؟ اور آپ سے آپ کا بوجھ نہیں گرا دیا؟ تو بھی مفہوم آپس میں برابر ہو جاتا ہے۔ اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ: اور گرایا ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ جس نے کہ آپ کی کمر توڑ دی تھی، اِنقاضِ ظہر، جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی، وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ: اور اُونچا کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو، فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا: پس بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا: بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے، "نُورالانوار" (عام کی بحث) میں آپ نے پڑھا کہ معرفہ کا تکرار معرفہ کے ساتھ ہو تو ثانی عین اُولی ہوتا ہے، اور نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ ہو تو ثانی غیر اُولی ہوتا ہے، تو ان دونوں آیتوں میں اَلْعُسْر تو دونوں جگہ معرفہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ جو مصداق پہلے عُسر کا ہے وہی مصداق دُوسرے عُسر کا ہے، اور یُسْرًا دونوں آیتوں میں نکرہ آیا ہے تو یسر کا مصداق جو پہلی آیت میں ہوگا دُوسری آیت میں وہ مصداق نہیں بلکہ اور ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک عُسر کے ساتھ دو یسر ہیں، اِسی کو وہاں ایک شعر کا حوالہ دے کر ملا جیون نے بات واضح کی تھی:

اِذَا اشْتَدَّتْ بِكَ الْبَلْوٰی فَفَكِّرْ فِیْ اَلَمْ نَشْرَحْ   فَعُسْرٌ بَیْنَ یُسْرَیْنِ اِذَا فَكَّرْتَهٗ فَافْرَحْ

کہ جب تجھے کوئی مصیبت، آزمائش آجائے تو اَلَمْ نَشْرَحْ میں غور کیا کر، وہاں ایک عُسر دو یسر کے درمیان میں ہے، تو جب تو یہ سوچے گا خوش ہو جائے گا، کہ اگر اللہ تعالیٰ تنگی دیتے ہیں تو تنگی کے آگے پیچھے اللہ کی طرف سے کشادگی کا وعدہ بھی ہے، اِذَا فَكَّرْتَهٗ فَافْرَحْ جب تو اس میں غور کرے گا تو خوش ہو جائے گا، تو یہ اِسی اصول کے مطابق ہے کہ اَلْعُسْر اَلْعُسْر یہ معرفہ ہے، تکرارِ معرفہ جس وقت ہو تو ثانی عین اُولی ہوتا ہے، تو دونوں جگہ عُسر کا مصداق ایک ہوا، اور یُسْرًا یُسْرًا دونوں جگہ نکرہ آیا ہوا ہے، اور جس وقت نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ ہو تو ثانی غیر اُولی ہوتا ہے، تو ایک عُسر کے ساتھ دو مختلف یسر آگئے۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ: پھر جس وقت آپ فارغ ہو جائیں تو پھر آپ محنت کریں، فَانْصَبْ مشقت اُٹھائیں، وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ: اور آپ اپنے رَبّ کی طرف رغبت کریں، اُسی کی طرف ہی مائل ہو جائیں، اُسی سے لو لگالیں۔ یہ ہے ترجمہ اس سورت کا۔

تفسیر

حضور ﷺ کے شقِ صدر کے چار واقعات

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ: کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟ اس شرحِ صدر سے کیا مراد ہے؟ ایک ہے سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا شقِ صدر کا، تو شقِ صدر اور شرحِ صدر ایک چیز ہے یا دونوں کے مصداق علیحدہ علیحدہ ہیں؟ شقِ صدر کا معنی سینے کا کھولنا، سینے کا پھاڑنا حسی طور پر سینے کا چیر دینا، حضور ﷺ کی زندگی میں یہ واقعہ بھی چار دفعہ پیش آیا جیسے کہ روایات میں موجود ہے۔

۱- ایک دفعہ بچپن میں جس وقت آپ ﷺ ابھی اپنی مرضعہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے بچپن میں، تو جبریل آئے، بچوں کے ساتھ آپ کھیل رہے تھے، تو آپ کو پکڑ کر لٹا یا اور سینہ کھولا، اور کھول کے اندر سے کوئی چیز نکالی، اور پھر اسی طرح سے اس کو سی دیا، بچے ڈر کے بھاگ گئے، جا کے اطلاع دی: اِنَّ مُحَمَّدًا قَدۡ قُتِلَ! حلیمہ سعدیہ اور ان کے گھر والے دوڑے ہوئے آئے، جب آ کے دیکھا تو حضور ﷺ کا رنگ اُڑا ہوا تھا، جس طرح سے کوئی بہت ہیبت زدہ بچہ ہوا کرتا ہے، تو اس واقعے سے متاثر ہو کے حلیمہ سعدیہ جلدی سے ان کو واپس کر آئی تھیں ان کی والدہ کے پاس، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنات کا یا ایسا کوئی اثر ہو جائے، اور کل کو ان کا کوئی جانی نقصان ہو جائے، ذمہ داری میرے پر آئے گی، تو یہ ڈر کر جلدی سے واپس کر آئی تھیں، تو یہ بچپن کے اندر شقِ صدر ہوا تھا۔

۲- پھر جب آپ کی عمر دس سال کی تھی، بالغ ہونے والے تھے، اس وقت شقِ صدر ہوا۔

۳- اور پھر جس وقت نزولِ وحی ہونے والا تھا غارِ حراء میں، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی شقِ صدر ہوا۔

۴- اور چوتھی دفعہ جس وقت آپ ﷺ معراج پر تشریف لے جانے والے تھے، جبریل علیہ السلام آئے اور وہیں مکہ معظمہ میں آپ کا سینہ کھولا گیا۔

شقِ صدر میں حکمتیں

اور ہر دفعہ کوئی چیز اندر سے نکالی گئی اور کوئی چیز بھری گئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جیسے معراج کی روایت میں آتا ہے کہ ایمان کے ساتھ اور اعتماد کے ساتھ دل کو بھر دیا گیا۔ اسی طرح سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت بچپن میں شقِ صدر کر کے دل سے وہ جذبات نکال دیے جس قسم کے جذبات بچوں کے ہوا کرتے ہیں، اور بچے ان جذبات کے تحت کچھ نازیبا حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جو اعلیٰ معیار سے گری ہوئی ہوتی ہیں، تو رسول اللہ ﷺ سے وہ جذبہ نکال دیا گیا جس کی بنا پر بچے بچگانہ حرکتیں کیا کرتے ہیں، تو آپ ﷺ کی طبیعت کے اندر سنجیدگی آ گئی۔ جوان ہونے لگے تو وہ جذبات نکال دیے گئے جن جذبات کی بنا پر جوان کچھ ایسی حرکتیں کر لیتے ہیں کہ جو موزوں نہیں ہوتیں، نامناسب ہوتی

ہیں، اُن اثرات سے بچانے کے لئے وہ جذبات خارج کردیے گئے۔ اور جس وقت نبوّت آنے لگی تھی تو تا کہ تحمّل ہوجائے اللہ تعالیٰ کے انوار اور تجلیات کا، اُس وقت دل کے اندر کوئی چیز بھری گئی۔ اور جب عالمِ آخرت کی طرف جانے لگے تھے معراج کی صورت میں، تو آخرت کے واقعات کا تحمّل پیدا کرنے کے لئے حضور ﷺ کے اندر قوت ڈالی گئی، اور آپ کے دِل کے اندر کوئی معنوی چیز ڈالی گئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ یہ شقِ صدر کا واقعہ حضور ﷺ کے ساتھ پیش آیا، حسی طور پر آپ کا سینہ کھولا گیا اور دِل نکالا گیا، دِل نکال کے اس کے اندر سے کوئی چیز نکالی گئی اور کوئی چیز بھری گئی، یہ واقعہ حسی طور پر تھا، اس لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سلائی کے نشان، اثرِ مخیط، سُوئی کے ساتھ جس طرح سے ٹانکا لگایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ ٹانکوں کے نشان حضور ﷺ کے سینے پر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ یہ واقعہ حسی طور پر پیش آیا تھا اور اس کا نشان بھی تھا، یہ ہے شقِ صدر۔ تو یہ واقعہ تو صحیح روایات سے ثابت ہے حضور ﷺ کے سینے کے کھولے جانے کا اور دِل کے آپریشن کا، کسی چیز کے نکالنے کا اور کسی چیز کے ڈالنے کا، اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت یہ واقعہ پیش آیا۔

''شرحِ صدر'' کا مصداق ''شقِ صدر'' ہے یا کوئی اور؟

لیکن مفسرین رحمہم اللہ عام طور پر کہتے ہیں کہ ''شرحِ صدر'' سے وہ واقعہ مراد نہیں ہے، ''شرحِ صدر'' ایک معنوی چیز ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت فرعون کی طرف جانے لگے تھے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور اس کو جا کر یہ وعظ کرو، تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دُعا کی تھی وہ یہی ہے رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ: اے اللہ! میرا سینہ کھول دے، وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ: میرا اَمر میرے لئے آسان کردے، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ: اور میری زبان سے بندش دُور کردے، یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ: تا کہ وہ لوگ میری بات کو سمجھیں (سورہ طٰہٰ: ۲۵ تا ۲۸)، تو ''شرحِ صدر'' کی دُعا فرمائی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے۔ اور اسی طرح سے قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے گزرا مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (سورۂ اَنعام: ۱۲۵) اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں تو اس کے سینے کا ''شرحِ صدر'' کردیتے ہیں اسلام کے لئے۔ تو یہ ''شرحِ صدر'' جو ہے، اس کا معنی ہوتا ہے دِل کے اندر حوصلہ پیدا کردینا، ایک گھٹن جو طبیعت کے اندر ہوتی ہے اُس کو دُور کردینا، اپنے پروگرام کے اُوپر پوری طرح سے کامل اعتماد پیدا کردینا، اور جس قسم کی اُلجھنیں ہوا کرتی ہیں وہ ساری کی ساری دُور کردی جائیں، اس کو کہتے ہیں کہ ''مجھے اس معاملے میں شرحِ صدر ہوگیا، کوئی اُلجھن باقی نہیں رہی، جو کچھ میں سمجھنا چاہتا تھا میری سمجھ میں آگیا، جو رُکاوٹیں محسوس ہوتی تھیں وہ دُور ہوگئیں، دِل کی گھٹن اور دِل کا انقباض زائل ہوگیا'' اس کو ''شرحِ صدر'' کہتے ہیں۔ تو یہاں حضور ﷺ کے ''شرحِ صدر'' کا مطلب یہ ہوا جس طرح سے پچھلی سورت میں آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی فطرتِ صحیحہ کے طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہتے تھے، طریقے معلوم نہیں تھے، اور اپنی قوم کی بُری حالت دیکھ کر ہر وقت کڑھتے تھے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان کی اصلاح کس طرح سے کروں؟ یہ ایک گھٹن تھی جو طبیعت کے اُوپر طاری رہتی تھی، قوم شرک میں مبتلا تھی، بتوں کو پوجتے

تھے، ظلم کرتے تھے، شرابیں پیتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، اولاد کو قتل کرتے تھے، کیا کیا قباحت تھی جو اُس وقت موجود نہیں تھی، بہت ساری قباحتیں اس وقت موجود تھیں، تو ان چیزوں کو دیکھ کر آپ ﷺ کی طبیعت میں جو ایک اِنقباض اور ایک گھٹن طاری ہوتا تھا، اس خیال سے کہ میں اس کی اصلاح کس طرح سے کروں؟ یہ قوم کس طرح سے سمجھائی جاسکتی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے جس وقت آپ کے اُوپر وحی اُتاردی دونوں قسم کے اِنقباض آپ کے دُور ہوگئے، دِل کے اندر جذبہ تھا اللہ کی عبادت کا، اس کا طریقہ بھی کھول کھول کر بتادیا گیا، اور قوم کی اصلاح کے لئے بھی پروگرام دے دیا گیا کہ توحید، رسالت اور عقیدۂ آخرت یہ چیزیں ہیں جس کے ساتھ قوم کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ تو آپ کو جو پروگرام دیا گیا، جو چیزیں آپ کے سامنے واضح کی گئیں، ان کے اُوپر پورا اطمینانِ قلب اور پورا اِعتماد، اور جس طرح سے ایک راستہ روشن ہوگیا ہو اس طرح سے وہ راستہ آپ کے سامنے نمایاں ہوگیا، اسی کو "شرحِ صدر" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تبلیغ کے اندر جو مشکلات پیش آنے والی تھیں، رُکاوٹیں پیش آنے والی تھیں، اُن کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کردیا گیا، تو ضِیق، تنگی، گھٹن جو بھی دِل میں تھی سب کا ازالہ ہوگیا، تو یہ معنوی "شرحِ صدر" ہے۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ جب کسی کا مقدر اچھا کردیتے ہیں تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں، تو اس کے سینے میں اسلام کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے، اس کو اِسلام کے اُوپر پورا پورا اِعتماد آجاتا ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ایک ایک بات سچی ہے اور اس کی ایک ایک بات دُنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے، یہ اطمینان حاصل ہوجائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندے کے متعلق ہدایت کے اِرادے کی علامت ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دُعا کی تھی اللہ تعالیٰ کے سامنے کہ میرا سینہ کھول دیجئے، اس کا بھی یہی معنی تھا کہ میں اتنے بڑے جابر اور اتنے بڑے ظالم کے سامنے جو جارہا ہوں تو دِل میں جس طرح سے ایک ہیبت، یا دباؤ، یا گھٹن ہے، اِس کا اِزالہ کردیجئے تاکہ میں اپنے کام کو خوب اچھی طرح سے حوصلے کے ساتھ کروں اور میرے سامنے کوئی کسی قسم کا اِنقباض یا گھٹن نہ ہو، دِل کھلا ہوا ہو، اچھی طرح سے میں اپنی بات کو اعتماد کے ساتھ ادا کرسکوں اور آنے والی رُکاوٹوں سے گھبراؤں نہ، اِسی قسم کے "شرحِ صدر" کا مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ اور یہ نعمت جو موسیٰ علیہ السلام نے مانگی تھی یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو وافر مقدار میں عطا فرمائی، اُسی احسان کو یہاں ذِکر کیا جارہا ہے کہ کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟

اِصلاحِ اُمّت کا بوجھ ہلکا ہوگیا

"اور ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ گرادیا جس نے آپ کی کمر ٹیڑھی کررکھی تھی، کمر توڑ رکھی تھی" نقض توڑنے کو کہتے ہیں، کمر توڑ رکھی تھی، یہ آج کل ہم بھی ایک محاورہ استعمال کیا کرتے ہیں، جب انسان پر ایک بہت ساری ذمہ داری پڑ جائے اور انسان یہ سمجھتا ہو کہ یہ ذمہ داری مجھ سے نبھے گی نہیں، تو ایسا ہوتا ہے جیسے اس بوجھ سے کمر ٹوٹی جارہی ہے، یہ بھی ایک معنوی کیفیت ہوتی ہے، حسی طور پر بھی اُس کا اثر انسان اپنے کندھوں پر، اپنے سر پر، اپنی کمر پر محسوس کرتا ہے جب کوئی ذمہ داری اس کے اُوپر ڈال دی

جاتی ہے۔ تو یہی بوجھ تھا حضور ﷺ کے اُوپر جو اِصلاحِ اُمت کا، اِصلاحِ قوم کا پڑا ہوا تھا، اور اِس میں آپ ﷺ بہت فکر مند رہتے تھے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کامیابی کی صورت نمایاں ہوگئی اور آپ کا حوصلہ بڑھ گیا اور کامیابی کے آثار نظر آنے لگ گئے تو وہ بوجھ بھی آپ ﷺ کی طبیعت سے ہلکا ہوگیا، یہ بوجھ بھی اُتار دیا گیا۔

بوجھ ہلکا ہونے کے مزید دو مفہوم

اور یہ بھی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کبھی کوئی اپنی صواب دید سے کام کر لیتے اور بعد میں معلوم ہوتا کہ یہ خلافِ مصلحت ہے، تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ چونکہ تعلق بہت قوی تھا تو ایسا کوئی کام آپ سے ہو جائے، آپ کریں اچھے جذبہ کے تحت، لیکن نتیجۃً معلوم ہو کہ یہ کام ٹھیک نہیں ہوا، جس کو صورۃً ذنب کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے مختلف آیات میں، اُن کا پھر فکر اتنا ہوتا تھا کہ بالکل آپ کی کمر ٹوٹتی جارہی تھی اور طبیعت پر بوجھ پڑ جاتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے جس وقت یہ بات بتادی کہ آپ کے اگلے پچھلے ہم نے سب گناہ معاف کر دیے تو اس سے بھی بوجھ ٹل گیا، یہ فکر بھی جاتا رہا، تو گویا کہ ذنوب کے معاف ہونے کا اعلان ایک تو سورۂ فتح میں ہوا، ایک اِس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ آپ کی طبیعت پر جو یہ بوجھ ہے کہ فلاں کام مجھ سے ہوگیا، نہیں ہونا چاہئے تھا، خلافِ اَولیٰ، خلافِ مصلحت، تو ہم نے وہ بوجھ آپ سے گرا دیا جس کے نیچے آپ دبے جارہے تھے، یہ بھی اِس کا مفہوم ہے، چنانچہ حضرت شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ ''وحی کا اُترنا اوّل سخت مشکل تھا پھر آسان ہوگیا، یا منصبِ رسالت کی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے خاطر شریف پر گرانی گزرتی ہوگی وہ رفع کر دی گئی (یعنی بوجھ کے اُٹھانے کا ایک یہ مطلب بھی ہوا کہ وحی کے ثقل میں درجہ بدرجہ کمی آگئی) یا وِزر سے وہ اُمورِ مباحہ مراد ہوں جو گاہ بگاہ آپ قرینِ حکمت وصواب سمجھ کر کر لیتے تھے اور بعد میں ان کا خلافِ حکمت یا خلافِ اَولیٰ ہونا ظاہر ہوتا تھا، اور آپ بوجہ علوِ شان اور غایتِ قُرب کے اس سے ایسے ہی مغموم ہوتے تھے جس طرح کوئی گناہ سے مغموم ہوتا ہے، تو اِس آیت میں ان پر مؤاخذہ نہ ہونے کی بشارت ہوئی، کذا رُوِی عن بعض السلف، اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آپ کی ہمت عالی اور پیدائشی اِستعداد جن کمالات ومقامات پر پہنچنے کا تقاضا کرتی تھی، قلبِ مبارک کو جسمانی ترکیب یا نفسانی تشویشات کی وجہ سے اُن پر فائز ہونا دُشوار معلوم ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے جب سینہ کھول دیا اور حوصلہ کشادہ کر دیا وہ دُشواریاں جاتی رہیں اور سب بوجھ ہلکا ہوگیا'' (تفسیر عثمانی)۔ یہ سارے مفہوم اِس آیت کے تحت آسکتے ہیں۔

سَروَرِ کائنات ﷺ کے رَفعِ ذِکر کی تفصیل

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ: اور ہم نے آپ کے لئے آپ کا ذکر اُونچا کر دیا، لوگ آپ ﷺ کو دَبانا چاہتے ہیں لیکن ہم نے آپ کا نام بہت نمایاں کر دیا۔ رَفعِ ذِکر یہ بھی انعام ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ پر کیا ہے، یہ ذِکر بلند کس طرح سے ہوا؟ مکہ معظمہ میں آپ ﷺ تنہا تھے، اور جس وقت آپ ﷺ نے نبوّت کا اظہار کیا تو ساری آبادی مخالف ہوگئی، آپ ﷺ کی آواز کو دَبانے کی کوشش کی گئی، آپ ﷺ کا نام ونشان مٹانے کے لئے سارے کے سارے زور لگانے لگے، لیکن اللہ تعالیٰ نے

آئے دن آپ ﷺ کے نام کو اُونچا کیا کہ پہلے مکہ کے اندر شہرت ہوئی، پھر ارد گرد شہرت ہوئی، لوگ عقیدت اور محبت سے ملنے لگ گئے، حتیٰ کہ زندگی کے اندر سارے عرب مملکت میں آپ ﷺ کی حکومت کا ڈنکا بجنے لگ گیا۔ اور صرف یہی نہیں کہ جسم کے طور پر لوگ مطیع ہو گئے تھے، دل کے طور پر بھی فدا ہو گئے، اور آپ کا نام لینا لوگوں کے لئے ایک لذیذ ترین مشغلہ بن گیا اور آپ کے ذکر کو لوگ محبت کے ساتھ کرنے لگے، اس طرح سے آپ ﷺ کا نام اُونچا کر دیا گیا اور آپ ﷺ کا ذکر اُونچا ہو گیا۔ پھر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رَفعِ ذکر کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اللہ کا ذکر آتا ہے وہاں حضور ﷺ کا ذکر بھی آتا ہے، کتنے مقامات ایسے ہیں، کلمے کے ساتھ مستقل جزء بنا دیا گیا "لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ"، اَذان کے اندر مستقل جزء بنا دیا گیا کہ جہاں "اشھد ان لا اِلٰہ اِلّا اللہ" کی چیخ پکار ہوتی ہے، وہاں "اشھد اَنّ محمدًا رسول اللہ" کو بھی ساتھ ہی پکارا جاتا ہے، تو جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ہی اُس کے رسول کا تذکرہ بھی آتا ہے، تو اس طرح سے جس کو لوگوں نے مٹانے کی کوشش کی تھی اللہ تعالیٰ نے اتنا اُونچا کر دیا کہ جیسے اللہ کی شان نمایاں ہے اللہ کے بعد اللہ کے رسول کی شان بھی اسی طرح سے نمایاں ہے۔ یہ اِنعام کے طور پر ذکر کیا گیا اور ایک قسم کی پیش گوئی بھی ہے کہ آئندہ آپ ﷺ کا نام اُونچے سے اُونچا ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ ساری دُنیا کے اُوپر آپ ﷺ کا نام ہی گونجے گا، جیسے کہ اب آثار حالات آپ کے سامنے ہیں، کہ کوئی پیغمبر اور اس کی کتاب ایسی نہیں کہ آج دُنیا کی فضا کے اندر وہ گونجتی ہو سوائے اس کتاب کے جو سرورِ کائنات ﷺ پر اُتاری گئی، اور اس کی معرفت آپ کا نام آج ساری دُنیا کے اندر اُونچا ہے، مثلاً ریڈیو پر صرف یہ کتاب پڑھی جاتی ہے، کوئی دُوسری کتاب نہیں کہ جو ریڈیو کے اُوپر پڑھی جاتی ہو، ریڈیو کی آواز ساری دُنیا کے اُوپر گھومتی ہے اور اِس کے ساتھ حضور ﷺ کا ذکر اور آپ ﷺ کی شان ساری دُنیا میں نمایاں ہوتی چلی رہی ہے، یہ ساری کی ساری "رَفعِ ذکر" کی صورتیں ہیں۔

تنگی کے بعد آسانی کی پیش گوئی

آگے یہ پیش گوئی ہے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ؕ کہ ٹھیک ہے کہ اس وقت آپ کی زندگی بڑی عسر کی زندگی ہے، تنگی کی زندگی ہے، ہر لحاظ سے آپ سختی میں ہیں، لیکن زندگی کی منزل یونہی طے ہوتی ہے، سختی آتی ہے کشادگی آتی ہے، سختی آتی ہے، کشادگی آتی ہے، اسی کے مطابق آپ کے ساتھ بھی معاملہ ہوگا کہ آئندہ آپ کے لئے بھی کشادگی بڑھتی چلی جائے گی، اور آنے والی تاریخ نے کس طرح سے یہ ثابت کر دیا کہ حضور ﷺ کی تنگیاں کیسے دُور ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے کشادگیاں کیسے دیں، آخرت تک اسی طرح سے یسر ہی یسر میں ترقی ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ وہ مقامِ یسریٰ جس کا ذکر سورۃ واللیل میں آیا تھا اُس میں آپ بھی پہنچ جائیں گے اور آپ کے طور طریقے پر چلنے والے بھی پہنچ جائیں گے۔ "سختی کے ساتھ نرمی ہے، بے شک سختی کے ساتھ نرمی ہے" تو اگر کبھی سختی آ بھی جائے تو گھبرانا نہیں چاہیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت ہے، جس طرح سے پیچھے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی کے تذکرے کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا گیا تھا، کہ جیسے ظاہری دُنیا میں کبھی تاریکی، کبھی روشنی، اور حکمت کا تقاضا یہی

ہے، تو اسی طرح سے انسان کی زندگی میں بھی کبھی غم، کبھی خوشی، کبھی سختی، کبھی نرمی، یونہی چلتی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اسی طرح سے انسان کی تربیت کرتے چلے جاتے ہیں، تو اگر کبھی عسر کے اندر انسان مبتلا ہو بھی جائے تو گھبرائے نہیں بلکہ اس کو سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے عسر کے ساتھ ساتھ یسر بھی رکھا ہے، تکلیف اُٹھائیں گے تو اس کے فوائد بھی انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔

خلوَت میں عبادت کا حکم اور اس کی وجہ

یہاں تک تو وہی! اِنعامات کا ذکر ہے، یا یسر کے حاصل ہونے اور رَفعِ ذِکر کی ایک قسم کی پیش گوئی بھی ہے، خبر بھی ہے پیش گوئی بھی ہے، آگے وہ حکم آ گیا، جس طرح سے پچھلی سورت میں بھی اِنعامات کو ذکر کر کے کچھ اَحکام دیے گئے تھے۔ فَإِذَا فَرَغْتَ: جس وقت آپ فارغ ہو جائیں فَانْصَبْ: تو مشقت اُٹھائیں، فارغ کس چیز سے ہو جائیں؟ اور مشقت کس چیز کی اُٹھائیں؟ فارغ ہونے سے مراد ہے کہ جس وقت آپ تبلیغ کے کام سے یا اپنی دُوسری ضروریات سے فارغ ہو جائیں، تبلیغ بھی بہت بڑی عبادت ہے، لیکن اس میں براہِ راست توجہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے، فَانْصَبْ کا معنی یہ ہے کہ پھر خلوَت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی مشقت اُٹھائیں، کیونکہ مبلغ آدمی خلوَت میں جتنا اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا اور اللہ کی عبادت کرتا ہوا مشقت اُٹھائے گا اتنا ہی اُس کی تبلیغ میں اثر پیدا ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص باہر شور تو مچاتا رہے، وعظ اُونچی آواز سے بلند آواز سے کرتا رہے، لیکن اس کی خلوَت اگر اللہ کے ذکر کے ساتھ آباد نہیں تو اس کی آواز میں وہ تاثیر نہیں پیدا ہوا کرتی اور اُس سے وہ نتائج نہیں برآمد ہوا کرتے جس قسم کے نتائج تبلیغ کے ساتھ برآمد ہونے چاہئیں۔ تو اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ اُس کی تبلیغ میں، اس کی تعلیم میں اور اُس کے وعظ میں اثر پیدا ہو، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ خلوَت کے اندر اللہ کو خوب یاد کرے، اللہ کی عبادت کرے، اللہ کا ذکر کرے، مشقت اُٹھائے، تو پھر جس وقت جلوَت میں آئے گا تو اس کی کلام میں اثرات ہوں گے اور اس کے وعظ کے اندر بھی عجیب قسم کا اثر پیدا ہو جائے گا، تو خلوَت کی عبادت، جلوَت کے اندر اَثرات دِکھاتی ہے، اس لئے فرمایا کہ جس وقت آپ وعظ سے تبلیغ سے اور دُوسری ضروریات سے فارغ ہو جائیں تو پھر خلوَت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی مشقت برداشت کریں...... چنانچہ سرورِ کائنات ﷺ کا طریقہ آخر وقت تک یہی رہا کہ دِن کو اگر آپ اصلاحِ اُمت میں مشغول ہوتے تھے، وعظ و تلقین میں مشغول ہوتے تھے، تو رات کو پھر مصلے پر کھڑے ہو کر اللہ کے سامنے گھنٹوں روتے تھے، عبادت کرتے تھے، کتنے لمبے لمبے قیام، کتنے لمبے لمبے رُکوع اور سجدے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پاؤں کے اُوپر وَرم آ جاتا تھا اللہ کے سامنے کھڑے کھڑے، حَتّٰی تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ، جس طرح سے حدیث شریف کے اندر آتا ہے، کہ آپ ﷺ اتنا قیام فرماتے تھے کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس مشقت کو دیکھ کر کہا تھا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے تو آپ اتنی مشقت کیوں اُٹھاتے ہیں؟ تو گویا کہ سوال کرنے والوں کا ذہن یہ تھا کہ گناہ گار آدمی تو مشقت اُٹھائے اللہ سے مغفرت حاصل کرنے کے لئے،

جس کی مغفرت کا اللہ تعالیٰ نے اعلان ہی کر دیا اور کوئی کسی قسم کی گرفت ہونے والی نہیں تو اس کو اتنی مشقت اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو سرورِ کائنات ﷺ نے جواب دیا تھا کہ: اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا: کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟[1] کیا مطلب؟ کہ جب اللہ تعالیٰ کے احسانات میرے پر سب سے زیادہ ہیں تو میں یہ عبادت گناہ معاف کروانے کے لئے نہیں کرتا، میں اللہ کی شکر گزاری کے طور پر یہ عبادت کرتا ہوں۔ تو حضور ﷺ خلوت میں یوں اللہ کو یاد کرتے تھے اور مشقت اُٹھاتے تھے اِسی حکم کے تحت، اور مبلغ اور معلم اور واعظ کے لئے اِس بات میں نمونہ ہے کہ جس وقت تک وہ خلوت کو آباد نہیں کرے گا اور علیحدگی میں بیٹھ کر اللہ کو یاد نہیں کرے گا، اللہ کی عبادت کے لئے مشقت نہیں اُٹھائے گا، اس وقت تک اس کے وعظ تلقین میں، تبلیغ میں اثرات نمایاں نہیں ہوتے، یہ ایک بہت واضح حقیقت ہے۔ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ: اللہ کی عبادت کی مشقت اُٹھائیے اور اپنے رَبّ کی طرف رغبت کیجئے، یعنی اُسی سے لَو لگائیے، دُنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر، مخلوق کی خدمت سے فارغ ہو کر، تعلیم وتلقین سے فارغ ہو کر بس پھر اپنے اللہ سے لو لگا لو، اور خلوت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی مشقت اُٹھاؤ۔ یہ آخر میں حکم آ گیا جس طرح سے پچھلی سورت میں بھی احسانات کے تذکرے کے بعد آخر میں کچھ اَحکام دیے تھے۔

رکوعہا ۱ ۩ ۹۵ سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ ۲۸ ۩ اٰیاتہا ۸
سورۂ تین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣ لَقَدْ
قسم انجیر کی! اور قسم زیتون کی! ۝ اور قسم طورِ سینین کی! ۝ اور قسم اِس امن والے شہر کی! ۝
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝٥ اِلَّا
ہم نے اِنسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے ۝ پھر لوٹا دیا ہم نے اُس کو گھٹیا چیزوں میں سے سب سے گھٹیا چیز کی طرف ۝ ہاں!
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٦ فَمَا يُكَذِّبُكَ
جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اَجرِ غیر منقطع ہے ۝ اے انسان! تجھے تکذیب پر کون سی چیز برانگیختہ کرتی ہے

(۱) بخاری ۲/۷۱۶، کتاب التفسیر، سورۃ الفتح/ مسلم ۲/۳۷۷ باب اکثار الاعمال/ مشکوۃ ۱/۱۰۹ باب التحریض علی قیام اللیل، فصل اوّل۔

بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝

اس کے بعد جزا کے متعلق ۝ کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟ ۝

تفسیر

''انجیر'' اور ''زیتون'' کا تعارف وفوائد

سورۂ تین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں۔ اس میں بھی اثباتِ جزا ہی ہے جس طرح سے ''مکی'' سورتوں کے اندر مضمون چلا آ رہا ہے۔ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ: واؤ وہی! قسمیہ، اور یہ قسم آنے والے مضمون کے لئے ایک قسم کی شہادت ہوتی ہے تاکید ہوتی ہے، تین کہتے ہیں انجیر کو، یہ ایک پھل ہے، اس علاقے میں کم ہوتا ہے، شام کے علاقے کی طرف زیادہ ہوتا ہے، یہاں بھی کہیں کہیں اس کے درخت کھڑے ہوتے ہیں، اور پنساریوں کی دُکانوں پر خشک انجیر ملتی ہے، بعض دوائیوں میں بھی ڈالتے ہیں، بہت کثیر النفع پھل ہے۔ وَالزَّيْتُوْنِ: اور قسم زیتون کی، زیتون بھی اس علاقے میں نہیں ہوتا، اُدھر شام کے علاقے میں زیادہ ہے، جس کا تیل نکالتے ہیں، قرآنِ کریم میں سورۂ نور کے اندر اس کا ذکر آیا تھا یُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (آیت: ۳۶) تو وہاں اسی زیتونہ کا ذکر آیا ہوا ہے، پاکستان میں بھی اِدھر اسلام آباد کے علاقے میں، پہاڑی علاقے میں زیتون لگانے کی کوشش کی گئی ہے، ایک درخت تو اسلام آباد کی پہاڑیوں پر کھڑا ہے جو میں بھی دیکھ کے آیا ہوں، ورنہ اس علاقے کے اندر زیتون نہیں ہے، اُدھر زیادہ ہوتا ہے، اس کا تیل نکالتے ہیں، کھانے کے کام بھی آتا ہے، مالش کے کام بھی آتا ہے، حدیث شریف میں ترغیب دی گئی ہے: ''كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ'' زیتون کو کھایا بھی کرو اور اس کے ساتھ مالش بھی کیا کرو، ''فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ'' کیونکہ یہ برکت والے درخت سے حاصل کیا ہوا ہے۔[1] تو بہت کثیر النفع تیل ہے، اور جلدی سے بدن میں سرایت کرتا ہے، دردوں کے لئے اور اس قسم کی تکلیفوں کے لئے عموماً زیتون کے تیل کی مالش بتایا کرتے ہیں، اور ہمارے ہاں بھی دواخانوں پر ڈبیوں میں بند تیل اس کا ملتا ہے، حاجی بھی اُدھر (حرمین) سے لایا کرتے ہیں۔

''تین'' اور ''زیتون'' کا مصداق کیا ہے؟

تو ''تین'' اور ''زیتون'' یہ دو لفظ جو استعمال کیے گئے تو اس سے یہ دو پھل ہی مراد ہیں تو بھی ٹھیک ہے، کہ ان میں اللہ کی بہت قدرت نمایاں ہے، پھلوں میں سے ممتاز پھل ہیں، بہت کثیر النفع ہیں، اللہ نے ان کے اندر بہت برکت رکھی ہے، اسی کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے کہ جیسے پھلوں میں اس پھل کو کثیر النفع اللہ نے بنایا، اور باقی پھلوں کے مقابلے میں امتیاز دیا ہے اسی طرح سے انسان کو بھی بہت اچھے سانچے میں ڈھالا ہے اور اس کو بھی باقی مخلوق کے مقابلے میں اللہ نے بڑا امتیاز دیا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۶ باب ما جاء فی اکل الزیت/مشکوٰۃ ۲/۳۶۶، کتاب الاطعمۃ، فصل ثانی، عن ابی اسید۔

الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ جس طرح سے آگے مضمون آرہا ہے۔ اور بعض مفسرین ﷭ نے یوں بھی کہا ہے کہ تین اور زیتون یہ دو لفظ بول کر وہ علاقہ مراد ہے جس علاقے میں یہ تین اور زیتون زیادہ تر پیدا ہوتے ہیں، اور یہ پھر وہی شام کا علاقہ ہے، تو شام کے علاقے میں چونکہ انبیاء ﷩ کثرت سے پیدا ہوئے ہیں، مبعوث ہوئے ہیں، تو اِن لفظوں سے اسی علاقے کی طرف اشارہ ہے۔

وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ: طورِ سینین، طورِ سیناء، یہ مختلف لفظ بولے جاتے ہیں، اِس سے وہی پہاڑ مراد ہے جس پہاڑ پر حضرت موسیٰ ﷤ کو اللہ تعالیٰ نے نبوّت کا شرف دیا تھا اور تورات کے ساتھ نوازا تھا، نبوّت سے سرفراز فرمایا تھا، طورِ سینین سے وہی مراد ہے، وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ (سورۂ مؤمنون: ۲۰) تو سیناء کا لفظ آیا ہے قرآنِ کریم میں، اور طورِ سینین بھی کہتے ہیں، یہ ایک ہی چیز ہے۔ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ: اور اِس امن والے شہر کی قسم! بلد الأمین سے مکہ معظمہ مراد ہے۔ تو طورِ سینین یہ بھی ایک مقام ہوگیا، اور بلد الأمین یہ بھی ایک مقام ہے، تو اِسی مناسبت سے مفسرین ﷭ کہتے ہیں کہ تین اور زیتون سے بھی وہ علاقہ ہی مراد ہے جس میں تین اور زیتون کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ تو طورِ سینین سے حضرت موسیٰ ﷤ کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے، اور بلد الأمین سے سرورِ کائنات ﷺ کی طرف اور آپ ﷺ سے پہلے اِس شہر کے آباد کرنے والے باپ بیٹا حضرت ابراہیم ﷤ اور اسماعیل ﷤ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، اور تین اور زیتون سے اس علاقے کے دیگر انبیاء ﷩ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، اِن سب کو نمونے کے طور پر، شہادت کے طور پر پیش کر کے کہا جارہا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔

اللہ نے مخلوق میں سب سے زیادہ حُسن انسان کو دِیا ہے

تقویم: قَوَّمَ تَقْوِیْمًا: سیدھا کرنا، دُرست کرنا، ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے''، انسان کی ساخت باقی مخلوق میں سے بہترین ساخت ہے، بہترین بناوٹ ہے، ظاہری بناوٹ بھی، کہ جتنا اللہ نے حُسن اِس کو دیا، خوبصورتی اس کو دی، مخلوق میں سے کوئی چیز اتنی خوبصورت نہیں ہے، اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے بھی خوبصورتی سب سے زیادہ انسان میں ہے، اور اِس کے بدن کے اندر ظاہری طور پر بھی سب سے زیادہ تناسب اعتدال اور اس کے اعضا کے اندر اِس قسم کی چیز اللہ نے رکھی ہے کہ جس سے وہ بہت سارے فوائد حاصل کرتا ہے ظاہری طور پر بھی۔ اور اِس کی باطنی تقویم! وہ بھی بہت اعلیٰ ہے کہ جس قسم کی صلاحتیں انسان میں رکھی ہیں مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنی صلاحیت نہیں رکھی، جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ''(۱) کہ اللہ تعالیٰ نے آدم ﷤ کو اپنی صورت پہ پیدا کیا ہے، اور تفصیل اس کی یہی ذکر کی جاتی ہے کہ آدم ﷤ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت ساری صفات ظاہر فرمائی ہیں، جس قسم کا ارادہ، علم، قدرت، اور بینائی، شنوائی، گویائی، یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان میں جتنی رکھی ہیں کسی اور مخلوق کے اندر اتنی نمایاں نہیں، اور استعدادِ باطنی اتنی کامل رکھی ہے کہ اگر یہ نیک بننا چاہے تو فرشتوں سے بھی آگے گزر جائے، اور کمال یہی ہوتا ہے، قدرت اِسی کو کہتے ہیں، کمال اِسی کو کہتے ہیں کہ کسی کو دوطرفہ طاقت حاصل ہو، یہ انسان بھی کسی ایک کام کے کرنے پر مجبور نہیں بلکہ اللہ نے اس کو

(۱) بخاری ۹۱۹/۲، کتاب الاستئذان کی پہلی حدیث۔ مشکوٰۃ ۳۹۷/۲، باب السلام کی پہلی حدیث۔

اختیار کی صفت ایک ایسی صفت دی ہے کہ یہ آگے پیچھے جدھر کو چلنا چاہے اپنے اختیار کے ساتھ چل جاتا ہے، دائیں طرف کا راستہ اختیار کرلے، بائیں طرف کا راستہ اختیار کرلے، تو اللہ تعالیٰ نے باطنی صلاحیت کے اعتبار سے بھی اس کی ایسی مشین بنائی کہ جس قسم کی مشین کائنات کے اندر اور کسی کی نہیں ہے، اس لیے اِس عالمِ اکبر میں اِس انسان کو عالمِ اصغر کہتے ہیں، کہ ساری دُنیا کے حالات سمٹ کر اِنسان کے باطن میں آگئے، یہ سب چیزیں شاہد ہیں اِس بات کی، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دال ہیں، اور اُسی اللہ نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے، تو پیدا کرنے کا اِنعام آگیا۔

''اسفل سافلین'' کا مفہوم

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ: پھر ہم نے لوٹا دیا اُس انسان کو...... اسافل: گھٹیا چیز، نیچے کو جانے والی، عالی کے مقابلے میں ہوتا ہے سافل، اور اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ: گھٹیا چیزوں میں سے سب سے زیادہ گھٹیا حال کی طرف، ''پھر لوٹا دیا ہم نے اُس انسان کو گھٹیا چیزوں میں سے سب سے زیادہ گھٹیا حال کی طرف، گھٹیا چیز کی طرف'' کیا مطلب؟ ایک تو اِس میں ظاہری رَدّ ہے، مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ جس طرح سے سورۂ یٰسٓ میں آیا تھا (آیت:۶۸) کہ جس کی ہم عمر طویل کر دیتے ہیں اُس کو خلق میں اُلٹا کر دیتے ہیں، خلق میں اُلٹا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے جس طرح سے کمال کی طرف ترقی ہوتی ہے، پھر جب عمر آگے بڑھ جاتی ہے تو پھر ترقی سے زوال کی طرف انسان آنا شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے آپ کی ٹانگوں میں طاقت نہیں تھی بچپن میں، جیسے جیسے جوان ہوتے چلے گئے ٹانگوں میں طاقت آتی چلی گئی، اور پھر جوانی کے عروج پر پہنچنے کے بعد پھر زوال آیا تو اسی طرح سے ٹانگوں سے طاقت زائل ہونی شروع ہوگئی، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جیسے بچے کی ٹانگیں کمزور ہوتی ہیں وہ چل پھر نہیں سکتا، بوڑھے کی ٹانگیں بھی ایسے ہی ہو جاتی ہیں۔ اور اسی طرح سے آپ کے بازو کمزور تھے، آپ کام نہیں کر سکتے تھے، جیسے جیسے جوان ہوتے چلے گئے بازوؤں کی قوت بڑھتی چلی گئی، لیکن ایک کمال پر پہنچنے پہ پھر جب رَدّ شروع ہوا تو ہاتھ بالکل اُسی طرح سے بیکار ہو گئے جس طرح سے بچہ کوئی چیز اپنے ہاتھوں کے ساتھ پکڑ کر نہیں اُٹھا سکتا بوڑھے کے ہاتھ بھی ایسے ہو جاتے ہیں۔ بینائی کا وہی حال، کانوں کا وہی حال، اور ویسے بھی انسان پھر اس طرح سے ٹیڑھا بچڑا اُجڑا سا ہو جاتا ہے کہ شکل سے بے شکل ہو گیا، چمڑے میں جھریاں پڑ گئیں، رنگ بگڑ گیا، آنکھیں اندر کو دھنس گئیں، ہڈی کوئی کدھر کو اُبھر رہی ہے، کوئی کدھر کو اُبھر رہی ہے، تو پھر یہ ظاہری طور پر دیکھنے میں بھی ایک رَدّی سے رَدّی چیز بن جاتا ہے، جیسے بظاہر کسی کام کا نہیں، تو اللہ تعالیٰ جس طرح سے اَحسنِ تقویم میں اِس کو اُٹھاتے ہیں تو اپنی قدرت کا نمونہ دکھانے کے لئے جب اس کو اُلٹا رَدّ کرتے ہیں تو رَدّ کر کے پھر اس کو اسفل سافلین بھی بنا دیتے ہیں، ظاہری طور پر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اسی طرح سے نمایاں ہے، اور اِسی قدرت سے استدلال کر کے کہا جا رہا ہے کہ اس بات کے سامنے آجانے کے بعد روزِ جزا کو کون جھٹلا سکتا ہے؟ کون سی چیز ہے جو انسان کو روزِ جزا کے جھٹلانے پر براہیختہ کرتی ہے؟ جس اللہ کی قدرت انسان کے سامنے بچپن سے لے کر جوانی تک، جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اپنے بدن میں اتنی نمایاں ہے، تو اس کے بارے میں کیوں شک پیدا ہوتا ہے کہ یہ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ تو یہ رَدّ ظاہری صورت کے اعتبار سے بھی ہے کہ انسان اَسْفَلَ

سٰفِلِيْنَ کی طرف چلا جاتا ہے، رڈی سے رڈی چیز بن جاتا ہے لوٹ کر، جو اَحْسَنِ تَقْوِيْم میں تھا بڑھاپے میں چلتے چلتے ایک رڈی سے رڈی چیز بن گیا، اور اِس کے زیادہ آپ کے سامنے سمجھانے کی اور کہنے کی ضرورت نہیں، صبح شام رات دِن آپ بوڑھوں کو دیکھتے ہیں، جتنا جتنا انسان بوڑھا ہوتا چلا جائے اَرْذَلِ الْعُمُر کی طرف جاتا ہے تو اتنا ہی بے کار سے بے کار شئے بنتا چلا جاتا ہے، کسی کام کا نہیں رہتا، اولاد بھی تنگ آجاتی ہے، آس پاس والے بھی تنگ ہوتے ہیں، نہ اُس کی طرف رغبت ہوتی ہے، نہ اس کے ساتھ کسی قسم کا اُنس ہوتا ہے، بس ایک بوجھ ہے جو اپنے اقارب کے لئے، رشتہ داروں کے لئے اور دُوسروں کے لئے بن جاتا ہے، تو یہ اَحْسَنِ تَقْوِيْم کے بعد رَدّ جو ہوا تو اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ میں چلا گیا...... اور اسی طرح سے باطن کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اتنی اچھی تقویم کی ہے، اتنا اچھا اندازہ اس میں لگایا ہے کہ اس سے اچھا اندازہ اِستعداد کے اعتبار سے کسی مخلوق کا نہیں ہے، لیکن اِس اچھے اندازے میں جس وقت انسان اپنی اُس اِستعداد کو کسی بُرے راستے کی طرف لے جانا چاہے تو لے جاتے لے جاتے ایسی کیفیت پہ پہنچ جاتا ہے کہ دُنیا میں اُس سے بدتر چیز کوئی نہیں ہوتی جہاں انسان پہنچ جاتا ہے، باطنی ملکات کے اعتبار سے بھی۔

جب اِنسان بُرے راستے پر چلتا ہے تو جانوروں کو بھی مات کر جاتا ہے

یہ بات کچھ تشریح طلب ہے، کہ انسان اگر بُرا بننے لگے تو بُرا بنتا بنتا اتنا بُرا ہو جاتا ہے اور اتنی بُرائی میں چلا جاتا ہے کہ کوئی رڈی سے رڈی اور بے کار سے بے کار چیز دُنیا میں بدتر سے بدتر چیز ایسی نہیں جس طرح سے انسان بدتر ہو جاتا ہے، اگر یہ گناہ کی زندگی اختیار کر لے تو ہر مخلوق سے آگے نکل جاتا ہے، شہوت پرستی میں آجائے تو شہوت پرستی کا جانوروں میں ایک خاص طریقہ متعین ہے، خاص وقت میں وہ کرتے ہیں، اور اپنی اپنی نوع کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن اگر اِنسان شہوت پرستی کے گڑھے میں گرنے لگے تو پھر اس کی شہوت پرستی کا کوئی ایک طریقہ متعین نہیں ہے، پھر یہ اپنی اِس عقل کے ساتھ اور مدرکِ کلیات ہونے کے اعتبار سے شہوت رانی کے اتنے طریقے تجویز کرتا ہے کہ آپ فہرست نہیں مرتب کر سکتے کہ انسان کی شہوت رانی کے کتنے طریقے ہیں، شہوت رانی میں تمام حیوانوں کو مات کر جاتا ہے۔ اور اگر اس کے غصے کی اور غضب کی کیفیت آزاد ہوتی ہے اور اُس گناہ کی لائن پر چڑھ جاتا ہے غصے سے جس قسم کے گناہ سرزد ہوتے ہیں تو تمام دُنیا کے درندوں کو یہ مات کر جاتا ہے، کوئی درندہ اتنا ظالم نہیں، جتنا ظالم پھر اِنسان ہوتا ہے، درندے کا غصہ وقتی ہے جو چیز اس کے سامنے آگئی اس پر غصہ نکالے گا، جس پر اس کو غصہ آیا ہے اس کے باپ سے اس کو کوئی ضد نہیں، اس کے بیٹے سے کوئی ضد نہیں، پچھلے واقعات کو وہ یاد نہیں رکھتا، آئندہ واقعات کو سوچتا نہیں، وقتی سا احساس ہوتا ہے، چلو چیر پھاڑ کر لی جیسے بھی ہے، لیکن جب انسان کو کسی انسان پر غصہ آتا ہے تو اس کی نسلیں اُڑاتا ہے اور اس کے باپ دادے تک پہنچتا ہے، اور پھر ماضی اور مستقبل کے حالات کو یاد رکھ کر غصہ نکالنے کے اور دُوسروں کو سزا دینے کے وہ وہ طریقے ایجاد کرتا ہے کہ شیطان بھی وہاں آ کے سر پیٹ کے رہ جاتا ہے۔ تو جب یہ بُرائی کی طرف جانے لگے تو پھر ہم اس کو ایسی ہلاکت کے گڑھے میں گراتے ہیں کہ دُنیا کی کوئی رڈی سے رڈی چیز اس کے مقابلے میں نہیں آسکتی، سب سے زیادہ رڈی، نکما اور سب سے زیادہ بُرا پھر یہی ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (سورۂ اَعراف: ۱۷۹) یہ تو جانوروں کی طرح

ہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ تو جب انسان غلط راستے پر چڑھتا ہے تو جانوروں سے بھی آگے گزر جاتا ہے تو معنوی کیفیت اس کی یہ ہوتی ہے، تو ردّ معنوی طور پر بھی ہوسکتا ہے۔

نیک مؤمنین بڑھاپے میں بھی ظاہراً و باطناً رُو بہ ترقی رہتے ہیں

آگے آگیا اِستثناء اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ: اب اس کو دونوں معنوں کے ساتھ لگا لیجئے۔ اگر تو پہلے اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کی طرف رَدّ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کو بڑھاپے کی طرف لے جاتے ہیں، ان لفظوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا ہو کر آدمی بالکل بے کار ہو جاتا ہے، رَدّی ہو جاتا ہے، کسی کام کا نہیں رہتا، ہاں! جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اَجرِ غیر منقطع ہے، یعنی وہ بوڑھے ہونے کے باوجود بھی اللہ کی طرف سے اَجر سے محروم نہیں ہوتے، ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں ان کا بڑھاپا بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔ اچھا دو وجہ سے، (خیال کریں، اللہ تعالیٰ کی کلام میں کیا جامعیت ہے) ایک تو یہ تجربہ ہے کہ جو شخص جوانی میں ایمان اور عملِ صالح کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے اکثر و بیشتر آخر عمر تک اس کے حواس ٹھیک رہتے ہیں، یعنی عمر بڑی ہونے کے باوجود بھی اس کی عقل ماؤف نہیں ہوتی، اس کے حواس بہت حد تک دُرست رہتے ہیں، باہوش رہتا ہے وہ جس نے جوانی کی عمر ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ گزاری ہوئی ہو، تو کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو جائے اس کے حواس مختل ہو کر ایسا نہیں ہوتا جس طرح سے عام جاہل قسم کے لوگ بوڑھے ہونے کے بعد ہو جاتے ہیں، نہ چادر کی خبر نہ کسی دُوسری چیز کی، بلکہ وہ کچھ ہوش میں رہتے ہیں، صاف ستھرے رہتے ہیں، اور ان کی اچھی کیفیات نمایاں رہتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لئے ایسا اجر ہوتا ہے جو قطع ہونے والا نہیں...... اور پھر جنہوں نے ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ وقت گزارا ہوا ہوتا ہے بوڑھا ہونے کے بعد بھی اللہ کی مخلوق کے دِل میں ان سے نفرت نہیں پیدا ہوتی، اللہ کی مخلوق اُن کو رَدّی نہیں سمجھتی، یہ اللہ والے جتنے جتنے بوڑھے ہوتے چلے جاتے ہیں مخلوق کے دِل میں اتنی عزّت اور قدر بڑھتی چلی جاتی ہے، اُن کو رَدّی سمجھنے کی بجائے لوگ ان کو قیمتی سرمایہ سمجھنے لگ جاتے ہیں، اُن میں چلنے کی طاقت نہیں ہوگی تو ہاتھوں پہ اُٹھائے پھریں گے، اور ان میں کوئی کام کرنے کی طاقت نہیں ہوتی تو جس طرح سے ایک مہربان ماں اپنے بچے کو سنبھالتی ہے واقعہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو بڑھاپے کے اندر جا کر ان کے خدام اسی طرح سے سنبھالتے ہیں، وہ کوئی کام نہیں کر سکتے تو ان کا سارے کا سارا کام کریں گے، حتیٰ کہ اگر ان میں پیشاب اور پاخانے کی ہمت طاقت نہیں ہوتی تو اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کرتے کراتے ہیں، تو اُن کا بڑھاپا ان کو رَدّی نہیں بناتا بلکہ ان کا بڑھاپا ان کو زیادہ قیمتی سے قیمتی بناتا چلا جاتا ہے...... اور پھر معنوی طور پر بھی! جب انہوں نے ایمان اور عملِ صالح کی زندگی اختیار کی ہوئی ہوتی ہے تو ان کا اجر منقطع نہیں ہوتا، ظاہری اَجر بھی منقطع نہیں ہوتا کہ اُسی طرح سے مخلوق خادم ہوتی ہے، اسی طرح سے مخلوق اُن سے محبت کرتی ہے، اسی طرح سے مخلوق ان کو اچھا سمجھتی ہے جس طرح سے اِبتداء میں سمجھتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اور پھر ایک بات یہ بھی ہوا کرتی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص جوانی میں نیکیوں کی عادت ڈال لے تو بوڑھا ہونے کے بعد اگر وہ کچھ بے ہمت ہو گیا اور وہ نیکی نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب وہی جاری رکھتے ہیں، اس کا ثواب منقطع نہیں ہوتا۔

انسان بیمار ہوجائے، بیمار ہو کے بعض نیکیاں چھوٹ جائیں تو ان کا ثواب باقاعدہ جاری رہتا ہے، ان کا اَجر غیر منقطع ہوتا ہے، ختم نہیں ہوتا۔[1] آپ کے سامنے مثال موجود ہے، یہ ہمارے شہر میں دیکھو صوفی صاحب[2]، کہ کمزور ہیں، بیمار ہیں، جیسے کیسے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ظاہری حواس کتنے اچھے رکھے ہوئے ہیں، اتنی طویل بیماری اور اتنے عرصے سے، اور خوراک وغیرہ بھی سب کچھ چھوٹ گئی لیکن چہرے کی رونق دیکھو کس طرح سے بحال ہے، اور کس طرح سے مخلوق اردگرد چکر کاٹتی پھرتی ہے، اور جاکر زیارت کرنے کو، مصافحہ کرنے کو، پاؤں پہ ہاتھ لگانے کو کس طرح سے اپنے لئے شرف سمجھتی ہے۔ اور اگر یہ اللہ والے نہ ہوتے، اہلِ علم میں سے نہ ہوتے، اللہ اللہ کرنے والے نہ ہوتے، تو ذرا بازار میں گزریں تو سہی، آپ کو بوڑھے اس طرح سے نظر آئیں گے کہ گھر والے بھی اُٹھا کے نالی پہ چارپائی ڈال کے اُوپر بٹھا دیتے ہیں کہ یہیں تھوکتے رہنا، اور پوچھنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا، کیا یہ کیفیات آپ لوگوں کے سامنے نہیں ہیں؟ تو اِنسان اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ تب بنتا ہے جب اس کی ایمان اور عملِ صالح والی زندگی نہ ہو، جب اس کی زندگی ایمان اور عملِ صالح والی ہو تو اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر بھی اس کو قیمتی بناتے چلے جاتے ہیں اور باطنی طور پر بھی اس کا اجر غیر منقطع ہوتا ہے، تو دُنیا میں بھی اُس کا حال اچھے سے اچھا ہوگا اور آخرت میں تو ہونا ہی ہے، اس لیے جو پیچھے معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھا رذی ہوجاتا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں اُس سے اِستثناء کردیا "مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اَجر غیر ممنون ہے"، ان کے اندر رَذی ہونے والی بات نہیں ہوتی، تو مستثنیٰ منقطع کے طور پر ترجمہ یوں ہوجائے گا "پھر لوٹا دیتے ہیں ہم اُس انسان کو اس حال میں کہ تمام رذی چیزوں میں سے زیادہ رذی ہوتا ہے، ہاں! جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اَجر غیر منقطع ہے" ان کا اجر ختم نہیں ہوتا۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ: "كَ" کا خطاب عام انسانوں کو ہے، اے اِنسان! تجھے تکذیب پر کون سی چیز برانگیختہ کرتی ہے، اِس بات کے معلوم ہوجانے کے بعد تجھے کون سی چیز تکذیب پر برانگیختہ کرتی ہے جزا کے متعلق، کہ تُو جزا کا عقیدہ نہیں رکھتا کہ مرنے کے بعد اللہ دوبارہ زندہ کرے گا اور جزا دے گا، تجھے کون سی چیز اِس تکذیب کے اُوپر برانگیختہ کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے

"کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟" دُنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکم ہیں وہ بھی اپنے ماتحتوں میں انصاف چاہتے ہیں، تو جو احکم الحاکمین ہے کیا وہ اپنے بندوں سے انصاف نہیں کرے گا؟ کہ ایک بندہ دُنیا میں ظالم رہ کے گیا اور ایک مظلوم رہ کے گیا تو کیا انجام دونوں کا برابر ہوگا؟ احکم الحاکمین کی حکومت میں یہی انصاف ہے؟ کیا تو سوچتا نہیں اس بات کو؟ احکم الحاکمین فیصلہ کرے گا اور انصاف کے ساتھ کرے گا، بُروں کے سامنے بُرائی آئے گی، اچھوں کے سامنے اچھائی آئے گی، اس کے عدل

---

(۱) إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيمًا صَحِيحًا (بخاری ۴۲۰/۱، باب یکتب للمسافر)، نیز مشکوٰۃ ۱۳۵/۱-۱۳۶، باب عیادۃ المریض۔

(۲) صوفی محمد یار صاحب رانا دا ہن، کہروڑ پکا، ضلع لودھراں۔ سلسلہ نقشبندیہ کے معروف بزرگ تھے، پیر فضل علی قریشی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز تھے۔

وحکمت کا تقاضا یہی ہے، اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ (سورۂ قلم: ۳۵)، تو تم جو کہتے ہو کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا نہیں ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ مسلمان اور مجرم سب برابر ہو جائیں گے مرنے کے بعد؟ یہ کوئی عقل کی بات نہیں ہے، یہ بات اللہ کے علم وحکمت کے منافی ہے، جب دُنیا کے اندر کوئی حاکم اس طرح سے برداشت نہیں کرتا کہ اُس کی رعایا اچھی بُری سب ایک درجے میں ہو، بلکہ جو اس کے فرماں بردار ہیں ان کے ساتھ اس حاکم کا اور معاملہ ہوتا ہے، جو اس کے نافرمان باغی ہیں ان کے ساتھ اس کا اور معاملہ ہوتا ہے، تو اللہ تو احکم الحاکمین ہے، تو وہ کیوں نہیں اپنے محکوموں کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرے گا علم وحکمت کے مطابق، جو اس کے فرماں بردار ہیں ان کا انجام اور ہوگا، جو اس کے نافرمان ہیں ان کا انجام اور ہوگا۔

آخری آیت کا جواب کس طرح سے دیا جائے؟

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ: کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟ اب یہ بھی دیکھو! یہاں سوال ہے، جس طرح سے آپ کی خدمت میں پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں بعض بعض آیات ہیں جن کے اندر سوال ہے اور جواب آگے مذکور نہیں، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ تلاوت کے آداب میں سے ہے کہ اس کے بعد اِنسان اپنی زبان سے جواب دے،(۱) اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ جب آپ پڑھیں تو اس کے بعد آپ اپنی زبان سے لب ولہجہ تبدیل کر کے، تلاوت والا لب ولہجہ نہ ہو، تبدیل کر کے کہیں: "بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ" کیوں نہیں! میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں کہ اللہ احکم الحاکمین ہے۔ جس طرح سے پیچھے آیتیں آپ کے سامنے گزری تھیں، جہاں بھی سوال آیا تو اس کا جواب اسی انداز سے دے دیا جاتا ہے، اُمر کا صیغہ آ گیا تو اس کے مطابق عمل ہو جاتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ اِن پر ذِکر کیا تھا، تو یہاں بھی اسی طرح سے آدابِ تلاوت میں سے ہے کہ اِس آیت کو سننے کے بعد انسان یوں کہے: بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

(۱) ترمذی ۱۷۲/۲، تفسیر سورۃ التین/ مشکوۃ ۸۱/۱، باب القراءۃ فی الصلاۃ، فصل ثانی کا آخر۔

رکوعها ۱ ۹۶ سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ ۱ اٰیاتها ۱۹

سورۂ علق مکہ مکرمہ میں اُتری، ۱۹ آیتیں ہیں اور ایک رُکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ

پڑھیے اپنے رَبّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا ۝۱ پیدا کیا اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے ۝۲ پڑھیے، آپ کا رَبّ

الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ كَلَّآ اِنَّ

بہت کرم والا ہے ۝۳ جس نے سکھایا قلم کے ذریعے سے ۝۴ اور تعلیم دی انسان کو ان باتوں کی جو انسان جانتا نہیں ۝۵ یہ پکّی بات ہے بے شک

الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ۝۶ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸

انسان البتہ سرکش ہو جاتا ہے ۝۶ اس سبب سے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے ۝۷ بے شک تیرے رَبّ کی طرف ہی لوٹنا ہے ۝۸

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝۹ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝۱۰ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝۱۱

کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جو روکتا ہے ۝۹ بندے کو جس وقت وہ نماز پڑھے ۝۱۰ کیا دیکھا آپ نے کہ اگر وہ بندہ ہدایت پر ہو ۝۱۱

اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۳ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ

یا وہ تقویٰ کا حکم کرتا ہو ۝۱۲ آپ بتائیں کہ اگر یہ روکنے والا تکذیب کرتا ہو اور اِعراض کرتا ہو ۝۱۳ اس کو معلوم نہیں؟ کہ اللہ

يَرٰى ۝۱۴ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۵ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۶

دیکھ رہا ہے ۝۱۴ ہرگز اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، اگر یہ باز نہ آیا تو البتہ ضرور گھسیٹیں گے ہم ناصیہ سے پکڑ کر ۝۱۵ ایسی ناصیہ جو کہ جھوٹی ہے خطا کار ہے ۝۱۶

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝۱۷ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۸ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹

چاہیے کہ وہ شخص بلا لے اپنے ہم نشینوں کو ۝۱۷ ہم بھی عنقریب بلا لیں گے عذاب دینے والے فرشتوں کو ۝۱۸ اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، آپ بھی اس کی بات نہ مانیں اور سجدہ کرتے رہیں اور اللہ کا قُرب حاصل کرتے رہیں ۝۱۹

***

اِبتدائی آیات کا شانِ نزول

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ سورۂ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۹ آیتیں ہیں۔ جمہور فقہاء محدثین مفسرین رحمہم اللہ کے نزدیک اِس سورت کی اِبتدائی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہونے والی آیتیں ہیں، یعنی حضور ﷺ پر وحی کی اِبتدا انہی آیات کے ساتھ ہوئی، مفصل واقعہ ''بخاری، مسلم'' میں موجود ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ پر وحی کی اِبتدا پہلے خوابوں کے ساتھ ہوئی، جو خواب رات کو دیکھا کرتے تھے صبح کو بالکل روشن صبح کی طرح سامنے آجایا کرتا تھا، سچے خواب دیکھے، اس کے بعد آپ ﷺ کو خلوت محبوب ہوگئی، اور آپ ﷺ غارِ حرا میں خلوت اختیار کیا کرتے تھے، ''حرا'' ایک پہاڑ ہے اور اس کی چوٹی پر یہ غار ہے، آج کل اس کو ''جبلِ نُور'' کہتے ہیں، کئی کئی راتوں کے لئے اپنے ساتھ کچھ زاد لے جایا کرتے تھے اور وہاں راتیں گزارتے، اور اس کے بعد پھر واپس آتے، واپس آکر پھر کچھ راتوں کے لئے اسی طرح سے زاد لے کر چلے جاتے، حتیٰ کہ ایک دِن واقعہ پیش آیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام سرورِ کائنات ﷺ کے پاس آئے، بظاہر معلوم ہوتا ہے انسانی شکل میں آئے، سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے کہا: اِقْرَاْ، پڑھیے! بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ریشم کے قطعے کے اُوپر یہ آیات لکھی ہوئی تھیں، اور وہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کر کے انہوں نے کہا کہ اس کو پڑھو (سیرۃ ابن ہشام)۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ! میں تو پڑھنا نہیں جانتا، میں تو پڑھنے والا نہیں ہوں، اور اگر وہ لکھی ہوئی نہ بھی ہوں تو ویسے ہی اِبتداءً جا کے خطاب کیا کہ پڑھیے، اور جس وقت کسی کو کچھ پڑھنے کے لئے کہا جائے تو ظاہر یہی ہے کہ ذہن جلدی سے منتقل اِدھر ہی ہوتا ہے کہ کوئی چیز پڑھوانی مقصود ہے، جس کی بنا پر حضور ﷺ نے کہا: میں تو پڑھنے والا نہیں ہوں، میں پڑھنا نہیں جانتا، تو جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو پکڑا، پکڑ کے سینے سے لگایا اور اتنا دبایا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مشقت اِنتہا کو پہنچ گئی، پھر چھوڑا اور پھر کہا: اِقْرَاْ، پڑھیے! آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ! میں تو پڑھنے والا نہیں ہوں، پھر پکڑا، پھر اسی طرح سے سینے کے ساتھ لگا کر دبایا اور پورے زور سے، اور پھر چھوڑا، پھر وہی بات کہی کہ اِقْرَاْ، پڑھیے! آپ نے پھر یہی جواب دیا، تیسری دفعہ پھر جبریل علیہ السلام نے اسی طرح سے سینے کے ساتھ لگایا اور دبایا اور چھوڑا، پھر یہ آیات تلاوت کیں، حضور ﷺ کے اُوپر اِن آیات کا اِلقاء کیا، یہی اِبتدائی پانچ آیتیں جو آپ کے سامنے آرہی ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کو سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا تسلی دینا

تو حضور ﷺ ان آیات کو لے کر واپس لوٹے، دِل آپ کا کانپ رہا تھا، بدن پہ کپکپی طاری تھی، یہ پہلی وحی تھی جو حضور ﷺ پر اُتری، اِس کے اثر سے قلب کے اُوپر کچھ ہیبت سی طاری ہوگئی، گھر آگئے اور گھر والوں سے کہا کہ مجھے کوئی کپڑا اُڑھادو، میرے اُوپر کوئی کمبل ڈال دو، زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ۔ گھر والوں نے اُوپر کمبل ڈال دیا، تو جس وقت آپ ﷺ کی طبیعت میں کچھ سکون آیا تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے سرورِ کائنات ﷺ نے واقعہ نقل کیا اور اُس واقعے میں یہ کہا کہ مجھے تو اتنی تکلیف ہوئی اور میرے اُوپر اتنی مشقت ڈالی گئی کہ مجھے تو اندیشہ ہوگیا کہ کہیں میری جان ہی نہ نکل جائے، اور اسی طرح سے اگر واقعات پھر

مسلسل پیش آئے یا دوبارہ کوئی اس قسم کا واقعہ آیا تو مجھے تو اندیشہ ہے کہ شاید میں برداشت نہ کر سکوں، یہ تاثر سرورِ کائنات ﷺ نے حضرت خدیجہ ؓ کے سامنے ذکر کیا، تو حضرت خدیجہ ؓ بہت سمجھ دار عورت تھیں وہ کہنے لگیں: ''كَلَّا وَاللهِ لَا يُخْزِيْكَ اللهُ'' بالکل نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس میں آپ کے لئے رُسوائی کا پہلو ہو، اور یہ بھی ایک رُسوائی ہوتی ہے کہ کسی شخص کے اُوپر ایسی ذمہ داری ڈالی جائے جس کو وہ نبھا نہ سکے، نتیجۃً وہ رُسوا ہو جاتا ہے۔ تو حضرت خدیجہ ؓ فرمانے لگیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہوسکتا جو آپ کی عزّت کے، اِحترام کے اور آپ کی عظمت کے خلاف ہو، آگے پھر حضور ﷺ کی انہوں نے صفات شمار کیں: اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ: آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، رشتہ داروں کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کرتے ہیں، اور اسی طرح سے آپ اپاہج آدمی کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، جو کسی کام کا نہ ہو اس کا بوجھ آپ اُٹھا لیتے ہیں، حق کے واقعات پر آپ لوگوں کی مدد کرتے ہیں، فقیر آدمی کو آپ مال کما کر دیتے ہیں، اس قسم کی صفتیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ذکر کیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ چالیس سالہ زندگی جو گزری تھی جس میں سے پندرہ سال خدیجہ ؓ کے ساتھ گزرے ہیں، کتنی پاک کتنی صاف اور اِعتراض سے، کسی قسم کے شبہ سے، اُنگلی رکھنے سے بالاتر۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ بیوی سے کسی شخص کا کوئی عیب چھپا نہیں رہا کرتا، اس لئے عام طور پر مشہور ہے کہ کسی کی بیوی اس کی معتقد نہیں ہوسکتی، کوئی بزرگ ہو، بڑا ہو، بیوی اس کی معتقد نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی کوئی انسانی کمزوری اس سے چھپی ہوئی نہیں، اور تعلقات آپس میں بہت گہرے ہوتے ہیں، پردہ ایک دوسرے سے کسی چیز کا نہیں ہوتا، تو عام طور پر بیوی کے دِل میں خاوند کی عقیدت نہیں ہوتی، تو سرورِ کائنات ﷺ کی بیوی کا آپ ﷺ کے متعلق اس قسم کی عقیدت کا اظہار کرنا اور پورے زوردار الفاظ سے، یہ بھی حضور ﷺ کے معجزے میں شامل ہے، اور یہ قطعی دلیل ہے حضور ﷺ کی زندگی کے بےداغ ہونے کی اور بےغبار ہونے کی، کہ آپ ﷺ کی زندگی کس طرح سے پاک صاف بےداغ، بےغبار تھی، کہ بیوی جو ہر وقت ساتھ رہنے والی ہوتی ہے جس سے کوئی کسی قسم کا حال مخفی نہیں ہوتا وہ بھی آپ کی زندگی کے اُوپر کوئی کسی قسم کی اُنگلی نہیں رکھ سکتی۔

ورقہ بن نوفل کا حضور ﷺ کی نبوّت کی تصدیق کرنا

خدیجہ ؓ کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل مکہ معظمہ میں رہتے تھے، اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جاہلیت کے زمانے میں ہی شرک اور بت پرستی چھوڑ دی تھی، مشرکانہ طور طریقے چھوڑ دیے تھے، اور اس وقت کے مطابق دینِ حق عیسائیت کو قبول کر لیا تھا، اور یہ توراۃ و انجیل پڑھتے تھے، لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کیا کرتے تھے، بوڑھے ہو چکے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نابینا ہو چکے تھے اتنے بوڑھے تھے، تو حضرت خدیجہ ؓ حضور ﷺ کو اُن کے پاس لے گئیں، چونکہ وہاں اہلِ علم میں سے وہی تھے، تاکہ اِن کا حال اُن کے سامنے ذکر کر کے مزید تصدیق حاصل کر لی جائے، تو سرورِ کائنات ﷺ جس وقت وہاں تشریف لے گئے تو خدیجہ ؓ نے کہا ذرا ان کا حال تو سنو، جب سرورِ کائنات ﷺ نے حال بیان کیا تو ورقہ بن نوفل نے فوراً کہا

کہ یہ تو وہی ناموس ہے، وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، وہی آپ پر نازل ہوا ہے، اور پھر آپ ﷺ کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو نبوّت دیں گے، آپ ﷺ کو اس طریقے سے رسالت کے مقام پر فائز کیا جائے گا، ساتھ یہ بھی کہا کہ کاش! میں تیری نبوّت کے زمانے میں جوان ہوتا تو میں تیری بھرپور امداد کرتا، اور جس وقت آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس قسم کے الفاظ ورقہ بن نوفل نے بولے، جب اس نے یہ کہا کہ ''جب تیری قوم تجھے نکال دے گی اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو میں تیری مدد کروں گا!'' تو رسول اللہ ﷺ یہ لفظ سُن کر کچھ پریشان سے ہوئے، فرمانے لگے کہ ''اَوَ مُخْرِجِیَّ هُمْ'' مجھے میری قوم نکال دے گی؟ کیونکہ اُس وقت تک تو آپ ﷺ قوم کے محبوب تھے، ہر کوئی آپ کو عزّت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، سارے امین کہتے تھے، امانت دار کہتے تھے، ہر طرح سے اعتماد کا اظہار کرتے تھے، تو ایسی محبوب شخصیت جس کے ہاتھ سے کسی کا دِل نہیں دُکھا، کسی کو آپ ﷺ کے ہاتھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی، اُس کے متعلق یہ کیسے تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ قوم انہیں نکال دے گی؟ اس لئے آپ ﷺ نے حیرانی سے پوچھا کہ کیا مجھے نکال دیں گے؟ تو ورقہ نے کہا کہ ہاں! جو شخص بھی تیرے جیسی چیز لے کر آتا ہے، جیسی تو چیز لایا ہے یعنی دِین نبوّت، لوگوں کے سامنے جو شخص بھی آیا اس کے ساتھ عداوت کی گئی، لوگ اس کے دشمن ہوجایا کرتے ہیں، اُسی حساب سے آپ کے بھی لوگ دشمن ہوں گے اور آپ کے لئے مشکلات پیش آئیں گی۔ اِس واقعے سے کچھ مدّت کے بعد ہی ورقہ تو وفات پا گئے، حضور ﷺ کی طرف سے دعوت کا آغاز نہیں ہوا تھا اُس سے پہلے پہلے ورقہ کا انتقال ہوگیا۔[1]

ورقہ بن نوفل جنّتی ہیں

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا تھا کہ ورقہ نے آپ کی دعوت کا زمانہ تو نہیں پایا، لیکن جتنا حال اُس کے سامنے آیا ہے، اتنے کی اس نے تصدیق کردی، تو اَب آخرت میں اس کے ساتھ کیا گزرے گی؟ یعنی اس کا ایمان قابلِ اعتبار ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اور تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا، میں نے خواب کے اندر ورقہ کو دیکھا ہے اور اس کا لباس سفید تھا، اُجلا، صاف ستھرا، اگر وہ جنّتی نہ ہوتا تو اس کے اوپر ایسا لباس نہ ہوتا۔[2] تو جس کا مطلب یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل جنّتی ہے، صحابی اس کو نہیں کہہ سکتے، کیونکہ حضور ﷺ کی طرف سے ابھی دعوت کا آغاز نہیں ہوا تھا، جتنا حال اس کے سامنے پیش آیا اتنے کی اس نے تصدیق کردی، اس لئے اس کا ایمان قابلِ اعتماد ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے، فترت کا زمانہ تھا، جو پچھلا دِین تھا سچا اس کو وہ قبول کیے بیٹھے تھا، حضور ﷺ کا جتنا معاملہ سامنے آیا اس کی اس نے تصدیق کردی، اس لئے حضور ﷺ کے اس قول سے معلوم یونہی ہوتا ہے کہ وہ ناجی ہے۔

(۱) بخاری ص ۳۔ نیز ۲/ ۷۴۰، تفسیر سورۃ اقرأ/ مسلم ۱/ ۸۸، باب بدء الوحی/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۲، باب المبعث وبدء الوحی، فصل اوّل۔

(۲) ترمذی ۲/ ۵۴، ابواب الرؤیا، باب ما جاء فی رؤیا النبی ﷺ المیزان والدلو/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۹۶، کتاب الرؤیا، فصل ثانی۔

فترتِ وحی اور آپ ﷺ کی بے چینی

بہر حال اطمینان ہوگیا، تو رسول اللہ ﷺ پر اس کے بعد تین سال تک وحی رُکی رہی (فتح الباری)، اور اِس دوران میں حضور ﷺ بہت پریشان ہوتے تھے اِس انتظار میں کہ اللہ کی طرف سے وحی آئے، کیونکہ اس کی لذت ایک دفعہ دیکھ چکے، اللہ کے ساتھ رابطہ قائم ہوگیا، تو اِنتظار میں پریشان ہوتے تھے، جیسے ایک دِن آپ کے سامنے ذِکر کیا اسی روایت کے آخر میں ہے کہ کبھی کبھی پریشانی میں یہ وسوسہ بھی آنے لگ جاتا تھا کہ میں اپنے آپ کو ہلاک ہی کردوں، اِس بے چینی سے بچنے کا یہ ذریعہ ہے، پہاڑ کی چوٹی پر آپ تشریف لے جاتے کہ اپنے آپ کو گرادیں، لیکن فوراً اللہ کا کوئی فرشتہ نمایاں ہوتا اور آواز آتی کہ ''اِنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ حَقًّا'' تو پھر رسول اللہ ﷺ کو کچھ سکون آجاتا، تو یہ بڑی بے چینی اور بہت ایک قلبی حیرانیت کی سی کیفیت جس طرح سے ہوا کرتی ہے اُس سے یہ وقت گزرا۔[1]

اِبتدائی آیات کے متعلق مختلف روایات میں تطبیق

تین سال کے بعد پھر وحی کا آغاز ہوا اُن آیات کے ساتھ جو سورۂ مدثر کی اِبتدا میں آپ کے سامنے ذِکر کی گئیں، اس لئے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اُترنے والی آیات سورۂ مدثر کی آیات ہیں، تو اس کی تطبیق محدثین اور شارحین نے یونہی دی ہے کہ اِبتدائے حقیقی تو اِن آیات کے ساتھ ہوئی ہے، لیکن فترتِ وحی کے بعد جس وقت وحی کا سلسلہ مسلسل شروع ہوا ہے اُس کی اِبتدا سورۂ مدثر کی اِبتدائی آیات کے ساتھ ہوئی ہے۔ اور اسی کے آس پاس ہی سورت فاتحہ اُتر گئی تھی اس لئے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے اُتری (مظہری)۔ بہر حال مسلسل وحی شروع ہونے سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوگئی ہو تو من وجہٍ اِبتدائے اضافی کے طور پر اُس کو بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب سے پہلے اُتری ہے، تو ان تینوں کے متعلق ہی روایات میں آتا ہے، یا تو یہ اقرأ، اِس سورت کے متعلق کہ یہ سب سے پہلے اُتری، یا سورۂ مدثر کی اِبتدائی آیات کے متعلق، یا سورۂ فاتحہ کے متعلق، ان کے درمیان میں نے آپ کے سامنے تطبیق ذِکر کردی۔

جبریلِ اَمین علیہ السلام نے اپنا سینہ حضور ﷺ کے سینے کے ساتھ کیوں لگایا؟

یہ واقعہ جو آپ کے سامنے ذِکر کیا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی، تو اُس میں یہ ایک لفظ آیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''فَغَطَّنِي'' ''مجھے جبریل نے مجھے بہت شدّت کے ساتھ دبایا، اور تین دفعہ یہ واقعہ پیش آیا۔ اِس دبانے سے کیا مقصد تھا؟ حقیقتِ حال اللہ جانتے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر عزیزی'' کے اندر یہ بیان کیا کہ صوفیہ کے ہاں جس طرح سے مروّج ہے کہ دُوسرے شخص کو توجہ دے کر اس کے قلب کے اندر کوئی چیز ڈالی جاتی ہے، اور بعض چیزوں کو نمایاں کیا جاتا ہے اور اُبھارا جاتا ہے، توجہ دینے کے مختلف طریقے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک طریقہ جو ہے وہی! سینے سے سینہ لگا کر

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۱۰۳۳ باب اول ما بدیٔ بہ رسول اللہ ﷺ من الوحی/مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۲ باب المبعث، فصل اوّل۔

توجہ دینے کا بھی ہے، جس سے دُوسرے کے قلبی احوال پر اپنے احوال کا اثر ڈالا جاتا ہے، اور اُس کے اندر کچھ اِستعداد پیدا کی جاتی ہے یا اس کی اِستعداد کو اُبھارا جاتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے چونکہ جبریل علیہ السلام وحی کے امین بن کر آئے تھے، اور اس ذریعے سے اللہ تعالیٰ فیض پہنچانا چاہتے تھے حضور ﷺ کو، اور حضرت جبریل علیہ السلام درمیان میں واسطہ ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کے اندر وَحی کا تحمل پیدا کرنے کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام نے سینہ حضور ﷺ کے سینے کے ساتھ لگایا، اور اس طرح سے حضور ﷺ کو توجہ دی، جس سے قلب کے اندر وہ صلاحیت اُبھری جو وحی کو برداشت کرسکتی اور وحی کو اپنے اندر سموسکتی۔

''توجہِ اِتحادی'' پر خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

اِس ضمن میں وہ (شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ) ایک واقعہ نقل کرتے ہیں ''توجہ اِتحادی'' کے عنوان سے، کہ ایک توجہ اتحادی ہے کہ شیخ جس وقت اپنے مرید کو توجہ دیتا ہے تو مرید کے قلب کی کیفیت بالکل اپنی کیفیت پہ لے آتا ہے، جیسی کیفیت اس کی ہوتی ہے ویسی ہی اس کی ہوجاتی ہے، دونوں آپس میں متحد ہوجاتے ہیں قلبی کیفیات کے اعتبار سے، اس کو توجہ اتحادی کہتے ہیں۔ اس کے ضمن میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ کا، اِن بزرگوں کے نام سے شاید آپ آشنا نہ ہوں، حضرت مجدّدالف ثانی رحمہ اللہ جو ایک معروف بزرگ ہیں ہندوستان کے اندر، جو جلال الدین اکبر کے زمانے میں ہوئے، اور یہ کُفر کا سیلاب جو ہندوستان میں آرہا تھا اُس کے سامنے انہوں نے بند باندھا، اور آج نقشبندی سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے، اور باقی سلسلوں میں بھی وہ مجاز تھے، متفق علیہ قابلِ اعتماد بزرگ ہیں ہندوستان کے، اور پوری دُنیا میں ان کے اثرات ہیں، صرف ہندوستان میں نہیں۔ خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ اُن کے پیر ہیں، حضرت مجدّدالف ثانی اِنہی کے خلیفہ ہیں۔ دہلی میں حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ تشریف فرما تھے (جب ہمارا سفر ہوا دیوبند کے جلسے کے سلسلے میں،[1] تو اُن کی خانقاہ میں میں بھی گیا تھا اور ان کے مزار پہ حاضری دے کے آیا ہوں، دہلی میں قبر ہے حضرت خواجہ صاحبؒ کی)، تو جہاں خواجہ صاحب ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سامنے کسی نان بائی کی دُکان تھی، جس طرح سے لوگ تنور سڑکوں کے کنارے پہ لگالیتے ہیں، روٹی کا تھوڑا بہت انتظام ہوتا ہے، تو ایک دفعہ حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ کے ہاں کچھ مہمان آگئے، اور خواجہ صاحب کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو مہمانوں کے سامنے بطور مہمانی کے رکھتے، فاقہ تھا، پریشان سے ہوئے کہ مہمان آئے ہیں اور ان کی خدمت کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اِسی پریشانی میں دو چار دفعہ جیسے انسان کبھی باہر آتا ہے کبھی اندر جاتا ہے، کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی کہ مہمانوں کی خدمت کس طرح سے کی جائے، وہ سامنے جو نان بائی تھا اس نے اندازہ کرلیا کہ خواجہ صاحب کے مہمان آئے ہیں، کچھ حالات ایسے ہیں جیسے خواجہ صاحب کے پاس کچھ ہے نہیں اِن کو کھلانے کے لئے، تو وہ مہمانوں کے اندازے سے کھانا تیار کرکے لے گیا، اور خواجہ صاحب کی خدمت میں جاکے پیش کردیا، تو حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ پر ایک خوشی کی لہر آگئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے سُرور اور اِنبساط کی کیفیت جو طاری ہوئی تو اس نان بائی سے کہتے ہیں کہ تُو مانگ کیا مانگتا ہے؟ تیری کیا خواہش ہے؟ تو وہ نان بائی کہنے لگا کہ جی اور تو کوئی خواہش نہیں، اپنے جیسا

(۱) دارالعلوم دیوبند میں صد سالہ اجلاس ۲۱ تا ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء بمطابق ۴ تا ۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ بروز جمعہ تا اتوار منعقد ہوا تھا۔

بنا لیجئے! آپ نے فرمایا کہ یہ تیرے لئے مشکل ہے، کچھ اور کہہ، وہ کہنے لگا کہ نہیں جی! بس ایک یہی چاہتا ہوں کہ اپنے جیسا بنادو۔ دو تین مرتبہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو دوہرایا لیکن وہ نان بائی نہ مانا، اس کا اِصرار یہی رہا، اور دِل میں ایک کیفیت آگئی تھی کہ جب اِس نے اس مشکل وقت میں دیکھو خود بغیر کہنے کے آگے بڑھا ہے، اور آکے اِس نے اس طرح سے تعاون کیا، یہ خوشی کی بات ہوتی ہے، کسی وقت دِل کے اندر اس قسم کی بات آجاتی ہے، تو حضرت خواجہ صاحب اس کے احسان کا بدلہ دینا چاہتے تھے، اور وہ اِس پر مصر تھا کہ میں بدلہ یہی لوں گا اگر لیا، کہ مجھے اپنے جیسا بنادیں۔ کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو لے کر کمرے میں چلے گئے اور کمرے میں لے جا کر اس کو توجہ اِتحادی دے دی، تو توجہ اِتحادی کا اثر ایسا ہوا کہ جب کمرے سے باہر نکلے تو باہر والے لوگ پہچان نہ سکے کہ اِن میں سے خواجہ صاحب کون ہیں اور نان بائی کون ہے؟ ظاہری شکل تک تبدیل ہوگئی، بس فرق تھا تو یہی تھا کہ جو اصل خواجہ صاحب تھے خواجہ باقی باللہ وہ ہوش میں تھے، اور وہ نان بائی اس طرح سے تھا جس طرح سے نشے کی کیفیت ہوتی ہے اور وہ مدہوش تھا (آخر تین دِن کے بعد بیہوشی کی حالت میں ہی وفات پا گیا۔ ناقل)۔ یہ واقعہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر عزیزی'' کے اندر لکھا ہے اِس ثبوت میں کہ توجہ اِتحادی جو ہوا کرتی ہے اُس میں توجہ دینے والا جس کو توجہ دے اس کے قلبی اَحوال کو اپنے درجے پر لے جاتا ہے، تو حضرت جبریل علیہ السلام نے بھی اِسی طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کے ساتھ سینہ لگا کے توجہ جو دی تو جبریل حاملِ وحی بن کے آئے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے امین تھے، تو وحی کے تحمل کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں جبریل نے یہ عمل کیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی وہ کیفیات منتقل کی گئیں، جس کی بنا پر آئندہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حاملِ وحی قرار پائے، اور وحی کی امانت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں سما گئی۔ اور حقیقتِ حال اللہ جانتا ہے، ظاہری طور پر اس کی ایک یہ توجیہ ہے جو سمجھ آنے والی ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر عزیزی'' میں لکھی ہے۔

سَرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّی ہونے میں حکمت

تو یہ آیات جو پہلے پہلے نازل ہوئیں اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، آپ چونکہ اُمّی تھے، اَن پڑھ تھے۔ اُمّی کا مطلب، اُمّ: ماں، ماں کی طرف نسبت رکھنے والے، یعنی جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ویسے ہی تھے، نہ کسی مدرسے میں گئے، نہ کسی سکول میں گئے، نہ اہلِ علم کی صحبت میں رہ کر کوئی کتاب پڑھی، نہ لکھنا سیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اعجاز نمایاں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ عطا کیا کہ آپ کو لکھنے پڑھنے سے بَری رکھا تا کہ کوئی شخص یہ اِتہام نہ لگا سکے کہ چونکہ یہ پڑھے لکھے ہیں، اہلِ علم کی صحبت میں رہے ہیں، مدرسوں میں رہے ہیں، لائبریریوں کا مطالعہ کیا ہے، پُرانی کتابیں دیکھی ہیں، شاید اُنہی کو دیکھ دیکھ کے یہ مضمون مرتب کر کے لوگوں کو سنانے لگ گئے۔ اب اگر کوئی منصف شخص ہو تو جاہل سے جاہل بھی ہو تو یہ سمجھ سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے کبھی کوئی قصیدہ نہیں کہا، کبھی کوئی تقریر نہیں کی، اہلِ علم میں نہیں بیٹھے، کتاب کا مطالعہ نہیں کیا، آج تک اپنے قلم کے ساتھ ایک خط تک کسی کو نہیں لکھا، تو یکدم اس قسم کی فصیح، بلیغ، اور معانی سے پُر، حکمت سے لبریز کتاب کس طرح سے لے

آئے؟ اور کس طرح سے یہ آیات سنانی شروع کردیں؟ کس طرح سے یہ بات نمایاں کردی؟ اگر کوئی شخص انصاف کے ساتھ اس بات پہ غور کرتا تو اس کو سمجھنے میں دقت نہ پیش آتی کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب آئی ہے، حضور ﷺ کا اس میں ذاتی دخل نہیں ہے، چنانچہ جو منصف مزاج تھے وہ جلد ہی اِس بات کو سمجھ گئے، اور جو انکار کرنے والے تھے ضدی، ان کے سامنے تو آپ جانتے ہیں کہ ہزار دلائل پیش کردیے جائیں، تو جب ایک انسان انکار پر ہی تلا ہوا ہو تو پھر اس کو منوانے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

تفسیر

اُمّی کو عالم بنانا اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں

تو یہاں اِبتدا اِسی سے کی گئی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ: پڑھیے، یہ ایجادِ قراءت ہے، پڑھیے اپنے رَبّ کے نام کے ساتھ جس نے کہ پیدا کیا، اپنے رَبّ کے نام کے ساتھ پڑھیے جس نے پیدا کیا، یعنی اُس رَبّ کا نام لیجئے اور اس رَبّ کے نام کی مدد سے، اعانت سے، برکت سے پڑھیئے۔ لفظ رَبّ کا معنی ہے تربیت کرنے والا، اس میں اشارہ ہے کہ جس نے آپ کی تربیت اِبتدا سے اِس انداز کے ساتھ کی ہے تو آج اُمّی سے آپ کو پڑھا ہوا بھی بنادیں گے، اور آپ کے اندر پڑھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوجائے گی، جس نے پیدا کیا اِبتداءً، وہ یہ صفت بھی پیدا کردے گا،'' پڑھیے اُس رَبّ کے نام کے ساتھ جس نے کہ پیدا کیا۔'' خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ: پہلا خَلَقَ عام ہے، ہر چیز کو پیدا کیا، وہ خالق ہے، ہر چیز کا خالق ہے، تو صفتِ قراءت کا آپ کے اندر پیدا کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں،'' پیدا کیا اُس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے'' علق جمے ہوئے خون کو کہتے ہیں، کیونکہ نطفہ رَحم کے اندر جب جاتا ہے تو اس کے بعد یہ خون کی کیفیت ہی اختیار کرتا ہے،'' پیدا کیا انسان کو علق سے'' یہ پیدائش کی طرف متوجہ کردیا گیا وہی! قدرت سمجھانے کے لئے، کہ اِبتدا کس طرح سے اُٹھائی گئی اور انسان میں اللہ نے کیا کمال دکھایا، تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اگر کسی اُمّی اَن پڑھ کے اندر بھی قراءت کی صفت پیدا کرنا چاہے، قراءت کی صلاحیت پیدا کرنا چاہے تو اس کے سامنے کوئی مشکل نہیں، اللہ کا نام لیں اور پڑھیں۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ: پڑھیے، یہ اُسی کی تاکید ہے، قراءت کیجئے، پڑھیے، آپ کا رَبّ بڑا کرم والا ہے، بہت احسان کرنے والا ہے، جس طرح سے اس کے دوسرے احسانات ہیں ایک احسان اُس کا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اب علم اِلقاء کریں گے، آپ کے دل دماغ کو علوم سے بھر دیں گے۔'' پڑھیے، آپ کا رَبّ بہت کرم والا ہے۔''

قلم کے ذریعے سے بھی اللہ ہی علم دیتے ہیں

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ: جس نے کہ سکھایا قلم کے ذریعے سے، یہ طریقۂ تعلیم کی طرف متوجہ کردیا، چونکہ عام طور پر دُنیا میں علوم جو محفوظ ہوتے ہیں یا دُوسروں کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو قلم کے ذریعے سے منتقل ہوتے ہیں، قلم کے ساتھ لکھی ہوئی کتاب ہمارے سامنے آتی ہے ہم اس کو پڑھتے ہیں تو علم حاصل کرتے ہیں، آگے اپنا علم اگر منتقل کرنا ہو تو اکثر و بیشتر کتاب میں لکھ کے منتقل کردیا جاتا ہے، پڑھے لکھے لوگ اکثر و بیشتر انہی تحریرات کے ذریعے سے ہی علم حاصل کرتے ہیں اور علم پھیلاتے ہیں، تو اس میں اِدھر

اشارہ کردیا کہ قلم کے ساتھ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی اللہ کا دیا ہوا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے کسی کو قلم کی وساطت کے بغیر علم دے دے تو یہ اس کی قدرت میں داخل ہے، آخر تعلیم بالقلم بھی تو اللہ کی جانب سے ہی ہے، ورنہ قلم میں کون سی ایسی خصوصیت ہے جو علم کو نقل کردے یا علم کو محفوظ کرلے، اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی، تو جو قلم کے ذریعے سے تعلیم دے سکتا ہے وہ بغیر قلم کے بھی علم دے سکتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کو جتنا بھی علم حاصل ہوا اس کے درمیان واسطہ کسی لکھی ہوئی تحریر کا نہیں ہے، کہ آپ نے لکھی ہوئی کتاب پڑھی ہو، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل دماغ میں یہ بات ڈال دی۔ ''سکھایا اُس نے قلم کے ذریعے سے۔''

حصولِ علم کے آلات بھی اللہ کے ہی عطا کردہ ہیں

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: اور تعلیم دی انسان کو اُن باتوں کی جو انسان جانتا نہیں، یہ ابتدا سے ہی اللہ کا احسان ہے، جس وقت انسان اپنے بطنِ مادر سے پیدا ہوتا ہے تو اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا (سورۂ نحل:۷۸) کہ تمہیں ماں کے پیٹوں سے اس طرح سے نکالا تھا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، تمہیں کچھ بھی علم حاصل نہیں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے علم حاصل کرنے کے آلات دیے، کان دیے، آنکھیں دیں، دل دیا، دماغ دیا، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہی ضرورت کے مطابق علم کا اِلقاء قلب میں کرتا چلا گیا، دُودھ پینا سکھا دیا، باقی دُوسرے کام جو بچہ کرتا ہے، اس کی فطری صلاحیت اُبھرتی جاتی ہے اور وہ سیکھتا چلا جاتا ہے، اور آگے پھر قلم واسطہ بنتا ہے، قلم کے واسطے کے ساتھ پھر اور علوم حاصل ہوتے ہیں، تو جو انسان نہیں جانتا اللہ نے سکھا دیا، اسی طرح سے اگر آپ کو بھی بعض چیزیں معلوم نہیں ہیں تو اب اللہ کا قلم آپ کی طرف بھی متوجہ ہوگیا ہے، آپ کو بھی وہ ساری باتیں سکھادی جائیں گی جو آپ کو معلوم نہیں۔

یہ ہیں ابتدائی آیات جو سرورِ کائنات ﷺ پر اُتریں، اور اِن میں حضور ﷺ کے سامنے ایک پیش گوئی کے درجے میں چیز رکھ دی گئی کہ اب آپ کے پڑھنے کا موقع آگیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو تعلیم دے گا، علم آپ کی طرف القاء کرے گا۔

آخری آیات کا پس منظر

اگلی آیات جو ہیں (كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى الخ) وہ کچھ مدت کے بعد اُتری ہوئی ہیں، لیکن ان کو رکھ دیا گیا یہیں۔ اس کا شانِ نزول عام تفاسیر میں جو نقل کیا ہوا ہے، کہ اصل یہ واقعہ پیش آیا تھا ابوجہل کے ساتھ، اس کا اوّلین مصداق ابوجہل ہے، اگرچہ پھر جو بھی شخص اِن صفات کا حامل ہوگا اُس پر یہ بات صادق آئے گی۔ سرورِ کائنات ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ نے تعلیم دے دی تو آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لئے بیت اللہ کے پاس جاتے تھے اور جا کر نماز پڑھا کرتے تھے، اور اس سے ابوجہل بڑا چڑتا تھا، گویا کہ آپ کے دین کا اظہار لوگوں کے سامنے نماز پڑھنے کے ساتھ ہی ہوتا تھا، نماز سے اِبتدا ہوئی۔ ابوجہل روکتا تھا کہ یہ یہاں نماز نہ پڑھیں، ڈانٹ ڈپٹ کرتا تھا، حضور ﷺ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ اس نے یہ کہا کہ اب اگر میں نے اِن کو دیکھ لیا کہ یہاں آکے سجدہ کرتے ہیں تو میں ان کی گردن پر پاؤں رکھوں گا اور ان کی گردن کو روند دوں گا، چنانچہ حضور ﷺ اپنی

عادتِ شریفہ کے مطابق نماز پڑھنے کے لئے تشریف لائے اور یہ طاغی سرکش آدمی بھی اپنی اُس بات کے مطابق آگے بڑھا تاکہ حضور ﷺ کو تکلیف پہنچائے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ اس طرح سے پیچھے کو ڈرتا ہوا ہٹتا آرہا ہے جیسے کسی چیز سے بچتا ہے، آگے سے جیسے کوئی خطرہ پیش آجائے تو اِنسان پیچھے کی طرف ہٹتا ہے، تو اس کے ہاتھ اور ہر چیز کی حرکت اِس بات پہ دلالت کیا کرتی ہے گویا کہ سامنے کوئی چیز ہے اور اُس سے یہ بچتا ہوا پیچھے کو ہٹ رہا ہے، ہیبت زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو اس نے بتایا کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک آگ کی خندق تھی، اور اس آگ کی خندق میں بعض پروں والی چیزیں تھیں جس سے مجھے بڑا ڈر لگا اور میں پیچھے کو ہٹ گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اصل کے اعتبار سے وہ اللہ کے فرشتے تھے، اگر یہ اپنے اِرادے کے مطابق آگے بڑھتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو کر ڈالتے، اس کو ریزہ ریزہ کردیتے اور اس کا ایک ایک عضو علیحدہ کردیتے۔[1] یہ واقعہ پیش آیا۔ تو اِن آیات میں اُسی ابوجہل کی مذمت ہے جو اللہ تعالیٰ کے اِنعامات حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے باغی اور طاغی ہوگیا تھا۔ اور اس ضمن میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ اللہ کا ایک نیک بندہ جو اللہ کو یاد کرتا ہو اور نماز پڑھتا ہو، خود متقی ہو اور دُوسروں کو تقویٰ سکھاتا ہو، اِس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ، پھر ایسے شخص کی طرف سے جو کہ خود تکذیب کرتا ہے اور اللہ کی باتوں سے اِعراض کرتا ہے، یہ کتنا تعجب خیز ہے؟ اور حضور ﷺ کو اطمینان دِلایا گیا ہے کہ آپ اِن کی باتوں کی بالکل پرواہ نہ کریں اور باقاعدہ اسی طرح سے اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہیں، اِن کی باتیں نہ مانیں، اور اللہ کی عبادت کریں، سجدہ کریں اور اللہ کا قُرب حاصل کریں، جس طرح سے آخری آیت میں آرہا ہے۔ تو گویا کہ یہاں بھی جس طرح سے پچھلی سورت میں کچھ احسان ذِکر کر کے اَحکام دیے گئے تھے، تو یہاں بھی اِبتدا میں حضور ﷺ پر اِحسانات کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں وہی اِعبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مال پر گھمنڈ کی وجہ سے ابوجہل کی بدکرداری اور اس پر وعید

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى...... كَلَّا ردع کے لئے بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی حقًا کے معنی میں بھی ہوتا ہے جس طرح سے سورۂ مدثر کی تفسیر میں ذِکر کیا گیا تھا، یہاں عام طور پر مفسرین نے اس کو حقًا کے معنی میں کیا ہے، ''یہ پکی بات ہے'' اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى: بے شک انسان البتہ سرکش ہوجاتا ہے، اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى: اِس سبب سے کہ اپنے آپ کو وہ مستغنی دیکھتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ میں غنی ہوگیا ہوں، مستغنی ہوگیا ہوں، میرے پاس ہر ضرورت کی چیز موجود ہے، میں کسی کا محتاج نہیں، جب وہ یوں سمجھنے لگ جاتا ہے تو پھر وہ سرکش ہوجاتا ہے، پھر اس کے اندر تواضع نہیں رہتی، ''البتہ سرکش ہوجاتا ہے انسان جس وقت کہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے'' کہتا ہے مجھے کسی کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے ضرورتیں پوری کردیں، اس کو چاہیے تو تھا کہ اللہ کا شکر گزار ہوتا، لیکن یہی استغناء اُس کے لئے تکبر کا ذریعہ بن جاتا ہے، اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى: بے شک تیرے رَبّ کی طرف ہی لوٹنا ہے، رجعیٰ یہ مصدر ہے، یعنی یہ

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۷۲، کتاب صفة القیامة باب قوله ان الانسان لیطغیٰ۔

بغاوت اور یہ سرکشی طغیان یہ اچھی بات نہیں، آخر لوٹ کے تیرے رَبّ کی طرف ہی آنا ہے، وہاں طغیان کی سزا مل جائے گی۔

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰى...... اَرَءَيۡتَ: کیا دیکھا تُو نے؟ اس کا لفظی معنی یہ ہے، یہ لفظ مقامِ تعجب میں بولا جاتا ہے، کیا آپ نے ایسا شخص دیکھا؟ اور عام طور پر مترجمین اس کو اَخۡبِرۡنِىۡ کے معنی میں بھی کر دیتے ہیں کہ بتلایئے ایسے شخص کا حال، یہ بھی اظہار تعجب کے لئے ہے، ''ایسا شخص آپ نے دیکھا؟ اس شخص کی خبر دیجئے کہ یہ کیسا شخص ہے؟'' مطلب یہ ہے کہ بہت ہی قابلِ تعجب ہے، ''کیا دیکھا آپ نے؟'' خطاب ہر کسی کو ہے، ''کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جو کہ روکتا ہے'' عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى: بندے کو جس وقت کہ وہ نماز پڑھے، یعنی کتنی تعجب کی بات ہے کہ بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے جس وقت وہ اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ''کیا دیکھا آپ نے کہ اگر وہ بندہ جس کو روکا جارہا ہے اگر ہدایت پر ہو، سیدھے راستے پر ہو، یا وہ تقوے کا اَمر کرتا ہو، آپ بتائیں کہ اگر یہ روکنے والا تکذیب کرتا ہو اور اِعراض کرتا ہو'' تو بھلا اِن دونوں کا آپس میں معاملہ کتنا تعجب کا ہے، کہ جس کو روکا جارہا ہے وہ نماز پڑھنے والا اور اللہ کو یاد کرنے والا ہے، اور صحیح راستے پر چلنے والا ہے، اور پھر اسی طرح سے لوگوں کو بھی تقوے کا اَمر کرتا ہے، اور جو روکنے والا ہے وہ مکذب ہے اور اِعراض کرنے والا ہے، دیکھو! ان کا کیا حال ہے، یہ قابلِ تعجب ہے، ایسے شخص کے حال پر تعجب کرنا چاہیے، دونوں میں کتنا تفاوت ہے، لیکن اس کے باوجود یہ شخص اللہ کا نام نہیں لینے دیتا، عبادت کرنے سے اور نماز پڑھنے سے روکتا ہے، اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى: اِس کو پتا نہیں؟ کہ اللہ دیکھ رہا ہے، اِس منع کرنے والے کو معلوم نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے کسی کا کوئی حال مخفی نہیں، تو جو نیکی کا حکم دیتے ہیں نیکی کرتے ہیں ان کو بھی اللہ دیکھ رہا ہے، اور جو نیکی کے کاموں سے روکتے ہیں ان کو بھی اللہ دیکھ رہا ہے، اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى، یعنی اگر اُس کو یہ بات معلوم ہوتی کہ یہ سارا معاملہ اللہ کے سامنے ہے اور جزا سزا کے متعلق اُس کا تصور صحیح ہوتا تو پھر ایسی حرکت نہ کرتا۔

مجلس پر ناز کرنے والے ابوجہل کا اَنجامِ بد

كَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ: یہ كَلَّا ردع کے لئے ہے، ہرگز اِس شخص کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ: اگر یہ باز نہ آیا، انتہاء: رُکنا، اگر یہ باز نہ آیا، لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ: ناصیۃ کہتے ہیں سَر کے اگلے حصے کے بالوں کو، یہ جو پیشانی کے اُوپر ہوا کرتے ہیں، اور جب کسی کو یہاں سے پکڑ لیا جائے تو وہ پوری طرح سے قابو آجاتا ہے، اور ''سَفۡعٌ'' گھسیٹنے کو کہتے ہیں، لَنَسۡفَعًا میں عین کے اُوپر جو تنوین ہے یہ نون خفیفہ سے بدلی ہوئی ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ فعل کے اُوپر حقیقتاً تنوین نہیں ہوا کرتی، تنوین تو اسم کی علامت ہے، تو یہ نونِ خفیفہ کا بدل ہے، لَنَسۡفَعًا: لام تاکید بانون تاکید خفیفہ، ثقیلہ کی بجائے یہ خفیفہ ہے، ''البتہ ضرور گھسیٹیں گے ناصیہ سے پکڑ کر'' نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ: ایسی ناصیہ جو کہ جھوٹی ہے اور خطا کار ہے، یہ آگے اُس کی صفت بڑھا دی گئی چونکہ ابوجہل جو اس کا اوّلین مصداق ہے وہ ایسے ہی تھا، ''ہم اُس کو ناصیہ سے پکڑ کے گھسیٹیں گے ایسی ناصیہ جو کہ جھوٹی ہے اور خطا کار ہے''، اور ناصیہ کو جھوٹی اور خطا کار کہنے سے یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ شخص جھوٹا اور خطا کار ہے، ناصیہ بول کر وہ شخص مراد ہے۔ فَلۡيَدۡعُ نَادِيَهٗ: نادِی کہتے

ہیں مجلس کو، قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ بھی یہ لفظ ہے تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (سورۂ عنکبوت: ۲۹) تم اپنی مجلسوں کے اندر منکرات کا ارتکاب کرتے ہو ایک دُوسرے کے سامنے۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ: یہاں سے ہم مجلس مراد ہیں جو اس کے پاس بیٹھنے والے ہیں، ہم جلیس، ''چاہیے کہ وہ شخص بلالے اپنے ہم نشینوں کو'' اپنی مجلس کو بلالے ہمارے مقابلے میں، کیا مطلب؟ کہ جب ہماری گرفت میں آجائے گا پھر چاہے اپنے ہم نشینوں کو بلالے پھر یہ چھوٹ نہیں سکے گا، جس جماعت پر جس مجلس پر اِس کو ناز ہے کہ میرے پاس بہت بیٹھنے والے لوگ ہیں، میری مجلس بہت بھری ہوئی ہوتی ہے، جس کی بنا پر یہ سرکشی کرتا ہے، گردن اُٹھاتا ہے، تو پھر یہ اُن کو بلالے، یعنی اس کا بلانا پھر کچھ کام نہیں آئے گا، ''چاہیے کہ بلالے یہ اپنی مجلس کو'' سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ: ہم بھی عنقریب بلالیں گے عذاب دینے والے فرشتوں کو، زَبانیہ زَبَن سے ہے، اور یہ زِبْنِيَة کی جمع ہے، مدافعت کرنے والے فرشتے، دفع کرنے والے، دھکے دینے والے، ''ہم بھی عنقریب بلالیں گے عذاب دینے والے فرشتوں کو۔''

حضور ﷺ کو کُفّار کی پروا کیے بغیر عبادت جاری رکھنے کا حکم

كَلَّا: اب اس كَلَّا کا معنی یوں بھی کر سکتے ہیں کہ اس شخص کو ایسے نہیں کرنا چاہیے، آگے بات نئے سرے سے ہوجائے گی، ''اِس کو ایسے نہیں کرنا چاہیے، آپ بھی اس کی بات نہ مانیے'' اگر یہ نماز پڑھنے سے روکتا ہے تو آپ بھی اس کی بات نہ مانیں، لَا تُطِعْهُ: اس کی اطاعت نہ کریں، اِس کی بات نہ مانیں، بلکہ باقاعدہ اُسی طرح سے حسبِ عادت اللہ کو سجدہ کرتے رہیں اور اللہ کا قُرب حاصل کرتے رہیں، سجدہ کرنے کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، جس طرح سے حدیث شریف میں ہے کہ بندہ اللہ کی طرف سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہی ہوتا ہے۔[1] تو یہ كَلَّا کی ردع اُس کو ہوجائے گی، کہ اُس کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، اور آپ بھی اُس کی بات نہ مانیں بلکہ باقاعدہ اسی طرح سے عبادت کرتے رہیں، سجدہ کرتے رہیں اور اللہ کا قُرب حاصل کرتے رہیں۔ اِس آیت کے اُوپر سجدۂ تلاوت واجب ہے، ویسے مراد یہاں وہی! نماز پڑھنا ہے، کہ باقاعدہ نماز پڑھتے رہیں اور اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرتے رہیں، نماز میں سجدہ آتا ہے اور سجدے میں سب سے زیادہ قُربِ اللہ تعالیٰ کا حاصل ہوتا ہے، کثرتِ سجود سے کثرتِ صلوٰۃ ہی مراد ہوا کرتی ہے۔ اور كَلَّا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ہرگز آپ اس کی بات نہ مانیے، آپ اس کے ڈراوے سے ہرگز متاثر نہ ہوں، اگر یہ آپ کو دھمکاتا ہے تو آپ اس سے ہرگز متاثر نہ ہوں، اور اس کا کہنا بالکل نہ مانیے، اور باقاعدہ عبادت کرتے رہیے، سجدہ کرتے رہیے اور اللہ کا قُرب حاصل کرتے رہیے۔

***

(۱) اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ. (مسلم ۱/ ۱۹۱ باب ما یقال فی الرکوع والسجود/ مشکوٰۃ ۱/ ۸۴ باب السجود وفضلہ، فصل اوّل)

ایاتھا ۵ ۹۷ سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ ۲۵ رکوعھا ۱

سورۂ قدر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ

بے شک ہم نے اس کو اُتارا قدر کی رات میں ۝۱ آپ کو کیا معلوم کہ قدر کی رات کیا ہے؟ ۝۲ قدر کی رات

خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

تو ہزار مہینے کے مقابلے میں بہتر ہے ۝۳ اُترتے ہیں فرشتے اور رُوح اِس میں اپنے رَبّ کے حکم سے

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

ہر اَمرِ خیر کو لے کر ۝۴ یہ رات سلامتی ہی سلامتی ہے، یہ رات (باقی رہتی ہے) فجر کے طلوع ہونے تک ۝۵

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

سورۂ قدر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں۔ پچھلی سورت میں نزولِ قرآن کی اِبتدا ہوئی، جیسے کہ میں نے عرض کیا کہ یہ وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے اُتری تھیں، گویا کہ نزولِ قرآن کی اِبتدا جو ہے وہ اِن آیات کے ساتھ ہوئی ہے۔ اب اُسی قرآن کی عظمت کو نمایاں کرنے کے لئے ساتھ دوسری سورت رکھ دی گئی، جس سے یہ معلوم ہوجائے کہ قرآن کتنی عظیم الشان چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے کیسے مبارک وقت میں اس کو اُتارا، اور یہ بتایا کہ ہم اُتارنے والے ہیں، یہ کوئی کہانت یا کوئی شاعری یا جنّات کے اثر سے پیدا ہونے والی بات نہیں ہے، یعنی قرآنِ کریم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب اگرچہ بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی لیکن مناسبت دونوں سورتوں میں اس طرح سے ہوگئی۔ پچھلی سورت میں اِبتدائے نزول ہے اور اِس میں واضح کیا جارہا ہے کہ قرآنِ کریم کا نزول کیسے مبارک وقت میں ہوا، اور ہم اس کو نازل کرنے والے ہیں، اس میں کسی دوسری چیز کا دخل نہیں ہے، اِس اعتبار سے سورت کا ماقبل کے ساتھ ربط واضح ہوجائے گا۔

تفسیر

''قدر'' کے دو مفہوم

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ: بے شک ہم نے اِس کو اُتارا قدر کی رات میں، قدر سے عظمت اور شرف مراد ہو تو ''عظمت اور

شرف والی رات میں"، اور قدر اگر اندازہ کرنے کے معنی میں ہو تو "تقدیر کی رات میں" جس میں کہ سب اُمور کی تقدیر ہوتی ہے، ایسی رات میں جس میں کہ اندازے کیے جاتے ہیں، لیلۃ القدر، مراد اس سے وہ رات ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ آنے والے واقعات کا اندازہ فرما کر فرشتوں کے سپرد کر دیتے ہیں، جیسے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

"لیلۃ القدر" کی تعیین

اور اس رات سے کون سی رات مراد ہے؟ یہ تو وعظ میں عموماً آپ سنتے ہی رہتے ہیں، رمضان المبارک میں اکثر وبیشتر اِسی سورت کے اُوپر وعظ ہوتا ہے، لیلۃ القدر رمضان المبارک میں ہوتی ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ ذکر کیا گیا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (سورۂ بقرہ:۱۸۵)، قرآنِ کریم کے اُتارنے کی نسبت رمضان کے مہینے کی طرف کی گئی، اور یہاں ذکر کیا گیا کہ ہم نے اِس کو لیلۃ القدر میں اُتارا ہے، ان دونوں آیتوں کو اگر آپ سامنے رکھیں گے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے۔ اور پھر روایاتِ صحیحہ نے اس کی تفصیل بتادی کہ رمضان المبارک میں ہوتی ہے اور پھر رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہوتی ہے، اور آخری عشرے میں سے طاق راتوں کے اندر اِس کی زیادہ اُمید دِلائی گئی ہے، طاق راتوں میں ہوتی ہے، اور طاق راتوں میں سے روایات کا زیادہ رُجحان ستائیسویں کی طرف ہے، لیکن یہ قطعی طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا کہ ستائیسویں ہی ہے، اس لئے جو لوگ صرف ستائیسویں رات کا اہتمام کرتے ہیں باقی راتوں کا اہتمام نہیں کرتے وہ اس کی فضیلت سے محروم رہ سکتے ہیں، اور جو باقی راتوں کا بھی اہتمام کریں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ وہ یہ فضیلت پالیں گے۔

"لیلۃ القدر" کی اہمیت، اور اس کی وجہِ تسمیہ کے متعلق دو اِحتمال

سورۂ حٰمٓ دُخان کے اندر لیلۂ مبارکہ کا ذکر آیا تھا اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ: برکت والی رات کے اندر ہم نے اِس کو اُتارا، تو وہاں بھی عرض کیا تھا کہ لیلۂ مبارکہ سے مراد بھی یہی لیلۃ القدر ہے۔ اس میں ایک بات تو یہ آگئی کہ اِس میں قرآن اُتارا گیا، یہ اتنا عظیم الشان واقعہ اِس رات میں پیش آیا، نزول کی اِبتدا ہوئی یا مجموعی طور پر قرآنِ کریم کو لوحِ محفوظ سے نقل کر کے آسمانِ دُنیا پر پہنچادیا گیا، اور وہاں سے حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا اُترتا گیا اور تیئیس سال میں پورا ہوگیا، نزول کی اِبتدا اُسی رات میں ہوئی، ایک تو عظیم الشان واقعہ یہ پیش آیا۔ اور پھر قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ ذِکر کیا گیا فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (سورۂ دُخان) اِس میں ہر اَمرِ حکیم کا فیصلہ ہوتا ہے، حکمت والے اَمر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور روایاتِ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ فیصلے فرماتے ہیں اور فیصلے فرمانے کے بعد جس جس شعبے سے وہ چیز متعلق ہوتی ہے اس کو اس شعبے کے کارکن فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے، آنے والے سال کے اندر کتنے لوگ مرنے والے ہیں؟ آنے والے سال میں کتنے پیدا ہونے والے ہیں؟ کتنا رزق اُترے گا؟ کتنی بارش آئے گی؟ کیا کیا حادثے ہوں گے؟ کیا کیا واقعات ہوں گے؟ متعلقہ فرشتوں کو یہ فہرستیں دے دی جاتی ہیں، اِس طرح سے اس کو "تقدیر کی رات" بھی کہہ سکتے ہیں، کہ آنے والے اُمور کو مقدر کر کے، اندازہ کر کے ان کو متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔..... بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ لیلۃ نصف شعبان میں پیش آتا ہے، شعبان کی درمیانی رات، جس کو

''شب براءت'' کہتے ہیں، بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے، لیکن قرآنِ کریم کی آیت سے جس طرح سے بات واضح ہے اُس کے مقابلے میں وہ روایات اِس قابل نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ وہ ٹکر لے سکیں، جو صحیح روایات اور قرآنِ کریم کی آیت سے مطلب واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعات لیلۃ القدر میں ہوتے ہیں وہ (نصف شعبان والی روایات) اِس درجے کی نہیں کہ ان کی وجہ سے اِس بات کو بدلا جا سکے۔ ہاں! البتہ علماء نے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس قسم کے کام کی اِبتدا ہو جاتی ہو پندرہ شعبان کو، اور اِختتام پر یہ پہنچ جاتے ہوں لیلۃ القدر میں، فیصلے اُس وقت ہو جاتے ہوں، سپرد اِس رات میں ہو جاتے ہوں، اللہ کی حکمت کے تحت اس عرصے کے درمیان میں یہ بات چلتی رہتی ہو...... تو اِس کو بلا تشبیہ اگر سمجھایا جا سکتا ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح سے مُلک میں سالانہ طور پر بجٹ تیار ہوتا ہے اور بجٹ کا اظہار ہوتا ہے، اور ہر شعبے کے متعلق حکومت کی طرف سے ہدایات جاری کردی جاتی ہیں، اور یہ ایام انتظامِ مُلکی کے تحت بہت اہم ہوا کرتے ہیں جن میں بجٹ کی تیاری ہوتی ہے، کہ آمد کیا ہوگی؟ خرچ کیا ہوگا؟ کس شعبے میں کتنا خرچ کرنا ہے؟ کس شعبہ سے کتنی آمدن ہوگی؟ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی کچھ اسی طرح سے (بلا تشبیہ عرض کر رہا ہوں، دُنیا کی حکومت پر اللہ کی حکومت کو قیاس نہیں کیا جا سکتا) تو پندرہ شعبان سے لے کر ستائیس رمضان تک یا جو بھی لیلۃ القدر ہو اللہ کے علم میں، اُس رات تک یہ سال بھر کا نظم جو ہے وہ کارکنانِ قضا وقدر کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ تو اس قدر سے عظمت والی رات بھی مراد لے سکتے ہیں، عظمت اور شرف والی رات، اور اِس سے تقدیر کی رات بھی مراد لے سکتے ہیں کہ جس میں اُمور مقدر کر کے فرشتوں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

''لیلۃ القدر'' کی فضیلت اور اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ: آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے؟ وہ کتنی شرف والی ہے؟ وہ کتنی اہم رات ہے؟ اُسی میں یہ اہم واقعہ پیش آیا کہ ہم نے اِس قرآن کو اسی رات میں اُتارا، باعظمت وقت کے اندر یہ باعظمت کتاب اُتری اور اُتارنے والے ہم ہیں، اِس سے اس قرآن کی عظمت کو نمایاں کر دیا گیا۔ تو یہ سوال جو ہے یہ بھی اس کے شرف کو نمایاں کرنے کے لئے ہے، آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے؟ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ: یہ قدر کی رات، یہ تو ہزار مہینے سے بہتر ہے، جس کا مطلب یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ہزار مہینے کی راتوں میں عبادت کرے اور دُوسرا شخص لیلۃ القدر میں عبادت کرلے تو یہ ایک رات کی عبادت ہزار مہینے کے مقابلے میں بہتر ہے، ہزار مہینہ وہ کہ جس میں لیلۃ القدر نہ آئی ہو۔ یہ خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِس اُمت کو نصیب فرمائی سرورِ کائنات ﷺ کی برکت سے، کہ پہلی اُمتوں میں لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا بہت موقع مل جاتا تھا، حضور ﷺ کی اُمت کی عمریں چھوٹی ہیں، تو مقدار کے لحاظ سے اِس میں عبادت کم رہ سکتی ہے، ان لوگوں کو سینکڑوں سال عمر ملتی تھی، سینکڑوں سال وہ نمازیں پڑھتے تھے، ریاضتیں کرتے تھے، اللہ کا نام لیتے تھے، اور اس اُمت کی عمر اکثر ساٹھ ستر کے درمیان ہی ہے، کوئی کوئی آگے بڑھتا ہے، تو ان کے لئے جب وقت تھوڑا ہے تو وقت تھوڑا ہونے کے ساتھ مقدار کے لحاظ سے عبادت کم رہ جائے گی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف دیا کہ ایک رات ایسی رکھ دی کہ جو شخص اس ایک رات میں

عبادت کرلے گا تو یہ ایک رات تراسی سال سے بہتر قرار دے دی گئی، ہزار مہینے کے تراسی سال اور کچھ دن اُوپر بنتے ہیں، تو اس ایک رات کی عبادت کو تراسی سال سے بھی بہتر قرار دے دیا گیا، تو مطلب اس کا یہی ہے کہ اگر آپ اس رات میں عبادت کریں گے جو بھی عبادت کریں گے ایسے سمجھا جائے گا گویا کہ تراسی سال تک رات میں آپ یہی عبادت کرتے رہے ہیں بلکہ اُس سے بھی بہتر۔

''لیلۃ القدر'' کی فضیلت پانے کے لئے اس کا معلوم ہونا ضروری نہیں

تو لیلۃ القدر کی اِس فضیلت کو پانے کے لئے لیلۃ القدر کا معلوم ہونا ضروری نہیں، بعض اللہ والوں کو کچھ انوار معلوم بھی ہوجاتے ہیں، کچھ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے نزول کی خبر بھی ہوجاتی ہے، لیکن اِس فضیلت کے حاصل کرنے کے لئے اس کا معلوم کرنا ضروری نہیں، آپ اپنے طور پر رات کو عبادت کریں، اگر وہی رات لیلۃ القدر ہوئی تو اللہ کے حساب میں آپ کی عبادت اتنے اضافے کے ساتھ لکھ دی جائے گی، تو اس کا معلوم ہونا کوئی ضروری نہیں، اور نہ اس کے لئے کوئی قطعی طور پر رات متعین ہے، یعنی راجح یہ ہے کہ یہ طاق راتوں میں سے کسی رات میں ہوتی ہے، اکیس، تئیس، پچیس، ستائیس اور اُنتیس، تو جو شخص بھی رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اِن راتوں کا اہتمام کرلے تو غالب اُمید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے

خاص اوقات کی برکات صرف اُنہی اوقات کے ساتھ خاص ہیں

اور وہ فضیلت کسی دوسری رات میں حاصل نہیں کی جاسکتی، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوقات میں بعضی برکتیں رکھی ہوئی ہیں، اِس کو یوں سمجھئے، مثلاً ہفتے کے بعد آپ کے ہاں، ہفت روز کے بعد جمعہ آتا ہے، جمعہ کو آپ دو رکعت پڑھتے ہیں خاص ترتیب کے ساتھ، تو اس پر جو فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ دس دِن کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں،[1] اور جب انسان جمعہ کی طرف پیدل جاتا ہے تو اس کو قدم قدم پر ثواب ملتا ہے،[2] تو یہ جو فضیلتیں نقل کی گئی ہیں، اب باقی ایام میں جو چھ دِن ہیں درمیان میں، جمعہ سے لے کر جمعہ تک درمیان میں جو چھ دِن آتے ہیں، اگر آپ چھ دِن میں ہر روز اِس اہتمام کے ساتھ اسی طرح سے خطبہ پڑھ کے دو رکعتیں پڑھتے رہیں تو آپ جانتے ہیں کہ اس پر کچھ بھی اثر مرتب نہیں ہوتا، کیونکہ اِس فضیلت کے حاصل کرنے کا وہی ایک خاص وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے اُس میں ایک تاثیر رکھی ہے۔ رمضان المبارک کا وقت اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت کے لئے متعین کردیا، جس میں نیکیاں بہت بڑھتی ہیں جو اس موسم میں کی جائیں، اب اگر دُوسرے وقت میں آپ چاہیں کہ آپ روزے رکھ کے وہ فضیلت حاصل کرلیں یا رات کو قیام کرکے وہ فضیلت حاصل کرلیں تو نہیں کرسکتے، اُس وقت میں اللہ نے ایسا اثر رکھا ہے۔ نو ذی الحج کو ظہر

---

(۱) ابوداؤد ۱/ ۱۵۸ باب الكلام والإمام يخطب/مشكوٰة ۱/ ۱۲۳ باب التنظيف، فصل ثالث۔ فَهِيَ كَفَّارَةٌ إِلَى الْجُمُعَةِ الَّتِي تَلِيهَا وَزِيَادَةَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ

(۲) مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَغَسَّلَ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَدَنَا وَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ كَانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ يَخْطُوهَا أَجْرُ سَنَةٍ صِيَامُهَا وَقِيَامُهَا. (ترمذی ۱/ ۱۱۱۔ مشکوٰة ۱/ ۱۲۲)

سے لے کے بعد والا جو وقت ہے وقوفِ عرفہ کا، اُس میں اللہ تعالیٰ نے یہ اثر رکھا ہے کہ جب ایک خاص مقام میں، اِس خاص وقت میں جا کے لوگ ٹھہرتے ہیں تو ان کا حج ہو جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص تین سو انسٹھ دِن جا کر وہیں ٹھہرتا رہے اور جا کے اسی طرح سے قیام کرتا رہے تو ذرا برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جو وقت جس نیکی کے بڑھنے پھولنے کے لئے رکھ دیا، وہ نیکی اسی وقت میں کی جائے گی تو بڑھے گی پھولے گی، دُوسرے اوقات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے جس رات میں لیلۃ القدر نہ ہو، یہ فضیلت نہ ہو، آپ اگر ہزار مہینے چھوڑیئے! کتنے سال ہی عبادت کرتے رہیں تو اُس فضیلت کو حاصل نہیں کر سکتے جو لیلۃ القدر میں عبادت کرنے کے ساتھ حاصل ہوگی، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوقات میں اس قسم کی تاثیرات رکھی گئی ہیں، اپنی حکمت کے تحت اس نے بعض اوقات کو بعض کے مقابلے میں فضیلت دی ہے، دُوسرے دِنوں کی عبادت اس کے مقابلے میں نہیں آسکتی۔ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَہْرٍ: قدر کی رات ہزار مہینے کے مقابلے میں بہتر ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْہَا: اُترتے ہیں فرشتے اور رُوح، رُوح سے مراد رُوحُ القدس، جبریل، ان کا ذکر خصوصیت سے کر دیا، یعنی اس رات میں فرشتے اُترتے ہیں اور جبریل علیہ السلام اُترتے ہیں، بِاِذْنِ رَبِّہِمْ: اپنے رَبّ کی اجازت کے ساتھ، اپنے رَبّ کے حکم سے یہ فرشتوں کی فوجیں آتی ہیں، مِنْ کُلِّ اَمْرٍ: بِکُلِّ اَمْرٍ یعنی ہر اَمرِ خیر کو لے کے، جس کو دُوسری جگہ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ کے ساتھ تعبیر کیا، فِیْہَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ (سورۂ دُخان) اَمرِ حکیم: حکمت والا کام، ''ہر اَمرِ خیر کو لے کر یہ فرشتے اُترتے ہیں۔''

''ھِیَ سَلٰمٌ'' میں ترکیبی اِحتمالات

سَلٰمٌ: ھِیَ سَلٰمٌ وہ رات سلامتی ہی سلامتی ہے، یعنی ھِیَ مبتدأ نکال لیں گے، اور سَلٰمٌ خبر بن جائے گا، آگے جو ھِیَ ہے ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ میں وہ علیحدہ ہے، ھِیَ سَلٰمٌ علیحدہ نکالیں گے، ھِیَ نکالیں گے تو ھِیَ ضمیر لوٹ جائے گی لَیْلَۃُ الْقَدْرِ کی طرف، ''لیلۃ القدر سلام ہے'' یعنی سراپا سلامتی ہے، اس میں اللہ کی طرف سے سلامتی ہی سلامتی اترتی ہے۔ اور ھُوَ سَلٰمٌ بھی تقدیر نکالی گئی ہے، پھر یہ جملہ اَمْرٍ کی صفت بن جائے گی، ''ہر اَمر جو کہ سلامتی کا باعث ہے۔'' تو لفظ سلام کی ترکیب دو طرح سے ہو سکتی ہے، یا تو یہ رات کو سلامتی کہا جا رہا ہے کہ سراپا سلامتی ہے، اس میں سلام ہی سلام اُترتا ہے، تو پھر ہم اس کو ھِیَ سَلٰمٌ کر لیں گے۔ ھِیَ کی ضمیر لوٹ جائے گی رات کی طرف اور سَلٰمٌ اُس کی خبر ہوگی، اور سَلٰمٌ چونکہ مصدر ہے تو یہ مذکر مؤنث دونوں طرح سے ہی آ سکتا ہے، ھِیَ مبتدأ، سَلٰمٌ خبر، ''یہ رات سلامتی ہی سلامتی ہے۔'' اور ھُوَ سَلٰمٌ اگر نکال لیا جائے تو پھر یہ اَمْرٍ کی صفت بھی بن سکتا ہے، ''ہر اَمر کے ساتھ فرشتے اُترتے ہیں، ہر اَمر جو کہ سلامتی ہی سلامتی ہے'' جس طرح سے کہ اس کو اَمرِ حکیم کے ساتھ تعبیر کیا گیا وہاں (سورۂ دُخان میں)، یہاں اَمرِ سلام کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ''ہر سلامتی والے اَمر کے ساتھ، ہر خیر و برکت والے اَمر کے ساتھ فرشتے اُترتے ہیں۔'' آگے ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ: اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ وہ رات اِسی خیر و برکت کے ساتھ طلوعِ فجر تک باقی رہتی ہے، ہر رات ہی طلوعِ فجر تک باقی رہا کرتی ہے، وہ رات بھی طلوعِ فجر تک باقی رہتی ہے، تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِسی خیر و برکت کے ساتھ، یہ نہیں

کہ اس کے کسی خاص جزء میں اللہ نے یہ اثر رکھا ہے تو اُس کا خاص جزء باعث برکت ہے یا باعث سلامتی ہے، نہیں او وہ رات اِسی خیر و برکت کے ساتھ طلوعِ فجر تک باقی رہتی ہے، یعنی یہ خیر و برکت اور سلامتی اس رات میں سارا وقت رہتی ہے، یہ نہیں کہ ایک وقت میں ہو اور ایک وقت میں نہ ہو، حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ: یہ رات اِنہی برکات کے ساتھ باقی رہتی ہے طلوعِ فجر تک، فجر کے طلوع ہونے تک۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتها ۸ | ۹۸ سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۰ | رکوعها ۱

سورۂ بینہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہیں وہ جدا ہونے والے نہیں تھے حتیٰ کہ آجاتی ان کے پاس

الْبَيِّنَةُ ۝۱ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳ وَمَا

واضح دلیل ۝ اللہ کی طرف سے رسول جو تلاوت کرتا پاکیزہ صحیفوں کی ۝ ان صحیفوں میں مضبوط اور دُرست مضامین ہیں ۝ نہیں

تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴ وَمَآ اُمِرُوْٓا

پھوٹ ڈالی ان لوگوں نے جو کتاب دیے گئے مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیل آگئی ۝ نہیں حکم دیے گئے یہ لوگ

اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ

مگر اس بات کا کہ عبادت کریں اللہ کی اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوں اس کے لئے دِین کو، اس حال میں کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر دینِ حق

وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ

کی طرف متوجہ ہونے والے ہوں، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، دُرست ملّت کا طریقہ یہی ہے ۝ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے

الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّةِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ

جو کافر ہیں گے وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، اور یہ سب مخلوق میں سے بدتر ہیں ○ بے شک

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّةِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں یہ مخلوق میں سے بہتر ہیں ○ ان کا بدلہ ان کے ربّ

رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ

کے نزدیک ہمیشگی کے باغات ہیں، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے،

رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ع

اللہ ان سے خوش، وہ اللہ سے خوش، یہ مقام اس شخص کو حاصل ہوگا جو اپنے ربّ سے ڈرتا ہے ○

ماقبل سے ربط اور سورۂ بینہ کا مضمون

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ سورۂ بینہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں۔ پچھلی سورت میں قرآنِ کریم کے اُتارنے کا ذکر تھا ایک باعظمت وقت میں، جس سے خود اس کتاب کی عظمت بھی نمایاں تھی، کہ اللہ تعالیٰ اُتارنے والے ہیں اور ایسے مبارک وقت میں اُتارنے والے ہیں، اور یہ سورت جو اَب آپ کے سامنے آرہی ہے اس سورت میں یہ واضح کیا جارہا ہے کہ اس کتاب کی قدر کرنی چاہیے تھی مشرکین کو بھی اور اہلِ کتاب کو بھی، لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں کی، بلکہ اس کو بھی اپنے اختلافات کا نشانہ بنالیا، تو جس کے نتیجے میں دو گروہ ہو گئے، اِس کتاب کے ماننے والے اور نہ ماننے والے، تو ان دونوں گروہوں کا انجام ذکر کیا جارہا ہے۔

تفسیر

لَمۡ یَكُنِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِیۡنَ...... مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِیۡنَ یہ الَّذِیۡنَ کا بیان ہوجائے گا، جو لوگ کافر ہیں اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے وہ جدا ہونے والے نہیں تھے۔ مُنۡفَكِّیۡنَ یہ لَمۡ یَكُنِ کی خبر ہے، اِنفکاک: جدا ہونا، "باز آنے والے نہیں تھے، جدا ہونے والے نہیں تھے، جب تک ان کے سامنے واضح دلیل نہ آجاتی" یعنی اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین، جنہوں نے کفر اختیار کررکھا ہے وہ اپنے اس کفر کے طریقے پر اتنے اَڑے ہوئے اتنے جمے ہوئے ہیں اور اتنے پختہ ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نمایاں اور واضح دلیل نہ آجاتی اس وقت تک یہ اپنے کفر سے ہٹنے والے نہیں تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اِن کے لئے واضح دلیل بھیج دی، جس کے بعد چاہیے تھا کہ یہ اپنے کفر سے باز آجاتے، لیکن یہ کفر سے باز نہیں آئے،

بلکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بھیجی تھی باعث ہدایت بنا کر، اس کو بھی اِنہوں نے اپنے اختلافات کے نشانہ بنالیا۔ یہ تو اُن کے کُفر کی پہلے پختگی ذکر کی گئی ہے کہ اپنے طور طریقے پر وہ اس طرح سے جمے ہوئے تھے کہ کسی صورت میں ہٹنے والے نہیں تھے، ہر طرف کُفر کی ظلمت تھی، اور کوئی آگے روشنی نہیں تھی جس کی بنا پر اس ظلمت سے چھٹکارا پایا جاسکے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ رسول بھیجا، اس کے ساتھ اچھے اچھے مضمون اُتارے، واضح واضح باتیں اُتاریں، تو چاہیے تھا کہ اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں ہی اس سے فائدہ اُٹھاتے۔ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا یہ لَمْ یَكُنِ کا اسم ہے اور مُنْفَكِّیْنَ خبر ہے۔ ''اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہیں، جنہوں نے کُفر کیا ہے، جدا ہونے والے نہیں تھے حتّٰی کہ آجاتی اُن کے پاس واضح دلیل۔'' آگے واضح دلیل کا بیان ہے رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً: اللہ کی طرف سے رسول، تلاوت کرتا ہے پاکیزہ صحیفوں کی، پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے، صحیفہ اصل میں کہتے ہیں اُس ورق کو جس میں کوئی مضمون لکھا ہوا ہو، تو قرآنِ کریم اُترنے کے بعد چونکہ اسی طرح سے اوراق میں لکھا جانے والا تھا اس لئے اس کو صحف کے ساتھ ہی تعبیر کیا گیا ہے، سورۂ عبس کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا۔ مطہرۃ: صاف ستھرے، جس میں کوئی شیطانی دخل نہیں، کسی ناپاک نجس آدمی کا اِس میں کوئی دخل نہیں، اصل سے ہی پاک ہے، پاکیزگی کے ساتھ ہی اُتارا گیا، پاک لوگوں پہ اُتارا گیا، پاک لوگ ہی اِس سے اِستفادہ کرتے ہیں، ہر لحاظ سے اِس میں طہارت ہی طہارت ہے، ''تلاوت کرتا ہے پاکیزہ صحیفوں کی۔''

قرآنِ کریم میں سابقہ تمام کُتب کے مضامین موجود ہیں

فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ: كُتُبٌ کتاب کی جمع ہے، اور قیمہ: مضبوط اور دُرست کو کہتے ہیں، ''ان صحیفوں میں مضبوط اور دُرست کتابیں ہیں''، اگر کُتب سے کتاب ہی مراد لے لی جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس رسول پر جو صحیفے اُتارے ہیں سابقہ کُتب کے مضامین بھی سارے کے سارے اِن کے اندر آگئے، پہلے اللہ کی طرف سے جو کتابیں اُتری ہیں جو کُتبِ قیمہ کا مصداق ہیں وہ بھی ساری کی ساری اِن صحیفوں میں آگئیں، فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ کا معنی یہ ہوگیا کہ اِن صحفِ مطہرۃ میں جو یہ رسول پڑھتا ہے ان میں پہلی آسمانی کتابیں بھی موجود ہیں، توراۃ، اِنجیل، زَبور میں جو مضامین اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لئے بیان فرمائے تھے وہ سب اِس میں موجود ہیں، کیونکہ دِین کے اُصول تو تمام انبیاء ﷩ کے ہاں ایک ہی رہے ہیں، دِین کی جو بنیاد ہے وہ توحید ہے، رسالت ہے، معاد ہے، آخرت کا عقیدہ، جن اور فرشتوں کے متعلق عقیدہ، یہ سارے کے سارے مضمون تمام کتابوں کے اندر آئے اور سب کے نزدیک مسلمہ ہیں، فرق اگر پڑا ہے تو کچھ عملی اَحکام کے اندر پڑا ہے، ورنہ جہاں تک اُصول کا تعلق ہے وہ انبیاء ﷩ کے ہمیشہ سے ایک ہی رہے ہیں، تو اُن کتابوں کے اندر جو اچھی اچھی باتیں مضبوط مضبوط مضمون آئے ہوئے تھے وہ سارے اِن صحیفوں میں موجود ہیں جو یہ رسول پڑھتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بیّنہ بنا کر بھیجا ہے، واضح دلیل بنا کر بھیجا ہے...... اور اگر کُتب کتاب کی جمع، اس کو لغوی معنی میں لے لیا جائے یعنی مکتوب، لکھی ہوئی بات، پھر یہ مضمون کے معنی میں ہوجائے گا، تو پھر اس کا ترجمہ کرلیں گے ''اُن صحفِ مطہرہ میں، ان پاکیزہ صحیفوں میں بڑے مضبوط مضبوط، دُرست اور ٹھیک مضامین موجود ہیں۔''

قَيِّمَةٌ: مستقیمہ، ٹھیک، مضبوط، دُرست۔ اُن صحفِ مطہرہ میں مضبوط، دُرست، ٹھیک ٹھیک مضامین موجود ہیں، ایسے صحیفے رسول پڑھتا ہے، یہ رسول اُس بینہ کا مصداق ہے، جب تک یہ بینہ نہ آجاتی اس وقت تک کُفر سے چھوٹنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا، نہ اہلِ کتاب کُفر سے بچ سکتے تھے نہ مشرکین بچ سکتے تھے۔

اہلِ کتاب سے شکوہ

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ: اہلِ کتاب اُس وقت اہلِ علم سمجھے جاتے تھے، جب یہ کتاب آئی اور اللہ کے رسول نے پڑھ پڑھ کر سنانی شروع کی، تو مشرکین نے بھی اختلاف کیا، اور اہلِ کتاب تک جب اِس کی آواز پہنچی تو اہلِ کتاب نے بھی اختلاف کیا، اب اُسی کا آگے شکوہ کیا جارہا ہے، ''نہیں پارٹی بازی کی نہیں فرقہ بازی کی نہیں پھوٹ ڈالی اُن لوگوں نے جو کتاب دیے گئے مگر بعد اِس کے کہ اُن کے پاس بینہ آگئی'' اَلْبَيِّنَةُ سے وہی بینہ مراد ہے جس کا ذکر پیچھے آیا، اِس بینہ کے آجانے کے بعد پھر اہلِ کتاب نے آپس میں پھوٹ ڈال لی، بعضے ماننے والے تھے اور بعضے انکار کرنے والے تھے، اور جب اہلِ کتاب جو کہ اہلِ علم تھے انہوں نے تفرق کیا تو مشرکین کا تو کیا ہی کہنا، ان کا اختلاف تو نمایاں تھا ہی، یعنی اس بینہ کے آجانے کے بعد انہوں نے قدر نہیں کی، اس روشنی میں اپنے لئے راستہ نہیں دیکھا، راستہ نہیں تلاش کیا، بلکہ اِس کو بھی اپنے لئے فرقہ بازی کا ذریعہ بنالیا۔ ''نہیں پھٹے'' تَفَرَّقَ: پھٹنا، علیحدہ علیحدہ ہوجانا، اختلاف کرنا، ''نہیں جدا جدا ہوئے وہ لوگ جو کتاب دیے گئے مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیل آگئی۔'' حالانکہ اختلاف کی کوئی بات نہیں تھی، جو اَحکام ان کو سابقہ کتابوں میں دیے گئے وہی اِس کتاب میں دیے گئے، وہ اَحکام کیا ہیں؟ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: نہیں حکم دیے گئے یہ لوگ مگر اس بات کا کہ عبادت کریں اللہ کی اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوں اُس کے لئے دِین کو، حُنَفَآءَ: اس حال میں کہ ہر طرف سے یکسو ہونے والے ہوں، حنفاء حنیف کی جمع ہے، حنیف اُس شخص کو کہتے ہیں جو کہ ہر طرف سے ہٹ ہٹا کے اللہ کی طرف ہوجائے، اَدیانِ باطلہ سے ہٹ کر دِینِ حق کی طرف متوجہ ہوجائے، اصل کے اعتبار سے یہ لقب ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، اور پھر جو لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی اِتباع کرنے والے ہیں وہ اُسی ابراہیم حنیف کی اتباع میں حنفاء کہلاتے ہیں۔ تو ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ اللہ کے لئے اپنے دِین کو خالص کریں، عقیدے کو خالص کریں، ہر طرف سے ہٹ ہٹا کر اللہ کی طرف متوجہ ہوجائیں اور اللہ کی عبادت کریں، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اِن کو حکم یہی دیا گیا تھا، اور یہی حکم ان کو اِس کتاب میں دیا گیا ہے، تو دونوں باتوں میں اختلاف کیا ہوا؟ یعنی جو چیز اِن کو پہلی کتابوں میں بتائی گئی تھی وہی اس کتاب میں بتائی جارہی ہے، پھر بھی یہ اس کو مانتے نہیں اور اس سے اختلاف کرتے ہیں، ''نہیں حکم دیے گئے وہ مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ کی اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوں اس کے لئے دِین کو'' دِین کا معنی عبادت، بندگی، عقیدہ، ''خالص کرنے والے ہوں اُس کے لئے طاعت کو'' دِین طاعت کو بھی کہتے ہیں، ''اس حال میں کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر دِینِ حق کی طرف متوجہ ہونے والے ہوں'' ابراہیم حنیف کی اتباع کرنے والے ہوں، ''اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں۔''

''دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ'' کے دو مفہوم

وَذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ...... اَلْقَیِّمَۃِ صفت کا صیغہ ہے، موصوف اِس کا محذوف ہے اَلْمِلَّۃُ الْقَیِّمَۃُ۔ دین الملۃ القیمۃ، دُرست ملّت، مضبوط ملّت، ٹھیک ملّت کا طریقہ یہی ہے، اور ملّتِ قیمہ کا مصداق ملّتِ ابراہیمی ہے جس کے وہ بھی مدعی تھے، مشرکین بھی مدعی تھے اور اہلِ کتاب بھی مدعی تھے، تو ملّتِ قیمہ کا طریقہ یہی ہے جو یہ اَحکام اِن کو دیے گئے تھے، اور وہی اب اِس کتاب کے اندر بیان کئے جارہے ہیں، تو اَلْقَیِّمَۃِ کا موصوف ملّت نکال لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ملّتِ قیمہ یعنی ملّتِ ابراہیمی، اُس کا طریقہ یہی ہے، کہ اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کریں، اور ہر باطل سے ہٹ جائیں، حق کی طرف متوجہ ہوجائیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اِخلاص کے اندر عقیدے کی صحت ذِکر کر دی گئی، شرک وغیرہ سے بچنا، اور اِقامتِ صلوٰۃ میں بدنی عبادت ذِکر کر دی گئی، اِیتائے زکوٰۃ میں مالی عبادت ذِکر کردی گئی...... اور اَلْقَیِّمَۃِ سے کُتبِ قیمہ بھی مراد لے سکتے ہیں جن کا ذِکر اُوپر آیا، ذٰلِكَ دِیْنُ الْكُتُبِ الْقَیِّمَۃِ، جن کُتبِ قیمہ کا اُوپر ذِکر آیا اُن کا طریقہ یہی ہے، یعنی اِن کُتبِ قیمہ کے اندر یہی بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کی جائے، اور دُوسرے دِینوں سے ہٹ کر دِینِ حق کی طرف متوجہ ہوجائیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، یہی مضمون اُن کُتبِ قیمہ کا ہے جن کا ذِکر پیچھے آیا، اور ان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں کہ جس سے اختلاف کی گنجائش ہو، ہمیشہ سے یہی حکم اللہ کی طرف سے آتا رہا ہے۔

مخلوق میں سے بدترین

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: اب یہ ان کی بڑائی اور تکبر کے اُوپر چوٹ لگائی ہے، کہ مشرکین بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، متکبر ہیں، اللہ کی بات اور اللہ کے رسول کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم ملّتِ ابراہیمی پر ہیں، اور ہم سب سے اچھے ہیں، اور یہی حال اہلِ کتاب کا ہے، اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا کا مفہوم یہاں یہ ہوگا کہ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو کافر رہیں گے، جو کُفر کرتے ہیں، کُفر سے باز نہیں آئیں گے، آخر وقت تک جو کافر رہیں گے، ''جہنم کی آگ میں جائیں گے، ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں گے'' اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ: اور یہ بدترینِ خلائق ہیں، بریہ کہتے ہیں مخلوق کو، شَرُّ الْبَرِیَّۃِ کا معنی ''سب مخلوق میں سے بدتر ہیں'' یہ جو اپنے آپ کو بہتر سمجھتے ہیں اور برتری کے زعم میں مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ شر البریۃ ہیں، بریہ سے مخلوق مراد ہوگی۔ یہ ایک کلیت کے درجے میں مذمت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، ہر ہر چیز کے ساتھ تفصیلاً مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہوتا، کہ آپ یہ کہیں کہ کیا اِس قسم کے کافر شیطان سے بھی بدتر ہیں؟ شیطان تو ان سب میں سے بدتر ہے، تو یہ مذمت بیان کرنے کا ایک عنوان ہے کہ بدترینِ خلائق ہیں، ساری مخلوق میں سے بدتر لوگ ہیں جو کُفر کرتے ہیں، اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے ہوں۔ تو یہ نارِ جہنم کی جو خبر دی جارہی ہے یہ اُن لوگوں کے متعلق ہوگی جو اِس کُفر پہ اَڑے رہیں، اللہ کے رسول کا انکار کر کے جو کافر ہوگئے جو اِسی کُفر پہ رہیں گے وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے اور وہ بدترین خلائق ہیں، چاہے وہ اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھتے ہوں مال دار ہونے کی وجہ سے، اچھے خاندان میں ہونے کی وجہ سے، انبیاء ﷺ کی

اولاد میں ہونے کی وجہ سے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک خیریت اِن چیزوں سے ثابت نہیں ہوتی کہ تم مال دار ہو یا نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کوئی برتری کی دلیل نہیں ہے کہ تم نیکوں کی اولاد ہو، اور نہ ہی یہ کوئی برتری کی دلیل ہے کہ تم اچھی جگہ میں حرم شریف میں رہنے والے ہو یا بیت المقدس کے اردگرد بسنے والے ہو، یہ چیزیں کسی شخص کے اندر خیر نہیں پیدا کرتیں، خیر پیدا ہوتی ہے ایمان اور عقیدے سے، اور وہ ایمان اور عقیدہ ان کا ٹھیک نہیں ہے، تو ایسی صورت میں یہ بدترین خلائق ہیں۔

مخلوق میں سے بہترین

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ: یہ بہترین خلائق ہیں، یہ اُن کے مقابلے میں آ گئے، مخلوق میں سے یہ بہتر ہیں، معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتری ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ نصیب ہوا کرتی ہے، نہ مال دار ہونے کے ساتھ، نہ کسی اچھے خاندان سے منسلک ہونے کے ساتھ، نہ کسی اچھوں کی اولاد میں ہونے کے ساتھ، یا کسی اچھے کے ساتھ تعلق ہونے کی بنا پر، اگر ایمان اور عملِ صالح ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر ہیں، اور اگر ایمان اور عملِ صالح کی دولت سے محروم ہیں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدتر ہیں۔ یہ ایک اِجمال کے طور پر مدح کر دی گئی کہ بہترینِ خلائق ہیں، باقی! ہر ہر فرد کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں کہ کیا سارے کے سارے ایمان اور عملِ صالح والے سب فرشتوں سے افضل ہیں؟ وہ تفصیل اپنی اپنی جگہ موجود ہے کہ انسان فرشتے سے افضل ہے؟ کس انداز سے افضل ہے، کس انداز سے افضل نہیں ہے، وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (سورۂ اسراء: ۷۰) اس آیت کے ضمن میں کچھ اس کی تفصیل عرض کی تھی۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: اِن کا بدلہ ان کے ربّ کے نزدیک جَنّٰتُ عَدْنٍ: ہیشگی کے باغات ہیں، تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا: اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے، ان کو اللہ یہ بدلہ دے گا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ: اللہ ان سے خوش، وہ اللہ سے خوش، یعنی آخرت میں جس وقت بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گا، تو بندوں کے خوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کی کوئی آرزو باقی نہیں رہے گی جو اللہ پوری نہ کر دیں، اس لئے بندوں میں رضا ہی رضا، خوشی ہی خوشی ہوگی، دل کے کسی گوشے کے اندر بھی کوئی شکوہ کوئی شکایت اور کوئی طلب اس قسم کی نہیں ہوگی کہ جس کے پورا نہ ہونے کی بنا پر دل میں انقباض آئے کہ اللہ نے ہماری فلانی خواہش پوری نہیں کی، ایسی بات نہیں ہوگی، خوش ہی خوش ہوں گے، ہر مرضی ان کی پوری ہو جائے گی، اور ہر خواہش اُن کی پوری ہو جائے گی۔ بندے تو خوش اس طرح سے ہوں گے، اور اللہ بھی بندوں سے خوش، اللہ کی طرف سے بھی بندوں کا کوئی شکوہ، کوئی شکایت، کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں ہوگا، اللہ بھی خوش ہوگا۔

اللہ کی رضا کا اِظہار جنّت کی اعلیٰ ترین نعمت ہے

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا کا اظہار یہ جنّت کے مقامات میں سے سب سے اعلیٰ مقام ہے جیسے کہ روایاتِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب جنّتی جنّت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر متوجہ ہوں گے اپنی شان کے مطابق جیسے اُس کی شان ہے، اور اہلِ جنّت سے پوچھیں گے کہ کیا تم سب خوش ہو گئے؟ وہ کہیں گے کہ جی کیوں خوش نہ ہوں، آپ

نے ہمیں یہ نعمت دے دی، یہ نعمت دے دی، تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ کچھ اور بھی چاہیے؟ وہ کہیں گے کہ یا اللہ! اب تو کسی چیز کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، ہم اور کیا چاہیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں تم پر اپنی رضا کا اظہار کرتا ہوں، اب آئندہ کبھی بھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا۔[1] تو یہ رضا کا اعلان جس وقت ہوگا تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنتی اتنے خوش ہوں گے کہ جنت کی کسی نعمت پر ان کو اتنی خوشی نہیں ہوئی ہوگی جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان سُن کر وہ خوش ہوں گے، تو جس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی رضا کا حاصل ہو جانا یہ جنت کے مقامات میں سے بھی سب سے اعلیٰ مقام ہے اور جنت کی نعمتوں میں سے سب سے برتر نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کا اعلان فرمادیں، تو جو اس طرح سے ایمان اور عملِ صالح لے کر جائیں گے وہ اللہ سے خوش رہیں گے، اللہ ان سے خوش رہے گا، وہ اللہ سے خوش رہیں گے کہ اللہ کی طرف سے کوئی معاملہ ایسا نہیں ہوگا جس پر اُن کے دِل میں کوئی شکایت پیدا ہو، اور اللہ ان سے خوش رہے گا کہ کبھی بھی ناراضگی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی۔

اللہ کا خوف وخشیت بہت بڑی سعادت ہے

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ: یہ مقام حاصل کن کو ہوگا؟ اِبتدا میں تو بنیاد رکھی گئی ایمان اور عملِ صالح پر، لیکن پھر اُس کا تکرار کردیا گیا اس بات کے ساتھ کہ یہ مقام اس شخص کو حاصل ہوگا جو اپنے رَبّ سے ڈرتا رہے، اور جو اپنے رَبّ سے ڈرے گا، بن دیکھے ڈرے گا، وہی ایمان اور عملِ صالح کی دولت حاصل کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا خوف اور خشیت یہ بہت بڑی سعادت ہے، اگر کسی انسان کو حاصل ہوجائے، اِسی کی بنا پر ہی اللہ کی رضا نصیب ہوا کرتی ہے، جتنا بے خوف ہوتے چلے جائیں گے، بدعمل ہوتے چلے جائیں گے، اتنی اللہ کی ناراضگی آئے گی، اور جتنا اللہ کا خوف دِل میں بیٹھتا چلا جائے گا اتنا انسان اَحکام کا پابند ہوتا چلا جائے گا اور اتنا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ انسان کو ملتا چلا جائے گا، تو اللہ کی طرف سے رضا انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں۔

اٰیاتُها ۸	۹۹ سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ ۹۳	رکوعها ۱

سورۂ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ

جب ہلائی جائے گی زمین خوب ہلایا جانا ۝ اور زمین اپنے بوجھ نکال دے گی ۝ اور اِنسان کہے گا

(۱) بخاری ۲/۹۶۹، کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنۃ والنار / مشکوٰۃ ۲/۴۹۶ باب صفۃ الجنۃ، فصل اول۔ نوٹ: مضمون تھوڑا سا مختلف ہے۔

الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۞۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۞۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۞۵

کہ اِس زمین کو کیا ہو گیا؟ ۞۳ اُس دِن زمین اپنی خبریں بیان کردے گی ۞۴ اس سبب سے کہ تیرے رَبّ نے اس کو حکم دیا ۞۵

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۞۶ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

اُس دِن لوٹیں گے لوگ مختلف حالات پر تا کہ ان کو ان کے اعمال دِکھا دیے جائیں ۞۶ پھر جس شخص نے ذرّہ برابر بھلائی کی ہوئی ہوگی

خَيْرًا يَّرَهٗ ۞۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞۸

وہ اس کو دیکھ لے گا ۞ اور جس نے ذرّہ برابر کوئی بُرائی کی ہوگی، وہ اس کو بھی دیکھ لے گا ۞

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

سورۂ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں۔ پچھلی سورت میں بُروں کے لئے سزا کا ذکر تھا: فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا، اور اچھوں کے لئے جزا کا ذکر تھا، اور یہ چیز چونکہ ظاہر ہوگی قیامت کے دِن، تو اِس سورت کے اندر قیامت کا اِثبات ہے، اور وہی جزائے اعمال کا ذکر ہے جو مضمون پہلے آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

سورۂ زلزال کی فضیلت

بعض بعض سورتوں کے فضائل حدیث شریف میں خاص طور پر ذکر کیے گئے ہیں، تو سورۂ زلزال کے متعلق بھی بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی یہ فضیلت دی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس کے تلاوت کرنے پر نصف قرآن کا ثواب ہوتا ہے،[1] جس طرح سے سورۂ اِخلاص کا ثواب ہے، سورۂ فاتحہ کا ہے، اور اسی طرح سے بعض سورتوں کی خاص خاص فضیلت منقول ہے، تو ان میں سے اِس کی بھی فضیلت ہے، اِس کو نصف القرآن کے برابر ٹھہرایا گیا ہے۔

تفسیر

قیامت کے دِن زمین کا زلزلہ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا: زلزال مصدر ہے، اور زُلْزِلَتْ کے ساتھ یہ بطور مفعول مطلق کے آیا ہے، جب ہلائی جائے گی زمین خوب ہلایا جانا، زلزال مصدر ہے، "ھا" ضمیر "ارض" کی طرف لوٹے گی، اور یہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، "جب زلزلے میں ڈالی جائے گی زمین، ہلا ڈالی جائے گی زمین خوب اچھی طرح سے ہلایا جانا" یعنی جیسا زلزلہ اُس کی شان کے لائق ہے، یہ زلزلہ نفخۂ اُولیٰ کے وقت بھی آئے گا، اور علاماتِ قیامت میں بھی داخل ہے، اور یہاں جو واقعات ذکر کئے جارہے ہیں

(۱) ترمذی ۲/۱۱۷، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی اذا زلزلت۔ مشکوٰۃ ۱/۱۸۸، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی۔ اِذَا زُلْزِلَتْ تَعْدِلُ نِصْفَ الْقُرْآنِ۔

اس میں بعض نفخۂ اُولیٰ کے ہیں اور بعض نفخۂ ثانیہ کے، بہر حال قیامت کے دن کے حالات ہیں، قیامت کا دن شروع ہو جائے گا نفخۂ اُولیٰ سے، آگے سارے کا سارا جو بھی ہے وہ ایک ہی دن سمجھا جائے گا، اس لئے جتنے واقعات بھی پیش آئیں گے ان کو ایک دن کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، حاصل اس کا یہی ہے کہ جب قیامت آ جائے گی، زمین کو زلزلہ آئے گا اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یہ سورۂ حج کی ابتدا میں آیا تھا، کہ قیامت کا زلزلہ بہت بڑا حادثہ ہے، اور یہ زلزلہ آئے گا، زمین میں کپکپی طاری ہوگی، نشیب وفراز سب ٹھیک ہو جائے گا، پہاڑ بیٹھ جائیں گے، ایک کف دست کی طرح سارے کا سارا میدان بن جائے گا۔

زمین اپنے سارے خزانے باہر پھینک دے گی

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا: اثقال ثِقل کی جمع ہے، ثقل بوجھ کو کہتے ہیں، ''اور زمین اپنے اَثقال نکال دے گی'' جو کچھ اس کے اندر بوجھ پڑے ہوئے ہیں سب نکال کے باہر پھینک دے گی، اس سے مُردے مراد ہیں جو دفن ہوئے ہوئے ہیں، وہ بھی باہر نکل آئیں گے، اور اسی طرح سے خزینے، دفینے، جتنے زمین کے اندر ہیں سب اُگل دے گی، مال دولت سب نمایاں ہو جائے گا جو بھی مدفون ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت یہ زمین سارے کے سارے خزانے نکال کے باہر پھینکے گی تو یہ بھی انسان کے لئے ایک حسرت اور افسوس کا مقام ہوگا کہ انسان دیکھے گا اور دیکھ کر کہے گا کہ یہی وہ دولت ہے، یہی وہ سونا چاندی، یہی وہ روپیہ پیسہ ہے، جس کی بنا پر میں ان گناہوں میں مبتلا ہوا، اِن کی تو کچھ قدر ہی نہیں، یہ تو اسی طرح سے ہیں جس طرح سے کہ ٹھیکریاں اور مٹی کے روڑے پڑے ہوتے ہیں، کوئی ان کی قدر و قیمت نہیں۔[1] جو اِنہی پیسوں کی وجہ سے قطع رحمی کرتا رہا کہ اپنے رشتے داروں کے حقوق ادا نہیں کرتا تھا وہ بھی دیکھ کر پچھتائے گا کہ اس دولت کی وجہ سے میں نے اپنے رشتے داروں سے توڑی، اور اگر کسی نے مال و دولت حاصل کرنے کے لئے کسی کو قتل کیا ہے وہ بھی ہاتھ کاٹے گا کہ یہ ایسی بے قدر چیز تھی جس کی خاطر میں نے کسی کی جان لی تھی، اور چور جس کا ہاتھ کٹا ہوگا وہ بھی دیکھے گا کہ یہ بے قدر چیز تھی جس کی خاطر میں نے اپنا ہاتھ کٹوایا اور یہ ذلت اپنے سر پہ ڈالی، تو حسرت اور افسوس بڑھانے کے لئے اللہ تعالیٰ مال و دولت کے خزانے جتنے بھی ہیں وہ زمین سے نکال کر اُوپر پھینک دیں گے، انسان ان کو دیکھے گا، اور اسی طرح سے زمین میں مدفون مُردے اور مُردوں کے اجزا سب باہر نکل آئیں گے۔

زمین پر اِنسان تعجب کا اِظہار کرے گا

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا: اس وقت تعجب کے ساتھ انسان کہے گا کہ اِس زمین کو کیا ہو گیا؟ مَا لَهَا: کیا ہو گیا اِس زمین کو، یعنی یہ کس طرح سے ساری چیزیں نکال رہی ہے اور کس طرح سے نکال نکال کر باہر پھینک رہی ہے، اس کو کیا ہو گیا، یہ بطورِ تعجب کے کہے گا۔ اسی قسم کا تعجب نامۂ اَعمال کے متعلق بھی انسان ظاہر کرے گا، سورۂ کہف میں جس طرح سے آیا تھا، مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً: جب وہ نامۂ اَعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا تو انسان کہے گا کہ اس کتاب کو کیا ہو گیا، اس نے تو نہ کوئی

---

(۱) دیکھیں: مسلم ۱/ ۳۲۶، کتاب الزکاۃ باب الترغیب فی الصدقۃ قبل ان لا یوجد/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۶۹ باب اشراط الساعۃ، فصل اوّل/ ترمذی ۲/ ۴۴۔

چھوٹا عمل چھوڑا نہ بڑا عمل چھوڑا، اِلَّآ اَحْصٰهَا (آیت:۴۹) سب کو ہی اپنے احاطے میں لے لیا۔ یہ تعجب کا اظہار ہے۔ ''انسان کہے گا کہ کیا ہو گیا اِس کو؟''

زمین اِنسان کے اعمال کو ریکارڈ کر رہی ہے

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا...... يَوْمَئِذٍ: يَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا، جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں گے، جس دن ایسا ہوگا، تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا: زمین اپنی خبریں بیان کردے گی، تُحَدِّثُ تحدیث: بیان کرنا، خبریں بیان کرنے سے کیا مراد؟ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے اِس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے فرمایا[1] کہ اس کی خبریں یہی ہیں کہ جو واقعات اِس کے اُوپر پیش آئے ہیں وہ واقعات یہ نمایاں کردے گی، بتائے گی کہ فلاں شخص نے میری پشت کے اُوپر فلاں وقت میں نیک عمل کیا، فلاں شخص نے میری پشت کے اُوپر فلاں وقت میں بُرا عمل کیا، اب آپ جانتے ہیں کہ انسان کی آبادی زمین پر ہی ہے، اور جو کچھ یہ کرتا کراتا ہے، زمین پر ہی کرتا کراتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اِس کو بتارہے ہیں کہ تیرے اردگرد یہ جو مٹی کے ڈھیر ہیں، یہ بھی یوں سمجھو کہ جس طرح سے کیمرہ مشینیں لگی ہوئی ہیں، اور جو کچھ کرتے جارہے ہو سب اِس میں ریکارڈ ہوتا چلا جارہا ہے، تمہاری کوئی چیز نہیں چھپے گی، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آئے گا تو زمین بول بول کے بتادے گی کہ میرے اُوپر اس نے یہ کیا تھا یہ کیا تھا۔ جیسا کہ پیچھے آپ کے سامنے اعضا کے بولنے کا ذِکر آیا تھا کہ جو کچھ انسان کرتا کراتا ہے اس کے اَعضا میں بھی ریکارڈ ہوتا چلا جارہا ہے، اللہ جب چاہے گا وہ ساری کی ساری چیزیں بدن سے بھی اُگلوالے گا، زمین سے بھی اُگلوالے گا۔

یہ باتیں آپ کو اس لئے بتائی جارہی ہیں کہ ہر وقت آپ کے ذہن کے اندر یہ بات موجود رہے کہ ہمارا کوئی جرم چھپ نہیں سکتا، کتنا ہی چھپالیں، کتنا ہی ہم اُس کا اِخفاء کرنے کی کوشش کریں، چھپ نہیں سکتا، بدن سے علیحدہ ہو کر ہم کوئی کام نہیں کرسکتے، زمین سے علیحدہ ہو کر ہم کوئی کام نہیں کرسکتے، فرشتے کاتب اعمال ہم پر مسلط ہیں، ان سے بچ کر ہم کہیں نہیں جاسکتے، تو جب اتنی چیزیں ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہیں تو ہم کیوں سوچتے ہیں گناہ کرتے وقت کہ ہمارے اِس گناہ کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ کوئی عمل مخفی نہیں رہے گا، نہ نیکی مخفی رہے گی نہ برائی مخفی رہے گی، اگر یہ تصور کسی شخص کے دماغ میں راسخ ہو جائے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ کہیں بھی کسی جگہ بھی، کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت کی جرأت کرسکے، یہ جرأت جب ہوتی ہے اس غفلت کی بنا پر ہوتی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم چھپالیں گے، ظاہر نہیں ہوگی، یہاں تو چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہر چیز اردگرد والی آپ کے عمل کی گواہ ہے، اور جب اللہ کو منظور ہوگا اُس کی گواہی دلوادی جائے گی، تو یہاں حضور ﷺ نے فرمایا کہ زمین کی خبریں یہی ہیں کہ انسان کے اعمال کے متعلق گواہی دے گی کہ میری پشت پر فلاں شخص نے فلاں وقت میں یہ کام کیا تھا، یہ سب خبریں بیان کردے گی۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا: اور یہ اس کا خبریں بیان کرنا اس وجہ سے ہوگا کہ تیرے رَبّ نے اس کو حکم دیا، اِس سبب سے کہ تیرے رَبّ نے

(۱) ترمذی ۲/۱۷۳، تفسیر سورۃ اذا زلزلت/مشکوۃ ۲/۴۸۳ باب الحشر فصل ثانی کی پہلی حدیث۔

اُس کو حکم دیا، بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا: زمین کی طرف وحی کی تیرے رَبّ نے، تیرے رَبّ نے اس کو حکم دیا جس حکم کی بنا پر یہ سارے کے سارے کام ہوگئے۔

لوگوں کی مختلف قسمیں بن جائیں گی

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا: اشتات: متفرق کے معنی میں ہے، شَتٌّ کی جمع ہے۔ صَدَرَ صُدُوْر: واپس لوٹنا۔ جس دن ایسا ہوگا، یومئذٍ: یَوْمَ اِذْ کَانَ کَذَا، جب یہ واقعات پیش آئیں گے تو اِنسان متفرق لوٹیں گے، اللہ تعالیٰ کے ہاں سے پیش ہوکر متفرق ہوکر لوٹیں گے، کوئی کیسا ہوگا، کوئی کیسا ہوگا، کوئی فرقہ اور گروہ کسی طرح سے ہے، کوئی فرقہ اور گروہ کسی طرح سے ہے، مختلف گروہوں کی شکل میں لوٹیں گے، ''جس دِن کہ لوٹیں گے لوگ مختلف حالات پر'' کسی کا حال کوئی ہوگا، کسی کا حال کوئی ہوگا، کوئی کسی طرح سے ہوگا کوئی کسی طرح سے ہوگا، سارے ایک جیسے نہیں ہوں گے، لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ: تاکہ ان کو ان کے اعمال دِکھا دیے جائیں، ہرکوئی اپنے عملوں کا نتیجہ دیکھنے کے لئے واپس لوٹے گا۔

ذرّہ برابر کی ہوئی نیکی یا بُرائی نظر آجائے گی

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ: پھر جس شخص نے ذرّہ برابر بھلائی کی ہوئی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، مثقال وزن کو کہتے ہیں، ذرّہ کا لفظ ہماری زبان میں بھی ایسے ہی استعمال ہوتا ہے، ویسے اصل کے اعتبار سے لغۃً ذرّۃ کہتے ہیں چیونٹی کے بچّے کو جب وہ پیدا ہوتا ہے، تو چونکہ بہت چھوٹا ہوتا ہے تو ذرّہ بول کر چھوٹی چیز مراد لے لی جاتی ہے، اسی طرح سے یہ روشن دان میں سے جو دُھوپ اندر آتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس دُھوپ کے اندر ایسی بکھری ہوئی چیزیں نظر آیا کرتی ہیں، جن کو اگر آپ پکڑنا چاہیں تو نہیں پکڑ سکتے، خوردبین کے ساتھ اُن کو دیکھا جاسکتا ہے، ویسے بھی ذرا نمایاں ہوتی ہیں، تو یہ چیزیں بھی ذرّات کہلاتی ہیں۔ تو اتنی سی بھی نیکی اگر کسی نے کی ہوئی ہوگی تو اِنسان اس کو دیکھ لے گا۔ لیکن یہاں سے مراد وہ نیکی ہوگی جو قیامت تک باقی بھی رہ جائے، ورنہ اگر دُنیا کے اندر کوئی نیکی کی تھی بعد میں کوئی غلطی کرکے اس کو ضائع کرلیا، وہ نامۂ اَعمال سے کٹ گئی، مٹ گئی، اب وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی، جو چیز اس وقت تک باقی ہے وہ آپ دیکھ لیں گے (آلوسی)، یا دیکھنے میں یوں آجائے گی کہ زندگی بھر کی تفصیل آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ نیک کام ہم نے کیا تھا، اور یہ اب تک باقی ہے اس پہ ثواب مرتّب ہوگا، اور یہ نیک کام ہم نے کیا تھا لیکن اس کے بعد یہ بُرائی ہوگئی جس کی بنا پر یہ نیکی مٹ گئی، یوں تفصیل بھی ساری کی ساری ہمارے سامنے آسکتی ہے، تو جو کیا ہوگا سب سامنے آجائے گا۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا: اور جو کوئی کرے گا ذرّہ برابر شر، بُرائی، جس نے کوئی بُرائی کی ہوگی ذرّہ برابر، یَّرَهٗ: وہ اس کو بھی دیکھ لے گا، یہاں بھی وہی بات ہے، یا تو یہاں شر سے وہی شر مراد ہے جو قیامت تک باقی رہ جائے، ورنہ اگر کوئی گناہ کیا تھا، گناہ کرنے کے بعد توبہ کرلی تھی، اور اس توبہ کے ساتھ وہ گناہ مٹ گیا تو وہ وہاں دیکھنے میں نہیں آئے گا، یا یوں تفصیل سامنے آجائے گی کہ فلاں وقت ہم نے یہ گناہ کیا تھا لیکن اللہ نے فلاں نیکی کی برکت سے اس کو مٹادیا، فلاں وقت میں ہم نے گناہ کیا تھا اور فلاں توبہ کی برکت سے اللہ نے اُسے ختم کردیا، اور اب یہ یہ گناہ باقی ہیں جو ختم نہیں ہوئے، اِس طرح سے تفصیل اگر آجائے تو

پھر ہر نیکی اور ہر بُرائی، زندگی کے اندر جس دور میں بھی کی گئی، انسان اس کو دیکھ لے گا، آنکھوں کے سامنے ساری کی ساری آجائیں گی۔ تو یہ عقیدہ راسخ کیا جا رہا ہے انسان کے دِل میں کہ اپنے کسی عمل کو وہ بے کار نہ سمجھے، جو بھی کرے گا تھوڑا کرے، زیادہ کرے، اچھا کرے، بُرا کرے، کہیں کرے، ہر ہر عمل اُس کے سامنے نمایاں ہوگا، اور اس کے اُوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا اور سزا کا سلسلہ قائم ہوگا۔

آیاتها ۱۱ ۱۰۰ سُوْرَةُ الْعٰدِیٰتِ مَكِّيَّةٌ ۱۴ رکوعها ۱

سورۂ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۱ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِيٰتِ

قسم ان گھوڑوں کی جو دوڑنے والے ہیں اس حال میں کہ وہ ہانپتے ہیں ہانپنا ۝ پھر وہ گھوڑے جو کہ آگ نکالنے والے ہیں

قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ

زور سے پاؤں مار کر ۝ پھر وہ گھوڑے جو کہ لوٹ ڈالنے والے ہیں صبح کے وقت ۝ پھر وہ اُڑاتے ہیں صبح کے وقت میں

نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَاِنَّهٗ

گرد و غبار ۝ پھر گھس جاتے ہیں صبح کے وقت میں جماعت میں ۝ بے شک انسان اپنے رَبّ کے لئے بڑا ہی ناشکرا ہے ۝ اور بے شک وہ

عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي

اس بات پر البتہ گواہ ہے ۝ اور بے شک وہ مال کی محبت میں البتہ بہت سخت ہے ۝ کیا یہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب اُکھاڑا جائے گا اس چیز کو

الْقُبُوْرِ ۝۹ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱

جو کہ قبروں میں ہے ۝ اور جو کچھ سینوں میں ہے وہ سارا حاصل کر لیا جائے گا ۝ بے شک ان کا رَبّ ان کے متعلق اس دن پوری پوری خبر رکھنے والا ہوگا ۝

تفسیر

گھوڑوں کی پانچ صفات کا تذکرہ

سورۂ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۱ آیتیں ہیں۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا: عادیات یہ لفظ عَدْو سے لیا گیا ہے، عدو کہتے ہیں دوڑنے کو۔ عَدَا يَعْدُو عَدْوًا۔ اور عادیات یہ جمع مؤنث کا صیغہ ہے یہ گھوڑوں کی صفت ہے۔ اور واؤ قسمیہ ہے۔ ضَبْحًا یہ مفعول مطلق ہے فعل محذوف کا يَضْبَحْنَ ضبحًا اور یہ جملہ فعلیہ ہو کے عادیات میں جو ضمیر ہے (جو الف لام بمعنی الذی کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ العادیات کا الف لام موصولہ ہے) تو یہ اُس ضمیر سے حال واقع ہو جائے گا، تو بات یوں بن جائے گی "قسم اُن گھوڑوں کی جو دوڑنے والے ہیں اس حال میں کہ وہ ہانپتے ہیں ہانپنا۔" ضَبْحًا کہتے ہیں وہ خاص آواز جو اُس کے ناک سے پیدا ہوتی ہے جس وقت کہ وہ دوڑ رہا ہوتا ہے، جس کو ہماری زبان میں ہانپنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں گھوڑے۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا: موریات: یہ بھی اُن گھوڑوں کی صفت ہے۔ یہ لفظ ایراء سے لیا گیا ہے، اَوْرٰى يُوْرِيْ اِيراء: آگ جلانا، آگ نکالنا، اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ (سورۂ واقعہ: ۷۱) یہ لفظ وہاں بھی آیا تھا، تم خیال کرو اُس آگ کا جو تم جلاتے ہو، دیکھو اس کو، بتلاؤ کہ اس کے اندر جو ایندھن جلتا ہے جن درختوں سے وہ پیدا ہوتی ہے اس کو ہم نے پیدا کیا یا تم نے پیدا کیا؟ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ، تو وہاں بھی تُوْرُوْنَ کا لفظ آیا ہوا ہے، "پھر وہ گھوڑے جو کہ آگ نکالنے والے ہیں" قَدْحًا: قَدَحَ کا معنی ہوتا ہے ایک چیز کو دوسری چیز پہ مارنا، جس طرح سے دو پتھر ٹکراتے ہیں تو آگ نکلتی ہے، اور یہاں گھوڑے جو آگ نکالتے ہیں وہ ٹاپ مار کر نکالتے ہیں، چونکہ گھوڑے کے پاؤں میں لوہے کے نعل لگے ہوئے ہوتے ہیں، اور جب یہ پتھریلے علاقے میں چلتے ہیں اور دوڑتے ہیں اور زور کے ساتھ جب ان کا پاؤں پتھر پر پڑتا ہے تو جیسے چقماق سے آگ نکلتی ہے اسی طرح سے آگ نکلا کرتی ہے۔ آپ حضرات نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا، میں نے تو بار ہا دیکھا، یہی جو ہماری سڑکیں ہیں ان سڑکوں پر بھی تانگا اگر زور کے ساتھ دوڑا جا رہا ہو، گھوڑا بھاگا جا رہا ہو رات کے وقت، تو اس وقت بھی شعلے پیدا ہوتے ہیں، کبھی خیال کر لینا، سڑکوں پر جس وقت یہ گھوڑے دوڑتے ہیں، تانگا جس وقت بھاگتا ہے تو گھوڑے ٹاپ جو مارتے ہیں تو اس کے ساتھ آگ کا شعلہ نکلتا ہے۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کا معنی ہو گیا "پھر وہ گھوڑے جو کہ آگ نکالنے والے ہیں زور سے پاؤں مار کر۔" فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا: مغیرات یہ لفظ اِغارۃ سے لیا گیا ہے۔ اَغَارَ يُغِيْرُ: لوٹ ڈالنا، غارت گری کرنا۔ مغیرات: وہ گھوڑے جو کہ لوٹ ڈالنے والے ہیں۔ صُبْحًا: صبح کے وقت۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا: نَقْع کہتے ہیں گرد وغبار کو، اور بِهٖ کی ضمیر صبح کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اَثَرْنَ یہ اَثَارَ يُثِيْرُ اِثَارَةً سے ہے بھڑکانا، برانگیختہ کرنا، اُڑانا، "پھر وہ اُڑاتے ہیں صبح کے وقت میں گرد وغبار" مٹی اُڑاتے ہیں، اَثَرْنَ اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن مفہوم اس کا اسی طرح سے ہوگا، "پھر اُڑایا انہوں نے صبح کے وقت میں گرد وغبار" یعنی جن کا یہ فعل ہے۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا: پھر گھس جاتے ہیں صبح کے وقت میں جماعت میں، مجمعوں میں گھس جاتے ہیں، فوجوں میں گھس جاتے ہیں۔

گھوڑوں کی قسم کھانے کا مقصد

یہ آپ کے سامنے پانچ آیتیں آگئیں، اور یہ پانچ صفتیں ذکر کی گئی ہیں گھوڑوں کی، مفسرین کا تقریباً اتفاق ہے اس بات پر کہ اس سے وہی! جہاد کے اور لڑائی کے گھوڑے مراد ہیں۔ عرب چونکہ گھوڑے بہت رکھا کرتے تھے، گھوڑا کیا چیز ہے، اللہ کی ایک مخلوق ہے، انسان کا پیدا کیا ہوا نہیں، اور انسان اُس کو جو کچھ کھلاتا پلاتا ہے وہ بھی انسان کا پیدا کیا ہوا نہیں، اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، صرف ظاہری طور پر انسان اُس گھاس اور دانے کے پہنچانے میں واسطہ بنتا ہے، کہ اس نے گھوڑے تک پہنچا دیا، اور تھوڑی بہت خدمت انسان گھوڑے کی کرتا ہے، تو یہ گھوڑا جس کی ایک عارضی سی خدمت انسان کرتا ہے وہ گھوڑا انسان کی خدمت کے لئے کتنی مشقتیں اُٹھاتا ہے، لڑائی کے وقت میں کس طرح سے ہانپتا ہوا بھاگتا ہے جدھر انسان بھگانا چاہے، اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے انسان کی فرماں برداری میں، اور اتنا دوڑتا ہے پہاڑی علاقے میں کہ اس کے پاؤں لگنے کے ساتھ شعلے نکلتے ہیں، گویا کہ آگ کے انگاروں میں وہ دوڑتا جا رہا ہے، یہ نقشہ ہر وقت اُن کے سامنے ہوتا تھا، چونکہ عرب کا علاقہ پہاڑی علاقہ ہے، جس وقت وہ گھوڑے دوڑتے ہیں تو یوں شعلے پیدا ہوتے ہیں۔ اور عادت یہ تھی کہ یہ لوگ رات کو سفر کر کے کسی قبیلے کے پاس جا کر ٹھہر جاتے تھے، اور غارت گری صبح کو کیا کرتے تھے، حملہ صبح کے وقت کرتے تھے، یہ اس وقت کا عام رواج تھا، رات کی تاریکی میں حملہ کرنا وہ بہادری کے خلاف سمجھتے تھے، سفر رات کی تاریکی میں کرتے تا کہ ان کو پتا نہ چل جائے اور وہ اپنا بچاؤ نہ کر لیں اور کہیں اور نہ بھاگ جائیں، جا کے کہیں قریب ٹھہر جاتے تھے، اور حملہ اور غارت گری جو کیا کرتے تھے لوٹنے کے لئے تو وہ صبح کے وقت ہی کرتے تھے، ایسے وقت میں وہ گھوڑے لوٹ ڈالتے ہیں، وہی نقشہ ان کے سامنے دکھایا جا رہا ہے۔ اور پھر اتنا تیزی کے ساتھ اور اتنی مشقت کے ساتھ وہ گھوڑے دوڑتے ہیں کہ صبح کے وقت جو کہ عام طور پر رات کی شبنم کے اثر سے گرد وغبار کے جمنے کا وقت ہوتا ہے اُس وقت میں بھی وہ مٹی اُڑاتے ہوئے جاتے ہیں، یہ بھی وہی ان کے شدت کے ساتھ چلنے کی طرف ہی اشارہ ہے کہ یوں بھاگتے ہیں کہ ایسے ٹھنڈے وقت میں بھی خوب مٹی اُڑتی ہے۔ اور پھر جان کی بازی لگاتے ہوئے دشمنوں کی فوجوں میں گھس جاتے ہیں، جہاں وہ نیزے بھی کھاتے ہیں، تلواروں کے زخم بھی کھاتے ہیں، آج کل کے محاورے کے مطابق گولیوں سے بھی چھلنی ہو جاتے ہیں، لیکن لگام جس انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس کی فرماں برداری میں گھوڑا یہ سب مشقتیں اُٹھاتا ہے۔ تو جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے مختلف حیوانات اور ان کے منافع ذکر کر کے انسان کو شکر کی طرف متوجہ کیا ہے تو یہاں بھی وہی بات ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ ایک مخلوق جس کی تم نے تھوڑی سی خدمت کی دیکھو! تمہاری فرمانبرداری میں کیا کردار ادا کرتا ہے، تو جب تم گھوڑے سے یہ کام لیتے ہو تو کبھی یہ سوچتے نہیں؟ کہ آخر تم بھی کسی کے پیدا کئے ہوئے ہو، اور وہ تمہیں کھانے کے لئے دیتا ہے، اس نے تمہیں اتنی نعمتیں دے رکھی ہیں، کیا اس کے اَحکام کے تحت تمہیں محنت کرنے کا خیال نہیں آتا؟ تم اس کی فرماں برداری نہیں کر سکتے؟ ان گھوڑوں کی فرماں برداری کو دیکھو کہ کس طرح سے تمہاری خاطر یہ اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں، لیکن انسان ہے کہ اپنے خالق، مالک کی پروا بھی نہیں کرتا۔ یہی بات ہے جو آگے کہی گئی ان قسموں کے بعد کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ بے شک

انسان اپنے رَبّ کے لئے بڑا ہی ناشکرا ہے، کَنُوْدٌ: مبالغے کا صیغہ ہے، بہت ہی ناشکرا ہے، کَنَدَ: ناشکری کو کہتے ہیں یہ اس کا حاصل ترجمہ ہے، ورنہ کَنَدَ: اصل میں ہوتا ہے کہ جو شخص راحت یاد نہیں رکھتا، تکلیف ہی یاد رکھتا ہے، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی فرماں برداری میں نہیں، نافرمانی میں استعمال کرتا ہے، کَنُود: مبالغے کا صیغہ ہے، تو حاصل ترجمہ اس کا یہی ہے کہ انسان اپنے رَبّ کے لئے بڑا ناشکرا ہے، گھوڑے دیکھو کس طرح سے اپنے مالک کے فرماں بردار اور شکر گزار ہیں لیکن ان گھوڑوں کی حالت اس بات پر گواہی دیتی ہے کہ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے، یہ ذکر کیا جا رہا ہے عام عنوان سے، لیکن مراد اس سے کافر ہے۔

آخری آیات کا حاصل

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ: اور بے شک وہ انسان اِس بات پر البتہ گواہ ہے، یعنی انسان خود ہی اگر دیکھے، اپنے گریبان میں جھانکے، تو اس کو خود ہی اپنی یہ حالت سمجھ میں آجائے گی کہ جس طرح سے گھوڑے اپنے مالک کے فرماں بردار ہیں کیا یہ اپنے مالک کا فرماں بردار ہے؟ انسان خود اس کے اوپر گواہ ہے۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ: اور بے شک وہ انسان البتہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے، مال کی محبت میں بہت سخت ہے، یہ محبت اِس کے دِل میں بہت پڑی ہوئی ہے۔ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ: کیا یہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب اُکھاڑا جائے گا اس چیز کو جو کہ قبروں میں ہے، قبروں میں جو کچھ ہے سب نکال کے کھڑی کرلی جائے گی۔ بَعْثَرَةُ الْقُبور: اُلٹ پلٹ کردینا، اندر کی چیز باہر لے آنا، یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (سورہ انفطار) جب قبور کو اُکھیڑ لیا جائے گا۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ: اور جو کچھ سینوں میں ہے وہ سارا حاصل کرلیا جائے گا، دِل کے جذبات بھی نمایاں کرلیے جائیں گے۔ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ: بے شک اِن کا رَبّ ان کے متعلق اُس دِن پوری پوری خبر رکھنے والا ہوگا، اللہ تعالیٰ خبر تو اِس وقت بھی رکھتے ہیں انسان کے اعمال کی، انسان کا عمل اللہ تعالیٰ سے کوئی مخفی نہیں، وہ خبر تام رکھتے ہیں، لیکن اس دِن یہ ظاہر ہوجائے گا کہ واقعی اللہ تعالیٰ انسان کے ہر عمل سے اور ہر جذبے سے خوب اچھی طرح سے واقف تھا۔

”اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ“ کا دُوسرا مفہوم شیخ الاسلامؒ کے قلم سے

حضرت شیخ الاسلام ﷫ لکھتے ہیں کہ ”جہاد کرنے والے سواروں کی اللہ کی راہ میں سرفروشی وجاں بازی بتلاتی ہے کہ وفادار وشکر گزار بندے ایسے ہوتے ہیں، جو آدمی اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کے راستے میں خرچ نہیں کرتا وہ پرلے درجہ کا ناشکرا اور نالائق ہے، بلکہ غور کرو تو خود گھوڑا زبانِ حال سے شہادت دے رہا ہے کہ جو لوگ مالک حقیقی کی دی ہوئی روزی کھاتے ہیں اور اس کی بے شمار نعمتوں سے شب وروز تمتع کرتے ہیں، پھر اس کے باوجود اس کی فرماں برداری نہیں کرتے، وہ جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل وحقیر ہیں۔ ایک شائستہ گھوڑے کو مالک گھاس کے تنکے اور تھوڑا سا دانہ کھلاتا ہے وہ اتنی سی تربیت پر اپنے مالک کی وفاداری میں جان لڑادیتا ہے، جدھر سوار اشارہ کرتا ہے ادھر چلتا ہے، دوڑتا اور ہانپتا ہوا ٹاپیں مارتا اور غبار اُٹھاتا ہوا گھمسان کے معرکوں میں بے تکلف گھس جاتا ہے، گولیوں کی بارش میں، تلواروں اور سنگینوں کے سامنے پڑ کر سینہ نہیں پھیرتا، بلکہ بسا اوقات وفادار گھوڑا اسوار کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے، کیا انسان نے ایسے گھوڑوں سے کچھ سبق سیکھا؟ کہ اس کا بھی

کوئی پالنے والا مالک ہے جس کی وفاداری میں اسے جان و مال خرچ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے، بے شک انسان بڑا ناشکرا اور نالائق ہے کہ ایک گھوڑے بلکہ کتے کے برابر بھی وفاداری نہیں دکھلا سکتا" (تفسیر عثمانی)۔ "سرفروش مجاہدین کی اور ان کے گھوڑوں کی وفاشعاری اور شکر گزاری اس کی آنکھوں کے سامنے ہے، پھر بھی بے حیا ٹس سے مس نہیں ہوتا" (تفسیر عثمانی) یہ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ کا ایک اور ترجمہ کیا جا رہا ہے، میں نے ترجمہ کیا کہ بے شک انسان اس بات پر البتہ گواہ ہے، یعنی اس کو باہر سے گواہی لانے کی ضرورت نہیں، اگر خود غور کر لے اور اپنے گریبان میں جھانکے تو اُسے پتا چلے گا کہ میں اپنے مالک اور منعم محسن کا کیا شکر ادا کرتا ہوں، اُس کی دی ہوئی نعمتیں اُس کی فرماں برداری میں صَرف کرتا ہوں یا نافرمانی میں صَرف کرتا ہوں؟ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں، انسان خود گواہ ہے، یہ ہم نے ضمیر لوٹائی اِنَّهٗ کی انسان کی طرف، اور عَلٰی ذٰلِكَ کا اشارہ ہم نے لے لیا اس ناشکری کی طرف، اور شہید کا معنی گواہ۔ اور حضرت شیخ (الہندؒ) نے دُوسرے ترجمے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ترجمہ کرتے ہیں کہ "اور وہ آدمی اس کام کو سامنے دیکھتا ہے" یعنی انسان کی آنکھوں کے سامنے ہے گھوڑے کا کردار، اور پھر اس سے متاثر نہیں ہوتا، تو شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا یہ حاشیہ اسی ترجمے کے مطابق ہے، کہ سرفروش مجاہدین کی اور ان کے گھوڑوں کی وفاشعاری اور شکر گزاری اس کی آنکھوں کے سامنے ہے پھر بھی بے حیا ٹس سے مس نہیں ہوتا، یہ مطلب تب ہے کہ جس وقت ہم اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ میں شہید سے مراد لیں دیکھنے والا، مشاہدہ کرنے والا، اور ذٰلِكَ سے مراد لیں گھوڑے کا کردار جو پیچھے ذِکر کیا گیا، "بے شک یہ انسان گھوڑے کے کردار کو دیکھنے والا ہے"، اور اس مشاہدہ کرنے کے باوجود اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

ناشکری کی اصل وجہ مال کی محبت ہے

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ: مال کی محبت میں بڑا سخت ہے، یہ ساری اس کی ناشکری کی وجہ بیان کر دی، کہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے دِل میں محبت ہونی چاہیے تھی اللہ کی، اور اس کا محبوب حقیقی اللہ ہوتا، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرہ: ۱۶۵) کہ جو مؤمن ہیں وہ اللہ کی محبت میں بڑے سخت ہوتے ہیں، جس وقت وہ اللہ کی محبت میں سخت ہو گئے تو پھر اللہ کی فرماں برداری کو سعادت سمجھیں گے، کیونکہ جس سے محبت ہوا کرتی ہے انسان بالاضطرار اس کی اطاعت کرتا ہے، پھر اللہ کو راضی کرنے کے لئے مال قربان کرے گا، اللہ کو راضی کرنے کے لئے جان قربان کرے گا، اس کی ساری کی ساری اطاعت اور فرماں برداری اللہ کی رضا کے لئے ہوگی، لیکن یہ ناشکرا انسان ناشکرا اس وجہ سے ہے کہ اس کے دل میں اللہ کی محبت نہیں مال کی محبت ہے، اس لئے ہر وقت یہ سوچتا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ کماؤں، زیادہ سے زیادہ جمع کر کے رکھوں، تو مال کی محبت میں یہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا خیال نہیں کرتا، اور "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ"[1] یہ مضمون بارہا آپ کے سامنے ذِکر کیا جا چکا، کہ دِل کے اندر دُنیا کی محبت کا آ جانا یہ ہر بُرائی کی جڑ ہے، تو مال کی محبت جب انسان کے دِل میں آ جاتی ہے تو حریصانہ طور پر وہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرتا ہے، جائز ناجائز کی پروا نہیں کرتا، اور حاصل ہو جانے کے بعد بخیل ہوتا ہے، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

---

(۱) مشکوٰۃ ۲ / ۴۴۴، کتاب الرقاق، فصل ثالث بحوالہ رزین و شعب الایمان۔

آخرت کی یاددہانی کے ذریعے مال کی محبّت پر تنبیہ

آگے اس کو یاددہانی کروائی جارہی ہے کہ یہ ناشکری اور یہ مال کی محبت اُس وقت تیرے لئے وبال بن جائے گی جس وقت یہ حالات پیش آئیں گے، تو تجھے معلوم نہیں وہ وقت؟ تجھے اُس وقت کا علم نہیں ہے؟ یہ انسان سے کہا جارہا ہے، اَفَلَا یَعۡلَمُ، یَعۡلَمُ کی ضمیر اِنسان کی طرف لوٹ رہی ہے، کیا انسان اس بات کو نہیں جانتا؟ ایسے انسان کو گویا کہ سمجھایا جارہا ہے کہ تیرے سامنے وہ وقت نہیں ہے؟ جب قبروں میں جو کچھ ہے سب اکھیڑ لیا جائے گا، سب کچھ نکل کے آجائے گا، کیا وہ انسان نہیں جانتا؟ اس قسم کا ناشکرا اِنسان، مال کی محبت میں مبتلا اِنسان، کیا اُس کو علم نہیں؟ جب قبروں میں جو کچھ ہے اُس کو اکھیڑ لیا جائے گا، قبروں سے بھی نکال لیا جائے گا اور جو کچھ سینوں میں ہے وہ بھی نچوڑ لیا جائے گا۔ حُصِّلَ: حاصل کرلیا جائے گا، دل کا کوئی جذبہ مخفی نہیں رہے گا، جو کچھ سینے میں ہے سب نمایاں ہوجائے گا، اور اُس دِن نمایاں ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی بڑی خبر رکھنے والا ہے، ورنہ خبر تو اب بھی رکھتا ہے، لیکن اس دِن کی طرف جو نسبت کی جارہی ہے تو اِس اعتبار سے کہ اللہ کی خبر اور اللہ کا علم اس دِن تمام انسانوں کے سامنے نمایاں ہوجائے گا۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

اٰیاتھا ۱۱ ۔ ۱۰۱ سُوۡرَةُ الۡقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۳۰ ۔ رکوعھا ۱

سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۱ آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلۡقَارِعَةُ ۝۱ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۳ يَوۡمَ يَكُوۡنُ

کھٹکھٹانے والی ۝ کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟ ۝ آپ کو کیا معلوم کہ وہ کھٹکھٹانے والی کیا چیز ہے؟ ۝ جس دِن کہ ہوجائیں گے لوگ

النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝۴ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝۵ فَاَمَّا

پھیلائے ہوئے پتنگوں کی طرح ۝ اور ہوجائیں گے پہاڑ دُھنی ہوئی رنگین اُون کی طرح ۝ پھر

مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ

وہ شخص جس کے ترازو بوجھل ہوگئے ۝ وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا ۝ اور وہ شخص جس کے ترازو

مَوَازِيْنُهٗ ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾

ہلکے ہوگئے ﴿۸﴾ اس کا ٹھکانا گڑھا ہے ﴿۹﴾ اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ گڑھا کیا چیز ہے؟ ﴿۱۰﴾ دہکتی ہوئی آگ ہے! ﴿۱۱﴾

سورت کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی ۱۱ آیتیں ہیں۔ اِس سورت میں بھی اِثباتِ معاد ہے، قیامت کا تذکرہ کر کے یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ آخرت میں دو قسم کے گروہ ہوں گے، جن کے پلّے ایمان ہے وہ کامیاب ہوں گے، جن کے پاس ایمان نہیں وہ ناکام ہوں گے، اور ''مکی'' سورتوں میں خاص طور پر جو اِبتدائی دور میں اُتری ہیں آپ کے سامنے بارہا ذکر کیا جا چکا کہ اِسی مضمون کا اِثبات ہے۔

تفسیر

قیامت کے حالات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۱ آیتیں ہیں۔ ''مکی'' سورتوں کی طرح اس میں اِثباتِ قیامت ہے، اور جزائے اعمال کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ اَلْقَارِعَةُ: یہ صفت کا صیغہ ہے قَرَعَ يَقْرَعُ سے جس کا معنی ہوتا ہے کھٹکھٹانا، اَلْقَارِعَةُ یہاں یہ اَلْحَاقَّةُ کی طرح قیامت کے نام کے طور پر استعمال ہوا ہے، ''کھٹکھٹانے والی، کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی'' یہ مزید ہول پیدا کرنے کے لئے ہے، کھٹکھٹانے کی مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ آئے گی تو معاملہ ایسا وحشت ناک دہشت ناک ہوگا کہ دل دھڑکنے لگ جائیں گے، اور چیخ و پکار جو ہے یہ بھی انسان کے کانوں کو کھٹکھٹا کے رکھ دے گی، تو اِس لفظ کے اندر اُس قیامت کے حال کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ہول کی طرف اشارہ ہے، ''کھٹکھٹانے والی، کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی'' وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ: آپ کو کیا معلوم کہ وہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی، یہ بھی مزید دہشت پیدا کرنے کے لئے ہے کہ اُس کی صحیح کیفیت انسان یہاں جان ہی نہیں سکتا، جس وقت وہ آئے گی تبھی پتا چلے گا کہ وہ کیا چیز ہے۔ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ: فَراش یہ اسم جمع کے طور پر ہے، فَراشة کی جمع ہے، اور مبثوث اُس کی صفت ہے، تو اسم جمع لفظوں کے طور پر مفرد سمجھا جاتا ہے جس کی بنا پر اس کی صفت مفرد آگئی، تَمْرٌ تَمْرَةٌ کی طرح فرق کر لیا کرتے ہیں، بَثٌّ پھیلانے کو کہتے ہیں، فَراش: پتنگے، ''جس دِن کہ انسان پھیلائے ہوئے پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے''، پتنگوں کے ساتھ تشبیہ جو دی جا رہی ہے وہ کثرت میں اور اُن کے ضعف میں اور اُن کی پراگندگی میں، دیکھا ہوگا آپ نے خاص طور پر برسات کے موسم میں رات کو چراغ پر کس طرح سے پتنگے اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور کبھی کدھر کو بھاگتے ہیں کبھی کدھر کو بھاگتے ہیں، پھر وہ اپنی کمزوری کی بنا پر جلدی ہی گر بھی جاتے ہیں، تو اِنسان بھی کمزور حالت میں ہوں گے اور کثرت میں ہوں گے اور پتنگوں کی طرح گڈمڈ ہوں گے، نفسی نفسی پڑی ہوئی ہوگی، کوئی کسی دوسرے کا خیال

نہیں کرے گا۔ یہاں فَرَاش مبثوث کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور سورۂ قمر کے اندر لفظ آیا تھا ''جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ'' کا، کہ جس طرح ٹڈیوں کا دَل ہوتا ہے اور ٹڈیاں منتشر ہوتی ہیں اس طرح سے لوگ قبروں سے اُٹھیں گے اور ٹڈی دَل کی طرح نکل کے آئیں گے، یہ فصل کھانے والی ٹڈی جس وقت آیا کرتی ہے تو یہ فوج کی شکل میں آتی ہے، ٹڈی دَل کا لفظ محاورے میں استعمال ہوتا ہے۔ تو کثرت اور پراگندگی کی طرف اشارہ ہے، ''جس دِن کہ ہوجائیں گے لوگ پھیلائے ہوئے بکھیرے ہوئے پتنگوں کی طرح، منتشر کیے ہوئے پتنگوں کی طرح۔'' وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ: اور ہوجائیں گے پہاڑ......! عِهن کہتے ہیں رنگی ہوئی اُون کو، رنگین اُون، اور منفوش: دُھنکی ہوئی۔ یہ دُھنیا جس وقت دُھنتا ہے تو اس وقت جو بہت کمزور ہو کے علیحدہ علیحدہ ہو کے اڑتی ہے، یہ رُوئی وغیرہ کاتنے کے لئے جس طرح سے وہ جاتی ہے، دُھنکی جاتی ہے، اس طرح سے اُون جس وقت دُھنیا دُھنتا ہے تو وہ بھی ذرّہ ذرّہ ہو کے اُڑتی ہے۔ تو یہ پہاڑ بھی اسی طرح سے دُھنی ہوئی اُون کی طرح ہوجائیں گے، اور اس کو عِهن کے ساتھ تعبیر کیا، عِهن کہتے ہیں رنگین اُون کو، تو پہاڑوں کے بھی چونکہ رنگ مختلف ہوا کرتے ہیں، تو جس وقت وہ اُڑیں گے ذرّہ ذرّہ ہوں گے تو اس وقت اُن میں مختلف رنگ نمایاں ہوں گے، اس لئے اس کو تشبیہ دے دی گئی رنگین اُون کے ساتھ، یعنی یہ قلعے، یہ محلات، یہ مکانات تو کیا محفوظ رہیں گے، پہاڑ جیسی مضبوط مخلوق یہ بھی دُھنی ہوئی اون کی طرح ہوجائے گی۔ ''ہوجائیں گے پہاڑ دُھنی ہوئی اُون کی طرح۔''

بوجھل میزان والوں کا اَنجام اور یہاں ''میزان'' کا مصداق

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ: پھر وہ شخص جس کے موازین بوجھل ہوگئے، موازین میزان کی جمع ہے، جس کے تول بوجھل ہوگئے، یہاں سے ایمان کے تول مراد ہیں، جس کا ایمان کا تول بوجھل ہوگیا، فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ: عِيْشَةٍ زندگی کو کہتے ہیں، اور رَاضِيَةٍ کا لفظ رضا سے لیا گیا ہے، اور یہ وزن اسم فاعل کا ہے، لیکن مَرْضِيَّةٍ کے معنی میں ہے، ''پسندیدہ زندگی میں ہوں گے۔'' یا: فِيْ عِيْشَةٍ ذَاتِ رِضًا یوں کرلیں گے اِس کو، ذِي کذا کے ساتھ جس طرح سے تعبیر کی جاتی ہے، ''رضا والی زندگی، پسندیدہ زندگی میں ہوں گے''، ''جن کا تول بوجھل ہوجائے گا'' یعنی ایمان والا تول جس کا بوجھل ہوگا، روایات کی طرف دیکھ کے معلوم یوں ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو تول قائم ہوگا جس میں صرف کُفر اور ایمان کو تولا جائے گا، جس سے مؤمن اور کافر علیحدہ علیحدہ ہوجائیں گے، تو جس کے پاس ایمان ہوگا اس کا ایمان والا پلڑا بھاری ہوجائے گا، جس کے پاس ایمان نہیں ہے تو ایمان والا پلڑا ہلکا ہوگا، اِس سے تو کافروں کو اور مؤمنوں کو آپس میں ممتاز کرلیا جائے گا، پھر مؤمنوں کے لئے ایک دُوسرا تول قائم کیا جائے گا جس میں ان کی نیکیوں اور بُرائیوں کو تولا جائے گا، جس کی نیکیاں غالب آجائیں گی وہ نجات پا جائے گا، جس کی نیکیاں مغلوب ہوجائیں گی وہ جہنم میں چلے جائے گا، چاہے دائمًا نہ جائے، لیکن بُرائیوں کے غالب آجانے کی صورت میں وہ اِس بات کے حق دار ٹھہرے گا کہ اس کو جہنم میں بھیج دیا جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف کردیں، کسی کی سفارش سے معاف کردیں، یا سزا دینے کے بعد معاف کردیں، یہ سب صورتیں ہوں گی۔ تو یہاں ایمان وکُفر کا امتیاز ہے اور اکثر وبیشتر قرآنِ کریم میں اور روایات میں مقابلۃً انہی دونوں کا ذکر کیا جاتا

ہے، کامل مؤمن کا اور کافر کا، اور جو مؤمن فاسق ہوتا ہے اس کی حالت بین بین ہے جو کہ مقابلہ کے ساتھ خود بخود سمجھ میں آتی ہے، مقابلہ جب بھی ذکر کیا جاتا ہے اِنہی دو قسموں کا کیا جاتا ہے مؤمن کامل اور کافر۔ ''پس وہ شخص جس کے تراز و بوجھل ہو گئے'' فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ: وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا۔

ہلکے میزان والوں کا انجام...... جہنم کی آگ کے ساتھ حامیہ کی صفت ذِکر کرنے کی وجہ

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ: اور وہ شخص جس کے تراز و ہلکے ہو گئے، اس کے پاس ایمان نہ ہوا، ایمان والا تراز و ہلکا ہو گیا، فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ: اُمّ ٹھکانے کو کہتے ہیں، هاوِيه: گڑھا، کھڈ، ''اُس کا ٹھکانا پھر کھڈ ہے، گڑھا ہے'' وہ کھڈے میں جائے گا، وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ: اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ کھڈ اور گڑھا کیا چیز ہے؟ هِيَهْ کے آخر میں جو ہاء ہے وہ سکتہ کی ہے، ضمیر نہیں ہے۔ ''آپ کو کیا معلوم کہ وہ کھڈ اور گڑھا کیا چیز ہے؟'' نَارٌ حَامِيَةٌ: وہ سراپا گرم آگ ہے، نار: آگ، حامیہ: گرم، ''دہکتی ہوئی تپتی ہوئی آگ ہے''، تو جہنم کی آگ کے ساتھ جو حامیہ کی صفت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ گرم ہے، دہکتی ہے، تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ دُنیا کی آگوں میں حرارت کبھی کم بھی ہو جاتی ہے، کبھی وہ بجھ بھی جاتی ہیں، ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں، لیکن جہنم کی آگ نہ ٹھنڈی ہوگی نہ بجھے گی نہ اس کی حرارت کمی آئے گی اس لیے یہ صفت اس کے اندر نمایاں کی جاتی ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ آگ گرم ہی ہوتی ہے تو اس صفت کے اضافے کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن اِس بات کو نمایاں کرنے کے لئے کہ دُنیا کی آگوں میں حرارت کی کمی اور اُس آگ کا بجھ جانا ٹھنڈا ہو جانا یہ بھی ہوتا ہے، لیکن وہ تو نار ایسی ہوگی جو حامیہ ہی ہے، جس میں گرمی ہی گرمی ہے، اس کے اندر کوئی کسی قسم کی کمی نہیں آئے گی حرارت میں، اور نہ وہ بجھے گی نہ ٹھنڈی ہوگی، وہ ہے ھاوِیہ جس کے اندر اِن کافروں کو ڈال دیا جائے گا۔ تو یہ دونوں فریقوں کے انجام کی طرف اشارہ کر دیا، تو اثباتِ معاد بھی ہو گیا، اور جزا سزا کا اِثبات بھی ہو گیا، مکی زندگی میں سب سے پہلے اِنہی باتوں پر ہی زور دیا جاتا تھا۔

سورۂ تکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳

تمہیں غفلت میں ڈال دیا ایک دُوسرے کے مقابلے میں کثرت حاصل کرنے نے ۝ حتیٰ کہ جا ملے تم قبروں کو ۝ ہرگز نہیں! عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا ۝

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ

پھر ہرگز نہیں! عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا ۝ ہرگز نہیں! اگر تم جان لو یقین کا جاننا ۝ البتہ ضرور دیکھو گے تم جہنم کو ۝ پھر

لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝

(ہم کہتے ہیں کہ) تم ضرور دیکھو گے اس جہنم کو ایسا دیکھنا جو کہ بعینہٖ یقین ہے ۝ پھر البتہ ضرور پوچھے جاؤ گے تم اس دن خوش حالی کے متعلق ۝

تفسیر

''تکاثر'' کا مفہوم

سورۂ تکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۸ آیتیں ہیں۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ: اَلْهٰى ماضی کا صیغہ ہے، اَلْهٰى يُلْهِىْ: غفلت میں ڈالنا، لہو میں ڈالنا، اَلْهٰكُمْ: تمہیں غفلت میں ڈال دیا۔ التَّكَاثُرُ: یہ لفظ کثرت سے لیا گیا ہے، ایک دُوسرے کے مقابلے میں کثرت حاصل کرنا، مفاخرت، کثرت کا دعویٰ کرنا، یعنی یوں چاہنا کہ دوسرے کے مقابلے میں میرے ہاں اولاد زیادہ ہے، میرے ہاں مال زیادہ ہے، اِس جذبے نے تمہیں غفلت میں ڈال دیا، تم اپنے مال واولاد کے بڑھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہو، تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اِس تکاثر میں آ کے، تفاخر میں آ کے، کثرت حاصل کرنے کے جذبے میں آ کے تم آخرت سے غافل ہو گئے، انجام سے غافل ہو گئے، تکاثر نے تمہیں غفلت میں ڈال دیا۔ اُس زمانے میں چونکہ قبائلی زندگی تھی، اور اُس قبائلی زندگی میں ہر قبیلہ دُنیا کے اندر اپنے تحفظ کا خود ذمہ دار ہوتا ہے، اس لئے وہ لوگ کوشش کیا کرتے تھے کہ ہمارے افراد زیادہ سے زیادہ ہوں اور ہمارے پاس اسباب زیادہ سے زیادہ جمع ہوں، اور قبیلے کی سرداری بھی اُسی شخص کو حاصل ہوا کرتی تھی جس کے پاس مال اور جس کے کنبے کے افراد زیادہ ہوتے، اس لئے دوڑ لگی ہوئی تھی، ہر شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی اور زیادہ سے زیادہ اولاد اور گھر کے افراد جمع کرنے کی کوشش کرتا تھا، اور اِسی فکر میں سارے کا سارا ان کا وقت اور ساری کی ساری صلاحیتیں صرف ہوتی تھیں۔

دورِ حاضر میں ''تکاثر'' کا منظر

بالکل آج جس طرح سے کثرتِ اولاد کی تو لوگ فکر نہیں کرتے، بلکہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' نے ذہن دُوسری قسم کا دے دیا، وہ کہتے ہیں کہ جتنا کنبہ چھوٹا ہوگا اتنا زیادہ خوش حال ہوگا، یہ اُلٹا فلسفہ چل پڑا ہے آج، ہاں! آج دوڑ لگی ہوئی ہے معیارِ زندگی بلند کرنے میں، اور معیارِ زندگی بلند ہوتی ہے مال کے ساتھ، اس لئے مال کے اندر تکاثر آج کل اِنتہا کو پہنچا ہوا ہے، معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے اچھے سے اچھا مکان چاہیے، گھر کے اندر اچھے سے اچھا ساز وسامان چاہیے، اور کھانے پینے کی بہتات چاہیے،

بہترین قسم کا لباس چاہیے، فرنیچر چاہیے، یہ ساز وسامان جمع کرنے کے لئے انسان دوڑ لگا رہا ہے کہ میں اپنے محلے میں، اپنے شہر میں، اپنے خاندان میں سب سے ممتاز ہو کے رہوں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ چیزیں بغیر مال کی کثرت کے ہوتی نہیں، اس لئے حرام حلال کا امتیاز اُٹھا کر لوگ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور پھر اُس مال کو اِن کاموں میں صَرف کرتے ہیں جو ایک وقتی تعیش ہے اور وقتی ذہنی آسائش ہے، جس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہیں، اچھے سے اچھا پہن لیں گے، کیا ہوگا، چند دِنوں کے بعد وہ بوسیدہ ہو جائے گا، اچھے سے اچھا کھائیں گے، کیا ہوگا، وہی گوبر بنا کر پھینک دیں گے، کھانے کا نتیجہ یہی ہے جس کا کوئی پائیدار انجام سامنے آنے والا نہیں، اور اچھے سے اچھا مکان بنالیں، سامان بنالیں، تو اور کچھ بھی نہ ہو تو موت ان سب چیزوں کا خاتمہ کردے گی، آخر پھر انسان خالی ہاتھ! لیکن یہ دوڑ جب لگ گئی تو اب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ پیسے زیادہ سے زیادہ کس طرح سے کمائے جاسکتے ہیں؟ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے، اور اس کے نتیجے میں ہم پر کوئی وبال آئے گا کوئی پریشانی آئے گی، یہ نہیں سوچتے۔ تو اِس وقت تکاثر مال میں ہے معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے، اُس وقت تکاثر مال میں بھی تھا اور اولاد میں بھی تھا، کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اولاد بھی زیادہ حاصل کرنا چاہتے تھے، کنبے کے افراد بڑھانا چاہتے تھے، کیونکہ سرداری اسے ملتی تھی جس کے کنبے کے افراد زیادہ ہوں اور جس کے پاس مال بھی بہت ہو۔ تو جب ایک چیز کو مقصود ٹھہرالیا گیا، مثلاً آج کل اچھی سے اچھی زندگی گزارنے کو اور معیارِ زندگی بلند کرنے کو مقصود ٹھہرالیا گیا، تو صبح شام اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے انسان کے ذہن پر یہی مسلط ہوتا ہے کہ میرے کاروبار میں نفع کتنا ہوگا، اور فلاں جگہ سے مجھے کتنی آمدنی ہوگی، فلاں جگہ جو سرمایہ لگا یا ہوا ہے کہیں وہ نقصان میں تو نہیں جارہا، فلاں چیز کیسے میسر آئے گی؟ کس طرح سے اس کو حاصل کروں گا؟ بس یہی خیالات ہوتے ہیں جو انسان کے دماغ کے اُوپر طاری ہوتے ہیں، نہ وہ سوچتا ہے کہ میں کدھر سے آیا ہوں، نہ یہ سوچتا ہے کہ میں نے کہاں جانا ہے، میری آخری منزل کیا ہے، کوئی میرا پیدا کرنے والا بھی ہے یا نہیں، کوئی مجھے دے کر مجھ سے حساب لینے والا بھی ہے یا نہیں، انسان کی طبیعت ادھر متوجہ نہیں ہوتی، اِس کو کہا گیا ہے اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ: کہ اِس تکاثر نے تمہیں غفلت میں ڈال دیا، تم بالکل ہی غافل ہوگئے، تمہیں پتا ہی نہیں کہ تمہارے اُوپر کوئی دوسرا حاکم بھی ہے یا نہیں جس نے تم سے حساب لینا ہے۔

لفظِ ''زیارت'' کا مفہوم عربی اور اُردو میں الگ الگ ہے

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ: حتیٰ کہ تم قبروں سے جاملے، زُرْتُمْ یہ زیارۃ سے ہے، ہمارے ہاں اُردو میں ''زیارت'' کا لفظ بولا جاتا ہے کسی باعظمت شخصیت کے دیکھنے پر، عام آدمی سے ملنے کو ہم اس کی ''زیارت'' کرنا نہیں کہتے کہ میں فلانے کی زیارت کو جارہا ہوں، ''زیارت'' کا لفظ وہیں بولا جاتا ہے کہ جہاں کسی نہ کسی درجے میں عظمت ہوتی ہے، لیکن لغوی مفہوم کے طور پر یہ لفظ اس معنی سے خالی ہے، یہ مطلقاً ملنے کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے حدیث شریف میں ہے کہ حضرت فضل بن عباسؓ فرماتے ہیں ''زَارَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ''[1] اس کا ترجمہ اگر ہم یوں کریں گے کہ ''حضور ﷺ ہماری زیارت کو آئے'' تو ہماری زبان کے اعتبار سے معنی ذرا

(۱) طحاوی ۱/ ۲۶۸ باب المرور بین یدی المصلی / نیز ایک اور حدیث میں بھی یہ الفاظ ہیں: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَزُوْرُهَا. (مسلم ۲/ ۲۹۱ باب فضائل اُمّ ایمن)

گراں سا ہوجاتا ہے، یہ معنی وہاں نہیں کریں گے چونکہ ہمارے اپنے محاورے میں اِس کا مفہوم کچھ غلط سا ہوجاتا ہے، گویا کہ ہم باعظمت ہیں اور رسول اللہ ﷺ ہمیں ملنے کے لئے آئے، وہاں ترجمہ یونہی کریں گے ''حضور ﷺ ہمیں ملنے کے لئے آئے''، جس طرح سے آپ ﷺ کی عادت تھی کہ دوست احباب کے گھر جاتے رہتے تھے تو اس طرح سے ملنے کے لئے وہاں چلے گئے۔ تو ''زیارت'' کا مفہوم عربی میں اِس عظمت والے معنی سے خالی ہے جس معنی پر ہمارے محاورے میں یہ لفظ مشتمل ہے، اس لئے یہاں زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ کا معنی یہ ہوگا حتیٰ کہ تم قبروں سے جاملے، تم نے قبریں دیکھ لیں، یعنی مرنے تک تم اِسی دوڑ میں لگے رہتے ہوایک دُوسرے سے بڑھنے کے لئے، مرنے سے قبل تمہیں ہوش نہیں آتی، اِسی طرح سے فکر کرتے ہوئے، ایک دُوسرے کے مقابلے میں دوڑ لگاتے ہوئے، مال واولاد کو زیادہ جمع کرنے کی تگ ودَو کرتے ہوئے تم قبروں میں پہنچ جاتے ہو، قبروں سے پہلے تمہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ''حتیٰ کہ زیارت کرلی تم نے مقابر کی، جاملے تم قبروں کو، جادیکھیں تم نے قبریں۔''

''تکاثر'' کا بے فائدہ ہونا عنقریب معلوم ہوجائے گا

كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ..... كَلَّا اِس جذبے کے اُوپر ردع ہے، مال اولاد کی کثرت کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا فکر کیا جائے یا اس کو مقصودِ حقیقی ٹھہرایا جائے، كَلَّا: یہ تکاثر کوئی چیز نہیں ہے، ہرگز نہیں، یہ تکاثر کوئی اچھی بات نہیں ہے، مال واولاد کے اندر کثرت حاصل کرنے میں ہی اپنی ساری صلاحیتیں کھپادینا یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ: عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا کہ یہ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں تھی، عنقریب پتا چل جائے گا یعنی مرتے ہی، جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ آدم کا بچہ کہتا ہے میرا مال، میرا مال، اس پہ خوش رہتا ہے کہ میں مال اکٹھا کررہا ہوں، میرا مال، میرا مال، حالانکہ اُس کے مال میں اس کے لئے کچھ نہیں سوائے اس کے کہ جو اس نے کھالیا وہ فنا کردیا، اور جو اس نے پہن لیا وہ بوسیدہ کردیا، ہاں! البتہ جو اس نے آگے بھیج دیا اُس کو اِس نے اپنے لئے ذخیرہ کرلیا، اور باقی جو کچھ رہ گیا وہ اس کا مال نہیں، وہ پرایا مال ہے، یہ چلا جائے گا، دُوسروں کے لئے چھوڑ جائے گا۔[1] تو كَلَّا کے اندر یہی بات کہی جارہی ہے کہ یہ تکاثر کوئی اچھی بات نہیں ہے، مال واولاد کے حاصل کرنے میں، اُس میں کثرت پیدا کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو کھپادینا کوئی اچھی بات نہیں، ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، تمہیں عنقریب پتا چل جائے گا کہ یہ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں تھی یعنی مرتے ہی پتا چل جائے گا۔ پھر ڈانٹ ہے ثُمَّ كَلَّا: پھر ہم کہتے ہیں کہ ہرگز یہ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں، سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ: عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا، اِس کو ماقبل کی تاکید قرار دے لیں تو بھی بات صحیح ہے، یا ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جس طرح سے دونوں جملوں میں فرق کرنے کے لئے کہہ دیا کہ پہلا مرتے وقت کی بات ہے، اور دُوسرا قبروں سے نکل کر جب حشر کی طرف جائیں گے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے محاسبے کے لئے، اس وقت کی بات ہے۔ ''عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا'' یعنی مرتے ہی، ''پھر تمہیں پتا چل جائے گا'' یعنی قبروں سے اُٹھتے ہی۔ یہ مختلف

---

(۱) مسلم ۲/ ۴۰۷، کتاب الزهد۔ ترمذی ۲/ ۱۷۳ تفسیر سورۃ التکاثر۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۴۰، کتاب الرقاق فصل اول۔

منزلوں کے اندر تمہیں احساس ہوگا کہ ہم جس میں اپنی صلاحیتیں کھپا کے آئے ہیں ہم نے کوئی اچھا کام نہیں کیا، اور یہ تکاثر کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کی خاطر انسان اس طرح سے فکرمند ہو۔ کَلَّا کے ساتھ اُسی کے اوپر ردع ہے، ''پھر ہرگز نہیں عنقریب تم جان لو گے۔''

اگر تمہیں انجام پر یقین ہوتا تو تکاثر چھوڑ دیتے

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۞ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۞ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ...... کَلَّا پھر اسی طرح سے ردع ہے اسی بات پر، مال اولاد کی کثرت یہ کوئی حاصل کرنے کی چیز نہیں، ایسی نہیں کہ اِس کے اندر انسان کھپے، ہرگز تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، اگر تم جان لیتے پوری طرح جاننا تو پھر تم اِس مال اور اولاد کے پیچھے اتنا نہ پڑتے اگر اس کا انجام تمہیں پوری طرح سے معلوم ہوجاتا، انسان مستقبل میں آگے کی طرف جھانکتا نہیں ہے، یہ وقتی لذتوں کو دیکھتا ہے، ورنہ اگر یقین آجائے کہ اِس مال میں تو اُلٹا ہم پھنس جائیں گے، اور یہ اولاد کی کثرت دُنیا میں بھی پریشانی کا باعث بنتی ہے اور آخرت میں بھی اس کا حساب دینا پڑے گا کہ اولاد کی تربیت کیا کی تھی، اس کو کن طریقوں پر لگا گئے تھے، اور مال کے بارے میں سوال ہوگا، کہاں سے کمایا، کہاں خرچ کیا، اس کی پائی پائی کا حساب دینا پڑے گا، اگر تمہیں پوری طرح سے اس بات کا یقین آجائے تو پھر تم اس طرح سے مال کی کثرت کے پیچھے نہ لگو۔ لَوْ کا جواب یوں محذوف نکال لیا جائے گا۔ عِلْمَ الْيَقِيْنِ یہ تَعْلَمُوْنَ کا مفعول مطلق ہے، ''جان لو تم یقین کا جاننا'' یعنی یقینی طور پر اگر تم جان لو، تمہیں اگر یقین آجائے اِس کے انجام کا تو پھر تم اس طرح سے نہ کرو۔

جہنم کو تم ضرور دیکھو گے

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ: البتہ ضرور دیکھو گے تم جحیم، جحیم یہ بھی جہنم کا نام ہے، جہنم تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گی، ''البتہ ضرور دیکھو گے تم جہنم کو''، ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا: پھر ہم کہتے ہیں کہ تم ضرور دیکھو گے اُس جہنم کو عَيْنَ الْيَقِيْنِ: ایسا دیکھنا جو کہ عین یقین ہے، عین یہ نفس کے معنی میں ہے، اور یہ صفت ہے مصدر محذوف کی ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا رُؤْيَةً عَيْنَ الْيَقِيْنِ: پھر تم دیکھو گے اس جہنم کو ایسا دیکھنا جو کہ بعینہٖ یقین ہے، نفس یقین، یعنی پوری طرح سے یقینی طور پر دیکھو گے، تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گی جہنم۔

قیامت کے دِن ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ: پھر البتہ ضرور پوچھے جاؤ گے تم اُس دن خوش حالی کے متعلق، کہ اللہ تعالیٰ نے جو خوش حالی تمہیں دی تھی اس کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے اُس کا کیا حق ادا کیا؟ دُنیا کے اندر کھاتے رہے پیتے رہے اور پوری طرح سے عیش اُڑاتے رہے، اس کا حساب آج دو کہ کھانے کے بعد اس کا کیا شکر ادا کیا۔ ''مشکوٰۃ شریف''، ''کتاب الرقاق'' میں روایت ہے سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت انسان پیش ہوگا تو سب سے پہلے جس چیز کے متعلق سوال ہوگا،

جب نعمتوں کا سوال شروع ہوگا تو سب سے پہلے جو چیز پوچھی جائے گی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ کیا میں نے تجھے تندرستی نہیں دی تھی؟ کیا میں نے تجھے پینے کے لئے ٹھنڈا پانی نہیں دیا تھا؟[1] تو ٹھنڈے پانی کا حساب لیا جائے گا اور صحت کا حساب لیا جائے گا۔ ویسے تو ہر نعمت کے متعلق ہی پوچھا جائے گا، لیکن صحت، خوراک، ٹھنڈا پانی، فرصت، یہ اس قسم کی چیزیں ہیں کہ جن کی انسان واقعی قدر نہیں کرتا، اور بے قدری کے ساتھ اللہ کی اِن نعمتوں کو ضائع کردیتا ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ ایک دفعہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی ہمراہی میں کسی انصاری کے ہاں تشریف لے گئے، اور تشریف لے جانے کی وجہ بھی یہ تھی (روایت مفصل ہے) کہ حضور ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے، اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے، آپ ﷺ نے پوچھا، کہ ابوبکر! اس وقت کیسے آنا ہوا؟ وہ کہنے لگے یارسول اللہ! بھوکا تھا، بھوک لگی ہوئی تھی، باہر نکلا تھا کہ دیکھوں کہیں سے کوئی چیز میسّر آئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی اسی وجہ سے باہر آیا ہوں، اور اتنے میں حضرت عمر آ گئے، انہوں نے بھی یہی وجہ بیان کی کہ جی فاقے سے بے چین ہو کے آیا ہوں کہ دیکھوں باہر کوئی چیز میسّر آئے، کوئی روزی کا انتظام کیا جائے، تو رسول اللہ ﷺ اِن دونوں کو لے کر ایک انصاری کے باغ میں چلے گئے، اور وہاں جاکے اُس انصاری کے پاس کچھ کھجوریں کھائیں، اس نے کھجوریں کھلائیں، پانی پلایا، اور بکری ذبح کی، گوشت کھلایا، اُس وقت رسول اللہ ﷺ نے اِن دونوں کو متوجہ کیا کہ یہی وہ نعمتیں ہیں جن کے متعلق قیامت کے دن پوچھا جائے گا،[2] دیکھو! گھر سے تم بھوکے نکلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیسی کیسی نعمتیں دے دیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ کھانے کے لئے جو میسّر آتا ہے، پینے کے لئے جو میسّر آتا ہے، وہ بھی اس نعیم میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ اُس کے متعلق بھی پوچھے گا کہ یہ خوش حالی تم نے جو حاصل کی تھی اور تمہیں یہ اچھی حالت جو ملی تھی تو آخر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اور تم نے اس کا شکر ادا کیا یا نہیں کیا؟ تو اس لئے مال اور اولاد کی کثرت حاصل کرنے کے پیچھے پڑنے کی بجائے یہ دیکھو کہ جتنا اللہ نے دے رکھا ہے اس کا شکر بھی ادا کرتے ہو یا نہیں؟ ''البتہ ضرور پوچھے جاؤ گے تم اُس دن خوش حالی کے متعلق۔''

***

(۱) ترمذی ۲/ ۱۷۳، تفسیر سورۃ التکاثر/ مشکوۃ ۲/ ۴۴۳، کتاب الرقاق، فصل ثانی کا آخر۔

(۲) مسلم ۲/ ۱۷۷، کتاب الأشربة، باب جواز استتباعه غیره الی دار من یثق الخ/ مشکوۃ ۲/ ۳۶۹ باب الضیافۃ، فصل اول۔

اٰیاتها ۳ ۱۰۳ سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۳ رکوعها ۱

سورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

قسم ہے زمانے کی! ۝۱ بے شک انسان البتہ خسارے میں ہے ۝۲ مگر جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

اور ایک دُوسرے کو تاکید کرتے ہیں حق کی، اور ایک دُوسرے کو تاکید کرتے ہیں صبر کی ۝۳

تفسیر

سورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳ آیتیں ہیں۔ وَالْعَصْرِ: عصر کہتے ہیں زمانے کو، قسم ہے زمانے کی۔ اور قسم جو ہے یہ آپ جانتے ہیں کہ یہ شہادت ہوا کرتی ہے مابعد کے مضمون کے لئے۔ عام زمانہ مراد ہے، یا سرورِ کائنات ﷺ کا مبارک زمانہ مراد ہے، یا یہ زمانہ مراد ہے جو ہمارے اُوپر گزرتا ہے جس میں ہم اپنی عمر پوری کرتے ہیں۔

خسارہ کسے کہتے ہیں؟

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ: یہ جوابِ قسم ہے، بے شک انسان البتہ خسارے میں ہے، خسارہ کسے کہتے ہیں؟ یہ عموماً لفظ استعمال ہوتا ہے تجارت کے ساتھ، تجارت میں نفع ہوگیا، تجارت میں خسارہ ہوگیا، نفع کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور اس میں آگے ترقی ہو، پانچ ہزار کے ساتھ آپ نے کاروبار شروع کیا اور سال کے بعد حساب کیا تو پانچ کی بجائے دس ہوگیا، تو یہ نفع بخش تجارت ہے کہ آپ کا اصل سرمایہ محفوظ رہا اور اُس میں آگے بڑھوتری پیدا ہوگئی، زیادہ ہوگیا۔ اور ایک یہ ہے کہ پانچ ہزار کے ساتھ تجارت شروع کی تھی اور سال کے بعد حساب کیا تو چار یا تین رہ گیا، اِس کو کہتے ہیں کہ خسارہ پڑ گیا کہ جو اصل سرمایہ تھا وہ بھی ضائع ہوگیا، اس کے مقابلے میں کوئی دُوسری اچھی چیز حاصل نہ کی جاسکی، تو خسارے کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے۔

انسان کے پاس سرمایہ کیا ہے؟ اور یہ خسارے میں کب رہتا ہے؟

تو انسان خسارے میں ہے، مطلب یہ ہوگیا کہ یہ اپنی قیمتی سے قیمتی چیز صرف کر رہا ہے اور مقابلے میں کوئی اچھی چیز حاصل نہیں کر رہا، "بے شک انسان خسارے میں ہے۔" تو اس آیت میں ایک تجارت کا تصور دیا گیا کہ انسان تجارت کرتا ہے

لیکن نتیجۃً خسارے میں جاتا ہے۔ انسان تجارت کس چیز کی کرتا ہے؟ انسان کے پلّے کیا چیز ہے جو یہ دے رہا ہے اور پھر دیکھو کہ مقابلے میں لے کیا رہا ہے؟ سب سے زیادہ قیمتی چیز انسان کے پاس اس کا وقت اور اس کی یہ عمر ہے، اور یہ ایک ایک سانس جو آ رہا ہے وہ اِس کے اس سرمایے کو ختم کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کی اپنی صلاحیتیں یہ بھی بہت قیمتی چیز ہیں، آنکھ قیمتی ہے، اس کے اندر بینائی بہت قیمتی ہے، زبان اور اس کی گویائی بہت قیمتی ہے، ہاتھ اور پاؤں کی طاقت، چلنے پھرنے کی صلاحیت، دل اور دماغ کی صلاحیت، سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت، یہ بہت قیمتی چیزیں ہیں، اور جیسے جیسے انسان کے اُوپر وقت گزرتا جاتا ہے عمر بھی صَرف ہوتی چلی جارہی ہے اور یہ صلاحیتیں بھی خرچ ہوتی چلی جارہی ہیں، ایک وقت آئے گا جس وقت آپ اس سرمائے سے خالی ہوجائیں گے، نہ عمر میں سے کوئی لمحہ باقی ہوگا، نہ بدن کی صلاحیتوں میں سے کوئی صلاحیت باقی ہوگی، یہ آپ کا سرمایہ سارے کا سارا آپ کے ہاتھ سے چلا گیا، اب دیکھو! کہ سرمائے کو خرچ کر کے تم نے حاصل کیا کیا؟ اگر اس سرمائے کو خرچ کرنے کے بعد گناہوں کے انبار اکٹھے کر لئے تو اس سے بڑھ کے خسارہ کیا ہے کہ قیمتی سے قیمتی چیز دے کر ہلاکت خریدی، اور اگر اس سرمائے کو خرچ کرنے کے بعد آپ دیکھیں کہ نیکیوں کے ڈھیر اکٹھے کر لئے جس کے نتیجے میں دائمی زندگی حاصل ہوگئی، جنّت کی نعمتیں حاصل ہوگئیں، پھر واقعی آپ نے ایک عارضی چیز صرف کر کے بہت قیمتی چیز حاصل کر لی، یہ نفع کی تجارت ہے۔ اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق، تواصی بالصبر کرتے ہیں یہ تو خسارے میں نہیں، بلکہ یہ نفع میں ہیں، ان کے لئے تو فوز و فلاح ہے، اور اِن کے علاوہ باقی انسان جتنے ہیں وہ سارے کے سارے خسارے میں ہیں، عمرِ انسان کی لمحہ بہ لمحہ ختم ہو رہی ہے، اور اس کا ایک ایک سانس اور ایک ایک ساعت ہاتھ سے جارہی ہے، لیکن انسان خیال نہیں کرتا، اور دھڑا دھڑ یہ وقت ضائع جارہا ہے اور اس کے مقابلے میں یہ حاصل کچھ نہیں کرتا۔

سمجھانے کے لئے مثال

سمجھانے کے لئے بزرگ ہمیشہ یہ مثال دیا کرتے ہیں کہ انسان تو یوں سمجھے کہ یہ برف کا تاجر ہے، جس طرح سے ایک آدمی صبح کو برف کا بلاک لا کے اپنے تخت پوش پر رکھ لیتا ہے، اگر وہ سمجھدار ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جلد از جلد اس کو بیچ کر پیسے کمالوں، اور یہ جلدی نکلے، اور اس کے مقابلے میں پیسے آجائیں، کیونکہ جتنی اس میں دیر ہوتی چلی جائے گی یہ پانی بنتی چلی جائے گی، اور اگر کوئی شخص اس برف کے پاس بیٹھ جائے اور اس کی ٹھنڈک اور اس کی رنگت کو دیکھ دیکھ کر مزے لیتا رہے، اور لوگ خریدنے کے لئے آئیں تو نہ بیچے، کہے کہ نہیں، مجھے تو یہ بڑی اچھی لگتی ہے، میں تو اس کو اسی طرح سے دیکھتا رہوں گا، میرے لئے یہ بڑی اچھی چیز ہے، میں اس کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں اور اس کی رنگت دیکھ دیکھ کے مزے لے رہا ہوں، تو چند گھنٹوں کے بعد دیکھے گا کہ سوائے ایک گیلے پٹو (ٹاٹ کی گدڑی) کے اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہوگا، اور چند منٹوں کے بعد دُھوپ اس کے اُس اثر کو بھی ختم کر دے گی، اور جو سرمایہ اس نے اِس برف کی خریداری پر خرچ کیا تھا سارے کا سارا ضائع ہوگیا اور اس نے مقابلے کے اندر کچھ بھی حاصل نہ کیا۔ بالکل اسی طرح سے غیر اختیاری طور پر، اس میں آپ کا اختیار کوئی نہیں ہے، آپ کی عمر آپ کے اختیار

کے بغیر برف کی طرح پگھلتی چلی جارہی ہے، اس لئے جتنا اِس کو قیمتی بنانا چاہتے ہیں آپ......! قیمتی بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ اِس کے مقابلے میں اچھے سے اچھا عمل کر لیجئے، اور اچھے سے اچھا کوئی ہنر حاصل کر لیجئے، آخرت میں کام آنے والی چیز کو حاصل کر لیجئے، تب تو آپ عمر خرچ کر کے نفع کمائیں گے، اور اگر آپ اِس کو گناہوں میں صرف کریں گے، معصیت میں خرچ کریں گے، تو قیمتی سے قیمتی سرمایہ خرچ کر کے آپ ہلاکت خرید رہے ہیں، تو اس سے بڑھ کر اور خسارہ کیا ہوگا؟

قسم کی جوابِ قسم سے مناسبت

اور یہ بات جو ذکر کی جارہی ہے کہ انسان خسارے میں ہے زمانہ اِس کا گواہ ہے، تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو، کیسی کیسی قومیں آئیں، اللہ نے اُن کو کیسی کیسی صلاحیتیں دیں اور ان کو سنبھلنے کے لئے کتنا کتنا وقت دیا، لیکن انہوں نے اپنا وقت بھی گنوایا، صلاحیتیں بھی گنوائیں، آخر اللہ کے عذاب کا نشانہ بن گئے، وہ سارے کے سارے تاریخی واقعات جو زمانے میں بکھرے ہوئے ہیں وہ اِس بات کی دلیل ہیں کہ انسان خسارے میں ہے۔

خسارے سے بچنے والے کون ہیں؟

ہاں البتہ خسارے سے بچنے والے یہ لوگ ہیں جن کی چار صفتیں ذِکر کر دیں اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ: ''جو لوگ ایمان لاتے ہیں'' یہ تو عقیدوں کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ ہوگیا، اور کامل ایمان وہی ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ پھر عملِ صالح بھی ہو''نیک عمل کرتے ہیں''، عقیدہ بھی صحیح ہوگیا، کردار بھی ٹھیک ہوگیا، اور پھر اِس کے ساتھ ساتھ تواصی بالحق بھی کرتے ہیں اور تواصی بالصبر بھی۔ تواصی: ایک دُوسرے کو وصیت کرنا، وصیت کا معنی ہوتا ہے دوسرے کو تاکید کرنا، ''ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں حق کی''، پہلا ہے تکمیل نفس کہ اپنے آپ کو سنبھال لیا، عقیدے صحیح کر لئے اور اپنا کردار اچھا کر لیا، پھر صرف اپنے پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ آگے دوسروں کو بھی حق کی وصیت کرتے ہیں کہ حق کو قبول کرو، حق کا ساتھ دو، سچائی کو اپناؤ، سچائی کو حاصل کرو، اپنے کردار سے بھی اس بات کی تلقین کرتے ہیں اور اپنی زبان کے ساتھ بھی اس بات کی تلقین کرتے ہیں جس کو اَمر بالمعروف نہی عن المنکر کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، تو گویا کمال انسان تبھی حاصل کر سکتا ہے کہ جب خود کامل ہونے کے ساتھ اپنے متعلقین اور اپنے زیر اثر لوگ یا دوسرے اپنے بھائی بند حتیٰ کہ سب انسان، جیسے جیسے ان کے ساتھ تعلق ہوتا چلا جائے اُن کی تکمیل میں بھی کوشش کرے، خود اچھا ہو اور دُوسروں کو اچھا کرنے کی کوشش کرے یہ لوگ ہیں جو خسارے سے بچیں گے، بلکہ یہ اپنی عارضی سی عمر اور عارضی سی صلاحیتیں خرچ کر کے بہت دائمی نعمتیں حاصل کر لیں گے، یہ نفع میں ہیں، تو اس لئے ان کو فائزون کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، مفلحون کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، ان کی یہ تجارت ایسی ہے جو نفع کی تجارت ہے، اور باقی سارے خسارے میں رہ جائیں گے۔ ''ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے ہیں'' کہ حق قبول کرو، حق کا ساتھ دو، سچائی کو اپناؤ، ایک دوسرے کو کہتے رہتے ہیں، اور اسی طرح سے حق قبول کرنے میں جو رُکاوٹیں پیش آتی ہیں، دقتیں پیش آتی ہیں اُن کو برداشت کرنے کی تلقین کرتے

ہیں، صبر کا مفہوم عام ہے، نیکی کرنے میں تکلیف اُٹھانا یہ بھی صبر ہے، بُرائی چھوڑنے میں جو اِنسان کو تکلیف ہوتی ہے اس کو برداشت کرنا یہ بھی صبر ہے، اور جو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حق کے راستے میں مصیبتیں سہنی پڑتی ہیں اُن کو برداشت کرنا یہ بھی صبر ہے، تو صبر کا مفہوم عام ہے۔ تو حق کی تلقین کرتے ہیں اور پھر ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں، کہ اپنے نفس کے اندر صبر کی کیفیت پیدا کرو، یعنی نیکیوں پر بھی جمو، اور نیکیوں کے اختیار کرنے میں جو تکلیف آتی ہے اُسے برداشت کرو، بُرائیاں چھوڑو، اور ان کے چھوڑنے میں جو نفس پہ گرانی ہوتی ہے اس کو بھی برداشت کرو، اور اسی طرح سے حق کا ساتھ دینے میں جو دُوسری مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں ان کو بھی جھیلو، اس طرح سے وہ ایک دُوسرے کو کہتے سنتے رہتے ہیں، تلقین کرتے رہتے ہیں۔ تو ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق، تواصی بالصبر، جو لوگ یہ صفت اپنالیں گے، یہ چار چیزیں حاصل کرلیں گے یہ خسارے میں نہیں، اور ان کے علاوہ باقی جتنے لوگ ہیں سب خسارے میں ہیں۔

سورۂ عصر اپنے مضمون کے لحاظ سے مختصر و جامع ہے

تو یہ سورت اپنے اِس مضمون کے لحاظ سے مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع ہے۔ مفسرین نے نقل کیا ہے، جیسے یہاں بھی حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اِمام شافعی رحمہ اللہ نے سچ فرمایا کہ اگر قرآن میں سے صرف یہی ایک سورت نازل کردی جاتی تو سمجھ دار بندوں کی ہدایت کے لئے کافی ہوتی، بزرگانِ سلف میں جب دو مسلمان آپس میں ملتے تھے تو جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو یہ سورت سُنایا کرتے تھے (تفسیر عثمانی)۔ ایک دوسرے کو سورت سُناتے یاددہانی کے لئے، کہ کامیابی کی زندگی یہی ہے کہ ایمان اور عملِ صالح اختیار کیا جائے، اور آپس میں ایک دُوسرے کو نیکی کی تلقین کی جائے، اور بُرائی سے روکا جائے، اور دِین کی خاطر مصیبتیں اُٹھانے کے لئے صبر کی کیفیت پیدا کی جائے، ان باتوں کی یاددہانی کے لئے جب آپس میں ملتے اور ملاقات کرتے تو ایک دوسرے کو یہ سورت سُنایا کرتے تھے۔

آیاتها ۹ ۱۰۴ سُوْرَۃُ الْهُمَزَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۳۲ رکوعها ۱

سورۂ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا

خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو پس پشت عیب چننے والا ہے اور آمنے سامنے طعنہ دینے والا ہے ۝ یہ وہ شخص ہے جو مال کو جمع کرتا ہے

وَعَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤
اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے ○ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ رکھے گا ○ ہرگز نہیں، البتہ ضرور پھینکا جائے گا یہ چُورا چُورا کر دینے والی چیز میں ○
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧
اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ چُورا چُورا کر دینے والی کیا چیز ہے؟○ وہ اللہ کی آگ ہے بھڑکائی ہوئی ○ جو مطلع ہو جائے گی دِلوں پر ○
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩
وہ آگ ان کے اُوپر بند کی ہوئی ہوگی ○ اس حال میں کہ یہ لوگ لمبے لمبے ستونوں میں ہوں گے ○

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

سورۂ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۹ آیتیں ہیں۔ سورۂ تکاثر کے اندر مال و دولت کا جو مقابلہ تھا اس سے روکنا مقصود تھا، کیونکہ یہی مقابلہ ہے جو آخرت کے متعلق تیاری سے مانع بنتا ہے، اور اگلی سورت کے اندر اِنسان کو اِیمان اور عملِ صالح کی تلقین کی گئی، جس میں یہ بات نکلتی ہے کہ اِس میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانی چاہیے، مال و اولاد میں سبقت لے جانا یہ کوئی نفع کی بات نہیں ہے، جو اپنی صلاحیتیں ان کاموں میں خرچ کر دیتے ہیں وہ بہت خسارے میں رہتے ہیں، تو اس سورت میں بھی زیادہ تر مال کے جمع کرنے کی ہی مذمت ہے، اور بخیل لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے جو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، کہ خود خرچ کرتے نہیں اور پھر خرچ کرنے والوں پہ طعن کر کے زبان درازی کر کے ان کا مذاق اُڑا کے استہزا کر کے ان کو بھی روکنے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس لیے یہاں ھَمز اور لَمز دونوں کی مذمت اِس میں کی جارہی ہے، اور مال کی محبت میں مبتلا ہو کے جو لوگ بُرائی میں مبتلا ہوتے ہیں اُن کا انجام بتایا جارہا ہے۔

تفسیر

مال دار بخیل کی بدکرداری

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ...... هُمَزَة اور لُمَزَة دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، پہلا ھَمز سے ہے، دُوسرا لَمز سے ہے، مفہوم دونوں کا قریب قریب ہے، عیب چننا، طعنہ دینا، هُمَزَة کا مفہوم بیان کر دیا گیا جو کہ پس پشت لوگوں کی غیبت کرتا ہے، لوگوں کے عیوب نکالتا ہے، لوگوں پر تنقید کرتا ہے، هُمَزَة: پس پشت عیب نکالنے والا، عیب بیان کرنے والا، تنقید کرنے والا، بُرائی کرنے والا، اور لُمَزَة ہو جائے گا کہ جو لوگوں کے منہ پہ طعنہ دیتا ہے، یعنی سامنے آ کے اس کے منہ کے اُوپر طعنہ بازی کرتا ہے اور اس کے عیب اس کو جتلاتا ہے۔ اور یہ اکثر مال دار، بخیل لوگ جو اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم معاشرے میں سب سے اُونچے ہیں، باقی لوگ

ہم سے گھٹیا ہیں، اکثر و بیشتر یہ عادت اُن کی ہوتی ہے، اور یہ ناشی ہوتی ہے تکبر سے، پس پشت بیٹھیں گے تو بھی فخر کرتے ہوئے دُوسرے کی بُرائیاں کریں گے کہ وہ کیا چیز ہے ہمارے مقابلے میں؟ وہ تو ایسا ہے، اس میں تو یہ خامی ہے، اس میں تو یہ خامی ہے، اور منہ پر بھی اگر آمنا سامنا ہو جائے تو اپنے مال پر فخر کرتے ہوئے اور اپنے خاندان اور اولاد پر فخر کرتے ہوئے بسا اوقات ان کو طعنے دیتے ہیں کہ تم کیا چیز ہو؟ تم تو ہمارے مقابلے میں ایسے ہو، تمہارے اندر یہ کمی ہے یہ خرابی ہے، ہمارے اندر یہ خوبی ہے اور یہ بھلائی ہے، اس طرح سے منہ پر بھی طعنے دیتے ہیں، تو یہ کردار انہی بخیل سرمایہ داروں کا ہے جو مال کی محبت میں مبتلا ہیں اور دُوسروں کی تحقیر کرتے ہیں، تو تحقیر کرتے وقت پس پشت بھی بُرائیاں کی جاتی ہیں اور منہ پر بھی طعنہ بازی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے دِل میں کسی کی بڑائی تو ہوتی نہیں، وہ دُوسروں کے مقابلے میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں، تو اس قسم کے بدزبان زبان دراز لوگ اُن کے لئے یہاں وَیل ذکر کی گئی ہے کہ نتیجۃً یہ لوگ تباہ ہونے والے ہیں۔ ''خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو کہ عیب چننے والا ہے پس پشت، اور آمنے سامنے طعنہ دینے والا ہے۔''

سرمایہ دار بخیل ہر وقت شمار میں لگے رہتے ہیں

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ: یہ هُمَزَة، لُمَزَة وہ شخص ہے جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر گن گن کے رکھتا ہے، دیکھو وہی بات آ گئی، مال کو جمع کرتا ہے پھر گن گن کے رکھتا ہے، یعنی اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، بخیل ہے، اور ہر وقت ننانوے کے پھیر میں رہتا ہے، گنتا جاتا ہے ننانوے ہو گئے تو اَب سو ہو گیا، سو سے آگے پھر ایک شروع ہو گیا، ننانوے کے پھیر سے نکلتا نہیں، یعنی یہ نہیں کہ سو پورا ہو جائے تو کفایت ہی کر لے، نہیں، سو پورا ہو جانے کے بعد اگلا سو پھر شروع ہو جاتا ہے، گن گن کے رکھتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مال کی محبت میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور مال کمانے کے لئے وہ تجارت میں یا دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہوتے ہیں ہر وقت وہ اِسی شمار میں ہوتے ہیں کہ فلاں جگہ اتنا سرمایہ لگا ہوا ہے، وہاں سے اتنا نفع آئے گا، فلاں تجارت کے اندر ہم نے اتنا سرمایہ لگایا ہے، وہاں سے اتنا نفع آئے گا، اِدھر سے ہمیں اتنا ملنے والا ہے، اُدھر سے اتنا آنے والا ہے، اتنا خرچ ہونے والا ہے، اتنا جانے والا ہے، یہی حساب کتاب اُن کا ہر وقت جاری رہتا ہے، اور ویسے بھی اپنا دِل بہلانے کے لئے مال شمار کرنا اور گننا کہ اتنا ہمارے پاس جمع ہو گیا، یہ اُن کا ایک دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے، مال اکٹھا کرتے ہیں، گن گن کے رکھتے ہیں، خود توفیق نہیں ہوتی کہ کسی کے ساتھ رواداری برتیں، اور جن لوگوں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں جن کے پاس مال نہیں یا اس طرح سے کوئی خاندان، کنبہ، قبیلہ نہیں ان کے اُوپر زبان درازی کرتے ہیں، پس پشت بھی ان پر تنقید کرتے ہیں، اور رُوبرو بھی ان کو طعنے دیتے ہیں۔ تو میں نے جیسے کہا کہ یہ بخیل اور حُبِ مال میں مبتلا سرمایہ داروں کا کردار ہوتا ہے تو یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ: یہ هُمَزَة لُمَزَة وہ شخص ہے جو کہ مال کو جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔

سرمایہ دار بخیل کو اپنے مال پر اِعتماد ہوتا ہے

یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ: یہ بھی اس سرمایہ دار بخیل کی ایک نفسیاتی کیفیت واضح کی ہے، کہ اس کو مال کے اُوپر اتنا اعتماد ہوتا

ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس مال کے ساتھ اِس کو دوام حاصل ہوگیا، یہ مال اِسے مرنے نہیں دے گا، اِس کو بچالے گا، اتنا مال پر اعتماد ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ہر خطرے سے گویا کہ بے نیاز سمجھ رہا ہے، ''سمجھتا ہے کہ اس کا مال اِس کو ہمیشہ رکھ لے گا۔'' یہ ترجمہ جو میں کر رہا ہوں اِس میں اَخْلَدَہٗ کی ضمیر میں نے مال کی طرف لوٹائی ہے اور ہٗ کی ضمیر اُس شخص کی طرف لوٹائی ہے (عام تفاسیر)، ''وہ مال دار سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اس کو ہمیشہ رکھ لے گا'' اِس مال داری کی وجہ سے اُس کو خلود نصیب ہوجائے گا، اُس کو مرنا یاد نہیں، آنے والے حادثات اُس کو یاد نہیں، مال کے اعتماد پر اتنا غافل ہو یا ہوا ہے، سمجھتا ہے کہ مال حاصل ہوگیا تو مجھے سب کچھ ہی حاصل ہوگیا، دوام اور خلود حاصل ہوجائے گا، یہ مال اس کو ہمیشہ رکھ لے گا...... دوسری طرح سے بھی ترجمہ کیا گیا ہے، اَخْلَدَہٗ کی ضمیر مالک کی طرف اور ہٗ کی ضمیر مال کی طرف (آلوسی)، ''وہ سمجھتا ہے کہ بے شک اس کا مال، وہ مالک اس مال کو اپنے پاس ہمیشہ رکھ لے گا'' اس کو یہ اندیشہ ہی نہیں کہ یہ مال بھی زائل ہونے والی چیز ہے، وہ سمجھتا ہے یہ مال میرے پاس ہمیشہ رہے گا، اور میں نے یونہی مال دار رہنا ہے۔ اور یہ کتنا بڑا مغالطہ ہے انسان کو، اگر واقعات پر اِنسان نظر ڈالے تو دیکھے آج ایک شخص سرمایہ دار ہوتا ہے کل کو فقیر ہوجاتا ہے، لُٹتے ہوئے دیر ہی نہیں لگتی، کماتے ہوئے زندگی گزر جاتی ہے اور زندگی بھر کی کمائی منٹوں میں چلتی لگتی ہے، یہ واقعات ہر روز آپ کے سامنے پیش نہیں آتے؟ ابھی دو تین دِن کی بات ہے، اخبار میں آیا تھا، ایک خاندان سعودی عرب سے آیا، اور کار میں سفر کرتے ہوئے کراچی سے آرہے تھے، وہاں کتنی مدت سے گئے ہوئے تھے، جو کچھ بھی تھا لاکھوں کا مال کار میں تھا، صادق آباد کے پرلی طرف ڈاکوؤں نے لُوٹ لیا، کار بھی لے کر بھاگ گئے، سامان بھی سارا لے کر بھاگ گئے، اور وہ محنت مشقت کر کے برسہا برس میں جو کما کر لائے تھے ایک منٹ میں اُڑ گیا۔ اور یہ ایک واقعہ نہیں، اس قسم کے واقعات روز ہوتے ہیں، آگ لگتی ہے، سیلاب آتے ہیں، چور لے جاتے ہیں، ڈاکو لُوٹ کے لے جاتے ہیں، اور اس قسم کے حادثات کا انسان شکار ہوجاتا ہے کہ اس حادثے کے نتیجے میں سارے کا سارا سرمایہ زائل ہوجاتا ہے۔ تو کتنی بڑی غلط ذہنیت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مال میرے پاس ہمیشہ رہے گا، اور اس مال کی وجہ سے مجھے دوام حاصل ہوگیا، اور ہر خطرے کا مقابلہ میں اِس مال کے ذریعے سے کرسکتا ہوں، یہ کتنی بڑی غلط ذہنیت ہے، اُسی پر انکار کیا جارہا ہے۔ ''یہ شخص سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ رکھ لے گا'' یہ ایک ترجمہ ہے، یَحْسَبُ: یہ شخص سمجھتا ہے، اس کی ذہنیت یہ ہے، ''یہ شخص سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا یعنی وہ مالک اس مال کو ہمیشہ اپنے پاس رکھ لے گا'' (یہ دُوسرا ترجمہ ہے)، دونوں باتیں ہی غلط ہیں، اس کا یہ گمان غلط ہے، نہ مال کسی کو ہمیشہ رکھ سکتا ہے نہ مال کسی کے پاس ہمیشہ رہتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حادثہ آئے تو مال بچا نہیں سکتا، اور جب اللہ تعالیٰ مال چھیننا چاہے تو مالک روک نہیں سکتا، تو ایک اتنی عارضی سی چیز لے کے اس پر اتنی برتری اور اپنے آپ کو فخر اور غرور میں لایا ہوا ہے کہ دوسروں پر زبان درازی کرتا ہے، طعنے دیتا ہے، اور اسی طرح سے پس پشت ان کے عیب نکالتا ہے، یہ اس کی غلط فہمی ہے۔

سرمایہ دار بخیل کا انجام اور جہنم کی آگ کی شدت کا ذِکر

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ: وہ تو سمجھتا ہے کہ مال کے حاصل ہونے سے مجھے خلود نصیب ہوگیا، مجھے ہر قسم کی راحت ہوگئی،

''ہرگز نہیں، البتہ ضرور پھینکا جائے گا یہ حطمہ میں'' حطمہ یہ بھی جہنم کی صفت ہے۔ حَطَمَ توڑنے کو کہتے ہیں۔ حُطَمَة: چُورا چُورا کردینے والی، ''اِس کوڈال دیا جائے گا چُورا چُورا کردینے والی چیز میں'' مراد اس سے جہنم کی آگ ہے جو ہر چیز کو ریزہ ریزہ کرکے رکھ دے گی۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ: آپ کو کیا معلوم کہ وہ حطمۃ کیا چیز ہے، وہ چُورا چُورا کردینے والی کیا چیز ہے؟ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ: وہ اللہ کی آگ ہے بھڑکائی ہوئی۔ اَوْقَدَ: آگ جلانا۔ مُوْقَدَة: جلائی ہوئی، ''وہ اللہ کی آگ ہے جلائی ہوئی''، اَلَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ: جو مطلع ہوجائے گی قلوب پر۔ افئدة فُؤَادٌ: کی جمع ہے، فؤاد: دِل کو کہتے ہیں، ''وہ آگ مطلع ہوجائے گی دِلوں پر'' اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی آگ کی یہ خاصیت ہے اگر اِس میں کسی انسان کو پھینک دیا جائے تو یہ بدن کو جلاتی ہوئی دِل کی طرف جاتی ہے، لیکن ہوتا یوں ہے کہ دِل تک پہنچتے پہنچتے پہلے اِنسان مرجاتا ہے، اور دِل کے جلنے کا اِنسان کو اِدراک اور احساس نہیں ہوتا، جان پہلے ہی نکل جاتی ہے، لیکن وہ آگ ایسی ہوگی کہ وہ تو قلوب تک پہنچے گی اور اِنسان مرے گا بھی نہیں، یعنی بدن کو جلاتی ہوئی دِلوں تک جائے گی اور دِل بھی جلیں گے اور اِنسان مرے گا نہیں۔ وہ سیدھی قلوب پر مطلع ہوگی، اس کا اثر قلوب تک جائے گا، وہ جھانک کے دیکھ لے گی قلوب کو، لفظی معنی اسی طرح سے بنتا ہے، اُس کا اثر براہِ راست قلوب تک جائے گا، دُنیا کی آگ کی طرح نہیں کہ جب انسان کو ڈال دیا جائے تو دِل تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ انسان پہلے مرجاتا ہے، ایسی بات نہیں ہے، ''مطلع ہوجائے گی قلوب پر''، اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ: اور وہ آگ ان کے اُوپر بند کی ہوئی ہوگی، مُّؤْصَدَةٌ کا لفظ آپ کے سامنے سورۂ بلد میں بھی آیا تھا۔ اَصَدَ الْبَابَ: دروازہ بند کردینا۔ مُّؤْصَدَةٌ: بند کی ہوئی ہوگی۔ اور اس آگ کے بند ہونے کی صورت میں اس کی تیزی اور حرارت زیادہ بڑھی ہوئی ہوگی، جس طرح سے تندور کے اُوپر ڈھکنا دیا ہوا ہو تو حرارت اندر تیز ہوجاتی ہے، ڈھکنا اُٹھالیا جائے تو اس میں کمی آجاتی ہے، یہ جہنم کی آگ اسی طرح سے اُن کے اُوپر بند کی ہوئی ہوگی، جس میں حرارت کی کمی کا کوئی اِمکان نہیں۔ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ: اس کا تعلق عَلَيْهِمْ کی ضمیر کے ساتھ ہے بطور حال کے، ''اس حال میں کہ وہ لوگ لمبے لمبے ستونوں میں ہوں گے، لمبے لمبے ستونوں میں ان کو جکڑا ہوا ہوگا، اور وہ آگ کے ستون ہوں گے، اردگرد بھی ساری آگ ہی آگ ہوگی اور اُوپر سے بند بھی کی ہوئی ہوگی۔ تو ایسے مال دار جو مال کی محبت میں مبتلا ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، کماتے ہیں، گن گن کے رکھتے ہیں، ذہنیت اُن کی یہ ہوتی ہے کہ مال حاصل ہوگیا تو سب کچھ حاصل ہوگیا، اور یہ مال ہمیں بچالے گا، اور ہم اس مال کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیں گے، ان کی یہ ذہنیت ہے، اور اس کی بنا پر وہ غریبوں کی تحقیر کرتے ہیں، دوسرے لوگوں کے اُوپر زبان درازی کرتے ہیں، پس پشت بھی عیب جوئی کرتے ہیں، منہ پر بھی طعنے دیتے ہیں، ان سرمایہ داروں کا، بخیلوں کا، مال کی محبت کے اندر مبتلا ہونے والوں کا انجام یہ ہوگا کہ اِن کو ستونوں کے اندر جکڑ کے آگ اِن کے اُوپر بند کردی جائے گی، اس طرح سے ان کا انجام ہوگا کہ وہ آگ ان کو چُورا چُورا کردے گی اور ان کے پلے کچھ نہیں رہے گا۔ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ: اس حال میں کہ یہ لمبے لمبے ستونوں میں ہوں گے، اور وہ ستون بھی خود آگ کے ہوں گے، اُن ستونوں میں اِن کو جکڑا ہوا ہوگا اور آگ کو اِن کے اوپر بند کیا ہوا ہوگا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتہا ۵ ۱۰۵ سُوْرَۃُ الْفِیْلِ مَکِّیَّۃٌ ۱۹ رکوعہا ۱

سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ﴿۱﴾ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ

کیا تُو نے نہیں دیکھا، کیسے کیا تیرے رَبّ نے ہاتھی والوں کے ساتھ؟ کیا نہیں کیا ان کی چال کو

فِیْ تَضْلِیْلٍ ﴿۲﴾ وَّاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ﴿۳﴾ تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ

غلطی میں؟ اور بھیجے ان پر پرندے غول در غول پھینکتے تھے وہ پرندے ان پر پتھر

سِجِّیْلٍ ﴿۴﴾ فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ﴿۵﴾

کھنگر سے پس کر دیا ان کو کھائے ہوئے چارے کی طرح

اٰیاتہا ۴ ۱۰۶ سُوْرَۃُ قُرَیْشٍ مَکِّیَّۃٌ ۲۹ رکوعہا ۱

سورۂ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۴ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ﴿۲﴾ فَلْیَعْبُدُوْا

قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے یعنی ان کے مانوس ہونے کی وجہ سے سردی اور گرمی کے سفر سے ان کو چاہیے کہ وہ عبادت کریں

رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ ﴿۳﴾ الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

اِس گھر کے رَبّ کی جس نے ان کو کھانے کو دیا بھوک سے، اور ان کو امن دیا خوف سے

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ

الْفِیْلِ: فیل: ہاتھی کو کہتے ہیں، کیا تُو نے نہیں دیکھا کیسے کیا تیرے رَبّ نے ہاتھی والوں کے ساتھ، اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ: تضلیل یہ باب تفعیل کا مصدر ہے، ضَلَّلَ: کسی کو بھٹکا دینا، غلطی میں ڈال دینا، کیا نہیں بنایا تیرے رَبّ نے ان کی چال کو سراپا غلطی میں، کیا ان کی چال سراسر اللہ تعالیٰ نے تضلیل نہیں ڈال دی، کیا نہیں کیا ان کی چال کو غلطی میں۔ وَّاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ: اور بھیجا ان پر پرندوں کو۔ اَبَابِیْلَ: یہ وزن جمع کا ہے، بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ اس کا مفرد کوئی نہیں، اور بعض نے اس کا مفرد ''اِبَّالَۃٌ'' لکھا ہے، تو ابابیل کا معنی غول در غول، جھنڈ در جھنڈ، جماعت در جماعت، ''اور بھیجے ان پر پرندے جماعت در جماعت، غول در غول، جھنڈ در جھنڈ'' یعنی کثرت کے ساتھ مختلف ٹکڑیوں کی شکل میں ان کے اُوپر پرندے بھیجے۔ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَۃٍ: رمی کرتے تھے وہ ان کو، وہ پرندے مارتے تھے ان کو پتھر کے ساتھ، مِّنْ سِجِّیْلٍ: یہ ''حجارۃ'' کا بیان ہے، سجیل یہ معرّب ہے سنگِ گِل کا (مظہری)، جیسے یہ لفظ ستائیسویں پارے کے شروع میں بھی آیا تھا، سنگِ گِل، جس کو ہم کھنگر کہتے ہیں، جو گیلی مٹی پکنے کے بعد پتھر کی شکل اختیار کرتی ہے تو اس کو سجیل کہا جاتا ہے، کھنگر کے پتھر اس کا معنی ہو جائے گا، کھنگر کے ساتھ تعبیر کریں تو بھی ٹھیک ہے، اور کھنگر کے ساتھ تعبیر کریں تو بھی ٹھیک ہے، ''پھینکتے تھے وہ پرندے اُن پر پتھر کھنگر سے۔'' فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ: عصف کہتے ہیں چارے کو، اور یہ لفظ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ سورۂ رحمٰن میں گزرا ہے، اور ماکول: کا معنی کھایا ہوا، ''کر دیا ان کو کھائے ہوئے چارے کی طرح'' یعنی کھایا ہوا چارہ جس طرح سے بدنما اور پراگندہ بدحال ہوتا ہے، جانور جس کو کھا کے ردّی کر کے پھینک دیتے ہیں، بچا ہوا، کچھ کھایا اور کچھ روندا، کچھ خراب کیا، تو اُس کھائے ہوئے چارے کی طرح ان کو کر دیا۔

سورۂ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۴ آیتیں ہیں۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ: اَلَفَ اِیْلَافًا: مانوس ہونا یا مانوس کرنا، یہ لفظ اُلفت سے ہے، ''قریش کے مالوف ہونے کی وجہ سے یعنی ان کے مانوس ہونے کی وجہ سے سردی اور گرمی کے سفر سے۔'' رِحلہ سفر کو کہتے ہیں، اور شتاء: سردی، اور صیف: گرمی۔ اور اگر متعدی کے طور پر ترجمہ کیا جائے تو پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ ''قریش کو مانوس کرنے کی وجہ سے'' اور اُس سے بدل آ گیا اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ: یعنی ان کو گرمی اور سردی کے سفر سے مانوس کرنے کی وجہ سے، فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ: اُن کو چاہیے کہ وہ عبادت کریں اس گھر کے رَبّ کی الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ: جس نے اِن کو کھانے کو دیا بھوک سے وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ: اور جس نے اِن کو اَمن دیا خوف سے۔

تفسیر

دونوں سورتوں کا مشترکہ مضمون اور ماقبل سے ربط

یہ سورۂ فیل کا نام تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ میں جو ''فیل'' کا لفظ آیا اس سے لیا گیا ہے، اور یہ دونوں سورتیں ایک مضمون سے متعلق ہیں، قریش جس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، جو حرمِ مکہ میں مقیم تھے، یہ ایک خاندان ہے جو نضر بن کنانہ کی اولاد سے تعلق رکھتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی قریشی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو سب سے پہلے آپ کے مخاطب یہی قریش تھے، اور قریش کو مُلکِ عرب کے اندر مرکزیت حاصل تھی، اور یہ مرکزیت ان کو حاصل تھی

بیت اللہ کے خادم ہونے کی وجہ سے۔ اِن سورتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِسی بیت اللہ کوذکر کر کے اپنے کچھ احسان جتلائے ہیں اور قریش کو متوجہ کیا ہے اپنی عبادت کی طرف، اور اِجمالی اشارہ ہے اُن کی اپنی تاریخ کی طرف۔ یایوں کہہ لیجئے کہ پچھلی سورتیں جو آپ کے سامنے گزری ہیں اُن میں اکثر وبیشتر ترہیب کی گئی تھی آخرت کا عذاب ذکر کر کے، اور یہ سورت (سورۂ فیل) جواَب آپ کے سامنے آرہی ہے اس میں دُنیوی عذاب کا ذِکر بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ جس وقت گرفت کرتے ہیں تو فوجوں والے اور بڑے بڑے ساز وسامان والے بچتے نہیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو فوجوں والوں کو اور ہاتھیوں والوں کو پرندوں سے تباہ کروادیتا ہے، تو یہ موجودہ مخالفین اپنی طاقت پر اور اپنے جتھے پہ ناز کریں تو اِن کی حماقت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح سے تباہ کردینا، پرندوں کے ذریعے سے فوجوں کا برباد کروادینا، یہ کوئی ایسا مخفی واقعہ نہیں، مکہ والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تو ان کو اِس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اِس طرح سے بھی آپ اس کو کہہ سکتے ہیں کہ دُنیوی عذاب کے ساتھ ترہیب ہے، جس طرح پچھلی سورتوں کے اندر اُخروی عذاب کے ساتھ ترہیب گزری۔ بہرحال بیت اللہ کی عظمت کو ذِکر کیا جارہا ہے، اور اِس عظمت کی وجہ سے جو قریش کو عظمت حاصل تھی اُن کو وہ یاد دِلائی جارہی ہے، اور اس رَبّ کے شکر کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ جس نے اس گھر کو عظمت دی، اور اِس گھر کی عظمت کی وجہ سے اس خاندان کو عظمت ملی۔ یہ خلاصہ ہے اس مضمون کا جو دونوں سورتوں کے اندر بیان ہوا ہے، چونکہ مضمون آپس میں متحد تھا، اس لئے دونوں کا ترجمہ اکٹھا کردیا گیا۔

ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی برکت سے آج پورا مکہ نعمتوں سے مالا مال ہے

واقعہ کی اصلیت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو اِس جگہ آباد کیا تھا جہاں آج بیت اللہ ہے، اُس وقت اِس کی حیثیت قرآنِ کریم میں اس لفظ سے واضح کی گئی ہے بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ (سورۂ ابراہیم: ۳۷) کہ اے اللہ! میں اپنی اولاد کو ایسی وادی میں آباد کررہا ہوں کہ جس میں کھیتی باڑی نہیں ہے، تو ہزاروں سال پہلے جو اس کی حیثیت تھی آج بھی اُس کی یہی حیثیت ہے، اور آج سے چودہ سو سال پہلے بھی یہی حیثیت تھی کہ مکہ معظمہ کی حدود میں کھیتی نہیں ہوتی، اب باہر سے مٹی لے جا لے جا کر سڑکوں کے کنارے پر ڈال کے فٹ پاتھوں پر کچھ گھاس وغیرہ لگایا جارہا ہے تو سبزہ کچھ نظر آنے لگ گیا، بہت ہی مشقت کے بعد کچھ پھول لگائے جارہے ہیں تو سڑکوں میں کچھ رونق نظر آتی ہے، ورنہ جو مکہ کی اپنی زمین ہے اُس میں سبزہ نہیں اُگتا، بالکل سنگلاخ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی ایسے ہی تھی۔ تو وہاں جاکر اِن کو آباد کیا، اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم وہدایت کے تحت بیت اللہ کی تعمیر ہوئی، اور اِس گھر کے اردگرد علاقے کو حرم قرار دیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی کہ میں نے اپنی اولاد کو یہاں آباد کیا ہے، لوگوں کے دِل اِدھر مائل کردے اور اِن کو پھلوں سے رزق دے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کی ساری دُعائیں قبول کیں، لوگوں کے قلوب بھی اُدھر مائل ہوئے، اور رزق اور پھلوں کی وسعت بھی اللہ تعالیٰ نے وہاں کے رہنے والوں کے متعلق کردی۔

قریش کو مذہبی طور پر تقدس حاصل تھا

اور اس کو جو حرم قرار دیا، حرمِ آمن، تو اس کا اثر یہ تھا کہ عرب کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہونے کے باوجود، اور کفر وشرک

میں انتہا کو پہنچنے کے باوجود، فسق و فجور کی کوئی کسی قسم کی کمی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود اس علاقے کا وہ احترام کرتے تھے، حرم کی حدود میں کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا تھا، قتل وغارت بالکل نہیں تھی، لوٹ کھسوٹ نہیں تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اس گھر کی مجاور تھی، جس کی بنا پر ان کا احترام اہلِ عرب میں ایسے ہی تھا جس طرح سے ''پیرزادوں'' کا ہوتا ہے، ان کو ہر لحاظ سے قیادت حاصل تھی۔ اور یہ لوگ اپنی معاشی ضرورت کے تحت سفر کرتے تھے، ایک سفر ان کا سردیوں میں ہوتا تھا یمن کی طرف اور دُوسرا سفر گرمیوں میں ہوتا تھا شام کی طرف، چونکہ شام کا علاقہ ٹھنڈا ہے، اُدھر یہ جاتے تھے گرمیوں میں، اور یمن کا علاقہ گرم ہے، اُدھر یہ جاتے تھے سردیوں میں۔ اور ان کے یہ جو دو سفر تھے وہ ان کی خوش حالی کا باعث تھے، اور یہ سفر ان کے لئے باعثِ خیر و برکت تھے، اس وجہ سے بھی کہ عام تجارتی قافلے چلتے تو اُن کے لئے بڑی مشقتیں تھیں، راستے میں جو قبائل آتے ان کے ساتھ ان کو مزاحمت ہوتی، بسااوقات وہ ان کو لُوٹ لیتے، اور اُن قبائل کی حدود میں سے انہوں نے گزرنا ہوتا تو ان سے اجازت نامہ حاصل کرتے، ان کو نذرانے دیتے، فیسیں دیتے، ٹیکس ادا کرتے، اور یوں اپنے آپ کو بچتے بچاتے ہوئے تجارتی قافلے لے جایا کرتے تھے، تو آپ جانتے ہیں کہ جب اتنے بھاری اِخراجات ان کو راستے میں خرچ کرنے پڑتے تو ان کے نفع کا تناسب کیا ہوگا؟ برخلاف اِس کے قریش! یہ چونکہ پیرزادوں کا خاندان تھا، صاحبزادے تھے، اور ان کو مذہبی طور پر تقدس حاصل تھا بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے، یہ جس وقت سفر پہ نکلتے تو راستے کے قبائل اِن کی اُلٹا خدمت کرتے تھے، اور ان کے لئے حفاظت فراہم کرتے، کوئی ان کے ساتھ مزاحمت نہیں کرتا تھا، کوئی لوٹ کھسوٹ کا سوال ہی نہیں تھا، بڑی عزت اور احترام کے ساتھ یہ اپنا سامان اُٹھا کر لے جاتے یمن کی طرف اور شام کی طرف، اور وہاں سے سامان لے کر آتے تھے، اور اس سے بہت نفع ان کو ہوتا، اور اس نفع کی بنا پر اِن کو مکہ معظمہ کے اندر خوش حالی حاصل تھی، تو یوں عزت و راحت اور امن و امان کا گویا کہ ذریعہ بنا ہوا تھا اِن لوگوں کے لئے بیت اللہ، اور سارے عرب کے اندر اِس بیت اللہ کی عزت تھی۔

ابرہہ کا بیت اللہ پر حملہ کرنے کا واقعہ

ایک تاریخی واقعہ پیش آیا، یمن کے علاقے میں ایک عیسائی بادشاہ تھا ابرہہ، اصل کے اعتبار سے یہ شاہِ حبش کا گورنر تھا اور اس کے ماتحت تھا، اور متعصب قسم کا عیسائی تھا، بیت اللہ کی عزت اور احترام جس طرح سے لوگوں کے قلوب میں بیٹھی ہوئی تھی اس کو یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا، یمن کے لوگ بھی جو عرب تھے حج کرنے کے لئے ادھر ہی آتے، تو اس نے ارادہ کیا کہ میں بیت اللہ کی مرکزی حیثیت ختم کردوں اور یمن کے اندر عیسائیت کے زیرِ اثر کوئی مرکز قائم کردوں، تو ایک کنیسہ بنایا، گرجا گھر، اور خوب اچھی طرح سے شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ وہ عمارت بنائی، مزین، اُونچی، لمبی چوڑی، اور اس کو ہر طرح سے آراستہ کیا تاکہ اس میں ظاہری کشش پیدا ہوجائے، کیونکہ بیت اللہ تو آپ کو معلوم ہی ہے حاجیوں سے آپ سنتے رہتے ہوں گے کہ بالکل جیسے اَن گھڑت پتھروں کا ایک کوٹھا ہی تھا، کوئی اس میں اس قسم کی ظاہری زیب و زینت نہیں، اور آج بھی اسی طرح سے پتھروں کا ایک کمرہ کھڑا

ہے، بس ایک غلاف اس کے اُوپر چڑھا دیتے ہیں، ورنہ غلاف اگر اُتار دیا جائے تو سوائے اس کے کہ پتھر پہاڑ سے لا لا کر چنتے ہوئے ایک دیوار بنالی، نہ اُس میں کوئی روشن دان نہ اُس میں کوئی کھڑکی، نہ اس کے کنگرے نہ منارے، کچھ بھی نہیں، بس ایک سادہ سا کوٹھا ہے۔ تو اُس نے اس کے مقابلے میں بہت مزین گھر تیار کرلیا، اور اُس گھر کے تیار ہوجانے کے بعد لوگوں کو اس نے تلقین کی کہ حج کرنے کے لئے مکہ نہ جایا کرو، بلکہ یہیں آیا کرو، صنعاء شہر میں جو اس نے کنیسہ بنایا تھا، یہ بات اہلِ عرب کو بہت ناگوار گزری، اور اس ناگواری کے نتیجے میں کوئی عربی گیا اور رات کو کوئی موقع ڈال کر اس میں پیشاب کر آیا، یہ ایک قسم کی نفرت کا اظہار تھا کہ ہم اس کا احترام نہیں کر سکتے، ہمارے نزدیک بیت اللہ کے مقابلے میں یہ بیت الخلا کی طرح ہے۔ اور بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہیں پاس ہی کوئی قافلہ ٹھہرا تھا، اور انہوں نے اپنی ضرورت کے لئے آگ جلائی تھی اور وہ آگ کچھ ہوا کے ساتھ متعدی ہو کے جا لگی اور وہ جل گیا جس نے اس کو غصہ چڑھا دیا، اُس نے اِس واقعے کو قرار دیا کہ یہ تخریب کاری کا نتیجہ ہے، اور عربوں نے جان بوجھ کر اس گھر کو برباد کرنے کے لئے آگ لگوائی ہے، اور اسی طرح سے کسی شخص نے ضد میں آ کے اس طرح سے اگر پیشاب پاخانہ کیا تھا تو یہ ایک انفرادی فعل تھا، لیکن وہ اُس کے اس حسد کو بھڑکانے کا باعث بن گیا اور وہ انتقام لینے کے لئے تیار ہوگیا، کہ اگر انہوں نے اس گھر کی عزت نہیں کی اور احترام نہیں کیا، تو جو ان کا گھر ہے، جس کی یہ عزت کرتے ہیں، احترام کرتے ہیں، اس کو بھی رہنے نہیں دُوں گا۔ لشکر تیار کیا، کچھ ہاتھی بھی ساتھ تیار کیے، اور ہاتھی ایک ایسا جانور ہے کہ جو عرب میں پایا نہیں جاتا تھا، اور عربوں نے اس کو دیکھا تک نہیں تھا، اور اس قسم کی چیزیں لے کر انسان جب لڑائی میں جاتا ہے تو مدمقابل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ بڑا ہاتھی جس کو آگے آگے لگایا، روایات میں آتا ہے کہ اس کا نام ''محمود'' تھا، اور کوئی ساٹھ ہزار فوج اُس نے مرتب کی مکہ معظمہ پر حملہ کرنے کے لئے۔ جس وقت وہ اپنی جگہ سے چلتا ہے تو راستے میں جتنے عرب قبائل تھے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہر کسی نے مزاحمت کی اور یہ برداشت نہیں کیا کہ ہمارے علاقے میں سے گزر کر یہ بیت اللہ پہ جا کر حملہ کرے، جتنی جتنی جس کی حیثیت تھی سب نے مزاحمت کی، حتّٰی کہ وہ ان کو شکست دیتا ہوا اور اپنا راستہ صاف کرتا ہوا طائف تک آ گیا، طائف میں بنوثقیف قبیلہ آباد تھا انہوں نے مزاحمت نہیں کی بلکہ یہ سمجھا کہ جس طرح سے پچھلے لوگ شکست کھاتے آئے ہیں ہم مقابلہ کریں گے تو ہم بھی شکست کھا جائیں گے، تو اپنے بُت خانوں کے تحفظ کی اِن سے ضمانت لے لی اور ان کے ساتھ تعاون کا وعدہ کرلیا، چنانچہ ثقیف میں سے ایک شخص ''ابورغال'' نامی تھا جو اِن کے ساتھ بطور راہنما کے شامل ہوگیا، وہ راستے دکھاتا ہوا آگے لایا، چنانچہ وہ ''ابورغال'' جس وقت مرا ہے تو اس کی قبر کو یعنی سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے تک تقریباً لوگ رَمی کرتے رہے، جاتے تھے، نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اس کی قبر کے اُوپر سنگ باری کیا کرتے تھے، اِس کا ذکر روایات میں آتا ہے، جو بھی اس کی قبر کے پاس سے گزرتا تو دو چار پتھر اُٹھا کے مار دیا کرتا تھا نفرت کا اظہار کرنے کے لئے۔

ابرہہ اور حضرت عبدالمطلب کے مابین مکالمہ

تو یہ آ گیا اور آ کے مکہ قریب عرفات کی جانب (مُغَمِّس نامی جگہ پر) اس نے پڑاؤ ڈال لیا، اسی راستے سے یہ آیا ہے،

عرفات کی طرف سے آگے منیٰ سے ہوتے ہوئے اس نے بیت اللہ کی طرف جانا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اہل مکہ کو پیغام بھیجا، اور اُس وقت مکہ کے اندر سرداری تھی سرورِ کائنات ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی، تو عبدالمطلب کے پاس اس نے پیغام بھیجا، اور یہ کہا کہ میرا تمہارے سے کوئی جھگڑا نہیں ہے، اگر میرے ساتھ لڑو گے تو مقابلہ نہیں کرسکو گے، میں صرف اِس گھر کو گرانے کے لئے آیا ہوں، اگر تم مزاحمت نہ کرو تو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اور اِتفاق ایسا ہوا کہ اُس علاقے میں جدھر آ کے اس کی فوجیں ٹھہری تھیں عربوں کے اُونٹ چرتے پھر رہے تھے، جن میں عبدالمطلب کے بھی تقریباً دو سو اُونٹ تھے اور وہ اس کی فوج نے پکڑ لئے، چرواہوں نے جا کے اطلاع دی ہوگی کہ اُونٹ دشمنوں کے ہاتھ میں آ گئے، اور انہوں نے لُوٹ لئے ہیں، تو عبدالمطلب کو یہ اطلاع بھی ہوگئی۔ تو قاصد عبدالمطلب کو ساتھ لے کر آیا ابرہہ کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے کہ وہاں چلو اور گفتگو کرلو، معاملہ طے ہوجائے، ہم تمہارے ساتھ لڑنا نہیں چاہتے، ہمارا مقصد تو اِس بیت اللہ کو گرانا ہے، عبدالمطلب چلے گئے، جس وقت گئے ہیں تو چونکہ بہت وجیہ تھے، شکیل تھے، خوبصورت تھے، ابرہہ اُٹھا اور اُٹھ کر اِستقبال کیا، اپنے برابر تخت پر بٹھایا، جہاں وہ خود بیٹھا ہوا تھا ان کو برابر بٹھایا، اور بڑے ادب اور احترام کے ساتھ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر گفتگو شروع کی ترجمان کے واسطے سے، ابرہہ نے پچھوایا کہ ان سے پوچھو کہ کیسے آئے ہیں؟ کیا بات کرنے آئے ہیں؟ تو عبدالمطلب نے جواب دیا کہ مجھے اطلاع پہنچی ہے کہ آپ کی فوج نے میرے اُونٹ پکڑ لئے، تو میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ میرے اُونٹ چھوڑ دیں۔ تو یہ بات سنتے ہی ابرہہ کے تیور بدل گئے، اور وہ ترجمان کی وساطت سے کہلاتا ہے کہ میں آپ کو دیکھ کے تو بہت متاثر ہوا تھا کہ آپ بڑے آدمی ہیں، شخصیت آپ کی اُونچی معلوم ہوتی ہے، آپ کوئی معقول بات کریں گے، تمہیں اتنا خیال نہیں آیا؟ کہ جو گھر تمہاری عزت کا باعث، تمہارے احترام کا باعث ہے، جس کی وجہ سے تمہیں مرکزیت حاصل ہے، میں تو اُس کو گرانے کے لئے آیا ہوں، تمہیں اپنے اُونٹوں کی فکر پڑگئی اور اس گھر کے متعلق تم نے کوئی بات نہ کی؟ مطلب اس کا یہ تھا کہ اتنی گھٹیا بات آپ نے کی ہے جو آپ کی شخصیت سے جوڑ نہیں کھاتی، میں تو تمہاری حیثیت ختم کرنے کے لئے آیا ہوں، جس کی وجہ سے تمہیں قیادت حاصل ہے، سیادت حاصل ہے، مرکزیت حاصل ہے، تو یہ بیت ہی ختم ہوجائے گا تو اس کے بعد اُونٹوں کی کیا حیثیت رہ جائے گی، تو تم نے بات بیت کی نہیں کی اور اپنے اُونٹوں کی بات کی۔ یہ بات ترجمان کی وساطت سے ابرہہ نے عبدالمطلب کے کان تک پہنچائی، تو انہوں نے اپنی شان کے مطابق جواب دیا، کہنے لگے: جی! وہ بیت میرا نہیں ہے، جس کو آپ گرانے کے لئے آئے ہیں وہ میرا نہیں ہے، وہ جس کا ہے وہ جانے، اُونٹ میرے ہیں اس لئے میں نے تو اپنے مال کے متعلق بات کی ہے، اپنے مال کے متعلق میں نے بات کرلی اور جس کا بیت ہے وہ تجھ سے خود سمجھ لے گا، کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم تیری مزاحمت تو کر نہیں سکتے، اس لئے تُو جان اور گھر والا جانے!

قریش کا مکہ کو خالی کردینا اور ابرہہ کے لشکر کی پیش قدمی اور تباہی

یہ بات کہہ کر عبدالمطلب آ گئے، اور تاریخ اور سیرت دونوں کی روایات میں موجود ہے کہ عبدالمطلب نے آ کے قریش کے

اندر اعلان کر دیا کہ جس قسم کی یہ فوج ہے اور جتنی تعداد میں ہے، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لئے ان کا راستہ چھوڑ دو اور اپنے تحفظ کے لئے پہاڑوں میں چلے جاؤ، اور آگے اللہ جانے اور اللہ کا گھر جانے اور یہ دشمن جانے، جو ہو گا دیکھ لیں گے! یعنی قریش کے دل میں اس گھر کی عظمت اتنی تھی کہ وہ بھی یقین کئے ہوئے تھے کہ اس گھر کے اُوپر جو بھی تعدی کرے گا، زیادتی کرے گا، وہ اللہ کے عذاب کا نشانہ بنے گا، اتنا اعتماد تھا ان کو۔ چاہے وہ کُفر میں مبتلا تھے، شرک میں مبتلا تھے، جیسے کیسے ان کے خیالات تھے، لیکن اس گھر کی نسبت وہ اللہ کی طرف ہی کرتے تھے اور اس گھر کا محافظ اللہ کو ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ سارے کے سارے لوگ مکہ خالی کر کے اردگرد پہاڑوں میں چلے گئے، اور ابرہہ کو اور غصہ تھا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، اور وہاں سے اس نے اپنی فوج کو کُوچ کا حکم دیا، تو یہ مزدلفہ کو عبور کر کے آگے وادی آتی ہے جہاں آج بھی نشان لگا ہوا ہے، جہاں سے وادی شروع ہوتی ہے وہاں بورڈ لگا ہوا ہوتا ہے وادی محسّر، منیٰ کی طرف سے آئیں تو وہاں بھی، اور وہ وادی ایسی ہے کہ جہاں سے حاجیوں کو حکم ہے کہ ذرا تیز رفتاری سے گزر جایا کریں، یہ وادی مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان میں آتی ہے، اب بھی نشان اس پر لگا ہوا ہے، ''وادی محسر'' کا بورڈ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جس وقت وہ اس وادی میں پہنچا ہے، اس کی فوج اس وادی میں آگئی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب مدافعت کا وقت آگیا، تو سمندر کی جانب سے کوئی پرندے آئے، جتنے میں کہتے ہیں کہ کبوتر کے برابر یا کبوتر سے کچھ چھوٹے تھے، سمندر کی طرف سے آئے اور ایک ایک پرندے کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک ایک چونچ میں اور ایک ایک ہر پنجے میں، ٹکڑیوں کی شکل میں آئے، اور آکر ابرہہ کی فوج کے اُوپر سنگ باری شروع کر دی، کہتے ہیں کہ وہ کنکری جو گرتی تھی تو گولی کی طرح جہاں بدن پر لگتی دُوسری طرف نکل جاتی اور اپنے زہریلے اثرات بدن کے اندر چھوڑ دیتی، اِس سنگ باری سے ہاتھی بھی مر گئے، اور فوج میں بھی افراتفری پڑ گئی، کچھ لوگ وہاں مر گئے، کچھ بھاگے اور بھاگ کے جہاں جہاں گئے اپنے اپنے وقت پر اِس زہر کے اثر سے اُن میں سے کوئی نہیں بچا، سارے کے سارے ہلاک ہو گئے۔ اور یہ جو ہاتھی (محمود) تھا جو آگے آگے لگا رکھا تھا اس کے متعلق بھی ایک روایت کتابوں میں موجود ہے کہ جب یہ وادیٔ محسر میں آیا ہے تو یہ آتے ہی بیٹھ گیا، اس کو اُٹھانے کے لئے ہزار کوشش کی گئی لیکن یہ اُٹھا نہیں، اور جب اس کا رُخ پیچھے کو موڑا گیا یعنی اشارہ کیا کہ اِدھر کو چلو، تو اُٹھ کے چل دیا، دائیں طرف چل دیا، بائیں طرف چل دیا، لیکن جب اس کو آگے چلنے کے لئے کہتے تو بیٹھ جاتا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ اُس حیوان کی فطرت میں بھی یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا کہ آگے جانا اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بننے والی بات ہے، لیکن انسان جو اس پر سوار تھے وہ نہ سمجھے، وہ اپنی قوت کے ناز میں اور اپنے اس زعم میں کہ ہمارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا بیت اللہ کی طرف بڑھنا چاہتے تھے، تو یہاں اس سارے لشکر کو برباد اور تباہ کر دیا گیا۔

یہ واقعہ سرورِ کائنات ﷺ کی ولادت سے تقریباً پچاس دن پہلے پیش آیا ہے، اور اس واقعے کے پچاس دن بعد حضور ﷺ کی ولادت ہوگئی، اور جس وقت آپ ﷺ نے نبوّت کا اظہار کیا ہے اُس وقت تک اس واقعے کو دیکھنے والے چشم دید گواہ تھے وہ موجود تھے، حتیٰ کہ ایک روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی نقل کیا گیا، اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا بھی جو

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں کہ ہاتھی کو ہانکنے والے دو شخص بچ گئے تھے، لیکن اپاہج ہو گئے، اندھے ہو گئے، اور ہم نے اُن کو اس بدحالی کے اندر مکہ کی گلیوں میں گداگری کرتے ہوئے دیکھا ہے (تفسیر ابنِ کثیر)، تو گویا کہ وہ واقعہ ایسے تھا جیسے آنکھوں کے سامنے۔ اِس واقعے سے قریش کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی، پہلے بھی لوگوں کے دلوں میں عظمت تھی، لیکن جب یہ واقعہ پیش آیا تو عظمت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

واقعۂ اَصحابِ فیل تواتر کی وجہ سے مشاہدے کے درجے میں تھا

تو اللہ تعالیٰ اب یہ چیز جو یاد دِلا رہے ہیں اِس میں دونوں پہلو ہیں، اِن کو یہ یاد دِلایا جا رہا ہے کہ تمہیں پتا نہیں کہ اَصحابِ فیل کے ساتھ تیرے رَبّ نے کیا کیا تھا؟ خطاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو تو سُنانا تو بھی دُوسروں کو مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ اس بات کو ذہن میں لاؤ، اور وہ ایسی ہے جیسے تمہاری آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہے، اور اگر آنکھوں سے دیکھی ہوئی نہیں تھی جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعے کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، لیکن اتنی صحیح روایت کے طور پر اور تواتر کے طور پر وہ واقعہ موجود تھا گویا کہ مشاہدہ ہے، اور تواتر آپ جانتے ہیں کہ مشاہدے کا فائدہ ہی دیا کرتا ہے، جب اتنے زیادہ لوگ واقعہ کو نقل کرنے والے ہوں جن کا عقلاً جھوٹ پر کوئی اتفاق نہ ہو سکے تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آج آپ میں سے کتنے افراد ہیں کہ جنہوں نے کراچی شہر نہیں دیکھا، لیکن آپ نے سُنا اتنا ہے کراچی شہر کے متعلق، کہ ایسے ہی ہے جیسے آپ نے آنکھوں سے دیکھ لیا، یعنی آپ اگر کراچی جائیں، کراچی پر جس وقت آپ کی نظر پڑے گی تو آپ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، آپ وہاں جا کے یوں نہیں کہیں گے کہ واقعی لوگ سچ کہتے تھے کہ پاکستان میں کراچی شہر بھی ہے، یہ کیفیت نہیں ہوگی، جس کا مطلب یہ ہے کہ علم جس اِنتہا کو پہنچنا چاہیے آپ کا علم اس اِنتہا کو پہنچا ہوا ہے کراچی کے متعلق کہ کراچی شہر ہے، تو وہاں اس کو دیکھنے کے بعد بھی آپ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، یقین جیسے پہلے تھا ویسے ہی ہے۔ تو یہ واقعہ بھی چونکہ تواتر کے ساتھ منقول تھا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اُن کے لئے ایسے ہی تھا گویا کہ آنکھوں سے دیکھا ہوا ہے۔

اَصحابِ فیل کا واقعہ ذِکر کرنے سے مقصد

اِس میں ایک تو قریش کو یاد دہانی ہو گئی کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہاری حفاظت کس طرح سے کی، اور جو اس بیت اللہ کو اُجاڑنے کے لئے آیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے برباد کس طرح سے کیا، دونوں پہلو ہو گئے، قریش کے اوپر احسان ہے، اور مخالف اور دُشمن کے لئے ایک عذاب کا پہلو ہے۔ اُن کو اب یاد دہانی کروائی جا رہی ہے کہ وہ اُجاڑنے کے لئے آیا تھا حسی طور پر، کہ اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتا تھا، اور تم اِس اسلام کی اور اس نبی کی مخالفت کر کے اس بیت اللہ کو معنوی طور پر اُجاڑ رہے ہو، کیونکہ جس مقصد کے لئے یہ گھر آباد کیا گیا تھا اس مقصد کی بار بار قرآنِ کریم میں اُن کو یاد دہانی کروائی گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ اولاد یہاں کیوں بسائی تھی، اور یہ بیت اللہ جو تعمیر کیا تھا تو کس مقصد کے لئے تعمیر کیا تھا، اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا، اور اس لئے تا کہ آپ کی اولاد یہاں پھلے اور اللہ کی نماز پڑھے، قرآن کریم میں وہی آیت جس کی طرف میں نے آپ کی توجہ دِلائی تھی اس میں یہ لفظ بھی

ہیں: اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (سورۂ ابراہیم: ۳۷) تو لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے الفاظ ہیں، تاکہ یہ نماز پڑھیں، نماز پڑھنے کے لئے اِن کو بسایا، اللہ کی عبادت کرنے کے لئے بسایا، اور کُفر وشرک سے بچنے کی تلقین اِبتدا ہی سے کی جارہی تھی، اب اگر کوئی شخص وہاں کُفر وشرک کرے اور نماز نہ پڑھے اللہ کی عبادت نہ کرے تو گویا کہ اس نے اس بیت اللہ کے مقصد کو ختم کردیا، اور نماز پڑھنے والوں کو اور توحید کا نعرہ لگانے والوں کو وہاں سے نکالنا اور وہاں سے باہر بھیجنے کی کوشش کرنا، یا ہلاک کرنے کی کوشش کرنا، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اس بیت اللہ کی رُوح کو ختم کیا جارہا ہے اور اس کو اُجاڑا جارہا ہے۔ اس واقعے کو ذِکر کر کے قریش کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ خبردار ہوجاؤ، تمہیں اپنی کثرت پر ناز نہیں ہونا چاہیے، مال داری پر ناز نہیں ہونا چاہیے، اس گھر کو اُجاڑنے والے اچھے نتیجے نہیں پایا کرتے، اُن کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا کرتا، یہ واقعہ تمہارا دیکھا ہوا ہے کہ بیت اللہ کو جو ڈھانے آئے تھے ان کا کیا انجام ہوا؟ تم اگر اِس کو اُجاڑنے کی کوشش کرتے ہو تو تمہارا انجام بھی یہی ہوگا، اس واقعے میں اشارہ اس بات کی طرف بھی کردیا۔

سورۂ قریش کی تفسیر

اور دُوسری سورت میں پھر وہی اِنعام جتلایا کہ اسی بیت اللہ کی وجہ سے تو تمہیں یہ عزّت حاصل ہے، احترام حاصل ہے، اور تمہارے کھانے پینے کا انتظام اسی بیت اللہ کی برکت سے ہوا، کہ یہاں وادی ایسی ہے کہ جس میں کوئی پیداوار نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے تمہارے لئے ثمرات کا انتظام کیا ہے، رِزق کا انتظام کیا ہے، فاقہ کشی کا علاقہ تھا، قحط کا علاقہ تھا، اللہ تعالیٰ نے کتنا کھانے کے لئے دیا، رزق کا انتظام کیا۔ اور ہر جگہ قتل وقتال اور شر وفساد جاری ہے، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے تمہیں خوف سے امن دیا ہے، تو اِس بیت کی قدر کرو، اور بیت کی قدر کا مطلب یہی ہے کہ اِس بیت والے کی عبادت کرو، کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔ دُوسری سورت کے ضمن میں یہی بات یاد دلا کے اُن کو اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔ تو دونوں سورتیں ہی گویا کہ بیت اللہ کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں، اور بیت اللہ کو اُجاڑنے والوں کی بدانجامی پر دلالت کرتی ہیں۔ اور بیت اللہ کی وجہ سے جو قریش کو عظمت حاصل تھی، وہ عظمت یاد دِلا کے ان کو رَبّ کی عبادت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔

دونوں سورتوں پر ایک نظر اور!

ایک دفعہ ترجمہ پھر دیکھ لیجئے...... اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ: کیا آپ نے نہیں دیکھا کیسے کیا تیرے رَبّ نے ہاتھی والوں کے ساتھ، کیا اُن کی چال کو تضلیل میں نہیں کردیا، یعنی اُن کی جو چال تھی بیت اللہ کو ڈھانے کے لئے وہ سب غلطی میں ڈال دی، وہ ضلالت میں چلی گئی، وہ کسی صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکے اپنی اس چال کی بنا پر، جو مقصد تھا اس کو حاصل نہ کرسکے، سراپا غلطی میں ڈال دیا، ''کیا اُن کی چال کو سراپا غلطی میں نہیں ڈال دیا؟'' وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ: اور بھیجے اُن کے اوپر غول درغول

پرندے جو مارتے تھے اُن کو پتھروں کے ساتھ، پھینکتے تھے اُن پر پتھر، اور وہ پتھر سنگِ گِل کے، کھنگر، پس کر دیا اللہ تعالیٰ نے اُن کو کھائے ہوئے چارے کی طرح، جس طرح سے جانور کسی چارے کو روند دیتے ہیں، منہ مار کے اِدھر اُدھر خراب کر دیتے ہیں، یعنی بدنما بدشکل اور بے کار، اِس طرح سے اُن کو اللہ تعالیٰ نے کر دیا، کَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ: کھائے ہوئے چارے کی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو کر دیا۔ تو اِن آیات میں گویا کہ اُس سارے مضمون کی طرف متوجہ کر دیا گیا جتنا میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، تو مخالفین کے لئے اِس میں ایک وعید ہے اور قریش کے لئے اس میں ایک قسم کا اِنعام ہے...... دُوسری سورت میں بھی یاددہانی کہ "قریش کو مانوس کرنے کی وجہ سے، یا، قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے" لازم اور متعدی دونوں طرح سے ترجمہ صحیح ہے، قریش یہ وہ خاندان ہے جو نضر بن کنانہ کی اولاد سے تعلق رکھتا ہے، "سردی اور گرمی کے سفر کے ساتھ مانوس کرنے کی وجہ سے، یا: مانوس ہونے کی وجہ سے" سردی گرمی کے سفر! یہ سارا ان کی معاشی جدوجہد کا نقشہ اِس میں آ گیا، کہ سردی میں بھی سفر کرتے ہیں، گرمی میں بھی سفر کرتے ہیں، اور اِس سفر کے اندر وہ کیا کیا فوائد حاصل کرتے ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں اُن کے سامنے ہیں، اس لئے ان کو اِس بیت کے رَبّ کی عبادت کرنی چاہیے جس نے اس بیت کو عظمت دی، اور اس بیت کی عظمت کی وجہ سے اِس خاندان کو عظمت ملی، "پس چاہیے کہ وہ قریشی عبادت کریں اِس گھر کے رَبّ کی جس نے ان کو کھانے کے لئے دیا بھوک سے" بھوک کا اِزالہ کیا، کھانے کے لئے دیا، "اور اِن کو اَمن دیا خوف سے" خوف سے بچایا اور اِن کو اَمن دیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں یہ دو چیزیں ہی انسان کا مقصود ہوتی ہیں، اور کامیاب حکومت وہی ہوا کرتی ہے جس میں عوام کو یہ دو چیزیں حاصل ہوں، رزق کی فراوانی ہو، رزق میں سب کچھ ہی آ گیا، صرف کھانے کی بات نہیں، اس میں رہنے سہنے کی ضروریات پہننے کی ضروریات کھانا پینا سب کچھ اِس میں آ جاتا ہے، جب کہتے ہیں وہاں کے عوام بھوکے ہیں، تو بھوکے سے صرف یہ مراد نہیں ہوتا کہ ان کے پیٹ میں روٹی نہیں ہے، بلکہ ان کی بدحالی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کہ ان کو ضرورت کے مطابق کپڑا میسر نہیں، ضرورت کے مطابق ان کو رہائش میسر نہیں، تو یہ کھانا کھلانا اور بھوک کا اِزالہ یہ ان کی خوش حالی کی طرف اشارہ ہے، تمہیں خوش حالی دے رکھی ہے، معاشی خوش حالی حاصل ہے، اور دُوسرے یہ کہ جان اور مال کا تحفظ ہو، اَمن وامان ہو، بدامنی نہ ہو، فساد نہ ہو۔ تو بیت اللہ کی برکت سے یہ دونوں باتیں ان کو حاصل تھیں، اَمن وامان بھی حاصل تھا عافیت بھی حاصل تھی اور رزق کی فراوانی بھی، تو جس گھر کی برکت سے یہ سارے کے سارے فائدے اُٹھا رہے ہیں اس گھر کے رَبّ کی ان کو عبادت کرنی چاہیے، اور ظاہری طور پر اس مالی خوش حالی کا باعث یہ سفر بنتے تھے، اور ان سفروں کے اندر ان کی عزت نمایاں تھی، ان کا احترام نمایاں تھا، عوام ان کے ساتھ کس طرح سے عقیدت سے پیش آتے تھے، یہ ساری کی ساری برکات بھی اِسی بیت کی تھیں، اِس گھر کے مجاور ہونے کی وجہ سے ان کو یہ سارے کے سارا عزت اور احترام حاصل تھا۔

❖❖❖

ایاتھا ۷ (۱۰۷) سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ مَکِّیَّۃٌ (۱۷) رکوعھا ۱

سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اوراس کی ۷ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ① فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ② وَلَا يَحُضُّ

کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جو جھٹلاتا ہے بدلے کو○ پس یہی وہ شخص ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو○ اور نہیں براہیختہ کرتا

عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ③ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ④ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ

مسکین کے کھانے پر○ پس خرابی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لئے○ جو اپنی نماز سے

سَاهُونَ ⑤ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ⑥ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ⑦

غافل ہیں○ جو دِکھلاوا کرتے ہیں○ اور برتنے کی چیز کو روکتے ہیں○

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اوراس کی ۷ آیتیں ہیں۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ: کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جو کہ دِین کی تکذیب کرتا ہے، دِین سے جزا مراد ہے، جزا کی تکذیب کرتا ہے، یعنی یوم دِین پر ایمان نہیں لاتا، اس کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال کا بدلہ دے گا، ''کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جو جھٹلاتا ہے بدلے کو'' فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ: پس یہی وہ شخص ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو، دَعٌّ دھکے دینے کے معنی میں، یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا سورۂ طور کے اندر غالباً یہ الفاظ آئے تھے، ''دھکے دیتا ہے یتیم کو''، وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ: اور مسکین کے کھانے پر براہیختہ نہیں کرتا، نہ خود کھلاتا ہے نہ دوسروں کو ترغیب دیتا ہے فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ: پس خرابی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لئے الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ: جو کہ اپنی نماز سے غافل ہیں، سَاهُوْنَ سہو سے لیا گیا ہے، ''جو اپنی نماز سے غافل ہیں'' الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ: جو کہ دِکھلاوا کرتے ہیں، یُرَآءُوْنَ یہ ریاء سے لیا گیا ہے، ''جو دِکھلاوا کرتے ہیں''، وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ: ماعون کے دو معنی ذکر کیے گئے ہیں، ماعون زکوٰۃ کو بھی کہتے ہیں ''زکوٰۃ روکتے ہیں، زکوٰۃ نہیں دیتے''، صلوٰۃ اور زکوٰۃ دونوں کا ذکر اکٹھا آیا کرتا ہے تو یہاں دونوں کا ہی ذکر آگیا کہ نماز سے غافل ہیں، نماز نہیں پڑھتے اور زکوٰۃ روکتے ہیں، زکوٰۃ نہیں دیتے، اور یا: ماعون کہتے ہیں عام طور پر استعمال کی اشیاء کو جو ایک دوسرے سے انسان لیتا رہتا ہے استعمال کرنے کے لئے، مثلاً آپ کو ضرورت پیش آجاتی ہے آپ دوسرے سے چاقو مانگ لیتے

ہیں، کبھی کوئی ضرورت پیش آ گئی کوئی مہمان آ گیا تو چار پائی طلب کر لی، کسی کے گھر سے بستر مانگ لیا، اور کسی کے گھر سے کوئی برتن لے لیا، یہ عام طور پر ایک دُوسرے سے لے لیتے ہیں، اسی طرح بالٹی، لوٹا وغیرہ بوقت ضرورت ایک دوسرے کا لیتے رہتے ہیں، تو یہ عام طور پر چھوٹی موٹی استعمال کی اشیاء جو لوگ ایک دوسرے کو عاریۃً دیتے رہتے ہیں ماعون سے وہ مراد ہیں، تو یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ یہ اُن کے بخل کی ایک بہت اعلیٰ تصویر ہے، کہ زکوٰۃ تو انہوں نے کیا دینی ہے، کسی مسکین کو کھانا تو کیا کھلانا ہے، یہ عام استعمال کی چیزیں جو لوگ ایک دُوسرے کو عاریۃً دے دیتے ہیں، یہ بھی نہیں دیتے کسی کو مانگی ہوئی، یہ اُن کے بخل کی انتہا ہے۔ تو اس سورت کا نام ماعون تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ آخری لفظ سے ماخوذ ہے یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ، اور یہ سورت بھی ''مکی'' ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

ماقبل میں بیت اللہ کا ذِکر آیا تھا اور بیت اللہ کے ان مجاوروں کا ذکر تھا، اِس سورت میں سرورِ کائنات ﷺ کے وقت میں موجود مجاوروں کے کردار کا نقشہ کھینچا گیا ہے، کہ انہوں نے بیت اللہ کی عظمت کو کس طرح سے پامال کیا؟ اور جس مقصد کے تحت بیت اللہ کو بنایا گیا تھا وہ مقصد اِنہوں نے کس طرح سے تلف کر دیا ہے؟

بیت اللہ کا اصل مقصد اور مشرکین کی اس سے رُوگردانی

بیت اللہ کی حیثیت کیا تھی؟ وہاں بسنے والے اللہ کی نماز پڑھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے میں خصوصیت سے یہ بات ذِکر کی گئی لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (سورۂ ابراہیم: ۳۷) اے اللہ! میں نے اپنی اولاد کو اِس لئے یہاں آباد کیا ہے تا کہ یہ نماز پڑھیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے جانشین حضرت اسماعیل علیہ السلام، اُن کی خاص طور پر صفت یہ ذِکر کی گئی: کَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ (سورۂ مریم: ۵۵) وہ اپنے گھر والوں کو صلوٰۃ وزکوٰۃ کا ہی حکم دیا کرتے تھے، تو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کے پاس بسنے والوں کو خصوصیت کے ساتھ خاندانی طور پر تاکید تھی نماز کی اور زکوٰۃ کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ آباد کیا، اور اپنی اولاد کو آباد ہی اس لئے کیا تا کہ اللہ کی نماز پڑھیں، اور حضرت اسماعیل کا یہ کردار نقل کیا گیا ہے کہ کَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ، وہ اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔ اب اِس عظمت والے گھر کی مجاورت اختیار کرنے کے بعد چاہیے یہ تھا کہ یہاں کے لوگ جو اس بیت کے متولی ہیں جو اس کے فوائد حاصل کرتے ہیں وہ بھی نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے، اور جس مقصد کے لئے اِس بیت کو بنایا گیا تھا اُس کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جس مقصد کے تحت اس گھر کو بنایا تھا اللہ کے حکم کے تحت اُس کو پیش نظر رکھتے، لیکن ان کا کردار اب بالکل بدل چکا ہے، یہ فوائد تو حاصل کرتے ہیں ذمہ داریوں کا احساس نہیں کرتے، پہلی بات تو یہ ہے کہ اِن کا عقیدہ ہی خراب ہو گیا، انبیاء علیہم السلام کے عقیدے کو ہی انہوں نے ترک

کردیا، کہ یہ آخرت کے قائل نہیں رہے، جو بنیادی تعلیم ہے انبیاء ﷺ کی، جو نبی آیا اس نے یہی تلقین کی کہ انسان اپنے آپ کو غیر مکلف نہ سمجھے، مہمل نہ سمجھے بلکہ اس کے بُرے کردار کی اس کو سزا ملے گی، اور اس کے اچھے عمل کے اُوپر اس کو جزا ملے گی، ہر نبی کی بنیادی تعلیم یہ تھی، لیکن اب اِس بیت اللہ کے مجاور اِس عقیدے کو بھی چھوڑ بیٹھے۔

بیت اللہ خیر خواہی کا مرکز تھا، لیکن مشرکین نے اس کو اپنی جاگیر بنالیا تھا

اور اِس عقیدے کے ساتھ ساتھ دوسری بات جو تھی کہ یہ بیت اللہ جو تھا یہ اللہ کی عبادت کا گھر بھی تھا، اور غریبوں کے ساتھ خیر خواہی اور ان کے ساتھ مواسات کا بھی ایک مرکز تھا، ہوا یوں کرتا تھا کہ لوگ اِس بیت اللہ پہ نذرانے چڑھاتے اور اِس میں تحائف آتے، قریش اُن کو سنبھالتے تھے، مستقل ایک محکمہ تھا جس کے ذِمّے یہ انتظام ہوتا تھا ہدیوں کا اور تحفوں کا، جو نذرانے، چڑھاوے بیت اللہ میں آتے ان کو سنبھالنا اور پھر غرباء میں اُن کو تقسیم کرنا، مساکین میں تقسیم کرنا، اس طرح سے مساکین کی خیر خواہی بھی ہوتی تھی۔ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں، جس وقت کہ آپ نے رِسالت کا اعلان کیا ہوا تھا، یہ جو محکمہ تھا رِفادۃ کا جس میں ان عطیات تحفوں اور نذرانوں کا انتظام ہوتا تھا، کہ جو چڑھاوے آتے نذرانے آتے ان کو سنبھالنا، پھر غرباء میں اور مساکین میں تقسیم کرنا، اِس کا انچارج تھا ابولہب، ابولہب کے ذِمّے یہ شعبہ ہوتا تھا، اور ابولہب آخرت کا منکر تھا، اِس سے تو اس نے اللہ کے حقوق تلف کردیے، اور بیت اللہ کے ساتھ تعلق کی بنا پر جو چاہیے تھا کہ اس کی ہمدردی یتیموں کے ساتھ ہوتی، مسکینوں کے ساتھ ہوتی، اُن کو کھانا کھلاتے، ان کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آتے، تو یہ آخرت کے منکر ہونے کی بنا پر اور مال کی محبت میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے انہوں نے اُن عطیات کو اور ان نذرانوں کو اپنی جاگیر بنالیا، خود اس سے فائدے اُٹھاتے اور کسی غریب، مسکین کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرتے تھے۔

مشرکین کے کردار کا نمونہ آج بھی دیکھا جاسکتا ہے

اِس کا اگر آپ بلاتشبیہ چھوٹا سا نمونہ دیکھنا چاہیں تو یہ قبروں کے مجاوروں والی بات دیکھ لیجئے، یہ ایسے ہی مثال کے طور پر ایک بات پیش کررہا ہوں، کہ بزرگوں کی قبروں کے ساتھ اور بزرگوں کی جگہوں کے ساتھ لوگوں کی جو عقیدت ہے، اُس عقیدت کے تحت وہ وہاں مالی نذرانے بھی پہنچاتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے (اِبتدا میں یہی مقصد تھا، بعد میں تو جیسے کیسے لوگ بدلتے چلے گئے) مقصد یہ تھا کہ جو اِس بزرگ سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں آئیں گے تو ان کی خدمت ہو، ان کو کھانا کھلایا جائے، ان کی رہائش کا انتظام کیا جائے، یہ لنگر جاری ہوتے تھے خانقاہوں کے ساتھ۔ اب بیت اللہ کے پاس بھی لوگ آتے تھے عبادت کے لئے، طواف کے لئے، حج کے لئے، تو ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کرنا آخر وہاں کے رہنے والوں کے ذِمّے تھا، تو لوگ جو نذرانے دیتے، تحفے دیتے، ہدیے دیتے بیت اللہ کی طرف نسبت کرکے، اُس سے انتظام ہوتا تھا ان کے کھانے پینے کا اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا، اور اُس پر یہ اس طرح سے مسلط ہوگئے جیسے آپ آج کل دیکھ رہے ہیں کہ وہ لوگ خود عیاش

ہو گئے اُن خانقاہوں کی کمائیوں کے ساتھ، اور جس مقصد کے لئے ان خانقاہوں کے نام پر وقف کیے گئے تھے اور آمدنی کے ذرائع تھے وہ مقصد ختم کر دیا۔ یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے سمجھانے کے لئے۔ اسی طرح سے وہاں بھی مشرکوں نے غریبوں اور مسکینوں کے حصے پر خود ہی قبضہ کر لیا، اور اگر کوئی یتیم مسکین سامنے آ جائے تو اس کو دھکے دے کر دفع کر دیتے تھے، کوئی ان کی مدد نہیں کرتے تھے، مسکینوں کو نہ کھلاتے تھے، نہ کھلانے کی ترغیب دیتے تھے، یعنی بعض لوگوں کا کردار یہ تھا، بعض اگر چہ سخی بھی تھے اور خرچ کرتے تھے لیکن بیت اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے کی بنا پر بیت اللہ کے نذرانوں کے ساتھ ان کا جو معاملہ تھا وہ غلط ہو گیا تھا۔ اب یہ ان کا کردار دکھایا جا رہا ہے کہ نماز کو انہوں نے چھوڑ دیا، زکوٰۃ کو یہ روکنے لگ گئے، غریبوں کے ساتھ شفقت اِن کی ختم ہو گئی، جب یہ ان کا کردار ہے تو اب یہ کس طرح سے حق دار ہیں کہ یہ قیادت اور سیادت ان کو حاصل رہے؟

سورۂ کوثر میں مشرکین کی قیادت سے معزولی کی پیش گوئی

اگلی سورت (سورۂ کوثر) کے اندر نشاندہی کر دی کہ اب آپ کے ساتھ دشمنی رکھنے والے جو بیت اللہ کے حقوق کو تلف کرنے والے ہیں، اب یہ مقطوع ہو گئے، ابتر ہو گئے، اب ان کی کوئی نسل باقی نہیں رہے گی، کوئی خیر و برکت ان میں باقی نہیں رہے گی، اب ان کو محروم کر دیا گیا ہے، تو اگلی سورت میں گویا کہ ان کی معزولی کا باقاعدہ اعلان کیا جا رہا ہے، کہ اب خیر و برکت ان کے لئے نہیں، اب خیرِ کثیر، خیر و برکت جو کچھ ہے، سب آپ ﷺ کی طرف منتقل ہو جائے گی، اور آپ کے ساتھ عداوت رکھنے والے جن کا کردار اُوپر کی سورت میں دِکھایا گیا ہے، اب یہ پھلیں پھولیں گے نہیں، یہ پیش گوئی مکہ کے اندر ہی کر دی گئی جس کا ظہور چند سالوں کے اندر اندر ہو گیا کہ واقعی ایسے لوگ جتنے تھے وہ سارے کے سارے مٹ مٹا گئے، نام و نشان باقی نہ رہا، اور دینی دُنیوی خیر و برکت، دُنیوی اُخروی جتنی تھی وہ ساری کی ساری سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کے ماننے والوں کی طرف منتقل ہو گئی، اگلی سورت میں گویا کہ یہ نتیجہ سامنے آ جائے گا۔

سورۂ ماعون پر ایک نظر اور!

اَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ...... اَرَءَيْتَ: کیا آپ نے ایسے شخص کو دیکھا؟ معلوم ہو گیا کہ اِس قسم کی شخصیات نمایاں تھیں جو آنکھیں اُٹھانے سے سامنے نظر آتی تھیں، جنہوں نے مخلوق پر شفقت کرنے کی بجائے اور دِین کے عقائد اپنانے کی بجائے یہ غلط طریقہ اختیار کر لیا تھا، آخرت کے قائل نہیں، یومِ جزا کے قائل نہیں، اور کوئی یتیم مسکین سامنے آتا ہے تو یتیموں کو دھکے دیتے ہیں اور ان کے اُوپر کوئی کسی قسم کی شفقت نہیں کرتے، اور نہ مسکینوں کو کھلاتے ہیں، نہ دُوسروں کو کھلانے کی ترغیب ہی دیتے ہیں، اس طرح سے بخل میں مبتلا ہو گئے۔ اور باقی! وہ نماز جس کے لئے بیت اللہ آباد کیا گیا، جس کے لئے وہاں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد آباد کی تھی، جس کے متعلق اَحکام حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی اولاد کو دیے تھے، یہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہونے پر تو فخر کرتے ہیں، لیکن ان مقاصد کو بالکل چھوڑ بیٹھے..... !، نماز سے غافل ہیں، زکوٰۃ دیتے نہیں، اور جو کوئی تھوڑی بہت مذہبی رسمیں

ادا کرتے ہیں وہ بھی ریاکاری کے طور پر اور دِکھلاوے کے لیے ہے، دِل کے اندر کوئی کسی قسم کا خلوص نہیں ہے، گویا کہ وہاں کے باشندوں کا کردار نمایاں اِس میں کر دیا گیا، نماز بھی چھوڑ دی، زکوٰۃ بھی چھوڑ دی اور جو کچھ تھوڑا بہت اپنے آپ کو مذہبی ظاہر کرتے ہیں وہ بھی محض دِکھلاوے کے لئے اور دُنیوی فائدے حاصل کرنے کے لئے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا کوئی مخلصانہ تعلق باقی نہیں رہا، ''یہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیموں کو، اور نہیں برانگیختہ کرتا مسکین کے کھانے پر، پس بربادی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں، نماز سے غافل ہیں'' یہ اصل تو مشرکوں کا کردار ہی دکھایا جارہا ہے جو نماز سے بالکل غافل ہوگئے تھے، اصل کے اعتبار سے ان کا منصب مصلین کا تھا، لیکن اب یہ اپنی نماز کو چھوڑ بیٹھے، لیکن اگر کوئی مسلمان ہو کر اس قسم کی حرکت کرے، یومِ جزا پر یقین رکھتا ہو، پھر نماز سے غافل ہے، نماز وقت پر نہیں پڑھتا، یا اچھی طرح سے نہیں پڑھتا، قضا کر دیتا ہے، بالکل چھوڑے ہوئے ہے، لاپروائی برتتا ہے، اسی طرح سے زکوٰۃ نہیں دیتا، لوگوں کے ساتھ مروت اور احسان نہیں کرتا، تو اس کی قباحت اپنی جگہ، لیکن یہاں کردار جو ذِکر کیا جارہا ہے یہ مشرکین کا ہے، ان کی نماز کا ذِکر قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ بھی آیا ہے، سورۂ اَنفال میں آیا تھا مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً (سورۂ اَنفال: ۳۵) اِن کی نماز بیت اللہ کے پاس کیا ہے؟ سیٹیاں بجاتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، یعنی جو اصل طریقہ تھا عبادت کا اور نماز پڑھنے کا وہ چھوڑ دیا، اب نماز کی جگہ انہوں نے سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا اختیار کرلیا، وہاں جاتے ہیں تو اس طرح تالیاں بجا کے اور سیٹیاں بجا کے آجاتے ہیں، جس طرح سے مختلف لوگوں نے اپنی عبادت کے مختلف طریقے بنائے ممکن ہے مشرکینِ مکہ بھی کوئی اس قسم کا طریقہ اپنائے ہوئے ہوں کہ وہاں جاتے ہوں گے، بتوں کے سامنے جاکے کوئی باجے بجاتے ہوں گے، سیٹیاں بجاتے ہوں گے، تالیاں بجاتے ہوں گے، یہی اُن کی نماز بن گئی، نماز کو انہوں نے اس طرح سے ضائع کر دیا، مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً: ان کی نماز یہی ہے کہ بیت اللہ کے پاس جاکے سیٹیاں بجاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں، تو یہ جو اصل کے اعتبار سے مصلّی تھے، نماز پڑھنے والے تھے، کہ اسماعیل علیہ السلام نے اپنی اولاد کو تاکید کی تھی، لیکن اب یہ سب نماز سے غافل ہوگئے۔ اور درجہ بدرجہ مؤمنین پہ یہ بات صادق آئے گی، اگر ایمان کے باوجود بھی کوئی نماز سے غفلت برتتا ہے اور زکوٰۃ نہیں دیتا اور ریاکاری کرتا ہے، تو اس کی مذمت بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے، ''پس خرابی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لئے جو کہ اپنی نماز سے غفلت برتنے والے ہیں'' الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ: جو کہ ریاکاری کرتے ہیں، وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ: اور زکوٰۃ کو روکتے ہیں، یا، برتنے کی چیز کو روکتے ہیں، کسی کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

***

آیاتھا ۳ | ۱۰۸ سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ ۱۵ | رکوعھا ۱

سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝١ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝٣

بے شک ہم نے آپ کو خیرِ کثیر دی ۝ پس آپ اپنے ربّ کے لئے نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے ۝ بے شک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہے ۝

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ: اَلْكَوْثَرَ: یہ مبالغہ ہے کُثْر کا، کُثْر کہتے ہیں کثیر چیز کو، اَلْكَوْثَرَ کا معنی ہوجائے گا بہت کثیر، پھر اَلْكَوْثَرَ سے خیرِ کثیر مراد ہے یا یہ کوثر کسی چیز کا نام ہے؟ دونوں طرح سے یہاں ترجمہ کیا گیا ہے، اَلْكَوْثَرَ یہ نام ہے ایک حوض کا یا ایک نہر کا جو جنّت میں ہوگی، پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ بے شک ہم نے آپ کو حوضِ کوثر دیا، اور اگر اَلْكَوْثَرَ سے خیر کثیر مراد لے لیں تو پھر معنی یہ ہوگا کہ بے شک ہم نے آپ کو خیرِ کثیر دی۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ: صَلِّ اَمر کا صیغہ آ گیا، پس تو نماز پڑھ اپنے ربّ کے لئے، وَانْحَرْ: اور قربانی دے، ''نحر'' اصل میں اُونٹ کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں، جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اُونٹ کو کھڑا کر کے اس کی ایک ٹانگ باندھ کے نیزہ مار کر یا چھری مار کر اس کے حلقوم کو کاٹتے ہیں کھڑا کر کے، اُونٹ آسانی سے اس طرح سے ذبح ہوتا ہے، اس کو ''نحر'' کہتے ہیں۔ جس طرح سے گائے بکری کو لٹا کر اس کی رگیں کاٹی جاتی ہیں تو اُونٹ کو کھڑا کر کے چھری مار کر یا نیزہ مار کر اس کے حلقوم کو کاٹا جاتا ہے، یہاں مطلقاً قربانی دینا مراد ہے، ''پس تو نماز پڑھ اپنے ربّ کے لئے اور قربانی دے۔'' إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ: شَانِئَكَ یہ مضاف مضاف الیہ ہیں، شانِئٌ: دشمن، بدخواہ۔ مصدر اِس کا شَنَئَان آتا ہے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (سورۂ مائدہ:۸) کسی قوم کی عداوت تمہیں اِس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، تو شَنَئَان عداوت کو اور بدخواہی کو کہتے ہیں، تو شَانِئٌ یہ اسم فاعل کا صیغہ آ گیا، ''بے شک تیرا دشمن، تیرا بدخواہ، تجھ سے عداوت رکھنے والا، بغض رکھنے والا''، هُوَ الْأَبْتَرُ: اَبتر بَتَرَ سے ہے، بتر کاٹنے کو کہتے ہیں، اور ابتر: کٹا ہوا، اصل کے اعتبار سے یہ لفظ بولا جاتا ہے اُس جانور کے لئے جس کی دُم کاٹ دی جائے، دُم کٹا جانور، پھر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ایسے شخص کے لئے جس کے پیچھے اولاد نہ ہو، اُس کو اَبتر اس لئے کہتے تھے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا تو اَبتر کا مفہوم یہ ہوجائے گا ایسا شخص جس کے پیچھے اُس

کا نام لینے والا کوئی نہ ہو، اس کا مفہوم ہو گیا بے نام ونشان، کہ'' بے شک تیرا دشمن'' ھُوَ الْاَبْتَرُ: ھو کے ساتھ اس میں مزید تاکید اور حصر پیدا ہو گیا'' بے شک تیرا دشمن ہی بے نام ونشان ہے، بے شک تیرا دشمن ہی وہ ہے کہ جس کا پیچھے کوئی نام لینے والا نہیں ہوگا، یہ مفہوم اس کا ہو گیا۔

تفسیر

شانِ نزول

یہ مختصر سی سورت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی اور ترجمہ کیا گیا، حاصل اِس کا یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے لڑکا پیدا ہوا قاسم، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لڑکے بھی پیدا ہوئے، قاسم، عبداللہ، طیب، طاہر، یہ نام آتے ہیں مکہ معظمہ میں پیدا ہونے والے بچوں کے، یہ علیحدہ بات ہے کہ شارحین کا کچھ اِس میں اختلاف ہے کہ طیب، طاہر یہ ایک کا ہی نام ہے، اسی کو طیب کہتے تھے اور اسی کو طاہر، یا یہ علیحدہ علیحدہ بچے ہیں، تو بہرحال مکہ معظمہ میں تین بچے پیدا ہوئے یا چار، اُن میں سے بڑے قاسم تھے جس کی بنا پر آپ ﷺ کو ابوالقاسم کہا جاتا تھا، مدینہ منورہ میں آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا آپ کی باندی ماریہ قبطیہ سے، اس کا نام ابراہیم رکھا گیا، مکہ معظمہ میں آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی، لڑکیاں زندہ رہیں، زینب، اُمِّ کلثوم، رُقیہ، اور سب سے چھوٹی فاطمہ، رضی اللہ عنہن، اور لڑکا کوئی زندہ نہیں رہا، بیٹے جتنے پیدا ہوئے سب فوت ہو گئے۔ تو جب آپ ﷺ کے بچے فوت ہو گئے اور آپ ﷺ کے کوئی اور لڑکا نہ ہوا تو مشرکین آپس میں تذکرہ کرتے تھے، جس میں خصوصیت کے ساتھ عاص بن وائل کا نام ذِکر کیا گیا ہے، وہ کہتا تھا کہ یہ اَبتر ہیں، اِن کی نسل منقطع ہو گئی، جتنے دِن تک زندہ ہیں کچھ اپنی بات کر رہے ہیں، جس وقت فوت ہو جائیں گے اُس کے بعد اِن کا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تو جب مشرکین نے اس قسم کا تذکرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت آپ کی تسلی کے لئے اُتاری کہ آپ بے نام ونشان رہنے والے نہیں، بے نام ونشان رہنے والا آپ کا دشمن ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی اولاد بھی پھیلے گی، چاہے لڑکیوں سے ہی ہو، نسل آپ کی باقی رہے گی، لیکن رُوحانی اولاد تو اتنی کثرت کے ساتھ ہوگی کہ جس کا کوئی حساب ہی نہیں۔ اور وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے اندر جس طرح ذِکر کر دیا گیا تھا کہ آپ کا نام تو اتنا اُونچا کر دیا گیا کہ اِس وقت دیکھ ہی رہے ہیں آپ، کہ دُنیا میں اللہ کے نام کے بعد جتنا آپ کا نام پُکارا جاتا ہے کسی اور کا کیا پُکارا جائے گا، اور وہ جو دشمن تھے دشمنی کرنے والے ان کا نام ونشان مٹ گیا، اب ان کا نام اگر باقی ہے تو اسلامی روایات میں باقی ہے، یعنی وہ بھی حضور ﷺ کے واقعے کو ذِکر کرتے ہوئے کبھی اِن کا نام لے لیا جاتا ہے کہ کوئی عاص بن وائل بھی تھا، ورنہ اگر اسلامی روایات اس کے نام کو باقی نہ رکھتیں تو کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں، کوئی اس کا نام لینے والا نہیں، نہ اس کے نسب کا پتا، نہ نسل کا پتا، کہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نسب چلا، کوئی نسل چلی، یہ بھی معلوم نہیں، اور کوئی اس کا عزت واحترام کے ساتھ نام لینے والا نہیں ہے، تو جو پیش گوئی کی گئی تھی تو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کہ واقعی آپ کے دشمن ہی بے نام ونشان ہو گئے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور یہ تین آیتیں ہیں۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ: بے شک ہم نے آپ کو کوثر دیا، فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ: پس آپ اپنے رَبّ کے لئے نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے، ''نحر'' قربانی کرنے کو کہتے ہیں، خاص طور پر اُونٹ کے ذبح کرنے کو، ''ذبح'' اور ''نحر'' یہ دو لفظ آیا کرتے ہیں، ذبح ہے بکری کا، گائے کا، بھیڑ کا، ان جانوروں کو لٹا کر ان کی رگیں کاٹی جاتی ہیں، یہ ''ذبح'' ہے۔ اور ''نحر'' ہوتا ہے کہ اُونٹ کو کھڑا کر کے اس کی ایک ٹانگ باندھ لیتے ہیں، اور پھر چھری کے ساتھ یا نیزے کے ساتھ اس کے حلقوم کو یہاں (گردن کی جڑ) سے کاٹ دیا جاتا ہے، اس سے اُونٹ آسانی سے ذبح ہوتا ہے، اس کو ''نحر'' کہتے ہیں، اور یہاں مطلقاً قربانی کرنے کا معنی ہے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ: شَانِئَكَ یہ مضاف مضاف الیہ ہیں، شَانِئٌ: یہ اِسم فاعل کا صیغہ ہے، اس کا مصدر آتا ہے شَنَآن، قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (سورۂ مائدہ:۸) شَنَآن عداوت اور بغض کو کہتے ہیں، تو شَانِئٌ کا معنی ہو جائے گا عداوت اور بغض رکھنے والا، اِنَّ شَانِئَكَ: بے شک تیرا دُشمن، تیرے ساتھ بغض اور عداوت رکھنے والا، هُوَ الْاَبْتَرُ: هُوَ ضمیرِ فصل ہے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ الْاَبْتَرُ یہ خبر ہے، اور یہ شَانِئٌ کی صفت نہیں، اَبتر یہ بَتَرَ سے لیا گیا ہے، بَتَرَ کاٹنے کو کہتے ہیں، اور اَبتر یہ مفعول کا معنی ادا کرتا ہے، جس طرح سے اشہر کا معنی مشہور آتا ہے اسی طرح سے ابتر یہ مَبْتُوْر کے معنی میں ہے، کٹا ہوا، لفظی معنی اس کا یہ ہے، اور پھر اَبتر ایسے جانور کو کہتے ہیں کہ جس کی دُم کٹی ہوئی ہو، اور پھر ایسے شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ جس کے پیچھے اس کی اولاد نہ ہو، اور اس کا کوئی نام لینے والا پیچھے باقی نہ رہا ہو، اُس کو بھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص اَبتر ہے، مقطوع النسل، جس کے پیچھے اس کا کوئی نام لینے والا نہیں، ''بے شک تیرا دُشمن ہی اَبتر ہے'' وہی مقطوع النسل ہے، بے نام و نشان ہے، اس کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔

تفسیر

''کوثر'' کا مصداق

''کوثر'' کا لفظ اِس سورت میں جو اِستعمال ہوا اس سے خیرِ کثیر بھی مراد لے سکتے ہیں، کیونکہ کوثر یہ کَثْرَة یا كُثْر کا مبالغہ ہے، خیرِ کثیر کے معنی میں، بہت ساری چیز کو کوثر کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، تو ''ہم نے آپ کو خیرِ کثیر دی''، اس کو عام طور پر بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، اور کوثر کا مصداق ایک نہر بھی ہے جو جنت میں ہے، نہرِ کوثر، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اُس میدان میں جس میں سارے کے سارے لوگ حساب کتاب کے لئے جمع ہوں گے وہاں بھی ایک حوض ہوگا جس کو ''حوضِ کوثر'' کہتے ہیں، تو جنت کی نہر یا وہ میدانِ حشر کا حوض وہ بھی اس کا مصداق ہوسکتا ہے۔

''نہرِ کوثر'' کا تعارف

روایات میں غور کرنے سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ اصل تو وہ نہر جنت میں ہی ہے، جب سرورِ کائنات ﷺ معراج پر

تشریف لے گئے تھے تو آپ نے وہ نہر دیکھی، آ کر اُس کا وصف آپ نے بیان فرمایا کہ اس کا پانی دُودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا (ترمذی) اور اس کے نیچے جو مٹی ہے وہ مسکِ اذفر ہے، (بخاری) یہ بہت خوشبودار کستوری ہے، اور ندی نالوں کے نیچے جس طرح سے کنکریاں ہوا کرتی ہیں تو اُس (نہرِ کوثر) میں کنکریاں یاقوت اور لؤلؤ اس قسم کے قیمتی موتی ہیں (طبری)، اور اس کے کناروں پر مجوف موتیوں کے خیمے بنے ہوئے ہیں (بخاری)۔ اور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اس میں ایسے جانور بھی دیکھے کہ جن کی گردنیں بختی اُونٹ جیسی ہیں (ترمذی)۔ جس وقت یہ لفظ سامنے آیا کرتا ہے تو میرا ذہن اکثر و بیشتر مرغابی کی طرف منتقل ہوتا ہے، یہ جو پانی میں جانور رہتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی گردن بھی اُونٹ کی طرح ہی ہوتی ہے لمبی، تو وہاں جو جانور ہوں گے ان کی کچھ نہ کچھ تشبیہ ان کے ساتھ ہوگی جیسے یہاں مرغابی ہے، تو وہاں بھی حوض میں نہر میں یہ جانور ہوں گے۔ جس وقت یہ حضور ﷺ بیان فرما رہے تھے تو ایک صحابی (سیدنا عمرؓ) نے کہا کہ یا رسول اللہ! وہ پرندے تو بہت خوش حال ہوں گے جو نہرِ کوثر میں رہتے ہیں! آپ نے فرمایا کہ ان کے کھانے والے ان سے بھی زیادہ خوش حال ہوں گے، جن کو وہ کھانے کے لئے ملیں گے (ترمذی)۔ (۱)

''حوضِ کوثر'' کا تعارف

اور ایسے ہی اُس حوض کا ذِکر بھی روایات میں کثرت کے ساتھ آیا ہے جو قیامت کے دِن اس میدان میں ہوگا جہاں لوگ جمع ہوں گے، اس کا ذِکر بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہت وسیع ہے، اور چاروں کونے اس کے برابر ہیں، جس کو ہم ''مربع'' کہتے ہیں، مہینے کی مسافت ہے، اور اس میں برتن اتنے ہیں کہ جس طرح سے آسمان کے ستارے ہیں، میں اپنے اُمتیوں کو اس دِن پانی پلاؤں گا، اور جو ایک دفعہ پیئے گا اس کو دوبارہ پیاس نہیں لگے گی۔ (۲) اسی موقع کے متعلق ایک روایت میں آتا ہے کہ کچھ لوگ حضور ﷺ کی طرف آنا چاہیں گے اور رسول اللہ ﷺ بھی اُن کو پہچانیں گے کہ یہ میرے اُمتی ہیں، لیکن سامنے فرشتے رُکاوٹ ڈال دیں گے، ان کو وہاں تک پہنچنے نہیں دیں گے، آپ کہیں گے: ''أُصَيْحَابِي، أُصَيْحَابِي'' یہ تو کچھ میرے ساتھی ہیں، یہ تھوڑے سے میرے ساتھی ہیں اِن کو آنے دو، تو فرشتے جواب دیں گے کہ ''إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ'' آپ کو پتا نہیں کہ انہوں نے آپ کے دُنیا سے چلے آنے کے بعد کیا کیا نئے کام کئے، انہوں نے اِحداث کیا، دِین کے اندر بدعتیں نکالیں، نئے نئے طریقے ایجاد کئے۔ تو جس وقت یہ بات سامنے آئے گی تو پھر رسول اللہ ﷺ فرمائیں گے: ''سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِي'' جن لوگوں نے میرے بعد میرے دِین کو تبدیل کر دیا وہ دفع ہو جائیں، دفع ہو جائیں، دُور ہو جائیں، (۳) دَفع دُور جس طرح سے کہتے ہیں تو ''سُحْقًا سُحْقًا'' یہ بھی ٹھکرانے اور دھتکارنے کا کلمہ ہے۔ تو ایسے بدعتی لوگ، یا حضور ﷺ کے بعد جو اِنکارِ زکوٰۃ کی بنا پر مرتد ہو گئے

---

(۱) دیکھئے: ترمذی ۲/ ۸۰ باب ما جاء فی صفۃ طیر الجنۃ/ بخاری ۲/ ۹۷۴ باب فی الحوض مختصر/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۸ باب صفۃ الجنۃ، فصل ثانی۔ تفسیر طبری۔

(۲) مسلم ۲/ ۲۴۹ باب اثبات حوض نبینا/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۷ باب الحوض کی دُوسری حدیث/ نیز بخاری ۲/ ۹۷۴ باب فی الحوض۔

(۳) بخاری ۲/ ۶۶۵، تفسیر سورۂ مائدہ کا آخر۔ ۲/ ۹۷۴ باب فی الحوض مسلم ۲/ ۲۵۰ باب اثبات حوض نبینا۔ نوٹ: یہ دو حدیثوں کا مجموعی مضمون ہے۔

تھے، یا مسیلمہ کذاب کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، اِس قسم کے لوگ حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوں گے تو آپ ﷺ ان کو دھتکار دیں گے فرشتوں کی اطلاع کے بعد۔ اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ انبیاء ﷩ کے اپنے اپنے حوض ہوں گے، اور ہر نبی اپنے اُمتیوں کو پانی پلائے گا، اور ہر نبی یہ دیکھے گا کہ کس کے حوض کے اُوپر لوگ زیادہ آنے والے ہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ میرے حوض پر آنے والے ہوں گے، اور میں ان اُمتوں کے مقابلے میں اپنی اُمت کی کثرت کے اُوپر فخر کروں گا، میری اُمت سب سے زیادہ ہوگی۔(1) تو اَصل نہر ہے جنّت میں جو حضور ﷺ کو دی گئی، اور اسی نہر سے دو پرنالے گرتے ہوں گے اس حوض میں جو کہ قیامت کے دِن اس میدان میں ہوگا (مسلم ۲؍۲۵۰)۔ وہاں سے رسول اللہ ﷺ اپنے اُمتیوں کو پانی پلائیں گے اور اپنے اُمتیوں کو آثارِ وضو کے ساتھ پہچانیں گے، وضو کے آثار حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ چمکتے ہوں گے، ان سے یہ اُمت پہچانی جائے گی۔(2) تو اِس روایت کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اُمتوں میں یا تو وضو تھا نہیں، انبیاء ﷩ کے وضو کا ذِکر تو آتا ہے "هٰذَا وُضُوْئِيْ وَوُضُوْءُ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِيْ"(3) یہی میرا وضو کا طریقہ ہے اور یہی اُن انبیاء ﷩ کے وضو کا طریقہ ہے جو مجھ سے پہلے گزرے ہیں، تو انبیاء ﷩ کے وضو کا ذِکر تو آتا ہے، اُمتوں میں یا تو وضو ہوگا نہیں، اور اگر وضو ہو تو پھر بھی یہ آثار قیامت کے دِن جو نمایاں ہوں گے وہ اِس اُمت کی خصوصیت ہے۔ تو اعضائے وضو چمکتے ہوں گے اور اِن کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ اپنے اُمتیوں کو پہچانیں گے۔ تو وہ نہر جو جنّت میں ہے اُسی سے پانی آئے گا اِس حوض میں، اور سرورِ کائنات ﷺ کی برکت سے باقی انبیاء ﷩ کو بھی پانی اُسی نہر سے پہنچے گا، اور وہ بھی اپنے اپنے حوض سے اپنے اپنے اُمتیوں کو پانی پلائیں گے۔ تو یہ جو "کوثر" ہے جنّت میں نہر، یا "حوضِ کوثر" جو محشر میں ہوگا، یہ صحیح روایات سے ثابت ہے، اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، اِس کے مطابق عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ واقعی ایک نہر ہے جس کو "نہرِ کوثر" کہتے ہیں، یا حوض ہے جس کو "حوضِ کوثر" کہتے ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ دے دیا، آپ کے لئے وہ ہو گیا، اِس میں حضور ﷺ کا اِعزاز نمایاں ہے۔

"کوثر" کا مصداق "خیرِ کثیر" کو بنانا راجح ہے، دلیلِ اوّل

اور اگر اس کو "خیرِ کثیر" کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک عام مفہوم ہے، "بخاری شریف" (۲؍۹۷۴) میں ابن عباس ﷠ سے روایت آتی ہے کہ آپ نے اس کا ترجمہ "خیرِ کثیر" کے ساتھ کیا، تو کسی نے کہا کہ اس سے تو حوض مراد ہے، تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی "خیرِ کثیر" کا ہی حصہ ہے، یعنی جب اس سے "خیرِ کثیر" مراد لے لیا جائے گا تو دُنیا اور آخرت میں جو خیر بھی سرورِ کائنات ﷺ کو ملنے والی تھی وہ سب اِس میں آجائے گی۔

---

(۱) ترمذی ۲؍۷۰ باب ما جاء فی صفة الحوض/ مشکوٰۃ ۲؍۴۹۳ باب الحوض، فصل ثانی۔ ولفظ الحدیث: إنّ لکلّ نبيٍّ حوضًا... الخ.

(۲) مسلم ۱؍۱۲۶ باب استحباب اطالة الغرة... الخ. مشکوٰۃ ۱؍۴۰، کتاب الطہارۃ، فصل ثالث۔ نیز بخاری ص ۲۵ باب فضل الوضوء والغر المحجلون۔

(۳) مشکوٰۃ ۱؍۴۷ باب سنن الوضوء، فصل ثالث۔

دلیلِ ثانی

اور اِس سورت کے شانِ نزول کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اِس کو عام رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے، زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مفسرین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا لڑکا ''قاسم'' جس وقت فوت ہوا تو بعض مشرکوں نے یہ کہا کہ اس کے نرینہ اولاد نہیں ہے، یہ مرجائے گا، پیچھے اِس کا کوئی نام نہیں لے گا، جس وقت تک زندہ ہے کچھ اپنی آواز اُٹھا رہا ہے، اور اِس کے اولاد ہے نہیں، اس کی نسل آگے چلے گی نہیں، اس لئے مرجانے کے بعد اِس کے دِین کو اور اس کے طریقے کو کوئی باقی نہیں رکھے گا، یہ بے نام ونشان ہوجائے گا۔ تو یہ لفظ انہوں نے استعمال کیا کہ یہ ''اَبتر'' ہے، مقطوع النسل ہے، اِس کے پیچھے کوئی اس کا نام لینے والا نہیں ہوگا، ایسا کہنے والوں میں خاص طور پر عاص بن وائل کا نام ذِکر کیا گیا ہے (جلالین)۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے دُختری اولاد تو رہی ہے، چار بیٹیاں تھیں، زینب، اُمِّ کلثوم، رُقیہ، فاطمہ رضی اللہ عنہن، یہ چار بیٹیاں تو ہیں، اور لڑکے جتنے پیدا ہوئے وہ سب فوت ہوگئے چھوٹی عمر میں۔ مکہ معظمہ میں قاسم، عبداللہ، طیب، طاہر، ان کا نام آتا ہے، اور مدینہ منورہ میں ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے حضرت ابراہیم، لیکن ان میں سے زندہ کوئی نہیں رہا، سب چھوٹی عمر میں فوت ہوگئے۔ تو مشرکین کہتے تھے جب اس کے نرینہ اولاد نہیں تو اس کی آگے نسل چلے گی ہی نہیں، جب نسل نہیں چلے گی تو آئندہ اس کا کوئی نام باقی نہیں رہے گا، کوئی نام لینے والا نہیں ہوگا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت اُتاری جس میں ایک قسم کی پیش گوئی کردی گئی کہ یہ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ مقطوع النسل ہیں اور آپ کا ذِکرِ خیر باقی نہیں رہے گا اور کوئی آپ کا نام لینے والا نہیں ہوگا، لیکن ہم یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ ہم نے آپ کو خیرِ کثیر دے دی، آنے والے وقت میں خیر آپ کے ہی حصے میں ہے، ہر آنے والا وقت آپ کے حق میں پچھلے سے زیادہ اچھا ہوگا، اور آپ کے یہ دُشمن بے نام ونشان ہوکر رہ جائیں گے، ان کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔ یہ پیش گوئی سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ذِکر کردی گئی، اس میں ایک بشارت کا پہلو ہے، اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ ایسا ہی ہوا، کہ رسول اللہ ﷺ کی دُختری اولاد بھی بہت پھیلی، آپ کی طرف نسبت رکھنے والے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے بہت زیادہ لوگ ہیں، دُختری اولاد بھی بہت ہے، لیکن اصل ہے رُوحانی اولاد، نبی اُمت کا باپ ہوا کرتا ہے اور اُمتی نبی کی اولاد ہیں، اِن کے ذریعے سے سرورِ کائنات ﷺ کا جتنا ذِکرِ خیر باقی ہے آپ اندازہ کرسکتے ہیں، ساری دُنیا میں کتنی محبت کے ساتھ آپ کا نام پکارا جاتا ہے۔ جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، آپ کا نام لیا جاتا ہے، وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے تحت جس طرح سے ذِکر کردیا تھا، کتنے لوگ آپ کی محبت کے اندر پگھلتے جاتے ہیں، اور ہر وقت آپ کا ذِکرِ خیر ہے۔ اور وہ مخالفین جو تھے ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا، ان کا اگر کوئی نام باقی بھی ہے تو وہ بھی اِنہی اسلامی روایات میں اس واقعے کو ذِکر کرتے ہوئے تو کبھی کسی کی زبان پہ آجائے گا، ورنہ آج دُنیا کے اندر ان کی نسل کا کوئی شخص ایسا موجود نہیں جو عزت کے ساتھ ان کا نام لینے والا ہو، جو کہتے تھے کہ ان کا نام ونشان مٹ جائے گا، تو دُنیا نے دیکھ لیا کہ مخالفین جو تھے اُن کا نام ونشان مٹ گیا۔

دلیلِ ثالث

اور اسی طرح سے ماقبل کی طرف دیکھتے ہوئے ''کوثر'' کا مفہوم خیرِ کثیر مراد لے کر یہ بھی ذکر کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ شخص اپنے آبائی دِین سے کٹ گیا، آبائی دِین سے علیحدہ ہوگیا، اور جس وقت آثار کچھ ہجرت کے شروع ہوگئے تھے، مسلمان کلمہ پڑھنے والے مکہ معظمہ کو چھوڑ کر جارہے تھے، کوئی حبشہ چلا گیا پھر بعد میں مدینہ منورہ جانا شروع ہوگئے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی آثار کچھ ایسے نظر آنے لگ گئے کہ یہ بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں گے، تو وہ لوگ یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ اس شخص کا تعلق بیت اللہ سے کٹتا جارہا ہے، اور اپنے آبائی دِین سے جدا ہوگیا، تو بیت اللہ کو چھوڑنے کا اور اپنے آبائی دِین کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ بے نام ونشان ہوجائے گا، اس کا کوئی نام لینے والا باقی نہیں رہے گا، کیونکہ قریش کو جتنی شہرت حاصل تھی، دُنیا کے اندر جو وہ خوش حال تھے وہ بیت اللہ کی ہی برکت سے تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا تعلق بیت اللہ کے ساتھ باقی ہے، ہم اِس کے مجاور ہیں، اور یہ سارے چھوڑ چھاڑ کے بھاگتے جارہے ہیں، تو جس وقت ان کا مرکز سے تعلق نہیں رہے گا تو کوئی خیر ان کے حصے میں نہیں آئے گی اور یہ بے نام ونشان ہوجائیں گے اللہ کے اس گھر سے کٹ کر۔ تو جب ہم ''کوثر'' سے ''خیرِ کثیر'' مراد لیں گے تو اس میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ آنے والے وقت میں خیر اِنہی کے حصے میں ہے، اس لئے بیت اللہ کی تولیت اور بیت اللہ کے ساتھ تعلق اِنہی لوگوں کا بحال رہے گا، اور جو ان کے مخالف ہیں بے نام ونشان وہ ہوجائیں گے، تو اِس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، واقعے کے لحاظ سے چونکہ مکہ معظمہ میں خیر وبرکت بیت اللہ کی وجہ سے ہی تھی، اور قریش کو غلبہ اور تسلط حاصل تھا تو بیت اللہ کے تعلق کی بنا پر ہی تھا، تو اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ عنقریب قریش جو مشرک ہیں اُن کا تعلق کٹ جائے گا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں یہ خیر بھی آجائے گی، اور دُشمن سارے بے نام ونشان ہوجائیں گے۔

''خیرِ کثیر'' ملنے پر اَدائے شکر کا حکم

اور درمیان میں یہ جو آیت ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ یہ ایک قسم کا شکر کا مطالبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ''خیرِ کثیر'' دے رہے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیجئے بدنی بھی مالی بھی، اور یہی وہ مشن ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے تھے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بھی آتا ہے اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ انعام: ۱۶۲) ''نُسك'' بھی قربانی کو کہتے ہیں، قربانی کرنا اللہ کے نام پر اور نماز پڑھنا، ایک بدنی عبادت آگئی اور ایک مالی، لِرَبِّكَ کی صراحت خصوصیت کے ساتھ کردی جس کے ساتھ انکار کرنا مقصود ہے مشرکین پر، کہ وہ بھی نماز تو پڑھتے تھے اپنے خیال کے مطابق، جیسے پچھلی سورت میں آپ کے سامنے آیا تھا فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ میں، تو نماز تو پڑھتے تھے اپنے خیال کے مطابق لیکن بتوں کی، اور قربانی دیتے تھے چڑھاوے چڑھاتے تھے لیکن بتوں پر، اور اِن دونوں باتوں میں مشرکین کے ساتھ مخالفت ہے کہ آپ اپنے رَبّ کی نماز پڑھئے اور اپنے رَبّ کے لئے قربانی کیجئے، یہ شکر ہے، گویا کہ آپ عبادت بدنی اور عبادت مالی اللہ تعالیٰ کے لئے کرتے رہیے، اللہ تعالیٰ کی طرف

سے فیصلہ ہوگیا کہ آپ کو "خیرِ کثیر" ملے گی، اور آپ کے دشمن سارے کے سارے بے نام ونشان ہوجائیں گے، مٹ جائیں گے، کوئی دشمن آپ کا باقی نہیں رہے گا۔

"خیرِ کثیر" کی پیش گوئی کا دُنیا وآخرت میں پورا ہونا

تو جو بشارت اِس سورت کے ضمن میں دی گئی تھی آنے والی تاریخ نے بہت جلد اس کی تصدیق کردی، اور آج آپ بھی کھلی آنکھوں دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دُنیا میں کس طرح سے "خیرِ کثیر" دی، آخرت میں بھی آپ ﷺ کو "خیرِ کثیر" ملے گی، حتیٰ کہ تمام اوّلین اور آخرین کے مقابلے میں جس وقت آپ ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز کیا جائے گا، تو رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اوّلین وآخرین جتنے بھی ہیں وہ سب میرے پہ غبطہ کریں گے،[1] میری حالت کو دیکھ دیکھ کر ان کو رشک آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا مقام دیا۔ تو دُنیا میں آپ ﷺ کا نام بلند ہوا، آپ ﷺ کا ذِکرِ خیر بلند ہوا، اور آخرت میں بھی سب سے زیادہ فضیلت اور سب سے زیادہ منقبت آپ ﷺ کی نمایاں ہوگی "اٰدَمُ وَمَنْ بَعْدَهٗ تَحْتَ لِوَائِيْ"[2] آدم علیہ السلام اور آدم کے بعد آنے والے جتنے بھی ہیں سارے کے سارے رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے جیسے حضور ﷺ نے ظاہر فرمایا۔ تو دُنیا اور آخرت کی "خیرِ کثیر" حضور ﷺ کو مل گئی جیسے کہ پیش گوئی اِس سورت کے اندر کی گئی تھی۔

اٰیاتھا ٦ ۔ ١٠٩ سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّةٌ ١٨ ۔ رکوعھا ١
سورۂ کافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ٦ آیتیں ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ① لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ
آپ کہہ دیجئے: اے کافرو! ○ نہیں عبادت کرتا میں اس چیز کی جس کی تم عبادت کرتے ہو ○ اور نہیں ہو تم عبادت کرنے والے اس چیز کی
اَعْبُدُ ③ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ④ وَلَآ اَنْتُمْ
جس کی میں عبادت کرتا ہوں ○ اور نہیں ہوں میں عبادت کرنے والا اس چیز کی جس کی تم نے عبادت کی ○ اور نہیں ہو تم

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۳، باب الحوض والشفاعۃ، فصل ثانی۔ سنن دارمی، رقم ۲۸۴۲۔ ولفظ الحدیث: ثم اقوم عن یمین اللہ مقاما یغبطنی الاولون والآخرون۔

(۲) ترمذی ۲/ ۱۴۷، تفسیر سورۃ اسراء/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۳، باب فضائل سید المرسلین، فصل ثانی۔ ولفظه: مَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ اٰدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَائِيْ

عٰبِدُوْنَ	مَآ	اَعْبُدُ ۞	لَكُمْ	دِيْنُكُمْ	وَلِيَ	دِيْنِ ۞

عبادت کرنے والے اس چیز کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں ۞ تمہارے لئے تمہاری جزا ہے اور میرے لئے میری جزا ہے ۞

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ کافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۶ آیتیں ہیں۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ: آپ کہہ دیجئے، قُلْ: اعلان کر دیجئے، کہہ دیجئے اے کافرو! الْكٰفِرُوْنَ: اسم فاعل کے اُوپر جس وقت الف لام آجائے تو آپ نے پڑھا ہے کہ یہ الذی کے معنی میں ہوتا ہے، تو يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کا مفہوم وہی ہے جو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا ہے، اے وہ لوگو جو کفر کرنے والے ہو، کُفر کا معنی انکار، جو میری باتوں کو نہیں مانتے، اللہ کی باتوں کو نہیں مانتے، اللہ کی کتاب کو تسلیم نہیں کرتے، ''اے انکار کرنے والو!'' لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ: نہیں عبادت کرتا میں اس چیز کی جس کی تم عبادت کرتے ہو، وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ: اور نہیں ہو تم عبادت کرنے والے اس چیز کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں، وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ: اور نہیں ہوں میں عبادت کرنے والا اس چیز کی جس کی تم نے عبادت کی، وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ: اور نہیں ہو تم عبادت کرنے والے اس چیز کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ: تمہارے لئے تمہارا دِین اور میرے لئے میرا دِین۔ دِيْنِ، نون کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یاءِ متکلم پر دلالت کرتا ہے، دِین سے مراد مذہب اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے، ''میرے لئے میرا طریقہ اور تمہارے لئے تمہارا طریقہ'' لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ (سورۂ یونس: ۴۱)۔ اور اس سے جزا بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تمہارے لئے تمہاری جزا ہے تمہارا کیا ہوا تمہارے سامنے آجائے گا، اور میرے لئے میری جزا ہے میرا کیا ہوا میرے سامنے آجائے گا۔

تفسیر

شانِ نزول

یہ سورت سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے پوری طرح سے براءت کا اعلان ہے کافروں کے ساتھ۔ شانِ نزول اس کا یہ ہے مفسرین کے ذِکر کے مطابق، کہ مشرکین میں سے بعض لوگ ایسے تھے جو اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم مصلح ہیں، مصلحانہ کارروائی کرتے ہیں، اُن کی کوشش یہ تھی کہ سرورِ کائنات ﷺ کے اس دِین کے ظاہر کرنے کے بعد قوم میں جو پھوٹ پڑ گئی ہے، دو پارٹیاں بن گئیں، ایک ''لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھنے والے، اور دُوسرے اپنے دِینِ آبائی کے پابند، اس پھوٹ پڑ جانے کے ساتھ گھر گھر لڑائی ہے، گھر گھر کشاکشی ہے، خاوند بیوی میں اختلاف ہو گیا، بہن بھائیوں میں ہو گیا، ماں باپ اور اولاد میں ہو گیا، تو ساری کی ساری قوم جو تھی وہ دو حصوں میں بٹتی چلی جارہی ہے، اور دِن بہ دِن اختلاف میں شدّت ہوتی جارہی ہے، تو کیا ہی اچھا ہو کہ درمیان میں کوئی مصالحانہ نقطہ پیدا کر لیا جائے، ''کچھ لو، کچھ دو'' اُصول پر آپس میں صلح کر لی جائے، تو آپس میں اتفاق ہو جائے۔ اس لئے حضور ﷺ کے سامنے بار باراُن کے وفود آتے تھے، اُن کے نمائندے آتے تھے یہ بات کرنے کے لئے کہ

تھوڑا سا آپ مان جائیں، تھوڑا سا ہم مان جائیں گے، سورۂ یونس کے اندر بھی آیا تھا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (آیت ۱۵) انہوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ ہم آپ کے ساتھ اچھی طرح رہ سکتے ہیں، آپ کی بات سنیں گے، صلح صفائی کے ساتھ رہیں گے، لیکن اِس قرآن کو چھوڑ کر کوئی اور قرآن لے آ، اَوْ بَدِّلْهُ: یا اِسی کے اندر کچھ کوئی تبدیلی کر دے، اور تبدیلی وہ یہی چاہتے تھے کہ جو ہمارے مذہب کو بُرا کہا جارہا ہے اور ہمارے معبودوں کو بُرا کہا جارہا ہے، یہ آیات اِس میں سے نکال دو، تو پھر ہم بھی آپ کے ساتھ رواداری سے پیش آئیں گے، آپ کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے، اس قسم کے وہ مطالبے کرتے تھے، اُس سورت میں بھی اس کا ذکر آیا، اور روایات میں موجود ہے، وہ کہتے تھے ہمارے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دو، کچھ کچھ تم اُن کا لحاظ کرلیا کرو، کچھ ہم آپ کا لحاظ کرلیں گے، اس قسم کی مصالحانہ کوشش بعض لوگ کرتے تھے، اور یہ قصہ چلتا رہتا، حضور ﷺ اپنی جگہ اپنے دِین کی تبلیغ کرتے تھے، وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے، اور کچھ لوگ تھے درمیان کے اندر آپس میں ربط پیدا کروانے والے، کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ دونوں گروہ آپس میں جُڑ بیٹھیں، قوم کے اندر کسی قسم کا اختلاف نہ ہو، لیکن آپ جانتے ہیں کہ بھلا دِینِ حق کے اندر یہ بات کس طرح سے برداشت ہوسکتی ہے کہ شرک کی اجازت دے دی جائے، یا مشرکانہ افعال اور اطوار کے اندر اُن کے ساتھ خود شریک ہو کر ایک مصالحانہ رَوِش کا مظاہرہ کر دیا جائے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ کشاکشی چلتی رہی، آخر جب کافروں پر بالکل اِتمامِ حُجت ہوگیا اور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے پوری طرح وضاحت ہوگئی تو پھر یہ اعلانِ براءت کر دیا گیا، اِس میں صاف صاف ان کو یہ بات سُنادی گئی کہ آپس میں مصالحت کسی طرح سے بھی نہیں ہوسکتی، مصالحت کا ایک یہی طریقہ ہے کہ کُفر اور شرک کو چھوڑ کر اللہ کی توحید پر آجاؤ، اور اگر تم چاہتے ہو کہ کافر ہوتے ہوئے مشرک ہوتے ہوئے تم ہمارے ساتھ جوڑ لگالو، ایسا نہیں ہوسکتا، نہ ہم تمہارے معبودوں کو پُوج سکتے ہیں اور نہ تم مشرک رہتے ہوئے اللہ کے عبادت گزار سمجھے جاسکتے ہو۔

مشرکین کے اصل معبود غیر اللہ ہیں

مشرک اگرچہ اللہ کو بھی پُوجتا ہے، لیکن اصل معبود اس کے وہی ہوتے ہیں جو غیر اللہ ہیں، کیونکہ جب کسی کام میں شرک داخل ہوجائے، پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس عبادت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہ عبادت دُوسرے کے پلّے میں ڈال دی جاتی ہے، اس لئے باوجود اس کے کہ اُن کے معبودوں میں اللہ بھی شامل ہے، لیکن یہاں ان کے معبودوں سے جو تبرّی کی جارہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ کا نام لینا ایسے ہی ہے برائے وزنِ بیت، ورنہ اصل عبادت ان کی وہی غیر اللہ کی ہے، اور اگر وہ اللہ کا نام لیتے بھی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں۔

جملوں میں تکرار کی پہلی وجہ

تو یہ جو دو دفعہ جملے دوہرائے گئے تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ نہ تو آئندہ ہمارا آپس میں اتفاق ہوسکتا ہے، نہ ہم تمہارے معبودوں کو پُوج سکتے ہیں اور نہ تم ہمارے معبود کو پُوج سکتے ہو جس وقت تک کہ شرک سے توبہ نہ کرو۔ اور دُوسرے جملوں میں ماضی کا حوالہ دے دیا گیا، کہ ماضی میں بھی ایسے ہی رہا کہ نہ ہم نے تمہارے معبودوں کو پُوجا اور نہ تم ہمارے معبود کو پُوجنے والے تھے،

سرورِ کائنات ﷺ کی پوری زندگی اس بات کے اُوپر شاہد ہے کہ بچپن سے لے کر جب سے آپ نے ہوش سنبھالا، جوانی اور نبوت تک پہنچے تک بھی آپ نے کبھی مشرکانہ کارروائیوں میں حصّہ نہیں لیا تھا، اور کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، کبھی کسی بت کے ہاں چڑھاوا نہیں چڑھایا جس طرح سے مشرکین کرتے تھے، تو ظاہر کر دیا کہ جیسے ماضی میں ہم نے تمہارے معبودوں کو نہیں پُوجا، اور تم نے دیکھ لیا کہ ہم پہلے دن سے ہی اِن سے دُور رہے ہیں، تو آئندہ بھی ہم سے یہ توقع نہ رکھو۔ اور اسی طرح سے مشرک ہوتے ہوئے جس طرح سے تم ماضی کے اندر اللہ کے عبادت گزار نہیں تھے اسی طرح سے مستقبل میں بھی تم اللہ کے عبادت گزار نہیں ہو سکتے، ایک ہی صورت ہے کہ تم اپنے کُفر اور شرک سے توبہ کرو اور اللہ کی توحید کو اِختیار کرلو، اگر تم ایسا کرنے والے نہیں ہو تو پھر تم جانو تمہارا کام جانے، ہمارا دِین ہمارے لئے، تمہارا دِین تمہارے لئے، تمہارا کیا تمہارے سامنے آجائے گا، ہمارا کیا ہمارے سامنے آجائے گا، مصالحت کی کوئی کسی قسم کی گنجائش نہیں ہے۔

اُسوۂ اِبراہیمی کا اِحیا

یہ ایسا ہی اعلان ہے جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اِتمامِ حُجّت کے بعد اپنی قوم کے سامنے کر دیا تھا جس کا ذِکر سورۂ ممتحنہ میں آپ کے سامنے آیا، اِتمامِ حُجّت کے بعد......! پہلے پوری طرح سے قوم کو ہمدردی اور خیرخواہی سے سمجھایا جاتا ہے، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اور اپنے رشتہ دار ہونے کی حیثیت سے سمجھانے میں کمی نہیں کی جاتی، لیکن جب مایوسی ہو جائے تو اس کے بعد پھر اعلانِ براءت ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذِکر آیا سورۂ ممتحنہ میں: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآٰؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ: تو یہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ اعلان ہو گیا، آپ کی طرف سے بھی اور آپ کے ماننے والوں کی طرف سے بھی، اُنہوں نے صاف صاف اپنی قوم کو کہہ دیا کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں، ہم نے تمہارا بھی انکار کیا، ہم تمہیں بھی ماننے کے لئے تیار نہیں اور تمہارے معبودوں کو بھی، اور ہماری آپس میں بغض اور عداوت بالکل نمایاں ہو گئی جس وقت تک کہ تم ایمان نہ لاؤ، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ جو قرآنِ کریم میں ذِکر کیا گیا ہے تو گویا کہ سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کے صحابہ نے اسی نمونے کو اپنایا اور کافروں کے سامنے صاف صاف لفظوں میں براءت کردی کہ ہمارا تمہارا کسی صورت میں آپس میں جوڑ نہیں لگ سکتا اور ہماری آپس میں صلح نہیں ہو سکتی، تو یہ اِعلانِ براءت ہے جو اِس سورت کے اندر کر دیا گیا۔

''اے کافرو! نہیں عبادت کروں گا میں اُن چیزوں کی جن کی تم عبادت کرتے ہو'' یعنی مستقبل میں، آئندہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے معبودوں کو مان لوں۔ ''اور نہیں تم عبادت کرنے والے اس چیز کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں'' مشرک رہتے ہوئے تم کبھی اللہ کے عابد نہیں بن سکتے۔ ''اور نہیں ہوں میں عبادت کرنے والا جس چیز کی تم نے عبادت کی'' یعنی ماضی میں بھی ایسے ہی رہا کہ میں نے تمہارے معبودوں کو نہیں مانا۔ ''اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں'' یعنی ماضی میں تم اللہ کو پُوجنے والے نہیں تھے اور ہم بتوں کو پُوجنے والے نہیں تھے، یعنی وہ اگرچہ اللہ کا نام لیتے

تھے لیکن اللہ کی وہ عبادت قابلِ اعتبار نہیں جس وقت کہ اُس میں شرک شامل ہو۔ تو ماضی کا بھی حوالہ دے دیا۔ ایک ترجمہ تو اس کا اس طرح سے کیا گیا ہے کہ دونوں جگہ میں نے ''مَا'' کو موصولہ بنا کر یہ ترجمہ کیا ہے، اور فرق کر دیا دونوں جملوں میں، بظاہر جو تکرار معلوم ہوتا ہے، تو دونوں جملوں میں فرق ہو گیا کہ ایک میں مستقبل مراد ہے، اور دُوسرے میں ماضی مراد ہے کہ نہ ماضی میں ایسا ہوا اور نہ مستقبل میں ایسا ہوگا (آلوسی)۔ [1]

جملوں میں تکرار کی دُوسری وجہ

اور دُوسرا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے، جو ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ذِکر کیا کہ پہلے ''مَا'' کو موصولہ بنالیا جائے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ، وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اِس میں ''مَا'' موصولہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا معبود میں اشتراک نہیں، تمہارے معبود میرے معبود نہیں، میرا معبود تمہارا معبود نہیں۔ اور آگے ''مَا'' کو مصدریہ بنالیا جائے، مصدریہ جس وقت بن جائے گا تو مَا عَبَدْتُّمْ اور مَآ اَعْبُدُ یہ عبادت کے معنی میں آجائیں گے، مَآ اَعْبُدُ: عِبَادَتِيْ، اور مَا عَبَدْتُّمْ: عِبَادَتُكُمْ مصدر کی تاویل میں ہو جائیں گے، مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا عبادت کرنے کا طریقہ جدا، میرا عبادت کرنے کا طریقہ جدا، میں اُس طرح سے عبادت نہیں کرسکتا جس طرح سے تم عبادت کرتے ہو، تم اُس طرح سے عبادت نہیں کرسکتے جس طرح سے میں عبادت کرتا ہوں، ہمارے معبود بھی علیحدہ علیحدہ، ہمارا طریقۂ عبادت بھی علیحدہ علیحدہ، تمہارا طریقۂ عبادت جو ہے وہ تمہارا اپنا گھڑا ہوا ہے، کہیں سیٹیاں بجاتے ہو، کہیں تالیاں بجاتے ہو، کہیں ننگے ہو کے طواف کرتے ہو اور ناچتے ہو، یہ تمہارے طریقے ہیں جو تم نے اپنے طور پر ایجاد کر لئے، ہمارا طریقۂ عبادت جو اللہ نے ہمیں بتادیا وہ ہمارا ہے، تمہارا اور طریقہ، ہمارا اور طریقہ، تمہارے اور معبود، ہمارا اور معبود، تمہارے لئے تمہارا دِین، ہمارے لئے ہمارا دِین، آج کے بعد دوبارہ ہم سے اس قسم کی بات نہ کرنا، جس طرح سے پہلے کرتے رہتے ہو کہ آؤ کوئی درمیانی سا نقطہ نکال کر آپس میں صلح کرلیں، صاف صاف جواب ہے، تمہارا اپنا راستہ، ہمارا اپنا راستہ۔

سورۂ نصر کا ماقبل سے ربط

جس وقت نوبت یہاں آجایا کرتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کُن بات سامنے آیا کرتی ہے، اور وہ فیصلہ کُن بات وہی ہے جس کا ذِکر اگلی سورت میں آگیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو نصرت حاصل ہوگی، فتح حاصل ہوگی، پھر لوگ دھڑا دھڑ اس دِین کے اندر داخل ہونا شروع ہو جائیں گے اور کُفر کا زور ٹوٹ جائے گا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ ہجرت کے بعد پھر غزوات شروع ہوئے، اور یہ غزوات آخر منتہی ہوئے جا کے فتحِ مکہ پر، اور فتحِ مکہ کے بعد پھر مشرکوں کا زور ٹوٹ گیا، اور شرک وکُفر نے اِسلام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے، پھر اُس کو سر اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی سرزمینِ عرب میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وہ علاقہ سارے کا سارا صاف ہو گیا، اُسی فتح اور نصرت کا ذِکر اگلی سورت میں آرہا ہے۔

---

(۱) یہ تطبیق علامہ زمخشری کی ہے، جبکہ بہت سے مفسرین نے پہلے جملوں کو حال اور دُوسرے جملوں کو استقبال پر محمول کیا ہے۔ دیکھیں: جلالین، نسفی، ابن کثیر، وغیرہ

سورۂ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳ آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝١ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۝٢

جب آجائے اللہ کی مدد اور فتح ۝ اور آپ دیکھیں لوگوں کو کہ داخل ہوتے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج ۝

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝٣

تو تسبیح بیان کیجئے آپ اپنے رَبّ کی اُس کی حمد کے ساتھ، اور اس سے اِستغفار کیجئے، بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے ۝

سورۂ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳ آیتیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ: جس وقت آجائے اللہ کی مدد اور فتح، فتح سے پہلے نصر اللہ کا ذِکر ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ فتح جو آئے گی تو اللہ کی مدد کے ساتھ ہی آئے گی، اور ہمیں یہی عقیدہ تلقین کیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی نعمت حاصل ہوتی ہے براہِ راست اللہ کی نصرت اور اس کی توفیق سے ہی حاصل ہوتی ہے، "جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح آجائے" وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا: اور آپ دیکھیں لوگوں کو کہ داخل ہوتے ہیں اللہ کے دِین میں فوج در فوج، پھر تسبیح بیان کیجئے آپ اپنے رَبّ کی اُس کی حمد کے ساتھ، یعنی تسبیح بیان کیجئے اور تحمید کیجئے، وَاسۡتَغۡفِرۡهُ: اور اس سے اِستغفار کیجئے، اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا: بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر

سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ نے ایسی فتح دی جس کے بعد کُفر نے گھٹنے ٹیک دیے

اس میں پیش گوئی کردی گئی نصرت اور فتح کے حاصل ہونے کی، اور یہ نصرت اور فتح ایسی ہے کہ جس کے بعد لوگ دھڑا دھڑ دین میں داخل ہونا شروع ہوجائیں گے، تو یہ فتح کون سی فتح ہے؟ جس وقت سرورِ کائنات ﷺ کی سیرت کے واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو فتح تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے میدانوں میں دی، لیکن ایسی فتح کہ جس کے بعد کُفر بالکل گھٹنے ٹیک دے اور اس کو مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہو بلکہ بالکل مٹ جائے یہ فتح فتحِ مکہ ہے، اس لئے قرآنِ کریم میں جہاں جہاں بھی فتح کا ذکر آیا ہے وہاں ذہن فتحِ مکہ کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے وَاُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ (سورۂ صف) اِس فتحِ قریب سے بھی

فتحِ مکہ مراد ہے، اور لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ (سورۂ حدید) تم میں سے وہ لوگ برابر نہیں جنہوں نے فتح سے پہلے لڑائی لڑی اور اللہ کے راستے میں خرچ کیا، تو معلوم ہوگیا کہ یہ فتح ایسی ہے کہ جس نے معیار بدل دیا، کہ پہلے لڑنے والے اور خرچ کرنے والے وہ اُونچے درجے کے ہیں، اور اِس فتح کے بعد لڑنے والے اور خرچ کرنے والے اُس درجے کے نہیں، تو یہ معیار صرف فتحِ مکہ پہ صادق آتا ہے۔ اور حال یہ تھا کہ قریش کے ساتھ تو سرورِ کائنات ﷺ کی مزاحمت چل رہی تھی، اور باقی قبائل جتنے تھے وہ اس وقت کے منتظر تھے کہ دیکھیں دونوں فریقوں میں سے غلبہ کس کو حاصل ہوتا ہے۔ اُصحابِ فیل کا واقعہ جو پیش آیا تھا اور عرب اُس کو سنے بیٹھے تھے، اس کے بعد ان کے دِل میں اتنی عظمت آگئی تھی قریش کی، کہ وہ سمجھتے تھے کہ کوئی باطل اس کے اُوپر غالب نہیں آسکتا، کوئی غلط آدمی ان کے اُوپر تسلط حاصل نہیں کرسکتا، اس لئے وہ کہتے تھے کہ اِس کو اور اس کو قوم کو چھوڑ دو، یعنی حضور ﷺ کو ان کی قوم کے ساتھ چھوڑ دو، جو غالب آئے گا پھر دیکھی جائے گی، وہ منتظر تھے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے، تو جس وقت مکہ فتح ہوگیا اور قریش مغلوب ہوگئے، بلکہ قریش بھی تقریباً سارے کے سارے ہی مسلمان ہوگئے، اور مکہ معظمہ دارُ الاسلام بن گیا، اور اس کے اُوپر تسلط پوری طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کو حاصل ہوگیا، اب اس دِین کے قبول کرنے میں جو رُکاوٹ تھی، ختم ہوگئی۔ قریش کا تشدد، قریش کی طرف سے غلط پروپیگنڈا، یہ چیزیں رُکاوٹیں بنی ہوئی تھیں، اور ایسے ہی اِس بیت اللہ کے تعلق کی بنا پر لوگوں کے ذہن کے اندر قریش کی عظمت وہ بھی ایک قسم کی رُکاوٹ تھی۔ اس تسلط کے حاصل ہوجانے کے بعد پھر قبائل فوج در فوج آئے ہیں اور آکر انہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ چنانچہ فتحِ مکہ کے بعد اگلا سال جو آیا، ۸ ہجری رمضان میں مکہ فتح ہوا، اور ۹ سن جو ہے سرورِ کائنات ﷺ کی سیرت میں یعنی نو ہجری وہ ''سنِ وفود'' کہلاتا ہے کہ اس میں بہت کثرت کے ساتھ وفود آئے اور آکر اپنے قبیلے کی طرف سے اسلام قبول کرکے چلے گئے۔

تسبیح، تحمید اور اِستغفار کا حکم

تو جس وقت آپ یہ دیکھیں تو اس وقت پھر آپ اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوجائیں۔ اِس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ کو جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، اب آپ کے سبکدوش ہونے کا وقت آگیا، آپ نے بہت محنت کی، بہت مشقت اُٹھائی، اب اللہ کو یاد کیجئے، تسبیح تحمید کیجئے، سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ کا شکر اَدا کیجئے، اور اللہ سے استغفار کیجئے، استغفار کا مطلب یہ ہے کہ یوں سمجھئے کہ آپ کے ذِمّے جو کام لگایا گیا تھا آپ نے اپنی ہمت اور کوشش میں کوئی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی، لیکن پھر بھی انسان انسان ہی ہوتا ہے، اپنی اپنی شان کے مطابق جو کچھ بھی کمی کوتاہی رہ گئی ہو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں، چنانچہ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں بھی حضور ﷺ کو گناہوں سے اِستغفار کے لئے کہا گیا ہے، تو وہاں ''گناہوں'' سے ایسی ہی باتیں مراد ہیں جو آپ ﷺ کی شان کے مطابق اور آپ کے مرتبے کے لائق کچھ خلافِ اَولیٰ کام ہوجاتے ہیں، آپ ﷺ نے نیک نیتی کے ساتھ اچھا سمجھ کر ایک کام کیا، لیکن بعد میں اللہ کے بتلانے سے معلوم ہوا کہ اس میں کچھ مصلحت کے خلاف بات ہوگئی، اِس قسم کی چیزوں سے اِستغفار کیجئے۔

ہر کامیابی اللہ کی عنایت ہے

اور ساتھ یہ بات بھی نمایاں کردی گئی کہ یہ کامیابی جتنی ہے سب اللہ کی نصرت سے ہے، اللہ کی مدد سے ہے، اور مسلمانوں کو یہ ذہن دے دیا گیا کہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے تم کتنی ہی بڑی کامیابی حاصل کرلو، اس کو کبھی بھی اپنی ہمت اور کوشش کا نتیجہ نہ قرار دو، بلکہ یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے دینے کے ساتھ یہ حاصل ہوئی ہے، اللہ کی عنایت ہے، اس لئے اس کے شکر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

مذکورہ اُحکام پر حضور ﷺ کا عمل

چنانچہ اِس سورت کے اُتر آنے کے بعد سرورِ کائنات ﷺ بہت کثرت کے ساتھ اِستغفار کیا کرتے تھے، بہت عبادت کرتے تھے، "سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ"[1] اس سورت میں جس طرح سے اشارہ کیا گیا یہ الفاظ کثرت سے حضور ﷺ کی زبان پر آتے تھے، بلکہ آپ کی سجدے کی تسبیح بھی یہی ہوگئی تھی "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ"[2] تو سجدے میں بھی اسی طرح سے پڑھا کرتے تھے۔

حضور ﷺ کے سفرِ آخرت کی طرف اِشارہ

اِس سورت میں اشارہ ہے سرورِ کائنات ﷺ کے سفرِ آخرت کی طرف، جیسے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے[3] کہ اِس سورت میں حضور ﷺ کو خبر دے دی گئی کہ اب آپ کے دُنیا سے جانے کا وقت قریب آگیا، اس لئے آپ اب آخرت کی تیاری کی طرف زیادہ متوجہ ہوجائیے، اللہ کی تسبیح اور اللہ کی تحمید کیجئے، اور اِستغفار کثرت سے کیجئے، جو کام آپ کے ذِمّے لگایا گیا ہے گویا کہ جب لوگ فوج درفوج دین میں داخل ہونے لگ جائیں گے تو سمجھ لینا کہ اب وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ تو حضور ﷺ کی زندگی میں عرب میں اسلام غالب آگیا تھا، سب قبائل نے اسلام قبول کرلیا تھا، کچھ یہود باقی رہ گئے تھے جن کا اِخراج حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا، تو اِس میں فتح جو ذِکر کی گئی ہے اس فتح سے فتحِ مکہ مراد ہے، تو اعلانِ براءت کے بعد گویا کہ مکمل کامیابی کی طرف اشارہ اِس سورت میں آگیا۔

---

(۱) مسلم ۱/ ۱۹۲ باب ما يقال فی الركوع والسجود

(۲) بخاری ۱/ ۱۱۳ باب التسبيح والدعاء فی السجود ۲/ ۷۴۲ تفسير سورة النصر/ مسلم حوالہ مذکورہ/ مشکوٰۃ ۱/ ۸۲ باب الركوع. كان النبی ﷺ يكثر أن يقول فی ركوعه وسجوده سبحانك... الخ.

(۳) بخاری ۲/ ۷۴۳، كتاب التفسير، سورة النصر/ ترمذی ۲/ ۱۷۴، كتاب التفسير، سورة النصر

ایاتھا ۵ ۱۱۱ سُوْرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ ٦ رکوعھا ۱

سورۂ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی برباد ہوگیا! ○ کوئی فائدہ نہ دیا اُس کو اس کے مال نے اور اس چیز نے جو

كَسَبَ ② سَيَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُهٗ ۚ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④

اس نے کمائی ○ عنقریب داخل ہوگا وہ شعلے والی آگ میں ○ اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں اُٹھانے والی ہے ○

فِیْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤

اس کے گلے میں رسّی ہے مونجھ کی! ○

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

سورۂ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ: ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے، وَّتَبَّ: اور وہ خود بھی برباد ہوا، مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ: کوئی فائدہ نہ دیا اُسے اس کے مال نے اور اس چیز نے جو اس نے کمائی۔ اَغْنٰی عَنْهُ کا ترجمہ کئی دفعہ آپ کے سامنے ذکر کیا جاچکا، دُور ہٹانا، کام آنا، فائدہ پہنچانا، اس کا یہ مفہوم ہوتا ہے۔ ''کچھ فائدہ نہ پہنچایا اُس کو اس کے مال نے اور اس چیز نے جو اس نے کمائی''، مَا كَسَبَ یہ اُس کی کمائی ہوگئی۔ سَيَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ: عنقریب داخل ہوگا وہ شعلے والی آگ میں۔نار: آگ۔ ذَاتَ لَهَبٍ: شعلے والی آگ، لپٹ والی آگ، جس کی لاٹیں نکل رہی ہوں گی۔ وَّامْرَاَتُهٗ: اس کا عطف سَيَصْلٰی کی ضمیر پر ہے، ضمیر مرفوع متصل پر عطف بغیر تاکید لائے جائز ہے جس وقت درمیان میں فاصلہ آجائے، اور یہاں فاصلہ درمیان میں آیا ہوا ہے، تو سَيَصْلٰی ھُوَ وامراتُہٗ یہ مفہوم ہوگیا اس کا: ''وہ ابولہب بھی داخل ہوگا اور اس کی بیوی بھی'' اِمْرَاَتُهٗ: اُس کی بیوی، جس کی کنیت اُمِّ جمیل تھی۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ: حطب کہتے ہیں ایندھن کو، حَمَّالَۃ کا معنی اُٹھانے والی، حطب: لکڑی، ایندھن جو آگ میں ڈالا جاتا ہے آگ کو بھڑکانے کے لئے، لفظی معنی ہے ایندھن کو اُٹھانے والی۔ ترکیب میں حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کیا واقع ہو رہا ہے؟ اس کو عام طور پر مفسرین نے علیٰ سبیلِ ذم منصوب قرار دیا ہے، یعنی اَذُمُّ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ یہ منصوب ہے اس کی برائی کی طرف اشارہ کرنے

کے لئے، تو اصل تو یہ ہوا کہ اُس بیوی کا تعارف کرایا جارہا ہے کہ وہ ایندھن اُٹھانے والی ہے، لکڑیاں اُٹھانے والی ہے، تو مطلب یہ ہوگیا کہ میں بُرائی بیان کرتا ہوں اُس حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کی۔ اور مفہوم ظاہر کرنے کے لئے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں ''اور اس کی بیوی یعنی حَمَّالَةَ الْحَطَبِ۔'' اور حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے عنوان کے ساتھ اس کو ذکر کیا جارہا ہے تو اُس کی مذمت کی وجہ سے، اس کے فسق اور کمینگی کو نمایاں کرنے کے لئے، تو حطب سے یہ لکڑیاں مراد ہوجائیں ''ایندھن اُٹھانے والی، ایندھن کا گٹھا اُٹھانے والی۔'' اور اسی طرح سے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا لفظ عرب کے اندر چغلی کرنے والے کے لئے بھی بولا جاتا ہے، جو اِدھر کی اُدھر لگا اور اُدھر کی اِدھر لگا، جس کو فارسی میں ہیزم کش کہتے ہیں جو آگ میں ایندھن ڈال کر آگ بھڑکا دیتا ہے، تو یہ لفظ چغل خور کے معنی میں بھی ہوتا ہے، تو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا معنی چغلی کھانے والی، چغل خور، یہ بھی ہوسکتا ہے۔ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ: جید گردن کو کہتے ہیں، اس کی گردن میں رَسّی ہے، مِّنْ مَّسَدٍ: مسد اس ریشے کو کہتے ہیں جس سے رَسّی بنائی جاتی ہے، چاہے وہ کھجور کا ہو، چاہے ناریل کا ہو، چاہے یہ مُونج ہو، کوئی ریشہ جس کے ساتھ رَسّی بنائی جاتی ہے، اور یہاں عام طور پر کھجور کی رَسّی مراد لی گئی ہے، تو مسد اس ریشے کو بھی کہتے ہیں، اور بٹی ہوئی رَسّی کو بھی کہتے ہیں جو مضبوط قسم کی موٹی ہو، تو اگر اس سے رَسّی مراد لی جائے تو پھر یہ مِن بیانیہ ہے: ''اُس کی گردن میں حبل ہے یعنی مضبوط رَسّی''، حبل بھی رَسّی کو کہتے ہیں، مِن بیانیہ کے ساتھ اس کی وضاحت کردی گئی مسد کے ساتھ، کہ عام رَسّی نہیں بلکہ کھجور کی موٹی اور شدید قسم کی رَسّی اس کے گلے میں ہے، مِّنْ مَّسَدٍ اس کا بیان ہوجائے گا۔ یا ''رَسّی جو مسد سے بنائی گئی ہے'' کھجور کے ریشے سے یا ناریل کے ریشے سے بنائی ہوئی رَسّی اس کے گلے میں ہے۔ تو اس رَسّی سے مراد آخرت میں اُس کے گلے میں جو جہنم کا طوق ہوگا وہ مراد ہے، اور رَسّی کے ساتھ اس کو ذکر اس لئے کیا کہ پیچھے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا ذکر آیا ہے، اور حَمَّالَةَ الْحَطَبِ لکڑیاں اُٹھانے والے کی مناسبت کے ساتھ یہ رَسّے کا ذکر آگیا، کیونکہ عموماً گٹھے اُٹھانے والے، لکڑیاں اُٹھانے والے رَسّے میں ہی باندھ کے لاتے ہیں، اِس مناسبت سے رَسّی کا عنوان آگیا، ورنہ مراد اس سے آخرت میں جہنم میں اس کے گلے کے اندر جو زنجیر ڈالی جائے گی تو اِس حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے وہی زنجیر مراد ہے۔

تفسیر

سورۂ لہب کی وجۂ تسمیہ اور ''ابولہب'' کا مختصر تعارف

یہ سورۂ لہب، اِس کا نام تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ میں ''لہب'' کا لفظ آگیا، اور سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ یہ بھی ''لہب'' کا لفظ آیا، تو یہاں سے اِس کا نام ماخوذ ہے کہ اِس کا نام سورۂ لہب رکھ دیا گیا۔ ''ابولہب'' اس کا اصل نام ہے عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب، عبدالمطلب کا لڑکا عبدالعزیٰ، اور اس کی کنیت ہے ''ابولہب''، تو جب یہ عبدالمطلب کا لڑکا ہوا، سرورِ کائنات ﷺ کے والد عبداللہ یہ بھی ابن عبدالمطلب ہیں، تو بات صاف ہوگئی کہ یہ حضور ﷺ کا چچا ہے، اور سارے قرآنِ کریم میں صرف یہ ایک شخص ہے بدبختی کا مارا ہوا کہ جس کا نام لے کر اس کو جہنمی قرار دیا گیا اور اس کی بربادی کا ذکر آیا، ورنہ سرورِ کائنات ﷺ کے مخالفین جتنے تھے کسی کا

قرآنِ کریم میں نام نہیں لیا گیا، نام صرف اِسی کا لیا گیا، تو اِس سے خود بخود یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ اِس کا نام لے کے اس کی مذمت کی گئی اور اِس کو جہنمی قرار دیا گیا حالانکہ مخالفین تو دُوسرے بھی تھے، اُن کا نام نہیں لیا گیا، اور پھر صرف اِس کا ہی نہیں اس کی بیوی کا بھی ساتھ تذکرہ کیا گیا، اِس کی خصوصیت کی کیا وجہ ہے؟

عرب کے اندر عصبیت بہت نمایاں تھی

تو اِس کی خصوصیت سمجھنے کے لئے بات اس طرح سے ہے کہ یہ تھا حضور ﷺ کا حقیقی چچا، اور عرب کے اندر اُس وقت نظام تھا قبائلی، قبائلی نظام کے اندر عصبیت ہوتی ہے بہت زیادہ، ہر شخص اپنے رشتے دار کی رعایت رکھتا ہے، اور اُس کے جان، مال، عزّت کا تحفظ کیا کرتا ہے، چاہے اس کا رشتہ دار خود قصوروار ہی کیوں نہ ہو، عرب کی تاریخ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ تاریخ میں ایک واقعہ یہ بھی آتا ہے کہ جب مسیلمہ کذّاب نے نبوّت کا دعویٰ کیا، سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت کے مقابلے میں اس نے اپنی نبوّت چالو کردی، تو بعضے لوگ جو بنوحنیفہ سے تعلق رکھنے والے تھے وہ بھی مسیلمہ کے ساتھ ہوگئے، تو کسی نے کسی سے پوچھا کہ تم مسیلمہ کے ساتھ کیوں ہوگئے ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ ہمیں اتنا تو پتا ہے کہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور محمد ﷺ سچا ہے، لیکن ہمیں بنوحنیفہ کا جھوٹا قریش کے سچے کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہے۔[1] یہ وہی عصبیت ہے، عرب کے اندر یہ عصبیت بہت نمایاں تھی جس کے نتیجے میں لوگ صلہ رحمی بہت کرتے تھے کہ اپنے رشتہ دار کے ساتھ وہ دشمنی نہیں کرتے تھے، چاہے وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو، قصور اسی کا کیوں نہ ہو، لیکن جب بھی کسی کے ساتھ مقابلہ ٹھن جاتا تو وہ رعایت اسی کی کرتے جو ان کے اپنے قبیلے کا فرد ہوتا۔

”بنوہاشم“ اور ”بنومطلب“ کی طرف سے بھرپور حمایت

یہی وجہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے جس وقت اعلانِ نبوّت کیا تو بنوہاشم اور بنومطلب یہ دونوں خاندان اوّل سے حضور ﷺ کے ساتھ رہے ہیں، چاہے اِن میں سے بعض افراد نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن حضور ﷺ کے ساتھ دشمنی بھی نہیں کی، آپ کے سامنے ہے کہ ابوطالب باوجود اس بات کے کہ وہ ایمان نہیں لایا لیکن آخر وقت تک رسول اللہ ﷺ کا حامی رہا اور ہر میدان میں اس نے حضور ﷺ کا ہی ساتھ دیا، حتّٰی کہ جب مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ کا بائیکاٹ کیا تھا تو یہ پورے بنوہاشم اور اسی طرح سے بنومطلب یہ حضور ﷺ کے ساتھ اس بائیکاٹ میں شریک تھے، باوجود اس بات کے کہ وہ ایمان نہیں لائے، بعض افراد ان میں سے ایمان لائے تھے، اکثر نہیں لائے تھے، لیکن انہوں نے اس مشکل وقت میں ساتھ حضور ﷺ کا دیا اور آپ کو چھوڑا نہیں، یہ اُس زمانے کے لحاظ سے صلۂ رحمی کا ایک تقاضا تھا، قبائلی عصبیت کا یہ تقاضا تھا کہ اپنے گھر کا جو فرد ہوتا اس کے جان مال کا لوگ تحفظ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے بارہا مشورہ کیا حضور ﷺ کو قتل کرنے کا، لیکن ان کو جرأت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ سارے بنوہاشم اور بنومطلب مقابلے میں آجائیں گے، یہی تو وجہ ہے کہ آخر انہوں نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ ہر خاندان

---

(۱) طلحہ نمری بدبخت نے مسیلمہ سے کہا: اشهد انك كذّاب وان محمدا صادق ولكن كذاب ربيعة احب الينا من صادق مضر (البداية والنهاية ۶/۳۴۰)۔
اور شرح المھذب للنووی ۴۲/۱۴ پر ہے: لأنهم كانوا يقولون: كذّاب ربيعة خير من صادق مضر

ایک ایک آدمی شامل کرے، اور ایک ایک آدمی شامل کر کے حضور ﷺ کو یک دَم حملہ کر کے ختم کر دیا جائے، پھر بنو ہاشم اور بنو مطلب سب سے تو اِنتقام لے نہیں سکیں گے، آخر دیت لینے پر راضی ہوجائیں گے اور ہم دیت دے دیں گے، یہ حالات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب چاہے وہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن حضور ﷺ کے جانی دشمن نہیں تھے، آپ کی جان اور مال کا تحفظ کرتے تھے، اس لئے دشمنوں کو عام طور پر آپ پر دست درازی کا موقع نہیں ملتا تھا۔

''بنو ہاشم'' میں سے ایک ہی بڑا بد بخت نکلا

لیکن ایک بد بخت ہی ایسا نکلا بنو ہاشم میں سے کہ حضور ﷺ کا چچا ہونے کے باوجود حضور ﷺ کا سب سے زیادہ مخالف تھا، حالانکہ اُس وقت کا رِواج یہ تھا کہ چچا باپ کی جگہ ہی ہوتا ہے، خصوصیت سے جب کسی بچے کا باپ فوت ہوجائے تو چچا باپ کی طرح ہی اس کی کفالت کرتا ہے، جس طرح سے کہ ابوطالب نے کی تھی۔ تو اِس کا حق تو یہ تھا کہ حضور ﷺ کی سرپرستی کرتا، آپ کے ساتھ معاونت کرتا، لیکن اِس نے عداوت ایسے انداز میں کی کہ صرف عقیدے کے اختلاف کی بات نہیں، اس کو عداوت اس طرح سے ہوگئی جس طرح سے کوئی ذاتی مسئلہ ہو۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور صفا پہاڑ پر کھڑے ہوکر آواز لگائی تھی قریش کو اِکٹھا کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حکم آیا تھا اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ تو آپ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر آواز لگائی تھی، تو سارے کے سارے لوگ اکٹھے ہوگئے آپ کی بات سننے کے لئے جیسا کہ اس زمانے میں رِواج تھا، جب سارے اکٹھے ہوگئے تو آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا، حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے، کہ مجھے یہ بتلاؤ، اگر میں تمہیں یہ خبر دُوں کہ اِس پہاڑ کے دامن میں کوئی شاہسواروں کا لشکر ہے، گھات لگائے چھپا بیٹھا ہے، اور وہ تم پر حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم میری بات مان جاؤ گے؟ مجھے سچا سمجھو گے؟ یہ سوال کیا تھا اُن تمام بطون اور قبائل سے جتنے وہ سارے جمع ہوگئے تھے جن کے افراد آئے ہوئے تھے کہ اگر میں تمہیں یہ کہہ دُوں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر بیٹھا ہوا ہے اور وہ تمہارے اُوپر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو تم میری تصدیق کرو گے؟ تو سب نے بیک آواز کہا تھا کہ ہاں! ہم تصدیق کریں گے، کیونکہ ''مَا جَرَّبۡنَا عَلَیۡكَ اِلَّا صِدۡقًا'' کہ ہم نے بارہا آپ کا تجربہ کیا اور ہم نے ہمیشہ آپ کو سچا ہی پایا، تو اُن مشرکین نے جو اس وقت وہاں موجود تھے سب نے حضور ﷺ کے لئے سچائی کی ضمانت دی کہ آپ ﷺ سچ بولتے ہیں ہم آپ کی بات مان جائیں گے۔[1] مطلب اُن کا یہ تھا کہ اگرچہ ہمیں نظر نہیں آرہا تو ہم یہ سمجھیں گے کہ ہماری آنکھیں ہمیں دھوکا دے رہی ہیں، لیکن آپ کی زبان سے غلط بات نہیں نکل سکتی، اتنا اعتماد کا اظہار کیا سب نے جب حضور ﷺ نے یہ بات ان سے پوچھی۔ تو جب یہ تصدیق کروائی تو پھر حضور ﷺ نے اصل بات کہی کہ تم اپنے اس طریق سے باز آجاؤ، یہ طریق تمہارا کُفر کا ہے، شرک کا ہے، اگر تم اس سے باز نہیں آؤ گے تو میں تمہیں ایک اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں جو عذاب تمہاری گھات میں لگا ہوا ہے اور تم اس عذاب کی گرفت میں آجاؤ گے (جس طرح سے سمجھانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے) تو جب یہ بات سنی تو سارے بدک گئے، لیکن اس واقعے میں کسی شخص کی طرف سے حضور ﷺ کے مقابلے میں کسی بات کا ذِکر نہیں

(۱) بخاری ۲/۷۰۲، کتاب التفسیر سورۃ الشعراء/مشکوٰۃ ۲/۴۶۰ باب الانذار کی دُوسری حدیث۔

آتا، کہ کسی نے بُرا کہا ہو اور اس طرح آگے سے کوئی گستاخی کی ہو، سوائے اِس ابولہب کے کہ یہ ابولہب کھڑا ہوا، اس نے حضور ﷺ کو خطاب کر کے کہا: ''تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا'' (حوالہ مذکورہ) ہمیشہ کے لئے تیرا ستیاناس ہو جائے، تُو نے ہمیں اس لئے جمع کیا تھا؟ سارا دن تیرے لئے ہلاکت ہو، خرابی ہو، کیا تُو نے ہمیں اس لئے جمع کیا تھا؟ اور پتھر اُٹھایا پھینکنے کے لئے (نسفی)، اور پھر وہ اس طرح سے حضور ﷺ کا ذاتی دشمن بن گیا کہ جدھر آپ جاتے پیچھے پیچھے یہ ہوتا، اور عرب کے دستور کے مطابق چچے کی مخالفت لوگوں کے لئے بھی ایک بہت اہمیت رکھتی تھی کہ یہ تو ایک عجیب بات ہے کہ چچا بھتیجے کے مخالف ہو، لوگوں کے لئے شک اور تردّد پیدا کرنے والی بات ہوتی، تو جدھر بھی حضور ﷺ تبلیغ کے لئے جاتے پیچھے پیچھے یہ چلا جاتا، بارہا ایسا موقع آیا کہ اس نے پتھر مار مار کر حضور ﷺ کو زخمی کر دیا۔[1]

''ابولہب'' کی شدید دُشمنی کا اصل راز

اور یہ ذاتی عداوت اس نے جو ٹھان لی تھی تو اُس میں اِس بات کا دخل بھی تھا کہ بیت اللہ میں جو رِفادۃ کا شعبہ تھا یعنی بیت اللہ کی طرف آنے والے عطیے اور نذرانے، ان کا انتظام کرنا، ان کو سنبھالنا، یہ شعبہ اِس ابولہب کے سپرد تھا، بیت اللہ کے نام آنے والے چڑھاوے، نذرانے یہ وصول کیا کرتا تھا، اور یہ وصول کرنے کے بعد پھر جس طرح سے غلط کار مجاور کیا کرتے ہیں، تو اِس نے اُس کو بھی اپنی عیاشی کا ذریعہ بنالیا، مساکین، یتامیٰ کے اُوپر خرچ نہیں کرتا تھا، وہ آتے تو اس لیے تھے تاکہ یہاں سے مسکینوں کی خدمت کی جائے، یتیموں کی خدمت کی جائے، حاجیوں کی خدمت کی جائے، لیکن یہ شخص خود اُس سے ذاتی فائدہ اُٹھاتا، جیسے غبن کیا جاتا ہے، ناجائز تصرف کیا جاتا ہے تو وہ مساکین اور یتامیٰ پہ خرچ نہیں کرتا تھا، جیسے اشارہ اَرَءَيْتَ الَّذِي کے اندر آپ کے سامنے آیا تھا، اور ایسے شخص کو ہمیشہ خطرہ ہو جایا کرتا ہے کہ یہ آواز اگر اُثر دِکھا گئی اور لوگ اِس کے پیچھے لگ گئے تو میرا سارے کا سارا کاروبار خراب ہو جائے گا، تو اِس قسم کے حرام کھانے کی جن کو عادت ہو جایا کرتی ہے پھر وہ کبھی دُوسری آواز کو برداشت نہیں کرتے جس سے اُن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حق کے مخالف اکثر و بیشتر اسی قسم کے حرام خور ہوا کرتے ہیں جن کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اِس حق والے کی بات کسی نے سُن لی اور اِس کے پیچھے لوگ لگ گئے تو ہمارا یہ کاروبار خراب ہو جائے گا۔ چنانچہ آج کل بھی جتنے یہ ''قبوری'' ہیں، قبروں کی آمدنیوں پر گزارہ کرنے والے، تم ہزار معقول طریقے سے اِن کو سمجھالو، لیکن یہ نہیں سمجھیں گے، یہ ان کا ایک ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے۔ جیسے ہمارے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ ہر جگہ کی چوٹ انسان برداشت کر لیتا ہے، کسی کے پاؤں پہ مارو، گھٹنے پہ مارو، کمر پہ مارو، چوٹ برداشت ہو جاتی ہے، لیکن پیٹ کی چوٹ برداشت کرنی بہت زیادہ مشکل ہے، اِس کا برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا، اور جب کسی حق کے قبول کرنے کے نتیجے میں کسی کے پیٹ پہ لات لگتی ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ اِس کے نتیجے میں میری آمدنی خراب ہو جائے گی، جو مجھے کھانے کے لئے مل رہا ہے اِس میں نقص پڑ جائے گا، تو پھر وہ مشتعل ہو جاتا ہے، پھر بلا سوچے سمجھے مخالفت پہ تل جاتا ہے۔ تو ابولہب بھی کچھ اسی طرح سے مالی محبت میں مبتلا ہو کر اور اس آمدنی

---

(۱) اسی قسم کے ایک واقعے کے لئے دیکھیں: مصنف ابن ابی شیبہ ۸/۳۴۲، باب فی اذی قریش للنبی ﷺ وما لقی منهم.

کو ناجائز طور پر اپنے تصرف میں رکھتا ہوا چونکہ عیش وعشرت کا عادی تھا، تو اس نے حضور ﷺ کے اِس دِین کو اور آپ کی اِس آواز کو اپنے اس کاروبار کے بھی خلاف سمجھا۔

حضور ﷺ کی عدوات میں ابولہب کی طرح اس کی بیوی بھی پیش پیش تھی

اسی لئے اُس کے ساتھ اس کی بیوی بھی برابر کی شریک تھی، کیونکہ بیگمات بھی جب اس طرح سے عیش وعشرت میں مبتلا ہوجائیں تو وہ بھی تو آمدنی کے فرق کو برداشت نہیں کرسکتیں، اس کی بیوی اُمِ جمیل یہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بہن ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پھوپھی، اُمِ جمیل بنتِ حرب، اور یہ بھی معزز خاندان کی تھی، بڑے خاندان کی، بنواُمیہ کی لڑکی، اور ابولہب ادھر معزز تھا، دونوں کا جوڑ آپس میں لگا ہوا تھا، یوں سمجھو کہ اُس زمانے کے لحاظ سے ابولہب کی بیوی یہ آج کل کے محاردے کے مطابق مکہ کی ''خاتونِ اوّل'' تھی۔ جیسے بھٹو کے زمانے میں نصرت بھٹو کو ''خاتونِ اوّل'' قرار دیا تھا، جو بڑے کی بیوی ہوتی ہے اس کو سمجھتے ہیں کہ سارے مُلک میں اوّل درجے کی عورت یہی ہے تو یہ ''خاتونِ اوّل'' تھی۔ اسی طرح سے یہاں بھی مکہ معظمہ میں چونکہ بہت بڑی حیثیت تھی ابولہب کی، تو اس کی بیوی بڑے اُونچے خاندان کی تھی، تو اس کو بھی ویسے ہی عزّت حاصل تھی، لیکن عداوت میں جس طرح سے ابولہب تیز تھا، اسی طرح سے یہ اُمِ جمیل بھی عداوت میں تیز تھی، عام طور پر روایات میں ذِکر کیا گیا ہے کہ باوجود عالی خاندان کے ہونے کے اور اعلیٰ شرف کی عورت ہونے کے پھر بھی وہ خود کانٹے اکٹھے کر کے لاتی اور حضور ﷺ کے راستے میں بکھیرتی تھی، اور آپ ﷺ کو اس طرح سے پریشان کرتی تھی (عام تفاسیر)، تو اس کی مذمت بھی ساتھ کردی گئی۔

''ابولہب'' کا نام لے کر وعید ذِکر کرنے کا مقصد

اور اِس میں نام لے کر مذمت کرنے میں یہ پہلو بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں ظاہر کردیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر اگر ہے تو اِیمان اور تقویٰ کی ہے، ایمان اور تقویٰ اگر پاس نہ ہو تو کتنا بڑا کوئی شخص ہو، وہ اپنی مالی حیثیت میں، جاہ کے اندر، یا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیسی رشتہ داری رکھنے والا کیوں نہ ہو؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس شخص کی کوئی قدر و قیمت نہیں! اِسی معنیٰ کو سمجھانے کے لئے حضرت نُوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذِکر قرآن میں آیا، نُوح علیہ السلام اور لُوط علیہ السلام کی بیویوں کا ذِکر آیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا ذِکر آیا، اور یہاں حضور ﷺ کے چچا کا ذِکر آگیا، کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ مال دار ہو کر کوئی اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، کوئی بڑے درجے کا ہو کر اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، جاہ والا ہو کر، یا کسی اچھے آدمی کے ساتھ رشتے داری کی بنا پر اس کی کوئی قدر و قیمت ہوسکتی ہے، یہ سب باتیں غلط ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر قدر ہے تو اِیمان اور تقویٰ کی ہے، ورنہ عالی سے عالی نبی کا......! اب حضور ﷺ سے بڑھ کر تو سارے سلسلۂ نبوّت میں کوئی نہیں، تو آپ کا قریبی سے قریبی رشتہ دار چچا، اگر اس نے آپ کے دِین کو قبول نہیں کیا تو جتنی مذمت گویا کہ صراحت کے ساتھ قرآنِ کریم میں اِس کی کی گئی ہے، اتنی مذمت کسی کی بھی نہیں کی گئی، نام لے کر مذمت کی گئی، اور اس کو جہنمی قرار دیا گیا، اور دِکھایا گیا کہ دیکھو! اس کا مال اور اس کی کمائی کوئی کام نہ آئی، یہ بھی جائے گا اور اس کی بیگم صاحبہ جو اُس وقت کی ''خاتونِ اوّل'' تھی وہ بھی ساتھ ہی جائے گی، اور اس کی حیثیت نمایاں کردی کہ یہ اس کی بیوی...... ! ایندھن اُٹھانے

والی......! یہ بطورِ مذمّت کے عنوان ہے، کہ اتنی بڑی ہو کر پھر بھی اپنے بخل کی بنا پر اور خست کی بنا پر لکڑیاں خود ڈھوتی ہے، یہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا عنوان ہے۔ یا یہ ہے کہ یہ چغل خور......! جس کا کام ہی یہی ہے کہ اِدھر جاتی ہے بھڑکاتی ہے، اِدھر کی اُدھر لگاتی ہے، لگائی بجھائی کرنے والی عورت، یہ بھی مذمّت کے طور پر عنوان اختیار کیا گیا۔ اور اگر حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کو امْرَاَتُهٗ کا حال بنالیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب جہنّم میں داخل ہوگی اس وقت اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ ایندھن اُٹھانے والی ہوگی، پھر ایندھن سے مراد ہو جائے گا جہنّم کی آگ کو بھڑکانے والے اُس کے گناہ اور اس کے جرائم، جب جائے تو اس طرح سے ہوگا کہ گناہوں کا گٹھا سر پہ اُٹھایا ہوا ہوگا جو اس کے اُوپر آگ بن کے بھڑکے گا (آلوسی)۔ جیسے قرآنِ کریم میں یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (سورۂ اَنعام: ۳۱) اس قسم کے لفظ آتے ہیں، وِزر بوجھ کو کہتے ہیں، کہ وہ قیامت کے دِن اپنے بوجھ اُٹھائیں گے، تو یہی جو گناہوں کا بوجھ ہے اسی کو حطب کے ساتھ تعبیر کیا گیا کہ اپنے اُوپر آگ بھڑکانے کے لئے خود ساتھ سامان لئے جارہی ہے، تو آخرت کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے۔

''ابولہب'' اور اس کی بیوی کی عبرت ناک موت

اور آگے جو فِیْ جِیْدِهَا ہے، اس کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے یہاں ''فوائدِ عثمانی'' میں بھی ہے اور ''بیان القرآن'' میں بھی ہے، دُوسری کتابوں میں بھی ہے، کہ اِس کی موت بھی کچھ اسی طرح سے واقع ہوئی، جب یہ سورت اُتری تھی اُس وقت تو وہ زندہ تھی، لیکن اِس میں اشارہ آ گیا کہ اُس کے گلے میں رَسّی ہے کھجور کی بٹی ہوئی، کہتے ہیں لکڑیاں اُٹھائے آرہی تھی اور اتفاق سے کہیں وہ گٹھا پیچھے کو گرا، اور وہ رَسّی ڈھیلی تھی، وہ اس کے گلے میں پڑگئی، اور اُس گٹھے کا وزن جو پیچھے آیا رَسّی گلے میں پڑگئی تو اسی سے گلا گھٹ کے وہ مرگئی، تو دُنیا کے اندر بھی یہ اسی طرح سے مری، اِس کا انجام بھی یہ ہوا۔ اور ابولہب کی موت بھی اسی طرح سے قابلِ عبرت ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منوّرہ چلے گئے ہیں تو سب سے پہلا بھرپور غزوہ جو پیش آیا وہ بدر کا ہے، ابولہب بدر میں شریک نہیں ہوا، باقی قوم ساری کی ساری گئی ابولہب نہیں شریک ہوا، بلکہ اس نے اپنے بدل میں دُوسرے آدمی کو بھیج دیا کچھ پیسے دے کر، یا اُس کے ذِمّے قرض تھا، وہ قرض معاف کرنے کا وعدہ کرلیا اور یہ کہا کہ میری جگہ تم چلے جاؤ۔[1] تو بدر میں تو یہ بچ گیا، لیکن بدر کے کچھ مدّت کے بعد ہی اس کے طاعون کا پھوڑا نکلا یا چیچک نکلی دونوں قول ہیں، اصل میں ''عدسہ'' کا لفظ آیا ہے، عربی میں ''عدسہ'' اصل میں مسور کے ایک دانے کو کہتے ہیں، تو بعضوں نے اس کا ترجمہ ''چیچک'' کے ساتھ کیا ہے، بعض نے ''طاعون'' کے ساتھ کیا ہے، اور اِس بیماری کو متعدی سمجھنے کی وجہ سے کوئی اس کے پاس نہیں گیا، نہ اس کا کوئی بیٹا، نہ اس کی کوئی بیوی، اسی حالت میں وہ ذِلّت کے ساتھ مرا، تین دِن تک اس کی لاش پڑی رہی، سڑگئی (حوالہ مذکورہ) پھر حبشی غلاموں کو کرایہ پر حاصل کرکے اس کی اولاد نے اس کو اُٹھوایا، اور انہوں نے گڑھے میں دھکیل کے دُور سے کھڑے ہو کر پتھر پھینک کر اس کی لاش کو وہاں

---

(۱) مستدرک حاکم، رقم ۵۴۰۳ / ''سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم'' جلد ۲ ص ۹۱ از مولانا کاندھلوی۔ نوٹ:- ابوجہل کے بھائی عاص بن ہشام کو بھیجا تھا قرض کے بدلے۔

دبادیا(آلوسی)۔تاریخ میں اِس کی وفات کا واقعہ کا یونہی لکھا ہے، بہت ذلت کی موت مرا۔تو یہ نتیجہ ہوا اس کی اِس عزت کا، جاہ کا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ عداوت کا، یہ وجوہ ہیں جس کی وجہ سے اِس کا نام صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

''ابولہب'' کی عدوات کی اِنتہا کا ایک واقعہ

اور آپ اس واقعے کو بھی نہ بھولیے! جو سیرت کی کُتب میں لکھا ہوا ہے، کہ سرورِ کائنات ﷺ کی دو صاحبزادیاں اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا اور رُقیہ رضی اللہ عنہا، یہ اس کے دونوں بیٹوں کے نکاح میں تھیں، عتبہ اور عتیبہ یہ دو اس کے بیٹے ہیں، اُنہی کے نکاح میں تھیں، ابھی رُخصتی نہیں ہوئی تھی، جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے دِین کا اظہار کیا، توحید کا اِعلان شروع کیا، تو جب اِس اعلان کی مخالفت شروع ہوئی تو اِس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بُلا کے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ بولوں گا نہیں جس وقت تک تم اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دیتے، چنانچہ اِس کے دونوں بیٹوں نے حضور ﷺ کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دے دی، اور ان میں سے ایک نے غالباً عتیبہ نے حضور ﷺ کے منہ پہ جا کے گستاخی کی تھی، سامنے جا کے، بیٹی کو طلاق بھی دی اور سامنے جا کے گستاخی کی، تو سرورِ کائنات ﷺ نے اُس وقت بددُعا کی تھی کہ اے اللہ! اپنے کتوں میں سے ایک کُتا اِس کے اُوپر مسلط کر دے، چنانچہ سیرت میں واقعہ لکھا ہے کہ یہ ابولہب (مع عتیبہ) کسی تجارتی سفر میں شام کی طرف گیا تھا تو کسی علاقے میں جا کے جیسے سفر کے دوران میں پڑاؤ کرنا پڑتا ہے، تو وہاں پڑاؤ کیا، تو وہ اپنے اِس بچے کی حفاظت بہت شدّت سے کرتا تھا، چونکہ دِل تو اندر سے جانتا تھا کہ وہ جو بات کہتے ہیں پوری ہوجاتی ہے، ڈرتا تو تھا، اِس لئے اپنے اُس لڑکے کو ہمیشہ قافلے کے درمیان لٹاتا اور اس کی پوری حفاظت کا انتظام کیا کرتا تھا، رات کو ایک شیر آیا، سارے قافلے کو عبور کرتا ہوا جا کے اسی عتیبہ کو چیر پھاڑ کر چلا گیا، تو ایک شیر کے ذریعے سے اس کی ہلاکت ہوئی، ایک درندے کے ذریعے سے، تو جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یااللہ! اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کُتا مسلط کر دے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ درندہ اس کے اُوپر مسلط کر دیا (تفسیر آلوسی)۔ بہر حال اس مخالفت کے نتیجے میں دُنیا اور آخرت کی ذِلت ورُسوائی اِس شخص کے حصے میں آئی جو یہاں دِکھائی جارہی ہے۔

ماقبل سے ربط

اور ماقبل کی طرف دیکھتے ہوئے یوں ربط دے سکتے ہیں کہ جیسے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ میں حضور ﷺ کے لئے مکمل فتح کی پیش گوئی تھی، تو گویا کہ دُشمن کے ہلاک ہونے کی خبر بھی ساتھ ساتھ ذِکر کر دی گئی، کہ آپ فتح پا جائیں گے اور آپ کے دُشمن برباد ہو جائیں گے، اور یہی کامل فتح ہوا کرتی ہے کہ اپنی فتح کے ساتھ ساتھ دُشمنوں کی بربادی کا ذِکر بھی آ گیا۔

سورت کی آیات پر ایک نظر اور!

ترجمہ دیکھ لیجئے......ا''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے'' ہاتھوں کے ٹوٹنے سے اشارہ ہوتا ہے اُس کی کوشش کے ناکام

ہونے کی طرف، جس وقت کسی کے یار، مددگار، دوست اس سے جدا ہوجاتے ہیں تو انسان کہتا ہے کہ میرا بازو ٹوٹ گیا، ایک شخص کے ساتھ دُوسرا معاون ہو، اور وہ معاون مرجائے، جدا ہوجائے، تو اس کو بازو کے ٹوٹنے کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس میں اس بات کی پیش گوئی کردی گئی کہ جتنا جتھا اِس نے بنا رکھا ہے، جتنی جماعت اس نے بنا رکھی ہے، وہ بھی ختم ہوجائے گی اور یہ خود بھی برباد ہوجائے گا، چنانچہ بدر کے اندر اِس کے سارے بازو ٹوٹ گئے، اور بعد میں کچھ دِنوں کے بعد یہ خود بھی برباد ہوگیا، تو ''بازو ٹوٹنا'' یہ کنایہ ہے اس کے اَعوان واَنصار کے ختم ہونے سے، اور اپنی کوشش اور اپنے مقصد اور اپنی سکیم میں ناکام ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے'' وَّتَبَّ: اور وہ خود بھی برباد ہوگیا، یہ ماضی کے ساتھ تعبیر کیا جارہا ہے، اصل میں یہ پیش گوئی ہے۔ ''نہیں کام آیا اس کے'' یعنی نہیں کام آئے گا، تحقق وقوع کی وجہ سے اِس کو ماضی سے تعبیر کیا جارہا ہے، ''اِس کا مال اور جو کچھ اِس نے کمایا'' مَاكَسَبَ کے اندر تجارت سے جو نفع کمایا وہ بھی مراد ہوسکتا ہے، اولاد بھی، اور جتنی بھی انسان اپنی کوشش ہمت کے ساتھ کارروائیاں کرتا ہے مَاكَسَبَ میں سب داخل ہیں، ''نہ کام آیا اِس کے کچھ بھی اس کا مال اور نہ اس کی کمائی، عنقریب داخل ہوگا آگ میں جو شعلے والی ہے'' لھب اصل میں شعلے کو کہتے ہیں، اور ''ابولہب'' اِس کی کنیت ہے، اور اس میں بھی ''لھب'' کا لفظ آیا، تو سزا کے اندر بھی ذَاتَ لَهَبٍ کا ذِکر آ گیا، دونوں میں بڑا اچھا تناسب ہے، ''ابولہب'' اِس کو اس لئے کہتے تھے کہ کہتے ہیں یہ بہت خوبصورت تھا، اور اس کا رنگ اس طرح سے چمک دار تھا جس طرح سے چہرے سے شعلے اُٹھ رہے ہوں، ایسا چمک دار اس کا رنگ تھا، اِسی چہرے کی خوبصورتی اور حُسن کی بنا پر اس کو ''ابولہب'' کہتے تھے، لیکن یہی اس کی خوبصورتی اس کے لئے مصیبت کا باعث بنی، جیسے دُنیا کے اندر اس کا چہرہ دمکتا تھا چمکتا تھا، آخرت میں آگ بھی اِس کو ایسی شعلہ زن ملے گی۔ اور کنیت کے طور پر اس کو جو ذِکر کیا تو گویا کہ اِس نام کے ساتھ اُس آگ کی مناسبت آگئی، اور نام اس لئے نہیں لیا کہ نام میں عبدالعزیٰ یہ بالکل ہی شرکیہ کلمہ ہے جس کی بنا پر اس سے احتراز کیا گیا اور یہ کنیت ذِکر کردی گئی۔ ''عنقریب داخل ہوگا یہ شعلے والی آگ میں'' یعنی لاٹ والی آگ میں جس سے لاٹیں نکل رہی ہوں گی۔ ''اور اس کی بیوی بھی'' وَّامْرَاَتُهٗ کا عطف سَيَصْلٰى کے فاعل پر ہے، ''جو لکڑیاں اُٹھانے والی ہے'' حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے ترجمے سارے سمجھ میں آگئے؟ یا تو چغل خور مراد ہے، یا دُنیا کے اندر یہ لکڑیاں اُٹھانے والی مراد ہے، مذمت کے طور پر اِس کو ذِکر کیا جارہا ہے، یا یہ ہے کہ جب وہ جہنم میں داخل ہورہی ہوگی تو اس نے لکڑیوں کا گٹھا اُٹھا رکھا ہوگا، جس سے اشارہ اس کے گناہوں کی طرف ہے، کیونکہ جیسے دُنیا میں لکڑی آگ کو بھڑکانے کا ذریعہ ہوتی ہے، آخرت میں گناہ اِسی طرح سے ہیں کہ یہ آگ کے بھڑکانے کا ذریعہ بنیں گے، گناہوں کا بوجھ جو اُٹھایا ہوا ہوگا تو اس کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے ساتھ ذِکر کیا۔ ''اور اس کے گلے میں رَسّی ہے''، حضرتِ شیخ (الہند ﷫) نے ترجمہ کیا ہے ''مونجھ کی''، میں نے جیسے عرض کیا کہ ''مسد'' ایسے ریشے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ رَسّی بنائی جایا کرتی ہے، عام طور پر اس کا معنی کیا گیا ہے کھجور کی بنی ہوئی، کھجور کی چھال وغیرہ سے جو مضبوط رَسّی بناتے ہیں تو ''مسد'' سے وہی مراد ہے، ''مسد'' اس ریشے کو بھی کہتے ہیں اور اس ریشے سے بنائی ہوئی رَسّی کو بھی کہتے ہیں، اگر رَسّی مراد ہو تو مِن بیانیہ ہے، اور اگر وہ ریشہ مراد ہو تو ترجمہ ہوگا ''مسد کی بنی ہوئی رَسّی''، یا ''اس کے گلے میں ایسی رَسّی ہے جس کو مسد کہتے ہیں''

یعنی مونی کھجور کی بنی ہوئی رسی اس کے گلے میں ہے۔ یا تو یہ دنیا میں بھی اُس کی ذلت کی طرف اشارہ ہے کہ ایندھن اُٹھانے والے جس طرح رسے گلے میں ڈال لیتے ہیں تو یہ بھی گلے میں رسا ڈالے پھرتی ہے اور ایندھن اُٹھاتی پھرتی ہے، اور یا یہ آخرت کے طوق اور سلاسل جو اس کے گلے میں پہنائے جائیں گے اُس کی طرف اشارہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اٰیاتھا ۴ ۱۱۲ سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ ۲۲ رکوعھا ۱
سورۂ اِخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۴ آیتیں ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴
آپ کہہ دیجئے: وہ اللہ ایک ہے ۝ اللہ بے نیاز ہے ۝ اس نے کسی کو جنا نہیں، اور وہ جنا نہیں گیا ۝ کوئی اس کا ہمسر نہیں ۝

سورۂ اِخلاص کی وجہ تسمیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ اِخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۴ آیتیں ہیں۔ عام طور پر آپ نے دیکھا کہ سورتوں کا نام کسی ایسے لفظ کے ساتھ رکھا ہوا ہوتا ہے جو لفظ اُس سورت میں استعمال ہوا ہو، جیسے پچھلی سورت میں ''لہب'' کا لفظ آیا تھا تو سورۂ لہب اس کا نام ہے، اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ میں ''نصر'' کا لفظ آیا تھا تو وہی سورت کا نام ہے، اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ میں ''الکافرون'' کا لفظ آیا تھا تو وہی سورت کا نام ہے، اور ''الکوثر، الماعون'' تو اکثر و بیشتر سورت کا نام ایسے لفظ کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے جو لفظ اُس سورت میں استعمال ہوا ہو۔ اِس سورت کا نام ''الاخلاص'' یہ لفظ ایسا ہے جو اس سورت میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ یہ یہاں اس سورت کا یہ نام رکھا گیا ہے اِس کے مضمون کی طرف دیکھتے ہوئے، کیونکہ اِس کا مضمون خالص توحید پر مشتمل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے دین کو خالص کرنے کا مطلب یہی ہے کہ عقیدۂ توحید صاف ستھرا رکھا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی اعتبار سے بھی کسی کو شریک نہ کیا جائے، مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا جو بار بار مطالبہ آیا ہے[1] کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے طور پر کرو کہ اللہ کے لئے اپنے عقیدے کو خالص کرو، تو اس کے اندر اُسی اخلاص کا ذکر ہے، عقیدے کے خالص کرنے کا ذکر ہے، خالص توحید اس میں مذکور ہے، تو اِس مضمون کی طرف دیکھتے ہوئے اِس سورت کا یہ نام رکھ دیا گیا، ورنہ یہ لفظ اِس سورت میں استعمال نہیں ہوا۔

---

(۱) پارہ ۸ سورۃ اعراف آیت ۲۹۔ پارہ ۲۴ سورۃ غافر آیت ۱۴۔ سورۃ غافر: ۶۵۔ پارہ ۳۰ سورۃ بینہ آیت ۵۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

سورۂ اِخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۴ آیتیں ہیں۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ...... قُلْ: کہہ دیجئے، اعلان کر دیجئے، یہ سرورِ کائنات ﷺ کو حکم دیا گیا، جیسے قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے شروع میں بھی یہی قُلْ آیا تھا تو وہاں اس کی وضاحت کی تھی، کہ جب واضح طور پر کسی چیز کو کہنے کا حکم ہو تو اُس کے لئے یہ صیغہ استعمال ہوتا ہے، علی الاعلان کہہ دیجئے، اعلان کر دیجئے، واشگاف الفاظ میں یہ حقیقت بیان کر دیجئے۔ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ: هُوَ ضمیر شان ہے اور اللّٰهُ اَحَدٌ یہ آپس میں مبتدا خبر ہیں، اور هُوَ کو اگر ضمیر شان نہ بنایا جائے تو یہ ضمیر لوٹے گی اُس معبود کی طرف جس کے متعلق مشرکین نے سوال کیا تھا کہ آپ اپنے معبود کا تعارف کرائیں، تو وہ معبود اللہ اَحد ہے، پھر یوں مفہوم ہو جائے گا، ''آپ کہہ دیجئے وہ اللہ اَحد ہے۔'' اَللّٰهُ الصَّمَدُ: اللہ صمد ہے، صمد ٹھوس چٹان کو بھی کہتے ہیں کہ جس کی اوٹ انسان لیتا ہے کسی دُشمن سے بچنے کے لئے، بڑی چٹان۔ اور ایسے سردار کو بھی کہتے ہیں کہ جس کے اُوپر کسی دُوسرے کی سرداری نہ ہو، اور صمد محتاج الیہ کو بھی کہتے ہیں، جدھر لوگ محتاج ہوں اور اپنی حاجات کے لئے اُدھر رُجوع کرتے ہوں، اور اللہ تعالیٰ پر یہ لفظ اس معنی کے اعتبار سے صادق آتا ہے کہ اللہ محتاج الیہ ہے، مصیبت اور تکلیف کے وقت میں اسی کا سہارا لیا جاتا ہے، اور اپنی حاجات میں لوگ اسی کی طرف ہی رُجوع کرتے ہیں، وہ محتاج الیہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ جب یہ لفظ استعمال ہوا تو اس کا مفہوم یوں نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کا محتاج نہیں اور سب کا محتاج الیہ ہے، دُوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی مدد کے بغیر کسی کا کوئی کام بنتا نہیں، اور اللہ کا اپنا کام کسی دُوسرے پر اٹکتا نہیں، کہ اگر کوئی دُوسرا تعاون نہ کرے تو اللہ کا کام نہ ہو، ایسی بات نہیں ہے، اللہ بے نیاز ہے، اللہ کسی کا محتاج نہیں، اس کا کام کسی دُوسرے پر موقوف نہیں کہ اگر کوئی دُوسرا تعاون نہ کرے تو اس کا کام نہ ہو، ایسی بات نہیں ہے، ہاں کسی کا کام بغیر اس کی توفیق اور بغیر اس کی مدد کے ہوتا نہیں، الصمد میں یہ مفہوم ہوگا، وہ خود کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کی طرف محتاج ہیں۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ: اللہ صمد ہے، اللہ سب کے لئے محتاج الیہ ہے، وہ خود کسی کا محتاج نہیں، اللہ بے نیاز ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے، اُس کے بغیر کسی کا کام بنتا نہیں اور اس کا کام بغیر کسی کے اٹکتا نہیں، یہ صمد کا مفہوم ہے۔ لَمْ یَلِدْ: اُس نے کسی کو جنا نہیں، وَلَمْ یُوْلَدْ: اور وہ جنا نہیں گیا، لَمْ یَلِدْ کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا نہیں، اور لَمْ یُوْلَدْ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خود کسی کا بیٹا نہیں، تو نہ اس کا بیٹا ہے نہ باپ۔ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ: کفو کہتے ہیں ہم سر کو، برابری والا، جیسے ''کتاب النکاح'' میں آپ پڑھا کرتے ہیں لڑکی کا کفو، کہ لڑکے اور لڑکی کی آپس میں کفاءت ہونی چاہیے، ''کفو'' ہم سر کو کہتے ہیں، تو وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ: اُس کے لئے کوئی کفو نہیں، کوئی اس کا ہم سر نہیں، کوئی اس کے برابر نہیں، کوئی اس کا مثل نہیں، مشابہ نہیں، لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ کے اندر اِس کی نفی ہوگئی، کوئی اُس کے لئے کفو نہیں ہے، کوئی اُس کے لئے ہم سر نہیں۔

تفسیر

سورۂ اِخلاص کی فضیلت، ''ثلث قرآن'' کے برابر ہونے کا مفہوم

قرآنِ کریم سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا اور سورۂ اِخلاص پر اس کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جن کے

کثرت کے ساتھ فضائل حدیث شریف میں بیان کیے گئے ہیں، اور ہر موقع پر آپ کے سامنے اِس کا اظہار کرتا آیا ہوں، اِس سورت کے متعلق سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ یہ ''ثلثِ قرآن'' ہے،[1] ''ثلث'' کا معنی تیسرا حصہ، جس کا مطلب ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ اِس کی تلاوت کرنے پر اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے اتنا ثواب دے دیتے ہیں کہ جتنا اصل ثواب ثلث قرآن پہ ملتا ہے، ثلث قرآن کا اصل ثواب اور سورۂ اِخلاص کی تلاوت پر تفضلی ثواب جو اللہ تعالیٰ بڑھا کر دیتے ہیں یہ آپس میں برابر ہوجاتے ہیں، تین دفعہ اس کو پڑھ لیا جائے تو گویا کہ پورے قرآنِ کریم کے پڑھنے کا ثواب حاصل ہوگیا۔ اور اِس کو ثلث قرآن قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم میں زیادہ تر زور جو دیا گیا ہے وہ تین عقیدوں پر ہی ہے، اللہ کی توحید اور رسالت اور معاد، اور توحید کی تفصیلات جتنی قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی ہیں ان کا خلاصہ اِس کے اندر ذکر کردیا گیا، تو گویا کہ تین مضمونوں میں سے ایک مضمون پر یہ سورت مشتمل ہے جس کی بنا پر قرآنِ کریم کا تیسرا حصہ اس میں آگیا (آلوسی)۔ سورتوں کے فضائل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُس کی حکمت کے تحت محض توقیفی ہیں، اس کی وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے جب اطلاع مل گئی تو اُس فضیلت کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے، تو لفظ تو حدیث شریف میں اتنا ہی آیا کہ یہ ثلث قرآن کے برابر ہے، باقی اس کی مرادیں دونوں ہوسکتی ہیں، کہ مضامین کے لحاظ سے یہ ثلث قرآن پر مشتمل ہے، یا فضیلت کے لحاظ سے یہ ثلث قرآن کے برابر ہے، دونوں باتیں اس میں ہوسکتی ہیں۔

سورۂ کافرون اور سورۂ اِخلاص کی باہمی مناسبت وفضیلت

اور سورۂ الکافرون آپ کے سامنے گزری تھی، اُس میں ذکر کیا تھا کہ سرورِ کائنات ﷺ نے اس کو رُبع قرآن کے برابر قرار دیا، قرآنِ کریم کے چوتھے حصے کے برابر۔ سورۂ الکافرون میں شرک سے اور کُفر سے تبری تھی، کافروں سے لاتعلقی کا اعلان تھا، وہ منفی پہلو ہے، اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ کے اندر یہ مثبت پہلو ذکر کردیا گیا۔ کافروں کے ساتھ ہمارا کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں، ان کے معبودوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ہمارا معبود یہ ہے کہ جس کی یہ صفتیں ذکر کردی گئیں۔ اس لئے سرورِ کائنات ﷺ دونوں سورتوں کو ہی کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ ﷺ کی عادت تھی مغرب کے بعد جو دو سنتیں آتی ہیں اور فجر سے پہلے جو دو سنتیں ہیں، تو اِن دو رکعتوں میں اکثر و بیشتر حضور ﷺ یہی دو سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اتنی دفعہ ہم نے آپ ﷺ کو یہ پڑھتے ہوئے سُنا کہ ہم شمار نہیں کرسکتے۔[2] وظیفے کے طور پر پڑھنے کی تلقین بھی فرمایا کرتے تھے کہ سوتے وقت قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لی جائے (ترمذی ۱۷۷/۲)۔

---

(۱) ترمذی ۱۱۷/۲، تفسیر سورۃ الزلزال۔ نوٹ:- اکثر روایات میں: ''تعدل ثلث القرآن'' کا لفظ ہے، دیکھیں: بخاری ۷۵۰/۲۔ مشکوۃ ۱۸۵/۱، فضائل القرآن، فصل اوّل۔

(۲) ترمذی ۹۸/۱ باب ما جاء فی الرکعتین بعد المغرب ...الخ. عن ابن مسعود أنه قال: ما أحصی ما سمعت من رسول الله ﷺ یقرأ فی الرکعتین ...الخ

شرور سے حفاظت کے لئے آخری تین سورتوں کی اہمیت

قُلْ هُوَاللّٰهُ کا تو بہت ہی زیادہ ذکر آتا ہے، خاص طور پر اگلی دونوں سورتوں کے ساتھ ملا کر، ان تینوں کو مُعَوِّذات کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دینے والی سورتیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کی عادتِ شریفہ یہی تھی کہ رات کو سوتے وقت یہ پڑھ کر اپنے آپ پر دَم کیا کرتے تھے، تینوں سورتیں پڑھیں، اپنے ہاتھوں پر دَم کر کے اپنے بدن پر پھیر لیا، پھر اسی طرح سے تینوں سورتیں پڑھیں، پھر تین سورتیں پڑھیں، تین دفعہ پڑھا کرتے تھے اِن تینوں سورتوں کو اور اپنے آپ پہ دَم کیا کرتے تھے۔[1] اور قولی طور پر تلقین بھی فرمائی کہ صبح شام جو شخص ان کو پڑھتا رہے اللہ تعالیٰ اس کو ہر آفت سے، مصیبت سے، نظرِ بد، جادو سے، یہ ٹونے ٹوٹکے جو کچھ لوگ کرنے لگ جایا کرتے ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں۔[2] تو یہ عادت اگر اختیار کر لی جائے تو بہت سارے شرور وفتن سے انسان محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو وظیفے کے طور پر بھی اِس کے پڑھنے کی تلقین فرمائی۔

سورۂ اِخلاص کے مزید فضائل

اور بعض صحابہ ﷺ کا ذِکر آتا ہے کہ وہ قُلْ هُوَاللّٰهُ کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجدِ قبا کا اِمام تھا، وہ جس وقت نماز پڑھاتا تو ہر رکعت میں قُلْ هُوَاللّٰهُ ضرور پڑھتا تھا اور اس کے ساتھ پھر اور سورت بھی ملا لیتا، تو پیچھے جو مقتدی تھے انہوں نے اِعتراض کیا کہ تُو اِس طرح سے نہ کیا کر، ایک سورت پر اِکتفاء کر لیا کر، ہر رکعت میں تُو قُلْ هُوَاللّٰهُ کیوں پڑھتا ہے؟ یا تو قُلْ هُوَ اللّٰهُ نہ پڑھا کر، یا دُوسری سورت نہ ملایا کر۔ اس نے کہا: میں اسی طرح نماز پڑھاؤں گا، اگر تم چاہو تو میں نماز پڑھاؤں چاہو تو میں اِمامت چھوڑ دیتا ہوں، لیکن مقتدی اس کے تقویٰ کی وجہ سے چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے شکایت ہوئی، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تُو ایسا کیوں کرتا ہے؟ تو اس اِمام نے کہا کہ جی مجھے اس سورت کے ساتھ محبت ہے، اس لیے میں اس کو بار بار پڑھتا ہوں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ تجھے جو محبت اِس سورت کے ساتھ ہے یہی محبت تجھے جنت میں لے جائے گی۔[3] تو اس سورت کے ساتھ محبت جنت میں لے جانے والی چیز ہے، حضور ﷺ نے بیان فرمایا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ سفر کا ہے کہ ایک اُمیرِ قافلہ تھا، حضور ﷺ نے باہر کوئی جماعت بھیجی تو اس کا اُمیر تھا، وہ نماز پڑھایا کرتا تھا، تو وہ بھی قُلْ هُوَاللّٰهُ ضرور پڑھتا تھا۔ واپسی پر آپ کے سامنے اس کا ذِکر کیا گیا، تو آپ نے کہا کہ اس سے پوچھو وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ تو اس اِمام نے کہا: چونکہ یہ رحمٰن کی صفت ہے اس لئے میں اس کو محبت سے پڑھتا ہوں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اسے بتادو کہ اللہ کو بھی اس سے محبت ہے۔[4] بہر حال اِس کی بہت فضیلت آتی ہے۔

---

(۱) بخاری ۲/۷۵۰ باب فضل المعوذات/ترمذی ۲/۱۷۷/مشکوٰۃ ۱/۱۸۶، کتاب فضائل القرآن، فصل اوّل کا آخر۔

(۲) ترمذی ۲/۱۹۸، ابواب الدعوات۔ مشکوٰۃ ۱/۱۸۸، فضائل القرآن، فصل ثانی کا آخر۔ قُلْ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ حِيْنَ تُمْسِيْ وَتُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔

(۳) بخاری ۱/۱۰۷ باب الجمع بین السورتین الخ/ترمذی ۲/۱۱۸ ابواب فضائل القرآن باب ما جاء فی سورۃ الاخلاص۔

(۴) بخاری ۲/۱۰۹۷ باب ما جاء فی دعاء النبی امتہ الی توحید اللہ۔ مشکوٰۃ ۱/۱۸۵، کتاب فضائل القرآن، فصل اوّل۔

چند سورتوں کے فضائل ومناقب

آپ کے سامنے اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ آئی تھی اُس کو سُدسِ قرآن کے برابر ٹھہرایا گیا تھا، حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے کہ ہر روز قرآنِ کریم کا چھٹا حصّہ پڑھ لیا کرے، ایک ہزار آیت پڑھ لیا کرے، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یہ تو مشکل ہے، ہر روز اتنا کیسے پڑھا جا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ لیا کرو، یہ سُدسِ قرآن کے برابر ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا کا ذکر آتا ہے کہ اس کو نصف قرآن کے برابر ٹھہرایا۔ اور سورۂ یٰس کے متعلق ذکر آتا ہے کہ اس کو دس قرآن کے برابر ٹھہرایا۔ سورۂ فاتحہ کے متعلق آتا ہے کہ اُس کو نصف قرآن کے برابر ٹھہرایا۔ تو یہ ہیں خاص خاص سورتیں جن کے فضائل صحیح احادیث کے اندر آئے ہوئے ہیں، تو اُن میں سرِفہرست یہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہے۔

قرآنِ کریم کا پہلا اور آخری درس توحید ہے

فاتحہ سے قرآنِ کریم شروع ہوا، فاتحہ بھی توحید پر مشتمل تھی، وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر تھا، اس کی صفات کا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اور اسی طرح سے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، اس میں سرورِ کائنات ﷺ کو بھی تلقین کی گئی تھی کہ ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کو ظاہر کیجئے، جیسے کہ بعض تفاسیر کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا کہ اس سے پہلے بھی لفظ قُلْ مقدر ہے، کہ آپ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرنے کے لئے یوں کہیے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یہ تلقین ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کہ اس طرح سے کہو، تو وہ صفات بھی اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی تھیں اور یہاں آخر کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر کر دیا گیا، اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے دِین میں توحید سب سے زیادہ اہم عقیدہ ہے، اور اس عقیدے کے اندر اگر کسی نے تھوڑا سا بھی خلل ڈال دیا اور اس میں شرک کی ملاوٹ ہو گئی تو آخرت میں پھر نجات نہیں ہے۔

سورۂ اِخلاص کا شانِ نزول

شانِ ورود کے اندر ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا تذکرہ جب سرورِ کائنات ﷺ کرتے تھے اور توحید کی دعوت دیتے تھے تو مشرکین اِستہزا کے طور پر یا تحقیق کے طور پر کہ ان کا اپنا ذہن یہی تھا کہ ہمارے معبود تو کوئی پتھر کا بنا ہوا ہے، کوئی چاندی کا بنا ہوا ہے، کوئی لکڑی کا بنا ہوا ہے، کوئی کیسا ہے، تو وہ کہتے کہ آپ اپنے اِلٰہ کا تعارف کرائیے کہ وہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ بعض روایات میں یہ بھی ہے، کہ وہ پوچھتے تھے کہ آپ کا معبود کس چیز سے بنا ہوا ہے؟ چونکہ ان کے اپنے معبود مختلف چیزوں سے گھڑے ہوئے تھے، کوئی لکڑی سے، کوئی پتھر سے، کوئی پیتل سے، کوئی چاندی سے، انہوں نے اس طرح سے سوال کیا، (مظہری)۔ اور بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ آپ اپنے اِلٰہ کا نسب نامہ تو بیان کیجئے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت اُتری جس کے اندر اللہ تعالیٰ کا تعارف مکمل کروا دیا گیا، اور شرک کے جتنے شابے تھے وہ سارے کے سارے ختم کر دیے گئے۔[1]

---

(۱) ترمذی ۲/۱۷۳، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الإخلاص.

مشرکین بھی اللہ کو پہچانتے تھے

اَللّٰهُ اَحَدٌ میں تو یہ بات ذِکر کردی کہ ہمارا معبود وہ اللہ ہی ہے، اور اِس لفظ کو وہ جانتے پہچانتے تھے، قرآنِ کریم میں کتنی جگہ یہ آیا ہے کہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ کہیں گے اللہ نے۔ آسمان کی طرف سے بارش کون اُتارتا ہے؟ رِزق تمہیں کون دیتا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ۔ بہت ساری آیتوں کے اندر یہ ذِکر کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظِ "اللہ" سے واقف تھے، اور لفظِ "اللہ" کو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے بطور نام کے اِستعمال کرتے تھے، اور باقی الفاظ اُس کے لئے بطور صفت کے آیا کرتے تھے، تو لفظِ "اللہ" کو وہ پہچانتے تھے، غیر اللہ کے لئے وہ "اللہ" کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، اس کے لئے اِلٰہ کا لفظ استعمال ہوتا تھا، لفظ "اللہ" یعنی الف لام کے داخل کرنے کے ساتھ اس کو وہ بھی خاص کرتے تھے اُسی کے ساتھ جس کو زمین وآسمان کا خالق کہتے تھے، موت وحیات کا مالک کہتے تھے، اور عالم کے اندر مدبر، تدبیر کرنے والا قرار دیتے تھے۔

مشرکین کے شرک کی حقیقت

لیکن اس کو ماننے کے ساتھ ساتھ پھر وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اِس اللہ نے بعضے شعبے بعض دُوسروں کے سپرد کر کے اُن کو بااختیار کردیا ہے، اب جو چیز چاہیے اب اِن چھوٹوں کے سامنے درخواست دی جائے گی، ان کو خوش رکھا جائے گا، ان سے وہ چیز لی جائے گی۔ ورنہ اصل کے طور پر وہ مالک ہر چیز کا اللہ ہی کو قرار دیتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک یوں ٹھہرا لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت میں اِن کو حصے دار بنالیا ہے اور بعضے شعبے اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کردیے ہیں۔ اور اللہ کی حکومت کو وہ دُنیا کی حکومت کے اُوپر قیاس کرتے تھے کہ جس طرح سے ایک صدرِ مملکت ہوتا ہے، یا بادشاہ ہوتا ہے، وہ حکومت کا نظام چلانے کے لئے مختلف شعبے بنالیتا ہے، اور دُوسروں کو ان شعبوں کی سربراہی دے دیتا ہے، وہ اس کے ساتھ حکومت میں شریک ہوتے ہیں، اب اگر کام ہو تو چھوٹوں کے سامنے درخواست دی جاتی ہے، بڑے کے سامنے نہیں جایا کرتے، چھوٹے خود بڑے سے کروالیا کرتے ہیں، اِس قسم کا تصوّر اُن کا تھا۔

اللہ اکیلا بھی ہے، اور صمد بھی ہے!

تو یہاں بتادیا گیا کہ وہ اللہ ایک ہے، اس نے اپنے ساتھ کسی دُوسرے کو شریک نہیں ٹھہرایا ہوا کسی لحاظ سے بھی، نہ ذات میں نہ صفات میں، احدیت اور یکتائی یہاں نمایاں کردی گئی، لیکن وہ ایسا اکیلا نہیں کہ بالکل الگ تھلگ ہو کے بیٹھ جائے بلکہ وہ صمد بھی ہے، سب کے لئے سہارا ہے، سب اس کے محتاج ہیں، اپنی ضروریات کے لئے اس کی طرف سارے کے سارے رجوع کرتے ہیں، تو یہ مفہوم وہی ہے جو اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے اندر بیان کیا گیا تھا، کہ مدد اسی سے طلب کی جاتی ہے، کسی دُوسرے سے طلب نہیں کی جاتی، تو حاجات کے اندر رُجوع اسی کی طرف ہی کیا جاتا ہے، ضرورتیں پوری کرنے والا کوئی دُوسرا نہیں، مصیبت کے وقت

میں اس کے علاوہ کوئی دُوسرا سہارا نہیں، تو یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مخلوق کے لئے محتاج الیہ بھی ہے، مخلوق کی کے لئے سہارا بھی ہے، اپنی ضروریات کے لئے مخلوق اُدھر رُجوع بھی کرتی ہے، اَللّٰہُ الصَّمَدُ کے اندر یہ بات آ گئی۔

آخری دو آیات میں مزید تین انداز سے شرک کا رَدّ

اور یہود و نصاریٰ نے شرک جو اِختیار کیا ہوا تھا وہ اللہ کی اولاد قرار دینے کا تھا، مشرکین میں بھی یہ شرک تھا، فرشتوں کو وہ اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے، اور اسی طرح سے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اولاد قرار دیتے تھے، اور یہودیوں میں عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا گیا۔ تو لَمْ یَلِدْ کے اندر اُس کی نفی کر دی کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں، اس قسم کا شریک بھی نہیں، کیونکہ جو بیٹا ہوتا ہے وہ صفات میں باپ کے ساتھ شریک ہوا کرتا ہے۔ اور پھر مخلوق میں سے کسی کو خدا قرار دینا یا اس کے اندر اُلوہیت کی صفات ماننا اُس کی لَمْ یُوْلَدْ میں نفی کر دی کہ اللہ تو وہ ہوتا ہے جو خود کسی کا بیٹا نہ ہو، کسی نے اس کو جنا نہ ہو، وہ حادث نہیں ہوتا، قدیم ہوتا ہے، اور بیٹا جو ہوتا ہے وہ حادث ہے، پہلے نہیں تھا بعد میں ہوا، تو لَمْ یُوْلَدْ کے اندر اس کی نفی ہو گئی کہ مخلوق میں سے کوئی آدمی اللہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو جنا ہوا ہوتا ہے، اور جو جنا ہوا ہو گا وہ حادث ہو گا، قدیم نہیں ہو گا، تو اللہ کی ذات ایسی ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا، نہ بیٹے ہونے کے طور پر اس کا کوئی ساتھ شریک ہے، اور نہ اس کا کوئی باپ ہے کہ کسی نے اس کو جنا ہو، تو جس کا کوئی باپ موجود ہو اس کے اندر اُلوہیت نہیں مانی جا سکتی، لَمْ یُوْلَدْ کے اندر یہ بات واضح کر دی، اور آگے یہ نفی کر دی کہ کسی اور لحاظ سے بھی اس کا کوئی ہمسر نہیں، کوئی اس کی مثل نہیں۔ تو شرک جب بھی آتا ہے تو اِنہی چیزوں کے اندر ہی آتا ہے، یا ذات میں شرک ہو گا، یا صفات میں ہو گا، یا اولاد کا عقیدہ اختیار کیا گیا، یا مخلوق میں سے کسی دُوسرے کو خدا بنایا گیا، اِن سب چیزوں کی نفی یہاں کر دی، اور مختصر سے فقرے میں توحید کا پورا تعارف کرا دیا گیا۔

قرآنِ کریم کی اِبتدا بھی توحید سے اور اِختتام بھی توحید پر

تو قرآنِ کریم کے مضامین اِس سورت پہ جا کے اختتام پذیر ہو جاتے ہیں، اور آگے جو دو سورتیں آ رہی ہیں وہ یوں سمجھیے جس طرح سے ان کے اُوپر محافظ اور دو پہریدار کھڑے کر دیے گئے، جن کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی تو اس کی حقیقت آپ کے سامنے نمایاں ہو جائے گی، مضامین کے لحاظ سے یہ قرآنِ کریم کی آخری سورت ہے۔ تو جس طرح سے آپ دیکھتے ہیں کہ ایک درخت بویا جاتا ہے، اور بیج سے اس کی اِبتدا ہوتی ہے، اور وہ پھیلتا جاتا ہے، بڑھتا جاتا ہے، اپنے کمال کو پہنچنے کے بعد آخر کار اس کو پھل لگتا ہے تو پھر اس میں سے بیج ہی تیار ہوتا ہے، اِبتدا جیسے بیج سے ہوئی تھی تو ہر چیز کی اِنتہا جو ہے وہ اسی بیج پہ ہوا کرتی ہے، اِنتہا اسی سے ہے جس سے اِبتدا ہے۔ تو یہاں بھی قرآنِ کریم کو جس طرح سے توحید کے مسئلے سے شروع کیا گیا، پھر اس کی تفصیلات ہوتی چلی گئیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لانے کے تقاضے واضح ہوئے، کہ اُس کی عبادت کی جائے، اس کے اَحکام کو مانا جائے، اِسی سلسلے کے اندر ساری تفصیلات ہوتے ہوتے اِختتام پر جا کے پھر اُسی بات کو واضح کر دیا گیا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو۔ تو جہاں سے کتاب شروع ہوئی تھی، وہیں اس کا اِختتام ہو گیا، توحید سے شروع ہوئی تھی توحید پر ختم ہو گئی۔ جس طرح سے ایک بہت بڑا

درخت ایک بیج سے شروع ہوتا ہے اور جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو آخر کار بھی جا کر بیج ہی تیار ہوا کرتا ہے، نہایہ وہیں پر جہاں سے بدایہ ہے، تو اس طرح سے انتہا اور ابتدا آپس میں متناسب بھی ہو جاتی ہیں، کچھ اور مناسبات بھی ہیں ابتدا اور انتہا میں، اُن کا ذکر اگلی سورتوں کے اختتام پر کیا جائے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

آیاتها ۵ — ۱۱۳ سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ ۲۰ — رکوعها ۱

سورۂ فلق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا

آپ کہہ دیجئے، میں پناہ پکڑتا ہوں صبح کے رب کی ○ ہر اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا ○ اور تاریک چیز کے شر سے جس وقت

وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵

کہ وہ پھیل جائے ○ اور گانٹھوں میں پھونکے مارنے والیوں کے شر سے ○ اور حاسد کے شر سے جس وقت کہ وہ حسد کرے ○

آیاتها ۶ — ۱۱۴ سُوْرَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ ۲۱ — رکوعها ۱

سورۂ ناس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۶ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ

آپ کہہ دیجئے کہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب کی ○ لوگوں کے بادشاہ کی ○ لوگوں کے معبود کی ○ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے

الۡخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۝۵ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ۝۶

جوکہ پیچھے ہٹ جانے والا ہے ۝ جولوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے ۝ جنوں سے اور انسانوں سے ۝

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا محمدٍ واٰلِہٖ وصحبِہٖ كَمَا تُحِبُّ وترضٰى عددَ ما تُحِبُّ وترضٰى - رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ - سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ - رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا - رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا - رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا - سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ . لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ . لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ - لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ - يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ -

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ - يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ -

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ -

اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ.

اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ.

اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ.

آخری دوسورتیں مکی ہیں یا مدنی؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ سورۂ فلق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵ آیتیں ہیں۔ اِن دونوں سورتوں کے اُوپر ہی اِس قرآنِ کریم میں جو میرے سامنے رکھا ہوا ہے "مکیہ" لکھا ہوا ہے، لیکن عام طور پر معروف یہی ہے مشہور یہی ہے کہ یہ دونوں سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ لیکن بسا اوقات یوں بھی ہوجاتا ہے کہ سورت دو دفعہ نازل ہوجاتی ہے، پہلی دفعہ نازل ہوئی، پھر دُوسرے موقع پر جو اس کے شانِ نزول کے مطابق تھا دوبارہ اس کی یاددہانی کردادی گئی، تو اُس موقع پر جب اس کو پڑھا جاتا ہے تو اس وقت بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یوں ذکر کردیتے ہیں کہ یہ فلانے واقعے میں نازل ہوئی۔ اِس کی تفصیل آپ کے خدمت میں عرض کروں گا۔

آخری دونوں سورتوں کا ترجمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ: آپ کہہ دیجئے میں پناہ پکڑتا ہوں صبح کے رَبّ کی، مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ: ہر اُس چیز کے شر سے جس کو اُس نے پیدا کیا، مَا خَلَقَ: جو کچھ اُس نے پیدا کیا اُس کے شر سے، وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ: اور غاسق کے

شر سے، غاسق: تاریک چیز، تاریک چیز کے شر سے جس وقت کہ وہ پھیل جائے، وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ: اور پھونکیں مارنے والوں کی بُرائی سے، عُقد عُقدۃ کی جمع ہے، عقدۃ گانٹھ کو کہتے ہیں، ''گانٹھوں میں پھونکیں مارنے والیوں کی بُرائی سے''، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ: اور حاسد کے شر سے جس وقت کہ وہ حسد کرے...... سورۂ ناس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۶ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ: آپ کہہ دیجئے کہ میں پناہ پکڑتا ہوں رَبّ ناس کی، مَلِكِ النَّاسِ: لوگوں کے بادشاہ کی، اِلٰهِ النَّاسِ: لوگوں کے معبود کی، مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ: وَسواس اصل کے اعتبار سے مصدر ہے اور یہاں اسم فاعل کے معنی میں ہے مُوَسْوِس، وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، الْخَنَّاسِ: یہ وَسواس کی صفت ہے، خَنَسَ: پیچھے ہٹ جانا، خناس: جو کہ پیچھے ہٹ جانے والا ہے، دبک جانے والا ہے، الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ: جو لوگوں کے دِلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ: یہ وَسواس کا بیان ہے، جنوں سے اور انسانوں سے، یعنی وسوسہ ڈالنے والا جنوں سے ہو یا انسانوں سے ہو، میں سب کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

سورۂ فلق کا خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

اَعُوْذُ: عَاذَ يَعُوْذُ: پناہ پکڑنا، کسی تکلیف یا شر سے بچنے کے لئے کسی کی اوٹ میں آنا، کسی کا سہارا لینا۔ اور اِس کے بعد جس چیز کے اُوپر باء داخل ہو، اس کی پناہ لینی مقصود ہوتی ہے، اور جس کے اُوپر مِن داخل ہو، اس سے بچنا مقصود ہوتا ہے، جیسے آپ ''اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم'' پڑھتے ہیں، تو اللہ کی پناہ لی جاتی ہے شیطان رجیم سے بچنے کے لئے، تو یہاں بِرَبِّ الْفَلَقِ کے اُوپر باء داخل ہے، اور مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ اس کے بعد جو کچھ ہے سب مِن کے نیچے داخل ہے، تو مِن کے بعد والی چیزوں سے بچنا مقصود ہوتا ہے، اور باء کے مدخول کی پناہ میں آنا مقصود ہے۔ الْفَلَقِ: یہ لفظ اصل کے اعتبار سے مصدر ہے، فَلَق پھاڑنے کو کہتے ہیں، تو فلق مصدر ہے اور یہاں اس سے مراد لی گئی ہے صبح، کیونکہ رات کی تاریکی کے پھٹنے سے یہ صبح نمودار ہوا کرتی ہے، اور یہ لفظ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ (سورۂ انعام: ۹۶) صبح کو پھاڑ نکالنے والا، اور اسی طرح سے فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى (الانعام: ۹۵) بھی ہے، غلے کو چیر کے اس میں سے انگوری نکالنے والا، اور اسی طرح گٹھلی کو پھاڑ کے اس میں سے پودا نکالنے والا، تو فَلَق پھاڑنے کے معنی میں ہے، عام طور پر مترجمین نے اور مفسرین نے یہاں سے صبح ہی مراد لی ہے، تو رَبِّ فلق کا معنی ہوگا صبح کا رَبّ، اور مَا خَلَقَ یہ عام آ گیا جو کچھ بھی اس نے پیدا کیا ہے۔ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ: غاسق: تاریک چیز کو کہتے ہیں، قرآنِ کریم میں یہ لفظ بھی استعمال ہوا ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ (سورۂ اسراء: ۷۸) نماز قائم کیجئے سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک، تو غسق تاریکی کو کہتے ہیں، تو غاسق: تاریک چیز، اس کا مصداق رات بھی ہوسکتا ہے، اور بعض روایات[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصداق چاند بھی ہے، جس وقت اس کو گہن لگتا ہے، تاریکی میں داخل ہوتا ہے، تو اس کو بھی ''غاسق'' کہتے ہیں۔ اور

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۷۴، کتاب التفسیر، باب المعوذتین/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۱۷ باب الاستعاذۃ، فصل ثانی۔

بعض تفسیری روایات میں اِس کا مصداق سورج بھی لیا گیا ہے، جس وقت وہ تاریک ہوجائے یعنی چھپ جائے (تفسیر رازی)۔ ''رات کے شر سے جس وقت کہ وہ پھیل جائے، یا، جس وقت تاریکی سمٹ آئے'' وُقوب دونوں معنوں میں ہی ہے، تاریکی کا جمع ہوجانا، تاریکی کا پھیل جانا، مقصد یہ ہے کہ جس وقت خوب تاریک ہوجائے، تاریکی سمٹ آئے یا تاریکی پھیل جائے، یا ''چاند کے شر سے جس وقت وہ تاریکی میں داخل ہوجائے'' یعنی اس کو گہن لگ جائے۔ اور النَّفّٰثٰتِ: یہ نَفَث سے لیا گیا ہے، نَفَث: پھونک مارنا۔ جس طرح سے دَم کرتے وقت لوگ پھونک مارا کرتے ہیں، اور النَّفّٰثٰتِ یہ جمع کا صیغہ ہے اور مؤنث کا صیغہ ہے، یا تو اس کا مصداق عورتیں ہی ہیں، جیسے واقعے میں آپ کے سامنے آئے گا کہ یہ عورتیں ہی تھیں جنہوں نے کوئی دَم کر کے، پھونکیں مار کے جادو کیا تھا، تو نفاثات کا مصداق عورتیں بھی ہوسکتی ہیں، ''ان عورتوں کے شر سے جو کہ گانٹھوں میں پھونک مارنے والی ہیں''، اور نفاثات سے مذکر مؤنث سب بھی مراد ہوسکتے ہیں جماعات کے اعتبار سے ''وہ جماعات جو پھونکنے والی ہیں گرہوں میں''، نفوس کے اعتبار سے بھی، نفوس کا لفظ بھی مذکر مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے ''ان نفسوں کے شر سے جو کہ گرہوں میں پھونک مارنے والے ہیں'' (نسفی)۔ اور مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ: حَاسِدٍ یہ لفظ حسد سے لیا گیا ہے، حسد کہتے ہیں کسی کی اچھی حالت دیکھ کر جلنے کو، تو حاسد ہوگیا جلنے والا، جس کے دِل میں یہ تمنا اُبھرتی ہے کہ فلاں شخص کی یہ اچھی حالت کیوں ہے؟ یہ زائل ہوجانی چاہیے! اپنے لئے حصول کی تمنا نہیں ہوا کرتی، صرف دُوسرے سے زوال مقصود ہوتا ہے کہ اس کے پاس نہ رہے، اگر اس کے پاس رہتے ہوئے اپنے لیے حصول کی تمنا ہو تو اس کو ''غبطہ'' کہتے ہیں، ''رشک'' کہتے ہیں، یہ دُرست ہے، لیکن یہ تمنا کہ اُس کی حالت اچھی کیوں ہے؟ یہ زائل ہوجانی چاہیے! یہ جذبہ حسد ہے اور یہ رذیلہ ہے، اخلاق کے اندر یہ بدترین قسم کا بُرا خُلق ہے، بہت سارے شر و فساد کا یہ منبع ہے، جیسے تفصیل آپ کے سامنے آرہی ہے، تو ''حاسد کے شر سے''، اِس کے ساتھ قید لگادی اِذَا حَسَدَ: جس وقت کہ وہ حسد کرے، یعنی اگر وہ حاسد دِل میں حاسدانہ جذبات رکھتا ہے لیکن اپنے اُس حسد کے اُوپر عمل نہیں کرتا تو ایسی صورت میں محسود کا کوئی نقصان نہیں ہے، محسود کو بچنے کی ضرورت اُس وقت پیش آئے گی جس وقت حاسد اپنے حسد کے تقاضے کے مطابق کوئی کارروائی کرے۔

تفسیر

سورتوں کی ترتیبِ تلاوت بھی توقیفی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قرآنِ کریم میں یہ آخری دو سورتیں ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کی تعلیم و تلقین کے تحت اِن کو قرآنِ کریم کے آخر میں رکھا گیا ہے، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ آیات کی ترتیب نزول کے اعتبار سے اور ہے، اور قرآنِ کریم جس طرح سے جمع کیا گیا یہ ترتیب اور ہے، اسی لئے آپ سورتوں کی ترتیب بھی دیکھتے آئے کہ کبھی ''مکی'' سورت آجاتی ہے، کبھی ''مدنی'' سورت آجاتی ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے یہ ترتیب قائم فرمائی اللہ کی تعلیم کے تحت، اس لئے سورتوں کی ترتیب اور آیات کی ترتیب

جو کچھ ہے، سب وہی ہے جو "لوحِ محفوظ" میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو جس طرح سے تعلیم دی، آپ ﷺ نے صحابہ ﷡ کو فرمایا، تو اِسی ترتیب کے ساتھ قرآنِ کریم کو جمع کیا گیا، صحابہ ﷡ کا اِجماع ہے اس پر، اس لئے جو سورت جس جگہ رکھ دی گئی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتاب کے اندر وہ وہیں ہی ہے۔

معوّذتین کو آخر میں رکھنے میں حکمت

تو یہ دونوں سورتیں اِن کو قرآنِ کریم کے آخر میں رکھا گیا، آخر میں رکھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم "الحمد للہ" سے شروع ہوا تھا، مضامین کے لحاظ سے وہ سورۂ اِخلاص پر ختم ہو گیا، سورۂ اِخلاص میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی وضاحت آ گئی تھی، اور عقیدۂ توحید کو بہت واضح طریقے سے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا، جیسے کہ اس سورت کی تفسیر میں آپ یہ بات سُن چکے ہیں، تو توحید سے شروع کیا گیا تھا، توحید پر اِختتام ہو گیا، جیسے ایک تن آور درخت بیج سے شروع ہوتا ہے اور آخر کار جا کے پھل لگ کے پھر بیج ہی تیار ہوتا ہے، تو انتہا وہیں ہوتی ہے جہاں سے ابتدا ہوتی ہے۔ تو قرآنِ کریم کی اِنتہا بھی عقیدۂ توحید پہ ہوئی جس طرح سے کہ اس کی اِبتدا اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے تذکرے سے شروع ہوئی تھی، اِبتدا میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذِکر آیا تھا، تو آخر میں بھی اسی طرح سے ہو گیا..... تو یہ دو سورتیں آخر میں جو رکھی گئی ہیں تو یہ چونکہ تعوّذ پر مشتمل ہیں، یہ ایسے ہیں جس طرح سے اِس محفوظ ذخیرے کے لئے دو پہرے دار کھڑے کر دیے گئے ہیں، قرآنِ کریم کی دولت جس وقت مکمل ہو گئی تو یہ دو سورتیں بطور محافظ کے آخر میں رکھ دی گئیں، چونکہ اس میں ہر قسم کے شر سے ہر قسم کی بُرائی سے پناہ مانگی گئی ہے تو دِینی، دُنیوی ہر قسم کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اِن آیتوں کے ساتھ اِستعاذہ کیا جاتا ہے، تو یہ محافظ اور نگران ہونے کی حیثیت میں آخر کے اندر دونوں رکھی گئی ہیں۔

معوّذتین "مکی" ہیں یا "مدنی"؟

ان کے شانِ نزول میں جو واقعہ نقل کیا جاتا ہے، جو اَبھی آپ کی خدمت میں عرض کرنے والا ہوں، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں مدینہ منورہ میں اُتریں، لیکن عام مصاحف میں اِن کے اُوپر "مکیہ" لکھا ہوا ہے کہ مکہ معظمہ میں اُتریں، تو کبھی ایسے ہو جایا کرتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک سورت اُتر آئی، اور پھر مدینہ منورہ میں کوئی واقعہ پیش آ گیا، اُس واقعے کے موقع پر جبریل ﷺ نے آ کے دوبارہ اُن سورتوں کی یاددہانی کروادی، سرورِ کائنات ﷺ نے ان کو بیان کر دیا، تو دیکھنے والے اور سننے والے اُس واقعے کو بھی اُس سورت کا یا اُس آیت کا شانِ نزول کہہ دیا کرتے ہیں، اور پھر مفسرین ﷭ اس کی تعبیر کرتے ہیں کہ یہ دو دفعہ نازل ہوئی، اصل بات یہ ہوتی ہے کہ جبریل ﷺ کی طرف سے یاددہانی کروادی گئی کہ اس وقت جو مشکل پیش آئی ہے اس کا حل انہی آیات میں ہے جو آپ کے پاس پہلے آ چکی ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ اُن آیات کو اس موقع پر تلاوت کرتے ہیں، تو سننے والے اُسی واقعے کو اس کا شانِ نزول قرار دے کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیتیں اِسی موقع پر اُتری تھیں۔

شانِ نزول کے متعلق شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کردہ اُصول

اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر'' میں یہ اُصول لکھا ہے کہ جہاں یہ آئے ''نَزَلَ فِيْ كَذَا،نَزَلَ فِيْ كَذَا'' کہ فلانی سورت یا فلانی آیت فلاں معاملے میں اُتری ہے، ''نزلت فی کذا'' کے طور پر جو ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا ہر جگہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا تھا تو اُس پر وہ سورت اُتری یا وہ آیت اُتری، بلکہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آیت اُتری ہوئی ہے، سورت اُتری ہوئی ہے، اور پھر کوئی واقعہ ایسا پیش آ گیا جس کا حکم اُنہی آیات سے ثابت ہوتا تھا، یا کسی اِشکال کا حل اُنہی آیات میں تھا جو پہلے اُتری ہوئی تھیں، تو حضور ﷺ تلاوت کرتے یا کسی صحابی کے سامنے ایسا واقعہ پیش آتا تو صحابی اُس آیت کو پیش کر دیتا، تو سننے والے کہتے ہیں کہ یہ آیت اِسی بارے میں اُتری، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعے کا حل اِس میں ہے، اس مشکل کا حل اس میں ہے، یا اس صورت کا حکم اس میں ہے، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واقعہ پہلے پیش آیا اور سورت بعد میں اُتری، نہیں! سورت کے اُتر آنے کے بعد آگے اس کو جس واقعے پر منطبق کر دیا جائے تو عام طور اُس کو کہہ دیا جاتا ہے ''نزلت فی کذا'' کہ یہ سورت فلاں معاملے میں اُتری ہے، یہ آیت فلاں معاملے میں اُتری ہے۔ مثال کے طور پر آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آج ایک چور پکڑا ہوا آجائے، اور اس کے اُوپر چوری ثابت ہوجائے، حاکمِ وقت اس کا ہاتھ کاٹنے لگے تو ہاتھ کاٹنے کی دلیل کے طور پر وہ ذکر کرے کہ ایسے ہی شخصوں کے بارے میں یہ آیت اُتری ہے: السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا (سورۂ مائدہ:۳۸) سزا دیتے وقت وہ اس آیت کی اگر تلاوت کرے اور کہے کہ یہ آیت ایسے ہی واقعے کے بارے میں اُتری ہے، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ اُتر تو بہت پہلے چکی، لیکن یہ جو واقعہ پیش آیا ہے تو اس پر چونکہ یہ منطبق ہوتی ہے تو یوں سمجھو کہ یہ واقعہ بھی ویسے ہی ہے جیسے کہ شانِ نزول کے وقت میں کوئی واقعہ پیش آیا تھا، ایسی صورت میں ''نزلت فی کذا'' کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ تو چونکہ اِن دونوں سورتوں میں ہر قسم کے شر اور فتن سے پناہ مانگی گئی ہے، تو ہوسکتا ہے کہ مکہ معظمہ میں جب مشرکین ہر لحاظ سے آپ کو تنگ کر رہے تھے، آپ کو پریشان کر رہے تھے، طرح طرح سے وہ آپ کی مخالفت کرتے تھے، تو ان کے شر سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بطور دُعا کے اور بطور ذکر کے یہ سورتیں اُتاری ہوں، اُس وقت یہ ''مکی'' ہوگئیں، بعد میں اُسی طرح سے یہود کی طرف سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی، اور یہود نے آپ ﷺ کو پریشان کرنا شروع کیا، حضور ﷺ کو پریشان کرنے کے لئے تدابیر اختیار کیں، تو جبریل علیہ السلام نے آکر دوبارہ اُنہی سورتوں کی یاد دہانی کروادی، اور حضور ﷺ نے اِنہی سورتوں کے ساتھ اپنی اُس مشکل کا حل نکالا، تو جس کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُس واقعے میں اُتریں، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ میں اُتری تھیں، دونوں طرح سے اِن کو ذکر کیا جاسکتا ہے۔

معوّذتین کا شانِ نزول

اِن سورتوں کے شانِ نزول میں عام طور پر جو بات مشہور ہے وہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک شخص تھا لبید بن اعصم، ''یہودی'' کا لفظ اس کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منافق تھا (بخاری) یہودیوں کے ساتھ

اس کا اختلاط تھا، ملنا جلنا تھا، لبید بن اعصم، اُس نے سرورِ کائنات ﷺ پر جادو کیا[1] آپ ﷺ کے خادم کی وساطت سے، کوئی لڑکا نوجوان، اُس کے متعلق بھی لکھا ہے کہ یہود کا کوئی لڑکا حضور ﷺ کے پاس آتا جاتا تھا آپ کی خدمت میں (مظہری)۔

یہودی بچے آپ ﷺ کی خدمت میں آتے رہتے تھے

روایات میں یہ چیز آتی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ اپنے پاس یہود کو بھی آنے دیتے تھے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں ایک واقعہ ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا، حضور ﷺ کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار ہوگیا، رسول اللہ ﷺ اپنے چند صحابہ کے ساتھ اس کی عیادت کے لئے گئے، اور وہاں جا کے دیکھا تو اس کا باپ بیٹھا ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے باپ کو خطاب کر کے کہا، اے یہودی! کیا میرا ذکر تمہاری کتاب توراۃ میں آتا ہے؟ توراۃ میں آتا ہے؟ اس نے انکار کیا کہ نہیں جی! ہم تو اپنی کتاب میں آپ کا کوئی ذکر نہیں پاتے، وہ لڑکا جو بیمار پڑا ہوا تھا اس نے کہا کہ نہیں یا رسول اللہ! آپ کا ذکر کتاب میں آتا ہے، یہ واقعہ جس وقت ہوا تو وہ لڑکا پھر مسلمان ہوگیا، تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اس بوڑھے کو یہاں سے اُٹھادو اور اپنے بھائی کو تم سنبھال لو۔[2] تو اس بچے کی تولیت مسلمانوں کی طرف منتقل ہوگئی۔ اُس روایت میں یہ صراحتاً موجود ہے کہ یہودی بچے بھی حضور ﷺ کی خدمت میں اگر آتے تھے اور کوئی خدمت سرانجام دیتے تھے تو آپ ﷺ اس کو برداشت کرتے تھے، آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کا تقاضا بھی تھا تا کہ بچے مانوس ہوں اور مانوس ہونے کے بعد وہ ایمان لے آئیں، جیسے اس واقعے میں وہ لڑکا مسلمان ہوگیا، اور آپ ﷺ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے اِس کو جہنم کی آگ سے نجات دِلا دی۔ ایسے ہی کوئی لڑکا آتا جاتا تھا، اُس کی وساطت سے اُس لبید بن اعصم نے سرورِ کائنات ﷺ کے سَر کے بال جو کنگھی کرتے وقت نکلا کرتے ہیں وہ بال حاصل کر لئے (مظہری)۔

حضور ﷺ کے بالوں کی مقدار

کیونکہ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ سَر کے اُوپر لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے صرف حج اور عمرہ کے موقع پر اُسترا پھروایا ہے، ورنہ اکثر آپ کے سَر کے اُوپر لمبے لمبے بال رہے ہیں، وَفْرَۃ، لِمَّۃ، جُمَّۃ تین قسم کے بال آتے ہیں، کانوں کے برابر تک ہوں تو ان کو وفرۃ کہتے ہیں، اور کندھے سے اُوپر کانوں سے نیچے ہوں تو اس کو لمۃ کہتے ہیں، اور کندھوں تک پہنچ جائیں گردن کی جڑ تک تو اس کو جمۃ کہتے ہیں، تو جب کٹوائے ہوئے دیر ہوجاتی تھی تو جمۃ ہوجاتے تھے، اور جب تازے تازے کٹوائے ہوتے تو دیکھنے والے اس کو وفرۃ سے تعبیر کرتے تھے، اور کچھ وقت گزر جائے تو لمۃ کی حد میں آجاتے تھے۔ یا جس طرح سے روایات میں آتا ہے کہ آپ کے بال سیدھے نہیں تھے، بلکہ گھنگھریالے تھے، تو گھنگھریالے بال جب کنگھی نہ کی ہوئی ہو تو ذرا

---

(۱) پورا واقعہ دیکھیں: بخاری ۱/ ۴۶۲، باب صفۃ ابلیس۔ ۲/ ۸۵۷، باب السحر۔ ۲/ ۸۵۸، باب هل يستخرج السحر۔ ۲/ ۸۹۵، باب ان الله يامر بالعدل۔ ۲/ ۹۴۵، باب تکریر الدعاء۔۔۔ مسلم ۲/ ۲۲۱، باب السحر۔۔۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۴۳، باب المعجزات، فصل اول۔

(۲) دلائل النبوۃ بیہقی ۶/ ۲۷۲، باب ما جاء فی صفۃ الیہودی الذی اعترف۔۔۔ الخ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۸، باب اسماء النبی ﷺ، فصل ثالث۔

سکڑ کے اُوپر کو ہوتے ہیں، کنگھی کر لی جائے تو نیچے کو پھیل جاتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ کے بالوں کا ذکر اسی طرح سے تین لفظوں کے ساتھ حدیث شریف میں آیا ہے۔

حضور ﷺ پر جادُو کس طرح کیا گیا تھا؟

تو جب بال لمبے ہوتے، تو کنگھی جب کی جاتی تو بال اُکھڑتے تھے، اور وہ بال جو اُکھڑے ہوئے ہوتے تھے، اُس یہودی نے اس لڑکے کی وساطت سے وہ بال حاصل کر لئے، اور اسی طرح سے آپ ﷺ جو کنگھی استعمال کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بھی کچھ دندانے حاصل کر لئے (مظہری)، اور اُن بالوں کے اندر جادُو کروایا اپنی لڑکیوں سے، لبید بن اعصم کی لڑکیاں اس جادُو کرنے میں شریک تھیں، گیارہ گرہیں لگائی گئیں اُنہی بالوں میں یا تانت جو کمان میں استعمال ہوتی ہے اُس میں، بہر حال یہی اجزاء ذکر کئے گئے ہیں اُس جادُو کے، مشط، مشاطۃ، مُشاطۃ ان بالوں کو کہتے ہیں جو کنگھی کرنے سے گرتے ہیں، مِشط کنگھی کو کہتے ہیں، گیارہ گرہیں لگا کے جادو کر کے کھجور کا جو خوشہ ہوا کرتا ہے، نر کھجور کا خوشہ، اس کے اُوپر جو لفافہ ہوتا ہے پھل کے نکلتے وقت، خوشے کا وہ لفافہ لیا گیا، اور اس کے اندر اس کو بند کر کے ایک ویران کنواں، ''بیرِ ذَروان'' یا ''بیرِ ذِی اَروان'' دونوں قسم کے لفظ روایت میں آتے ہیں، اس کنویں کے اندر کوئی نیچے پتھر پڑا تھا، پتھر کے نیچے جا کے وہ دبا دیا گیا (بخاری)، جو طریقہ تھا اُس وقت میں اُن کے جادُو کرنے کا، تو حضور ﷺ پر جادُو کر کے وہاں دفن کر دیا۔

جادو کا اثر حضور ﷺ پر کس حد تک ہوا تھا؟

اُس کا اثر رسول اللہ ﷺ پر یہ پڑا کہ آپ ﷺ بدنی بیماری میں مبتلا ہو گئے، طبیعت گھٹی گھٹی سی رہتی، یادداشت متاثر ہو گئی، بایں معنی کہ ایک کام آپ ﷺ نے نہ کیا ہوتا تو آپ ﷺ کے خیال میں ہوتا کہ میں نے کر لیا ہے، اور ایک کام کیا ہوتا تو آپ ﷺ کو خیال ہوتا کہ شاید میں نے نہیں کیا، اِس طرح سے رسول اللہ ﷺ کے اُوپر کچھ اثر پڑ گیا تھا۔ عام طور پر شارحین اس واقعے کو یوں ہی نقل کرتے ہیں جادُو کی تفصیل کرتے ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ پر کیا اثر پڑ گیا تھا، لیکن یہ کسی روایت میں نہیں آتا کہ اُمورِ دینیہ میں حضور ﷺ کے کوئی خلل پڑا ہو، مثلاً نماز نہ پڑھی ہو اور خیال کر لیا ہو کہ پڑھ لی، یا نماز پڑھ لی ہو پھر خیال آ گیا ہو کہ نہیں پڑھی تو دوبارہ پڑھنے کے لئے متوجہ ہو جائیں، یا قرآنِ کریم کی کوئی سورت آپ بھول گئے ہوں، یا اس بیماری کے اثر سے کوئی اور اس قسم کی باتیں آپ ﷺ نے کرنی شروع کر دی ہوں جو دینی نقطۂ نظر سے غلط تھیں، ایسا کسی روایت میں کوئی اشارہ نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہ بدنی تکلیف کی حد تک یا دُنیوی اُمور کی حد تک رسول اللہ ﷺ کے اُوپر اَثر ہو گیا تھا، باقی! دینی اُمور، یا وحی جس کے تحفظ کا ذمہ اللہ نے لیا ہوا ہے، اس میں کوئی کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوا۔

جادُو والے واقعے پر منکرینِ حدیث کا اِعتراض اور اس کا جواب

اور یہ بات کہ نبی پر جادُو ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟ مفسرین رحمہم اللہ نے یہاں بھی اُٹھائی، قرآنِ کریم میں ایک آیت آتی

ہے کہ مشرکین مسلمانوں کو کہا کرتے تھے اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا(۱) تم پیروی نہیں کرتے مگر ایسے آدمی کی جس کے اُوپر جادُو ہو یا ہوا ہے، رَجلِ مسحور کی تم پیروی کرتے ہو، یہ مشرکین مسلمانوں سے کہتے تھے۔ اب یہ منکرین حدیث قسم کے لوگ جن کی عادت ہے کہ اپنے خیال کے مطابق ایک چیز تجویز کر کے جس چیز کو اُس کے خلاف دیکھتے ہیں تردید کرنا شروع کر دیتے ہیں، تو اس آیت کے ذریعے سے وہ اُن روایات کو رَدّ کرنا چاہتے ہیں جو ''صحیح مسلم'' اور ''صحیح بخاری'' کے اندر موجود ہیں، متفق علیہ روایات ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کے اُوپر جادو ہونے کی روایات صحیحین کے اندر موجود ہیں، اُن کو وہ رَدّ کرتے ہیں کہ دیکھو! قرآن تو کہتا ہے کہ مشرکین کہتے تھے نبی کو رَجلِ مسحور، اور کہتے تھے کہ تم رَجلِ مسحور کے پیچھے لگے ہوئے ہو، تو ان روایات کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو یہ روایات بھی نبی کو مسحور ثابت کرتی ہیں، تو جب یہ نبی کو مسحور ثابت کرتی ہیں تو پھر تو مشرکین کی بات سچی ہو گئی، لہٰذا یہ واقعات سارے کے سارے غلط ہیں، قرآنِ کریم کی آیت کے خلاف ہیں، نبی پر جادُو نہیں ہو سکتا۔ پھر اِس کو وہ دلیل بناتے ہیں کہ دیکھو حدیث شریف میں کیسی کیسی روایتیں آتی ہیں جو قرآنِ کریم کے خلاف ہیں، اس لئے حدیث کا اعتبار کوئی نہیں! اپنے طور پر ایک ذہنی خاکہ بنا لیتے ہیں اور اس کے اُوپر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس وقت اس کی مطابقت ان کے ذہن میں نہیں آتی تو حدیث شریف کو رَدّ کر دیتے ہیں اپنے فہم کے اعتبار سے، حالانکہ چودہ سو سال سے یہ واقعات احادیث کی کتابوں میں تمام اُمّت کے علماء پڑھتے آ رہے ہیں، پڑھاتے آ رہے ہیں، کبھی کسی کو اشکال نہیں ہوا کہ یہ حدیث قرآنِ کریم کی آیت کے متعارض ہے، اور جب یہ متعارض ہے تو ''بخاری'' کی روایت غلط ہے، ''مسلم'' کی روایت غلط ہے، حضور ﷺ پر جادُو بالکل نہیں ہوا، یہ روایتیں جھوٹی ہیں اور غلط ہیں، معلوم ہو گیا کہ ''بخاری، مسلم'' میں بھی اس قسم کی غلط روایتیں آ جاتی ہیں اور ذخیرۂ حدیث سے اعتماد اُٹھا دیا گیا۔ لیکن یہ بات اِن کی اپنی ذہنی اختراع ہے، ہمیں اس بارے میں کوئی کسی قسم کا اِشکال نہیں، مشرکین جو کہتے تھے، یہ مکہ کا واقعہ ہے، مشرکین کہتے تھے مسلمانوں کو کہ تم رَجلِ مسحور کے پیچھے لگ گئے ہو، تو اُس کا مطلب یہ تھا کہ مسحور بول کر وہ مجنون مراد لیتے تھے کہ یہ دیوانہ ہے، ہمارے معبودوں کی مخالفت کرتا ہے، اس لئے اِس کو کوئی تکلیف پہنچ گئی، جس طرح سے جادُو زدہ آدمی کی عقل خراب ہو جاتی ہے اس کی بھی عقل خراب ہو گئی، اور یہ جو توحید کی باتیں کرتا ہے اور ہمارے معبودوں کی مخالفت کرتا ہے یہ ایسے ہے جیسے دیوانے کی بڑ ہوتی ہے، اس کی یہ باتیں کوئی عقل کی نہیں ہیں، تو مضامینِ توحید کے اعتبار سے وہ کہتے تھے کہ اِس کی تو عقل ٹھکانے معلوم نہیں ہوتی جو اپنے آباء واجداد کے طریقے کے خلاف باتیں کرتا ہے اور آبائی دِین کو غلط قرار دیتا ہے اور ہمارے معبودوں کو اس طرح سے بُرا بھلا کہتا ہے، اور ہمارے دِین کو غلط قرار دیتا ہے، یہ کوئی عقل کی بات نہیں، ساری برادری سے ٹکر لے لی، سارے مُلک کی مخالفت کر لی، یہ ایک آدمی اس قسم کی باتیں کرتا ہے، یہ کون سی سمجھداری ہے کہ سب کو مخالف کر کے بیٹھ گیا، تو ایسے دیوانے کے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ تو وہ رَجلِ مسحور کہہ کے دیوانہ مراد لیتے تھے، اور دیوانہ کہتے تھے اِن مضامین کے بیان کے اعتبار سے جو انبیاء ﷸ توحید کے بارے میں بیان کیا کرتے ہیں، اور پچھلے انبیاء ﷸ کے واقعات جو قرآنِ کریم میں ذِکر کیے گئے

(۱) پارہ ۱۵ سورۂ اسراء آیت ۴۷۔ پارہ ۱۸ سورۂ فرقان آیت ۸۔

ہیں تو وہاں بھی بعض اُمتوں کا قول اپنے نبی کے بارے میں یہی نقل کیا گیا ہے، مُسَحَّرِيْنَ کا لفظ سورۂ شعراء (آیت ۱۸۵،۱۵۳) میں آیا تھا، کہ ایک اُمت (قومِ ثمود اور قومِ شعیب) نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ تو مُسَحَّرِيْنَ میں سے ہیں، تو مسحرین سے وہی مسحورین مراد ہے، تو وہاں دیوانگی مراد ہے اور وہ دیوانگی کہتے تھے اِن مضامین کے بیان کرنے کو جو کہ توحید پر مشتمل ہیں، لہٰذا اُن کا یہ قول غلط تھا، اُن مضامین کے اعتبار سے مکہ معظمہ میں رَدِّ شرک کے اعتبار سے حضور ﷺ کو مسحور قرار دینا یہ غلط تھا، اور آپ رَجلِ مسحور نہیں تھے، اور یہ بات اُن کی غلط ہے۔

نبی پر جادُو کا اثر ہو جانا قرآن سے ثابت ہے

باقی! یہ کہ جادو کے اثر سے کوئی بدنی تکلیف پہنچ جائے یہ کوئی نبوّت کے منافی نہیں ہے، آخر انبیاء علیہم السلام بھی انسان ہوتے ہیں، بشر ہوتے ہیں، تو بشر اور اِنسان جن حادثات سے متاثر ہوتا ہے ان حادثات سے انبیاء علیہم السلام متاثر ہو جاتے ہیں، خاص طور پر آپ جادو کا واقعہ ہی دیکھنا چاہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بڑا طویل قرآنِ کریم میں آیا ہے، جس وقت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جادوگر آئے تھے (واقعہ آپ کے سامنے مفصل گزر چکا، اُس کی تفصیل اِس وقت ذِکر کرنا مقصود نہیں ہے) مقابلے میں آ کے انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رَسیاں پھینکی تھیں، یہ ایک جادو تھا، رَسیاں اور لاٹھیاں پھینکنے کے بعد وہ سانپ کی شکل میں نظر آئیں، لوگوں کو بھی نظر آئیں، لوگوں نے دیکھا، اور موسیٰ علیہ السلام پر بھی ان کے جادُو کا اثر پڑا، موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں پر بھی ان کے جادُو کا اثر آیا يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعٰى (سورۂ طٰہٰ:۶۶) موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ان کے جادُو کے زور سے یہ بات ڈال دی گئی کہ یہ تو سب بھاگی پھر رہی ہیں، چاہے وقتی طور پر ہی صحیح، جادُوگروں کے جادُو کا اثر موسیٰ علیہ السلام پر بھی ہوا، قرآنِ کریم کے اندر خود مذکور ہے، اسی لئے تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ خوف محسوس کیا دِل میں کہ اب میں لاٹھی پھینکوں گا وہ بھی تو سانپ ہی بنے گا، تو لوگ فرق کس طرح سے کریں گے؟ وہ کہیں گے جادُوگروں نے بھی سانپ بنا دیا، موسیٰ علیہ السلام نے بھی سانپ بنا دیا، موسیٰ علیہ السلام نے صرف لاٹھی کا سانپ بنایا اور جادُوگروں نے لاٹھیوں اور رَسیوں دونوں کے بنا دیے، تو اس سے عوام سمجھ جائیں گے کہ غلبہ جادُوگروں کو ہو گیا، یہ پریشانی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئی جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ خوف کرنے کی بات نہیں، جو تیرے ہاتھ میں ہے ڈال دے، یہ سب نگل جائے گا جو کچھ سامنے ہے، خیر! واقعے کی تفصیل آپ کے سامنے آ چکی، بہرحال وہاں سے اتنا اشارہ تو نکلتا ہے کہ جادُوگروں نے جو تصرف کیا تھا تو جس طرح سے باقی لوگوں کی چشم بندی کر دی تھی اور ان کی آنکھوں پر اور قوتِ خیالیہ کے اُوپر اَثر ڈال دیا تھا، اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں پر اور آپ کی قوتِ خیالیہ پر بھی جادوگروں نے اثر ڈال دیا تھا، تو جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ نبی پر بھی جادُو اور تعویذ گنڈے کا اِس قسم کا اَثر ہو سکتا ہے کہ اُس کو کوئی کسی قسم کی تکلیف پہنچ جائے یا اس کی قوتِ خیالیہ متاثر ہو جائے، ایسا ہو سکتا ہے، موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کے اندر اس کا ثبوت موجود ہے۔

اور یہاں بھی روایات میں جو تفصیل ذِکر کی گئی اُس تفصیل کے تحت بھی یہی بات آتی ہے کہ حضور ﷺ پر اتنا سا اثر رہ گیا تھا کہ طبیعت گھٹی گھٹی رہتی تھی، بندی رہتی ہے، اور قوتِ خیالیہ اتنی سی متاثر ہو گئی کہ آپ ﷺ نے جو کام کیا ہوتا وہ یادداشت میں نہ

رہتا، معلوم ہوتا کہ نہیں کیا، یا نہیں کیا ہوتا تھا تو خیال ہوتا کہ کرلیا، اس قسم کا کچھ اثر آپ ﷺ کے دماغ پر ہوگیا تھا جس سے کچھ حواس متأثر ہوگئے، تو یہ بات شانِ نبوّت کے منافی نہیں۔ باقی! جہاں تک اُمورِ دینیہ کا تعلق ہے، وحی کا تعلق ہے، یا حضور ﷺ کے اَعمالِ شرعیہ کا تعلق ہے، یا اَقوالِ شرعیہ کا تعلق ہے، کسی روایت میں کوئی اشارہ نہیں آتا کہ حضور ﷺ کے اِن کاموں کے اندر خلل پڑا ہو، کیونکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفظ ہے، تکفل ہے، اس میں خلل نہیں آسکتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دشمن حسی طور پر کوئی تکلیف پہنچادے، اب ایک مشرک نے پتھر مارا اور آپ ﷺ کا دانت ٹوٹ گیا، ہونٹ زخمی ہوگیا، تو یہ بھی تو ایک مشرک کا تصرف تھا جس سے حضور ﷺ کو تکلیف پہنچی۔

آزادفکر کے حامل شخص کا ایک اور اِعتراض اور اس کا جواب

ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا، کہنے لگا کہ اُدھر تو آپ لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت تھے، میں نے کہا کہ بالکل کہتے ہیں، اور واقعہ ہے کہ سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ وہ کہتا ہے: اُدھر یہ بھی کہتے ہو کہ اُحد میں کسی مشرک نے پتھر مارا تھا اور آپ ﷺ کا دانت ٹوٹ گیا اور ہونٹ زخمی ہوگئے، تو ہونٹ زخمی ہونا اور دانت ٹوٹنا یہ تو ایک عیب ہے، تو یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ ایک نبی کو عیب لگ جائے؟ جس وقت لوگ آزادرَوِی سے سوچتے ہیں تو اس وقت ایسے ہی واہیات قسم کے شبہات اور بیہودہ قسم کے وسوسے دِل میں آتے ہیں، جب وہ کوئی صحیح تربیت حاصل نہیں کرتے، صحیح طریقے سے علم حاصل نہیں کرتے، اپنے طور پر مقدمے جوڑ جوڑ کے نتیجے نکالتے رہتے ہیں۔ تو یہ بھی شیطان کے انہی وَساوِس میں داخل ہے جن کے ساتھ وہ انسان کا عقیدہ خراب کرتا ہے، جس کا ذِکر اگلی سورت میں آرہا ہے۔ کہتا ہے: دانت کا ٹوٹ جانا اور زخم کا لگ جانا یہ تو ایک عیب ہے، تو یہ عیب نبی میں کس طرح سے لگ گیا؟ گویا کہ وہ اپنی عقل کے تحت اس بات کو لے کر کہ حضور ﷺ تو بہت حسین تھے، ان روایات کو رَدّ کرنا چاہتا تھا جن میں ذِکر آیا کہ مشرک کے پتھر لگنے کے ساتھ حضور ﷺ کا ہونٹ زخمی ہوگیا تھا اور دانت ٹوٹ گیا تھا، کہ اگر نبی سب سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اور اس میں کوئی کسی قسم کا عیب نہیں، تو یہ دانت کا ٹوٹنا اور ہونٹ کا زخمی ہونا یہ سب روایتیں من گھڑت ہیں، یہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہوسکتیں۔ میں نے کہا کہ بھائی! بات اصل میں یہ ہے کہ حُسن اور خوبصورتی وہ ہوتی ہے جو خلقی ہو، تناسبِ اعضا، اور باقی اللہ کے دِین کا کام کرتے ہوئے جہاد میں تو اگر کوئی جہاد کا نشان پڑتا ہے تو اصل کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک اس سے حُسن میں اضافہ ہوتا ہے، اس سے حُسن میں خلل نہیں آتا، بدن کے اُوپر جہاد کا یا کسی فرض کی ادائیگی کا نشان نہ ہونا یہ عیب ہے، اور اگر کوئی شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہوا ٹکڑے ٹکڑے بھی ہوجائے یہ عیب نہیں یہ خوبی ہے، اور واقعۃً روایات کی روشنی میں یہی مطلب ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دو نشان بہت پسند ہیں، ایک وہ نشان جو جہاد میں لگے اور ایک وہ نشان جو اللہ کا کوئی فرض ادا کرتے ہوئے انسان کے بدن پر پڑ جائے۔[1] جس کی شارحین مثال دیتے ہیں کہ سردیوں میں وضو کرنے کی بنا پر ہاتھ پاؤں پھٹ گئے، نماز پڑھنے کی بنا پر گھٹنوں پر اور پاؤں پر نشان پڑ گئے، پیشانی پر بسااوقات نشان

(۱) ترمذی ۱/ ۲۹۶، ابواب الجہاد سے کچھ پہلے/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۳۳، کتاب الجہاد، فصل ثانی کا تقریباً آخر۔

پڑ جاتا ہے نماز پڑھتے ہوئے، اسی طرح سے اللہ کا کوئی فرض ادا کرتے ہوئے انسان کے بدن کے اُوپر جو نشان پڑتا ہے، یہ نشان اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ محبوب ہے، اور جہاد کرتے ہوئے کوئی زخم کا نشان پڑ جائے یہ بہت ہی زیادہ محبوب ہے، تو اس قسم کے نشان خوبی میں داخل ہیں، یہ عیب میں داخل نہیں ہیں۔ اور جو شخص ایسے طور پر اللہ کی طرف جائے گا کہ اس کے بدن کے اُوپر اللہ کی عبادت کرتے ہوئے یا اللہ کا فرض ادا کرتے ہوئے کوئی نشان نہیں ہے تو آخرت میں یہ ایک عیب سمجھا جائے گا، روایات کے اندر صراحتاً یہ بات مذکور ہے (حوالہ مذکورہ)۔ اس لئے جہاد میں زخمی ہو جانا یا چہرے کے اُوپر زخم کا آ جانا، ہم اس کو خوبی سمجھتے ہیں، ہم اس کو عیب نہیں سمجھتے۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے دین کے لئے جہاد کرتے ہوئے زخمی ہوں اور اسی طرح سے کوئی نشان پڑ جائے تو یہ عیوب میں نہیں آتا۔ تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے طور پر ضابطے بناتے ہیں ذہنی طور پر، اور اُن ضابطوں کے اُوپر جب روایات کو وہ منطبق نہیں پاتے تو یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے ضابطے غلط ہیں، جو کچھ ہم نے ذہنی طور پر سوچا وہ بات غلط ہے، اُلٹا روایات پہ اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ یہ روایات غلط ہیں، گویا کہ ان کا ذہن تو بہر حال صحیح، اور قرآنِ کریم کی وہ آیت اور حدیث کی وہ روایت جو اِن کے ذہن کے مطابق نہ ہو وہ غلط، یوں کر کے یہ لوگ دُوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اسی طرح سے یہ جادُو کا قصہ ہے، تو جس طرح نبی ظاہری طور پر دُشمن کی کارروائی کے ساتھ ظاہری طور پر متاثر ہو سکتا ہے تو جادو ٹو نا ٹو ٹکا اس قسم کی بات کا اثر بھی اگر نبی کے اُوپر پڑ جائے تو یہ شانِ نبوّت کے منافی نہیں، انسان ہونے کی حیثیت سے بشر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کے اثرات نبی کے اُوپر آ سکتے ہیں۔

حضرت کشمیریؒ کی تحقیق

اور حضرت سیدنا شیخنا الانور رحمۃ اللہ علیہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر دارالعلوم دیوبند، ''بخاری'' پڑھایا کرتے تھے، تو اِن روایات پر انہوں نے کافی طویل کلام کی ہے، اور ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ روایات کی طرف دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر جو جادُو کیا گیا تھا وہ جادُو اِس قسم کا تھا جس کو ہمارے ہاں مَرد کو باندھنا کہتے ہیں کہ مَرد کو باندھ دیا، مَرد کو باندھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جادُو کی ایک قسم ایسی ہے کہ وہ جادُو جب لوگ کر دیتے ہیں تو مَرد کے اُوپر بندش لگ جاتی ہے، وہ بیویوں کے کام کا نہیں رہتا، اور کہتے ہیں کہ آج بھی یہ جادُو مروّج ہے، لوگ ایک دُوسرے پہ کر دیتے ہیں، اور کتابوں کے اندر اس کا حل بھی لکھا ہوا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر گھٹن جو طاری ہوئی تھی وہ اس معاملے میں تھی، بیوی کی طرف رغبت ہوتی لیکن اپنے آپ کو قادر نہ پاتے، اور عین موقع پر جا کے اس طرح سے احساس ہو جاتا جیسے کہ طبیعت سرد ہوگئی، یہ تھا حقیقت کے اعتبار سے جادُو کا اثر سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق، انہوں نے روایات میں یہ قرائن بیان کئے ہیں،[1] کیونکہ سب روایتوں میں الفاظ کچھ مختلف قسم کے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اثرات کیا واقع ہو گئے تھے۔ بہر حال اثر متفق علیہ ہے کہ اثر ہو گیا

---

(۱) فیض الباری ۶/۶۷، کتاب الطب، باب هل یستخرج السحر. والتحقیق مما قلنا ان الحدیث صحیح، وانه یتعلق بأمور النساء خاصة، ولا یمس غیر هذا الباب

تھا، کہ جس کی بنا پر کوئی بدنی تکلیف سی ہوگئی تھی، چاہے وہ بدنی تکلیف اس حد تک ہو کہ طبیعت میں گھٹن رہتی تھی، یادداشت متاثر ہوگئی تھی، یا وہ بدنی تکلیف اس درجے کی ہو کہ آپ پر یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بیویوں کی طرف آپ ﷺ کی رغبت ہوتی لیکن بعد میں طبیعت سردسی ہوجاتی اور اپنے آپ کو اس معاملے میں قادر نہ پاتے، سیّد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''فیض الباری'' کے اندر طویل کلام کے بعد اس بات کو ثابت کیا ہے کہ وہ جادُو اس قسم کا تھا، اور آج بھی یہ مروّج ہے، لوگ ایک دُوسرے پہ کردیتے ہیں، اور پھر تفاسیر کے اندر اور شروح میں اس کے علاج بھی لکھے ہوئے ہیں۔ بہر حال! اس کی تفصیل تو مقصود نہیں، عرض یہ ہے کہ جادُو اس قسم کا ہوگیا تھا۔

سَرورِ کائنات ﷺ سے جادُو کے اثرات کیسے ختم ہوئے؟

تو آپ ﷺ اس سلسلے میں پریشان تھے، ایک دِن آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری بیماری کے بارے میں تفصیل بتادی، کہ میں لیٹا ہوا تھا، دو فرشتے آئے، ایک میرے پاؤں کی طرف کھڑا ہوگیا، دُوسرا میرے سَر کی طرف کھڑا ہوگیا، ایک دُوسرے سے پوچھتا ہے: مَا وَجَعُ الرَّجُلِ؟ اِس آدمی کو کیا تکلیف ہے؟ دُوسرے نے کہا: مَطْبُوبٌ! اِس پر کسی نے جادُو کیا ہوا ہے، اُس نے سوال کیا کہ کس نے کیا ہے؟ دُوسرے نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے، اُس نے پوچھا کہ کس چیز میں کیا ہے؟ دُوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی میں، اور کنگھی سے گرے ہوئے بالوں میں، اور نر کھجور کے خوشے کے اُوپر والے لفافے میں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ یہ کہاں دفن کیا ہوا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بئرِ ذروان میں۔ یہ بنوزُریق کا کنواں تھا، ویران سا پڑا ہوا، جو آباد نہیں تھا، ''بئرِ ذروان'' بھی آتا ہے، اور ''ذی اَروان'' بھی نام آتا ہے، تو اس کنویں کو کشف کی حالت میں حضور ﷺ کو دِکھا دیا گیا کہ یہ کنواں ہے، اور یہ اس کی حالت ہے، یہ کیفیت ہے۔ تو حضور ﷺ اُٹھے، اور صحابہ کی جماعت کو ساتھ لیا، اور اس کنویں پر پہنچ گئے۔ جب اس کنویں پر پہنچے ہیں، تو جا کے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کنواں ہے جو مجھے دِکھایا گیا ہے، وہاں جو کھجور کے درخت کھڑے تھے انتہائی درجے کے بدنما، گلے ہوئے سڑے ہوئے، حدیث شریف میں لفظ آتے ہیں ''وَلَكَأَنَّ نَخْلَهَا رُءُوسُ الشَّيَاطِيْنِ'' (بخاری) وہ درخت ایسے تھے گویا کہ وہ سانپوں کے پھن ہیں، یعنی ایسے بدنما تھے جس طرح سے سانپ کے پھن کو دیکھ کر ہیبت آتی ہے تو وہ ایسے بدنما تھے۔ ایک آدمی کنویں میں اُترا اور چٹان کے نیچے سے یہ جادُو کی پوٹلی نکالی گئی، نکالنے کے بعد اس کو کھول دیا گیا، اور اُس میں گیارہ گرہیں تھیں، اور ان دونوں سورتوں کی گیارہ آیتیں ہیں، جبریل علیہ السلام یہ سورتیں لے کر آئے، اور یہ آیتیں پڑھی گئیں، ساتھ ساتھ وہ گرہیں کھولی گئیں، تو حضور ﷺ پر سے جادُو کا اثر زائل ہوگیا (آلوسی)۔ اور وہاں لفظ یہ آتے ہیں: ''كَأَنَّمَا أُنْشِطَ مِنْ عِقَالٍ'' کہ رسول اللہ ﷺ ایسے ہوگئے گویا کہ آپ کی رَسّی کھول دی گئی (ابوداؤد، وفی البخاری: نُشِطَ)۔ عِقَال کہتے ہیں گھٹنے کے اُوپر جو رَسّی ڈالی ہوئی ہوتی ہے، یہ اُونٹ وغیرہ کو جو باندھتے ہیں تو گھٹنا بندھا ہوا ہو تو اُونٹ اُٹھ نہیں سکتا، اس کے اُوپر پابندی لگی ہوئی ہوتی ہے، اور جب وہ رَسّی کھول دی جاتی ہے تو اُونٹ ہوشیار ہوجاتا ہے اور اُٹھ جاتا ہے، تو نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے اُونٹ کی رَسّی کھل جانے کے بعد اُونٹ اپنی بندش چھوٹ جانے سے کچھ ہوشیار سا

ہوجاتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ کے بدن سے بھی اسی طرح سے بندش کھل گئی، گویا کہ آپ رسّی میں کسے ہوئے تھے اور ان کے کھول دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے وہ بندش اُٹھ گئی۔ اور جادُو کے متعلق یہ لکھا ہے کہ جس کیفیت کے ساتھ یہ کیا گیا ہو، اُس کی اس ہیئت کذائی کو اگر کھول دیا جائے اور دُور کر دیا جائے تو جادُو کے اثرات ختم ہوجاتے ہیں، کسی چیز میں وہ کیا گیا ہے تو اس کو منتشر کر دو، اس کی ہیئت کذائی کو ختم کر دو، تو ایسی صورت میں اس کے اثرات ختم ہوجاتے ہیں، تو یہ سورتیں جو اُتریں تو اِن کے ساتھ دَم بھی کیا گیا، اور وہ گرہیں بھی کھولی گئیں تو رسول اللہ ﷺ سے وہ اثرات ختم ہوگئے۔

معوّذتین ''مکی'' ہیں یا ''مدنی''؟

جب شانِ نزول کے اندر یہ واقعہ بیان کیا جائے گا تو یہ دلیل ہے اِس بات کی کہ یہ سورتیں مدینہ منورہ میں اُتریں، اس لئے میں نے تطبیق آپ کی خدمت میں عرض کی کہ ہوسکتا ہے کہ مشرکین کے شر سے بچنے کے لئے مکہ معظمہ میں بھی اللہ نے یہ تلقین کی ہو، اور مدینہ منورہ میں جب یہود کی طرف سے اس قسم کی تکلیفیں پہنچنی شروع ہوئیں تو اس وقت پھر جبریل علیہ السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں کی یاددہانی کروائی، اس لئے بعض لوگوں نے اِن کو مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی قرار دیا کہ نزلت فی کذا، اس واقعے میں اُتری ہیں، اور بعض لوگوں نے اِن کو ''مکی'' قرار دیا کہ مکہ معظمہ میں مشرکین کے شر سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں سورتیں القاء کی تھیں، تلقین کی تھیں، جبریل علیہ السلام کی وساطت سے پہنچائی تھیں۔ تو دونوں باتیں صحیح ہوسکتی ہیں کہ ان کو ''مکیہ'' بھی کہا جائے اور ''مدنیہ'' بھی کہا جائے، چونکہ پہلے مکہ میں نازل ہوئیں اس لئے مصاحف کے اُوپر ان کو ''مکیہ'' قرار دیا گیا ہے، اور بعض مصاحف میں غالباً ان کے اُوپر ''مدنیہ'' بھی لکھا ہوا ہوگا، مفسرین رحمہم اللہ کی کلام سے تو یونہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں، یہ دونوں باتوں میں میں نے آپ کے سامنے تطبیق دے دی۔

معوّذات کے پڑھنے پر حضور ﷺ کا اَخیر زِندگی تک اِہتمام

تو سرورِ کائنات ﷺ اس کے بعد ان دونوں سورتوں کے ساتھ ہمیشہ اِستعاذہ کرتے تھے، عادتِ شریفہ تھی، رات کو سوتے وقت قُلْ هُوَ اللّٰهُ سمیت، قُلْ هُوَ اللّٰهُ کو بھی ساتھ شامل کر کے، کیونکہ یہاں ان کو معوّذات کہا جاتا ہے، معوّذات جمع کا صیغہ ہے اور یہ سورتیں دو ہیں، یا تو قُلْ هُوَ اللّٰهُ کو شامل کرلیا جائے تو تین ہوگئیں، یا آیات کے اعتبار سے اِن کو معوّذات کہا جاتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کے عمل میں یہ تینوں سورتیں ہیں، سونے سے قبل آپ ﷺ تینوں سورتوں کو پڑھتے تھے، پڑھ کے اپنے آپ کو دَم کیا کرتے تھے، ایک دفعہ تینوں سورتیں پڑھ لیں، ہاتھ پر دَم کیا، بدن کے اُوپر پھیرلیا، اور پھر تینوں پڑھ لیں پھر دَم کیا اور بدن پر جہاں جہاں ہاتھ پہنچتا ہے سارے بدن پہ پھیرلیا، پھر اسی طرح سے یہ تین پڑھ لیں ہاتھوں پہ دَم کیا اور سارے بدن پہ پھیرلیا۔ اس طرح سے اگر اِنسان رات کو اپنے اُوپر دَم کر کے سوجائے تو یہ جادُو ٹونا ٹوٹکا اور اس قسم کی حاسدانہ کارروائیاں جو بھی لوگ کرتے ہیں، شیاطین الانس والجن نقصان پہنچانے کے لئے جو بھی کارروائیاں کیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن سب سے تحفظ دیتا ہے، تو حضور ﷺ اِن سورتوں کے نازل ہونے کے بعد پابندی کے ساتھ ان سورتوں سے اپنے آپ کو دَم کیا کرتے تھے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

فرماتی ہیں کہ مرضِ وفات میں جب رسول اللہ ﷺ بالکل کمزور ہو گئے، نہ تو آپ ﷺ کو زبان سے کچھ پڑھنے پہ قدرت تھی، آخر وقت میں جا کے اتنا ضعف ہو گیا تھا، اور نہ آپ ﷺ اپنے ہاتھوں کو حرکت دے کر اپنے بدن کے اُوپر ہاتھ پھیر سکتے تھے، جب یہ کیفیت ہو گئی تھی تو میں یہ معوّذات پڑھا کرتی تھی، پڑھ کے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں پہ میں دَم کر دیتی، اور پھر آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کے میں خود ہی آپ کے بدن پر پھیر دیتی، یعنی پڑھتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں، اور ہاتھ حضور ﷺ کا استعمال کرتی تھیں بطور برکت کے۔[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخر تک سرورِ کائنات ﷺ نے اِستعاذہ کے لئے اِنہی سورتوں کو اِستعمال کیا ہے۔

معوّذتین کے ساتھ بچھو کے کاٹنے کا علاج

اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ کو بچھو نے کاٹ لیا، ''مشکوٰۃ شریف'' میں روایت ہے، آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، جب ہاتھ نیچے رکھا سجدے کے لئے گئے تو ہاتھ پر بچھو نے کاٹ لیا، تو حضور ﷺ نے جلدی سے جُوتا اُٹھا کے اس کو مار بھی دیا، لیکن بچھو کی تکلیف تو آپ کو معلوم ہی ہے جیسے ہوا کرتی ہے، تو نبی بھی آخر انسان ہوتا ہے، بشر ہوتا ہے، جن چیزوں سے عام انسان بشر متاثر ہوتے ہیں نبی بھی متاثر ہوتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ کو بھی تکلیف ہوئی، جب تکلیف ہوئی تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا جس میں نمک ڈالا گیا، نمکین پانی، تو آپ ﷺ اس طرح سے اس پانی کو اُوپر بھی ڈالتے تھے جیسے ٹکور کی جاتی ہے، پانی ڈالتے جاتے تھے اور معوّذتین پڑھ کے اُنگلی کے اُوپر دَم بھی کر رہے تھے، اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''لَعَنَ اللهُ الْعَقْرَبَ مَاتَدَعُ نَبِيًّا وَلَا غَيْرَهٗ'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''مَاتَدَعُ مُصَلِّيًا وَلَا غَيْرَهٗ'' اللہ تعالیٰ اِس بچھو کے اُوپر لعنت کرے! نہ یہ نبی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نبی کو، نہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نمازی کو، کوئی ہو جو اس کی زد میں آ جاتا ہے یہ ڈنگ مار ہی دیتا ہے۔[2] تو وہاں بھی معوّذتین کے ساتھ دَم کرنے کا ذِکر ہے کہ معوّذتین پڑھ کے آپ اپنی اُنگلی کے اُوپر دَم کر رہے تھے اور اسی طرح سے نمکین پانی بھی ڈالتے جا رہے تھے۔ اور عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی تلقین کی ان کے پڑھنے کے لئے۔

چاروں ''قُلْ'' پڑھنے کی اہمیت

اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے متعلق میں نے پہلے ذِکر کر دیا تھا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ نے یہ بھی کہا تھا کہ رات کو سوتے وقت قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ کے سویا کرو۔[3] اس لئے ہمارے مشائخ میں یہ مروّج ہے کہ وہ ان تین کے ساتھ اُس روایت پر عمل کرنے کے لئے جس میں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کا ذِکر آیا ہوا ہے، اُس کو بھی ساتھ شامل کر لیتے ہیں، اور چاروں قل پڑھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں، کہ رات کو چاروں قل پڑھ کے اسی طرح سے دَم کر کے انسان سوئے، تو اللہ تعالیٰ مختلف قسم کے شرور سے حفاظت فرماتے ہیں، صبح بھی پڑھ لی جائیں، شام بھی پڑھ لی جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے، جہاں اور

---

(۱) بخاری ۲/ ۷۵۰، باب فضل المعوذات. مشکوٰۃ ۱/ ۱۳۴، باب عیادۃ المریض، فصل اوّل۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۶، کتاب فضائل القرآن، فصل اوّل کا آخر۔

(۲) شعب الایمان ۴/ ۱۶۹۔ رقم ۲۳۴۱۔ نیز مشکوٰۃ ۲/ ۳۹۰، کتاب الطب، فصل ثالث۔

(۳) ترمذی ۲/ ۱۷۷، کتاب الدعوات. باب فیمن یقرأ القرآن عند منامہ سے اگلا باب/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۸، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی کا آخر۔

تعویذ گنڈے کیے جاتے ہیں ان سب سے اعلیٰ اور سُنّت کے مطابق جس میں کسی قسم کا اشکال نہیں ہے، اِن سورتوں کے ساتھ تعوّذ کرنا ہے۔ اور اس سے پہلے حضور ﷺ مختلف دُعائیں پڑھا کرتے تھے، لیکن جس وقت یہ دونوں سورتیں اُتر آئی ہیں تو پھر رسول اللہ ﷺ نے باقی سب وظیفے چھوڑ دیے تھے،[1] صرف یہی استعمال فرماتے تھے، آپ ﷺ کے عمل میں یہ چیز موجود ہے۔

تو شانِ نزول کی تفصیل آپ کے سامنے آگئی جس سے معلوم ہوگیا کہ اگر اِن کو ''مکیہ'' قرار دیا جائے تو پھر وجہ وہ ہے، اور ''مدنیہ'' قرار دیا جائے تو اس کی وجہ یہ ہے۔ اب آگے دیکھئے اِن کے مضامین......!۔

سورۂ فلق کے مضامین

معوّذتین میں بیان کردہ چیزیں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ یوں کہیے، اللہ کے کہنے کے تحت یہ چیز ادا کی جا رہی ہے۔ پہلی سورت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے رَبِّ فلق کو ذِکر کیا گیا ہے، اور آگے چار چیزیں ذِکر کی گئیں جن کے شر سے حفاظت مطلوب ہے، مَاخَلَقَ کا شر، غاسق کا شر، نفاثات کا شر، اور حاسد کا شر۔ ایک صفت ذِکر کی گئی اور چار شرور سے حفاظت چاہی گئی۔ اور اگلی سورت میں اللہ کی تین صفتیں ذِکر کی گئیں رَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ یہ تین صفتیں آ گئیں، انسانوں کا رَبّ، انسانوں کا بادشاہ، اور انسانوں کا معبود، اور جس شر سے حفاظت طلب کی گئی ہے وہ صرف ایک ہے وَسواس خنّاس کا شر، وسوسے ڈالنے والے خنّاس کے شر سے حفاظت طلب کی گئی اور اللہ کی صفتیں تین ذِکر کی گئیں۔ جس وقت آپ ان دونوں سورتوں میں غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پہلی سورت میں جن شرور سے حفاظت طلب کی گئی ہے وہ اکثر و بیشتر بدنی ہیں اور اِس دُنیوی زندگی میں پیش آنے والی تکلیفیں ہیں۔

بعض چیزیں فطرت کے لحاظ سے موذی ہیں

مَاخَلَقَ یہ عام ہوگیا ایسی چیزیں جن کی فطرت میں اور جن کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے شر رکھا ہے، جو کسی عداوت یا بغض کی بنا پر نہیں، اپنی طبیعت کے مقتضا سے جو تکلیف پہنچاتی ہیں، مَاخَلَقَ سے وہ چیزیں مراد ہو جائیں گی، اُن کے شر سے حفاظت، جس طرح سے سانپ، بچھو، شیاطین یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے موذی ہیں، تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کے اندر خیر نہیں، شر ہی شر ہے، تو ان سے تحفظ ہو جائے گا، مَاخَلَقَ عام ہوگیا، اس سے مراد ہو جائیں گے وہ موذیات جو اپنی طبعی خاصیت کے طور پر اِنسان کو تکلیف پہنچاتے ہیں، جیسے فارسی میں ایک شعر آتا ہے کہ:

نیشِ کژدم نہ از کین است　　　　مقتضائے طبیعت لعین است

کہ بچھو جو ڈنگ مارا کرتا ہے، کسی دُشمنی کی بنا پر نہیں، اُس ملعون کی طبیعت کا تقاضا یہی ہے۔ تو بعضی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی

---

(۱) ترمذی ۲۶/۲ باب ما جاء فی الرقیہ بالمعوذتین۔ مشکوٰۃ ۳۹۰/۲، کتاب الطب فصل ثانی کا آخر۔

طبعی طور پر خاصیت ہے کہ وہ تکلیف پہنچاتی ہیں، چاہے کوئی عداوت اور دُشمنی نہیں ہوا کرتی، اپنے طبعی تقاضے سے تکلیف پہنچایا کرتی ہیں۔ اِس کو واضح کرنے کے لئے عام طور ایک واقعہ بطور لطیفہ کے مشہور ہے..... معنوی چیز کو سمجھانے کے لئے لفظوں میں ایک مثال کے طور پر تعبیر یہ ہمیشہ سے دُنیا میں بیان کا ایک حصہ آیا ہے، تو اسی طرح سے اس فطری تکلیف دینے والی چیزوں کی مثال کے طور پر یہ بات ذِکر کی جاتی ہے..... کہ ایک بچھو نہر کے کنارے پر پہنچا، وہ نہر کو عبور کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ پانی کی بہتات کو دیکھ کر ڈر گیا کہ اگر میں اس پانی میں اُترا تو پانی مجھے بہا کے لے جائے گا، اتنے میں ایک کچھوے نے اسے دیکھ لیا کہ یہ بچھو کنارے پہ پریشان کھڑا ہے، تو کچھوا گیا، جاکے پوچھا: کیا بات ہے میاں بچھو! پریشان کیوں ہو؟ وہ کہنے لگا: میں نہر عبور کرنا چاہتا ہوں لیکن پانی بہت زیادہ ہے، اگر میں نیچے اُتر گیا تو مجھے بہا کے لے جائے گی۔ وہ کہنے لگا: اس میں فکر کی کون سی بات ہے؟ میری کمر پہ چڑھ جاؤ، میں تمہیں دُوسرے کنارے چھوڑ آتا ہوں! یہ کتنا بڑا اِحسان تھا جو کچھوا بچھو پر کر رہا ہے، تو بچھو اس کی کمر پر بیٹھ گیا اور کچھوے نے تیرنا شروع کیا، جب وہ نہر کے وسط میں گیا تو کچھوے کو محسوس ہوا جیسے اس کی کمر کے اُوپر کوئی چیز رگڑی جارہی ہے، تو کچھوا پوچھتا ہے کہ میاں بچھو! یہ کیا ہے؟ وہ جب ڈنگ لگاتا ہے، سُوئی لگانے کی کوشش کی، تو کچھوا تو پتھر جیسا سخت ہوتا ہے، اس میں اس کی سُوئی کیسے جائے؟ تو اس کو رگڑ محسوس ہوئی۔ تو بچھو کہتا ہے کہ کچھوا صاحب! مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، لیکن میں عادت سے مجبور ہوں، عادت تو پوری کرنی ہے، تو عادت کی مجبوری ہے ڈنگ مارنا، ورنہ اُس کو یقین ہے کہ کوئی نقصان تو پہنچایا نہیں جاسکتا۔ اس مثال کے ساتھ یہ بات واضح کی گئی کہ بسا اوقات بعض چیزیں محض عادت پوری کرنے کے لئے تکلیف پہنچاتی ہیں، اگرچہ اُن کو یقین ہو کہ جس کو تکلیف پہنچانے کی ہم کوشش کر رہے ہیں اس کو تکلیف پہنچے گی نہیں، لیکن ان کی فطرت کا تقاضا ہوتا ہے کہ کوشش کریں تکلیف پہنچانے کی۔ تو مَا خَلَقَ میں ایسی چیزیں آجائیں گی جن کی فطرت میں اور جن کی طبیعت میں اِیذا رسانی رکھی گئی ہے، اُن کے شر سے حفاظت ہو گئی۔

دُنیا میں اکثر و بیشتر شرور رات کی تاریکی میں پھیلتے ہیں

اور آگے غَاسِق: تاریک چیز، اِس سے اگر رات مراد لے لی جائے یا چاند جب گہن لگ جائے وہ مراد لے لیا جائے، تو تاریکی جب پھیلتی ہے، خوب اچھی طرح سے جمع ہو جاتی ہے، سمٹ جاتی ہے، پھیلنا سمٹنا ان دونوں سے گہرائی کی طرف اشارہ ہے، تو اکثر و بیشتر شرور جو دُنیا کے اندر پھیلتے ہیں وہ رات کی تاریکی میں پھیلتے ہیں۔ معلوم نہیں آپ حضرات کو کبھی واسطہ پڑا ہے یا نہیں پڑا؟ یہ وظیفے کرنے والے، گنڈے تعویذ، جادُو کرنے والے یہ بھی اپنا عمل رات کو کرتے ہیں، رات کی تاریکی میں، کیونکہ دِن کی روشنی میں ان کے اثرات کم ہوتے ہیں، رات کی تاریکی میں زیادہ ہوتے ہیں۔ چور، اُچکے، ڈاکو، اکثر و بیشتر رات کو پھیلتے ہیں۔ اور موذی قسم کے جِنّ رات کو پھیلتے ہیں، حشرات الارض سانپ وغیرہ درندے جتنے ہیں وہ سب رات کو پھیلتے ہیں، اور ان کی طرف سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رات کو زیادہ ہوتا ہے، فصلیں رات کو اُجاڑتے ہیں، دِن کو چھپے رہتے ہیں، اور اسی طرح سے باقی واقعات

بھی اکثر و بیشتر رات کو پیش آتے ہیں، تو اس لئے ''غاسق'' کی طرف ''شر'' کی نسبت کی گئی کہ ان سب تکلیفوں سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، رات کی تاریکی جس وقت عام ہوجاتی ہے تو اس وقت بھی اکثر و بیشتر شرور پھیلتے ہیں۔

اور تیسرے نمبر پر النّٰفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ آ گیا، گرہوں میں پھونکیں مارنے والے نفوس، مذکر ہوں یا مؤنث دونوں کو یہ لفظ شامل ہوجائے گا، اور واقعے کے لحاظ سے چونکہ پھونکیں مارنے والی عورتیں تھیں، لبید بن اعصم کی لڑکیاں، ان کو بھی یہ لفظ شامل ہوجائے گا۔ اِن کے شر سے اُس واقعے کی خصوصیت کے لحاظ سے پناہ مانگی گئی، کہ یوں کوئی جادُو کرے، ٹونا کرے، دَم کرکے، پھونک مار کے ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کرے، اس کے شر سے بھی تحفظ کی دُعا کی گئی۔ نفاثات: پھونکیں مارنے والی، فِی الْعُقَدِ: گرہوں میں۔ اس سے وہی جادُوگر قسم کی عورتیں مراد ہوگئیں، یا نفوس مراد ہو گئے، تو مذکر مؤنث دونوں کو شامل ہوجائے گا۔

''حسد'' کی مذمت اور اس کا نقصان

''اور حاسد کے شر سے جس وقت کہ وہ حسد کرے''، حسد کا معنی آپ کی خدمت میں میں نے عرض کردیا، کسی کی اچھی حالت دیکھ کر جلنا اور یہ تمنا کرنا کہ یہ اچھی حالت اس سے زائل ہوجائے، تو اس میں زوال کی تمنا ہوتی ہے، اپنے لئے حصول کی تمنا نہیں ہوتی، اس لئے حسد کبیرہ گناہ ہے، اَخلاقِ رزیلہ میں سے ایک بدتر قسم کا رزیلہ ہے، اِس میں اللہ تعالیٰ کی تقسیم کے اُوپر ایک اِعتراض ہے کہ یہ چیز اللہ نے اس کو کیوں دے دی؟ یہ تو اس قابل نہیں تھا، اس کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔ تو یہ اللہ کی تقسیم پر اِعتراض ہے، جس کی بنا پر حسد کے بارے میں بڑی وعید آئی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ حسد حاسد کی نیکیوں کو یوں کھا جاتا ہے جس طرح سے کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔[1] نیکیاں یوں بھسم ہوجاتی ہیں۔ بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر عزیزی'' میں بیان فرمایا کہ اکثر و بیشتر شرور کا منبع، جو اِنسانوں کی طرف سے دُوسرے انسان کو شرور پہنچتے ہیں، تکلیفیں جو پہنچتی ہیں، قتل، غارت، لوٹ، مار، جو کچھ بھی ہے، اکثر و بیشتر اس کا منبع حسد ہے، کہ ایک شخص کو دُوسرے پر حسد ہوتا ہے تو حسد کی وجہ سے پھر وہ کارروائیاں کر کے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی آسمان پر جو ہوئی تو وہ بھی حسد کی وجہ سے ہوئی کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام پہ حسد کیا، جس کے نتیجے میں اِبلیس کا شر پھیلا، تو سب سے پہلی نافرمانی آسمان پر حسد ہی ہے کہ ابلیس نے حسد کیا آدم علیہ السلام پر، اور زمین پر آدم علیہ السلام کے آجانے کے بعد سب سے پہلی نافرمانی وہ بھی حسد کی وجہ سے پیش آئی، کہ قابیل نے حسد کیا ہابیل پر، جس کے نتیجے میں قتل کا واقعہ پیش آیا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کردیا، وہ واقعہ آپ کے سامنے سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے، تو آسمان میں بھی پہلے یہی معصیت پیش آئی، اور آدم علیہ السلام کے اُترنے کے بعد زمین میں بھی سب سے پہلے یہی معصیت پیش آئی، تو اکثر و بیشتر شرور اور آفات جو اِنسانوں کو اِنسانوں سے پہنچتے ہیں ان کا منشا حسد ہوا کرتا ہے۔ لیکن حسد سے نقصان کب پہنچتا ہے؟ جس وقت کہ حاسد اُس حسد کے مقتضا پر عمل کرے اور اس پر عمل کر کے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، اگر دل میں جلتا رہے تو اس میں محسود کا کوئی نقصان نہیں ہے، اس لئے اس حاسد کے شر کو اِذَا حَسَدَ کے ساتھ مقید

(۱) ابوداؤد ۳۱۶/۲، کتاب الادب۔ باب فی الحسد/ مشکوٰۃ ۴۲۸/۲، باب ما ینھی عنہ من التھاجر والتقاطع

کردیا کہ ہم حاسد کے شر سے پناہ پکڑتے ہیں جس وقت کہ اپنے حسد کے مطابق وہ کارروائی کرے، تو حسد حرام ہے اور باطنی بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے۔

''حسد'' اور ''غبطہ'' میں فرق

اور ایک آیا کرتا ہے اِس کے مقابلے میں ''غبطہ'' اور ''رَشک''! جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کے اندر اچھی صفت کو دیکھ کر انسان للچائے کہ کاش! کہ یہ مجھے بھی حاصل ہوجائے، یعنی دُوسرے سے زوال کی تمنا نہیں ہوتی، اپنے لئے حصول کی تمنا ہوتی ہے، تو یہ جو تمنا ہے، یہ شرعاً بعض صورتوں میں مطلوب ہے، اس کو ''غبطہ'' کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ''حسد''، ''غبطہ'' کے معنی میں بھی آجاتا ہے، جیسا کہ ''فضائلِ قرآن'' میں ایک روایت آتی ہے، اور ''مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم'' میں بھی موجود ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں: ''لَا حَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ'' کہ حسد نہیں مگر دو آدمیوں کے بارے میں، تو وہاں ''حسد'' سے بالاتفاق ''غبطہ'' مراد ہے، رَشک نہیں کرنا چاہیے، مگر دو آدمیوں پر، یعنی دو آدمی ایسے ہیں کہ جن کو دیکھ کر اِنسان کے دِل میں تمنا آنی چاہیے کہ کاش! میں بھی ایسا ہوجاؤں، یعنی وہ دو عظیم نعمتیں ہیں کہ کسی کے پاس اگر موجود ہوں تو اِنسان کی رال ٹپکے اور دِل کے اندر یہ تمنا اُبھرے کہ یہ نعمت مجھے بھی حاصل ہوجائے، تیسری کوئی نعمت نہیں ہے جس کے متعلق رَشک کیا جائے، یعنی اِن دو نعمتوں کے مقابلے میں کوئی نعمت، نعمت نہیں ہے، ان دو نعمتوں پر رَشک کرو، اور کسی دُوسرے کے پاس ہو تو اس جیسا بننے کی تمنا کرو، ایک نعمت ذِکر فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مال دے، پھر اس کو توفیق دے حق میں خرچ کرنے کی، تو اس کی طرف دیکھ کر تمنا ہونی چاہیے کہ اللہ ہمیں بھی مال دے اور ہم بھی اسی طرح سے حق میں خرچ کریں جس طرح سے یہ شخص حق میں خرچ کرتا ہے، اور ایک وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ علمِ دِین دے دے، حکمت دے دے، قرآن کا علم دے دے، اور پھر وہ اس کو لوگوں کے اندر پھیلاتا ہو، تو اس کی حالت دیکھ کر بھی رَشک کرو کہ کاش! کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ نعمت دے دے، آتَاہُ اللہُ الْحِکْمَۃَ، جس کو اللہ تعالیٰ حکمت دے دے اور پھر وہ اس کی تعلیم دیتا ہو، لوگوں کو حکمت سکھاتا ہو، یا قرآن کا علم اللہ تعالیٰ کسی کو دے دے اور وہ اس کی اشاعت کرتا ہو، اس کی حالت بھی اس قابل ہے کہ اس کو دیکھ کر رَشک کیا جائے، اور اِنسان تمنا کرے کہ ہمیں بھی یہ نعمت حاصل ہوجائے۔ (۱)

سورۂ ناس کے مضامین

یہ سارے کے سارے چار شر جو آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق اسی بدنی زندگی کے ساتھ اور دُنیوی زندگی کے ساتھ ہے جس سے انسان کو تکلیف پہنچتی ہے، اور اگلی سورت میں جو شر ذِکر کیا گیا ہے، وہ ہے شیطان کا، وسوسہ ڈالنے والے کا، اس کا اثر براہِ راست ایمان پر اور عقیدے پر پہنچتا ہے، اور اِیمان اور عقیدہ اگر متاثر ہوجائے شیطان کے شر سے، تو آپ جانتے ہیں کہ رُوحانیت برباد ہوگئی اور آخرت برباد ہوگئی، تو دُوسری سورت سورۂ ناس مکمل اس مضمون پر مشتمل ہے کہ شیطان جو کہ مُوَسْوِس

(۱) بخاری ۱/۱۷، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ ۲/۷۵۱، باب اغتباط صاحب القرآن۔ مشکوٰۃ ۱/۳۲، کتاب العلم فصل اول۔ ۱/۱۸۳، کتاب فضائل القرآن، فصل اول۔

ہے، خنّاس ہے، اس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے، اور اس کے وسوسے اور شر کا تعلق ہوتا ہے ایمان کے ساتھ، ایمان خراب کرنے کے متعلق، جیسا کہ پہلے آپ کے سامنے تفصیل کی جاچکی، اور پہلی سورت کی تفصیل آپ کے سامنے کل آگئی تھی اور یہ کچھ مضمون باقی ہے جو آج اَدا کیا جارہا ہے، تو چونکہ ایمان کی حفاظت مطلوب ہے، اور ایمان کے خراب ہونے کی وجہ سے انسان کی آخرت برباد ہوتی ہے، تو اِس سورت میں اللہ تعالیٰ کے جو اَسماء ذِکر کیے گئے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی جو صفات ذِکر کی گئی ہیں، یہ ایمان کے لئے منشا بنتی ہیں۔

عقیدۂ رُبوبیت کی اہمیت

مثلاً سب سے پہلے رَبِّ نَاس کا ذِکر کیا، جس میں اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا ذِکر ہوا، تو اللہ تعالیٰ کی رَبّ ہونے کی جو صفت ہے، رُبوبیت والی صفت، یہ وہ صفت ہے کہ جس سے سب سے پہلے انسان کو رُوشناس کروایا گیا، اور یہی معرفتِ رَبّ کی اِبتدائی منزل ہے۔ یاد ہوگا! جس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اس کی ساری کی ساری اولاد کو موجود کیا اور اُن سے عہد اور میثاق لیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں سے جس اِسم کو ذِکر کیا تھا وہ رَبّ ہی ہے، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ: کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ (سورۂ اَعراف: ۱۷۲)، تو گویا کہ رَبّ ہونے کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کیا، اور اِنسان کو پہلے اپنی اِسی صفت سے رُوشناس کرایا، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کی اِبتدا جو ہے وہ یہی رُبوبیت سے ہوئی۔ رَبّ کہتے ہیں پالنے والے کو، ضرورتیں پوری کرنے والے کو، جو درجہ بدرجہ کسی چیز کو اُس کی تکمیل تک پہنچاتا ہے، آہستہ آہستہ تدریجاً درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے وہ ہوتا ہے رَبّ۔ تو اِنسان کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد اُس کو درجہ بدرجہ ایک کمال تک پہنچایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جو رَبّ ہونے کی صفت ہے جس کا تعلق انسان کی تربیت سے ہے، اس کو سب سے پہلے ذِکر کیا گیا بنی آدم کے سامنے، اور اِقرار لیا گیا، قَالُوْا بَلٰی: سب نے اقرار کیا کیوں نہیں، تُو ہی ہمارا رَبّ ہے...... اور زندگی کے اندر بھی اِس رُبوبیت کے عقیدے کی تاکید کی گئی، قرآنِ کریم میں مذکور ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (حم فصلت: ۳۰) جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے، یعنی انہوں نے جو عہد اور میثاق عالمِ رُوحانیت میں کیا تھا، اُسی کا اِس زندگی میں آکے وہ اقرار کرتے ہیں، اور اللہ کو اپنا رَبّ کہتے ہیں، اور رَبّ کہنے کے بعد پھر اسی کے اُوپر ڈٹ جاتے ہیں اور جمے رہتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے اُوپر فرشتے اُتریں گے اور ان کو بشارتیں دیں گے۔ تو معلوم ہوگیا کہ رُبوبیت کا عقیدہ ایک بہت بنیادی عقیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کو رَبّ جاننا، رَبّ ماننا، زندگی کے اندر بھی اِسی کے اُوپر اِستقامت مطلوب ہے...... اور آپ یہ بھی سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں کہ مرنے کے بعد جس وقت انسان قبر میں چلا جائے گا تو انسان کا امتحان جو لیا جائے گا اس میں جو تین سوال ذِکر کیے گئے ہیں حدیث شریف میں، جو انسان سے پوچھے جائیں گے، ان میں سے پہلا سوال بھی یہی ہے مَنْ رَّبُّكَ؟ تیرا رَبّ کون ہے؟ تو معلوم ہوگیا کہ رَبّ ہونے کا عقیدہ ہی سب سے پہلے انسان کے قلب میں ڈالا گیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اور زندگی کے اندر اسی کے اُوپر اِستقامت کا مطالبہ کیا گیا، اور قبر میں جانے کے بعد سب سے پہلے امتحانی سوال بھی یہی ہے مَنْ رَّبُّكَ؟ تو جو اس کا جواب صحیح دے گا وہ کامیاب ہوجائے گا۔

عقیدۂ رُبوبیت کا حاصل

تو اللہ تعالیٰ کے متعلق رُبوبیت کے عقیدے کا حاصل یہ ہے کہ جب پیدا کرنے والا وہ، پالنے والا وہ، درجۂ کمال تک پہنچانے والا وہ، تو ہر قسم کی عبادت اور اِطاعت کا حق دار بھی وہی ہے، جس کا کھایئے اسی کا گایئے، جب کھلاتا وہ ہے اور ہر قسم کی ضرورتیں پوری وہ کرتا ہے تو پھر کسی دُوسرے کی حاکمیت انسان تسلیم کرے، اور دُوسرے کے سامنے انسان جھکے، اور اپنی پستی کا اظہار کرے، یہ نہیں۔ ہر لحاظ سے بالادستی انسان کے دل اور دماغ پر اللہ تعالیٰ کی ہی ہونی چاہیے، جس کی رُبوبیت کا ہم نے اقرار کیا ہے اور جس کے متعلق ہم نے مانا کہ ہماری مشکلات کا دُور کرنا، ہماری حاجات کا پورا کرنا، یہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے، تو یہ جو اِحتیاج ہے انسان کا اللہ تعالیٰ کی طرف، وہ صفتِ رُبوبیت میں خوب نمایاں ہے، اور یہی ہے جہاں سے انسان کے ایمان کی اِبتدا ہوتی ہے۔

مکمل اِختیارات کا مالک صرف اللہ ہے

اور لفظ رَبّ کے بعد دُوسرے نمبر پر ذِکر کیا گیا مَلِكِ النَّاسِ: لوگوں کا بادشاہ، یہ اُس سے آگے کچھ ترقی ہوگئی، کہ جب ہم اس کو ضرورتیں پوری کرنے والا کہتے ہیں تو ضرورتیں پوری وہی کرسکتا ہے کہ جس کو ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوں، اور وہ کسی دُوسرے کی مرضی کا پابند نہ ہو، ہر طرح سے اُس کو بالادستی حاصل ہے، مکمل اس کو اِختیارات ہیں، جو چاہے کرے، اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں، تو فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ، يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، یہ شان ہوگی تو تب جا کے رَبّ والی صفت صحیح ثابت ہوسکتی ہے کہ جس کی جو ضرورت پوری کرنا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہ ہو، اور اس کے سامنے کوئی کسی قسم کی رُکاوٹ پیدا کرنے والا نہ ہو، تو یہ شان بھی اللہ تعالیٰ کی ہے، فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ہے، يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ہے، اُس کے فیصلے کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں کرسکتا، اور وہ جو کچھ کرنا چاہے، جو تصرف کرنا چاہے، کسی کو دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، کسی سے کچھ لینا چاہے تو کوئی منع نہیں کرسکتا، یہ صفت اُسی اللہ کی ہے، اور اسی کو مَلِكِ النَّاسِ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا کہ بادشاہ بھی وہی ہے، اس سے اُوپر حکومت کسی کی نہیں، اس کی حکومت سب پر ہے۔ تو مَلِكِ النَّاسِ کے اندر یہ ذِکر کردیا گیا، اختیارات بھی ہر قسم کے اسے ہی حاصل ہیں، ہر قسم کی قدرتیں اس کے لئے ثابت ہیں، جو چاہے وہ کرسکتا ہے، اُس کے فیصلے کے سامنے کوئی رُکاوٹ پیدا کرنے والا نہیں، مَلِكِ النَّاسِ میں اس درجے کا تعارف کروادیا گیا۔

''اِلٰہ'' صرف وہی ہے!

تو جب ضرورتیں پوری کرنے والا وہی، ہر قسم کے اختیارات رکھنے والا وہی، ہر قسم کی قدرتوں کا مالک وہی، تو اس کے بعد آئے گا اِلٰهِ النَّاسِ کا درجہ، کہ پھر اِنسان اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اُس کے علاوہ معبود بھی کوئی نہیں، کوئی ایسا نہیں جو عبادت کا حق دار ہو، کہ اُس کے سامنے انسان اپنی عبودیت کا اقرار کرے، اُس کے سامنے اپنے آپ کے تذلل کا اظہار کرے، اللہ کے علاوہ کوئی

دُوسری ذات ایسی نہیں۔ تو درجہ بدرجہ ان صفات میں غور کرنے کے بعد انسان اس عقیدے پر پہنچے گا کہ الٰہ بھی وہی ہے، عبادت اُسی کی کرنی چاہیے۔

مذکورہ تین صفات کا مقصد

ان تینوں باتوں کو اگر کوئی شخص پیش نظر رکھے تو شیطان کبھی اس کے ایمان کو خراب نہیں کر سکتا، اُس کے ایمان کی بنیاد قلب کے اندر مضبوط رہے گی، اس لئے شیطان کے وسوسے سے جس وقت پناہ مانگنے کا ذِکر کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی صفات وہی ذِکر کی گئیں جو کہ انسان کے ایمان کے لئے منشاءِ حق ہیں، جن میں غور کرنے کے بعد اِنسان کا ایمان صحیح ہوتا ہے۔

''وسواس'' اور ''خنّاس'' کی وضاحت اور شیطان کے وسوسے سے بچنے کا طریقہ

اُس شیطان کو وسواس کے لفظ کے ساتھ ذِکر کیا گیا مبالغۃً، جیسے زَیْدٌ عَدْلٌ میں آپ پڑھتے ہیں کہ مصدر کا حمل مبالغۃً ہوتا ہے، گویا کہ وہ سراپا وسوسہ ہی وسوسہ ہے۔ وسوسہ اُس خیال کو کہتے ہیں جو دِل کے اندر آئے اور وہ شر کی طرف داعی ہو، بُرائی کی طرف لے جانے والا ہو، اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔ اور اگر دِل کے اندر ایسا خیال آئے جو اس کو نیکی کی ترغیب دینے والا ہو، نیکی کی طرف لے جانے والا ہو، تو اس کو اِلہام سے تعبیر کرتے ہیں، وہ وسوسہ نہیں ہوتا، وہ اِلہام کہلاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان کے ساتھ فرشتہ بھی رہتا ہے جو اس کو خیر کی تلقین کرتا ہے، اور انسان کے ساتھ شیطان بھی رہتا ہے جو اُس کے دِل کے اندر بُرائی کا خیال ڈالتا ہے، پھر آگے انسان اپنے ارادے کے ساتھ جدھر کو ہو جاتا ہے اس کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے (دیکھئے مظہری)۔ تو یہ وسوسہ ڈالنے والا شیطان یہ انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے، اور جب انسان کو غافل پاتا ہے تو اس کے دِل کے اندر بات ایسی ڈالتا ہے جو اس کے لئے شر کی طرف داعی بن جاتی ہے، تو اس کا حل یہی ہے کہ اللہ کو یاد رکھا جائے، حدیث شریف میں آتا ہے: ''اِذَا ذُكِرَ اللهُ خَنَسَ'' شیطان اپنا منہ انسان کے قلب کے اُوپر لگائے ہوئے ہے اور اس میں بُرے خیالات ڈالتا رہتا ہے، لیکن جب اللہ کو یاد کیا جائے تو پھر یہ پیچھے کو دبک جاتا ہے، پیچھے کو ہٹ جاتا ہے۔[1] وہاں چونکہ ''خَنَسَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا اسی لیے اس شیطان کو ''خنّاس'' کہتے ہیں، یہ جلدی سے پیچھے کو ہٹ جاتا ہے، جس وقت اللہ کے ذِکر والا ڈنڈا اس کے سامنے آتا ہے، اللہ کا نام آتا ہے، تو اس طرح سے بھاگتا ہے جس طرح سے کتا ڈنڈے کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ تو شیطان کو اپنے قلب سے دُور ہٹانے کا ذریعہ ہے ذکر اللہ، اللہ کو یاد کیا جائے، اللہ کی صفات میں غور کیا جائے، اللہ کی طرف دھیان رکھا جائے، تو پھر یہ شیطان وسوسہ نہیں ڈالتا، اِذَا ذُكِرَ اللهُ خَنَسَ، جب اللہ کی یاد کی جاتی ہے قلب میں، اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، تو پھر یہ پیچھے کو ہٹ جاتا ہے، بھاگ جاتا ہے، اس لئے اس کو خنّاس کہتے ہیں۔ ''یہ وسوسہ ڈالتا ہے لوگوں کے سینوں میں'' صدور، صدر کی جمع ہے، صدر سینے کو کہتے ہیں، سینہ بول کر دِل مراد ہے، نسبت دونوں طرف ہی ہوتی ہے، سینے کا راز، دِل کا بھید، سینے کا بھید، دِل کا راز، دونوں طرح سے کہتے ہیں، چونکہ سینے میں

---

(۱) دیکھئے مشکوٰۃ ۱۹۹/۱ باب ذکر اللہ، فصل ثالث۔

ہی دِل ہوتا ہے، اس لئے دِل کی طرف نسبت کردی جائے تو بھی سینے کی طرف ہے، سینے کی طرف نسبت کی جائے تو بھی دِل کی طرف ہے، ''لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے، لوگوں کے دِلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔''

''وسواس'' کی دو قسمیں اور دونوں کے ''وسوسہ'' ڈالنے کا طریقہ

مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ میں تقسیم کردی کہ شیطان وسوسے ڈالنے والا دو قسم کا ہوتا ہے، جنوں میں سے بھی ہے اور انسانوں میں سے بھی ہے، جو جنوں میں سے ہے یہ تو وہ ہوا جو ہمیں نظر نہیں آتا، اور اندر گھس جاتا ہے، قلب کے اُوپر جا کے بیٹھ جاتا ہے، خیالات کا القاء کرتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ ''[1] شیطان، انسان کے بدن میں اس طرح سے گشت کرتا ہے جس طرح سے خون پھرتا ہے، خون کے پھرنے کی جگہ میں شیطان گشت کرتا ہے، تو جس کا مطلب ہے کہ اس کو بدن میں گھسنے اور اندر جا کے اثرات ڈالنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت قدرت دی ہے، تو یہ تو اندر گھس کے وسوسے ڈالنے والا ہے، اور ایک انسانوں میں سے بھی مُوَسْوِس ہوتا ہے، انسان بھی شیطان ہے جو وسوسے ڈالتا ہے، قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ بھی یہ ذِکر آیا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (سورۂ انعام: ۱۱۲) اس آیت میں دیکھیے! نبی کے دُشمن دو قسم کے ذِکر کئے گئے، شیاطینِ انس بھی اور جن بھی۔ تو جس طرح سے جنوں میں شیطان ہیں، اسی طرح سے اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں بھی شیطان ہیں، تو آخری سورت میں مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ کے اندر جو تقسیم کی گئی تو قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ اِس کا ذِکر آیا ہوا ہے۔ تو اِنسانوں میں سے شیطان جو وسوسہ ڈالا کرتا ہے تو اس کی صورت یہ ہوا کرتی ہے کہ یہ دِل میں تو گھس نہیں سکتا، یہ بڑا ہمدرد بن کر، خیرخواہ بن کر اِنسان کے کان کو لگتا ہے، بات ڈال دی، ہمدردی کا اظہار کردیا، پھر کسی دُوسرے وقت میں کسی دُوسرے انداز میں بات کردی، اپنے آپ کو خیرخواہ ثابت کر کے لے آئے، لیکن آہستہ آہستہ وہ بات جو کان میں ڈالی جاتی ہے وہ دِل میں قرار پکڑنا شروع ہوجاتی ہے، اور جب دِل میں قرار پکڑ جاتی ہے تو نتیجۃً انسان اُس بُرائی کی طرف مائل ہو کے ہلاکت کے کھڈے میں جا گرتا ہے، اس طرح سے انسان، انسان کو بھی بہکاتا ہے، انسان بہکاتا ہے کان میں باتیں ڈال کے یا کوئی چیز آنکھوں سے دِکھا کے، اور خیرخواہی کے جذبے سے آتا ہے، چنانچہ اس قسم کے لوگ جو خیرخواہی کے جذبے سے آتے ہیں اور دوستی کے رنگ میں اور محبت کے رنگ میں آ کے انسان کو بُرائی کی طرف لے جاتے ہیں، ان کو بھی اگر ڈانٹ دیا جائے تو یہ بھی پھر پیچھے کو ہٹ جاتے ہیں اور ان میں جرأت نہیں ہوتی کہ اپنے آپ کو دُشمن ظاہر کر کے یا اپنا مقصد صاف طور پر نمایاں کر کے بات کر سکیں، اِس معاملے میں بزدل ہوتے ہیں، منافقانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، کہ ہوتی ہے دِل میں بُرائی، لے جانا چاہتے ہیں آپ کو بُرائی کی طرف، لیکن آئیں گے خیرخواہ بن کر۔ اس طرح سے انسان، انسان کے دِل میں بھی وسوسہ ڈالتا ہے، تو جس طرح سے جنوں میں سے جو شیطان ہے، اس سے بچنے کی ضرورت ہے، اسی طرح سے انسانوں میں جو شیطان ہیں، جو وسوسہ ڈالنے والے اور اِنسان کو بُرائی کی طرف لے جانے والے، بُرے قسم کے

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۶۳ باب صفۃ ابلیس/مسلم ۲/ ۲۱۶ باب بیان انہ یستحب لمن رأی خالیا بامرأۃ/مشکوۃ ۱/ ۱۸ باب الوسوسۃ، فصل اوّل۔

دوست ہوا کرتے ہیں، جن کی صحبت سے اور جن کی باتوں سے متاثر ہونے کے بعد انسان دُنیا اور آخرت برباد کر بیٹھتا ہے اُن کے شر سے بھی پناہ مانگنے کی ضرورت ہے۔

تو یہ دونوں سورتیں جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں اِس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ رُوحانی شر ہو یا بدنی شر ہو، دونوں سے بچنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعوّذ کیا گیا ہے، اللہ کی پناہ پکڑی گئی ہے، اور اس پناہ کے حاصل ہو جانے کے بعد انسان ہر قسم کی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، ہر دولت اور ہر نعمت جو انسان کو حاصل ہو، وہ محفوظ رہتی ہے۔

معوّذتین کے متعلق حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون

اِس مضمون کو سمجھانے کے لئے علمائے کرام رحمہم اللہ نے مختلف انداز سے گفتگو کی ہے، اور یہاں ''فوائدِ عثمانی'' میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دار العلوم دیو بند کی طرف سے ایک مضمون نقل کیا ہے یہ سمجھانے کے لئے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک باغبان جس وقت کوئی پودا لگاتا ہے، اور اس پودے کے سائے اور پھل سے وہ فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو اس کو چند ایک کام کرنے پڑتے ہیں، اور اس پودے کی نشوونما کے لئے پوری حفاظت کا انتظام کرنا پڑتا ہے، حفاظت مختلف قسم کی چیزوں سے ہوتی ہے، پہلے تو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کوئی سبزہ خور جانور جس کی فطرت ہی ہے سبزہ کھانا، وہ آ کے کہیں اُس پودے کو کھا نہ جائے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ ایک پودا بوتے ہیں، کوئی جانور آتا ہے اور اس کو کھا جاتا ہے، چاہے اس کے دِل میں کوئی عداوت نہیں ہوتی، لیکن فطرت اس کی یہی ہے سبزہ خوری، اس لئے وہ سبز سمجھ کے کھا گیا۔ اور پودے کے اُگنے کے بعد جو دُوسرا کام کرنا پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس کی نشوونما کے جو طبعی اسباب ہیں وہ مہیا کئے جائیں، بقدرِ ضرورت اس کو پانی دیا جائے، اس کے لئے روشنی کا انتظام ہو، دُھوپ کا انتظام ہو، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ پودا سائے میں آ جائے، وہاں روشنی نہ پہنچے، دُھوپ نہ پہنچے، تو بسا اوقات وہ پودا خشک ہو جاتا ہے، اس کی نشوونما صحیح نہیں ہوتی، پانی اس کو نہ ملے تو بھی اس کی نشوونما صحیح نہیں ہوتی۔ اور پھر تیسرے نمبر پر بعض آفتوں سے بچانے کے لئے انتظام کرنا ہوتا ہے کہ اس کے اُوپر کورا نہ پڑے، سردی نہ پڑے، کوئی اور اس قسم کی باہر کی آفت نہ آ جائے اس پودے کے اُوپر جو اس کو خشک کر دے اور اس کا مادّۂ حیات ختم ہو جائے، اس لئے سردیوں میں دیکھا ہو گا آپ لوگوں نے، جو لوگ سبزیاں بیچتے ہیں یا پھلوں والے پودے بیچتے ہیں وہ سردیوں میں ان کے اُوپر کوئی سایہ سا کر دیتے ہیں تا کہ کورا وغیرہ پڑے تو اس کی حفاظت رہے، برف باری سے یہ بچا رہے۔ اور چوتھے نمبر پر جس چیز کا خیال کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی دُشمن آ کے دُشمنی کی بنا پر نہ اُس کو اکھیڑ کے پھینک دے، ایسا بھی ہوتا ہے بسا اوقات کہ آپ نے ایک اچھا پودا لگایا لیکن کوئی بدخواہ اور کوئی دُشمن آیا اور اس کو اُکھیڑ کے پھینک گیا۔ اگر ان چاروں آفتوں سے وہ پودا بچ جاتا ہے تو پھر اُمید کی جا سکتی ہے کہ اس کے سائے سے اور اس کے پھل سے اس کا مالک فائدہ اُٹھائے گا، بقول حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ اِس تقریر میں اتنا اضافہ کر لیا جائے کہ اس چیز کی بھی نگاہ داشت کی ضرورت ہے کہ جب اُس پودے کی گٹھلی یا بیج زمین میں دبایا جائے تو زمین میں دبائے جانے کے بعد بھی اُس بیج کی حفاظت بایں معنی ضروری ہے کہ اس کو کیڑا نہ لگ جائے،

دیمک نہ لگ جائے، کوئی مخفی کیڑا اُس کے اصل جوہر کو چوس نہ لے، جس کی بنا پر وہ پودا اُگے ہی نہیں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ حفاظت جو ہے یہ اِنسان کی دسترس سے باہر ہے، زمین میں بیج دبانے کے بعد، گٹھلی دبانے کے بعد، پھر اِنسان بے بس ہے، اب آگے اُس کی حفاظت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی اُس کو اُگائے گا، وہی اس کو محفوظ رکھے گا، بیج ڈالنے کے بعد پھر آگے انسان کا کوئی زور نہیں چلتا۔ تو بیج محفوظ رہ جائے، بیج کے محفوظ رہ جانے کے بعد پودا جب اُگے تو اس کو سبزہ خور جانوروں سے بچایا جائے، اور اس کے لئے اَسبابِ طبعیہ مہیا کئے جائیں، اور آفاتِ خارجیہ سے اس کی حفاظت کی جائے، اور دُشمن کی نظر سے اس کو بچایا جائے، جب یہ سارے درجے طے ہوجاتے ہیں تو پھر وہ پودا پھلتا ہے پھولتا ہے اور مالک اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ تو یہاں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس نعمت کی تکمیل کے بعد انہی چیزوں سے ہمارے لئے تعوّذ کی تلقین کی، شَرِّ مَا خَلَقَ کے اندر تو ایسی چیزیں ہوگئیں جیسے کہ تفصیل آپ کے سامنے ذِکر کی گئی، جن کی فطرت میں ہی اِیذا رسانی ہے، وہ کسی دُشمنی کی بنا پر تکلیف نہیں پہنچاتیں بلکہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ اور شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کا مطلب یہی ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ہمارے ساتھ تعلق ہوتا ہے، لیکن پھر وہ ٹوٹ جاتا ہے، اور ٹوٹنے کی بنا پر پھر ہمیں نقصان ہوتا ہے، جیسے روشنی کا ہمارے ساتھ تعلق تھا، سورج کی گرمی کا تعلق تھا، اور اندھیرا چھا جانے کے بعد وہ ربط ہم سے ٹوٹ گیا، جس میں پھر مختلف قسم کے شرور پیش آتے ہیں، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے پودے سے اس کے اسبابِ طبعیہ منقطع ہوجائیں، اس کے لئے ہوا کا انتظام نہ ہو، اس کے لئے روشنی اور گرمی کا انتظام نہ ہو، یا اس کے لئے پانی کا انتظام نہ ہو، یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو یہ بھی نقصان پہنچانے والی بات ہے۔ اور النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ یہ ایسے ہے جیسے باہر کی آفات ہوتی ہیں کہ باہر کی کوئی آفت آتی ہے، آکے پودے کو خراب کردیتی ہے، پالا پڑ گیا، کورا پڑ گیا، برف باری ہوگئی، ژالہ باری ہوگئی، جس سے پودے کا نقصان ہوجاتا ہے، تو جادو کے اثرات جو ہیں یہ بھی باہر سے آکے انسان کی صلاحیتوں کو دباتے ہیں، اور اس دبانے کے ساتھ انسان مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے اور تکلیف پاتا ہے، تو النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ایسے ہی ہے جیسے باہر کی آفات ہوتی ہیں جو آکے پودے خراب کرتی ہیں۔ اور شَرِّ حَاسِدٍ ایسے ہی ہے جیسے دُشمن کی دُشمنی، کہ کوئی دُشمنی کی بنا پر آئے اور آکے اس پودے کو اکھیڑ کے پھینک دے۔ اِن سب آفات سے تحفظ حاصل کرنے کے لئے، حفاظت حاصل کرنے کے لئے اللہ کی پناہ پکڑی گئی۔ اور اگلی ساری سورت کے اندر باطن کی حفاظت ہوگئی، کہ اللہ تعالیٰ باطن کی بھی حفاظت کرے، ہمارے شجرۂ ایمانی کا جو بیج قلب کے اندر ہے کوئی دُشمن اس کو نقصان نہ پہنچائے، چونکہ اِس کی حفاظت سب سے زیادہ اہم ہے اس لئے اِس تعوّذ میں اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کا ذِکر کیا گیا، جبکہ پہلی چار تکلیفوں سے بچنے کے لئے صرف ایک صفت کا ذِکر آیا رَبِّ الْفَلَقِ۔ تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اِس بیان سے ان دو سورتوں کا مضمون ذرا اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی اِبتدا اور اِنتہا میں مختلف مناسبتیں

اب قرآنِ کریم کے اِختتام کی بات آگئی، یہ بھی ایک کمال کی بات ہوتی ہے کہ کتاب کا آغاز اور کتاب کا اِختتام آپس میں متناسب ہو، اُن کا بھی آپس میں کوئی ربط اور نسبت ہو، یہاں بہت واضح قسم کی نسبتیں موجود ہیں۔

۱۔قرآنِ کریم کا افتتاح کیا گیا تھا سورۂ فاتحہ سے، جیسے کہ کچھ تفصیل آپ کے سامنے قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ پر ذکر کردی گئی تھی، کہ اُس کی بھی مناسبت ہے اِبتدا سے، کہ اللہ کی صفات ذِکر کر کے توحید کا تذکرہ آیا تھا تو اِختتام بھی توحید پر ہوگیا۔

۲۔اور اِس کے بعد آخری الفاظ جو ہیں اُن کے ساتھ بہت واضح مناسبت ہے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات جو ذِکر کی تھیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو وہاں بھی رَبِّ عالمین کا ذِکر تھا، تو رَبِّ ناس کو رَبِّ عالمین کے ساتھ مناسبت ہے۔

۳۔اور آگے مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ، اُس میں مالك اور مَلِك دونوں قراءتیں ہیں، مٰلِكِ یوم الدین بھی قراءت ہے، مَلِكِ یومِ الدین بھی قراءت ہے، یومِ دِین کا مالک، یومِ دِین کا بادشاہ، تو مَلِكِ یوم الدین کی قراءت ہو تو مَلِكِ النَّاسِ کو بہت ہی مناسبت ہے اُس کے ساتھ، اور اگر مٰلك کی قراءت ہو مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ، تو مٰلك اور مَلِك میں بھی کوئی خاص فرق نہیں ہے، مالک کہہ دیا جائے، بادشاہ کہہ دیا جائے، یہ مفہوم قریب قریب ہے، تو اس لفظ کو اُس کے ساتھ مناسبت ہے۔

۴۔اور آگے ہم سے جو کہلوایا تھا اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، تو اس کا حاصل یہی تھا کہ ہم تجھے معبود مانتے ہیں، کیونکہ جس کو معبود مانا جائے عبادت اسی کی ہوتی ہے، تو اِلٰهِ النَّاسِ کی اُس مضمون کے ساتھ مناسبت ہے، گویا کہ ہم نے وہاں اِقرار کیا تھا کہ ہم تجھے معبود مانتے ہیں، اِلٰہ کا ذِکر وہاں بھی آیا، اِیَّاكَ نَعْبُدُ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تو عبادت اسی کی کی جاتی ہے جس کو اِلٰہ مان لیا جائے، تو اِلٰهِ النَّاسِ کی مناسبت اُس کے ساتھ واضح ہے۔

۵۔اور آگے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں جو دُعا سکھائی گئی تھی، وہاں اُس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو تھے، اچھے لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق دے اور بُرے لوگوں کے راستے سے بچا، آخری آخری الفاظ جو آئے تھے وہ یہی تھے کہ جو مغضوب علیہم ہیں یا جو ضالین ہیں ہمیں اُن کے راستے سے بچا۔ مغضوب علیہم: جن کے اُوپر تیرا غضب ہوا ہے۔ ضالین: جو کہ بھٹکے ہوئے ہیں، دونوں کے درمیان میں اُس وقت فرق ذِکر کردیا گیا تھا، مغضوب علیہم وہ ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر کسی غلطی میں مبتلا ہوں، علم تو اُن کو ہے لیکن عمل کی توفیق نہیں، بھٹکے ہوئے ہیں، ضالین وہ ہوتے ہیں جو علم کے بغیر جہالت کی بنا پر بھٹکے ہوئے ہیں، تو بدعملی کی وجہ یا تو یہی ہوتی ہے کہ جان بوجھ کر اِنسان کج روی اختیار کرتا ہے، یا جہالت کی بنا پر کرتا ہے، تو دونوں قسم کی غلطیوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی گئی تھی کہ اے اللہ! ہمیں اچھے لوگوں کے راستے پر چلا، اچھے لوگوں کی تفصیل آگئی تھی اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے تحت، جن پہ تیرا اِنعام ہے، اور دُوسری جگہ منعم علیہم یعنی جن کے اُوپر اللہ کا انعام ہوا ان کی تفصیل یہ کی مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ (سورۂ نساء:۶۹)، یہ ہیں منعم علیہم چار گروہ، جن کے راستے پر چلنے کی توفیق مانگی گئی تھی، کہ ہمیں نبیوں کے راستے پر چلا، صدیقین کے راستے پر چلا، شہداء کے راستے پر چلنے کی توفیق دے، صالحین کی اتباع کی ہمیں توفیق دے، ان چار گروہوں کی اِتباع کی توفیق مانگی گئی تھی اور مغضوب علیہم اور ضالین کے راستے سے بچنے کی توفیق مانگی گئی تھی، کہ ہمیں ایسے لوگوں کے راستے پر نہ چلانا جن کے اُوپر تیرا غضب ہے، یعنی ہم ایسے راستے پر نہ چلیں جس کی بنا پر ہم بھی مغضوب ہوجائیں، اور اسی طرح سے ہم ایسے راستے پر نہ چلیں جس پر چلنے کی بنا پر ہم بھی ضلالت کی وادی میں جاگریں اور ضالین میں ہمارا بھی شمار ہوجائے۔ تو مغضوب علیہم اور ضالین کے راستے سے بچنے کی جو دُعا وہاں کی گئی تھی کہ یا اللہ! ہمیں ان سے بچا،

ان کے راستے پر ہمیں نہ چلانا، تو یہ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ کے مضمون کی مکمل مناسبت اُس کے ساتھ ہے، کیونکہ انسان غضب والا راستہ اختیار کرتا ہے اور ضلالت والا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس میں شیطان کا بہکاوا ہوتا ہے، انسان کو شیطان بہکاتا ہے جس کی بنا پر وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے جس کی بنا پر اللہ کا غضب آ گیا، اور بہکاتا ہے جس کی بنا پر ہدایت کے راستے کو چھوڑ کر وہ ضلالت کی طرف آتا ہے، تو شیطانی وسوسے، چاہے وہ شیطان جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے ہو، جتنے بھی بہکانے والے ہیں اور بہکا کے اللہ کے غضب کی طرف اور اللہ کی لعنت کی طرف لے جانے والے ہیں، اُن کے شر سے یہاں بھی تحفظ کی دُعا کی گئی ہے، تو جیسے وہاں توفیق مانگی گئی تھی کہ ہمیں ان کے راستے پر نہ چلانا جس کی بنا پر ہم پر بھی غضب آ جائے اور ہم بھی ضلالت کی وادی میں جا گریں، تو یہاں اُس کو اِن الفاظ سے ادا کر دیا گیا کہ اے اللہ! ایسے لوگ چاہے وہ جنوں میں سے ہیں یا انسانوں میں سے ہیں جو قلوب کے اندر وسوسہ ڈالتے ہیں، وسوسہ ڈالنے کے بعد وہ بُرائی کی طرف لے جاتے ہیں، گمراہی کی طرف انسان کو لے جاتے ہیں، ہمیں اِن کے شر سے محفوظ رکھ، تو جب انسان ان کے شر سے محفوظ رہے گا تو ضلالت اور غضب ہر قسم کی چیز سے وہ بچ جائے گا، تو اِس مضمون کو سورۂ فاتحہ کے آخری مضمون کے ساتھ مناسبتِ تامہ ہے۔

قرآن کی اِبتدا ''باء'' سے ہے اور اِختتام ''سین'' پر کیوں؟

لطیفے کے طور پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدثِ دہلوی رحمہ اللہ نے حکیم سنائی کا ایک قول نقل کیا ہے، یہ ایک علمی لطیفہ ہے، کہ قرآنِ کریم کی اِبتدا جو اِس وقت آپ کے سامنے ذِکر کی گئی وہ سورۂ فاتحہ سے ہے، اور اِختتام سورۃ الناس پر، یہ مناسبت آپ کے سامنے دونوں سورتوں کی واضح کی گئی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حقیقی ابتدا حروف کے اعتبار سے قرآنِ کریم کی ہوئی ''بسم اللہ'' کی ''باء'' سے، آپ دیکھ رہے ہیں جہاں کتاب اللہ شروع ہوئی تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' یہ پہلے کلمات ہیں، اور ان میں پہلا حرف ''باء'' ہے، اور حروف کے لحاظ سے اِختتام جو ہوا ہے، وہ ہے: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کی ''سین'' پر، تو ابتدا ''باء'' سے ہوئی اور اِختتام ''سین'' پہ ہوا، اور جس وقت ''باء'' اور ''سین'' کو اکٹھا کر لیا جائے تو کیا بن جایا کرتا ہے؟ ''بس!'' باء اور سین کو اِکٹھا کر لیں تو ''بس'' ہو گیا، اِسی مضمون کو حکیم سنائی نے اپنے ایک شعر کے اندر ادا کیا۔

اوّل و آخرِ قرآن زِچہ باء آمد و سین ۔۔۔ یعنی اندر رہِ دیں رہبرِ تُو قرآن بس!

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی اِبتدا جو ''بسم اللہ'' کی ''باء'' سے کی، اور اِختتام اس کا ''الناس'' کی ''سین'' پر کیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ''در رہِ دِین رہبرِ تُو قرآن بس!'' کہ دِین کے معاملے میں تیرا راہنما قرآن ہے، بس یہ کافی ہے، ''بس'' کا معنی کافی (تفسیر عزیزی)۔ تو پھر یہ وہی مضمون ہے جس کو ''حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ''(۱) کے اندر اَدا کیا جاتا ہے، کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے، دِین کی راہنمائی کے لئے ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، تو قرآنِ کریم کے اِبتدائی حرف اور آخری حرف کے ساتھ یہ ''حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ'' کا معنی پیدا ہو گیا۔

---

(۱) یہ حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے دیکھئے: بخاری ۲/ ۶۳۸ باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ/ مسلم ۲/ ۴۲ باب ترک الوصیۃ

حدیث اور فقہ، قرآن کے مخالف نہیں ہیں!

لیکن میں تھوڑی سی وضاحت کر دوں آپ کے سامنے، ''حَسْبُنَا کِتَابُ الله'' کا یہ معنی نہیں کہ کتاب اللہ کے بعد حدیث کی ضرورت نہیں، کتاب اللہ کے بعد فقہ کی ضرورت نہیں۔ اور ''حَسْبُنَا کِتَابُ الله'' کہہ کر لوگ انکارِ حدیث کو اختیار کریں، ''حَسْبُنَا کِتَابُ الله'' کہہ کر لوگ فقہ کا اِنکار کریں، یہ ان کی اپنی جہالت ہے، ''حَسْبُنَا کِتَابُ الله'' کا یہ معنی نہیں ہے۔ سُنّتِ رسول اللہ ﷺ اور فقہ تفقہ یہ کتابُ اللہ سے کوئی علیحدہ چیزیں نہیں ہیں، نفی جو ہوا کرتی ہے وہ غیر کی ہوا کرتی ہے، یہ کتابُ اللہ کا غیر نہیں، یعنی مغایر نہیں ہیں، یہ کتاب اللہ کے مخالف نہیں، یہ کتاب اللہ کا ہی ایک حصّہ اور اسی کی ایک تشریح ہیں، جن لوگوں کو یہ دو نظر آتی ہیں کہ کتابُ اللہ علیحدہ ہے، اور سُنّتِ رسول اللہ علیحدہ ہے، اور یہ دونوں مل کے ایک دِین کا مزاج ان کو نظر نہیں آتا، دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نظر آتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جس وقت وہ حدیث کو چھوڑتے ہیں تو اپنے خیال کے مطابق تو انہوں نے صرف حدیث کو چھوڑا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے قرآن بھی چھوٹ جاتا ہے، قرآن بھی ان کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتا۔ ایک کاغذ کی کتاب ان کے ہاتھ میں رہ جائے تو رہ جائے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق ہے وہ اُن کے ہاتھ میں نہیں رہتا۔

بھینگے کا واقعہ

جیسے مولانا رومی رحمہ اللہ نے ایک مثال ذکر کی، ''بھینگا'' تو آپ نے سنا ہوگا جس کو فارسی میں ''لوچ'' کہتے ہیں، ''گلستان'' (باب ۸) میں ایک فقرہ ہے ''یک دو بیند لوچ'' لوچ ایک کو دو دیکھا کرتا ہے، چیز ایک ہوتی ہے اور لوچ کو دو نظر آتی ہیں، ہماری زبان میں اس کو ''بھینگا'' کہتے ہیں، جس کی آنکھوں کا زاویہ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، یہ آنکھ مستقل دیکھتی ہے، یہ آنکھ مستقل دیکھتی ہے، تو جب سامنے ایک چیز رکھی ہوگی تو یہ آنکھ بھی دیکھے گی اس چیز کو، یہ بھی دیکھے گی اُس چیز کو، تو چیز ایک ہوگی لیکن اس کو نظر دو آئیں گی، اس کو کہتے ہیں ''بھینگا''، ''لوچ''، عربی کے اندر اس کے لئے لفظ ''اَحْوَل'' استعمال کیا جاتا ہے۔ تو مولانا رُومی کہتے ہیں کہ ایک اُستاذ کے پاس ایک لڑکا پڑھتا تھا اس کا شاگرد، وہ اَحول تھا یعنی بھینگا، اُستاذ نے کہا کہ جاؤ، الماری میں ایک بوتل پڑی ہے، وہ اُٹھالاؤ۔ وہ جس وقت گیا تو جا کے الماری کو کھول کے دیکھی تو بوتلیں دو تھیں، اُس کو وہ دو نظر آ رہی تھیں، وہ وہاں کھڑا ہوا شور کر رہا ہے کہ اُستاذ جی! کون سی بوتل اُٹھا کے لاؤں؟ یہاں تو دو بوتلیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اپنا بھینگا پن چھوڑ دے، بوتل ایک ہی ہے، تُو اُٹھالا! وہ کہتا ہے: جی! میں تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ دو ہیں، تو میں کون سی اُٹھا کے لاؤں؟ تو اُستاذ نے غصّے میں کہا کہ ایک توڑ دے، دُوسری لے آ۔ تو جس وقت اس نے ایک کو توڑا تو دُوسری بھی ساتھ ہی غائب ہوگئی، کیونکہ وہ تو ایک ہی تھی، اُس کے دیکھنے میں دو آ رہی تھیں۔[1] تو اس طرح سے اَحول جس وقت ایک چیز کو دو سمجھ لیتا ہے تو جب وہ ایک کو چھوڑتا ہے تو دُوسری بھی ساتھ ہی جاتی ہے۔ بالکل یہ بھی رُوحانی قسم کا بھینگا پن ہے، باطنی قسم کا بھینگا پن، جو قرآن اور حدیث کو دو علیحدہ حقیقتیں سمجھتے ہیں۔

---

(۱) ''مثنوی معنوی'' دفتر اوّل، حکایت ۱۲/ ''کلید مثنوی'' از حضرت تھانوی، ج۱ ص۱۲۱، بعنوان: داستان آں بادشاہ جہود کہ نصرانیاں را مے کشت از تعصب۔

حدیث اور فقہ، قرآن کی شرح ہیں

اور اگر اللہ تعالیٰ نظر کسی کی صحیح کر دے، اور بصیرت اس کی صحیح ہو، تو وہ سمجھے گا کہ کتاب اور حدیث یہ دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں، کتاب اللہ متن ہے، حدیث اس کی شرح ہے، اور فقہ اس سے آگے دُوسرے درجے کی شرح ہے۔ فقہ کو چھوڑ دو گے، حدیث ہاتھ سے چھوٹ جائے گی، اور حدیث کو چھوڑ دو گے، قرآن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، یہ تو رشتہ ان کا آپس میں اس طرح سے ہے کہ ان کا آپس میں متن اور شرح والا تعلق ہے، شرح جو ہوا کرتی ہے وہ متن سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہوا کرتی۔ قرآنِ کریم نے کہہ دیا: اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: نماز پڑھو، اتنا لفظ آ گیا۔ اب یہ پڑھنی کس طرح سے ہے؟ اس کی کچھ تفصیل حدیث میں بتادی گئی، اور مزید جزئیات جو پیش آئیں علمائے اُمت نے، فقہائے اُمت ﷺ نے اُن جزئیات کی تفصیل کر دی، تو کیا وہ سارے کے سارے اَحکام اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے نیچے نہیں آ گئے؟ قرآنِ کریم نے کہہ دیا: اٰتُوا الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ دیا کرو۔ لیکن اب زکوٰۃ کسے کہتے ہیں؟ کس کس چیز میں سے زکوٰۃ دینی ہے؟ کتنی کتنی ادا کرنی ہے؟ کس کو دینی ہے؟ یہ تشریحات کچھ حدیث نے بتادیں، اور کچھ جزئیات اگر حدیث میں صراحت کے ساتھ نہیں آئیں تو فقہائے اُمت نے اِشاروں کے ساتھ وہ اُخذ کر لیں، اب حدیث اور فقہ سارے کا سارا مل کر اٰتُوا الزَّكٰوةَ کی تفصیل ہے۔ اسی طرح سے روزے کا ذِکر ہے اور دُوسری چیزوں کا ذِکر ہے، قرآنِ کریم نے تو کلیات بیان کی ہیں، اور اُن کلیات کی تشریح حدیث نے کی ہے، اور فقہائے اُمت ﷺ نے اور علمائے اُمت ﷺ نے حدیث اور قرآن کے اشارے سمجھ کے کی ہے، تو یہ تو اِجمال اور تفصیل کا فرق ہے، کلیے کے تحت جزئیات کو ذِکر کرنے والی بات ہے، ان کا آپس میں کوئی تعارض اور کوئی تناقض نہیں کہ آپ سمجھیں کہ جو فقہ پہ عمل کرتے ہیں وہ حدیث پر نہیں کرتے، جو حدیث پر کرتے ہیں وہ قرآن پر نہیں کرتے، اور قرآن پر عمل کرنا ہو تو ان دونوں کو چھوڑنا پڑے گا، یہ گمراہی ہے جس کے اندر لوگ مبتلا ہیں۔ منکرینِ حدیث حقیقت کے اعتبار سے منکرِ قرآن بھی ہیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص قرآن کو مانے اور حدیث کو نہ مانے۔ حجیتِ حدیث کے متعلق مضمون مفصل ہے اُس کے ذِکر کرنے کی گنجائش نہیں، میں نے ذرا سا اشارہ کر دیا کہ ''حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ'' کا یہ معنی نہیں ہے کہ اِن چیزوں کی ضرورت نہیں، بلکہ ''حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ'' کا مطلب یہ ہے کہ اصل بنیاد دِین کی کتاب اللہ پر ہی ہے، باقی کتاب اللہ کے بیان کردہ طریقے کے مطابق جو بھی ہمارے سامنے چیز آئے گی...... ! کتاب اللہ نے ہی اطاعتِ رسول کو ضروری قرار دیا، کتاب اللہ نے ہی اہلِ ذِکر کی طرف رُجوع کرنے کو ضروری قرار دیا، اہلِ اِستنباط کی طرف رُجوع کرنے کو ضروری قرار دیا، اہلِ علم سے پوچھنے کو ضروری قرار دیا، فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (سورۂ انبیاء: ۷) ان اُصولوں سے ہی اِتباعِ حدیث بھی ثابت ہے اور اِتباعِ علماء بھی ثابت ہے، ان کے مان لینے سے کتاب اللہ کا اِنکار لازم نہیں آتا، یا کتاب اللہ سے بغاوت لازم نہیں آتی، بلکہ کتاب اللہ پر عمل کرنے کی صورت یہی ہے کہ اِن چیزوں کو مان کر اس کی اِتباع کی جائے۔

اِنسانی بدن کی ہر ضرورت زمین سے پوری ہوتی ہے

دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو چیزوں سے مرکب کیا ہے، ایک بدن اور ایک رُوح،

انسان کا بدن اَرضی ہے، زمین کے اجزا سے تیار ہوا ہے، اور رُوح عالَمِ اَمر سے آئی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1] اِس کا نفخ اللہ کی جانب سے ہوا ہے، تو بدن تو تیار ہوا زمینی اجزا سے، اس کی تو ساری کی ساری ضرورتیں اللہ تعالیٰ نے زمین سے پوری کیں۔ اب آپ دیکھ لیجئے! آپ کی بدنی ضرورت کے لئے اور بدنی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے جتنی چیزیں ضروری ہیں سب زمین سے نکلتی ہیں، کھانے کی جتنی چیزیں ہیں سب زمین میں موجود، پہننے کی جتنی چیزیں ہیں سب زمین میں موجود، یہ آپ کی گھڑی ہوگئی، عینک ہوگئی، جو کچھ بھی ہے سب زمین سے نکل رہا ہے، اور زمین سے ہی ساری چیزیں نکال نکال کے آپ کی بدنی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں، اور جس وقت آپ کی زندگی ختم ہوجائے گی تو آپ کا بدن زمین کی طرف ہی راجع ہوجائے گا۔ تو زمین جب آپ کے لئے اصل ہے تو آپ اس کی چیزوں کو اِستعمال کرتے ہیں، یہیں سے غلے نکال نکال کر کھاتے ہیں، یہیں سے فروٹ نکال نکال کر کھاتے ہیں، تو آپ کا ربط چونکہ زمین کے ساتھ ہے اس لئے کبھی آپ زمینی اشیاء کھاتے ہوئے اُکتاتے نہیں، کبھی آپ ایسے طور پر رجتے نہیں کہ پھر کبھی ضرورت نہ پیش آئے، وقتی طور پر آپ کھالیں گے، آپ کی بھوک مٹ جائے گی، مزید کھانے کو جی نہیں چاہے گا، تھوڑی دیر کے بعد پھر رغبت ہوجائے گی، اور زمین کو جب سے آپ نے کھانا شروع کیا ہے تو آپ کے کھانے کے ساتھ زمین ختم نہیں ہوئی، اور یہ پُرانی نہیں ہوئی، یہ اِنتہا کو نہیں پہنچتی۔

زمین سے ضرورت پوری کرنے کے طریقے ماہرین ہی جانتے ہیں

آپ کے بدن کا ربط زمین کے ساتھ ایسا ہے کہ اِس پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہماری ہر ضرورت زمین سے نکلتی ہے، لیکن زمین سے ضرورت نکلنے کا یہ معنی نہیں کہ تم مٹی پھانکنا شروع کردیا کرو اور یہی تمہاری زندگی کے لئے کافی ہے، زمین سے ضرورتیں نکلتیں ہیں لیکن نکالنے کا ایک طریقہ ہے، آپ کو گندم کی ضرورت ہے تو وہ زمین سے نکلے گی لیکن ایک خاص طریق کے مطابق، آپ کو لباس کے لئے کپاس کی ضرورت ہے کہ آپ کپڑا بنانا چاہتے ہیں تو کپاس بھی زمین سے نکلے گی لیکن ایک خاص ترتیب کے تحت جو ماہرین نکالیں گے، آپ کو میٹھے کی ضرورت ہے تو گڑ، شکر، چینی جو کچھ ہے سب زمین سے نکلے گا لیکن ایک خاص ترتیب کے مطابق جو کہ ماہرین نکالیں گے، اب اگر کوئی آدمی یہ سُن لے کہ زمین ہی ہماری غذا کا مرکز ہے اور جا کے وہ اینٹ، پتھر کھانے شروع کردے تو یہ غلطی اُس کی ہے، اور اس اینٹ پتھر کے کھانے کے بعد پھر مر جائے تو کہے کہ لوگ تو کہتے تھے کہ زمین کے کھانے کے ساتھ زندگی ملتی ہے، یہ تو زمین کا کھانا اُلٹا موت کا ذریعہ بن گیا۔ تو ماہرین جانتے ہیں کہ زمین میں سے چیزیں کیسے نکالی جاتی ہیں اور کیسی کیسی چیزیں نکلتی ہیں، اور جو جاہل ہے جو کسی چیز کو جانتا نہیں کہ زمین کی کیا خصوصیت ہے، اس میں سے کیا چیزیں نکلتی ہیں، کس طرح سے نکالی جاتی ہیں، اُس کو کسی میدان میں لے جا کر کھڑا کردو اور کہو کہ اس میں تمہارا لباس ہے، اس میں تمہاری خوراک بھی ہے، اس میں تمہاری دوائیں بھی ہیں، اس میں تمہاری مٹھائی بھی ہے، اور اس میں تمہاری خوشبوئیں بھی ہیں اور ہر قسم کی رنگت ہے، وہ کہے گا کہ کیسی باتیں کرتے ہو، یہ تو سوائے مٹی کے ڈھیر کے اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا، جو زمین کی خصوصیت نہیں

---

(1) پارہ ۱۴ سورۂ حجر آیت ۲۹۔ پارہ ۲۳ سورۂ ص آیت ۷۲۔

جانتا، زمین کے معاملے میں ماہر نہیں ہے، وہ تو زمین کو دیکھ کر یہی کہے گا کہ یہ تو مٹی کے ڈھیر ہیں، تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں لباس بھی ہے، خوراک بھی ہے، دوا بھی ہے، زیب و زینت کا سارے کا سارا سامان بھی ہے، خوشبو بھی ہے، جتنے بھی تلذذات ہیں وہ بھی سب اِس میں، غلط بیانی کرتے ہو، یہ تو سارے کا سارا مٹی کا ڈھیر ہے۔

رُوح کی ہر ضرورت قرآن سے پوری ہوتی ہے

بالکل اسی طرح سے سمجھ لیجئے آپ کہ اللہ تعالیٰ نے جب رُوح عالَمِ اَمر کی طرف سے بھیجی تو رُوح کی ضرورت کے لئے یہ کائنات ہمارے لئے اُتاری جس کو قرآنِ کریم کہتے ہیں، جیسے انسان کے بدن کی ہر ضرورت زمین سے پوری ہوتی ہے تو رُوح کی ہر ضرورت قرآن سے پوری ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے ذکر فرمایا کہ یہ کتابُ اللہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے علماء کا پیٹ نہیں بھرتا "لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ"[1] اِس کو دیکھیں، پڑھیں، کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس کو بار بار پڑھنے کے بعد رغبت تازہ رہے، ایک دفعہ پڑھیں گے، دو دفعہ پڑھیں گے، تیسری دفعہ ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا، لیکن اس کو جب پڑھو نئی نویلی، اور کتنی کثرت کے ساتھ اور بار بار آپ پڑھتے ہیں، کبھی طبیعت نہیں اُکتاتی، وقتی طور پر آپ تھک جائیں گے، چھوڑ دیں گے، دُوسرے وقت پھر اسی طرح سے تر و تازہ۔ علماء کا اس سے پیٹ نہیں بھرتا، کثرتِ تکرار کے ساتھ یہ پُرانی نہیں ہوتی، لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ (حوالہ مذکورہ) اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے، قیامت تک اس کے عجائبات اسی طرح سے چلتے رہیں گے۔

قرآن سے رُوح کی ضرورت کی چیزیں کون نکال سکتا ہے؟

لیکن یہ چیزیں اس شخص کے لئے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا اور جو اِس کو اِستعمال کرنا جانتا ہے، اور اس میں سے ضرورت کی چیزیں نکالنا جانتا ہے، تو وہ ہر ضرورت کی چیز اِس قرآن میں سے نکال لے گا۔ جیسے کہ زمین دار آدمی، کاشت کار، جس کو زمین سے چیزیں نکالنے کا سلیقہ ہے، وہ ہر چیز زمین میں سے نکال لیتا ہے، ماہرینِ طبقاتُ الارض کو سب چیزیں زمین کے اندر معلوم ہو جاتی ہیں اور اپنے طریقے کے مطابق وہ نکال لی جاتی ہیں، اسی طرح سے علماء جن کو اللہ تعالیٰ علمِ صحیح دیتا ہے وہ دِین کی اور اپنی رُوح کی ہر ضرورت قرآنِ کریم سے نکالے گا، نکالنے کا اُس کو طریقہ معلوم ہے، اس کو نظر آتا ہے کہ کن الفاظ میں یہ بات بیان کی گئی ہے اور اس کو اَخذ کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ لیکن جاہلوں کے سامنے، جو اس کی مہارت نہیں رکھتے، جن کو علمِ صحیح حاصل نہیں ہے، ان کے سامنے جس وقت اِس کتابُ اللہ کو پیش کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اِس میں سب کچھ ہے، ہر چیز کی تفصیل ہے، تمہاری ہر ضرورت پوری کرنے کے لئے یہ کتاب ہی اُتری ہے، وہ کہتے تھے "اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ" ہمیں تو اس میں کچھ نظر ہی نہیں آتا سوائے اس کے کہ لوگوں کے قصے کہانیوں سے بھری ہوئی کتاب ہے، جس طرح سے ایک غیر ماہر زمین کو دیکھ کر ایک مٹی کا ڈھیر سمجھتا ہے، تو کافر، مشرک، بے بصیرت، عقل کا اندھا، وہ اِس کتاب کو بھی دیکھ کر سمجھتا ہے کہ اس میں سوائے قصے کہانیوں کے ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا، لیکن جن کو اللہ تعالیٰ علم اور بصیرت دیتے ہیں ان کو سب کچھ اسی سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔

---

(۱) ترمذی ۲/۱۱۸ باب ما جاء فی فضل القرآن۔ مشکوۃ ۱/۱۸۶، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی عن الحارث

حدیث اور فقہ کو قرآن کے منافی کہنا جہالت ہے

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مٹھائی بھی زمین کا حصہ ہے، یہ زمین سے علیحدہ چیز نہیں ہے، ہمارے کپڑے بھی زمین کا حصہ ہیں یہ زمین سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہیں، جتنی خوشبوئیں اور جتنی ضرورتیں ہیں.......! یہ گھڑی ہوگئی، عینک ہوگئی، یہ لکڑی ہوگئی، جو کچھ ہے، ہم جانتے ہیں کہ یہ زمین کا ہی حصہ ہیں زمین سے علیحدہ چیز نہیں ہے، اور جس کو یہ نسبت معلوم نہیں وہ کہے گا کہ اس کا زمین سے تعلق ہی کوئی نہیں، زمین تو ایک مٹی جیسی ہے اور یہ لوہا اس میں سے کیسے نکل آیا؟ یہ لکڑی اس میں سے کیسے آگئی؟ یہ گوشت اس میں سے کیسے آگیا؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ سب زمین کے حصے ہیں، زمین کے ساتھ ان کی کوئی منافات نہیں ہے۔ اسی طرح سے قرآنِ کریم سے رسول اللہ ﷺ نے تشریح کرتے ہوئے جو مضامین بیان کئے یعنی احادیث یہ بھی قرآنِ کریم سے ایسے ہی تعلق رکھتے ہیں، جیسے آپ کا گوشت آپ کی خوراک اور آپ کا لباس زمین سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی طرح سے ماہرین اس میں سے ہر ضرورت کو نکالتے ہیں جس طرح سے زمین سے ہر ضرورت کو نکالتے ہیں، لیکن جاہل جو کہ اس حقیقت کو سمجھتا نہیں اُس کو قرآنِ کریم میں کچھ بھی نظر نہیں آتا، اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں قرآنِ کریم سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں، تو ان کا آپس میں تعارض اور تناقض جن لوگوں کو معلوم ہوتا ہے یعنی حدیث اور فقہ کا قرآن کے ساتھ، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی جاہل کہے کہ غلط ہے کہ یہ لباس زمین کے ساتھ تعلق رکھتا ہے یا زمین کا عنصر ہے، اسی طرح سے ان لوگوں کا ان میں منافات کا قول کرنا غلط ہے، ماہرین کے نزدیک جیسے زندگی کی ساری کی ساری رونق جو کچھ بھی ہے یہ زمین کا حصہ ہے، اسی طرح سے ہمارے نزدیک حدیث ہوگئی، فقہ ہوگئی، یہ ساری کی ساری کتاب اللہ کا حصہ ہے، اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ اس لئے "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" کا یہ معنی نہیں کہ کتاب اللہ کے بعد حدیث کی ضرورت نہیں، فقہ کی ضرورت نہیں، "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" سے اس کی نفی نہیں ہوتی، "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" سے نفی ہوتی ہے قرآنِ کریم کے مغایر کتابوں کی، کہ دین کی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہم کتاب اللہ کے علاوہ کسی دوسری کتاب کے محتاج نہیں، ہمیں ہر قسم کی ہدایت اسی کتاب سے ملے گی، اور سرورِ کائنات ﷺ کی تفصیل کے تحت ملے گی، اور علماء کے اجتہادات اور استنباطات کے تحت ملے گی، یہ چیزیں قرآنِ کریم کی تشریح ہیں، یہ قرآنِ کریم کے منافی چیزیں نہیں ہیں۔ تو "بس" کا مطلب یہ ہوگیا کہ دین کی راہنمائی کے لئے کتاب اللہ کے بعد ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، باقی! کتاب اللہ کو سمجھیں گے احادیث کی تشریح کے تحت، اور علمائے اُمت، محققین، مجتہدین کے اجتہادات اور ان کے استنباطات کے تحت، اس لحاظ سے کتاب اللہ کافی ہے۔ تو یہ جو اختتام ہوا "باء" اور "سین" کے ساتھ تو اس میں یہ نکتہ عجیب ہے، حکیم سنائی رحمہ اللہ کا یہ شعر جو آپ کے سامنے پڑھا گیا:

اوّل و آخر قرآں زچہ باء آمد و سین   یعنی در رہِ دیں رہبر تو قرآن بس

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اِس کو اختتام تک پہنچانے کی توفیق دی، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ" جس نعمت کے حاصل ہونے کا واسطہ انسان بنے تو اُس انسان کا شکریہ اَدا کرنا بھی ضروری ہے، تو یہ جو قرآنِ کریم کیسٹوں کے اندر جمع ہوا اِس میں سارے کا سارا تعاون ہمارے محترم قاری نسیم الدین صاحب کا ہے، اور یہ سارے کا سارا خرچ انہوں نے برداشت کیا ہے، اس لیے ہم اُن کے لئے بھی دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں جزا دے اور اُن کی اِس خدمت کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور میرے لیے بھی یہ آخرت میں نجات کا باعث بنے، اور آپ سب حضرات کو اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ اِس کے اچھی طرح سے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

اِختتامی دُعا

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ بِاَنَّكَ اَنْتَ اللهُ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ. يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ. يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ. سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ. وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ. سُبْحَانَ اللهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَسْاَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ. وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ وَالْعِصْمَةَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا دَيْنًا اِلَّا قَضَيْتَهٗ وَلَا حَاجَةً مِنْ حَوَائِجِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ هِيَ لَكَ رِضًا اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا. رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا. رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا. رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ. اَللّٰهُمَّ اِذَا اَرَدْتَ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنَا اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنِيْنَ. اِذَا اَرَدْتَ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنَا اِلَيْكَ غَيْرَ

مَفْتُوْنِیْنَ. اِذَا اَرَدتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنَا اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنِیْنَ اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِيْ فِيْ قَبْرِيْ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لِيْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً. اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنِيْ مِنْهُ مَا نَسِيْتُ وَعَلِّمْنِيْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ وَارْزُقْنِيْ تِلَاوَتَهٗ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لِيْ حُجَّةً يَّارَبَّ الْعَالَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ. نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ. مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ. عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ. اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا. وَّعَمَلًا صَالِحًا مُّتَقَبَّلًا. وَرِزْقًا حَلَالًا وَّاسِعًا. وَشِفَاءً مِّنْ كُلِّ دَاءٍ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ تَمَامَ الْعَافِيَةِ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ. اَللّٰهُمَّ بَلِّغْنَا وَبَلِّغْ مَنْ اَوْصَانَا بِالدُّعَاءِ وَجَمِيْعَ مَنْ لَّهٗ حَقٌّ عَلَيْنَا عَلَى الْمَقَاصِدِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. وَاكْشِفْ عَنَّا وَعَنْهُمْ سَائِرَ الْكُرُبَاتِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. اَنْتَ اَعْلَمُ بِهِمْ وَبِمَقَاصِدِهِمْ وَكُرُبَاتِهِمْ. اَنْتَ اَكْرَمُ الْاَكْرَمِيْنَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ تَسْتَحْيِيْ اَنْ تَرُدَّ يَدَ الْعَبْدِ صِفْرًا اِذَا رَفَعَ الْاَكُفَّ اِلَيْكَ.

یاربِّ! یااللہ! یارحمٰن! یارحیم! یاارحم الرّاحمین! یاربِّ! یااللہ! یارحمٰن! یارحیم! یاارحم الرّاحمین! یاربِّ! یااللہ! یارحمٰن! یارحیم! یاارحم الرّاحمین! اس خدمت نوں قبول فرما، اس دے اندر جیڑھیاں کوتاہیاں ہویاں اُنہاں تو درگزر فرما، یااللہ! ہمارے دوست، ہمارے محسن، قاری نسیم الدین صاحب نوں دُنیا اور آخرت وِچ خیر نصیب فرما، صحت وعافیت نال نواز، دُنیا اور آخرت دے اندر راحت اور عزّت نصیب فرما، اپنی مرضیات تے چلن دی توفیق دے، یااللہ! اِس خدمت نوں قبول فرما، ساڈے ساراں واسطے اِس نوں نجات دا ذریعہ بنڑادے، اے اللہ! اپنی کتاب نال تعلق نصیب فرما، صحیح سمجھ عطا فرما، سمجھنڑ دی اور عمل کرنڑ دی توفیق عطا فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا. اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا. اَللّٰهُمَّ لَا مَلْجَاَ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ. اَللّٰهُمَّ اسْتُرْنَا بِسِتْرِكَ الْجَمِيْلِ. اَللّٰهُمَّ اسْتُرْنَا بِسِتْرِكَ الْجَمِيْلِ. اَللّٰهُمَّ اسْتُرْنَا بِسِتْرِكَ الْجَمِيْلِ

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.